ایک کہانی

ے ہی جذباتی، رومانی، سنسنی خیز اور چونکا دینے والے واقعات

پہلا حصہ

عنایت اللہ

پیش لفظ

یہ ایک کہانی ہے۔

اسے مَیں نے ناول کہا ہے۔ ناول کا مطلب ہوتا ہے افسانہ، من گھڑت قصہ۔ یہ کہانی پڑھیں اور اپنے آپ سے پوچھیں ـــــ "کیا یہ افسانہ ہے؟ من گھڑت قصہ ہے؟" ـــــ پھر اپنے معاشرے کو دیکھیں۔ اَپر کلاس سوسائٹی کو دیکھیں۔ اپنے نوجوانوں میں ڈِسکو اور پاپ کی اور اپنے دشمن مُلک کی فلموں کی مقبولیت کو دیکھیں۔ اپنے کلچر کو آخری سانس لیتے اور ایک ایسے کلچر کو اپنے ہاں تیزی سے پھلتا پھولتا دیکھیں جو بے حیائی، عریانی اور فحاشی سے مرکّب ہے تو آپ کو اس سوال کا جواب مل جائے گا کہ یہ کہانی من گھڑت قصہ ہے یا پاکستان کا ایک حقیقی المیہ!

بھارت کو پاکستان میں جاسوسی، نظریاتی اور اخلاقی تخریب کاری اور تباہ کاری (سابوتاژ) کے لئے پاکستانی ایجنٹ اور کارندے کہاں سے اور کس طرح ملتے ہیں؟

بھارت کی انٹیلی جنس کے ہندو کارندے پاکستان میں مسلمان اور پاکستانی بن کر کس طرح رہتے ہیں اور انہیں کون تحفظ اور پناہ دیتا ہے؟

پاکستان کے نوجوانوں کو کس طرح سیر و سیاحت کے لئے بھارت لے جا کر جاسوسی اور تخریب کاری کی ٹریننگ دی جاتی اور ان کی برین واشنگ کی جاتی ہے؟

بھارت کے مسلمانوں کا پاکستان کے متعلق رویّہ اور جذبہ کیا ہے؟

اِس ناول میں آپ کو بڑے ہی جذباتی، رومانی، سنسنی خیز اور چونکا دینے والے واقعات اور زندہ مثالوں کی صورت میں اِن سوالوں کے جواب ملیں گے۔ ڈراماتی اغوا، تلاش، تعاقب اور فرار کی اور پُراسرار طریقوں سے قتل کی وارداتیں بھی ملیں گی۔

بھارت کے مسلمانوں کے ایک گروہ کی خفیہ اور خطرناک سرگرمیاں اِس ناول

کی روح میں شامل ہیں۔ اس گروہ کے دادوں پردادوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی
لڑی تھی، اب یہ نسل اسلام کو بھارت میں زندہ رکھنے کے لئے اور پاکستان کو
بھارتی جاسوسوں اور تخریب کاروں سے بچانے کے لئے دِلّی میں زمین دوز جنگ
لڑ رہی ہے۔

اِس "ایک کہانی" میں کوئی وعظ اور کوئی اخلاق سدھار لیکچر نہیں، کردار اور
واقعات کہانی سناتے ہیں۔ انہیں زبردستی کسی راستے پر نہیں ڈالا گیا نہ ناول کو دلچسپ
بنانے کے لئے انہیں اپنے سانچے میں ڈھالا گیا ہے۔ کردار اپنی نفسیات اور اپنے
احوال و کوائف کے تحت سرگرم ہیں۔

ناول آپ کے ہاتھ میں ہے۔ خود دیکھ لیں اور رائے قائم کریں کہ یہ حقیقت
ہے یا افسانہ!

کہانی بہت طویل ہے اس لئے اسے دو جلدوں میں تقسیم کرنا پڑا۔

اپنے بچوں کو یہ کہانی ضرور پڑھائیے گا۔ میں نے یہ آپ کے بچوں
کے لئے ہی لکھی ہے۔

عنایت اللہ
مدیر ماہنامہ "حکایت" لاہور

شادی کا ہنگامہ جو کئی دنوں سے جاری تھا، اُس رات کاروں کے
بڑے لمبے جلوس کی صورت میں لڑکی والوں کے ہاں چلا گیا اور دُلہن کو
ساتھ لے کر واپس آ گیا تھا۔

بارات لڑکی والوں کے گھر نہیں بلکہ ایک بہت بڑے ہوٹل میں
گئی تھی جس کے سائے میں کھڑے ہونے کے بھی شاید پیسے لگتے ہیں۔
دُلہن پہلے سے وہاں موجود تھی۔ دُلہن والے بھی اپنے سینکڑوں مہمانوں
کے ساتھ موجود تھے۔ دُلہن ہوٹل کے ہال میں سٹیج پر صوفے پر بیٹھی تھی۔
ہال کی اپنی چھت تھی جو نظر نہ آنے والی ٹیوبوں اور برقی قمقموں سے
دوپہر کے آسمان کی طرح روشن تھی لیکن دولہا دُلہن کے لئے اس چھت
کے نیچے جو سٹیج بنایا گیا تھا اس پر ایک چمکیلے کپڑے کے شامیانے کی
چھت ڈالی گئی تھی۔ اس کی جھالروں پر تِلّے اور گوٹے کے پھول بنے
ہوئے اور ان میں کانچ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے سِلے ہوئے تھے۔
جھالر ہلتی تھی تو کانچ کے ٹکڑے ستاروں کی طرح جھلملاتے تھے اور ان
سے رنگ برنگی شعاعیں نکلتی تھیں۔

دُلہن صوفے پر اس طرح بیٹھی تھی جیسے جاپانی گُڑیا رکھی ہوتی ہو۔
وہ بیوٹی پارلر سے بال سیٹ کروا کے آئی تھی۔ اُس کا میک اپ اور
سج دھج بیوٹی پارلر میں ہوئی تھی۔ اُس کی ماں نے دو ہزار روپے بل ادا
کیا تھا۔ مصنوعی جُوڑے کی قیمت الگ تھی۔

بیوٹی پارلر میں زیادہ تر عورتیں کام کرتی تھیں لیکن جس نے اس
لڑکی کو جاپانی گُڑیا جیسی دُلہن بنایا تھا وہ آدمی تھا — گورے چٹے رنگ
کا خوبرو آدمی — اپنے فن میں مہارت کے علاوہ اُس میں ایک خوبی یہ بھی
تھی کہ ہپیوں کے لب و لہجے میں انگریزی بول سکتا تھا۔ وہ جیکی کے نام

سے مشہور تھا۔ دُلہن بننے سے پہلے یہ لڑکی بالوں کی سیٹنگ کے لئے اسی کے پاس جایا کرتی تھی۔ وہ فارغ نہ ہوتا تو اُس کے انتظار میں بیٹھی رہتی تھی۔ جیکی بڑی توجہ اور انہماک سے اس کے بال تراش کر سیٹ کرتا اور ضرورت سے زیادہ وقت صَرف کیا کرتا تھا۔ اب اس لڑکی کو اُس کے پاس دُلہن بننے کے لئے لے جایا گیا تو جیکی پہلے سے تیار تھا۔ وہ لڑکی کو اُس کرسی پر لے گیا جو باقی کرسیوں سے الگ تھلگ تھی۔

"رِشی!" ـــ جیکی نے لڑکی کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوتے سرگوشی کی ـــ "ایسا تو نہیں کہ پھر کبھی آؤ گی ہی نہیں؟"

"مَیں کہیں باہر تو نہیں جا رہی جیکی!" ـــ رِشی نے جواب دیا ـــ "یہ بال تمہارے ہیں۔ شادی کے بعد بھی تم ہی انہیں سیٹ کیا کرو گے۔"

دُلہن کا نام راشدہ رحیم تھا اور وہ رِشی کہلاتی تھی۔ اسی طرح وہ پاکستانی کلچر سے لاتعلق ہو گئی تھی۔ عادی مجرموں، غنڈوں اور بدمعاشوں کے نام بھی اسی طرح کے ہوتے ہیں ـــ عبدالحق عُرف عبدا۔ جمال الدین عرف جامی، نذیر احمد عُرف ناجا۔ وغیرہ ـــ تھانوں کے کاغذات میں جرائم پیشہ کلاس کے افراد کے نام اسی طرح لکھے جاتے ہیں۔ زیادہ زور عُرف پر دیا جاتا ہے اور انہیں عُرف سے ہی پکارا جاتا ہے۔ عُرف کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ یہ آدمی اپنے ملک کے کلچر، معاشرتی اقدار اور اپنی تہذیب و تمدن سے خارج ہے۔

رِشی کا تعلق اس قانون شکن کلاس سے تو نہیں تھا بلکہ وہ اُس کلاس سے تعلق رکھتی تھی جو اپنے آپ کو سب سے زیادہ مہذب اور کلچرڈ سمجھتی تھی ـــ اس قدر مہذب کہ پاکستان کے کلچر کو پسماندہ سمجھ کر اس سے لاتعلق ہو گئی تھی ـــ اس کلاس کے لوگوں نے اپنی الگ تھلگ دُنیا آباد کر لی تھی اور اپنے کلچر اور تہذیب پہ امریکہ، فرانس اور برطانیہ کا رنگ چڑھا لیا تھا۔ پھر جب اُن ملکوں کے دھتکارے ہوتے نوجوان جنہیں اپنے باپوں کے نام بھی معلوم نہیں تھے، پاکستان میں آئے تو پاکستان کی

اس کلاس کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو یہ اتنے اچھے لگے کہ انہی جیسے ہپی بن گئے اور ہپی ازم کو ایک کلچر کا نام دے دیا اور اس میں ڈوب گئے اور انہوں نے اپنے پاکستانی نام بدل کر چھوٹے چھوٹے نام رکھ لئے۔

انہوں نے طور طریقے بدل لئے۔

لباس بدل لئے۔ لباس بھی ایسا بدلا کہ ان کی لڑکیاں ملبوس ہوتے ہوتے مستور نہیں ہوتی تھیں۔

انہوں نے نئی موسیقی درآمد کر لی جسے موسیقی اس لئے کہا جاتا تھا کہ اس میں ساز بجتے تھے۔ باقی جو کچھ تھا وہ بے ہنگم آوازیں، چیخ و پکار اور غل غپاڑہ تھا۔ اسے اُنہوں نے ڈسکو اور پاپ میوزک کا نام دے دیا۔ اس میوزک نے جس نسل کو جنم دیا، رِشی اس نسل سے تعلق رکھتی تھی۔ ان کی مادری زبان تو کچھ اور ہوتی ہے لیکن یہ جو زبان بولتی ہے وہ مادر پدر آزاد انگریزی ہوتی ہے۔

اس نسل کی مائیں اپنی جوان بیٹیوں سے زیادہ جوان بننے کے جتن کرتی رہتی ہیں اور اپنے خاوندوں کی بجائے اپنی بیٹیوں کے بوائے فرینڈز کے ساتھ جلدی فری ہو جاتی ہیں۔ خاوندوں کا استعمال کچھ اور ہوتا ہے۔ خاوند پیسے بنانے والی مشینیں ہوتے ہیں۔ یہ مشینیں جو پیسے بناتی ہیں وہ حلال کم اور حرام زیادہ ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں حرام میں بڑی برکت ہے۔

جیکی اسی نسل کا ماہر ہیئر ڈریسر تھا۔ اُسے افسوس ہو رہا تھا کہ رِشی دُلہن بن کے جا رہی ہے۔ رِشی جیسی گاہک اُسے کبھی کبھی ملا کرتی تھی۔ وہ اس سے پیسے نہیں لیا کرتا تھا۔ ہیئر ڈریسنگ کے دوران جیکی کے ہاتھ رِشی کے سَر سے نیچے بلکہ کندھوں سے بھی نیچے جسم کے اُس مقام تک بھی پہنچ جایا کرتے تھے جس کا ہیئر ڈریسنگ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا۔ اُس وقت رِشی کے نوجوان اور گلاب کی پتیوں جیسے ہونٹوں پر جو مسکراہٹ آجاتی تھی وہ اُس قیمت کا ایک حصّہ تھی جو جیکی اُس سے وصول کیا کرتا تھا۔

"شادی کر کے بندھ جاؤ گی رِشی!" ـــ جیکی نے کہا تھا۔

"نان سینس!" ـــ رِشی نے کہا تھا ـــ "شادی کر کے مَیں زیادہ آزاد ہو جاؤں گی۔ رابی کو نہیں جانتے تم؟ ..... وہ میرا سوِیٹ ہے۔ مَیں نے اُسے کہہ دیا ہے کہ مَیں کوئی پابندی قبول نہیں کروں گی نہ تم پر کوئی پابندی عائد کروں گی۔"

"رابی واقعی سوِیٹ ہے" ـــ جیکی نے کہا تھا ـــ "لیکن رِشی! ایسے لگتا ہے جیسے تم مجھے بھول جاؤ گی۔"

"ہنی مون سے واپس آتے ہی تمہیں فون کروں گی" ـــ رِشی نے کہا۔

"اور میں آج کے کام کے بھی پیسے چارج نہیں کروں گا" ـــ جیکی نے کہا ـــ "مَیں جس پیار سے تمہیں دُلہن بنا رہا ہوں اسے یاد رکھنا۔"

"نہیں جیکی!" ـــ رِشی نے کہا تھا ـــ "میری ممی سے بِل پورا وصول کرنا ورنہ ممی مجھ سے پوچھے گی کہ پارلر نے بِل کیوں نہیں لیا!"

جیکی نے رِشی کے بالوں اور چہرے کی سجاوٹ پر اپنی مہارت کا آخری ذرہ بھی استعمال کر ڈالا تھا جیسے بُت تراش اپنی زندگی کا آخری شاہکار تخلیق کر رہا ہو۔

❦

رِشی جب دُلہن بن کر ہوٹل کے ہال میں سٹیج پر بیٹھی تھی تو وہ مصنوعی لگتی تھی۔ کیمروں کے فلیش بلب آسمانی بجلی کی طرح بار بار چمکتے تھے اور جب ویڈیو کیمرے کے لئے لائٹ آن ہوتی تو دُلہن مسکراتی جس سے پتہ چلا کہ یہ مصنوعی نہیں۔

اس سٹیج سے کچھ دُور ایک اور سٹیج بنایا گیا تھا جس پر جاز بینڈ کے ساز اور کرسیاں رکھی تھیں۔ مائیک بھی تھا۔ مہمان آ رہے تھے۔ ہال بھرتا جا رہا تھا۔ انگریزی بولی جا رہی تھی جس میں اردو کی آمیزش بھی تھی۔ لال لگام والی بوڑھی گھوڑیاں بھی تھیں۔ انہوں نے عمر کی لکیریں گہرے میک اَپ

بلکہ پینٹ میں چھپا رکھی تھیں۔ ان کی چال ڈھال سے ان کی عمروں کا اور ان کی بول چال سے ان کے اوچھے پن کا اندازہ ہوتا تھا۔ یہ سب خود فریبی میں مبتلا تھیں۔

بارات آ گئی۔ ہال میں ہلچل مچ گئی۔ ویڈیو کیمرے کا رُخ دُولہا کی طرف ہو گیا۔ چند ایک نوجوان جاز بینڈ والے سٹیج پر چڑھ گئے اور کُرسیوں پر بیٹھ کر انہوں نے اپنے اپنے ساز سنبھال لئے۔ گیٹاروں والے دو نوجوان کھڑے رہے۔

دُولہا دُلہن کے پاس بیٹھ گیا۔ کئی کیمروں کے فلیش بلب چمکے اور ویڈیو کیمرہ دُولہا دُلہن پر مرکوز رہا۔ دُولہا اور دُلہن کے باپ چہروں پر فدویانہ مسکراہٹیں لئے جُھکے جُھکے سے ایک صوفے پر بیٹھے ہوئے دو مہمانوں تک پہنچے اور مزید جُھک کر دونوں نے دُولہا دُلہن کے سٹیج کی طرف اشارہ کیا اور عرض کی کہ حضور ہمارے بچوں کے پاس تشریف رکھیں۔ ان کی عزت افزائی ہو گی۔

دونوں مہمان اُٹھے اور سٹیج کی طرف چل پڑے۔ دونوں باپ کچھ جُھکے ہوئے کچھ سمٹے ہوئے ان مہمانوں کے پیچھے پیچھے گئے۔ مہمان سٹیج پر چڑھے۔ دُولہا دُلہن اُٹھے۔ دُولہا نے ان سے جُھک کر ہاتھ ملایا۔ دُلہن اپنے ماتھے پہ ہاتھ رکھ کر آداب بجا لائی۔ ان دو مہمانوں میں سے ایک دُولہا کے دائیں طرف اور دوسرا دُلہن کے بائیں طرف بیٹھ گیا۔

ہال میں جس جس کے پاس کیمرہ تھا وہ سٹیج پر چڑھ گیا اور تصویریں لینے لگا۔ ان میں سرکاری فوٹو گرافر بھی تھے۔ وہ آگے بڑھ بڑھ کر تصویریں لے رہے تھے۔ انہوں نے یہ تصویریں اُسی وقت اخباروں کو پہنچانی تھیں۔ صبح کے اخباروں میں یہ تصویر نہ چھپنے سے ان فوٹو گرافروں کی شامت آ جاتی ـــ ان دو مہمانوں میں ایک صوبے کا گورنر اور دوسرا وزیرِ اعلیٰ تھا۔

اس سٹیج پر تصویریں لینے کا ہنگامہ تھا۔ دوسرے سٹیج پر بھی ایک ہنگامہ شروع ہو گیا۔ ایک نوجوان نے مائیک ہاتھ میں لے لیا تھا۔ ساز

بجنے لگے تھے۔ جس کے ہاتھ میں مائیک تھا اُس نے مائیک اپنے مُنہ کے
قریب کیا اور چنگھاڑ جیسی آواز میں انگریزی گانا شروع کر دیا۔ سپیکروں کی
آواز انتہائی بلند رکھی گئی تھی۔ گانے والا بھی انتہائی بلند آواز سے گا رہا تھا۔
اس قدر غل غپاڑہ اور اتنا کرخت شور کہ ادھیڑ عمر اور بوڑھے مہمان اپنے
کانوں میں اُنگلیاں پھیرنے لگے۔

نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں نے بازو اُوپر کر کے اور لہرا لہرا کر
ڈرم کی تال پر تالیاں بجانی شروع کر دیں۔ تین چار نوجوان جوش میں آ کر بڑھے
اور کولہے مٹکا مٹکا کر اور بازو لہرا لہرا کر ناچنا شروع کر دیا۔ ہپی کلاس پر
دیوانگی طاری ہو چکی تھی۔

پرانی عمر کے مہمان آہستہ آہستہ ہال سے نکل گئے۔

"کیا یہ موسیقی ہے؟"

"اور سٹیج کے قریب لڑکے جو حرکتیں کر رہے ہیں یہ رقص ہے۔"

"یہ زندگی کے حقائق کے مفرور ہیں۔ یہ اس غل غپاڑے میں پناہ
لیتے ہیں۔ یہ ان کی نفسیاتی کیفیت ہے۔ ہماری یہ گمراہ نسل بھٹکتی پھر
رہی ہے۔ یہ دنیا کی کوئی اور آواز نہیں سننا چاہتے۔"

"میرا خیال ہے کہ اسلام اتنی تیزی سے نہیں پھیلا تھا جس تیزی
سے ہپیوں کا کلچر پاکستان میں مقبول ہُوا ہے۔"

پھر یہ ہنگامہ دُولہا کے گھر سمٹ آیا اور دُلہن حجلۂ عروسی میں پہنچا
دی گئی تھی۔ دُولہا کی ماں اور دو بہنیں اُسے اس سجے سجائے کمرے میں
لائی تھیں۔ اُسے ڈبل بیڈ پر بٹھایا۔ دُولہا کی ماں نے اپنی بہو کو کوئی دُعا
نہ دی۔ دُولہا کی بہنوں نے بھی نہ کہا کہ اللہ تمہیں ازدواجی زندگی کی پہلی رات
مبارک کرے یا یہ کہ اللہ تمہاری ازدواجی زندگی کو مسرت اور محبت عطا کرے۔

"WISH YOU GOOD LUCK RISHI" —— ایک بہن نے دُلہن
کے گال پر ہلکی سی تھپکی دے کر کہا۔

"AND LOOK AFTER HIM WELL" —— دوسری بہن نے دُلہن

کے پہلو میں گدگدی کرتے ہوئے کہا۔

"اوہ شٹ اَپ!" —— دُلہن نے بغیر حجاب کے کہا —— "رابی میرے
لئے STRANGER تو نہیں۔"

دُولہا کی ماں اور بہنیں کمرے سے نکل گئیں اور دروازہ بند
کر گئیں۔

دُلہن اُٹھی۔ اُس کے سر پر وزنی دوپٹہ تھا جس پر وزنی کام کیا ہُوا
تھا۔ دُلہن نے دوپٹہ کھینچ کر سر سے اُتارا اور پرے پھینک دیا۔ وہ ڈریسنگ
ٹیبل کے سامنے جا رکی اور اپنا جائزہ لینے لگی۔ اس نے مصنوعی جُوڑا اُتارا
اور ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دیا۔ اس نے ہیئر برش اُٹھایا اور سر پر
پھیرنے لگی۔

اس کے بعد اُس نے بیڈ روم کا معائنہ کیا۔ اٹیچ باتھ روم کا دروازہ
کھول کر دیکھا۔ اُس کا انداز ایسا تھا جیسے یہ ہوٹل کا کمرہ دیکھ رہی ہو کہ کسی
چیز کی کمی تو نہیں۔ اُس نے دروازہ کھولا اور باہر دیکھ کر بند کر دیا۔

اُس کے چہرے پر اکتاہٹ تھی۔ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔

"کم اِن!" —— دُلہن نے کہا۔

وہ سمجھی اُس کا دُولہا رابی آیا ہے لیکن وہ رابی کے گھر کی نوکرانی
تھی۔ وہ رشی کی ہم عمر تھی۔ وہ رشی جیسی خوبصورت تو نہیں تھی لیکن اُس
سے زیادہ خوبصورت لگتی تھی۔ اُس کے چہرے پر بھولا پن تھا معصومیت
تھی۔ یہی اُس کا حُسن تھا اور یہ دلوں کو موہ لینے والا حُسن تھا۔

"ہاں!" —— رشی نے پوچھا —— "کون ہو تم؟"

"میں اس گھر کی نوکرانی ہوں بیگم صاحب!"

"انعام لینے آئی ہو؟" —— رشی نے پوچھا اور لپک کر ڈریسنگ ٹیبل
پر رکھا ہُوا اپنا پرس اُٹھایا۔

"نہیں بیگم صاحب!" —— نوکرانی نے مُسکرا کر کہا —— "بڑی بیگم صاحب
نے بھیجا ہے کہ آپ سے پوچھ لوں کہ کچھ چاہیئے تو ...... کچھ پینا ہے تو بتا
دیں ..... چائے، کافی، دودھ ..."

"کچھ نہیں چاہیتے"— رشی نے شگفتہ سے لہجے میں کہا —"وہ جو اس وقت مجھے چاہیتے وہ STUPID معلوم نہیں کہاں چلا گیا ہے۔"

"آپ نے کس کا نام لیا ہے بیگم صاحب؟"

"دُولہا صاحب کا!"— رشی نے کہا —"رابی کہیں نظر آتے تو اُسے اِدھر بھیجو۔"

"ہائے اللہ بیگم صاحب!"— نوکرانی نے ہنستے ہوئے کہا — "پہلی رات ہی آپ اس طرح کی باتیں کر رہی ہیں ....دُولہا کو بلا رہی ہیں۔ مجھے تو اسی بات پر شرم آ رہی ہے۔"

رشی کی بھی ہنسی نکل گئی۔

"تمہاری جب شادی ہوگی تو تم بھی ...."

"میری شادی ہو چکی ہے بیگم صاحب!"— نوکرانی نے اپنی ہتھیلیاں رشی کے آگے پھیلا کر کہا —"یہ دیکھیں مہندی۔ اس کا رنگ ابھی بجھا نہیں۔ آٹھ روز ہو گئے ہیں۔"

"خاوند کہاں ہے؟"

"اسی کوٹھی میں نوکر ہے"— نوکرانی نے جواب دیا —"پانچ چھ سال سے یہاں نوکری کر رہا ہے۔ مجھے بھی یہیں لے آیا ہے۔ ہم سرونٹ کوارٹر میں رہتے ہیں۔"

"تم نے پہلی رات اپنے دُولہا کو نہیں بلایا تھا؟"

"توبہ توبہ بیگم صاحب!"— نوکرانی نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا — "وہ خود ہی آ گیا تھا۔ اللہ قسم بیگم صاحب! میں تو کہوں کہ زمین پھٹ جاتے اور میں اس میں اُتر جاؤں۔ پھر دل میں آئی کہ دوسرے دروازے سے بھاگ جاؤں لیکن بیگم صاحب! ہمارے گھر والوں کے جو کمرے ہوتے ہیں اُن کا ایک ہی دروازہ ہوتا ہے۔ اسی سے اندر جاتے ہیں اور اسی سے باہر نکلتے ہیں۔ اس دروازے کو اُس نے بند کر کے اندر سے کنڈی لگا دی تھی"— اُس کا چہرہ حجاب سے سُرخ ہو گیا اور بولی —"رہنے دیں

بیگم صاحب! کوئی اور بات کریں۔ آپ بتائیں، کچھ چاہیئے۔"

"نہیں!"— رشی نے کہا اور پرس سے دس دس کے دو نوٹ نکال کر نوکرانی کی طرف کرتے ہوئے کہنے لگی —"یہ رکھ لو .... تم جاؤ۔"

نوکرانی نوٹ ہاتھ میں لے کر چلی گئی اور بیگم کو جا کر بتایا کہ دُلہن کو کچھ نہیں چاہیئے۔

دُولہا نے دُلہن کو بہت انتظار کرایا۔ دُولہا کو دیکھ کر دُلہن شرم و حجاب سے سکڑی اور سمٹی نہیں۔ شرم کے مارے اُس نے اپنا گھونگھٹ اور زیادہ نہیں لٹکایا۔ اُس کے سر پر دوپٹہ ہی نہیں تھا گھونگھٹ کہاں سے آتا۔ اُس کی آنکھوں میں شرم ہی نہیں تھی نظریں کیسے نیچی ہوتیں۔ پلکیں وہ جھکا کرتی ہیں جو شرم و حیا کا بوجھ نہیں سہار سکتیں۔

"کہاں مر گئے تھے!"— دُلہن نے کہا۔

"وہ سب اکٹھے ہو گئے تھے"— دُولہا نے چار پانچ دوستوں کے نام لے کر کہا۔

"تم کچھ پی کر آئے ہو"— دُلہن بولی۔

"وکی سکاچ وہسکی کی بوتل لے آیا تھا"— دُولہا نے کہا —"رشی! سو نہ جائیں؟ تین راتیں ناچتے ناچتے جسم ٹوٹ گیا ہے۔"

دُولہا دُلہن تین چوتھائی انگریزی اور ایک چوتھائی اُردو ملا کر کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔

وہ ایک دوسرے کے لئے اجنبی نہیں تھے۔ صرف یہ ہی نہیں کہ وہ ایک دوسرے کو جانتے تھے بلکہ ایک دوسرے کے ضمیر کو بھی جانتے تھے۔ اگر رشی نے روایتی طور پر گھونگھٹ لٹکا رکھا ہوتا اور دُلہنوں کی طرح بیر بہوٹی بنی ہوتی تو بھی وہ رابی کے لئے لال ریشم میں لپٹا ہوا کوئی راز نہ ہوتی۔ رابی میں گھونگھٹ اُٹھانے کی ذرا سی بھی بے تابی نہ ہوتی، اشتیاق نہ ہوتا۔ رابی پر یہ راز شادی سے کافی عرصہ پہلے کھل چکا تھا۔

رشی کے لئے رابی بھی کوئی بھید نہ تھا۔

دونوں ایک دوسرے پر فاش ہو چکے تھے۔ شادی تو ایک رسم تھی جو پوری کی گئی تھی۔ ان کی ملاقات ایک سال پہلے ایک رات ہوئی تھی۔ رابی کا ایک دوست اُسے ایک پارٹی میں لے گیا تھا۔ وہاں اُسی جیسے نوجوان جمع تھے۔ دُبلے پتلے، لمبے لمبے بالوں والے نوجوان ڈسکو گانوں کے کیسٹ لگا کر ناچ رہے تھے۔ چرس بھرے سگریٹ پیتے جا رہے تھے۔ ان میں تین لڑکیاں بھی تھیں۔ یہ سب امیروں کی بیٹیاں بیٹے تھے۔

رابی اپنے دوست کے سوا ان میں سے کسی کو بھی نہیں جانتا تھا۔ اس دوست نے اُس کا سب کے ساتھ تعارف کرایا۔ وہ سب پاکستانی ہی تھے اور امریکی لہجے میں انگریزی بولتے تھے۔ رشی کے ساتھ بھی اُس کا تعارف ہُوا۔ دو لڑکیاں اور تھیں۔ ان کے ساتھ بھی تعارف ہُوا۔ ایک لڑکی تو یونہی سی تھی۔ اس میں صرف یہ خوبی تھی کہ اس کا باپ سب کے باپوں سے زیادہ امیر تھا۔ اُس کی دو بیویاں تھیں۔ دونوں بیویوں نے مل کر گھر کو بچوں سے بھر دیا تھا۔ انہوں نے گیارہ بچے پیدا کئے تھے۔ یہ لڑکی پہلی بیوی میں سے تھی۔ دوسری بیوی آئی تو پہلی بیوی کا دل مُرجھا گیا، من مر گیا۔ اُس کی توجہ اپنی اولاد سے ہٹ گئی۔

باپ سمجھا کہ دولت ہر مسئلہ حل کر دیتی ہے۔ وہ دونوں بیویوں پر اولاد اور روپوں کا مینہ برساتا رہا۔ اُس کے ذرائع آمدنی بہت تھے۔ حلال کے ذرائع محدود اور حرام کے لامحدود تھے۔ وزیروں اور افسر شاہی میں وہ مقبول شخصیت تھا۔ اُس کی تمام تر توجہ روپیہ اکٹھا کرنے پر مرکوز رہتی تھی۔ دونوں بیویوں کو اُس نے کاریں دے رکھی تھیں۔ ایک کار فالتو تھی جو اولاد کے لئے تھی۔ باپ یہی دیکھ کر خوش ہو جاتا تھا کہ اس کی اولاد اچھا کھاتی اور اچھا پہنتی ہے اور ایک لڑکی اور ایک لڑکا جو جوان ہو گئے ہیں وہ کالج جاتے ہیں اور آزاد خیال ہیں۔

دوسری لڑکی رشی سے کچھ زیادہ خوبصورت اور سمارٹ تھی۔ رابی نے نہ رشی میں دلچسپی کا اظہار کیا نہ اِس دوسری لڑکی میں جو خوبصورت اور سمارٹ تھی۔

وہ ان لڑکوں کے ساتھ لگا رہا اور اُن پر اپنے باپ کے بڑے پن اور امارت کا رُعب جماتا رہا لیکن اُسے یہ لڑکے اچھے نہ لگے۔ ایک تو وہ مریل مریل سے تھے اور گھٹیا قسم کے امیر زادے تھے۔

آدھی رات کے وقت ان میں سے چار نوجوان رخصت ہو گئے اور رشی بھی اُن کے ساتھ چلی گئی۔ اس سے کچھ ہی وقت بعد رابی نے اپنے دوست سے کہا کہ رخصت لی جائے۔ رابی دوست کی گاڑی پر آیا تھا۔ وہ چلنے لگے تو ایک نوجوان نے انہیں ایک لڑکی کو ساتھ لے جانے کو کہا۔

"اسے مَیں لایا تھا" —— اُس نے کہا —— "مَیں نے ابھی رُکنا ہے، اسے کیمپس تک پہنچا دینا۔"

"اندر خود چلی جاتے گی؟" —— دوست نے پوچھا —— "یا کوئی اور طریقہ ....."

"ہاں ہاں!" —— لڑکی نے مُسکراتے ہُوتے کہا —— "نو پرابلم۔ یہ تو ہماری رُوٹین ہے۔ وہ کیمپس ہے قلعہ تو نہیں .... اور رات کو وہاں سے میں اکیلی تو نہیں نکلتی۔"

لڑکی رابی اور اُس کے دوست کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی اور گاڑی روانہ ہو گئی۔

کیمپس ابھی کچھ دُور تھا۔ گاڑی نہر کے ساتھ ساتھ جا رہی تھی۔ اُس نوجوان لڑکی کو ذرا سی بھی پریشانی نہیں تھی کہ وہ نوجوان مردوں کے ساتھ جا رہی ہے، آدھی رات کا وقت ہے اور سڑک سنسان ہے۔ اُس کی زبان کار سے زیادہ تیز چل رہی تھی۔

آگے ایک کار جاتی نظر آئی جو چلتے چلتے رُک گئی۔ اُوپر سڑک کا بلب جل رہا تھا۔ ایک دو منٹ بعد کار کا ایک پچھلا دروازہ کھُلا اور ایک لڑکی دروازے سے باہر کو گری۔ وہ اُٹھ ہی رہی تھی کہ دو لڑکوں نے کار سے نکل کر اُسے دبوچ لیا۔ لڑکی ان سے آزاد ہونے کو تڑپ رہی تھی۔

کار سے دو اور لڑکے نکلے۔ اتنے میں رابی کے دوست کی کار قریب پہنچ گئی۔

"گاڑی روکو"۔۔۔ رابی نے کہا۔

"جانے دو یار!"۔۔۔ رابی کے دوست نے کہا ۔۔۔ "انہیں کھیلنے دو۔"

ان کی کار کو دیکھ کر اُن نوجوانوں نے اِدھر دیکھا۔ لڑکی نے چیخنا چلّانا شروع کر دیا۔

"اوہ!"۔۔۔ رابی والی کار میں بیٹھی لڑکی نے کہا ۔۔۔ "یہ تو رِشی ہے۔"

"نکل چلتے ہیں رابی!"۔۔۔ رابی کے دوست نے کہا ۔۔۔ "یہ اپنے دوست ہیں۔"

یہ وہی چاروں لڑکے تھے جن کے ساتھ رِشی آئی تھی۔

"گاڑی روک وِکی!"۔۔۔ رابی نے غصے سے کہا۔

گاڑی رُک گئی۔ رابی بڑی تیزی سے باہر نکلا اور اُن لڑکوں کی طرف گیا۔ وہ لڑکے بھاگے نہیں، ڈرے نہیں۔ رِشی کو دو لڑکوں نے پکڑ رکھا تھا اور وہ آزاد ہونے کو تڑپ رہی تھی۔

"اوہ!"۔۔۔ اُن میں سے ایک نے کہا ۔۔۔ "یہ تم ہو ..... دیکھو رابی! یہ کتنی بدتمیزی کر رہی ہے۔"

رابی کا جسم ان کی نسبت ذرا مضبوط تھا۔ اُس نے کچھ کہے بغیر اُن میں سے ایک لڑکے کے مُنہ پر گھونسہ جمایا جنہوں نے رِشی کو پکڑ رکھا تھا۔ فوراً ہی اُس نے ایک گھونسہ دوسرے لڑکے کے مُنہ پر جمایا۔ دونوں لڑکے پیچھے کو گرتے گرتے پانچ چھ قدم دُور جا گرے۔

ابھی دو لڑکے باقی تھے۔ وہ رابی کی طرف آئے۔ وہ لڑنے کے موڈ میں نہیں لگتے تھے۔

"کم آن رابی!"۔۔۔ ان میں سے ایک نے امریکی لہجے میں انگریزی

میں کہا ۔۔۔ "یہ تمہاری نہیں ہماری لڑکی ہے۔"

چوتھا لڑکا ذرا تیز معلوم ہوتا تھا۔

"رابی!"۔۔۔ اُس نے انگریزی میں چیلنج کے انداز میں کہا ۔۔۔ "میں تمہیں خبردار کرتا ہوں۔ بعد میں تمہیں افسوس ہوگا۔ تم پاکستانیوں جیسی حرکت کر رہے ہو۔"

یہ دونوں لڑکے پہلو بہ پہلو کھڑے تھے۔ رابی نے دونوں کے سروں پر ہاتھ رکھے۔ ان کے بال مُٹھیوں میں پکڑے اور زور سے جھٹکا دے کر اُن کے سر آپس میں ٹکرا دیئے ایک بار، دو بار، تین بار۔ جب اُس نے ان کے بال چھوڑے تو دونوں لڑکے یوں جھومنے لگے جیسے وہ نشے میں بدمست ہوں۔ اُن کے قدم اپنے آپ ہی اُٹھنے لگے لیکن قدم لڑکھڑا اور ڈگمگا رہے تھے۔ دونوں تیورا تے اور گر پڑے۔

جو پہلے دو گرے تھے وہ اُٹھ چکے تھے لیکن آگے نہیں آتے۔ رابی نے رِشی کو بازو سے پکڑا اور اپنے دوست کی گاڑی میں بٹھا دیا۔ رابی اور اس کا دوست اور لڑکی بھی گاڑی میں بیٹھے۔

"مجھے یہ کہہ کر ساتھ لاتے تھے کہ تمہیں گھر ڈراپ کر دیں گے"۔۔۔ رِشی نے کہا ۔۔۔ "اور اس طرف لے آتے۔ پھر تم نے دیکھا ہے یہ کیا کر رہے تھے۔ یہ چاروں مجھے ....."

"ان میں سے کسی کے ساتھ تمہاری دوستی ہے؟"۔۔۔ رابی نے پوچھا۔

"دوستی تو سب کے ساتھ ہے"۔۔۔ رِشی نے جواب دیا ۔۔۔ "محبت والی دوستی کسی کے ساتھ بھی نہیں۔ مَیں ابھی کسی کے ساتھ محبت نہیں کرنا چاہتی۔"

کار رِشی کی کوٹھی کے سامنے جا رُکی۔ رِشی اُتری۔ رابی بھی اُتر آیا اور چند قدم اُس کے ساتھ گیا۔

"تم کہاں رہتے ہو؟"۔۔۔ رِشی نے پوچھا ۔۔۔ "تمہارا فون نمبر

کیا ہے؟"

رابی نے بتایا۔ رشی نے اُسے ایک ہوٹل کا نام بتایا۔ یہ چھوٹا سا ہوٹل تھا جس میں انہی جیسے لڑکے اور لڑکیاں اکٹھے ہوتے تھے۔ اس ہوٹل کا تہہ خانہ بھی تھا جہاں کیبن بنے ہوتے تھے۔ تنہائی کی ملاقات کا خاطرخواہ انتظام تھا۔

"کل آسکو گے وہاں؟" —— رشی نے پوچھا —— "میں ان لڑکوں سے اب کبھی نہیں ملوں گی۔ یہ پیپر ٹائیگر ہیں۔"

"آجاؤں گا" —— رابی نے کہا۔

اگلی شام دونوں کی ملاقات اس ہوٹل کے تہہ خانے میں ہوئی۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد جب وہ تہہ خانے سے اُبھرے تو وہ ایک دوسرے کے سویٹ بن چکے تھے۔

پھر ان کی ملاقاتیں روزمرّہ کا معمول بن گیا۔ وہ اُس قسم کے عاشق و معشوق نہیں تھے جو گھروں میں بیٹھے آہیں بھرا کرتے اور چوری چھپے ملا کرتے ہیں اور آخر لڑکی کی شادی کہیں اور، اور لڑکے کی کہیں اور ہو جاتی ہے۔ رابی اور رشی اُس دنیا کے باسی تھے جنہیں عشق و محبت میں ہر طرح کی سہولت حاصل ہوتی ہے۔ ان کی ملاقاتوں پر کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ اس کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ ان کی شادی نہ ہو سکے تو یہ کوئی المیہ نہیں ہوتا۔ چھپ چھپ کر دردناک فلمی گیت نہیں گائے جاتے۔

رابی اور رشی نے محبت کی پینگیں بڑھائیں .... نہیں۔ یہ غلط ہے۔ پینگیں تو پسماندہ لڑکے لڑکیاں بڑھایا کرتے ہیں، رابی اور رشی کی دُنیا میں کاریں دوڑائی جاتی ہیں۔ موٹر سائیکل دوڑائے جاتے ہیں۔ گھنٹہ گھنٹہ، دو دو گھنٹے ٹیلیفون پر دل کی باتیں ہوتی ہیں۔ نئی روشنی کے لوگ جن کے طور طریقے اور انداز امریکی اور یورپی ہوتے ہیں وہ پینگیں نہیں بڑھایا کرتے کیونکہ پینگ کبھی دھڑک کر کے ٹوٹ جایا کرتی ہے۔ اگر محبت کرنے

والے کی کار پنکچر ہو جاتے تو فوراً ٹائر بدل لیا جاتا ہے۔ جس طرح کار میں سپیئر پہیہ رکھا جاتا ہے اسی طرح دیسی ہپیوں کی دُنیا میں محبت کرنے والے ایک عاشق یا معشوق سپیئر رکھتے ہیں تاکہ دونوں میں سے ایک بے وفائی کر جاتے تو فوراً سپیئر کے ساتھ عشق و محبت شروع ہو جاتے۔

رابی اور رشی کی پانچویں یا چھٹی ملاقات تھی۔ رات گیارہ بجے کے بعد کا وقت تھا۔ رشی رابی کی گاڑی میں بیٹھی تھی اور گاڑی آبادی سے دُور نہر کے کنارے کھڑی تھی۔ رابی باپ کار لیا اور ساتھ لے آیا تھا۔ دسمبر کی وہ رات بڑی ہی سرد تھی۔ کار کے شیشے چڑھے ہوتے تھے۔ رابی اور رشی پچھلی سیٹ پر چلے گئے —— اور رشی نے اپنی وہ آبرو جو ایک ہی مہینہ پہلے چار پاکستانی ہپیوں سے بچانے کی کوشش کی تھی اور رابی پہنچ گیا تھا، وہ انعام کے طور پر رابی کو دے دی۔

ایک سال بعد رابی اور رشی حجلۂ عروسی میں اس رات کو یاد کر رہے تھے۔

"شبِ عروسی تو وہ تھی رابی!" —— رشی نے ایک سال پہلے کے دسمبر کی اُس رات کو یاد کرتے ہوتے کہا: "IT WAS REAL GREAT : RABI!....O! THAT LOVELY NIGHT."

اُس نے انگڑائی لی۔ اُس کی آنکھوں میں ایسا تاثر تھا جیسے ایک سال پہلے کی اُس رات کو دیکھ رہی ہو۔

اُس نے انگڑائی کو بازوؤں میں سمیٹ کر رابی کی طرف دیکھا۔ رابی سلیپنگ سوٹ پہن کر پلنگ پر لیٹا ہوا تھا۔ اُس کا چہرہ بے تاثر تھا۔

گزرے ہوتے ایک سال میں اُس نے رشی کے ساتھ ایسی کتنی ملاقاتیں کی تھیں۔ رشی میں اب اُس کے لئے کچھ بھی نیا نہیں تھا۔

رشی کچھ دیر رابی کو دیکھتی رہی۔ اسے بھی اس میں کوئی نیا پن نظر نہ آیا۔ اسے نیند آنے لگی۔ وہ پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ رابی کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ رشی اُس کے ساتھ لیٹ گئی اور اس کی آنکھ لگ گئی۔

ازدواجی زندگی کی پہلی رات انہیں سوتا چھوڑ کر گزر گئی۔

رشی نے دو باپ دیکھے تھے —— ایک سگا دوسرا سوتیلا ——
اُس کا سگا باپ ایک سرکاری محکمے میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھا۔ اُس کی اُس وقت عمر چھتیس سال تھی جب اُس نے رشی کی ماں کے ساتھ شادی کی تھی۔ اُس وقت وہ رشی کی ماں نہیں تھی۔ اس کی عمر پچیس سال تھی۔ بہت خوبصورت لڑکی تھی۔ لڑکپن میں ہی اُس نے لڑکوں کو اُنگلیوں پر نچانا شروع کر دیا تھا۔ یہ اُس کی ہابی تھی۔ لڑکوں سے وہ تحفے وصول کرتی اور ہر ایک کو محبت کا یقین دلاتی اور انہیں جھوٹے وعدوں پر ٹالتی رہتی تھی۔

وہ بڑی ہوتی گئی۔ اکیس سال کی عمر میں اُس کی شادی کر دی گئی لیکن پانچویں مہینے طلاق لے کر گھر آ بیٹھی۔ کہتی تھی کہ اُس کا خاوند مُردہ دل ہے اور اُسے نصیحتیں کرتا رہتا ہے۔ ازدواجی زندگی کے جال سے آزاد ہو کر اس نے پھر اپنا پُرانا شغل شروع کر دیا۔ بیک وقت تین چار آدمیوں کو دل دینے کا جھانسہ دے کر اُن سے اپنی فرمائشیں پوری کراتی رہی۔ دو کو اُس نے آپس میں لڑا دیا اور تھانے تک پہنچا دیا تھا۔ اُس میں خوبی یہ تھی کہ چاہنے والوں سے اپنے جسم کو بچا کر رکھتی تھی۔ وہ انگریزی فلموں والی "محبت" کرتی تھی۔

اُسے صرف اپنے پرس کے ساتھ دلی محبت تھی۔ وہ پرس کا پیٹ بھر کر رکھتی تھی۔ پھر اُسے قیمتی کپڑوں سے محبت تھی۔ وہ شہزادی بننے کے خواب دیکھا کرتی تھی۔ وہ ایسے آدمی کی تلاش میں تھی جو اُس کے جسم کے وزن جتنے نوٹ دینے کے قابل ہو۔ وہ اپنی قدر و قیمت کو بڑی اچھی طرح جانتی تھی۔

یہ اُس کی اُستادی کا کمال تھا کہ ہوس کار آدمیوں کے درمیان رہتے ہوتے بلکہ اُن کے ساتھ گھومتے پھرتے اور کھاتے پیتے ہوتے اُس نے اپنے آپ کو اُن کے لئے جنس نایاب بنا رکھا تھا۔ اُس نے آدمیوں کی کمزوریوں کو بھانپ لیا تھا۔ اُن کی دُکھتی رگوں کو پہچان لیا تھا۔

اُس کی عمر پچیس سال ہو گئی اور اُسے ایک آدمی مل گیا جو اُس کی

فطرت کے پیمانے پر پورا اُترتا تھا۔ وہ اُس سے دس گیارہ سال بڑا تھا لیکن اتنا بڑا لگتا نہیں تھا۔ بڑا لگتا بھی تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس حسین لڑکی نے بھانپ لیا تھا کہ وہ جس کی تلاش میں تھی وہ اسے مل گیا ہے۔ ایک تو یہ شخص طبعاً خوشگوار تھا اور اُس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ دریا دل اور شاہ خرچ تھا۔

ان کی ملاقات اتفاقیہ ہوتی تھی۔ اس آدمی کا انداز اُن تمام آدمیوں سے مختلف اور باوقار تھا جو اُس وقت تک اس لڑکی سے مل چکے تھے۔ اُس نے لڑکی کے حُسن کی تعریف نہ کی۔ اس کے بالوں کو ریشم کے تار اور اُس کی آنکھوں کو جادُو بھرے نین نہ کہا۔ اُس کے جسم کی ساخت کی دلکشی کی بات نہ کی۔ اُس کے ہونٹوں کو گلاب کی پتیاں نہ کہا۔

اس آدمی کے ساتھ اُس کی دو تین اور ملاقاتیں ہوئیں تو بھی اُس نے کوئی فلمی مکالمہ نہ بولا اور باتیں ایسی کیں جیسے دو دوست کیا کرتے ہیں۔ لڑکی کو شک ہُوا جیسے اس آدمی کو معلوم ہی نہیں کہ جسے وہ دوست بنا رہا ہے وہ لڑکی ہے۔ اس احساس سے لڑکی کی اپنی ایک کمزوری بیدار ہو گئی۔

"کیا مَیں آپ کو اچھی نہیں لگتی؟" —— اُس نے اس آدمی سے پوچھا۔
وہ دراصل کہنا یہ چاہتی تھی کہ تم میرے حُسن و جوانی کی تعریفوں کے پُل کیوں نہیں باندھتے؟

"اچھی نہ لگتیں تو میں تمہارے ساتھ بات تک نہ کرتا" —— اس آدمی نے کہا —— "مجھے تمہارے ساتھ ہمدردی بھی ہے اور دلچسپی بھی۔ آخر کب تک کھیلتی رہو گی؟ .... ڈرائیونگ جانتی ہو؟"

"نہیں!" —— لڑکی نے کہا —— "ڈرائیونگ کا تو مجھے بہت شوق ہے۔"

"چلو میرے ساتھ!" —— اُس کے دوست نے کہا اور اُسے اپنی کار تک لے جا کر کہا —— "یہ گاڑی تمہاری ہے۔ کہو گی تو دوسری گاڑی آ جائے گی .... بیٹھو!"

گاڑی شہر سے نکل کر ایک وسیع میدان میں چلی گئی۔ گاڑی والے نے لڑکی کو سٹیئرنگ پر بٹھایا اور خود ساتھ بیٹھ گیا۔ ڈرائیونگ کی ٹریننگ شروع ہو گئی۔

پھر ہر روز ٹریننگ ہونے لگی۔

دسویں گیارہویں روز لڑکی شہر کی گنجان سڑکوں پر گاڑی چلا رہی تھی۔

پھر لوگ اس لڑکی کو اکیلے اس کار میں دیکھنے لگے۔ وہ اپنے چاہنے والوں اور اُمیدواروں کو خاص طور پر دکھاتی اور شو آف کرتی کہ یہ میری اپنی کار ہے۔ وہ دراصل کہنا یہ چاہتی تھی کہ اب تمہیں میری قیمت کا اندازہ ہُوا ہے۔

اور ایک روز اس خبر نے کتنے دلوں کو کچل اور مسل کر رکھ دیا کہ سلیمہ نے اکرام کے ساتھ شادی کر لی ہے۔

اکرام کی کوٹھی تو کسی نواب یا مہاراجے کا محل تھا۔ اُس کی پہلی بیوی مر گئی تھی۔ اُس سے اولاد نہیں ہوتی تھی۔ اکرام ایک سرکاری محکمے میں بڑی اچھی اور ذمہ دار پوسٹ پر تھا۔ وہ افسر شاہی کا ایک اہم کل پُرزہ تھا۔ فرہاد نے تو دُودھ کی نہر کھودی تھی جو شیریں کے محل کے قریب یا نیچے سے گزرتی تھی، اکرام نے سونے چاندی کی نہر نکالی تھی جو اُس کے اپنے محل میں آ کر ختم ہو جاتی تھی۔

یہ "فضلِ ربّی" کی نہر تھی۔ اکرام کے محکمے کو امریکی ایڈ اور غیر ملکی قرضوں کا ایک بڑا حصہ ملتا تھا جو عوام کی بہبود اور ملک کی ترقی کے کاموں میں صرف ہونا چاہیئے تھا لیکن اس حصے کا بڑا حصہ خورد بُرد ہو جاتا اور اُوپر والوں کو کاغذی کارگزاری دکھا دی جاتی تھی۔ اکرام ایسی کرسی پر بیٹھا ہُوا تھا جس کے نیچے یہ سارا خزانہ تھا۔

ایک روز اکرام گھر آیا۔ اُس کا چہرہ اُترا ہُوا تھا۔ بات کرتے زبان

ہکلاتی تھی۔ سلیمہ نے پوچھا تو اُس نے بتایا کہ آڈٹ ٹیم اچانک آدھمکی تھی۔ اکرام نے جعل سازی اور غبن کو چھپانے کی بہت کوشش کی تھی لیکن گیارہ لاکھ کی ایک رقم پکڑی گئی۔ اُس نے آڈٹ آفیسر کا مُنہ نوٹوں کی گٹھیوں سے بند کرنا چاہا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔

اس سے پہلے اکرام دو بار پکڑا گیا تھا۔ اُس کے خلاف انکوائری کا حکم دے دیا گیا تھا لیکن حکم دینے والے اور انکوائری کرنے والے اسی ملک کے باشندے تھے۔ وہ اسی مٹی کی پیداوار تھے۔ آسمان سے اُترے ہوئے فرشتے نہیں تھے۔ اکرام ان کی کمزوریوں اور دُکھتی رگوں سے واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اُوپر والوں کے ہاتھ پھیلے ہوتے اور مُنہ کُھلے ہوتے ہیں اور ان کے مُنہ ان کے وسیع و عریض پیٹوں کے دروازے ہیں۔ چنانچہ اُس نے اُس بڑے صاحب تک رسائی حاصل کی جو حکم دے بھی سکتا تھا اور اپنے حکم کو منسوخ بھی کر سکتا تھا۔ وہ وزیروں کے احکام پر لکیر پھیرنے کے اختیارات بھی رکھتا تھا۔ پاکستان کے اصل حکمران یہی لوگ ہیں۔ وزیر تو ان کے محتاج اور محکوم ہوتے ہیں۔

اکرام نے افسر شاہی کے اس بادشاہ کے مُنہ میں نوٹوں کے بنڈل ڈالے جیسے لیٹر بکس میں کارڈ اور لفافے ڈالے جاتے ہیں۔ اکرام جیل جانے سے بال بال بچ گیا۔ دوسری بار بھی اس نے یہی نسخہ چلایا اور انکوائری کے مکھن سے بال کی طرح نکل آیا تھا۔

"اب مجھے صرف تم بچا سکتی ہو سلیمہ!" ۔۔۔ اُس نے کہا ۔۔۔ "بلکہ اپنے آپ کو تم بچا سکتی ہو۔"

"اگر یہ میرے اختیار میں ہے تو مجھے راستہ دکھائیں" ۔۔۔ سلیمہ نے کہا۔

اکرام نے اُسے دو کوٹھیوں کے راستے بتا دیئے۔ سلیمہ سمجھ گئی کہ وہ ان کوٹھیوں میں کیا کمال دکھانے کے لئے بھیجی جا رہی ہے۔ وہ دو تین راتیں ایک کوٹھی میں اور دو تین راتیں دوسری کوٹھی میں گئی۔ ایک صاحب

کی فرمائش پر اُسے اُس کے ساتھ تین چار دنوں کے لئے سوات جانا پڑا۔ وہاں سے واپس آئی تو اگلے روز انکوائری کا حکم منسوخ ہو گیا —— قرضے میں آئی ہوئی کثیر رقم میں سے گیارہ لاکھ روپیہ ایک کوٹھی میں غائب ہو گیا۔

اکرام نے پہلے ہی جائزہ لے لیا اور حساب کر لیا تھا۔ گیارہ لاکھ روپیہ ہضم کرنے کے لئے بارہ تیرہ لاکھ روپیہ دینا پڑتا تھا۔ اُس کے لئے سلیمہ سستا سودا تھی۔

سلیمہ کو وہ دعوتوں، تقریبوں اور پارٹیوں میں اپنے ساتھ رکھتا اور بڑے افسروں سے اُسے صرف ملواتا ہی نہیں تھا بلکہ اُس کی حوصلہ افزائی کرتا تھا کہ وہ ان افسروں کو اپنے ساتھ بے تکلف کر لے۔ اُس نے سلیمہ کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ اُس کی اس لامحدود آمدنی کا ذریعہ کیا ہے۔ یہ معلوم ہو جانے سے سلیمہ سمجھ گئی تھی کہ اُسے بڑے افسروں اور وزیروں وغیرہ کے ساتھ کیوں بے تکلف ہونا ہے اور کس طرح کی بے تکلفی پیدا کرنی ہے۔ اس فن میں وہ مہارت رکھتی تھی۔ اُسے کم وبیش پانچ سال کا تجربہ حاصل تھا۔

سلیمہ سمجھ گئی کہ اکرام نے کس مقصد کے لئے اس کے ساتھ شادی کی ہے۔ اس کا سلیمہ کو ذرا سا بھی افسوس نہیں تھا۔ وہ دولت میں کھیلنا چاہتی تھی۔ دولت پیدا کرنے کا ایک بڑا اچھا ذریعہ اُسے مل گیا تھا۔ سلیمہ اُن پاکستانیوں میں سے تھی جو حرام کو حلال اور حلال کو حرام سمجھتے تھے۔ وہ پاکستانی صرف اس لئے کہلاتے ہیں کہ اس ملک میں پیدا ہوتے ہیں۔ فطری طور پر اُن کی محبت پاکستان سے نہیں، پیسے سے ہے۔ پیسہ خواہ ملک کی عزت بیچ کر حاصل کیا گیا ہو۔

خاوند کا اشارہ مل جانے سے سلیمہ ناز و انداز اور حسن و جوانی کے تمام تر ہتھیاروں سے لیس ہو کر میدان میں اُتری اور اُس نے اکرام کو ایک خطرناک فراڈ کی سزا سے بچانے کے بعد اُسے اگلے عہدے پر ترقی بھی دلا دی۔ اس سے اکرام کے اختیارات میں اضافہ ہو گیا اور اس

کے ساتھ ہی اُس نے سونے چاندی کی جو نہر نکالی تھی وہ اور بڑی ہو گئی اور اس کا بہاؤ بھی تیز ہو گیا۔

پاکستان میں جب کوئی افسر یا اہلکار رشوت خوری، جعل سازی، غبن وغیرہ کے جرم میں پکڑا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ پکڑنے والے دیانتدار اور محب وطن ہیں۔ دراصل انہیں پکڑے جانے والے کے خلاف ذاتی عناد ہوتا ہے یا انہیں پورا حصہ نہیں ملتا۔ غیر ملکی قرضوں، امدادی رقوم اور عُشر زکوٰۃ فنڈ وغیرہ میں سے جو خورد بُرد ہوتی ہے وہ کوئی بھی افسر یا اہلکار اکیلا نہیں کر سکتا۔ کرنے والا خواہ ایک ہی ہو، اُسے اُن ساتھیوں اور افسروں وغیرہ کو بھی حصہ وغیرہ دینا پڑتا ہے جو اُس کے ساتھ تعاون کرتے ہیں اور اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیتے ہیں اور پکڑے جانے کی صورت میں اُسے بچا لیتے ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک بھی فرد بگڑ جاتے تو بھانڈہ پھوٹ جاتا ہے۔

اکرام کا ہاتھ اتنا آگے نکل گیا تھا کہ خورد بُرد اور غبن سے ایک تو ملک کے ساتھ غداری کرتا تھا اور اس کے ساتھ ہی اپنے ساتھی افسروں اور اپنے محکمے کے وزیر تک کے ساتھ خیانت کر جاتا تھا۔ سب سے کم حصہ وزیر کو ملتا تھا کیونکہ وزیر جگہ جگہ تقریریں کرنے، اخباروں میں بیان اور تصویریں چھپوانے کے سوا کچھ نہیں جانتا تھا۔ اُسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اُس کے محکمے کی مشینری چلتی کیسے ہے۔ وہ تھوڑے سے حصے پر ہی خوش رہتا تھا۔

اکرام تجربہ کار فراڈیا تھا، لیکن وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ ملک کو دھوکہ دینا اور قومی خزانہ خالی کرنا آسان ہے اور پکڑے جانے کا خطرہ بھی کم ہے، لیکن اپنے ساتھی کو دھوکہ دینا بہت ہی خطرناک ہے۔ ایک ہی سال کے اندر اس کے خلاف ایک اور کیس بن گیا۔ یہ بھی پچھلے کیس کی طرح سنگین نوعیت کا تھا، لیکن سلیمہ نے اُسے پہلے کی طرح صاف بچا لیا۔ پہلے وہ سوات گئی تھی، اب وہ پورا ہفتہ مری میں رہی جب واپس آئی تو کیس ختم ہو چکا تھا۔

اکرام تو سلیمہ کا پجاری بن چکا تھا اور سلیمہ اکرام پر جان نثار کرتی تھی۔
پاکستان کے جس طبقے کی یہ کہانی ہے اس طبقے میں اسی کو محبت کہتے ہیں۔ لوگ جو کچھ کہتے ہیں وہ اس طبقے کے کانوں تک نہیں پہنچتا۔ اگر پہنچ بھی جاتے تو یہ طبقہ کہتا ہے ــــ "کس قدر پسماندہ ہیں یہ پاکستانی! اسی وجہ سے بھوکے مر رہے ہیں" ــــ سیاستدان اور حکمران بھی اسی طبقے کی پیداوار ہیں۔ وہ عوام کی طرف اسی لئے توجہ نہیں دیتے کہ عوام پسماندہ ہیں۔ سلیمہ کی کوششوں اور اس کی سرگرمیوں کی بدولت اکرام کا عہدہ اور تو نہ بڑھا لیکن اُس کا رُعب اور دبدبہ محکمے کے سب سے اونچے افسر سے بھی زیادہ ہو گیا۔ اس علاقے کے تھانیدار سے لے کر ڈی آئی جی تک اُسے سلام کرتے تھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ سلیمہ ان میں سے ہر ایک کے پاس جاتی اور انہیں اپنی حسین نسوانیت کے جال میں پھانس لیتی تھی۔ سلیمہ جانتی تھی کہ فلاں افسر کو مٹھی میں لے لیا جائے تو ایک درجن افسر ہاتھ میں آجاتے ہیں۔

اکرام نے ایک ایسا ہاتھ مارا کہ سارا مال خود ہضم کرنے کی کوشش میں پکڑا گیا۔ اس کے دو ساتھی افسروں نے اُسے کہا تھا کہ وہ مگرمچھوں سے بَیر نہ رکھے، لیکن سلیمہ کے اثر و رسوخ کی وجہ سے اُس کا دماغ زیادہ خراب ہو گیا تھا۔ سلیمہ نے اُسے بچانے کے لئے اپنی کارروائی شروع کر دی، لیکن اب اُس میں ایک کمزوری پیدا ہو چکی تھی۔ وہ یہ تھی کہ اُس کے پیٹ میں ایک بچہ پرورش پا رہا تھا اور یہ تیسرا مہینہ تھا۔ اس سے پہلے وہ ایک بچہ ایک بڑی ہی قابل لیڈی ڈاکٹر سے ضائع کروا چکی تھی۔ وہ اس بچے سے بھی نجات حاصل کرنا چاہتی تھی، لیکن اسی لیڈی ڈاکٹر نے اُسے کہا کہ اسے وہ کھیل نہ سمجھے۔ قدرت کے نظام کے ساتھ زیادہ کھیلنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ لیڈی ڈاکٹر نے کہا کہ جان جانے کا تو کوئی خطرہ نہیں، خطرہ یہ ہے کہ تولیدی نظام مجروح ہو جانے سے چہرے اور جسم پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔
یہ سُن کر سلیمہ نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ وہ اپنے چہرے اور جسم کی کشش کو خراب کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی کیونکہ یہی اُس کے ایٹمی

ہتھیار تھے۔
اکرام کو بچانے کی کارروائی میں اُسے ایک ایسے افسر سے ملنا پڑا جسے وہ پہلے کبھی نہیں ملی تھی کیونکہ اُسے اس جگہ آتے ہوتے ابھی ایک ہی مہینہ گزرا تھا۔ سلیمہ جب کسی اجنبی کو ملتی تھی تو چند منٹوں میں اجنبیت کی دیوار گرا دیتی تھی۔
"مسز اکرام!" ــــ اس نئے افسر نے اُسے کہا ــــ "میں جانتا ہوں آپ میرے پاس کیوں آئی ہیں۔ میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ مجھے آپ جیسی حسین اور جوان عورتیں بڑی اچھی لگتی ہیں، لیکن میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ آپ کس قدر رُسوا اور بدنام ہو چکی ہیں۔ افسروں اور اُن کے ماتحتوں کے حلقے میں آپ بڑی مہنگی طوائف کے نام سے مشہور ہیں۔ میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔ اگر آپ میرے ساتھ وہ کھیل کھیلنا چاہتی ہیں جو کھیلنے آئی ہیں تو میں آپ کا پورا پورا ساتھ دوں گا۔ کسی وقت، تھوڑا ہی عرصہ پہلے تک میں نے یہ کھیل بہت کھیلا ہے۔ پھر ایک المیہ ہوا۔ میرے گھر ایک بچہ پیدا ہوا اور ایک گھنٹے بعد مر گیا۔ اس کا مجھے ایسا صدمہ ہوا جیسے خدا نے میرے منہ پر تھپڑ مارا ہو.... اگر میں غلط نہیں کہہ رہا تو آپ مجھے اُمید سے نظر آتی ہیں"۔
"آپ نے ٹھیک نوٹ کیا ہے" ــــ سلیمہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ــــ "میں اُمید سے ہوں اور یہ چوتھا مہینہ ہے"۔
"اس بچے پر رحم کریں" ــــ نئے افسر نے کہا ــــ "اس معصوم کو جو ابھی پیدا نہیں ہوا، گناہوں کی غلاظت سے بچا کر رکھیں.... جب بچہ پیدا ہو چکے اور آپ از سر نو صحت یاب ہو جائیں تو پھر میرے پاس آئیں۔ میں آپ کو صاف الفاظ میں بتا رہا ہوں کہ اب کے اکرام صاحب نہیں بچ سکیں گے۔ نہ بچ سکنے کی وجہ یہ نہیں کہ انہوں نے قرضے کی رقم خورد برد کر کے اپنے ملک کو دھوکہ دیا ہے بلکہ اُنہوں نے ایک ایسے افسر کو بھی دھوکہ دیا ہے جس کے ہاتھ میں زیادہ اختیارات ہیں اور اُسے اکرام صاحب پہلے بھی دھوکہ دے چکے ہیں۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں محبِ وطن بن کر آپ

کو پند و نصیحت کر رہا ہوں۔ میں ایسی بات نہیں کہوں گا کہ پاکستان شہیدوں کی سرزمین ہے یا یہ قرآن کی سرزمین ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ہم جیسے افسروں، وزیروں، جاگیر دار حکمرانوں اور آپ جیسی عورتوں کی سرزمین بن چکی ہے۔ میں آپ کو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ جو بچہ آپ کے وجود میں پرورش پا رہا ہے اس پر رحم کریں اور اپنے آپ پر بھی رحم کریں۔ اکرام صاحب کے لئے تمام دروازے بند ہو چکے ہیں۔ صرف ایک دروازہ کھلا ہے اور وہ جیل کا دروازہ ہے۔"

سلیمہ نے پھر بھی اپنی کارروائی جاری رکھی اور اس دوران ہی اکرام کے خلاف کیس بن گیا اور یہ کیس اینٹی کرپشن کورٹ میں چلا گیا۔ سلیمہ نے دوست تو بہت بنا لئے تھے، لیکن ایک سو دوستوں کے مقابلے میں دشمن ایک ہی کافی ہوتا ہے۔ ان کا جو کوئی بھی دشمن تھا، اُس نے کیس کی عدالتی کارروائی کو اتنا تیز کرا دیا کہ ڈیڑھ دو مہینوں میں ہی شہادتیں بھگت گئیں اور اکرام کو چار سال قید بامشقت مل گئی۔

اس کے بعد سلیمہ نے ایک بچی کو جنم دیا جس کا نام راشدہ رکھا اور جو نوجوانی میں رِشی کہلانے لگی۔ رِشی تین سال کی ہو گئی تو اُس نے اپنے باپ کو دیکھا جو اب افسر نہیں بلکہ سزا یافتہ تھا۔ سلیمہ کو اکرام کی غیر حاضری میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ اُس کے ہاں دولت کے انبار لگے ہوتے تھے۔ جائیداد بھی بنا لی گئی تھی۔ اکرام نے آکر اپنا کاروبار شروع کر دیا اور سلیمہ کے نازو انداز اور شب و روز ویسے ہی رہے جیسے پہلے تھے۔ رِشی نے اپنی ماں سے بہت کچھ سیکھا لیکن اپنے آپ کو اتنا سستا اور رُسوا نہ کیا۔ سیکھا تو صرف یہ کہ عورت آزاد رہنے کے لئے پیدا ہوتی ہے اور شادی کر کے بھی عورت کو آزاد رہنا چاہیئے۔

لڑکپن سے نکل کر جب اُس نے نوجوانی میں قدم رکھا تو وہ اپنے طبقے کے نوجوانوں کی ماڈرن اور مادر پدر آزاد سوسائٹی میں شامل ہو گئی۔

اکرام رِشی کی شادی کے چھ مہینے پہلے اچانک دل کے کسی عارضہ میں

مبتلا ہو کر مر گیا تھا۔ سلیمہ بڑھاپے میں داخل ہو چکی تھی، لیکن میک اَپ کر کے اور ٹاٹ کپڑے پہن کر رِشی کی ہم عمر بننے کی کوشش کرتی تھی۔ اُس نے رِشی پر کوئی پابندی عائد نہیں کی تھی۔ اُسے یہ سبق دیا تھا کہ اپنے آپ کو جنسِ نایاب کس طرح بنایا جاتا ہے۔ اس سبق پر رِشی نے پورا پورا عمل کیا تھا۔

❦

رابی کے والدین رِشی اور رابی کی شادی پر کوئی زیادہ خوش نہیں تھے کیونکہ وہ اکرام کو اور سلیمہ کو بڑی اچھی طرح جانتے تھے۔ رابی کا باپ بھی حکومت کے ایک بڑے ہی اہم اور حساس محکمے کا افسرِ اعلیٰ تھا۔ اُس کی امارت میں رشوت کا عمل دخل نہیں تھا کیونکہ اس محکمے میں حرام خوری کی گنجائش بہت کم تھی۔ کھانے والے تو کھا ہی لیتے تھے، لیکن رابی کا باپ آبائی جائیداد اور زرخیز نہری زمین کا مالک تھا۔ اُس کا پیٹ بھرا ہُوا تھا۔ ویسے اخلاقی لحاظ سے اُس کی اور اُس کی بیوی کی یہ حالت تھی کہ اپنے اکلوتے بیٹے رابی کو آوارہ گھومتے پھرتے اور کار کو شہر میں اُڑاتے پھرتے اور کبھی ایک دو لڑکیوں کو ساتھ لئے دیکھتے تو بہت خوش ہوتے تھے کہ ان کا بیٹا شہزادہ ہے اور بڑا ہو کر وزیر تو ضرور بنے گا۔ اُنہوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا کہ کوٹھی کے اُوپر والے کمرے میں جب رابی کے دوست رات کو اکٹھے ہو کر وی سی آر پر فلم دیکھتے ہیں تو یہ کیسی فلم ہوتی ہے۔ رابی باپ کا ریوالور لے کے نکلتا تو ماں بہت ہی خوش ہوتی تھی، لیکن بیٹے نے جب کہا کہ وہ رِشی کے ساتھ شادی کرے گا تو ماں باپ کچھ خوش نہ ہوتے۔ اُنہوں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی کہ رِشی بڑے ہی بدنام ماں باپ کی بیٹی ہے، لیکن رابی نے وہ اودھم مچایا کہ اس کے والدین نے ہتھیار ڈال دیئے۔

رابی اور رِشی کی شبِ عروسی گزر گئی۔ اگلی شام اُسی ہوٹل میں ولیمے کا اہتمام تھا جس میں ان کی شادی ہوئی تھی۔ ہوٹل کے باہر دُور دُور تک کاریں کھڑی تھیں۔ چونکہ رابی کا باپ مرکزی حکومت کا افسرِ اعلیٰ تھا اس لئے تمام مرکزی وزیر ولیمے میں مدعو تھے۔ اُس رات اس ہوٹل میں مدعوئین کے بیٹوں

میں جو کھایا گیا اور اس کے علاوہ جو کھانا ضائع ہوا اس سے بہت سے غریب کنبے پیٹ بھر سکتے تھے۔ ولیمے کا یہ اہتمام اس لئے نہیں کیا گیا تھا کہ یہ سنتِ رسولؐ ہے بلکہ اس لئے کہ یہ بھی ایک موقع تھا جس سے رابی کا باپ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو دکھا سکتا تھا کہ وہ کتنا امیر آدمی ہے۔ یہ عرب کے کسی شیخ یا شہزادے کی دعوت معلوم ہوتی تھی۔

پولیس کے براس بینڈ کے علاوہ رابی اور رِشی کے دوستوں نے اپنے آرکسٹرا کے لئے ہال کے اندر الگ سٹیج بنایا اور ڈسکو اور پاپ میوزک اور انگریزی گانوں کا اُودھم مچایا تھا۔ لڑکوں نے دھما چوکڑی بھی کی تھی جسے ڈانس کہا جاتا ہے۔

اب مسئلہ ہنی مون کا تھا کہ کہاں جا کر منایا جائے۔ مری اور سوات برف سے ڈھکے ہوئے تھے اس لئے رابی اور رِشی نے کراچی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ولیمے کے اگلے روز وہ جہاز میں سوار ہوئے اور کراچی کے ایک بڑے مغربی طرز کے ہوٹل میں جا ٹھہرے۔

کراچی میں ایک ہی سیرگاہ ہے اور وہ ہے سمندر۔ رابی اور رِشی نے لانچ کرائے پر لے کر سمندر کی بہت سیر کی۔ ایک روز وہ ہاکس بے چلے گئے جو سمندر کے کنارے ایک اچھی سیرگاہ ہے اور وہاں کمرے کرائے پر مل جاتے ہیں۔ یہ جوڑا چکن روسٹ کے ساتھ فرانس کی بہترین شراب کی ایک بوتل بھی ساتھ لے گیا تھا۔

❦

انہوں نے ایک کمرہ جو ہٹ کہلاتا ہے، شام تک کرائے پر لے لیا۔ وہ اس کمرے میں داخل ہو رہے تھے کہ انہوں نے ایک جوڑا دیکھا۔ آدمی کی عمر تیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ خوبصورت آدمی تھا اور اس کا لباس رابی اور اس جیسے نوجوانوں جیسا تھا۔ اُس کے ساتھ ایک لڑکی تھی جس کی عمر تیئس چوبیس سال ہوگی۔ وہ بالوں کی تراش اور لباس اور چال ڈھال سے ماڈرن لڑکی لگتی تھی۔

"رِشی!" ــــ رابی نے اس جوڑے کی طرف اشارہ کر کے کہا ــــ "ان دونوں کو کل سے اب تک مَیں چار مرتبہ دیکھ چکا ہوں۔"

"ہاں رابی" ــــ رِشی نے کہا ــــ "ہم جہاں بھی گئے وہاں انہیں ضرور دیکھا۔ ایسے لگتا ہے کہ یہ ہمارے پیچھے پیچھے آ رہے ہیں۔ یہ بھی ہماری طرح سیر سپاٹے کے لئے آئے ہوں گے۔ یہاں سے واقف نہیں ہوں گے اور کہتے ہوں گے کہ جدھر ہم جائیں ادھر یہ بھی چلے چلیں۔"

"لڑکی خوبصورت ہے" ــــ رابی نے کہا۔

"آدمی بھی ٹھیک ٹھاک ہے" ــــ رِشی بولی۔

اتنے میں وہ جوڑا قریب آگیا۔ رابی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پیچھے دیکھا تو وہ آدمی مسکرایا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ انہیں ملنا چاہتا تھا۔ لڑکی بھی مسکرائی۔ رابی دروازے میں ہی رُک گیا اور اُس نے ان دونوں کی مسکراہٹوں کا جواب مسکراہٹ سے دیا۔ وہ دونوں اُس کی طرف آئے۔ اُس نے رِشی کو بھی باہر بلا لیا۔ وہ دونوں جوڑے تپاک سے ملے۔

"آپ شاید ہنی مون منانے آئے ہیں" ــــ اُس آدمی نے مسکراتے ہوئے رابی اور رِشی سے کہا۔

"یہ آپ نے کیسے جانا؟" ــــ رابی نے ہاتھ اس آدمی کی طرف پھیلاتے ہوئے کہا ــــ "ہمارے ہاتھوں پر مہندی نہیں لگی ہوئی نہ میرے سر پر دُولہا والی طُرّے دار پگڑی ہے۔ اسے دیکھ لو۔ اس نے سُرخ جوڑا نہیں پہنا ہوا ....."

"آپ کے انداز بتاتے ہیں کہ آپ ابھی میاں بیوی نہیں بلکہ دُولہا اور دُلہن ہیں" ــــ اُس آدمی کی ساتھی لڑکی نے کہا ــــ "ہم بھی ہنی مون منانے آئے ہیں اور ہم بھی آپ والے ہوٹل میں ٹھہرے ہیں۔"

"آپ نے ٹھیک پہچانا" ــــ رابی نے ہنستے ہوئے کہا ــــ "ہم ہنی مون منانے آئے ہیں۔ میرا نام رب نواز ہے۔ آپ مجھے رابی کہہ سکتے ہیں۔ یہ راشدہ ہے۔ ہم اسے رِشی کہتے ہیں۔"

"میرا نام عزیز ہے" — اُس آدمی نے جواب دیا — "اور یہ مریم ہے"۔

عزیز اور مریم بھی اپنے ساتھ کھانے پینے کا سامان لاتے تھے۔ رابی کے کہنے پر وہ انہی کے کمرے میں آ گئے۔ کچھ دیر بعد دونوں جوڑوں نے محسوس کیا کہ انہیں بڑا اچھا ساتھ مل گیا ہے۔ عزیز اور مریم صحیح معنوں میں زندہ دل تھے۔ عزیز کی عمر تو تیس سال تھی، لیکن اس کی باتیں اور حرکتیں رابی اور رشی جیسی تھیں۔ اُنہوں نے فرق صرف یہ رکھا کہ جب کھانے بیٹھے تو عزیز نے کہا کہ وہ وہسکی نہیں پیتا۔

کھانے سے فارغ ہو کر وہ سمندر کی سیر کو نکل گئے اور شام تک بھاگتے دوڑتے اور پانی میں کھیلتے رہے۔ شام کو چاروں اکٹھے ہوٹل میں واپس آئے۔ وہ اس قدر تھکے ہوئے تھے کہ بے سُدھ سو گئے اور رات گزر گئی۔ اگلے دن دس گیارہ بجے عزیز نے رابی کو کمرے میں فون سے پوچھا کہ وہ جاگ اُٹھے ہیں یا نہیں۔ وہ اُسی وقت جاگ گئے تھے۔ رابی نے انہیں اپنے کمرے میں بلا لیا اور وہیں ناشتہ منگوایا۔

رابی کے پوچھنے پر عزیز نے بتایا کہ اُس کے اور اُس کی دُلہن کے باپ دادا جالندھر کے رہنے والے تھے اور ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے اِدھر آ گئے تھے اور پشاور میں آباد ہوتے تھے۔ دونوں کے باپ کاروباری لوگ تھے۔ عزیز انہیں بڑے پیمانے کے تاجر بتاتا تھا۔

دونوں جوڑوں کی دوستی ایک دن میں ہی اتنی گہری ہو گئی جیسے وہ بچپن کے ساتھی ہوں۔ کمرے میں انگریزی گانوں کے کیسٹ لگا کر ناچتے بھی رہے گاتے بھی رہے۔ زیادہ تر انگریزی اور ذرا ذائقہ بدلنے کے لئے تھوڑی تھوڑی اُردو بھی بولتے رہے۔

تین چار دنوں بعد ان کی جذباتی حالت یہ تھی جیسے دونوں جوڑے ایک دوسرے پر عاشق ہو گئے ہوں۔ وہ کراچی میں آٹھ دن رہے۔ صرف سونے کے وقت الگ ہوتے تھے۔ عزیز اور مریم نے رابی اور رشی پر طلسم

طاری کر دیا تھا۔ انہوں نے اپنے کمروں میں دو تین بار ڈانس بھی کیا جو مرد اور عورت بغلگیر ہو کر کرتے ہیں۔ اس میں یہ آزادی ہوتی ہے کہ کوئی مرد کسی بھی عورت کو بازوؤں میں لے کر اس ڈانس میں شریک ہو سکتا ہے بلکہ اس ڈانس کا اصول یہی ہے۔ اس کے مطابق رشی عزیز کے بازوؤں میں اور مریم رابی کے بازوؤں میں ہوتی تھی۔

اس ڈانس کے دوران کوئی آدمی اپنے بازوؤں میں لی ہوئی کسی اور کی بہن، بیٹی یا بیوی کے ساتھ کوئی بیہودہ یا اخلاق سے گری ہوئی حرکت نہیں کر سکتا۔ ایک دوسرے کی بیویوں کے ساتھ بغلگیر ہونے کو یہ لوگ اخلاق سے گری ہوئی حرکت نہیں سمجھتے۔ اس جوڑے نے جب دوسری بار انگریزی آرکسٹرا کا ایک کیسٹ لگا کر یہ ڈانس کیا تو رابی نے محسوس کیا کہ مریم اپنا جسم رابی کے جسم کے ساتھ ڈانس کے اصول کے خلاف پوری طرح لگانے کی کوشش کرتی ہے۔ رابی کے لئے اپنی کلاس کی کسی بھی لڑکی کی ایسی حرکت عجیب نہیں تھی اور معیوب بھی نہیں تھی۔ رابی نے مریم کو کچھ زیادہ ہی اپنے ساتھ لگا لیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا۔ مریم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی جو رسمی یا زبردستی لائی ہوئی مسکراہٹ نہیں تھی۔

"تم مجھے کیوں اچھے لگتے ہو رابی؟" — مریم نے سرگوشی میں پوچھا۔

رابی نے اس سوال کا جواب ایک خاص قسم کی مسکراہٹ سے دیا اور اُس کے گرد لپٹے ہوئے اپنے بازو کا گھیرا اور زیادہ تنگ کر دیا۔ کیسٹ پلیئر کی آواز اتنی اونچی تھی کہ مریم کی سرگوشی رابی کے سوا کوئی نہیں سُن سکتا تھا۔

ڈانس کے بعد وہ بیٹھ گئے۔

"کوئی ہمیں ڈانس کی حالت میں دیکھ لے تو کیا کرے؟" — عزیز نے پوچھا۔

"پولیس کو اطلاع دے دے" — رابی نے کہا — "اور پولیس

آکر ہمیں اِس جرم میں گرفتار کرلے کہ ہم نازیبا حرکتیں کر رہے تھے۔"

"اس ہوٹل میں پاکستانی پولیس داخل نہیں ہوسکتی" ——— عزیز نے کہا ——— "یہ انٹرنیشنل ہوٹل ہے .... رابی! اپنے ملک کے خلاف بات تو نہیں کرنی چاہیئے لیکن ہم ملک کے کسی دشمن کے ساتھ بات نہیں کر رہے۔ تم سچے دل سے بتاؤ کہ اپنے ملک کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟"

"کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ پاکستان کے متعلق میری رائے اچھی ہوگی؟" ——— رابی نے کہا ——— "کیا اس سے زیادہ غلیظ اور گنوار ملک کوئی اور ہوگا؟ اس ملک کی مڈل کلاس اور لوئر کلاس کو دیکھ لو۔ یہ لوگ جن آبادیوں میں اور جن گھروں میں رہتے ہیں وہ دیکھ لو۔ ایک آیا تھا جس نے جاگیرداری اور سرمایہ داری کا نعرہ لگایا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ وہ سب کو روٹی کپڑا اور مکان دے گا۔ لوگ صرف روٹی کپڑے کی خاطر اُس کے ساتھ ہو گئے۔"

"اگر ان لوگوں کو جنہیں عوام کہا جاتا ہے، کہیں سے دولت مل جائے تو سب سے پہلے کاریں خریدیں گے اور کوٹھیاں بنائیں گے" ——— عزیز نے کہا ——— "اب کاروں اور کوٹھیوں والوں کو مُردہ باد کہتے ہیں۔"

"اگر ان میں سے دو آدمیوں کو ایک جاگیر دکھا کر کہا جائے کہ دونوں میں سے کوئی ایک اس جاگیر کا مالک بن جائے" ——— رشی نے کہا ——— "تو دونوں بھول جائیں گے کہ وہ جاگیرداری مُردہ باد کے نعرے لگایا کرتے ہیں۔ وہ جاگیر کی خاطر ایک دوسرے کا خون بہا دیں گے۔"

"پھر اسلام آگیا" ——— عزیز نے کہا ——— "اور مولوی مُلّا برساتی کیڑوں کی طرح نکل آئے۔"

"انہوں نے پہلا فتویٰ یہ دیا کہ عورت گھر سے باہر نہیں نکل سکتی" ——— مریم بولی ——— "پھر یہ کہ مرد جب چاہے بیوی کو زبانی ایک دو تین کہہ کر گھر سے باہر پھینک سکتا ہے۔ وہ ایک بیوی کی موجودگی میں ایک اور بلکہ تین اور بیویاں لاسکتا ہے۔"

"تم ہی بتاؤ رابی!" ——— رشی نے کہا ——— "اگر قانون بن جائے کہ عورت وہی باہر نکلے گی جو بُرقعے میں ہوگی تو کیا تم مجھے بُرقعے میں لپیٹ دو گے؟"

"میں یہ ملک چھوڑ کر چلا جاؤں گا" ——— رابی نے کہا۔

"کہاں جاؤ گے؟" ——— مریم نے پوچھا۔

"یونائیٹڈ سٹیٹس!" ——— رابی نے کہا۔

"اتنی دُور کیوں جاتے ہو بھائی!" ——— عزیز نے کہا ——— "یہیں سے سرحد پار کر کے انڈیا چلے جاؤ۔ آزادی ہی آزادی ہے۔"

یہاں سے انڈیا کی باتیں چل نکلیں۔ عزیز اور مریم نے انڈیا کی جو تعریفیں شروع کیں تو اسے امریکہ اور یورپ سے بھی اُوپر چڑھا دیا۔ وہ صرف آزادی چاہتے تھے ——— اخلاقیات سے آزادی، مذہب سے آزادی، حیوانوں جیسی آزادی ——— عزیز کہتا تھا کہ یہ آزادی انڈیا میں مل سکتی ہے۔ وہاں ہندو ہیں، اینگلو انڈین ہیں، انڈین کرسچن ہیں۔ جگہ جگہ کلب ہیں۔ ہم تم جیسوں کے لئے ڈسکو کلب ہیں۔ وہاں جو جی چاہے کرو۔ وہاں ایک سے ایک خوبصورت لڑکی آتی ہے۔ شراب ہے۔ وہاں نازیبا حرکتیں جرم نہیں، اور وہ سستا ملک ہے۔ امریکہ کی طرح مہنگا نہیں۔

"تم کبھی انڈیا گئے ہو؟" ——— رابی نے عزیز سے پوچھا۔

"میں تو ہر سال جاتا ہوں" ——— عزیز نے جواب دیا ——— "ہمارے رشتہ دار وہیں رہتے ہیں۔ اُن سے ملنے کے لئے بڑی آسانی سے ویزا مل جاتا ہے۔ کبھی تم دونوں کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤں گا .... تم اگر ناراض نہ ہو جاؤ تو دل کی بات کہہ دوں۔ میں بھی پاکستانی ہوں اور مسلمان ہوں لیکن کبھی کبھی تو افسوس ہوتا ہے کہ میں پاکستان میں کیوں پیدا ہوا۔"

"میں ناراض کیوں ہوں گا؟" ——— رابی نے کہا ——— "میں تو سوچا کرتا ہوں کہ پاکستان بنایا ہی کیوں گیا تھا؟ بنانے والوں کا تو کچھ نہیں گیا۔ سزا ملی تو اُن مسلمانوں کو جو انڈیا میں مارے گئے اور اُن ہندوؤں اور سکھوں

کو جو پاکستان میں مارے گئے۔"

"میں فورتھ ایئر میں تھا" —— عزیز نے کہا —— "ایک روز ہسٹری کے پروفیسر نے پاکستان کی ہسٹری شروع کر دی۔ کہنے لگا کہ پاکستان کا مطلب کیا، لا الٰہ الا اللہ ..... وہ ایک گھنٹہ بولتا رہا، خدا کی قسم، میرے دماغ میں یہ لا الٰہ الا اللہ کا مطلب نہ بیٹھا۔ میرے پلّے کچھ پڑا ہی نہیں۔"

"سب مولویوں کی چکر بازی ہے یار!" —— رابی نے کہا۔

"رابی اور رشی!" —— مریم نے کہا —— "ہم تمہیں انڈیا ضرور لے جائیں گے۔ یہاں تو ایک مری ہے یا سوات ہے۔ وہاں شملہ، ڈلہوزی، مسوری، اور ایسے ایسے ہل سٹیشن ہیں کہ دیکھ کر حیران رہ جاؤ۔ نادرن انڈیا کا اپنا حُسن ہے، سنٹرل انڈیا کے جنگلات دیکھو تو کھو کر باقی عمر وہیں گزار دیں ..... تم واپس پاکستان نہیں آنا چاہو گے۔"

عزیز اور مریم نے رابی اور رشی پر ہندوستان کا ایسا طلسم طاری کر دیا کہ آدھی رات کے بعد وہ اپنے کمرے میں آتے تو انڈیا کی ہی باتیں کرتے رہے۔ وہ پاکستان کو پہلے ناپسند کرتے تھے، اب یہ ناپسندیدگی نفرت کی صورت اختیار کر گئی۔ عزیز اور مریم انہیں پہلے سے زیادہ اچھے لگنے لگے۔

کچھ دیر بعد رشی سو گئی۔ رابی کو ابھی نیند نہیں آتی تھی۔ اُس کے ذہن میں مریم کے الفاظ گونجنے لگے —— "تم مجھے کیوں اچھے لگتے ہو رابی!" —— وہ یوں محسوس کرنے لگا جیسے مریم کا جسم ابھی تک اُس کے ساتھ لگا ہُوا ہو۔ اپنی بیوی اور مریم کے خاوند کو دھوکہ دینا کوئی جرم نہیں تھا پھر بھی تنہائی اور رازداری لازمی تھی۔ یہ لوگ ایک دوسرے کے چال چلن کو جانتے ہوتے بھی ظاہر کرتے تھے کہ وہ کچھ نہیں جانتے۔ شادی کی پہلی رات رابی نے رشی سے اور رشی نے رابی سے نہیں پوچھا تھا کہ شادی سے پہلے اُس کی دوستی کس کس کے ساتھ رہی ہے۔ رابی اور مریم کا ایک دوسرے کو پسند کرنا اور درپردہ دوستی لگا لینا ان کے ہاں معیوب نہیں تھا۔ مشکل

یہ پیدا ہو گئی تھی کہ مریم شادی شدہ تھی اور اُس کا خاوند اُس کے ساتھ تھا۔

وہ آٹھ دن کراچی میں رہے۔ ان کا معمول وہی رہا جو ہر روز ہوتا تھا —— کسی طرف سیر کے لئے نکل جانا، رات کو کمرے میں کیسٹ لگا کر ناچنا، اُچھل کود کرنا —— عزیز پاکستان کے خلاف بولنے کا موقع پیدا کر لیتا اور انڈیا کو فردوسِ بریں بنا دیتا تھا۔ مریم زیادہ تر ڈانس کی فرمائش کرتی اور رابی کے ساتھ ڈانس کرتی تھی۔

ایک روز مریم نے رابی کے ساتھ تنہائی کی ملاقات کا موقعہ پیدا کر ہی لیا۔ دن کا پچھلا پہر تھا رشی کھانے کے بعد یہ کہہ کر سو گئی تھی کہ وہ بہت تھکی ہوتی ہے، اُسے شام تک جگایا نہ جائے۔ وہ جب گہری نیند سو گئی تو رابی عزیز اور مریم کے کمرے میں چلا گیا۔ مریم نے اُسے پہلے ہی بتا رکھا تھا کہ عزیز آج شاپنگ کے لئے اکیلا جا رہا ہے۔

"رابی!" —— مریم نے کہا —— "میں بے شک تمہاری ہی کلاس کی لڑکی ہوں اور عام لوگوں نے ہماری کلاس کو بہت ہی بدنام کر رکھا ہے، لیکن میں اپنی عزت اور آبرو کے معاملے میں بہت حسّاس ہوں۔ مجھے اُن لڑکیوں جیسا نہ سمجھنا جو دوستیاں لگاتی اور بدلتی رہتی ہیں، لیکن تم میں نہ جانے کیا کشش ہے کہ میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو گئی ہوں۔"

"کیا تمہیں عزیز اچھا نہیں لگتا؟"

"اچھا نہ لگتا تو اس کے ساتھ شادی کیوں کرتی!" —— مریم نے جواب دیا —— "وہ ہر لحاظ سے اچھا ہے، لیکن اس کا اپنا مقام ہے اور تمہیں میں کوئی اور مقام دے رہی ہوں۔"

رابی اور مریم راز و نیاز کی باتیں اور حرکتیں کرتے رہے پھر اس ڈر سے کہ عزیز نہ آ جائے رابی اُٹھ کھڑا ہُوا۔

"لاہور میں میری ایک کزن ہے" —— مریم نے کہا —— "مجھ سے ڈیڑھ دو سال چھوٹی ہے۔ اگر لاہور میں تمہارے ساتھ ملاقات ہوتی تو اُس

کے ساتھ تمہارا تعارف کراؤں گی۔ اُسے دیکھ کر تم کہو گے کہ کوئی لڑکی اتنی خوبصورت بھی ہو سکتی ہے۔"

"میں تمہیں اور عزیز کو اپنے گھر مدعو کروں گا" — رابی نے کہا — "کزن کو بھی ساتھ لے آنا۔"

ایک مہینہ بعد عزیز، مریم اور اُس کی کزن رابی کے گھر بیٹھے ہوتے تھے۔ کراچی میں وہ صرف آٹھ دن رہے تھے۔ کراچی میں ہی اُنہوں نے لاہور کی اس ملاقات کا دن طے کر لیا تھا۔ عزیز اور مریم کو رابی نے لاہور مدعو کیا تھا، لیکن اُس کے پاس ٹھہرنے کی بجائے وہ ایک ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔

مریم کی کزن نبیلہ اُتنی ہی حسین تھی جتنی مریم نے بتائی تھی۔ وہ بھی رابی اور رشی کے ساتھ بڑی جلدی بے تکلف ہو گئی۔ اُس کی نظروں سے صاف پتہ چلتا تھا کہ اُس کی دلچسپی رابی کے ساتھ ہے۔ رابی بہت خوش تھا کہ اُس کی دوستیوں میں ایک بڑا ہی حسین اضافہ ہُوا ہے۔

انہوں نے رات کا کھانا رابی کے ہاں کھایا اور اگلے روز صبح شالامار میں ملاقات کا وقت طے کر لیا۔ رابی انہیں ہوٹل میں ڈراپ کرنے کے لئے اپنی گاڑی میں لے گیا۔ وہ ہوٹل تک پہنچے تو رابی اور رشی ان کا کمرہ دیکھنے کے لئے چل پڑے۔ عزیز نے رشی اور نبیلہ کو ساتھ لے لیا اور ذرا آگے نکل گیا۔ مریم پیچھے رابی کے ساتھ رہی۔

"کیسی ہے میری کزن؟" — مریم نے پوچھا۔

"جیسی تم نے بتائی تھی" — رابی نے جواب دیا — "اب اگلی بات کرو۔ اکیلے مل سکتی ہے؟"

"نہیں" — مریم نے کہا — "اتنی آسانی سے نہیں۔ اسے معلوم ہے کہ یہ کتنی خوبصورت ہے اور اس کی خوبصورتی کی قیمت کیا ہے۔"

"جو قیمت مانگے گی دوں گا" — رابی نے کہا۔

"یہ طوائف تو نہیں بیوقوف!" — مریم نے کہا — "یہ اتنی شریف بھی نہیں۔ مل جائے گی، لیکن بڑی محنت اور کوششوں سے ہی ملے گی۔

ہم کچھ دن یہیں رہیں گے۔"

اگلی صبح یہ پارٹی شالامار میں گھوم پھر رہی تھی اور فوٹو گرافی ہو رہی تھی۔ کچھ دیر بعد مریم کے کہنے پر رشی اور نبیلہ ایک گھنے درخت کے نیچے بیٹھ گئیں۔ عزیز رابی کو ذرا آگے ایک اور درخت کے پیچھے لے گیا۔

"تم کوئی کام دھندا بھی کرتے ہو رابی؟" — عزیز نے پوچھا — "یا باپ کی کمائی اور جائیداد پر عیش کر رہے ہو؟"

"ابھی تک تو یہی ہو رہا ہے" — رابی نے جواب دیا — "ڈیڈی نے مجھے آرمی کمشن کے لئے سیلیکٹ کرا کے کاکول اکیڈمی میں بھجوا دیا تھا۔"

"ہاں یار!" — عزیز نے کہا — "تمہارے ڈیڈی کی اتنی پاور ہے کہ وہ جسے چاہیں سیلیکٹ کروا سکتے ہیں۔ آرمی نیوی اور ایئر فورس تمہارے ڈیڈی کے ہاتھ میں ہیں ... پھر کیا ہُوا؟"

"پھر یہ ہُوا کہ تین مہینے پورے نہیں ہوتے تھے کہ میں گھر آ گیا" — رابی نے کہا — "اتنی سخت ٹریننگ کہ انسان کو انسان ہی نہیں سمجھتے۔ حکم یوں دیتے تھے جیسے بندر کو نچایا جاتا ہے۔ میں اپنا رہن سہن اور اپنی عادتیں تو نہیں بدل سکتا تھا۔ آٹھ دس دنوں بعد تو وہ بال کٹوانے کو کہتے تھے۔ میں اتنی جلدی جلدی بال نہیں کٹواتا تھا۔ انسٹرکٹر بدتمیزی سے بولتے تھے۔ مجھ سے بدتمیزی برداشت نہیں ہوتی تھی۔ ایک روز مجھے دفتر میں بلا لیا گیا۔ ایک لیفٹیننٹ کرنل نے مجھے کہا کہ آرمی میں شہزادوں کی ضرورت نہیں اور یہ مہاراجہ پٹیالہ کی فوج نہیں اور یہ فوج تمہارے لئے نہیں۔ تم بوریا بستر باندھو اور گھر چلے جاؤ .... میں نے اس کرنل کو سلیوٹ بھی نہ کیا اور اُس کے دفتر سے یوں دوڑتا ہُوا نکلا جس طرح بچے کلاس سے چھٹی کے وقت نکلتے ہیں۔"

"ڈیڈی نے کچھ کہا تھا؟"

"ڈیڈی نے صرف جُوتے نہیں مارے تھے" — رابی نے ہنستے

ہوتے کہا ——"باقی کوئی کسر چھوڑی نہیں تھی۔ ممی میرے حق میں تھیں۔
وہ کہتی تھیں کہ میں اپنے شہزادے بیٹے کو فوج میں نہیں جانے دوں
گی .... میں نے یہ بھی سوچا تھا ڈیئر عزیز! میں کیوں اس ملک کے ڈیفنس
میں موریچوں میں جا بیٹھوں اور میری ممی کو میری لاش ملے؟ اس ملک کے
ساتھ میری کیا دلچسپی ہو سکتی ہے جہاں میں اپنی گرل فرینڈ یا بیوی کے بازو
میں بازو ڈال کر باہر چل بھی نہیں سکتا۔ کیا میں ہی اس ملک کے لئے قربانی
کا بکرا رہ گیا ہوں؟"

"بات تو تم نے ٹھیک کہی ہے" —— عزیز نے کہا ——"اس
پاکستان کا ڈیفنس کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اگر یہ پھر پورے کا پورا
انڈیا بن جاتے تو اتنی آزادی مل جاتے گی کہ گرل فرینڈ کے بازو میں بازو
ڈال کر نہیں بلکہ اُسے گود میں اُٹھا کر بھی آزادی سے گھوم پھر سکو گے۔ یہاں
تو یہ حال ہے کہ تمہارے ہاتھ میں وہسکی کی خالی بوتل ہو گی تو بھی تمہیں تھانے
لے جائیں گے .... بہرحال تم نے یہ تو اچھا کیا کہ وہاں سے نکل آتے لیکن
تمہیں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا .... لیکن تمہیں کچھ کرنے کی ضرورت ہی
کیا ہے۔ تمہارے ڈیڈی کی اتنی زیادہ جائیداد ہے جس کے تم اکیلے
وارث ہو۔"

"جائیداد والا معاملہ بھی کچھ ایسا ویسا ہی ہے" —— رابی نے کہا ——
"ڈیڈی کے تین بھائی ہیں۔ وہ بھی اس کے حصّہ دار ہیں۔ ان تین بھائیوں میں
دو اصل فراڈیتے ہیں پھر ڈیڈی نے مجھے کہہ دیا ہے کہ جب تک اپنی کوئی
پوزیشن نہیں بناؤ گے اور خود کچھ کرنے کے قابل نہیں ہو جاؤ گے، جائیداد
کی وراثت سے محروم رہو گے۔ ڈیڈی نے مجھے کہا تھا کہ کنسٹرکشن کمپنی بنا
لو اور ٹھیکے میں دلاؤں گا۔ وہ کہتے تھے کہ ڈیفنس کنسٹرکشن کا کروڑوں
روپوں کا کام دلا دیں گے۔ انہوں نے مجھے ایک پُرانے ٹھیکیدار کے
ساتھ لگا بھی دیا لیکن صرف ایک روز دھوپ میں کھڑا رہنا پڑا اور کام
کرنے والوں کے ساتھ جھک جھک کرنی پڑی اور میں نے ٹھیکیدار کی

باتیں سُنیں کہ یہ کام کتنی بھاگ دوڑ کا ہے تو میں نے ڈیڈی سے کہہ دیا کہ
یہ کام مجھ سے نہیں ہو گا۔ پھر میری شادی ہو گئی۔"

" مجھے بتاؤ" —— عزیز نے کہا ——"تم چاہتے کیا ہو ....
"EASY MONEY?

"ہاں یار!" —— رابی نے جواب دیا ——"وہ دولت جو آسانی
سے ملے اور بارش کی طرح برسے۔"

"مل سکتی ہے!" —— عزیز نے رابی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال
کر معنی خیز لہجے میں کہا ——"برس بھی سکتی ہے، لیکن تم وہ کام نہیں کرو
گے۔ اگر کرو تو یہ ایسا ہی ہے جیسے لاکھوں روپے کی لاٹری نکل آتی ہو۔
پھر یہ لاٹری نکلتی ہی رہے گی۔"

"بتاؤ ڈیئر!" —— رابی نے کہا ——"جلدی بتاؤ۔"

"پہلے میں تمہیں یہ بتا دیتا ہوں کہ تم یہیں لاہور میں ہی گھومتے
پھرتے رہو گے" —— عزیز نے کہا ——"آسان سا کام ہو گا۔ اِس ہاتھ
دو گے، اُس ہاتھ نقد مل جاتے گا۔"

"پہلے مجھے کام بتاؤ" —— رابی نے پوچھا ——"اگر یہ کام اتنا ہی آسان
ہے اور دولت کے ڈھیر لگ جائیں گے تو یہ کام تم خود کیوں نہیں کرتے؟"

"ہاں رابی!" —— عزیز نے لمبا سانس لے کر کہا ——"تم نے ٹھیک
پوچھا ہے کہ میں یہ کام خود کیوں نہیں کرتا۔ میں کرنا چاہتا ہوں۔ اب بات سے
بات نکل آتی ہے تو میں تم سے مشورہ لیتا ہوں۔ اگر تم اوکے کر دو تو
ہم دونوں یہ کام کر سکتے ہیں۔"

"کام کیا ہے؟"

"جاسوسی" —— عزیز نے جواب دیا ——"انڈیا کے لئے .... کیوں؟
گھبرا گئے؟"

"گھبرانا کیسا ماتی ڈیئر!" —— رابی نے کہا ——"پہلے یہ بتاؤ کہ وہ کوئی
پکا آدمی ہے جس نے تمہیں یہ مشورہ دیا ہے؟"

"فولاد کی طرح مضبوط ہے" ــــ عزیز نے جواب دیا ــــ "وہ میرے پیچھے پڑا ہوا ہے اور اُس نے جو کچھ آفر کیا ہے وہ ہم خواب میں بھی نہیں دیکھ سکتے۔"

"آفر کیا ہے؟" ــــ رابی نے پوچھا۔

عزیز نے جب اُسے تفصیلاً بتایا کہ ایک قیمتی راز سرحد پار کر دینے کے صلے میں کیا ملے گا اور اگلا راز دینے تک کیا ملتا رہے گا تو رابی کی آنکھیں کُھل گئیں۔

"نبیلہ کو دیکھا ہے؟" ــــ عزیز نے کہا ــــ "اس جیسی لڑکیاں تمہاری تحویل میں ہوں گی۔"

"پہلے تو نبیلہ سے میری دوستی کرا دو" ــــ رابی نے مسکراتے ہوئے کہا ــــ "پھر اگلی بات کریں گے۔"

"تم ہاں کہہ دو" ــــ عزیز نے کہا ــــ "اور نبیلہ کو اپنی لونڈی سمجھو.... ابھی .... آج ہی"۔

"لیکن میں وہ راز کہاں سے لاؤں گا جو انڈیا کے لئے قیمتی ہوں گے؟" ــــ رابی نے پوچھا۔

"وہ راز تمہارے گھر میں موجود ہیں" ــــ عزیز نے کہا ــــ "تمہارے ڈیڈی ڈیفنس ڈیپارٹمنٹ کی ایک اونچی کرسی پر بیٹھے ہوتے ہیں۔ کیا وہ فائلیں گھر نہیں لاتے؟"

"ہاں ہاں" ــــ رابی نے اشتیاق سے کہا ــــ "ہفتے میں دو تین بار وہ فائلیں گھر لاتے ہیں اور رات کچھ دیر ان پر کام کرتے ہیں پھر یہ فائلیں اپنے بریف کیس میں رکھ کر اسے تالہ لگا دیتے ہیں۔"

"اگر تم ڈیڈی کے آفس میں جاؤ تو وہاں کا سٹاف تمہیں کس طرح ملتا ہے؟" ــــ عزیز نے پوچھا۔

"ڈیڈی کے ماتحت مجھے دیکھ کر یُوں اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں جیسے میں ہی اس محکمے کا ہیڈ ہوں۔"

"تو پھر کام اور زیادہ آسان ہو جائے گا" ــــ عزیز نے کہا ــــ "سوچ

کر جواب دو۔"

"میں نے سوچ لیا ہے" ــــ رابی نے کہا ــــ "مجھے نبیلہ چاہیئے۔"

"یہ لڑکی تمہاری ہو گئی" ــــ عزیز نے کہا ــــ "اور مریم کو بھی اپنا سمجھو۔"

"یہ تو تمہاری بیوی ہے" ــــ رابی نے حیران سا ہو کر کہا۔

"یہ کسی کی بھی بیوی نہیں" ــــ عزیز نے عجیب سی مسکراہٹ سے کہا۔

"عزیز!" ــــ رابی نے عزیز کی طرف جُھک کر رازداری کے لہجے میں پُوچھا ــــ "کیا تم انڈیا کے آدمی تو نہیں؟"

"ہاں رابی!" ــــ عزیز نے کہا ــــ "میں انڈیا کا آدمی ہوں۔ مجھ پہ بھروسہ رکھو" ــــ عزیز نے دایاں ہاتھ آگے کیا۔ رابی نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ عزیز نے کہا ــــ "او کے؟"

"او کے" ــــ رابی نے عزیز کے ہاتھ پر دوسرا ہاتھ بھی رکھ کر اور بڑے جوش سے ہلا کر کہا ــــ "پورا معاملہ طے کر لو۔"

"یہاں نہیں" ــــ عزیز نے کہا ــــ "کل صبح ہوٹل میں میرے کمرے میں آ جانا .... دیکھ لو، میں فائیو سٹار ہوٹلوں میں رہتا ہوں اور مریم اور نبیلہ جیسی حسین لڑکیوں کو ساتھ لئے پھرتا ہوں۔"

عزیز نے اُس کے ساتھ چند ایک ضروری باتیں کیں اور مزید سبز باغ دکھائے۔ اُس کے بولنے کا انداز ایسا تھا جو سُننے والے کو مسحور کر دیتا تھا۔ سب سے بڑی کشش تو مریم اور نبیلہ جیسی لڑکیاں تھیں۔

تینوں لڑکیاں ابھی تک وہیں بیٹھی تھیں۔ مریم اور نبیلہ کو معلوم تھا کہ عزیز اور رابی میں کیا بات ہو رہی ہے۔ وہ جب دونوں اُٹھ کر ان کی طرف آئے تو یہ بھی اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

رابی پر خاموشی طاری تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ انڈیا کی جنت میں پہنچ گیا ہے۔

جس روز رابی اور رشی ہنی مون کے لئے لاہور سے روانہ ہوتے تھے اُسی روز رابی کی ماں نوکرانی کو اُن کے بیڈ روم میں لے گئی۔

"یہ سب کچھ اُتار کر باہر پھینک دو" —— اُس نے نوکرانی سے کہا۔ اُس کا لہجہ اور انداز ایسا تھا جیسے اس کمرے میں کرایہ دار رہتے تھے اور ان سے بڑی مشکل سے کمرہ خالی کرایا گیا ہو۔

"یہ سب کچھ بیگم صاحب؟" —— نوکرانی نے سوالیہ انداز سے کہا۔

"ہاں بشیراں! یہ سب پھول وغیرہ!" —— رابی کی ماں نے جھنجلاہٹ سے کہا —— "کمرہ ویسے ہی کر دو جیسے یہ پہلے تھا"۔

"ہائے نہ ممی!" —— رابی کی ایک بہن آگئی۔ ماں کا حکم سُن کر بولی —— "اُن کے آنے تک یہ سجاوٹ رہنے دیں۔ ابھی تو وہ دُولہا دُلہن ہیں"۔

"اُتار دو بشیراں!" —— رابی کی ماں نے اپنی بیٹی کی بات سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے کہا اور بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے نکل گئی —— "دُلہن.... جیسی ماں ویسی بیٹی"۔

رابی کی بہن بیڈ روم سے نکل گئی اور بشیراں وہیں رہ گئی۔ بشیراں ان کی نوجوان نوکرانی تھی۔ اس کا خاوند جس کی عمر پچیس چھبیس سال تھی، پانچ چھ سال سے اس کوٹھی میں ملازم تھا۔ رابی اور رشی کی شادی سے کچھ ہی دن پہلے اس ملازم کی شادی ہوئی تھی اور وہ بشیراں کو اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ بیگم نے بشیراں کی بھی تنخواہ مقرر کر دی۔ یہ میاں بیوی سرونٹ کوارٹر میں رہتے تھے۔

بشیراں رابی اور رشی کے بیڈ روم میں اکیلی کھڑی کمرے کی سجاوٹ کو دیکھ رہی تھی۔ اُس کا جی نہیں چاہتا تھا کہ مالکن کے حکم کی تعمیل کرے۔ اُسے کمرے کی سجاوٹ بڑی اچھی لگ رہی تھی۔ سونے اور چاندی کی

طرح چمکتے ہوئے تاروں کے لمبے لمبے ہار اور مصنوعی پھول پلنگ کے اُوپر اس طرح لگائے گئے تھے کہ ان کی چھت بن گئی تھی۔ کمرے کی دیواریں بھی اسی طرح سجی ہوئی تھیں۔ رابی کی کار بھی ایسے مصنوعی ہاروں اور پھول سے سجائی گئی تھی۔

بشیراں کو بیگم صاحب کے حکم کی تعمیل کرنی پڑی۔ اُس نے تمام سجاوٹ اُتار لی لیکن اُس نے اس مصنوعی سجاوٹ کو پھینکا نہیں۔ اگر یہ قدرتی پھول ہوتے تو مُرجھا جانے کی وجہ سے پھینک دیئے جاتے۔ بشیراں ان تاروں اور کٹی ہوئی پتیوں کی چمک اور ان کے رنگوں سے ہی مسحور ہو گئی۔ اُس نے انہیں سمیٹا۔ ایک چادر اُتار لائی اور اس ساری سجاوٹ کو چادر میں لپیٹ کر اپنے کوارٹر میں رکھ آئی۔ اُس وقت اُس کا خاوند جس کا نام نذر تھا، کوٹھی میں کہیں مصروف تھا۔

رات کو بشیراں کام کاج سے فارغ ہو کر نذر سے پہلے اپنے کوارٹر میں چلی گئی۔ نذر کچھ دیر بعد فارغ ہُوا۔ وہ جب اپنے کوارٹر میں گیا تو دیکھا کہ بشیراں رابی اور رشی کے بیڈ روم سے اُتارا ہُوا سجاوٹ کا سامان اپنے کمرے کی دیواروں کے ساتھ لٹکا رہی تھی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" —— نذر نے پوچھا۔

"تم آ گئے؟" —— بشیراں نے پُر مسرت لہجے میں کہا —— "دیکھتے جاؤ میں اس کمرے کو کتنا خوبصورت بنا دوں گی"۔

"یہ کہاں سے لے آئی ہو تم؟"

"دُولہا دُلہن کے کمرے سے!" —— بشیراں نے جواب دیا —— "بیگم صاحب نے کہا تھا یہ سب اتارو اور باہر پھینک دو۔ میں چادر میں لپیٹ کر یہاں لے آئی۔ اتنی خوبصورت اور قیمتی چیزیں بھلا پھینکی جاتی ہیں؟ ہم بھی تو ابھی دُولہا دُلہن ہی ہیں نا! ہم اپنا کمرہ کیوں نہ سجائیں!"

"یہاں آ بشیراں!" —— نذر نے سنجیدہ لہجے میں کہا —— "میں تجھے بتاتا ہوں کہ ہم اپنا کمرہ کیوں نہ سجائیں"۔

"تمہیں بھوک لگی ہے نا!" ـــ بشیراں نے ایک لمبا ہار دیوار پر لٹکاتے ہوئے کہا ـــ "پہلے روٹی کھا لیتے ہیں ۔ ۔ ۔ آج تو کھانے کا مزہ آجائے گا۔ بیگم صاحب نے فریج سے تین قسم کے سالن نکال دیتے ہیں۔ روغنی نان بھی دیتے ہیں۔ میں گرم کر کے لاتی ہوں۔"

بشیراں نے سجاوٹ کا کام وہیں رہنے دیا اور اپنے باورچی خانے میں چلی گئی۔ باورچی خانہ کیا تھا، برآمدے میں چولہا چوکا بنا ہوا تھا۔

❦

بشیراں سالن اور روغنی نان گرم کر کے لاتی تو کمرے کی دیواروں سے سجاوٹ غائب تھی۔

"یہ تم نے اُتارے ہیں؟" ـــ اُس نے نذر سے پوچھا۔

"ہاں!" ـــ نذر نے جواب دیا ـــ "کھانا رکھو اور میرے ساتھ بیٹھ کر کھاؤ۔"

بشیراں اُداس سی ہو گئی۔ اُس نے دیکھا کہ تمام سجاوٹ ایک چارپائی کے نیچے پڑی تھی۔ نذر اُسی چارپائی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ بشیراں نے اُس کے آگے دسترخوان بچھایا، کھانا رکھا اور چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اُس کے نوجوان چہرے پر خوشی کے جو آثار تھے ان پر خفگی کی تہہ چڑھ گئی تھی۔ وہ معمولی سے خدوخال کی لڑکی تھی۔ اُس کا چہرہ گندمی تھا۔ اُس میں یہی ایک کشش تھی کہ وہ نوجوان اور بھولی بھالی سی تھی۔ نذر کا رنگ تو گہرا سانولا تھا اور اُس کی ایک آنکھ میں سفید سا داغ تھا لیکن اُس کا قد کاٹھ اچھا تھا۔

"تم نے چُپ کیوں سادھ لی ہے؟" ـــ نذر نے بشیراں سے پوچھا۔

"میں کمرہ سجا رہی تھی" ـــ بشیراں نے رُوٹھے ہوتے بچے کی طرح کہا ـــ "پتہ نہیں تم نے کیوں پسند نہیں کیا۔"

نذر چُپ چاپ کھانا کھاتا رہا۔

"تمہیں سجاوٹ پسند نہیں؟" ـــ بشیراں نے پوچھا ـــ "یہ رنگ برنگی چمکتی اور پردتی پتیاں تمہیں اچھی نہیں لگتیں؟ یہ اتنے پیارے پھول..."

"یہ بے جان پھول ہیں بشیراں!" ـــ نذر نے کہا ـــ "ان میں خوشبو نہیں۔ یہ میرے اور تیرے جیسے انسانوں کے بناتے ہوتے پھول ہیں۔ ان میں اللہ کی قدرت کا حُسن نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ میری بات سمجھ رہی ہو بشیراں؟"

"سمجھ رہی ہوں" ـــ بشیراں نے جواب دیا ـــ "لیکن خوبصورت تو ہیں۔"

"یہ ہمارے نہیں" ـــ نذر نے کہا ـــ "نہ یہ ہمارے لئے ہیں نہ ہم ان کے لئے ہیں۔ یہ ہم نے نہیں خریدے تھے۔ نہ میرے باپ میں اتنی ہمت تھی نہ تیرے باپ کی اتنی پسلی تھی کہ اس سجاوٹ پر رقم تباہ کرتے۔ یہ سجاوٹ کسی اور کے لئے تھی جو تم اُٹھا لاتی ہو۔ یہ زر پیسے والوں کا موج میلہ ہے بشیراں!"

"یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو" ـــ بشیراں نے بوجھل سی آواز میں کہا ـــ "ہم غریب ہیں نا! ان چیزوں پر ہمارا کوئی حق نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ میرے دل میں ویسے ہی آگئی تھی کہ اس کمرے کو سجا دوں اور اتنی خوبصورت چیزوں کو کوڑے میں نہ پھینکوں۔"

"یہ تو پکا کمرہ ہے" ـــ نذر نے کہا ـــ "تم اگر کسی جھگی میں ہو گی تو وہ بھی مجھے سجی ہوتی لگے گی۔ میری زندگی کی سجاوٹ تمہارے ساتھ ہے۔"

بشیراں ابھی نئی نئی دُلہن تھی۔ نذر کی بات سُن کر شرما گئی۔ اُس نے سر جھکا لیا اور اُس کا وجود سکڑ گیا۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں بشیراں!" ـــ نذر نے کہا ـــ "ہم دونوں ایک دوسرے کی سجاوٹ ہیں۔ میاں بیوی کی زندگی پیار اور محبت سے سجا کرتی ہے۔ ہمارا پہلا بچہ پیدا ہو گا تو تم کسی پھول کی ضرورت محسوس کرو گی ہی نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ نہ نقلی پھول کی نہ اصلی کی۔"

"تم کیسی باتیں کر رہے ہو!" ___ بشیراں نے شرم سے سُکڑتے ہوئے کہا۔

"میں تمہیں کچھ سمجھانا چاہتا ہوں" ___ نذر نے کہا ___ "تم نے کہا ہے کہ ہم غریب ہیں اور سجاوٹ والی ان چیزوں پر ہمارا کوئی حق نہیں ..... میں تمہیں یہ سمجھا رہا ہوں کہ ہم لوگ غریب نہیں۔ روپے پیسے کے لحاظ سے ہم غریب ہیں اور ہمیں اس وجہ سے بھی غریب کہا جاتا ہے کہ ہم امیروں کے نوکر ہیں اور ان کا دیا کھاتے ہیں اور ان کے مکان میں رہتے ہیں لیکن شرم، غیرت اور ایمان کے لحاظ سے ہم ان سے امیر ہیں۔"

بشیراں نے چونک کر نذر کی طرف دیکھا جیسے یہ بات اُس کی سمجھ میں نہ آئی ہو۔

"کیا تم کسی غیر مرد کے ساتھ باہر جاؤ گی؟" ___ نذر نے پوچھا۔

"توبہ ..... توبہ!" ___ بشیراں نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا ___ "میں تو زہر کھا کر مر جاؤں۔"

"جن کی طرح تم اپنا کمرہ سجانا چاہتی ہو وہ زہر نہیں کھایا کرتے" ___ نذر نے کہا ___ "ان کی عورتیں جوان ہوں یا ادھیڑ عمر، کسی بھی مرد کو غیر نہیں سمجھتیں بشرطیکہ یہ مرد انہیں اچھا لگتا ہو۔"

"یہ تو میں نے دیکھا ہے" ___ بشیراں نے کہا ___ "دُلہن نے میرے ساتھ جو باتیں کی تھیں وہ میں زبان پر نہیں لا سکتی۔"

"ایک بات اور ہے بشیراں!" ___ نذر نے کہا ___ "اگر تم نے آج یہ سوچا ہے کہ یہ کمرہ خوبصورت نہیں اور اسے کوٹھی کے کمرے جیسا ہونا چاہیئے تو کل پرسوں تمہارے دماغ میں یہ خیال بھی آ جائے گا کہ خاوند بھی خوبصورت نہیں اور امیر بھی نہیں۔"

"کیا فضول باتیں کرتے ہو تم!" ___ بشیراں نے بڑے پیار سے لہجے میں کہا ___ "میرا جینا مرنا تمہارے لیے ہے۔"

"اور بشیراں!" ___ نذر نے ایسے کہا جیسے اُس نے بشیراں کی بات

سُنی ہی نہ ہو ___ "دُوسروں کی خوبصورتی اور چمک دمک دیکھ کر میرے دماغ میں بھی خیال آ سکتا ہے کہ میری بیوی خوبصورت نہیں۔"

بشیراں کو دھچکا سا لگا۔ اُس کے چہرے پر اُداسی آ گئی کہ وہ خوبصورت نہیں۔

"میں کہاں کا خوبصورت آدمی ہوں کہ میں کہوں کہ مجھے خوبصورت بیوی چاہیئے" ___ نذر نے کہا ___ "جو تمہیں خوبصورت نہیں سمجھتا وہ میری نظروں سے تمہیں دیکھے تو اُسے پتہ چلے گا کہ تم سجاوٹ کے ان چمکتے ہوئے نقلی پھولوں اور رنگ برنگی بتیوں سے زیادہ خوبصورت ہو۔"

بشیراں بچوں کی طرح ہنس پڑی جیسے نذر نے اُس کے پہلو میں گدگدی کی ہو۔ نذر کے چہرے پر جو سنجیدگی گہری ہوتی جا رہی تھی وہ اُڑتے ہوئے بادل کی طرح اُس کے چہرے سے اُڑ گئی اور اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ دونوں کھانا کھاتے رہے۔ دونوں کے چہروں پر مسرت اور محبت تھی۔ نذر نے سر اُٹھایا تو بشیراں کی نظریں اُس کی آنکھوں سے ٹکرا گئیں۔ بشیراں کے سانولے چہرے پر حیا کی سُرخی آ گئی اور اُس کی نظریں جھک گئیں۔

"میں سجاوٹ کا یہ سارا سامان ابھی کُوڑے کے ڈرم میں پھینک آؤں گی" ___ بشیراں نے کہا۔

"ناراض ہو کر نہیں" ___ نذر نے اُس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا ___ "اگر تم نے میری باتیں سمجھ کر یہ چیزیں پھینکنے کی سوچی ہے تو ٹھیک ہے۔"

"نہیں نذرے!" ___ بشیراں نے کہا ___ "ناراضگی کی بات کیوں کرتے ہو! میں نے تمہاری بات سمجھ لی ہے۔"

"کیا سمجھی ہو؟"

"لو ..... تم نے تو مجھے کم عقل سمجھ لیا ہے" ___ بشیراں نے کہا ___ "تمہارا مطلب یہ ہے نا کہ پرائی خوشیاں اپنے چہرے پر نہیں سجائی جا سکتیں۔ خوشیاں اپنی اچھی ہوتی ہیں۔"

"اور خوشی دل کا معاملہ ہے" — نذر نے کہا — "دل وہی خوش ہوتا ہے جس دل میں محبت ہو لالچ نہ ہو، اُن چیزوں کی ہوس نہ ہو جو مل ہی نہ سکیں۔"

"تمہیں یہ باتیں کس نے بتائی تھیں؟" — بشیراں نے سادگی سے پوچھا۔

"میرے باپ نے!" — نذر نے جواب دیا۔

"تمہارا ابا عقل والا ہے" — بشیراں نے کہا — "بڑی سیانی باتیں کرتا ہے۔ میرے ساتھ اُس نے زیادہ باتیں تو نہیں کیں لیکن جو کی ہیں ان سے مجھے یہ خیال آتا تھا کہ یہ تو بہت ہی علم اور تعلیم والا آدمی ہے.... تمہارا ابا پڑھا ہُوا ہے؟"

"آٹھ جماعتیں بھی پوری نہیں پڑھ سکا تھا" — نذر نے جواب دیا — "میرا دادا مر گیا تو ابا کو سکول چھوڑنا پڑا اور اُسی عمر میں نوکری چاکری میں لگ گیا۔"

"آگے مجھے معلوم ہے" — بشیراں نے کہا — "جوان ہو کر وہ فوج میں بھرتی ہو گیا تھا اور ہندوستان کے ساتھ پاکستان کی جو جنگ ہوئی تھی اس میں تمہارے ابا کی ایک ٹانگ کٹ گئی تھی۔"

"اُس وقت میری عمر تین سال سے کچھ کم یا زیادہ تھی" — نذر نے کہا — "میرے ابا کی جب ٹانگ کٹی تو میں اپنی ماں کے ساتھ اُسے دیکھنے کے لئے فوجی ہسپتال میں گیا تھا۔ دیکھو میں کتنا چھوٹا تھا پھر بھی مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میری ماں نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ تیرے ابا کی ٹانگ کٹ گئی ہے۔ میں رو پڑا تھا۔ جب ہم ہسپتال جا رہے تھے تو میں سوچ رہا تھا کہ میرے ابا بھی رو رہے ہوں گے لیکن ہمیں دیکھ کر ابا ہنس پڑے اور مجھے بازوؤں میں لے کر اپنے سینے پر لٹا لیا تھا۔ وہ اتنا خوش تھے کہ میں اپنے آپ سے کہنے لگا کہ ماں نے مجھے جھوٹ بتایا ہے کہ ابا کی ٹانگ کٹ گئی ہے۔"

"میں جب اُسے نقلی ٹانگ پر چلتے یا ٹانگ اُتری ہوتی ہو تو بیساکھی کے سہارے چلتے دیکھتی ہوں تو مجھے بہت افسوس ہوتا ہے" — بشیراں نے کہا۔

"تم نے اُس کے ساتھ ٹانگ کی بات نہیں کی" — نذر نے کہا — "اُسے ذرا سا بھی افسوس نہیں۔ اُس کی ٹانگ سن پینسٹھ کی جنگ میں کٹی تھی۔ چھ سال بعد سن اکہتر میں جب مشرقی پاکستان پر ہندوستان کی بدمعاشی چل گئی اور پاکستان آدھا رہ گیا تو میرا ابا بہت رویا تھا۔ وہ اُسی طرح رو رہا تھا جس طرح میں یہ سن کر رویا تھا کہ ابا کی ایک ٹانگ کٹ گئی ہے۔ ابا نے کہا تھا کہ میری دوسری ٹانگ بھی کٹ جاتی، میں سارے کا سارا کٹ جاتا لیکن پاکستان نہ کٹتا.... مجھے یہ بھی یاد ہے کہ سن پینسٹھ میں جب میرا ابا نقلی ٹانگ لگوا کر گھر آیا تھا تو اُس نے مجھے اور میرے بڑے بھائی کو گلے لگا کر کہا تھا کہ میرے بیٹے دشمن سے میری ٹانگ کا بدلہ چکائیں گے۔"

"ان کی شادی نے جسم توڑ ڈالا ہے" — نذر نے رابی کی شادی کی بات کرتے ہوئے کہا — "سو جائیں۔"

"میں یہ کوڑے کے ڈرم میں پھینک آؤں" — بشیراں نے کہا۔

اُس نے رابی اور رِشی کے بیڈروم سے اُتارا ہُوا سارا سامان چادر میں لپیٹا اور باہر نکل گئی۔

❦

رابی اور رِشی کی ازدواجی زندگی کا ایک مہینہ پورا ہو گیا تھا اور اب رابی، عزیز، مریم اور نبیلہ کی جنت میں جا پہنچا تھا۔ وہ ہوٹل کے اُس کمرے میں بیٹھا تھا جس میں عزیز ٹھہرا ہُوا تھا۔ ایک روز پہلے یہ سب شالامار باغ کی سیر کو گئے تھے جہاں رابی عزیز کے جال میں آ گیا تھا اور عزیز نے اُسے اگلے روز ہوٹل میں ملنے کو کہا تھا۔

رابی کمرے میں داخل ہُوا اور دروازے میں ہی رُک گیا۔ اُس کی نظریں کمرے میں گھومنے لگیں۔ وہاں اکیلا عزیز تھا جو رابی کو دیکھ کر مسکراتا

ہُوا اُس کی طرف آ رہا تھا۔ رابی کا چہرہ ویران سا ہو گیا تھا۔

"آجاؤ.... آگے آجاؤ"۔۔۔ عزیز نے رابی کو اپنے بازوؤں میں لیتے ہوئے کہا۔۔۔ "میں جانتا ہوں کہ تم کسے ڈھونڈ رہے ہو لیکن آج تم میرے پاس آتے ہو۔ آج ہم نے نہایت اہم اور ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

"وہ کہاں ہیں؟"۔۔۔ رابی نے پوچھا۔

وہ مریم اور نبیلہ کو ڈھونڈ رہا تھا۔ عزیز نے اُسے صوفے پر بٹھایا۔

"وہ یہیں ہیں رابی!"۔۔۔ عزیز نے کہا۔۔۔ "یہاں تمہارے لئے اور بھی بہت کچھ ہے۔ میں تمہارے چہرے پر مایوسی دیکھ رہا ہوں۔"

"تم مایوسی کی وجہ تو سمجھتے ہو نا!"۔۔۔ رابی نے کہا۔

"تم مایوس ہی نہیں بے صبر بھی ہو"۔۔۔ عزیز نے کہا۔ اُس کے چہرے پر اور بولنے کے انداز میں سنجیدگی تھی۔ اُس نے رابی کو سر سے پاؤں تک دیکھا جیسے اُسے نظروں سے ناپا ہو، پھر کہنے لگا۔۔۔ "میری کچھ ضروری باتیں توجہ سے سُن لو رابی!.... ہر کام، ہر ہُنر، ہر پیشے اور ہر کھیل کے کچھ اصول ہوتے ہیں۔ انہیں نظر انداز کر دو تو سوائے نقصان کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اگر کھیل ہے تو کھیل بگڑ جاتا ہے.... تم نے میرے ساتھ جو راستہ اختیار کیا ہے اس کے اصول تو بہت ہی سخت ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کی بھی خلاف ورزی کرو گے تو صرف یہی نہیں ہو گا کہ بنا بنایا کھیل بگڑ جاتے گا بلکہ تمہارا حُلیہ بگڑ جاتے گا۔ تمہارا مستقبل ایسا بگڑے گا جسے تم بغیر دیکھے تصور میں نہیں لا سکتے۔"

"تم تو بزرگوں اور اُستادوں کی طرح باتیں کر رہے ہو"۔۔۔ رابی نے کہا۔۔۔ "میں مریم اور نبیلہ کو غیر حاضر دیکھ کر ذرا مایوس سا ہو گیا تھا۔"

"اگر تم صرف مریم اور نبیلہ کو ہی سب کچھ سمجھتے رہو گے تو آگے نہیں بڑھ

سکو گے"۔۔۔ عزیز نے بزرگانہ انداز میں کہا۔۔۔ "تم اُس مقام تک پہنچ ہی نہیں سکو گے یہاں تمہارے لئے خزانے موجود ہیں۔ اگر تمہاری دلچسپی مریم اور نبیلہ جیسی لڑکیوں کے ہی ساتھ ہے تو دولت کے زور پر تم راجہ اِندر بن جاؤ گے"۔۔۔ عزیز چُپ ہو کر سوچ میں پڑ گیا پھر بولا۔۔۔ "لیکن رابی! میری لائن پر چلنا ہے تو لڑکیوں میں دلچسپی کم کر دو۔ تمہارے لئے عورت ہی خطرہ بن جاتے گی۔ میں تمہیں ابھی بتا دیتا ہوں کہ میں تمہیں جس دُنیا میں لے جا رہا ہوں وہ جنت سے کم نہیں لیکن تمہاری ذرا سی غلطی اور چھوٹی سی بھول اس جنت کو جہنم میں بدل دے گی۔"

"تم تو مجھے ڈرا رہے ہو یار!"۔۔۔ رابی نے کہا۔۔۔ "میں غلطیاں کرنے والا آدمی نہیں۔ مجھے جو سبق دینا ہے وہ دے دو پھر مجھے آزما لینا۔"

"تم بہت بڑی غلطی کر رہے ہو"۔۔۔ عزیز نے کہا۔۔۔ "وہ یہ کہ تم مریم اور نبیلہ کو طوائفیں یا آوارہ لڑکیاں اور مجھے ان کا دلال سمجھ رہے ہو جسے پمپ کہتے ہیں۔"

"اوہ.... نہیں یار!"۔۔۔ رابی نے کہا۔۔۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ خدا کی قسم، میں تمہیں اپنا بھائی سمجھتا ہوں۔"

"یہ دونوں لڑکیاں اُن بموں سے زیادہ خطرناک ہیں جن کے دھماکے پاکستان میں ہوتے رہتے ہیں"۔۔۔ عزیز نے کہا۔۔۔ "یہ غیر معمولی طور پر ذہین، چالاک اور عیار لڑکیاں ہیں۔ انہیں اُستادوں نے ٹریننگ دی ہے۔ ایسی ہی ٹریننگ کی ضرورت تمہیں بھی ہے۔ ہم تمہیں ان لڑکیوں سے زیادہ ذہین اور چالاک بنا دیں گے۔"

"اور عیار بھی!"۔۔۔ رابی نے مذاق کے لہجے میں کہا۔

"ہاں.... عیار بھی!"۔۔۔ عزیز نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔۔۔ "عیاری بنیادی اصول ہے.... میں تمہیں کچھ بنیادی اصول بتا دیتا ہوں۔ اس معاملے میں اپنے ماں باپ پر بھی اعتبار نہ کرنا، انہیں اعتماد میں لینا۔

مطلب یہ ہے کہ اُس انسان کو بھی قابلِ اعتماد نہیں سمجھنا جسے تم اپنا عزیز ترین سمجھتے ہو۔ مثلاً رشی سے تمہیں دلی محبت ہے۔ ابھی اُسے بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا...... تم اسے بتا تو نہیں چکے کہ کل ہمارے درمیان کیا باتیں ہوتی ہیں؟"

"اتفاق کی بات ہے کہ میں نے اُسے ابھی نہیں بتایا" —— رابی نے جواب دیا —— "اور میں تمہیں یہ بھی بتا دیتا ہوں عزیز! مجھے رشی کے ساتھ ویسی محبت نہیں ہے جیسی تم سمجھ رہے ہو۔ یُوں سمجھ لو کہ شادی تو کرنی ہی تھی۔ اس کے لئے مجھے یہی لڑکی اچھی لگی۔"

"اِس لڑکی کی فیملی بیک گراؤنڈ کیا ہے؟" —— عزیز نے رابی سے پوچھا۔

"اس کی صرف ماں ہے" —— رابی نے کہا —— "باپ مر گیا ہے۔ ماں کے پاس دولت بھی ہے جائیداد بھی ہے لیکن شہرت اچھی نہیں" ——

رابی نے عزیز کو تفصیل سے سنایا کہ رشی کے باپ نے اُس کی ماں کو کس طرح استعمال کیا اور غبن، فراڈ اور ایسے ہی دیگر جرائم کر کے گرفتاری سے بچتا رہا آخر وہ پکڑا گیا اور اسے چار سال سزا تے قید ہو گئی جس کا اُسے اور رشی کی ماں کو زیادہ افسوس نہ ہُوا کیونکہ اُن کا گھر روپے پیسے سے بھرا ہُوا تھا اور جائیداد بھی بہت بن گئی تھی۔

"یہ لڑکی ہمارے کام آسکتی ہے لیکن ابھی نہیں" —— عزیز نے کہا —— "ایسی ماؤں کی بیٹیاں قابلِ اعتماد نہیں ہوتیں۔"

"تم فکر نہ کرو عزیز!" —— رابی نے کہا —— "میں رشی کو پتہ نہیں چلنے دوں گا تم جو بنیادی اصول مجھے بتا رہے تھے ان کی بات کرو۔"

❦

بھارتی انٹیلی جنس کے ایجنٹ عزیز نے پاکستان کے ایک نوجوان —— بلکہ ایک اور نوجوان —— رابی کو ملک اور قوم سے غداری کے اصول بتانے شروع کر دیئے تھے۔ اُسے کامیابی کے راستے دکھاتے۔ یہ راستے جنّت

جیسے سبز باغوں میں سے گزرتے اور یہیں پر آکر ختم ہوتے تھے۔ یہ دراصل برین واشنگ تھی اور عزیز اس میں مہارت رکھتا تھا۔ اُس نے رابی کی برین واشنگ کا پہلا مرحلہ شروع کر دیا تھا۔

اب عزیز پاکستان کے خلاف کوئی بات نہیں کر رہا تھا نہ اُس نے بھارت کے حق میں کوئی بات کی۔ وہ رابی کی کمزوریاں جان چکا تھا۔ رابی نے اپنی دُکھتی رگیں عزیز کے ہاتھ میں دے دی تھیں۔ عزیز کے الفاظ میں اور بولنے کے انداز میں طلسماتی تاثر تھا جو رابی پر اس طرح طاری ہوتا جا رہا تھا جیسے وہ ہپناٹائز ہو گیا ہو۔ عزیز کی مہارت اور چرب زبانی کا کمال تو تھا ہی لیکن اصل کام رابی کے کردار کی کمزوریاں کر رہی تھیں۔

"عزیز!" —— رابی نے صرف یہ پوچھا —— "کیا تم واقعی مسلمان ہو یا انڈیا سے آتے ہوتے ہندو ہو؟"

"مسلمان ہوں" —— عزیز نے رابی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا —— "اس میں تمہیں ذرا سا بھی شک نہیں ہونا چاہیئے۔ مَیں انڈیا کا مسلمان ہوں۔ اگر میں حافظِ قرآن ہوتا تو تمہیں سُورتیں اور آیتیں پڑھ کر سناتا۔"

"مان لیا بھائی، مان لیا" —— رابی نے مسکراتے ہوتے اُس سے کہا۔

"غور اس پر کرو رابی!" —— عزیز نے کہا —— "میں تمہیں کسی غیر اسلامی راستے پر تو نہیں چلا رہا۔ میں تمہیں کار چور نہیں بنا رہا۔ تمہیں یہ تو نہیں کہہ رہا کہ بلا لائسنس ریوالور اور کلاشنکوف رکھ لو اور بسوں کے مسافروں کو لُوٹو۔ میں تمہیں یہ بھی نہیں کہہ رہا کہ ڈیڈی کی دولت اور اثر و رسوخ سے سیاست کا کھیل کھیلو، وزیر بنو اور سرکاری خزانے پر ہاتھ مارو، اور میں......"

"مَیں سمجھتا ہوں یار!" —— رابی نے کہا —— "تم اپنی بات کرو۔"

عزیز رابی کی عقل پر ایسا غالب آیا کہ یہ بھی سوچنے کے قابل نہ رہا کہ عزیز اسے ایک بدترین جُرم کے لئے تیار کر رہا ہے۔

لڑائی حسن بن صباح کی "جنّت" میں داخل ہو گیا تھا۔

❦

پرانی دِلّی کی ایک پرانے زمانے کی حویلی کے ایک کمرے میں سات آٹھ آدمی بیٹھے ہوتے تھے۔ ان میں صرف ایک آدمی زیادہ عمر کا تھا۔ پچاس سال سے زیادہ عمر ہو گی۔ باقی سب چھبیس سے تیس بتیس سال کی عمر کے آدمی تھے۔ ان میں جو سب سے بڑی عمر کا آدمی تھا۔ اُسے سب ہاشمی صاحب کہتے تھے۔ پہلے تو اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ ایک آدمی نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ سب نے اُس کی طرف دیکھا۔

"رحیم میاں!" — ہاشمی نے اُسے کہا — "یہاں سگریٹ پینے کی بڑی سخت ممانعت ہے ... یہاں ہی نہیں، ہمارے گروہ میں جو بھی شامل ہوتا ہے اُسے سگریٹ جیسی ہر عادت سے نجات حاصل کرنی پڑتی ہے۔ یہ ایک پابندی ہے۔ تم اور یہ دو نوجوان ہمارے جہاد میں شامل ہوتے ہو۔ ہماری آج کی میٹنگ کا مقصد ہی یہی ہے کہ تم تینوں کو ذہن نشین کرایا جائے کہ ہم کیا کر رہے ہیں اور کیوں کر رہے ہیں۔ تمہارے دوست جو تمہیں ہمارے محاذ میں لاتے ہیں وہ تمہیں بتا چکے ہیں کہ ہمارا لائحہ عمل کیا ہے۔ میں ذرا تفصیل سے اس محاذ کا پس منظر بیان کروں گا۔ ہمارے دو ساتھی اور بھی ہیں۔ ان کے ساتھ بھی ابھی تفصیل سے بات نہیں ہوئی۔"

"ہاشمی صاحب!" — ایک آدمی نے کہا — "قطع کلامی کی معافی چاہتا ہوں۔ پہلے انہیں یہ بتا دیں کہ سگریٹ پینے کی ممانعت کیوں ہے۔"

"سگریٹ نوشی، چائے نوشی وغیرہ عادات ہیں" — ہاشمی نے جواب دیا — "یہ یا کوئی بھی نشہ انسانی جسم کی ایسی ضرورت نہیں کہ اس کے بغیر زندہ ہی نہ رہا جا سکے۔ یہ عادات زنجیریں بن جاتی ہیں۔ ایسا انسان ملک کو کیا آزاد کرائے گا جو ایک عادت سے آزادی حاصل نہیں کر سکتا۔ سگریٹ نوشی اور ایسا جو بھی نشہ ہے، انسان کے لئے بڑی خطرناک کمزوری بن جاتا ہے۔ ہمارا محاذ ایسا خطرناک ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی آدمی کسی بھی وقت پکڑا

جا سکتا ہے۔ پکڑے جانے والے پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے کسی بھی ساتھی کی نشاندہی نہ کرے، لیکن پکڑنے والے یعنی ہندوستان کی پولیس اور انٹیلی جنس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ پورے گروہ کی نشاندہی کرے۔ اگر پکڑے جانے والے کی شخصیت اور کردار مضبوط ہے تو وہ ایذا رسانی برداشت کرے گا، جان تک دے دے گا لیکن اپنے کسی ایک بھی ساتھی کو نہیں پکڑوائے گا اور اگر وہ نشے کی عادت میں مبتلا ہے تو یہ عادت اُس کے لئے اتنی بڑی کمزوری بن جائے گی کہ وہ سگریٹ کے ایک کش کی خاطر اپنے گروہ کا غدّار بن جائے گا۔"

"ہاشمی صاحب!" — ان میں سے ایک نے کہا — "میں ایک اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔ ہمارے گروہ کے آدمیوں کو کھانے، پینے اور سونے کا بھی عادی نہیں ہونا چاہیئے۔ ہفتے میں ایک دن فاقہ کرنا چاہیئے۔ ایک رات جاگ کر گزارنی چاہیئے تاکہ ہم سب کھانے اور سونے کی عادت کے بھی غلام نہ رہیں۔"

"میں تمہارے اس اضافے سے اتفاق کرتا ہوں" — ہاشمی نے کہا — "ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ خدا کی راہ میں کر رہے ہیں اس لئے ہمیں ہر اُس کام اور اُس ہر چیز سے پرہیز کرنا چاہیئے جو خدا تعالیٰ کو پسند نہیں۔"

"اس قسم کی ہدایات تو ہم انہیں ساتھ ساتھ دیتے ہی رہیں گے" — ایک اور نے کہا — "بہتر ہے کہ ہم اصل موضوع پر آ جائیں۔"

"ہم ہندوستانی مسلمان ہیں" — ہاشمی نے کہا — "لیکن ہمیں بھارتی مسلمان اور انڈین مسلم کہا جاتا ہے اور اس سے یہ تاثر پیدا کیا جاتا ہے کہ پاکستان کے ساتھ ہمارا کوئی تعلق نہیں۔ ہم پاکستان کے لئے غیر ملکی سمجھے جاتے ہیں اور پاکستانی مسلمان جب ہندوستان میں آتے ہیں تو انہیں مشکوک اور مشتبہ قسم کے غیر ملکی سمجھا جاتا ہے۔ ہم نے اس حقیقت کو سامنے رکھ کر یہ محاذ بنایا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے مسلمان ایک ہی ملک کے باشندے ہیں۔"

"کیا آپ کی یہ بات عجیب سی اور غیر حقیقی نہیں لگتی؟" — ایک نئے آدمی نے پوچھا۔

"میرے عزیز بھائی!" — ہاشمی نے جواب دیا — "ایک وقت تھا جب پاکستان کا لفظ بھی غیر حقیقی اور عجیب لگتا تھا۔ تم میں سے کوئی بھی ابھی پیدا نہیں ہُوا تھا جب ہندوستان کے مسلمانوں نے ایک علیحدہ مُسلم مملکت کا مطالبہ کیا تھا۔ میں بھی اُس وقت اتنا بڑا تو نہیں تھا کہ اس سیاست کو سمجھ سکتا لیکن سمجھنے والی بات میری عمر کے مسلمان بچوں نے بھی سمجھ لی تھی۔

یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنی الگ اور آزاد مملکت کا مطالبہ کیوں کیا تھا۔ مختصر یہ کہ ہندو اور مسلمان اکٹھے نہیں رہ سکتے تھے۔ یہ دو مختلف قومیں ہیں جن کے مذہب اور کلچر ایک دوسرے سے مختلف ہی نہیں بلکہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔"

"یہ دو قومی نظریہ ہے جسے ہم بڑی اچھی طرح سمجھتے ہیں" — اس محاذ کے نئے ممبروں میں سے ایک اور نے کہا — "آپ ان تفصیلات میں بیشک نہ جائیں۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اُس وقت جب ہندوستان کے مسلمانوں نے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا تو مسلمانوں کے ایسے لیڈر بھی تھے جنہوں نے مطالبہ پاکستان اور دو قومی نظریئے کو تسلیم نہیں کیا تھا۔"

"صرف تسلیم ہی نہیں کیا تھا بلکہ مخالفت کی تھی" — ایک اور نے کہا — "مخالفت بھی ایسی کہ مطالبہ پاکستان کے خلاف جو تحریک کی صورت اختیار کر گیا تھا، باقاعدہ محاذ بنا لیا۔ ان میں ایک طبقہ تو اُن جاگیرداروں کا تھا جنہیں انگریزوں نے جاگیریں عطا کی تھیں اور دوسرا طبقہ ہمارے مذہبی لیڈروں کا تھا جو علمائے دین کہلاتے تھے۔ ان کے ذہنوں میں ہندوؤں کے روحانی اور سیاسی پیشوا مہاتما گاندھی نے یہ ٹھونس دیا تھا کہ ہندوستان کے باشندے پہلے ہندوستانی ہیں اور اس کے بعد وہ ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی وغیرہ ہیں۔"

"کیسی عجیب بات ہے" — ایک اور نئے ممبر نے کہا — "ہندوستان میں جنگِ آزادی کی ابتدا کرنے والے علمائے دین تھے۔ میرا مطلب

تحریکِ مجاہدین کے بانی سیّد احمد شہیدؒ، مولانا اسمٰعیلؒ اور اُن کے دیگر تمام ساتھیوں سے ہے جنہوں نے جنگِ آزادی تقریروں اور اخباری بیانوں سے نہیں لڑی تھی بلکہ انہوں نے سکھوں اور انگریزوں کے خلاف باقاعدہ جنگ لڑی تھی۔ اگر وہ علمائے دین ہندوستان کو ایک مسلمان ملک بنانے کی بنیاد نہ رکھتے تو آج نہ صرف یہ کہ پاکستان کا وجود نہ ہوتا بلکہ ہندوستان میں اسلام کا وجود ہی ختم ہو چکا ہوتا۔"

"دو قومی نظریئے کی مخالفت کرنے والے مسلمان آج دیکھ رہے ہیں" — ہاشمی نے کہا — "وہ دیکھ رہے ہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہے۔ اگر پاکستان نہ بنتا تو ان صوبوں کے مسلمانوں کے ساتھ بھی ہندو یہی سلوک کرتے۔ ہندو نے مسلمانوں کو آج تک الگ قوم کی حیثیت سے قبول نہیں کیا ..... یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہو رہا ہے کہ تم اس پس منظر کو اور ہندو کی ذہنیت کو سمجھتے ہو اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ ہندو نے پاکستان کے وجود کو تسلیم نہیں کیا۔ تسلیم نہ کرنا کوئی بڑی بات نہیں۔ اصل مسئلہ بلکہ اصل خطرہ یہ ہے کہ ہندو پاکستان کے وجود کو ختم کر رہا ہے اور اسے وہ بھارت ماتا کی غیر قدرتی تقسیم کہتا ہے۔"

"ہندو لیڈر شپ نے آدھا پاکستان تو ختم کر دیا ہے" — ایک پرانے ممبر نے کہا۔

"ہم یہ بھی جانتے ہیں" — ایک نیا ممبر بولا — "مغربی پاکستان کو جس طرح بھارت کی حکومت تباہ کر رہی ہے ہم اس سے بھی واقف ہیں۔"

"یہاں میں تمہاری ایک تصحیح کرنا چاہتا ہوں" — ہاشمی نے کہا — "تم نے بھارت کہا ہے لیکن ہم اسے ہندوستان کہتے ہیں۔ میری یہ بات بھی تمہیں عجیب اور غیر حقیقی لگے گی کہ ہندوستان کو ہم ایک اسلامی ملک سمجھتے ہیں۔ ہندو اسے کہتا تو بھارت ہے لیکن اس کا درپردہ مطلب مہا بھارت ہے۔ اس مہا بھارت میں اُس نے جو علاقہ شامل کر رکھا ہے وہ انڈونیشیا اور ملائشیا سے لے کر دجلہ و فرات تک ہے جس میں افغانستان بھی شامل ہے۔ اسے اب ہندو قیادت نے مہا بھارت کی بجائے اشوکا سپر انڈیا یا ایپاتر کا

نام دے دیا ہے۔ ہمارا محاذ اس کے خلاف کام کر رہا ہے۔ ضرورت یہ ہے
کہ اس محاذ کو پھیلایا جائے اور جس طرح ہندو اپنی انٹیلی جنس کے ذریعے پاکستان
میں تخریب کاری کر رہا ہے اس طرح ہم ہندوستان میں زمین دوز کارروائیاں
کریں۔ مجھے احساس ہے جیسے میں یا اس محاذ کے میرے تمام ساتھی خوابوں
کی دنیا میں چلے گئے ہوں اور میں یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ میں نے یا ہم سب
نے ایک احمقانہ سکیم بنائی ہے لیکن اس مقصد کو دیکھو تو سمجھ جاؤ گے کہ مقصد
احمقانہ نہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب اسلام کا اور اللہ کی وحدت
کا پیغام لے کر نکلے تھے تو اکیلے تھے۔ اگر تم لوگ تاریخ اسلام سے
واقفیت رکھتے ہو تو جانتے ہو گے کہ یہی اسلام آگے دنیا میں پھیلا اور آج
کسی بھی ملک میں چلے جاؤ وہاں کے باشندوں میں مسلمان بھی ہوں گے۔
ہندوستان میں سیّد احمد شہیدؒ بھی اکیلے ہی اٹھے تھے۔ صرف یہ دیکھو
کہ ہم جو نظریہ اور مقصد لے کر اُٹھے ہیں وہ کہاں تک صحیح ہے۔ ہم ایک

بنیاد رکھ رہے ہیں۔ ضروری نہیں کہ ہم اپنی زندگی میں ہی کامیاب ہو جائیں
ہم جس راستے پر نکلے ہیں اس پر اپنے نقوشِ پا چھوڑ جائیں گے۔ ہمارے
پیچھے آنے والے ہمارے قدموں کے نشان دیکھ کر منزل تک پہنچ جائیں گے
.... ہمارا ایک مقصد یہ ہے کہ ہندوستان میں اسلام کا تحفظ کیا جائے اور
اس کے ساتھ ہی پاکستان کو بھی بھارتی حکومت کی شرپسندی سے بچایا جائے۔"

"پاکستانی خود کیا کر رہے ہیں؟" —— ایک نئے ممبر نے پوچھا۔

"پاکستانی اپنی تباہی کے سامان کر رہے ہیں" —— ہاشمی نے کہا۔

"پاکستان کے متعلق میری رائے آپ کو اچھی نہیں لگے گی" ——
نئے ممبر نے کہا —— "پاکستان کا نام سُن کر میں مایوس ہو جاتا ہوں۔ میرے
والد صاحب کبھی کبھی پاکستان کا ذکر لے بیٹھتے ہیں تو میں نے دو مرتبہ دیکھا
کہ اُن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ پاکستان کو بڑا مضبوط اور طاقتور ملک
دیکھنا چاہتے ہیں لیکن پاکستان نے اپنے آپ کو کمزور کر کے ہندوستان
کے مسلمانوں کو مایوس کر دیا ہے۔"

"تم اپنی رائے ذرا جھجک کر دے رہے ہو" —— ہاشمی نے کہا ——
"میں واضح طور پر بات کرتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ ایسے ہندوستانی مسلمانوں
کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے جو پاکستان سے صرف مایوس ہی نہیں ہوئے بلکہ
پاکستان سے متنفر ہو چکے ہیں۔"

"تو پھر پاکستان کو اس کے حال پر ہی کیوں نہ چھوڑ دیا جائے" ——
نئے ممبر نے کہا —— "ہم صرف ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے
جان و مال کا تحفظ کریں۔"

"نہیں!" —— ہاشمی نے کہا —— "پاکستان پاکستانیوں ہی کا نہیں بلکہ
یہ ہندوستان کے ہر مسلمان کا ملک ہے۔ پاکستان برصغیر کے ہر ایک مسلمان
کی جدوجہد اور قربانیوں کا حاصل ہے۔ پاکستان کو ہم برصغیر میں اسلام کا ایک
قلعہ سمجھتے ہیں۔ ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ ہندو پاکستان میں تخریب کاری کر رہا ہے۔
ہم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اس تخریب کاری کے خلاف ہم جو کچھ بھی کر سکتے ہیں
کریں۔ ایک نعرہ اپنے ذہن میں بٹھا لو اور پھر اس نعرے کو ایک عزم بنا لو۔ وہ
یہ کہ ہندو لیڈرشپ یہ کہتی ہے کہ پاکستان ہندوستان کا حصّہ ہے اور اسے
ہندوستان میں شامل کرنا ہے۔ ہم یہ عزم لے کر اُٹھے ہیں کہ پورا ہندوستان
پاکستان ہے۔"

"ہاشمی صاحب!" —— ایک پرانے ممبر نے کہا —— "اب ہم اصل
بات پر آ جائیں تو بہتر ہے۔ باقی باتیں یہ سمجھتے ہیں اور وہ سوجھ بوجھ بھی رکھتے
ہیں جو ہندوستان اور پاکستان کے ہر نوجوان کے دل میں پیدا
کرنا چاہتے ہیں۔"

* * *

"ہم اُس تخریب کاری کے خلاف کام کر رہے ہیں جو ہندوستان کی
حکومت اپنی انٹیلی جنس اور اپنے پاکستانی ایجنٹوں کے ذریعے پاکستان میں
کروا رہی ہے" —— ہاشمی نے کہا —— "میں ہندوؤں کے ان عزائم کے
پس منظر کو ذرا وضاحت سے بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ہمارے اس

دشمن نے پہلے یہ سکیم تیار کی تھی کہ پاکستان کو فوجی طاقت سے فتح کر کے
ہندوستان میں شامل کر لیا جائے۔ اس کے لئے ہندوستان کے پہلے وزیرِ اعظم
پنڈت نہرو نے چین کو اپنا دشمن بنا کر چین کے دشمن ممالک سے اسلحہ بارود،
ٹینک اور لڑاکا بمبار طیارے اکٹھے کر لئے۔ ان ممالک کے تعاون سے
ہندوستان نے اسلحہ بارود بنانے کی فیکٹریاں بنائیں۔ اٹھارہ سال بعد ۱۹۶۵ء
میں رن کچھ میں پاکستان کے ساتھ ایک سرحدی تنازعہ کھڑا کر کے باقاعدہ جنگی
کارروائی کی لیکن پاکستان کی فوج سے بہت بری شکست کھائی....

"اس وقت ہندوستان کا وزیرِ اعظم لال بہادر شاستری تھا جس کے
متعلق مشہور تھا کہ بہت شریف، سیدھا سادا اور نیک آدمی ہے لیکن اسلام
اور پاکستان کے معاملے میں وہ پنڈت نہرو سے بڑھ کر عیار اور چالاک تھا۔
اُس نے جب دیکھا کہ رن کچھ میں اُس کی فوج بُری طرح پسپا ہو رہی ہے تو
اُس نے فوراً فائر بندی کی پیش کش کر دی جو پاکستان کی حکومت نے قبول کر
لی لیکن شاستری نے فوراً ہی اعلان کر دیا کہ وہ پاکستان کو اپنی مرضی اور پسند
کے محاذ پر لڑائے گا۔ اس کے بعد ستمبر ۱۹۶۵ء میں بھارت کی فوجوں نے
پاکستان پر حملہ کر دیا۔ ہندوستانی حکومت اور فوج کا پلان یہ تھا کہ چند
دنوں کے اندر اندر پاکستان کو فتح کر لیا جائے گا لیکن سترہ دنوں کی جنگ
میں ہندوستانی فوج، ایئر فورس اور نیوی کو اتنا زیادہ نقصان اُٹھانا پڑا کہ یہ
عام خیال تھا کہ ہندوستان کو سنبھلنے میں کئی سال لگیں گے....

"یہ ایسا موقع تھا کہ پاکستان ہندوستان سے اپنی شرائط منوا سکتا تھا۔

اُدھر پاکستان کے کمانڈو جانبازوں نے مقبوضہ کشمیر میں ہندوستان کی فوج کو
اس حال تک پہنچا دیا تھا کہ کشمیر ہندوستان کے ہاتھ سے نکل گیا تھا لیکن
پاکستان کے برسرِ اقتدار لیڈروں کی حماقتوں نے یہ موقع گنوا دیا۔ ہندو لیڈر شپ
نے اپنی شکست سے بڑے اچھے نتائج اخذ کئے۔ ایک طرف اس نے
مشرقی پاکستان پر توجہ مرکوز کر لی اور دوسری طرف اس نے مغربی پاکستان
کے نوجوانوں کی اخلاقی تخریب کاری کی سکیم تیار کر لی۔ اس کے لئے ہندوستان

نے اپنے ریڈیو کو استعمال کیا۔ جالندھر ریڈیو سٹیشن سے صبح شام فلمی گانے
نشر ہونے لگے۔ یہ فرمائشی پروگرام ہوتے تھے جن میں فرمائش کرنے والوں
کے نام بھی سنائے جاتے تھے۔ ہم جانتے ہیں کہ ابتدا میں پاکستان کے
فرمائش کرنے والوں کے نام بہت ہی کم ہوتے تھے لیکن بہت سے
نام سنائے جاتے تھے اور ان کے ساتھ پاکستان کے مختلف شہروں اور
قصبوں کے نام بھی سنائے جاتے تھے۔ یہ سب جعلسازی تھی لیکن پاکستان
سے ہمیں جو اطلاعیں ملیں ان سے پتہ چلا کہ پاکستان کے نوجوان ان فرضی
ناموں کو اصلی سمجھ کر اپنی فرمائشیں جالندھر ریڈیو سٹیشن بھیج رہے ہیں
....اس کے بعد فلمی گانوں کے پاکستانی شائقین کے خط بھی جالندھر ریڈیو
سٹیشن سے سنائے جانے لگے۔ ان خطوط میں بھارت اور پاکستان کی
محبت کا اظہار ہوتا تھا۔"

"یہ خطوط بھی ہندوستانیوں کے اپنے دماغ کی اختراع ہوں گے"——
ایک نئے ممبر نے کہا——"ہندو خود ہی لکھ لیتے ہوں گے۔"

"ابتدا تو اسی طرح ہوتی تھی"—— ہاشمی نے کہا——"لیکن پاکستان سے
آنے والوں نے بتایا کہ وہاں کے نوجوان فلمی گانوں کے نشئی ہو چکے ہیں۔
گھروں میں، بازاروں میں، کالجوں کے ہوسٹلوں کے کمروں میں، بسوں میں ہندوستانی
فلموں کے گانے لگے ہوتے ہیں۔ یہ کہنا کہ آل انڈیا ریڈیو سے پاکستانیوں
کے جو خطوط سنائے جاتے ہیں وہ یہاں کے ہندوؤں کی اپنی تحریریں ہوتی
ہیں، مشکوک سا لگتا ہے۔ ابتدا تو ہندوؤں نے خود ہی کی تھی لیکن پاکستانیوں
پر نشے کی جو کیفیت طاری ہو گئی تھی اس کے زیرِ اثر وہ ایسے خطوط لکھتے
رہے ہوں گے۔ میں نے جالندھر ریڈیو سٹیشن سے ایک پاکستانی کا خط
سُنا تھا جس میں اُس نے لکھا تھا کہ یہ میری خواہش ہے کہ لتا منگیشکر ہمیں
دے دیں اور ہم سے پورا کشمیر لے لیں۔"

"نہیں"—— ایک نئے ممبر نے کہا——"میں یہ تو نہیں مانوں گا
کہ کسی پاکستانی نے اتنی گھٹیا خواہش کا اظہار کیا ہو گا۔"

ہاشمی ہنس پڑا۔ اس گروہ کے پرانے ممبروں کی بھی ہنسی نکل گئی لیکن
یہ ہنسی ایسی نہیں تھی جیسی کسی لطیفے کی پیداوار ہوتی ہے۔ ان لوگوں کی
ہنسی میں طنز بھی تھی اور افسوس بھی۔

"یہ مت کہو" — ہاشمی نے کہا — "پاکستان میں ہندوستان
کے فلمی گانوں نے ایسی کیفیت طاری کر دی تھی کہ وہ ستمبر ۱۹۶۵ء کے اُن
شہیدوں کو بھی بھُلوا لئے جا رہے تھے جن کی لاشیں ابھی تک تر و تازہ تھیں
اور جو انہی لوگوں کی عزت و آبرو پر قربان ہو گئے تھے ..... میرا خیال ہے
کہ میں پہلے یہ بتا دوں کہ ہندو کے دماغ نے پاکستان کے نوجوان ذہن پر
غالب آنے بلکہ اسے ہپناٹائز کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کی تھی۔ انہوں
نے یہ سبق یہودیوں سے سیکھا تھا کہ مسلمانوں کو ختم کرنے کا بہترین طریقہ
یہ ہے کہ ان کے نوجوان ذہن کو پراگندہ کر دو۔ یہ یہودیوں کا ایک بڑا
ہی پرانا پلان تھا جس میں وہ خاصے کامیاب ہو چکے ہیں۔ ہندو نے یہی
حربہ پاکستان پر استعمال کرنا شروع کیا اور پہلے مرحلے میں ہی کامیابی حاصل
کر لی .....

"ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد ہندوستان کی فوجی اور سیاسی
قیادت کو بتایا گیا تھا کہ پاکستانی قوم خصوصاً پاکستان کے نوجوان لڑکوں اور
لڑکیوں نے اپنی فوج کی جس طرح پشت پناہی کی تھی اور اپنے ملک کے
دفاع کے لئے جو کام کئے تھے وہی ہندوستانی افواج کی شکست کا سبب
بنے تھے ..... میرے عزیز ساتھیو! اگر میں آپ کو پوری تفصیل سے سناؤں
کہ پاکستانی قوم نے اپنے ملک کے دفاع کے لئے کیسے کیسے کارنامے
سر انجام دیتے تھے اور نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں نے کس طرح دن
رات ایک کر دیتے تھے اور اپنی فوج کے زخمیوں کے لئے خون کے
تالاب مہیا کر دیتے تھے تو تمہارے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ میں جب
آج کے نوجوانوں کی باتیں سنتا ہوں تو یقین نہیں آتا کہ یہ ۱۹۶۵ء والے
پاکستانیوں کی نسل ہے۔ ہندو لیڈر شپ نے اس کا یہ علاج سوچا کہ پاکستان
کے نوجوان ذہن کو رومان پرستی اور جنسیت سے ایسا پراگندہ کر دو کہ

اس ذہن میں قومی وقار، مذہب اور ملک کے دفاع کے احساس کے
لئے ذرا سی بھی جگہ نہ رہے۔"

"آج کا پاکستانی نوجوان پستی کی اس حد تک اُتر آیا ہے جس حد تک
اُسے ہندو لانا چاہتا تھا" — ایک پرانے ممبر نے کہا۔

"ارشد میاں!" — ہاشمی نے کلاس کے استاد کے لہجے میں کہا —
"ڈسپلن کا خیال رکھو۔ اب میری بات مت کاٹو۔ میں نئے ممبروں کو ایک باقاعدہ
سبق دے رہا ہوں۔"

"معافی چاہتا ہوں" — ارشد نے نادم سا ہو کر کہا۔

ہاشمی نے اُس دَور سے بات شروع کی تھی جب جالندھر ریڈیو سٹیشن
کے فلمی گانے پاکستان کے نوجوانوں کے لئے ایک نشہ بن گئے تھے اور
بھارت کے اس تخریبی عمل کو تفصیل سے بیان کرتے کرتے یہاں تک
لے آیا جہاں وی سی آر ایک کردارکش وبا کی صورت اختیار کر چکا تھا اور
بھارت کی فلمیں گھر گھر دیکھی جاتی تھیں اور جس شام بھارتی ٹیلیویژن سے
فلم دکھائی جاتی تھی اُس شام پاکستانی گھروں میں لوگ کھانا پینا بھی بھُول جاتے
تھے۔ ہاشمی نے یہ بھی کہا کہ صرف نوجوانوں پر تخریبی اثرات قبول کرنے کا
الزام عائد کرنا بھی ٹھیک نہیں۔ پاکستان کے ہر عمر کے افراد وی سی آر اور
بھارتی فلموں کے ذریعے بھارتی عزائم کا شکار ہو چکے ہیں۔

"کیا پاکستان میں ہندوستان کے اس نوعیت کے حملے کو روکنے
کا کوئی انتظام نہیں؟" — ایک نئے ممبر نے پوچھا۔

"نہیں" — ہاشمی نے دو ٹوک لہجے میں جواب دیا — "اس قسم
کے نظریاتی، ثقافتی یعنی کردارکشی کے عمل کو روکنا حکمرانوں کا پھر تعلیمی اور
مذہبی اداروں کا کام ہوتا ہے۔ پاکستان میں اس ذمہ داری کو کسی نے بھی قبول
نہیں کیا۔ سیاسی لیڈر اقتدار کی جنگ میں لگے رہے۔ آدھا ملک گنوا کر
بھی انہوں نے کچھ نہ سوچا بلکہ اس شکست سے سبق حاصل کرنے کی بجائے

اسے ایک دوسرے کے مُنہ پر سیاہی مَلنے کے لئے استعمال کیا۔ ان پاکستانی لیڈروں نے اپنے ملک کی سلامتی اور باوقار بقا کو داؤ پر لگا دیا۔ اقتدار میں جو بھی آیا اُس نے ملک کو دونوں ہاتھوں سے لُوٹا۔ مذہبی لیڈر جو علمائے کرام کہلاتے ہیں، اپنی فرقہ بندیوں میں مصروف رہے۔ سیاسی لیڈروں کی ہی طرح ایک دوسرے پر گند اچھالتے رہے۔ تعلیمی ادارے بھی سیاسی جنگ میں گھسیٹ لئے گئے۔ طلبا کو تنظیموں میں بانٹ کر سیاسی لیڈروں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا گیا۔ سیاسی جماعتیں انہیں پیسے بھی دیتی رہیں اور ہتھیار بھی۔ مجھے یاد ہے کہ پاکستانی اخباروں نے لکھا تھا کہ یونیورسٹیوں اور کالجوں کے ہوسٹل گوریلا کیمپ بن چکے ہیں۔ وہاں حالت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ طلباء کی تنظیمیں ایک دوسرے پر اس طرح فائرنگ کرتی ہیں جس طرح سرحد پر پاکستان اور ہندوستان کے سرحدی دستے ایک دوسرے پر گولیاں برساتے رہتے ہیں یا جس طرح پاکستان کے قبائلی علاقے میں دو قبیلے آپس میں لڑتے ہیں....

"میں اب اصل بات پر آتا ہوں .... ہندوستان نے اپنی انٹیلی جنس سروس کے ذریعے پاکستان میں اپنا جال بچھا دیا ہے۔ سندھ میں تو ہندوؤں نے اُسی طرح اپنے پنجے گاڑ دیتے ہیں جس طرح مشرقی پاکستان میں گاڑے اور اُس صوبے کو مغربی پاکستان سے الگ کر کے دم لیا تھا۔ ہمیں دو اڑھائی برسوں سے یہ رپورٹیں مل رہی ہیں کہ پاکستان کے بعض نوجوانوں کو سبز باغ دکھا کر یہاں لایا جاتا ہے اور اُن کی برین واشنگ ایسے حسین اور دل کش طریقوں سے کی جاتی ہے کہ یہ نوجوان اپنے مذہب اور اپنے وطن کو نہ صرف یہ کہ بھول جاتے ہیں بلکہ اپنا دشمن سمجھنے لگتے ہیں....

"تم نے یہ بھی دیکھا ہو گا کہ اپنے طور پر جو پاکستانی سیر و سیاحت کے لئے یا اپنے عزیزوں سے ملنے کے لئے یہاں چند دنوں کے لئے آتے ہیں ان کے ساتھ یہاں کیا سلوک ہوتا ہے۔ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جائیں تو انہیں پولیس کو باقاعدہ اطلاع دینی ہوتی ہے کہ وہ فلاں جگہ فلاں کام کے

لئے جا رہے ہیں جہاں کی خفیہ پولیس اور انٹیلی جنس اپنے مخبروں کے ذریعے سائے کی طرح اُن کے ساتھ لگی رہتی ہیں۔ بعض اوقات بہانے تراش کر اُن کی بے عزتی بھی کر دی جاتی ہے۔ یہاں تک بھی ہُوا ہے کہ کہیں فرقہ وارانہ فساد ہُوا تو اُس علاقے میں کوئی بھی پاکستانی جو باقاعدہ پاسپورٹ اور ویزا پر آیا تھا، گرفتار کر لیا گیا۔ ایسے پاکستانیوں کو پاکستان کے بھیجے ہوئے تخریب کار کہا جاتا ہے۔ علی گڑھ میں ایسے کئی پاکستانی گرفتار کئے گئے ہیں....

"اور اُن پاکستانیوں کو جنہیں یہاں انٹیلی جنس کے ذریعے لایا جاتا ہے، مہمانِ خصوصی سے بھی زیادہ درجہ دیا جاتا ہے۔ انہیں اشوکا جیسے ہوٹلوں میں ٹھہرا کر اُن پر دولت اور حسین لڑکیوں کا جال پھینکا جاتا اور ایسے انداز سے اُن کے ذہنوں کو اپنے سانچے میں ڈھالا جاتا ہے کہ انہیں محسوس تک نہیں ہوتا کہ ان کا کردار اور سوچ و فکر کا انداز ہی بدل گیا ہے۔ ان نوجوان اور جواں سال آدمیوں کو ہزارہا روپے دے کر پاکستان واپس بھیج دیتے ہیں اور ان سے ہر قسم کی تخریب کاری کراتے ہیں۔ یہ جو پاکستان میں آئے دن کہیں نہ کہیں دھماکے ہوتے رہتے ہیں، یہ ہندوستان کے تربیت یافتہ پاکستانیوں سے کراتے جاتے ہیں۔"

"اس کا مطلب یہ ہُوا کہ پاکستانی آزاد نہیں رہنا چاہتے" —— ایک نئے ممبر نے کہا —— "کیا یہ بہتر نہیں کہ انہیں اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے؟ ہمیں اپنے متعلق یعنی ہندوستان کے مسلمانوں کے متعلق سوچنا اور کچھ کرنا چاہیئے۔ یہ بات کرنے کی تو ضرورت ہی نہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہے۔ ہمارا قتلِ عام تو ہو ہی رہا ہے، مسجدوں کو تالے لگائے جا رہے ہیں۔"

"پاکستان کو ہم نظر انداز نہیں کر سکتے" —— ہاشمی نے کہا —— "مَیں یہ بتا چکا ہوں کہ پاکستان صرف پاکستانیوں کا نہیں اور مَیں یہ بھی بتا چکا ہوں کہ ایک مضبوط پاکستان ہندوستانی مسلمانوں کے لئے کیوں ضروری ہے .... میں پاکستان کی کمزوریوں کی جو بات کر رہا ہوں اس سے یہ مطلب نہ لو کہ پوری

کی پوری پاکستانی قوم ان کمزوریوں کی ذمہ دار ہے۔ پاکستان کے لوگ دو طبقوں میں بٹے ہوتے ہیں۔ ایک طبقہ سیاسی لیڈروں کا ہے جو جاگیر دار ہیں۔ ان کی دولت سندی کا کوئی حساب نہیں۔ یہ صرف جاگیروں کی آمدنی نہیں۔ یہ طبقہ قومی خزانے کو لوٹنے کے علاوہ دولت اکٹھی کرنے کا ہر ناجائز ذریعہ حتیٰ کہ سمگلنگ تک کرتا ہے۔ کچھ عرصے سے ہیروئن پاکستان کی پہچان بن چکی ہے۔ یہ پاکستان کا حکمران طبقہ ہے۔ باقی تمام لوگ یعنی پاکستان کی ساری آبادی اس طبقے کی رعایا ہے۔ اِس رعایا میں مختصر سا ایک طبقہ افسر شاہی کا ہے۔ یہ طبقہ جاگیر داروں کی طرح پاکستان پر حکمرانی کرتا ہے۔ انہی کی اولاد اِس وقت ہندوستان کی انٹیلی جنس کے ہاتھوں میں کھیل رہی ہے۔ اس طبقے میں کچھ شریف اور محبِ وطن افسر بھی ہیں، لیکن وہ بے بس اور مجبور ہیں۔ انہیں مشکوک لوگ سمجھا جاتا ہے ....

"جہاں تک پاکستان کے عوام کا تعلق ہے ان میں وہی جذبہ ہے جو ہم میں ہے۔ ان عوام نے پاکستان کے لئے جان و مال کی قربانیاں دی بھی ہیں اور دیں گے بھی، لیکن ان کے لئے حالات ایسے پیدا کر دیئے گئے ہیں کہ وہ پیٹ کے چکر میں اُلجھ کر رہ گئے ہیں۔ تم جب بھی پاکستان کی بات کرو تو ہمیشہ یہ ذہن میں رکھو کہ اصل پاکستان پاکستانی عوام ہیں۔ اگر ان عوام کو محبِ وطن قیادت مل جاتے تو وہ ان ہندوستانی حکمرانوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیں۔ ہم انہی عوام کو ہندوستان کے اس زہر سے بچانا چاہتے ہیں جو وہ نام نہاد پیار اور محبت اور طلسماتی طریقوں سے پاکستان میں پھیلا رہا ہے۔"

ہاشمی نے چند اور ضروری باتیں نئے ممبروں کو بتائیں اور ایک بار پھر کہا کہ وہ پاکستانی عوام کو پاکستانی قوم نہ سمجھیں بلکہ پاکستان اور ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک قوم کہا کریں یا برِصغیر کے مسلمان کہیں۔

"تم ہمارے محاذ کے نئے ممبر ہو جنہیں ہم مجاہدین کہتے ہیں" ——

ہاشمی نے کہا —— "لیکن تمہیں مجاہدین اُس وقت کہا جائے گا جب تم باقاعدہ قرآن مجید پر ہاتھ رکھ کر محاذ اور محاذ کے مقصد کے ساتھ وفاداری کا حلف اٹھاؤ گے۔ اس وقت میں تمہیں اپنا لائحہ عمل صرف اُس حد تک بتاؤں گا جو حلف اُٹھانے سے پہلے بتایا جانا چاہیئے۔ اس کے بعد جب تم عملی طور پر ہمارے ساتھ کام کرنے لگو گے تو بتانے کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہو گی کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔"

"آپ ہمیں حلف کے بغیر بھی وفادار پائیں گے" —— ایک نئے ممبر نے کہا۔

"اگر وفاداری نہیں کرو گے تو شاید تمہیں محاذ سے الگ کر دیا جائے" —— ہاشمی نے جواب دیا —— "لیکن غداری کرو گے تو یُوں سمجھ لو کہ تم نے خودکشی کی کامیاب کوشش کی ہے۔ جس روز تمہارے دماغ میں محاذ سے غداری کا خیال آیا وہ تمہاری زندگی کا آخری دن ہو گا۔"

"ہمارے دوستو!" —— محاذ کے ایک پرانے ممبر نے کہا —— "اسے دھمکی نہ سمجھنا۔ ہم اپنی جانیں اللہ کے سپرد کر چکے ہیں۔ ہمارے لئے زندگی اور موت کا صرف ایک مطلب رہ گیا ہے..... اسلام اور برِصغیر کے مسلمانوں کا تحفظ.... ہم نہ مرنے سے ڈرتے ہیں نہ کسی کو مارنے سے ڈریں گے۔"

"ہم ہندوستان کے انٹیلی جنس کا مقابلہ اس طرح نہیں کر سکتے جس طرح ایک فوج دوسری فوج کا کرتی ہے" —— ہاشمی نے کہا —— "نہ ہی ہم ہندوستانی انٹیلی جنس کا مقابلہ اُس طرح کر سکتے ہیں جسے کاؤنٹر انٹیلی جنس کہا جاتا ہے۔ ہم صرف یہ کر سکتے ہیں کہ جس کسی کے متعلق پتہ چلے کہ یہ شخص ہندوستان کے مسلمانوں کو ہندوستان کے حق میں گمراہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے یا مسلمانوں کے خلاف مخبری کرتا ہے اُسے پکڑا جائے۔"

"اور اُسے قتل کر دیا جاتے؟" —— نئے ممبروں میں سے ایک نے پوچھا۔

"نہیں" — ہاشمی نے جواب دیا — "کسی بھی جاسوس کو فوراً نہیں پکڑا جاتا بلکہ اُس کا پیچھا کیا جاتا ہے کہ وہ کس کس سے ملتا ہے۔ اس طرح اُس کے دوسرے ساتھیوں کی بھی نشاندہی ہو جاتی ہے۔ پھر اُسے گرفتار کر کے ایذا رسانی کے ذریعے اُس سے راز لئے جاتے ہیں ..... ان تفصیلات کو چھوڑیں۔ یہ مَیں جانتا ہوں کہ ہمارا طرزِ عمل کیا ہے۔ مَیں نے اپنے ایک عزیز دوست سے ٹریننگ لی ہے۔ وہ ہندوستان کی انٹیلی جنس میں رہ چکا ہے اور اب ریٹائرڈ زندگی گزار رہا ہے اور ہمیں اُس کا مخلصانہ تعاون حاصل ہے۔ یہاں سے آگے کچھ بتانے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ نئے ممبروں سے حلف لیا جاتے۔ مَیں ان نئے ساتھیوں سے درخواست کرتا ہوں کہ وضو کر آئیں۔"

تینوں نئے ممبر اُٹھے۔ میزبان انہیں باہر لے گیا اور وضو کرا کے واپس کمرے میں لے آیا۔ اس دوران قرآن مجید سامنے رکھا جا چکا تھا۔ تینوں ممبروں نے ہاشمی کے کہنے پر قرآن مجید پر اپنا اپنا دایاں ہاتھ رکھا۔ ہاشمی نے حلف نامے کے الفاظ کہے جو نئے ممبر اُس کے ساتھ دُہراتے گئے۔ پھر تینوں نے قرآن مجید باری باری ہاتھ میں لے کر چُوما اور آنکھوں سے لگایا۔

"اللہ کے مجاہدو!" — ہاشمی نے کہا — "اب تمہاری جانیں اس مقدس کتاب کے ذریعے اللہ کے سپرد ہو گئی ہیں۔ میں تمہیں وہ مشن بتاتا ہوں جس پر فوری طور پر کام شروع کرنا ہے" — ہاشمی نے پرانی دِلّی کے ایک محلے کا نام لے کر کہا — "وہاں کے ایک ادریس احمد کو تم جانتے ہو گے۔ وہ حال ہی میں ریلوے کی ملازمت سے ریٹائر ہوتے ہیں۔"

دو نئے ممبروں نے کہا کہ وہ ادریس احمد کو جانتے ہیں اور انہوں نے یہ بھی کہا کہ وہ شریف اور معزز آدمی ہے۔

"لیکن ان کا بیٹا ان کی طرح شریف اور معزز نہیں" — ہاشمی نے کہا۔

— "کیا آپ عزیز احمد کی بات کر رہے ہیں؟"

"ہاں" — ہاشمی نے جواب دیا — "میں اُسی عزیز احمد کی بات

کر رہا ہوں ..... یہ شخص انڈین انٹیلی جنس کا سرگرم رکن ہے۔ اس کا پاکستان میں آنا جانا لگا رہتا ہے۔ آج کل بھی وہ غائب ہے۔ خیال یہی ہے کہ وہ پاکستان گیا ہو گا۔ ہم کچھ عرصے سے اُس کی حرکات و سکنات دیکھ رہے ہیں۔ میں نے اپنے جس عزیز دوست کا ذکر کیا ہے کہ وہ یہاں کی انٹیلی جنس میں سروس کر چکا ہے، اُس کے تعاون اور راہنمائی سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ وہ پاکستان کے ایک خاص طبقے کے نوجوانوں میں کام کر رہا ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ وہ ایک پاکستانی نوجوان امیرزادے کو یہاں لا کر انڈین انٹیلی جنس کے حوالے کر چکا ہے۔ اب ہم نے اُس کی اس کارکردگی کے متعلق مزید شہادت حاصل کرنی ہے پھر اس کے خلاف کوئی کارروائی کریں گے۔"

❦

ادریس احمد دِلّی کا ایک وضع دار آدمی تھا۔ انگریزوں کے دَور میں وہ ریلوے میں ملازم ہوا تھا۔ اب اُس کی عمر ستر سال ہونے کو تھی۔ اُن کی چھ بیٹیاں اور صرف ایک بیٹا تھا جو پانچ بیٹیوں کے بعد پیدا ہوا تھا۔ اولادِ نرینہ کے لئے ادریس احمد کی بیوی نے ہر سال ہر اُس درگاہ، خانقاہ اور آستانے کی دہلیز پر ماتھا رگڑا تھا جس کا اُسے کسی نے راستہ دکھایا تھا۔ ہر سال اجمیر شریف کے دو پھیرے تو میاں بیوی کا معمول بن گیا تھا۔ نذر نیاز اور خیرات تو وہ دل کھول کر دیتے تھے۔

ادریس احمد نے تحریکِ پاکستان میں ایسا مجاہدانہ رول ادا کیا تھا کہ اپنی نوکری خطرے میں ڈال دی تھی۔ اُسے اُس کے دوستوں نے کہا بھی تھا کہ وہ اپنے بچوں کے مستقبل کو خطرے میں نہ ڈالے لیکن اُس نے ایک ہی بار جواب دے کر سب کو ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا تھا۔

"میرے عزیز دوستو!" — اُس نے کہا تھا — "میری عمر عبادت میں گزر رہی ہے۔ میں برِصغیر میں ایک آزاد مسلمان مملکت کے قیام کی جدوجہد کو بھی عبادت سمجھتا ہوں۔ قیام پاکستان کے لئے اگر مجھے نوکری

کے ساتھ اپنی آبائی جائیداد بھی قربان کرنی پڑی تو میں بخوشی یہ قربانی دوں گا۔ یہ قربانی اللہ کی خوشنودی کے لئے ہوگی۔

اُس دَور میں ہندوستان کے مسلمانوں کے جذبات ایسے ہی تھے۔ ادریس احمد کا کردار غیر معمولی نہ تھا۔ اُس کے ہندو ساتھیوں نے اُسے کئی بار کہا تھا کہ پاکستان تمہارے لیڈروں کا ایک خواب ہے اور یہ اُن خوابوں میں سے ایک ہے جس کی کوئی تعبیر نہیں ہوتی۔

"ادریس میاں!" —— اُسے اُس کے ہندو ساتھی کہتے ہی رہتے تھے —— "اگر پاکستان بن بھی گیا تو یہ دہلی سے بہت دُور بنے گا۔ دہلی ہر صورت میں انڈیا کا دارالحکومت رہے گا۔ تم یہیں رہو گے۔ تمہاری جائیداد اور تمہارے بیوی بچے یہیں رہیں گے۔ پھر کیوں نہ تم ہمارا ساتھ دو۔ ہم سے دشمنی مول نہ لو۔ مسلم لیگ کو اور محمد علی جناح کو ذہن سے اُتار دو اور کانگریس میں شامل ہو جاؤ۔"

ادریس احمد کو ہی نہیں آج کے بھارت کے ہر مسلمان کو ہندوؤں نے اسی طرح ورغلایا تھا، ڈرایا اور دھمکایا بھی تھا کہ وہ ہندوؤں کا ساتھ دیں اور پاکستان کا نام لینا چھوڑ دیں۔ آج کے بھارت کے اُس دَور کے مسلمان جانتے تھے کہ پاکستان بن بھی گیا تو اُن کے علاقے پاکستان میں شامل نہیں ہوں گے پھر بھی وہ برصغیر میں ایک آزاد مسلم مملکت کے قیام کے لئے جہاد کو اپنا فرض سمجھتے تھے۔

آخر ہندوستانی مسلمانوں کی جدوجہد اور قربانیوں کا ثمر مل گیا۔ پاکستان معرضِ وجود میں آگیا۔ ہندوؤں نے سکھوں کو اپنے ساتھ ملا کر اپنی پولیس اور فوج کی پشت پناہی میں اُن علاقوں کے مسلمانوں کو جو پاکستان میں شامل نہیں تھے جو سزا دی وہ ایک الگ داستان ہے۔ آزاد ہندوستان کی حکومت کی سرکاری پالیسی یہ تھی کہ ہندوستان میں کوئی مسلمان نہ رہے۔ قتلِ عام، لوٹ مار، آبروریزی اور آتش زنی سے لاکھوں مسلمانوں کو ختم کیا گیا اور دہشت طاری کی گئی کہ بچے کھچے مسلمان پاکستان کو بھاگ جائیں۔

ادریس احمد اُن ہندوستانی مسلمانوں میں سے تھا جنہوں نے اپنے آبائی گھر نہ چھوڑے اور پاکستان کو ہجرت نہ کی۔ ادریس احمد کا گزارہ صرف تنخواہ پر ہی نہیں تھا۔ وہ ایک خوشحال اور باوقار خاندان کا فرد تھا جس کی بہت بڑی حویلی تھی اور اس سے ذرا چھوٹے دو مکان الگ تھے جو کرائے پر چڑھے ہوتے تھے۔ دہلی میں ہی رُکے رہنا ادریس کے لئے زیادہ خطرناک تھا کیونکہ اُس وقت جب ہندو مسلمانوں کا خون بہا رہے تھے ادریس کی دو بیٹیاں جوان تھیں اور تیسری بیٹی لڑکپن کی عمر میں تھی۔ اس محلّے میں تمام تر آبادی مسلمانوں کی تھی۔ کئی اور مسلمان جو ہندوؤں کے محلوں میں رہتے تھے ادریس احمد کے محلّے میں آگئے تھے۔ اس محلّے کو مسلمانوں نے باقاعدہ مورچہ بنا لیا تھا۔ اس طرح یہ محلّہ ہندوؤں سے محفوظ رہا تھا۔

ریلوے میں ادریس احمد کی نوکری قائم رہی۔ اُس کی دو اور بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ پاکستان کی عمر دس گیارہ سال ہو چکی تھی جب دہلی میں ادریس احمد کے گھر بیٹا پیدا ہوا۔ ماں باپ نے اس کا نام عزیز احمد رکھا۔ بچے کے ماں باپ اور اس کی بہنیں خوشی سے پاگل ہوتی جا رہی تھیں۔ ادریس احمد کی بیوی جب زچگی کا عرصہ پورا کر کے سفر کے قابل ہو گئی تو اس نے بڑا لمبا سفر اختیار کیا۔ بچے کو اُٹھائے ہوئے وہ ہر اُس درگاہ، خانقاہ اور ہر اُس درویش اور بزرگ کے آستانے پر گئی جہاں جہاں اُس نے اولادِ نرینہ کے لئے دعائیں مانگی تھیں۔

یہ بچہ ماں باپ اور بہنوں کا کھلونا بن گیا۔

وقت بڑی تیزی سے گزرتا گیا۔ بچہ بڑا ہوتا گیا۔ وہ جب بیٹھنے لگا تو گھر میں جشن منایا گیا۔

وہ ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل چلنے لگا تو اس کی تقریب منائی گئی۔

وہ اپنے پاؤں پر چلنے لگا تو اس کا جشن منایا گیا۔

پھر وہ بھاگنے دوڑنے لگا اور اُس عمر کو پہنچ گیا جس عمر میں بچے کو

سکول میں داخل کرایا جاتا ہے لیکن ماں اور بہنیں اب بھی اُسے کھلونا ہی سمجھتی تھیں۔ اس کی جن بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں وہ عزیز احمد سے اپنے بچوں سے زیادہ پیار کرتی تھیں۔ ماں کا تو یہ حال تھا کہ بچہ رات کو کروٹ بدلتا تو ماں جاگ اُٹھتی اور بے تابی سے بچے کو دیکھتی کہ اسے کوئی تکلیف تو نہیں۔

بچے کی ہر فرمائش فوراً پوری کی جاتی تھی۔ اگر آدھی رات کے وقت بچے نے جاگ کر یہ ضد شروع کر دی کہ ریل گاڑی دیکھنی ہے تو باپ اُسے اُٹھا کر باہر نکل گیا اور تانگہ لے کر ریلوے سٹیشن پر جا پہنچا۔ اپنی ہر جائز اور ناجائز ضد اور فرمائش منواتے منواتے جب بچہ سکول میں داخل ہونے کی عمر کو پہنچا تو اس نے یہ حکم جاری کر دیا کہ وہ سکول میں داخل نہیں ہو گا۔ اُسے جب سکول میں داخلے کے لئے لے جانے لگتے تو وہ ہنگامہ برپا کر دیتا اور ماں اُسے چھ سال کی عمر میں بھی اُٹھا کر گلے لگا لیتی اور ادریس احمد سے کہتی کہ آج نہیں کل سہی۔

روپے کے سکے، اٹھنیاں اور چونیاں عزیز احمد کے لئے کھلونا تھیں۔ ماں باپ اُس کے کھیلنے کے لئے اٹھنیاں اور چونیاں گھر میں موجود رکھتے تھے۔ پیسوں کا لالچ دے دے کر اُسے سکول میں داخل کرایا گیا۔ وہ پانچ سات روپے جیب میں ڈال کر سکول جاتا تھا۔ پڑھنے پڑھانے میں اُسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اُس کا جب جی چاہتا سکول سے اُٹھ آتا تھا۔ پیسے خرچ کرنا اُس کی عادت نہیں بلکہ فطرت بن گئی۔

ادریس احمد سکول ماسٹروں کو پیسے دے دے کر اپنے بیٹے کو پاس کرواتا رہا۔ اُس کے پاس پیسوں کی کمی نہیں تھی۔

عزیز احمد دسویں جماعت تک پہنچ گیا۔ سکول میں وہ نواب زادہ کہلاتا تھا۔ اس کے ناز و انداز اور اُس کی عادات نوابزادوں ہی جیسی تھیں۔ صرف باپ جانتا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کی نوابی کس طرح پوری کر رہا ہے۔ وہ اب محسوس کرنے لگا تھا کہ اُس نے اپنے بیٹے کو بگاڑ دیا ہے لیکن بیٹے کو سنوارنے کا وقت کبھی کا گزر گیا تھا۔ بیٹے کی عمر اب سترہ سال ہو گئی تھی۔

وہ اب لڑکا لگتا ہی نہیں تھا، وہ جوان ہو گیا تھا اور بڑا ہی خوبصورت جوان تھا۔

عزیز احمد کی دوستی ہندوؤں کے لڑکوں کے ساتھ تھی۔ وہ سیٹھوں کے بیٹے تھے اور اُسی کی طرح شاہ خرچ تھے۔ ہندو سیٹھ پیسے کے معاملے میں ایسے لاپروا اور بے نیاز نہیں ہوتے کہ بیٹے جتنے پیسے مانگیں وہ فوراً اُتنے ہی پیسے دے دیں لیکن ان سیٹھوں کے بیٹے اپنے ماں باپ سے جھوٹ بھی بولتے اور گھر سے پیسے چوری بھی کر لیا کرتے تھے۔ یہی طریقہ عزیز احمد نے اختیار کر لیا تھا۔ اب باپ اُس کی پیسوں کی فرمائش پوری کرنے سے گریز کرنے لگا تھا لیکن عزیز اپنی فرمائش پوری کروانے کا عادی تھا۔ اُس نے گھر سے پیسے چُرانے شروع کر دیئے۔ وہ شادی شدہ بہنوں کے ہاں جاتا اور اُن سے بھی پیسے بٹور لاتا تھا۔

اُس کے باپ کو پتہ چلا کہ اُس کا بیٹا اپنے دو بہنوئیوں سے مختلف جھوٹ بول کر اچھی خاصی رقم اُدھار بھی لے چکا ہے۔ باپ کے لئے یہ صورتِ حال بڑی ناگوار تھی۔ عزیز احمد کی بہنیں بھی اپنے خاوندوں سے شرمسار تھیں۔ ان سب نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اپنے بہنوئیوں کے آگے اپنے ماں باپ کو شرمسار نہ کرے۔ عزیز احمد نے اب اپنے آپ میں ایک ایسی خوبی پیدا کر لی تھی جس کے سامنے سب لاجواب ہو جاتے تھے۔ یہ خوبی تھی جھوٹ بولنا، چرب زبانی اور بڑے پیارے انداز میں بولنا۔ اُس نے یہ فن اپنے ہندو دوستوں سے سیکھا تھا۔

ادریس احمد کی خواہش یہ تھی کہ اُس کا بیٹا اعلیٰ تعلیم حاصل کرے لیکن بیٹا میٹرک پاس کرنے کے بھی قابل نہیں تھا اور اُس کی خواہشات باپ کی خواہش سے بالکل اُلٹ تھیں۔

عزیز احمد نے میٹرک کا امتحان دے دیا اور اس کے ساتھ ہی وہ گھر سے دو دو تین تین دن غائب رہنے لگا۔ اُس کی فطرت صرف روپے پیسے سے خوش رہتی تھی اور وہ روپیہ پیسہ حاصل کرنے کے لئے ہر ڈھنگ کھیلتا تھا۔

انہی دنوں ادریس احمد ریلوے سے ریٹائر ہو گیا اور اُسے بہت سی رقم ریلوے کی طرف سے ملی۔ عزیز احمد نے باپ کو یہ جھانسہ دیا کہ وہ پڑھنے کی بجائے کوئی کاروبار کرنا چاہتا ہے اس لئے اُسے رقم دے دی جائے۔ باپ جانتا تھا کہ بیٹا بڑا ماہر مکار اور عیار ہو گیا ہے۔ وہ بیٹے کو ایک پیسہ بھی نہیں دینا چاہتا تھا لیکن بیٹے نے زبان کا جادُو چلایا اور باپ کو ایسے سبز باغ دکھائے کہ باپ نے بخوشی پندرہ بیس ہزار کی رقم بیٹے کے حوالے کر دی۔

باپ کے ہاتھ سے رقم بھی گئی، بیٹا بھی گیا۔

بیٹا نہ جانے کہاں کہاں عیش موج کرتا رہا۔

ایک وہ وقت تھا کہ ماں باپ اور بہنوں نے اس بچّے کی پیدائش اور اپنے پاؤں چلنے تک کتی جشن مناتے تھے مگر اب گھر میں جیتے جاگتے بیٹے کا ماتم ہو رہا تھا۔ بیٹا دُور نکل گیا تھا۔ وہ گھر آتا تھا تو بھی پتہ چلتا تھا کہ وہ بہت دُور سے نظر آ رہا ہے۔

❦

عزیز احمد پچیس چھبیس سال کا ہو گیا۔ ماں باپ کی خواہش کہ اُسے اعلیٰ تعلیم دلائیں گے، مٹی میں مل چکی تھی۔ ماں اور بہنوں کی یہ خواہش کہ اکلوتے بیٹے اور بھائی کے لئے بڑی خوبصورت دلہن لائیں گے، ایسا خواب بن گئی تھی جو آنکھ کھلتے ہی ذہن میں ہی گم ہو جاتا ہے۔

عزیز احمد کو دُلہن کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اُس کی دوستی ہندو لڑکیوں کے ساتھ ہو گئی تھی۔ انہی دنوں کا ذکر ہے کہ ہاشمی ادریس احمد سے ملا۔

"ادریس صاحب!" ــــ ہاشمی نے کہا ــــ "ہم ایک دوسرے کو بڑی اچھی طرح جانتے ہیں۔ آپ کے ساتھ میری کوئی ایسی بے تکلفی تو نہیں کہ میں آپ کے ذاتی اور گھریلو معاملات میں دخل دوں، لیکن ہم ایک ایسے مقدس رشتے میں بندھے ہوتے ہیں کہ آپ کے مسائل کو مَیں اپنے مسائل سمجھتا ہوں۔ مَیں آپ کے ساتھ جس مسئلے پر بات کرنے لگا ہوں اس کا تعلق اسی مقدس رشتے سے ہے۔"

"ہاشمی صاحب!" ــــ ادریس احمد نے سانس بھر کر کہا ــــ "مَیں جانتا ہوں آپ کس مسئلے پر بات کرنا چاہتے ہیں اور مَیں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ کس خلوص سے یہ بات کرنے آتے ہیں۔ ہمارے درمیان اسلام کا جو رشتہ ہے وہ واقعی مقدس ہے۔ اسی ناطے سے چند اور احباب میرے ساتھ یہ بات کر چکے ہیں .... آپ میرے بیٹے کے متعلق کچھ کہنے آتے ہیں نا! آپ ضرور کہیں، لیکن ہاشمی صاحب! اس بیٹے نے مجھے قبل از وقت بوڑھا کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ میرا تعلق صرف اتنا سا رہ گیا ہے کہ وہ میری بیوی کے بطن سے پیدا ہُوا تھا اور میں اس کا باپ ہوں۔ اُس نے اپنے آپ کو خاندان سے اس طرح نوچ لیا ہے جیسے کسی درخت سے ایک شاخ ٹوٹ کر تپّا پتّا ہو جاتی ہے۔"

"آپ کے ساتھ بہت بُرا حادثہ ہُوا ہے" ــــ ہاشمی نے کہا ــــ "اتنی بیٹیوں میں اللہ نے ایک بیٹا دیا اور وہ بھی نافرمان نکلا۔ دوسرا حادثہ یہ ہے کہ آپ کے بیٹے کا تعلق صرف آپ کے ساتھ نہیں بلکہ یہاں کی مسلمان برادری کے ساتھ ہے۔ اگر وہ صرف آوارہ اور عیش پرست ہو جاتا تو یہ نقصان آپ کی ذات اور اس کی ذات تک محدود رہتا مگر یہاں صورت یہ پیدا ہو گئی ہے کہ اُس نے ہندوؤں کے ساتھ جا یارانہ گانٹھا ہے"۔

"مَیں اُن ہندوؤں کو جانتا ہوں" ــــ ادریس احمد نے کہا ــــ "وہ سب آوارہ اور بدکار ہیں"۔

"نہیں ادریس صاحب!" ــــ ہاشمی نے کہا ــــ "آپ اُنہیں نہیں جانتے۔ وہ ہندو آوارہ اور بدمعاش نہیں۔ وہ ایک خاص سکیم اور پلان پر عمل کر رہے ہیں۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ یہاں کی حکومت نے یہ پلان بنایا ہے کہ مسلمانوں کو گھیر کر اُن کی شادیاں ہندو لڑکیوں کے ساتھ اس شرط پر کرائی جائیں کہ یہ لڑکیاں اپنا مذہب نہیں چھوڑیں گی"۔

"میں جانتا ہوں ہاشمی صاحب!" — ادریس احمد نے کہا — "شادیوں کے بغیر ہی مسلمان نوجوانوں کو ہندو لڑکیاں اپنے جال میں پھانس کر انہیں ہندو بنا رہی ہیں لیکن اپنے بیٹے کو میں کس طرح اس جال سے نکالوں" — ادریس احمد کے آنسو نکل آئے۔ آنسو پونچھ کر بولا — "میں نے تو اُسے دل سے اُتار دیا ہے۔ اگر مر جاتا تو دل کو یہ تسکین تو ہوتی کہ اللہ نے دیا تھا اور اُس نے واپس لے لیا ہے۔"

"میں کسی اور شک پر بات کر رہا ہوں ادریس صاحب!" — ہاشمی نے کہا — "مجھے بہت افسوس ہے کہ میں آپ کے دُکھی دل کو مزید دُکھ دے رہا ہوں .... عزیز کے متعلق پتہ چلا ہے کہ وہ یہاں کی انٹیلی جنس کا باقاعدہ مخبر بن گیا ہے۔ یہ بھی سُننے میں آیا ہے کہ وہ پاکستان میں بھی جا چکا ہے یا جاتا رہتا ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہوں گے کہ ہندوستانی انٹیلی جنس مغربی پاکستان میں کیسی تخریب کاری کرا رہی ہے۔"

"مغربی پاکستان نہ کہیں ہاشمی صاحب!" — ادریس احمد نے کہا — "ہم نے تو مشرقی اور مغربی پاکستان بنایا تھا اور ہم کہا کرتے تھے کہ ہندوستان کو ہم نے درمیان میں لے لیا ہے، لیکن ان ہندوؤں نے پاکستان کو توڑنے کے عزم کو مذہبی فریضہ بنا لیا تھا اور انہوں نے پاکستان کو کاٹ کے رکھ دیا۔ اب اسے مغربی اور مشرقی کہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر میرا بیٹا ہندوؤں کا جاسوس بن گیا ہے اور وہ اُس پاکستان کی جڑیں کھوکھلی کر رہا ہے جس میں اُس کے اپنے باپ کی قربانیاں بھی شامل ہیں تو میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میرے بیٹے کے خلاف یہ الزام ثابت کر دیں تو میں اسے اپنے ان ضعیف ہاتھوں سے قتل کر دوں گا۔ میرا خیال ہے کہ اس سے بڑی نیکی اور کوئی نہیں ہو سکتی۔"

"اللہ نہ کرے کوئی مسلمان باپ اپنے بیٹے کو قتل کرے" — ہاشمی نے کہا — "میں نے آپ کے ساتھ یہ بات اس لئے کی ہے کہ آپ کو اگر اپنے بیٹے کی خفیہ سرگرمیوں کا علم نہ ہو تو ہو جائے۔ میں آپ کی مجبوری

اور بے بسی کو سمجھتا ہوں۔ میں آپ سے یہ نہیں کہہ رہا کہ اپنے بیٹے کو سمجھانا یا راہِ راست پر لانا آپ کی ذمہ داری ہے۔ اس ذمہ داری کو میں نے قبول کر لیا ہے۔ میں اپنے احباب کے ساتھ عزیز کو سمجھانے کی کوشش کروں گا۔"

"نہیں ہاشمی صاحب!" — ادریس احمد نے کہا — "آپ نے اس معاملے کو گہرائی میں جا کر نہیں سوچا۔ اگر آپ نے اس کے ساتھ یہ بات کی کہ وہ انڈیا کا باقاعدہ جاسوس بن گیا ہے اور اس کام سے باز آجائے تو اُسی رات آپ لاپتہ ہو جائیں گے۔ یہاں کے مسلمان مخبر اپنی ہی برادری کے خلاف مخبری کر رہے ہیں۔ میرا بیٹا سمجھ بوجھ کی حدود سے بہت دُور نکل گیا ہے۔ اُس نے اپنے خون کی لاج نہیں رکھی۔ وہ آپ کو کیا سمجھے گا۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے بیٹے کے ہاتھوں کسی مسلمان کو نقصان پہنچے .... یہ گناہ میرا ہے۔ میں نے اُسے بے جا پیار و محبت سے بگاڑا ہے۔"

ادریس احمد کو بولتے بولتے ہچکی سی آئی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ہاشمی اُسے تسلی دلاسہ دینے لگا، لیکن یہ سب جھوٹی تسلیاں تھیں۔

"ہاشمی صاحب!" — ادریس احمد نے بڑی لمبی آہ بھر کر کہا — "میں آپ کو اجازت دیتا ہوں کہ آپ کو ثبوت مل جائے کہ میرا بیٹا انڈیا کا جاسوس ہے اور وہ اُس پاکستان کو نقصان پہنچا رہا ہے جو میں نے بنایا تھا تو آپ اُسے قتل کر دیں اور اُس کی لاش غائب کر دیں، لیکن مجھے ضرور بتا دینا کہ میرے بیٹے کا ناپاک وجود اس دنیا سے اُٹھ گیا ہے۔ میں نے اس کی بدکرداری اور ہندوؤں کے ساتھ دوستی قبول کر لی تھی۔ میں نے دونوں مکان جو کرائے پر چڑھے ہوتے تھے اُس کے نام کر دیئے تھے۔ مجھے کسی نے بتایا ہے کہ اُس نے ایک مکان بیچ ڈالا ہے اور باہر کہیں کوٹھی بنوا لی ہے۔ میں نے یہ سب کچھ برداشت کر لیا تھا، لیکن اُس کے اس گناہ کو نہیں بخشوں گا کہ وہ پاکستان کے خلاف جاسوسی کر رہا ہے۔"

ہاشمی نے اپنے محاذ کے آدمیوں کے ساتھ باتیں کرتے ہوتے اپنے
ایک دوست کا ذکر کیا تھا جو بھارتی انٹیلی جنس میں سروس کر چکا تھا۔ اس کا
نام عبدالقدیر تھا۔ اس شک کا اظہار اُسی نے کیا تھا کہ عزیز احمد انڈین
انٹیلی جنس میں باقاعدہ شامل ہو چکا ہے اور پاکستان میں بھی جاتا رہتا ہے۔
عبدالقدیر نے ہاشمی کو مشورہ دیا تھا کہ عزیز کے باپ کے ساتھ پہلے بات کر
لی جاتے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہاشمی کا محاذ عزیز کے خلاف کوئی کارروائی کرے
تو اس کا باپ محاذ کے راستے میں رکاوٹ بن جاتے۔

ہاشمی عبدالقدیر سے ملا اور عزیز کے متعلق اُس کے باپ کے
ساتھ جو گفتگو ہوتی تھی وہ اسے سناتی۔

"ہاشمی بھاتی!" — عبدالقدیر نے کہا — "کسی بھی انڈین جاسوس
کے خلاف کوئی حرکت یا بات کرو تو بہت ہی احتیاط سے کرنا۔ عقل سے کام
لینا۔ جذبے اور جذبات کو اپنی عقل پر حاوی نہ ہونے دینا۔ مجھ سے مشورہ
لیے بغیر کوئی قدم نہ اُٹھانا۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ عزیز کا پیچھا کس طرح کرنا ہے
اور یہ کس طرح معلوم کرنا ہے کہ اُس کی درپردہ سرگرمیاں کیا ہیں۔"

عبدالقدیر نے ہاشمی کو ضروری ہدایات دیں اور اُسے کچھ
طریقے بتاتے جن سے عزیز کا پیچھا کر کے اُس کی خفیہ سرگرمیاں معلوم کی جا
سکتی تھیں۔

اگلے ہی روز سے ہاشمی نے ان ہدایات کے مطابق عمل شروع کر دیا۔
مسلسل دس بارہ روز تک عزیز کا کوئی سراغ نہ ملا۔ عزیز نے جو کوٹھی بنوائی تھی
وہاں تالے لگے ہوتے تھے۔ راتوں کو اس کوٹھی پر نظر رکھنے کا انتظام بھی
کیا گیا، لیکن عزیز کا کچھ پتہ نہ چلا۔

تین ماہ سے زیادہ عرصہ گزر گیا۔

ایک روز ہاشمی پھر اس کوٹھی کے قریب سے گزرا۔ وہ دراصل یہی
دیکھنے گیا تھا کہ عزیز یہاں موجود ہے یا نہیں۔ کوٹھی میں سے ایک آدمی
باہر آ رہا تھا۔ وہ کوٹھی کا ملازم لگتا تھا۔ ہاشمی اُس سے ملا۔

"عزیز صاحب موجود ہیں؟" — ہاشمی نے ملازم سے پوچھا۔

"کیوں؟" — اُس آدمی نے ہاشمی سے پوچھا — "کوئی کام ہے؟"

"کام ہے تب ہی پوچھ رہا ہوں بھاتی!" — ہاشمی نے کہا۔

"کام کیا ہے؟"

"میرے بھاتی!" — ہاشمی نے جھنجھلا کر کہا — "میں بھارت کے
وزیرِاعظم یا پریذیڈنٹ کی نہیں پوچھ رہا۔ میں عزیز صاحب کی پوچھ رہا ہوں۔
اگر مل سکتے ہیں تو مجھے بتا دو۔"

اس شخص نے ہاشمی کو سَر سے پاؤں تک دیکھا پھر پاؤں سے
سَر تک دیکھا جیسے ہاشمی کو نظروں سے ناپ رہا ہو۔ ہاشمی کا شک یقین
میں بدل گیا۔

"وہ یہاں نہیں ہیں" — اُس آدمی نے جواب دیا۔

"کب مل سکیں گے؟"

"یہ تو میں نہیں بتا سکتا" — اُس آدمی نے جواب دیا — "وہ ملک
سے باہر گئے ہوتے ہیں" — یہ کہہ کر یہ آدمی وہاں سے چلا گیا۔

پورا ایک سال گزر گیا۔ عزیز دلی میں کہیں نظر نہ آیا۔

ہاشمی تقریباً ہر روز عبدالقدیر کو رپورٹ دیتا رہا۔ عبدالقدیر نے یقین
کے ساتھ کہا کہ عزیز انڈین انٹیلی جنس کا خاص آدمی بن چکا ہے اور اسی سلسلے
میں کہیں باہر گیا ہوا ہے۔

ہاشمی نے جو محاذ بنایا تھا اس میں نئے ممبر شامل ہوتے رہے۔ یہ
کوئی ایسی تحریک یا تنظیم نہیں تھی جو جلسوں اور جوشیلی اور جذباتی تقریروں
کے دائرے میں بند رہتی اور جو چاہتا اس کا ممبر بن جاتا۔ ہاشمی کا محاذ ایک
خفیہ تحریک تھی جس کی کسی طریقے سے بھی تشہیر نہیں کرنی تھی نہ کی جاتی تھی۔
ممبر خود نہیں آتے تھے بلکہ لاتے جاتے تھے۔ لاتے جانے والے ممبروں
کو پہلے ہی ٹھونک بجا کر پرکھ لیا جاتا تھا۔ کسی جذباتی آدمی کو ممبر نہیں بنایا
جاتا تھا۔

یہ محاذ اُن دہشت گرد (ٹیررسٹ) گروہوں کی صورت اختیار کر رہا
تھا جو انگریزوں کے دورِ حکومت میں بنے اور انگریزوں کے خلاف تخریب کاری اور
تباہ کاری کرتے رہتے تھے۔ ہاشمی کے محاذ کی نگرانی عبدالقدیر کرتا تھا۔
اس گروہ کی تعداد ابھی ایک درجن بھی پوری نہیں ہوتی تھی۔

ایک سال بعد محاذ کے ایک ممبر نے ہاشمی کو اطلاع دی کہ اُس
نے عزیز کو دیکھا ہے۔

"اُس کے ساتھ دو نوجوان تھے" ـــ ممبر نے بتایا ـــ "معلوم نہیں
وہ پاکستانی تھے یا ہندوستانی۔ وہ سینما ہال سے فلم دیکھ کر نکل رہے تھے۔"

ہاشمی نے عبدالقدیر کو بتایا۔ عبدالقدیر نے ہاشمی کو اچھی طرح سمجھایا
کہ عزیز احمد کا تعاقب کس طرح کرنا ہے۔

پانچ چھ دنوں کی مسلسل کوشش کے بعد ایک روز ہاشمی کو عزیز نظر
آگیا۔ اُس روز ہاشمی مایوس ہو گیا تھا۔ ہر روز اُس کی کوٹھی پر نظر رکھنے کے
لئے اُس علاقے میں گھومتے پھرتے رہنے سے وہاں کے لوگ ہاشمی پر
شک کر سکتے تھے۔ اس کوٹھی کے سوا ہاشمی کو اور کوئی ایسی جگہ معلوم نہیں
تھی جہاں عزیز کی آمد و رفت تھی۔ آخر ایک روز اس کوٹھی سے ایک کار نکلی
جو عزیز چلا رہا تھا۔ ایک نوجوان اُس کے ساتھ والی سیٹ پر اور ایسا ہی
ایک نوجوان پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔

ہاشمی نے ایک ٹیکسی لی اور ڈرائیور کو عزیز کی کار دکھا کر کہا کہ اس
کے پیچھے چلو۔

عزیز کی کار لال قلعے کے سامنے جا رُکی۔ ہاشمی نے ٹیکسی کچھ دُور رکوا
کر ڈرائیور کو پیسے دیئے اور خراماں خراماں قلعے کے دروازے کی طرف
چل پڑا۔ عزیز اپنے ساتھیوں کے ساتھ قلعے کے اندر چلا گیا تھا۔ ہاشمی نے
خاصا فاصلہ رکھا اور وہ بھی قلعے میں داخل ہو گیا۔ اُس نے عزیز کو دیکھا جو
اِدھر اُدھر ہاتھوں سے اشارے کر کے اپنے ساتھیوں کو قلعہ دکھا رہا تھا۔

ہاشمی نے اپنا رُخ بدل دیا اور عزیز کو نظر میں رکھا۔ پندرہ بیس منٹ
بعد قلعے کے ایک حصے میں ہاشمی عزیز کے سامنے آگیا اور اس طرح چونک
کر رُک گیا جیسے اچانک اور غیر ارادی طور پر ان کی ملاقات ہو گئی ہو۔ عزیز بھی
رُک گیا اور اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

"کیا تم عزیز احمد ہو بھائی؟" ـــ ہاشمی نے مسرور سے لہجے میں کہا
اور عزیز کے ساتھ بغلگیر ہو کر بولا ـــ "ارے میرے عزیز! تمہیں دیکھے
ایک عمر گزر گئی ہے" ـــ اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر پوچھا ـــ
"کہاں ہوتے ہو؟ کیا کرتے ہو؟"

"ٹورازم ڈیپارٹمنٹ میں ہوں" ـــ عزیز نے کہا۔

ہاشمی نے اُس کے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔

"ان سے ملیں ہاشمی صاحب!" ـــ عزیز نے کہا ـــ "پاکستان
سے سیر و سیاحت کے لئے آتے ہیں۔ پہلی بار ہمارے ملک میں آتے
ہیں۔ غیر ملکی سیاحوں کو سیر سپاٹا کرانا میری ڈیوٹی تو نہیں۔ ان سے اتفاقیہ
ملاقات ہو گئی تو ان کی فرمائش پر ان کے ساتھ چل پڑا۔"

ہاشمی نے دونوں پاکستانی نوجوانوں سے ہاتھ ملاتے اور پاکستان
کا حال احوال پوچھا۔

"وہاں تو خاک اُڑ رہی ہے" ـــ ایک پاکستانی نے کہا۔

وہاں تو ابھی یہی فیصلہ نہیں ہوا کہ پاکستان کا مقصد کیا تھا" ـــ
دوسرے نے کہا۔

"انڈیا آپ کو کیسا لگا؟" ـــ ہاشمی نے پوچھا۔

"بہت اچھا" ـــ ایک پاکستانی نے جواب دیا ـــ "اصل آزادی تو
ہم نے یہاں دیکھی ہے ..... آپ کو بُرا تو نہیں لگ رہا کہ ہم اپنے ملک
کے خلاف بات کر رہے ہیں؛ آپ سمجھتے ہوں گے کہ پاکستان ایک اسلامی
ملک ہے اور ہم اس اسلامی ملک کے دشمن ملک کو اچھا کہہ رہے ہیں۔"

"نہ میاں نہ" ـــ ہاشمی نے کہا ـــ "ہم نے پاکستان کو دل سے

اتار دیا ہے۔ ہم جانتے ہیں پاکستان کتنا کچھ اسلامی ملک ہے۔"

"خوب کہا آپ نے ہاشمی صاحب!" — عزیز بولا — "اگر پاکستان نہ ہوتا تو انڈیا میں آج ہندو مسلم فسادات نہ ہوتے۔"

عبدالقدیر نے ہاشمی سے کہا تھا کہ عزیز سامنے آجاتے تو اُسے پیار اور تپاک سے ملے اور اگر وہ دونوں نوجوان بھی ساتھ ہوں تو ہاشمی پاکستان کے خلاف باتیں کرے۔ ہاشمی نے اس ہدایت پر خوب عمل کیا۔ اس کا اثر یہ ہُوا کہ عزیز احمد کا چہرہ چمک اُٹھا۔ وہ بار بار پاکستانی نوجوانوں کی طرف فاتحانہ اور مسرور انداز سے دیکھتا تھا۔ پاکستانی نوجوان تو ایسی باتیں کر رہے تھے جیسے پاکستان بہت ہی پسماندہ اور تہذیب و تمدن سے دُور افتادہ ملک ہو۔ انہوں نے انڈیا میں ہی رہنے کی خواہش کا اظہار بھی کیا۔

"عزیز میاں!" — ہاشمی نے کہا — "انہیں بمبئی کی بھی سیر کرا دو اور انہیں ان کے محبوب فلمی ستارے دکھا دو۔ سُنا ہے پاکستان میں بھارتی فلمیں بہت مقبول ہیں۔"

"وہاں تو انہیں ضرور لے جاؤں گا" — عزیز نے کہا — "فلمی ستارے دکھاؤں گا ہی نہیں، انہیں اُن سے ملواؤں گا۔"

"معاف رکھنا میرے عزیزو!" — ہاشمی نے کہا — "مَیں نے آپ کو راہ جاتے روک لیا ہے۔"

ہاشمی نے تینوں سے ہاتھ ملاتے اور آگے نکل گیا۔

❀

عزیز احمد سے اس ملاقات کے تین سال بعد ہاشمی اپنے محاذ کے سات آٹھ آدمیوں کو جن میں تین نئے ممبر تھے، سُنا رہا تھا۔

"مجھے یقین ہو گیا کہ عزیز پاکستان کا ہی نہیں ہندوستان کے مسلمانوں کا بھی غدار بن چکا ہے" — ہاشمی نے کہا — "میں اپنے تین مجاہدین سے جنہوں نے آج حلف اُٹھایا ہے، خاص طور پر مخاطب ہوں۔ میں اپنے اُس وقت کے جذبات بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں جب عزیز سے میں لال

قلعے میں دو پاکستانی نوجوانوں کے ساتھ ملا تھا اور اُن کی باتیں سُنی تھیں .... لال قلعہ ہندوستان میں مسلمانوں کی عظمت کا قابلِ فخر نشان ہے۔ یہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ دِلی ایک عظیم اسلامی سلطنت کا دارالحکومت تھا۔ اب اس پر ہندوؤں کا جھنڈا لہراتا ہے ....

"لال قلعہ ہمیں اُن مجاہدین کی یاد دلاتا ہے جنہوں نے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کی غلامی کی زنجیریں توڑنے کے لئے میرٹھ سے جہادِ آزادی کی ابتدا کی اور وہ دِلی کو ایک بار پھر اسلامی سلطنت کا دارالحکومت بنانے کے لئے میرٹھ سے دِلی پہنچے اور لال قلعے میں آتے تھے۔ اُن کا انجام جو کچھ بھی ہُوا لیکن وہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے نشانِ منزل چھوڑ گئے تھے ....

"ہمارے بزرگوں نے وہ منزل پا لی۔ یہ ہے پاکستان .... اور اب ہندو ہمیں پھر باوقار زندگی سے محروم اور ہمارے قومی تشخص کا خاتمہ کر رہا ہے۔ وہ دراصل ہمیں مجبور نہیں کر رہا کہ ہم اپنے تحفظ کا کوئی انتظام کریں بلکہ ہمیں احساس دلا رہا ہے کہ ہندوستان میں ہم اپنی ایک اور آزاد مسلم مملکت بنائیں۔ اُدھر سکھ اپنی آزاد ریاست کے لئے لڑ رہے ہیں۔ یہ اُن کا حق ہے۔ مسلمان تو اس ملک میں دوسری اکثریت ہیں مسلمانوں کو اپنی آزادی کا حق لینا چاہیئے اور ہم یہ حق لے کے رہیں گے ....

"میری بات نے پھر تقریر کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ اُس لال قلعے میں جو ہندوستان کی اسلامی سلطنت کا مرکز تھا، آج مسلمان ہی وہاں غداری کا کھیل کھیل رہے ہیں۔"

"دخل در معقولات کی معافی چاہتا ہوں" — ایک نئے ممبر نے کہا — "غداری کا کھیل تو لال قلعے میں اُس وقت بھی کھیلا گیا تھا جب ۱۸۵۷ء میں مجاہدین آزادی زندگی اور موت کا معرکہ لڑ رہے تھے۔"

"حقیقت یہ ہے کہ مُغلیہ خاندان کے شہنشاہوں نے اپنی سلطنت کے ساتھ خود غداری کی تھی" — ہاشمی نے کہا — "وہ اسلامی روایات سے منحرف ہو کر شہنشاہ بن گئے تھے۔ وہ شراب کے رسیا تھے اور انہوں

نے حسین ترین لڑکیوں سے حرم بھرے ہوتے تھے۔ اُن کے دلوں سے تکریمِ انسانیت نکل گئی تھی ..... یہی گناہ پاکستان کے حکمران کرتے چلے آ رہے ہیں ..... لُوٹ کھسوٹ اور عیش و عشرت ..... کیا قوم کے ساتھ یہ غدّاری نہیں؟ ..... ہندوستان میں اورنگ زیب عالمگیر اُس وقت تختِ نشین ہُوا تھا جب سلطنت کی عمارت بغاوتوں اور خانہ جنگی سے بنیادوں تک ہل چکی تھی اور گرنے والی تھی۔ اورنگ زیب جو ایک مومن حکمران تھا، اِس عمارت کو نہ سنبھال سکا۔ پاکستان کے شہنشاہ ایک بغاوت اور خانہ جنگی کرا چکے ہیں۔ انہوں نے اس کے انجام سے سبق حاصل نہیں کیا۔ خطرہ یہ نظر آ رہا ہے کہ پاکستان میں کوئی اورنگ زیب عالمگیر اُس وقت آئے گا جب اِس مقدس عمارت کی خدانخواستہ بنیادیں کھوکھلی ہو چکی ہوں گی۔ وہاں بغاوت کے آثار صاف نظر آ رہے ہیں اور ہندوستان کی حکومت جلتی پر تیل ڈال رہی ہے۔"

"ہاشمی صاحب!" ــــ ایک نئے ممبر نے کہا ــــ "یہ بالکل واضح ہو گیا ہے کہ پاکستان ہندوستانی مسلمانوں کی پناہ ہے اور یہ ہمارا قلعہ ہے۔"

"کشمیری مسلمان بھی پاکستان کو اپنی پناہ اور قلعہ سمجھتے ہیں" ــــ دوسرے نئے ممبر نے کہا ــــ "لیکن کشمیری مسلمان تو مایوس ہوتے چلے جا رہے ہیں۔"

"ہم پاکستان سے مایوس نہیں" ــــ ہاشمی نے کہا ــــ "ہمیں اور کشمیری مسلمانوں کو پاکستان کے حکمران مایوس کر رہے ہیں۔ یہ سب سیاسی لیڈر ہیں۔ یہ اقتدار اور دولت کے بھوکے ہیں۔ ہم نے اِن سیاسی بازی گروں اور سیاسی ذہنیت کے پاکستانی جرنیلوں کا نہیں بلکہ پاکستان کا اور ہندوستانی مسلمانوں کے قومی تشخّص کا تحفظ کرنا ہے۔ اس کے لئے ہمیں مسلح جہاد کی ضرورت ہے۔"

تین سال پہلے کا واقعہ ہے کہ ہاشمی عزیز سے لال قلعے میں دو پاکستانی نوجوانوں کے ساتھ ملا تھا۔ اُس نے عبدالقدیر کو وہ ساری باتیں سنائی تھیں جو اُس کی عزیز اور پاکستانی نوجوانوں کے ساتھ ہوئی تھیں۔

"اب تو کوئی شک نہیں رہ گیا" ــــ عبدالقدیر نے کہا تھا ــــ "عزیز پر نظر رکھو۔ دیکھو یہ انہیں کہاں کہاں لے جاتا ہے۔ معلوم نہیں عزیز جیسے کتنے ہندوستانی مسلمان اور ہندو یہ کام کر رہے ہیں۔"

اس کے بعد ہاشمی اور اُس کے تین ساتھی عزیز کو ڈھونڈتے رہے۔ اُس کی کوٹھی کو بھی نظر میں رکھا۔ اُس کے باپ سے بھی ملتے رہے۔ عزیز ہاشمی کے ایک آدمی کو صرف ایک بار دکھائی دیا لیکن دُور سے۔ اُس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ وہ دُور دُور سے ہی غائب ہو گیا۔

ہاشمی اور اُس کے محاذ کے ساتھیوں کو پولیس، سی آئی ڈی اور انٹیلی جنس جیسی اتھارٹی اور سہولتیں تو حاصل نہیں تھیں کہ وہ مطلوبہ افراد کو اُن کے گھروں اور متوقع ٹھکانوں پر چھاپے مار کر برآمد کر لیتے۔ وہ تو زمین دوز محاذ بناتے ہوتے تھے اور آگ سے کھیل رہے تھے۔ ان کے کسی ایک ساتھی کی ذرا سی بے احتیاطی انہیں ایسا گرفتار کرا دیتی کہ سب کے سب بغیر مقدمے کے باقی عمر جیلوں میں گزار جاتے۔

اِن تین سالوں میں اِس محاذ میں چند اور ممبر شامل ہو گئے تھے۔ ہاشمی اور عبدالقدیر نے تین چار ایسے سرکردہ مسلمانوں کے ساتھ رابطہ قائم کر لیا تھا جو سیاسی لیڈر نہیں تھے لیکن اثر و رسوخ والے تھے۔ انہوں نے مختلف جگہوں میں اپنے جاسوس پیدا کر لئے تھے۔ ان میں دو فائیو سٹار ہوٹل بھی تھے جن میں سرکاری مہمانوں کو ٹھہرایا جاتا تھا۔ یہ جاسوس بیروں کی حیثیت سے اِن ہوٹلوں میں کام کرتے تھے۔

اس محاذ نے جس کا ابھی کوئی نام ہی نہیں رکھا گیا تھا، اس عرصے میں کوئی عملی کارروائی نہیں کی تھی سوائے اس کے کہ اپنے ہم خیال آدمیوں کی کچھ تعداد اکٹھی کر لی تھی اور محتاط انداز سے مسلمانوں میں

وہی جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے تھے جسے انہوں نے اپنے محاذ کی بنیاد بنایا تھا۔

انہیں اطلاعیں ملتی رہیں کہ پاکستان سے آنے والے مسلمانوں کے ساتھ بھارت کی پولیس کیا سلوک کرتی ہے اور کس طرح سی آئی ڈی اور انٹیلی جنس کے مخبران کی نقل و حرکت کو دیکھتے رہتے ہیں اور انہی پاکستانیوں میں ایک دو ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں یہی انٹیلی جنس اپنا مہمانِ خصوصی سمجھتی ہے۔ یہ تو بھارت کے لوگ دیکھ ہی رہے تھے کہ پاکستان سے کوئی ادیب، شاعر، صحافی یا گانے بجانے والا آ جاتا ہے تو اُسے بھارت سرکار سر آنکھوں پر بٹھاتی ہے۔ ٹی وی اور ریڈیو سے اُس کے انٹرویو نشر ہوتے ہیں اور اُسے اس طرح آسمان پر چڑھا دیا جاتا ہے کہ اُس کا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔ اس دماغی خرابی میں اُسے پاکستان چھوٹا سا، فضول اور بے معنی سا ملک معلوم ہونے لگتا ہے۔

پاکستان کے قلمکاروں اور فنکاروں کی برین واشنگ جاری رہی اور جاری ہے۔

اس عرصے میں ہاشمی کو عزیز کہیں نظر نہ آیا۔

عزیز دلی میں کہاں نظر آتا، وہ اُس وقت لاہور میں تھا۔ اُس نے جو شکار پھانس لیا تھا وہ بڑا قیمتی اور موٹا شکار تھا۔

اصل شکار تو پاکستان ہو رہا تھا۔ عزیز جیسے بھیڑیئے اور مریم اور نبیلہ جیسی لومڑیاں ایک بہت بڑے درندے کے لئے شکار کھیل رہی تھیں۔

پاکستان ایک جنگل بن چکا تھا جس میں رابی جیسے خرگوشوں اور رشی جیسی بھیڑوں کی کمی نہیں تھی۔

عزیز نے رابی سے کہا تھا کہ مریم اور نبیلہ طوائفیں نہیں بلکہ تربیت یافتہ لڑکیاں ہیں۔ دونوں لڑکیوں نے رابی پر عزیز کی یہ بات سچ ثابت کر دی تھی۔ دونوں رابی کو اپنے اتنا قریب رکھتی تھیں جہاں سے جسموں اور

سانسوں کی بُو سونگھی جا سکتی ہے لیکن رابی کے لئے وہ سراب بنی رہتی تھیں دونوں الگ الگ اُس کے ساتھ دیوانہ وار محبت کا اظہار کرتی تھیں جیسے وہ ایک دوسری کی رقیب ہو گئی ہوں۔

پھر انہوں نے ایک دوسری کے خلاف باتیں شروع کر دیں جیسے رابی کی محبت میں وہ ایک دوسری کی دشمن ہو گئی ہوں۔

رابی اور رشی کی کلاس کی لڑکیاں اور لڑکے پاپ اور ڈسکو رقص کی محفلیں بپا کرتے رہے۔ شراب کی جگہ اب ماریجوانا اور ہیروئن لے رہی تھیں۔

پاکستان کی یہ نسل بیک وقت کئی نشوں کا شکار ہو گئی تھی ——
جاگیرداری، رشوت خور اور غبی افسر شاہی، سمگلنگ اور دیگر ناجائز ذرائع سے کمائی ہوئی دولت کا نشہ، شراب، امریکی گانجے اور ہیروئن کا نشہ، انگریزی زبان کا نشہ، کاروں اور کئی کئی کنالوں پر پھیلی ہوئی کوٹھیوں کا نشہ، اخلاقی قدروں، مذہبی پابندیوں اور قومی وقار کے انحراف اور فرار کا نشہ، باپوں کے اثر و رسوخ کا نشہ اور نوجوانی کا نشہ۔ نوجوانی کا تو صرف نشہ ہی رہ گیا تھا ورنہ اس نسل کی نوجوانی اُس محاورے جیسی تھی —— کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ —— ان کی نوجوانی یا جوانی میں بلیو فلمیں کچھ حرارت پیدا کرتی تھیں جو یہ لڑکے وی سی آر پر دیکھتے تھے۔ وہ یہ فلمیں لڑکیوں کو بھی دکھایا کرتے تھے۔

یہ نشے اسی کلاس تک محدود نہیں رہے تھے۔ یہ تو وبا کی طرح بلکہ تیز و تند ہوا کی طرح متوسط طبقے تک پہنچے پھر یہ وبا اس سے بھی نیچے والے طبقوں میں چلی گئی اور اس کے نتیجے میں ملک میں چوروں، رہزنوں، جیب کتروں، عورتوں سے پرس چھیننے والوں اور دیگر جرائم کے مجرموں میں اضافہ ہو گیا۔

ایمان فروشی میں اضافہ ہو گیا۔

انسانی جذبات مر گئے۔

قومی جذبے نیلام ہو گئے۔

جس ملک کے حکمران اپنے اقتدار کے استحکام اور مخالفین کو ختم کرنے کے لئے لیڈروں اور سرداروں کو خرید رہے ہوں اور جہاں حق کو باطل اور باطل کو حق کہہ کر سرکردہ لوگ اور لیڈر بک جانے میں فخر محسوس کر رہے ہوں وہاں کچھ لوگوں کا اپنے ملک اور اپنے مذہب کے دشمن کے ہاتھ بک جانا معیوب نہیں سمجھا جاتا۔

❦

رشی رابی کے ساتھ اُن کوٹھیوں اور ہوٹلوں وغیرہ میں جاتی رہی جہاں ڈسکو ہنگامے بپا ہوتے تھے۔ وہ رابی کی بیوی تھی اور بڑے فخر سے کہا کرتی تھی کہ وہ رابی کی بیوی ہے لیکن اُسے معلوم نہیں تھا کہ رابی کس جال میں آگیا ہے اور وہ اُسے محض رسمی بیوی سمجھتا ہے۔ رشی کے دل میں رابی کی محبت موجود تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب رابی اُسے کہتا تھا کہ آج وہ ایک جگہ اکیلا جا رہا ہے تو رشی اُس کے ساتھ جانے کی ضد نہیں کرتی تھی۔

رابی دوسرے تیسرے روز اُس کے ساتھ کوئی جھوٹ بول کر اکیلا چلا جایا کرتا تھا۔ اس طرح اُس کی ملاقاتیں عزیز، مریم اور نبیلہ کے ساتھ ہوتی تھیں۔ عزیز نے ایسا انتظام کر رکھا تھا کہ اکثر وہ اکیلا ہی رابی سے ملتا تھا۔ رابی جب مریم اور نبیلہ کے لئے بے تاب ہو جاتا تو عزیز اِن دونوں میں سے ایک کے ساتھ اُس کی ملاقات کرا دیتا تھا لیکن یہ ملاقات اس طرح ہوتی تھی جیسے عزیز نے کوہ قاف کی ایک پری کو کسی خاص علم اور عمل کے ذریعے اپنی جان کی بازی لگا کر حاضر کیا ہو۔

یہ پری رابی کے ہاتھوں میں آتی اور یوں غائب ہو جاتی کہ رابی خلاء میں دیکھتا تشنہ رہ جاتا۔

عزیز اُس پر جو طلسم طاری کئے رکھتا تھا اس کے اثرات نے رابی کی عقل اور ہوش و حواس کو اُس کے اپنے قبضے اور اختیار میں رہنے ہی نہیں دیا تھا۔

اِس طلسم ہوشربا سے عزیز کو رابی سے پاکستان کا ایک اور راز مل گیا۔ یہ راز اتنا زیادہ قیمتی تو نہیں تھا لیکن عزیز کو رابی نام کا جو پاکستانی مل گیا تھا وہ بہت قیمتی تھا کیونکہ وہ کچھ قیمتی معلومات لے آیا تھا۔ رابی کے باپ کے پاس تو ایسے راز تھے جو نئی دِلّی جا کر اسلام آباد کو اور زیادہ کمزور اور پاکستان کی سلامتی کو اور زیادہ خطرے میں ڈال سکتے تھے۔

رابی کا باپ اپنی ذمہ داریوں کو خلوص اور دیانتداری سے پورا کرنے والا اعلیٰ افسر تھا۔ وہ دفتر میں جو کام پورا نہیں کر سکتا تھا وہ گھر لے آتا تھا۔ یہ ایک دو فائلیں ہوتی تھیں جو "ٹاپ سیکریٹ" اور "کانفیڈینشل" کے زمرے میں آتی تھیں۔ عزیز نے رابی کو اپنے جال میں اِسی وجہ سے پھانسا تھا۔ بھارت کی انٹیلی جنس کی نظریں رابی کے باپ پر لگی ہوتی تھیں۔

عزیز کی ہدایات اور راہنمائی کے مطابق ایک رات رابی نے وہ دو فائلیں دیکھیں جو اُس کا باپ گھر لایا تھا۔ اُس کا باپ کام سے فارغ ہو کر اپنے بیڈروم میں چلا گیا اور سو گیا تھا۔ رابی چوروں کی طرح باپ کی سٹڈی میں داخل ہُوا۔ اُسے معلوم تھا کہ باپ فائلیں کہاں رکھتا ہے۔ اُس نے دونوں فائلیں نکالیں، سٹڈی روم بند کیا، فائلیں گاڑی میں رکھیں اور رشی سے کوئی جھوٹ بول کر نکل گیا۔ چونکہ اُس نے یہ پروگرام پہلے ہی بنا رکھا تھا اس لئے اُس نے گاڑی کار پورچ یا گیراج میں رکھنے کی بجائے کوٹھی سے باہر کھڑی رہنے دی تھی تاکہ رات کو اُس کی ماں یا باپ کو پتہ نہ چلے کہ گاڑی باہر گئی تھی۔

عزیز نے جب یہ فائلیں دیکھیں تو اُس کا چہرہ چمک اُٹھا۔ رابی نے اُسے کہا کہ وہ بڑی تیزی سے فائلیں دیکھ لے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اُس کا باپ جاگ اُٹھے اور اُسے پتہ چل جائے۔

"فرشتوں کو بھی پتہ نہیں چلے گا" ——— عزیز نے کہا ——— "تم میرے لئے ..... نہیں ..... تم اپنے لئے ایک خزانہ لائے ہو"۔

عزیز کو یہ بھی معلوم تھا کہ ایک ہسپتال کے سامنے دوائیوں والی

جو دکانیں چوبیس گھنٹے کھلی رہتی ہیں ان میں ایک کیمسٹ نے فوٹوسٹیٹ کی مشین بھی رکھی ہوتی ہے۔ عزیز نے ایک فائل سے تین چٹھیاں اور دوسری فائل سے پانچ چھ صفحوں کی ایک رپورٹ نکالی اور رابی کو ساتھ لے کر اُس کی گاڑی میں کیمسٹ کی دُکان تک گیا اور پاکستان کے اِن "ٹاپ سیکریٹ" کاغذات کی فوٹوسٹیٹ کاپی کرالی۔

"چلو"— عزیز نے رابی سے کہا — "مجھے ڈراپ کر کے گھر چلے جاؤ اور کل لنچ میرے ساتھ کرنا .... یہ بتا دو کہ لنچ پر مریم کو بلاؤں یا نبیلہ کو؟"

"نبیلہ کو"— رابی نے جواب دیا۔

"تمہارا اپنا بنک اکاؤنٹ ہے؟"

"ہے تو نہیں"— رابی نے جواب دیا — "کھلوا لوں گا۔"

"پھر میں تمہیں کیش دے دوں گا"— عزیز نے کہا — "اس سے اپنا اکاؤنٹ کھلوا لینا۔"

رابی عزیز کو ہوٹل میں اُتار کر اپنے گھر چلا گیا۔ فائلیں وہیں رکھ دیں جہاں سے اُٹھاتی تھیں۔ عزیز نے ان میں سے نکالی ہوئی چٹھیاں اور رپورٹ واپس رکھ دی تھیں۔

❦

صبح رابی کا باپ دفتر جانے کے لئے باہر نکلا تو اس نے دونوں فائلیں ایک بڑے خاکی لفافے میں ڈال کر لفافہ بغل میں دبا رکھا تھا کہ کوئی دیکھ نہ لے۔ وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھا اور ڈرائیور نے گاڑی چلا دی۔

رابی رشی سے جھوٹ بول کر بارہ بجے کے لگ بھگ گھر سے نکل گیا اور عزیز کے کمرے میں جا پہنچا۔ نبیلہ بھی وہاں موجود تھی۔ عزیز کی موجودگی میں ہی نبیلہ رابی سے اس طرح بے تابی بلکہ بے شرمی سے ملی جیسے اُسے رابی سے بچھڑے بڑی لمبی مدت گزر گئی ہو۔

لنچ کے بعد عزیز نے جب رابی کو کیش دیا تو رابی کی آنکھیں ٹھہر گئیں۔ اُسے اتنے زیادہ کیش کی توقع نہیں تھی۔ عزیز نے اُسے دوسرا

انعام یہ دیا کہ کسی کام کے بہانے اُسے نبیلہ کے پاس چھوڑ گیا۔

رابی نے پاکستان کی قیمت کی پہلی قسط وصول کر لی۔

اُس روز بھی پاکستان کے بہت سے گھروں میں وی سی آر پر بھارتی فلمیں دیکھی جا رہی تھیں۔ بعض گھروں کے بند کمروں میں بلیو فلمیں چل رہی تھیں۔ فلمی گانوں سے پاکستان کی فضا بوجھل اور مکدر ہوتی جا رہی تھی۔

اُس روز بھی پاکستان کے سیاسی لیڈر ایک دوسرے کے خلاف بیان دے رہے تھے۔ بازو لہرا لہرا کر تقریریں ہو رہی تھیں۔

اُس روز بھی سندھ اور کراچی میں خون بہہ رہا تھا اور ہمارے لیڈر اس کی ذمہ داری ایک دوسرے پر ڈال رہے تھے۔ ایک دوسرے کو آپس کی خونریزی کا مجرم کہہ رہے تھے — اور ہمارا دشمن اپنا کھیل کھیل رہا تھا۔

دشمن کا ایک بے حد خطرناک جاسوس جس کا نام عزیز تھا، رابی کو نبیلہ کے پاس اکیلا چھوڑ کر گیا تو شام چار بجے واپس آیا۔

"اب انڈیا کی سیر کی تیاری کرو رابی!"— عزیز نے کہا — "لیکن تم چاہو تو پورے سال کا ویزہ لے دوں گا .... وہاں کے تمام اخراجات ہمارے ذمے ہوں گے۔"

"نہ بھائی میرے!"— رابی نے کہا — "میں ایک سال کے لئے تو گھر سے نہیں جا سکتا۔ دو تین ہفتے کافی ہوں گے .... لیکن رشی بھی ساتھ جانے کی ضد کرے گی۔"

"اُسے ساتھ لے جائیں گے"— عزیز نے کہا — "لیکن اسے ابھی ان کاموں سے بے خبر رکھنا ہے۔ یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ اس وقت دیکھو رشی کہاں ہے۔ انڈیا چل کر بھی ہم تمہیں اس سے کچھ وقت کے لئے الگ کر لیا کریں گے۔"

"اگر اسے کسی وقت بتا بھی دیا جائے تو کوئی حرج نہیں ہوگا"— رابی نے کہا — "وہ بے وفائی نہیں کرے گی۔"

"تم نہیں سمجھتے رابی!" — عزیز نے کہا — "تم نے رشی کی جو فیملی بیک گراؤنڈ بتاتی ہے اس میں وفا نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی.... تم ابھی نہیں سمجھ سکو گے۔ میری نظر جو دیکھ سکتی ہے وہ ابھی تم نہیں دیکھ سکتے۔ غور کرو کہ وہ کیسی ماں اور کیسے باپ کی بیٹی ہے۔ اُس کی شخصیت ہے ہی نہیں۔ وہ ریتلی شخصیت کی مالک ہے۔"

"تم اپنی بیک گراؤنڈ دیکھو سلیمہ!" — اُس وقت جب رابی عزیز اور بسیلہ کے پاس بیٹھا اپنے ایمان اور پاکستان کی قیمت وصول کر رہا تھا، رشی کی ماں رابی کی ماں کے پاس آتی بیٹھی تھی۔ رابی کی ماں اُسے کہہ رہی تھی — "یہ تو ہم نے اپنے بیٹے کی ضد پوری کی تھی کہ تمہاری بیٹی کو مَیں نے اپنی بہو بنا لیا۔ ایک ہی ایک میرا بیٹا ہے۔ اس کی ضد کو مَیں ٹال نہ سکی۔ مَیں تمہیں صاف الفاظ میں بتا دیتی ہوں کہ کبھی کبھار آجایا کرو لیکن تمہارا بار بار یہاں آنا مجھے پسند نہیں۔ خود سوچو کہ تم کس شہرت کی عورت ہو۔"

"تم تو لگتا ہے ابھی ابھی کسی گاؤں سے آتی ہو" — سلیمہ نے کہا — "اَن پڑھ اور جاہل عورتوں جیسی باتیں کرتی ہو۔ مَیں تم سے کچھ لینے یا مانگنے تو نہیں آتی۔ میں نے بیٹی کو جو جہیز دیا ہے وہ ساری سوسائٹی نے دیکھا ہے۔ اتنا زیور اور اتنا جہیز کون دیتا ہے؟"

"سوسائٹی یہ بھی جانتی ہے کہ تم نے اتنا جہیز دینے کے لئے دولت کس طرح اکٹھی کی تھی" — رابی کی ماں نے کہا — "تم ہم سے زیادہ دولت اور جائیداد والی ہو۔ اس معاملے میں ہم تمہارا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ میں عزت اور آبرو کی بات کر رہی ہوں۔ اس معاملے میں تم کنگال ہو۔"

"آنٹی!" — رشی بول پڑی۔ رابی کی ماں سے کہنے لگی — "آپ میری ممی کی اِنسلٹ کر رہی ہیں۔ مَیں یہ ٹالریٹ نہیں کر سکتی۔"

"اور مَیں تجھے اپنے گھر میں بڑی مشکل سے ٹالریٹ کر رہی ہوں" — رابی کی ماں نے کہا — "اگر تُو نے میرے آگے زبان درازی کی تو میں تجھے کسی بھی وقت طلاق دلوا سکتی ہوں۔ مجھے تو لوگوں کو یہ بتاتے ہوئے

شرم آجاتی ہے کہ تُو کس ماں کی بیٹی ہے۔"

سلیمہ نے رابی کی ماں سے کہا تھا کہ تم تو کسی گاؤں سے آتی ہوتی لگتی ہو لیکن سلیمہ اور رشی نے جب رابی کی ماں پر جوابی حملہ کیا تو تینوں عورتوں نے کسی پسماندہ گاؤں کی گنوار اور اجڈ عورتوں کی لڑائی کا منظر بنا دیا۔ اِس کلاس کے آدمیوں کو غصہ آتا ہے تو انگریزی میں غصہ نکالتے ہیں لیکن اِن تین عورتوں نے انگریزی چھوڑ اُردو کو بھی الگ پھینکا اور پنجابی میں ایک دوسری پر طعنوں، کوسنوں اور گالیوں کے وہ تیر چلاتے کہ بھنگن اور نوکروں کو بھی مزہ آگیا۔

رشی کی ماں زبان کے تیر چلاتی ہوئی رخصت ہوگئی اور رشی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

رابی واپس آیا تو گھر میں خاموشی تھی۔ وہ ماں کے پاس گیا تو ماں بھی خاموش تھی۔ رابی کو دیکھ کر ماں کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔ رابی اپنے کمرے میں گیا تو رشی کے چہرے کے آثار بدلے ہوئے دیکھے۔ رابی پر عزیز کے دیتے ہوئے کیش اور نبیلہ کا نشہ طاری تھا۔ اُس نے رشی سے پوچھنا گوارا ہی نہ کیا کہ اُس کا چہرہ بدلا بدلا سا کیوں نظر آتا ہے۔

"رابی!" — کچھ دیر بعد رشی نے خود ہی کہا — "اپنی ماں سے کہہ دو کہ مَیں اپنی ماں کی بے عزتی برداشت نہیں کروں گی۔"

رابی نے سب سے پہلے تو یہ نوٹ کیا کہ رشی نے انگریزی کا ایک بھی لفظ استعمال نہیں کیا تھا۔ اُس نے یہ سارے الفاظ پنجابی لب و لہجے میں اُردو میں کہے تھے۔

"میری ماں نے تمہاری ماں کی کب بے عزتی کی ہے؟"

رشی نے اُسے پوری تفصیل سنا دی۔ اُس کے سنانے کا انداز مظلومانہ اور معصومانہ تھا۔ اُس کی ماں نے رابی کی ماں کو جو بیہودہ باتیں کہی تھیں وہ گول کر گئی اور تمام تر الزام رابی کی ماں پر تھوپا۔ رابی خاموشی سے سُن رہا تھا اس لئے رشی کی زبان زیادہ ہی کُھل گئی اور رابی کی ماں کے خلاف ایک دو ایسی باتیں کہہ بیٹھی جو رابی کو بہت بُری لگیں۔ وہ ابھی نبیلہ کے نشے کو

بے مزہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"رشی!" —— رابی نے خالص انگریزی میں کہا —— "مَیں اپنی ماں کے خلاف اتنی بیہودگی برداشت نہیں کروں گا۔ کیا تم اپنی ماں کے ماضی کو نہیں جانتیں؟ کیا تمہیں کسی نے بتایا نہیں کہ تمہارا باپ تمہاری ماں کی جوانی میں اُسے کس طرح استعمال کرتا رہا ہے؟ .... مَیں نے یہ ساری بیک گراؤنڈ جانتے ہوئے تمہارے ساتھ شادی کی ہے.... نہ کرنا چاہتا تو تم میرا کیا بگاڑ سکتی تھیں؟ تم تو شادی سے پہلے ہی میری بیوی بن چکی تھیں میں یہ بھی سوچ سکتا تھا کہ تمہارے تعلقات معلوم نہیں اور کس کس کے ساتھ رہے ہوں گے لیکن تمہارا جسم مجھے اتنا اچھا لگا کہ میں نے اپنی ماں اور باپ کو مجبور کر دیا کہ میں رشی کے سوا کسی اور لڑکی کو قبول نہیں کروں گا.... اور یہ بھی سوچ لو رشی!...."

"ٹھہرو رابی!" —— رشی نے خالص اُردو میں کہا —— "تم نے مجھ پر دو انکشاف کئے ہیں۔ ایک یہ کہ تمہیں میرے ساتھ دِلی یا روحانی محبت نہیں۔ تمہیں میرا جسم اچھا لگا تھا.... اور دوسرا انکشاف میری ماں کے متعلق ہے کہ اُسے میرا باپ کسی غلط طریقے سے استعمال کرتا رہا ہے"۔

"لیکن یہ انکشاف کوئی بھی نہیں کر سکتا کہ تمہارا باپ کون ہے" —— رابی نے کہا۔

رابی کو توقع یہ تھی کہ رشی اُس پر برس پڑے گی لیکن رشی کا ردِّعمل یہ تھا کہ اُس کی آنکھیں ٹھہر گئیں اور وہ یوں چپ ہوگئی جیسے اُس پر سکتہ طاری ہوگیا ہو۔

"رشی!" —— رابی نے اُس کا یہ ردِّعمل دیکھ کر نرم لہجے میں کہا —— "مجھے افسوس ہے کہ مَیں نے تمہارے دل کو تکلیف پہنچائی ہے لیکن میں ایک حقیقت کو چھپا نہیں سکتا"۔

"مَیں اس حقیقت کو جاننا چاہتی ہوں رابی!" —— رشی نے مغموم سے لہجے میں کہا۔

رابی نے اُسے بتا دیا کہ اُس کا باپ کس عہدے کا افسر تھا اور وہ غبن، جعل سازی اور رشوت خوری کا عادی مجرم تھا۔ رشوت خوری میں تو وہ کبھی بھی نہیں پکڑا گیا تھا کیونکہ پاکستان میں یہ کوئی جُرم نہیں سمجھا جاتا تھا۔ وہ غبن اور سرکاری رقمیں جعل سازی سے خورد بُرد کرنے کے جُرم میں کئی بار پکڑا گیا لیکن رشی کی ماں جو جوانی میں بڑی پُرکشش اور عیار تھی، اپنے آپ کو رشوت کے طور پر پیش کر کے رشی کے باپ کو چھڑا لاتی تھی۔ رابی نے رشی کو یہ بھی بتایا کہ اُس کا باپ آخر ایسا پکڑا گیا کہ اُسے سزائے قید ہوگئی۔

"ساری سوسائٹی تمہاری ماں کے ماضی سے آگاہ ہے" —— رابی نے کہا۔

رشی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُس نے کچھ بھی نہ کہا جیسے اُس نے اپنی ماں کے ماضی کی ہر بات تسلیم کر لی ہو۔

"اپنی ممّی سے کہو کہ میری ممّی اور ڈیڈی جیسے بھی تھے ان کی وجہ سے مجھ سے نفرت نہ کریں" —— رشی نے التجا کے لہجے میں کہا —— "اُن سے کہو کہ مَیں اپنی ماں جیسی تو نہیں"۔

"کہہ دوں گا" —— رابی نے کہا

"اور مَیں اپنی ممّی سے کہہ دوں گی کہ یہاں نہ آیا کرے" —— رشی نے کہا۔

اس سوسائٹی میں رشی کی ماں جیسی عورتوں کی کمی نہیں تھی لیکن رشی جو اس سوسائٹی کی لڑکی تھی، بہت ہی اُداس ہوگئی۔

"رابی!" —— رشی نے جذباتی سے لہجے میں کہا —— "خواہ میرے جسم سے محبت کرو لیکن محبت کرتے رہنا"۔

رابی نے رشی کو یوں شکست خوردہ دیکھا تو اُسے رشی پر رحم آگیا۔

"انڈیا چلو گی رشی؟"

"کیوں نہیں؟" — رِشی نے خوش ہو کر کہا — "پاسپورٹ اور ویزا کا بندوبست ہو جاتے گا؟"

"یہ کونسا مشکل کام ہے!" — رابی نے کہا — "عزیز کے ساتھ جائیں گے۔"

"پیسے بھی تو بہت چاہئیں" — رِشی نے کہا۔

"پیسوں کی کوئی کمی نہیں" — رابی نے کہا — "تم تیاری کرو۔"

چار یا پانچ دنوں میں ہی رابی اور رِشی کے پاسپورٹ بھی بن گئے۔ ویزے بھی مل گئے اور وہ دِلی جانے کی تیاری کرنے لگے۔

انہی دنوں ان کے نوکر نذر کا باپ اپنے بیٹے اور بہو سے ملنے آگیا۔ نذر نے اُسے رابی کے باپ اور اُس کی ماں سے ملوایا۔ وہ یہاں پہلی بار آیا تھا۔

"صاحب جی!" — نذر نے رابی کے باپ سے اپنے آپ کو ملواتے ہوتے کہا — "میرے ابا کی ایک ٹانگ نہیں ہے۔ سن پینسٹھ کی لڑائی میں کٹ گئی تھی۔ یہ فوج میں تھے۔"

"شاباش!" — رابی کے باپ نے کہا — "پاکستان تم جیسے مجاہدوں کی قربانیوں کی بدولت قائم ہے اور ہمیشہ قائم رہے گا۔ اس کا اجر اور انعام تمہیں اللہ دے گا۔"

رابی کے باپ نے جیب سے ایک سو روپے کا نوٹ نکالا اور نذر کے باپ کو دینا چاہا۔

"نہیں صاحب!" — نذر کے باپ نے کہا — "آپ نے خود کہا ہے کہ اجر اور انعام اللہ دے گا .... آپ کی بہت مہربانی صاحب! مَیں اللہ کے بندوں سے تو انعام نہیں لوں گا۔"

"لے لو" — رابی کے باپ نے کہا — "میں انعام نہیں دے رہا۔ میرا دل چاہتا ہے تمہیں کچھ دوں۔ تم نے ہمارے لئے اپنی ٹانگ کٹوائی ہے۔"

"مجھے اللہ نے انعام دے دیا ہے صاحب!" — نذر کے باپ نے

کہا — "یہ ہے روحانی سکون اور فخر۔ مَیں اللہ کے حضور جاؤں گا تو شرمسار نہیں ہوں گا۔ یہ نوٹ وہاں کام نہیں آئیں گے! .... آپ صرف یہ مہربانی کریں کہ میرے بیٹے اور بہو کا خیال رکھنا۔ چھوٹی اور معمولی سی غلطی کریں تو معاف کر دینا۔ اگر چوری کریں، جھوٹ بولیں تو انہیں بالکل نہ بخشنا۔"

"یہ ہمارے اپنے بچے ہیں" — رابی کے باپ نے کہا۔

نذر اور اُس کا باپ سلام کر کے وہاں سے آگئے۔ رات کو نذر نے اپنے باپ کو بتایا کہ رابی اور رِشی سیر سپاٹے کے لئے انڈیا جا رہے ہیں۔

"ہاں ابا!" — نذر نے کہا — "امیر لوگ ہیں۔ چاہیں تو ساری دنیا کی سیر کر سکتے ہیں۔"

"ساری دُنیا کی سَیر کو نکل جائیں انڈیا نہ جائیں" — نذر کے باپ نے کہا — "مَیں تمہارے صاحب سے کہوں گا کہ اپنے بچوں کو انڈیا نہ جانے دیں۔ وہ ہمارا دشمن ملک ہے۔"

"کہاں کی باتیں کرتے ہو ابا!" — نذر نے کہا — "وہ غیرت جو تم لئے پھرتے ہو وہ ہم جیسے لوگوں میں ہو گی، ان امیرزادوں اور نوابزادوں میں نہیں۔ ان سے ایسی بات نہ کہہ بیٹھنا۔"

"مشکل یہ آپڑی ہے کہ حکومت ان لوگوں کے ہاتھوں میں ہے" — نذر کے باپ نے کہا — "سیاسی پارٹیاں انہی لوگوں کی ہیں۔ باری باری یہ لوگ پاکستان کے مہاراجے بن جاتے ہیں۔ آپس میں لڑتے ہیں اور اُدھر ہندوستان پاکستان کو تباہ کر رہا ہے۔ ملک کو فوج بچایا کرتی ہے لیکن جرنیلوں کو بھی سیاست کا چسکا پڑ گیا ہے۔"

"ان پاکستانی مہاراجوں کی اولاد کو تم نے نہیں دیکھا ابا!" — نذر نے کہا — "یہ تو اپنے آپ کو پاکستانی کہلاتے ہی نہیں۔ اگر تم چھوٹے صاحب اور اُس کی بیوی کے ساتھ ایسی باتیں کرو گے جیسی میرے ساتھ کر رہے ہو تو وہ تم پر ہنسیں گے۔"

"انہیں ماں باپ یہ بھی نہیں بتاتے کہ اِس پاکستان کی ہم نے کیا قیمت دی تھی" — نذر کے باپ نے کہا — "تمہارے چھوٹے صاحب

کی بیوی جیسی اور اپنی اِس بہو بشیراں جیسی ہزاروں مسلمان لڑکیوں کو ہندوؤں اور سکھوں نے اغوا کر لیا تھا۔ باقی جو قتلِ عام ہُوا اور جو لُوٹ مار ہوئی وہ ہم سے پوچھو جو اُدھر سے ہجرت کر کے آتے تھے.... یہ تو اُس وقت کی بات ہے جب پاکستان کا اعلان ہو گیا تھا۔ اِس سے پہلے مسلمانوں نے پاکستان کے لئے جو قربانیاں دی تھیں ....“

نذر کا باپ تقریباً اَن پڑھ آدمی تھا۔ وہ نظریۂ پاکستان اور تحریکِ پاکستان کو اپنے رنگ اور اپنے الفاظ میں بیان کر رہا تھا۔ اُس کے بیان میں جذباتیت غالب تھی لیکن اُس کا جذبہ وہی تھا جو تحریکِ پاکستان کے لیڈروں کا تھا۔

”دلّی تو میں بھی جانا چاہتا ہوں“ ـــــ اُس نے کہا ـــــ ”لیکن سیر سپاٹے کے لئے نہیں بلکہ لال قلعے پر پاکستان کا جھنڈا چڑھانے کے لئے۔ کسی پاکستانی کو انڈیا نہیں جانا چاہیئے۔“

پاکستان کی آن پر اپنی ٹانگیں کٹوانے والوں کا، اپنے بازوؤں اور آنکھوں سے محروم ہو جانے والوں کا، اپنے سہاگ قربان کرنے والیوں کا اور شہیدوں کی اولاد کا جذبہ اور ان کے جذبات پاکستان کے اُس طبقے کے لئے بے معنی ہو کے رہ گئے تھے جو پاکستان کو اپنی جاگیر سمجھتا تھا قیادت اور حکومت اسی طبقے کا پیدائشی حق بن گئی تھی۔ نذر کے باپ اور اُس جیسے سرفروشوں کی کون سنتا تھا۔

رابی اور رِشی بھارت چلے گئے۔ عزیز ان کے ساتھ گیا تھا عزیز نے پہلے اطلاع دے رکھی تھی کہ وہ شکار لا رہا ہے۔ دلّی میں ان کے استقبال کے لئے تین آدمی ائیر پورٹ پر آتے ہوتے تھے۔ باہر ان کے لئے مرسڈیز گاڑی کھڑی تھی جس میں انہیں نئی دلّی کے شہنشاہی ہوٹل ”اشوکا“ میں لے جایا گیا۔ رابی اور رِشی اپنے آپ کو وی آئی پی نہیں بلکہ پاکستان کے حکمران سمجھنے لگے۔

دوسرے ہی دن اس ہوٹل کا ایک بیرا ہاشمی کے گھر آیا۔

”عزیز آگیا ہے“ ـــــ بیرے نے ہاشمی کو بتایا ـــــ ”اُس کے ساتھ پاکستان کا ایک جواں سال آدمی اور ایک نوجوان لڑکی ہے۔ شاید میاں بیوی ہیں۔“

ہاشمی اس بیرے کو عبدالقدیر کے پاس لے گیا۔ عبدالقدیر نے اپنے انداز سے بیرے سے پوچھا۔ بیرے نے بتایا کہ ان دونوں کو مرسڈیز کار میں لایا گیا تھا۔ ان کے ساتھ عزیز تھا۔ ساتھ ایک کرولا کار تھی۔ اس میں تین آدمی تھے۔ وہ عزیز اور ان پاکستانیوں کے ساتھ ہوٹل میں آتے تھے۔ انہوں نے مہمانوں کے نام لکھواتے تھے اور یہ سب اِن دونوں کو اُن کے کمرے میں لے گئے تھے۔

”پکی خبر لاؤ کہ یہ دونوں پاکستانی ہیں“ ـــــ عبدالقدیر نے بیرے سے کہا ـــــ ”اس کے علاوہ اور بھی کوئی اطلاع ہو تو لاؤ۔“

یہ بیرا ہاشمی اور عبدالقدیر کے محاذ کا ملازم نہیں بلکہ محاذ کا مجاہد تھا۔ ”اشوکا“ جیسے بڑے ہوٹلوں کے بیرے تعلیم یافتہ اور تہذیب یافتہ ہوتے تھے۔ اس بیرے نے اُس کمرے تک رسائی حاصل کر لی جس میں رابی اور رِشی کو ٹھہرایا گیا تھا۔

رابی اور رِشی کے سَر پر سینگ نہیں تھے کہ وہ بھارتیوں سے الگ تھلگ دکھائی دیتے۔ اس بیرے نے معلوم کر لیا تھا کہ یہ دونوں پاکستانی ہیں۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ جو پاکستانی سیر و سیاحت کے لئے اور اپنے رشتہ داروں سے ملنے بھارت آتے ہیں انہیں مشتبہ سمجھا جاتا ہے لیکن ان دو پاکستانیوں کو وزیروں اور اعلیٰ افسروں جیسی اہمیت دی جا رہی تھی۔ عمر کے لحاظ سے رابی وزیر بھی نہیں ہو سکتا تھا اور اعلیٰ افسر بھی نہیں۔ اس کے علاوہ ان کے ساتھ پاکستانی سفارتخانے کا کوئی آدمی نہیں تھا۔

عبدالقدیر کی ہدایات کے مطابق بیرا ان کے کمرے میں چلا گیا اور ان کے ساتھ پاکستان کے متعلق کچھ جذباتی باتیں کیں۔ اُس نے یہ بھی

کہا کہ اُس کی خواہش ہے کہ وہ پاکستان میں جا کر رہے۔

اس کے جواب میں رابی نے پاکستان کے خلاف اور بھارت کے حق میں باتیں کیں جن سے کچھ پتہ چلتا تھا کہ ان دونوں کے دلوں میں پاکستان کے خلاف نفرت بھری ہوتی ہے اور بھارت سے اتنی محبت ہے جیسے یہ دونوں اِس مشن پر آتے ہوں کہ بھارت پاکستان پر حملہ کر دے۔

بیرے نے یہ باتیں عبدالقدیر اور ہاشمی کو سنائیں۔

"مَیں نے ایک بات نوٹ کی ہے" ___ بیرے نے کہا ___ "یہ پاکستانی مہمان جب پاکستان کے خلاف زہر اُگل رہا تھا تو اُس کی بیوی نے اُسے دو تین بار ٹوکا اور ایک بار کہا، رابی! پاکستان ہمارا وطن ہے۔ عزیز تمہارا دوست ہو سکتا ہے، انڈیا پاکستان کا دوست نہیں ہو سکتا.... اس کے جواب میں رابی نے کہا، اوشٹ اَپ رشی! انڈیا پاکستان کو دوستی کے قابل سمجھتا ہی نہیں .... ہو سکتا ہے وہ اپنے خیالات مجھ سے چھپانا چاہتی ہو۔"

"عزیز احمد پاکستان سے نیا شکار لایا ہے" ___ عبدالقدیر نے کہا ___ "بھارت کی انٹیلی جنس کو ایک اور پاکستانی جاسوس مل گیا ہے۔"

"دو جاسوس کہیے!" ___ ہاشمی نے کہا ___ "لڑکی بھی ہے۔"

"لڑکی بڑی خوبصورت ہے" ___ بیرے نے کہا ___ "سمارٹ لڑکی ہے۔ انگریزی بولتی ہے۔ یہ تو بڑی خطرناک جاسوس بنے گی۔"

"ان کی نگرانی کا بندوبست کرتے ہیں" ___ عبدالقدیر نے کہا۔

عبدالقدیر کو بھارتی انٹیلی جنس کے جو "را" کے نام سے مشہور تھی، دو تین ٹھکانے معلوم تھے۔ وہ باہر سے کچھ اور لگتے تھے۔ عبدالقدیر نے دو آدمی مقرر کر دیئے۔ یہ کام وہ خود بہتر طور پر کر سکتا تھا لیکن انٹیلی جنس میں ابھی کچھ آدمی موجود تھے جو اُسے پہچانتے تھے۔

چوتھے روز اُسے رپورٹیں ملیں۔ ان میں ان دو آدمیوں کے علاوہ بیرے کی رپورٹیں بھی شامل تھیں۔ ان سے پتہ چلا کہ ان تین چار دنوں

میں دونوں کو دو ایسی جگہوں پر لے جایا گیا جو کلب کہلاتے تھے لیکن وہاں صرف امیرزادوں کا طبقہ راتوں کو اکٹھا ہوتا اور غیر ملکی آوارہ ہپیوں کی طرح شرم و حیا سے دستبردار ہوتا تھا۔ ان میں بگڑے ہوئے اینگلو انڈین نوجوان زیادہ ہوتے تھے جن میں لڑکیاں بھی شامل تھیں۔ عزیز ان کے ساتھ ہوتا تھا۔

ہوٹل کے کمرے میں اِس دوران دو بڑی خوبصورت لڑکیاں آتی رہیں۔

دن کے وقت دو بار رابی کو عزیز رشی کے بغیر اُن دو جگہوں پر لے گیا جو انٹیلی جنس کی بتائی جاتی تھیں۔

پرانی دِلی کی اُس حویلی میں جس میں محاذ کے نئے ممبروں سے حلف لیا گیا تھا، چار آدمی اُسی کمرے میں بیٹھے تھے۔ ان میں ایک ہاشمی اور دوسرا عبدالقدیر تھا۔ باقی دو آدمی ان دونوں کے گہرے دوست اور محاذ کے بڑے دلیر اور دانشمند آدمی تھے۔ دونوں جوان تھے۔ چاروں اسی مسئلے پر غور کر رہے تھے۔

"اب ہمیں کوئی نہ کوئی کارروائی کرنی پڑے گی" ___ ہاشمی نے کہا ___ "محاذ کے ممبر بناتے چلے جانا، دروازے بند کر کے اندر بیٹھ جانا اور تقریریں کرنا تو کوئی کام نہ ہُوا۔"

"پہلے ہمیں معلوم ہی نہ تھا کہ ہمارا ٹارگیٹ کیا ہے" ___ عبدالقدیر نے کہا ___ "عزیز کے متعلق شک تھا۔ اب یہ شک یقین میں بدل گیا ہے۔ اس ٹارگیٹ کو مارنا ہے۔"

"عزیز کو اُڑا دیا جائے؟" ___ دوسرے دو آدمیوں میں سے ایک نے پوچھا۔

"نہیں!" ___ عبدالقدیر نے کہا ___ "ایک عزیز کو اڑا دینے سے کچھ نہیں ہوگا۔ معلوم نہیں کتنے عزیز اس شیطانی کام میں مصروف ہیں۔ میرے ذہن میں یہ دو پاکستانی اٹکے ہوتے ہیں۔ ہم اتنی دیر سے آپس

میں بحث مباحثہ کر رہے ہیں۔ ان دو پاکستانیوں اور عزیز کی یہاں نقل و حرکت
کے متعلق تم سب نے رپورٹیں سُن لی ہیں۔ میں نے ان رپورٹوں اور اپنے
تجربے کی رُو سے یہ سوچا ہے کہ یہ معلوم کیا جاتے کہ ان دونوں کے باپ
اور بھائی وغیرہ پاکستان میں کیا کام کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے ان کے باپ
وہاں سرکاری افسر ہوں اور انہیں اُن کی مدد اور شہ حاصل ہو۔ یہ بھی ہو
سکتا ہے کہ ان کے باپوں کو معلوم ہی نہ ہو کہ یہ دونوں انڈیا کے جاسوس
بن چکے یا بن رہے ہیں۔ پاکستانی شہزادوں کا کیا بھروسہ!.....

"پھر میں نے سوچا ہے کہ پاکستان کی انٹیلی جنس کو ان دونوں کے
متعلق اور ان دونوں کے خاندانوں کے متعلق پوری اطلاع دی جاتے
اور عزیز کو پاکستان میں گرفتار کرا یا جاتے ..... ہاشمی صاحب! میں آپ
سے اتفاق کرتا ہوں کہ اب ہمیں عملی میدان میں آنا چاہیئے۔ اگر یہ میدان
کی لڑائی ہوتی تو ہم دیکھتے کہ ہمارے سامنے کون ٹھہرتا ہے۔ یہ لڑائی
زمین دوز طریقوں سے لڑنی ہے۔ یہ بڑی خطرناک لڑائی ہے۔ ہم ایک
ملک کی انٹیلی جنس کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ ہم میں سے کسی کی ذرا سی بھی
بے احتیاطی اور کوتاہی ہمارے محاذ کو پہلے معرکے میں ہی نیست و نابود
کر دے گی اور ہمارا انجام بڑا ہی بھیانک ہو گا۔"

"یہ باتیں پہلے ہو چکی ہیں قدیر صاحب!" — ہاشمی نے کہا —

"ہم نے اپنی جانیں اللہ کے سپرد کر کے یہ محاذ بنایا ہے۔ آپ یہ بتائیں
کہ عزیز کی اس کارگزاری کو ناکام کرنے کے لئے کیا کرنا ہے۔ اب دو ٹوک
فیصلہ کریں۔"

"عزیز کے نازک پہلو پر وار کریں" — عبدالقدیر نے کہا — "اس
لڑکی کو اغوا کریں۔ اگر لڑکی ہمارے قبضے میں آگئی تو ہمیں پوری انفارمیشن مل
جائے گی۔ ہم یہ انفارمیشن پاکستان کی انٹیلی جنس تک پہنچا دیں گے۔ ہو سکتا
ہے ہم لڑکی کو ہی سرحد پار کرا کے پاکستانی انٹیلی جنس کے حوالے کر دیں۔"

"کیا آپ کے پاس ایسا کوئی ذریعہ ہے؟"

"ضروری نہیں کہ میں آپ کو اپنے تمام ذرائع سے آگاہ کر دوں" —

عبدالقدیر نے کہا — "فوری طور پر یہ سوچنا ہے کہ لڑکی کو اغوا کرنے کا کیا
طریقہ اختیار کیا جاتے۔"

❦

ہوٹل کا بیرا بڑا کارآمد ذریعہ تھا۔ اُس نے بتایا تھا کہ بعض اوقات
عزیز رابی کو رشی کے بغیر باہر لے جاتا ہے۔

"اب رشی کو اس طرح کمرے میں چھوڑ کر عزیز اور رابی نکل جائیں
تو ٹیلیفون سے مجھے اطلاع دو" — عبدالقدیر نے بیرے سے کہا —
"یہ لو فون نمبر، اگر میں نہ ہوں تو کہنا کہ قدیر صاحب کو بلا دو۔"

عبدالقدیر نے ہاشمی اور اپنے دو جانباز قسم کے ساتھیوں کو اپنے
ہاں بلا کر کہا کہ وہ اگلے چند دن ہر وقت اپنے گھروں میں تیار رہیں۔ اس
کے ساتھ ہی عبدالقدیر نے انہیں بتایا کہ اغوا کا کیا طریقہ اختیار کیا جاتے گا۔
ہاشمی نے پرانی سی ایک کار کا انتظام کر لیا تھا۔

یہ موقع اگلے روز ہی پیدا ہو گیا۔ شام کے چار بج چکے تھے عبدالقدیر
کو بیرے کا فون ملا۔

"میری سالی آگئی ہے" — اُس نے عبدالقدیر کی ہدایت کے مطابق
خفیہ الفاظ میں بات کی — "اُسے ریلوے سٹیشن سے لے آئیں۔ میں
اس وقت ہوٹل سے نکل نہیں سکتا۔"

آدھا گھنٹہ گزرا ہو گا کہ رابی اور رشی کے کمرے کے دروازے پر
دستک ہوئی۔

"کم اِن" — رشی نے کہا۔

دروازہ کھلا۔ ایک جواں سال اجنبی کمرے میں داخل ہوا۔

"مسز رابی!" — اس آدمی نے کہا — "عزیز صاحب اور مسٹر رابی
نے مجھے بھیجا ہے کہ آپ کو لے آؤں۔ انہوں نے پروگرام بدل دیا ہے۔
وہ دونوں کناٹ پلیس کے ایک ہوٹل میں بیٹھے ہیں۔ ایک میاں بیوی ان
کے ساتھ ہیں۔ چاتے ان کے ساتھ پینی ہے پھر کوئی انگلش پکچر دیکھنی
ہے۔ آپ جلدی تیار ہو جائیں۔ میں باہر انتظار کرتا ہوں۔"

رشی جلدی تیار ہوگئی اور کمرے سے نکلی۔ وہ آدمی اُس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ ہوٹل سے نکلے۔ اُس آدمی نے کار ذرا دُور کھڑی کی تھی۔ رشی کو کار کی پچھلی سیٹ پر بٹھایا اور کار کو بڑی تیزی سے ہوٹل سے دُور لے گیا۔ اُس نے ایک جگہ کار روکی۔ دو آدمی کار میں بیٹھ گئے۔ ایک رشی کے دائیں طرف اور دوسرا بائیں طرف۔

"یہ کون ہیں؟" — رشی نے پوچھا۔

"خاموش بیٹھی رہو" — ایک نے کہا۔

رشی نے دیکھا کہ دونوں آدمیوں کے ہاتھوں میں کھلے ہوئے چاقو تھے اور یہ چاقو بڑے سائز کے تھے۔ ایک آدمی نے رشی کا سر اپنی گود میں دبا لیا اور دوسرے نے اُس کی آنکھوں پر رومال باندھ دیا۔

کار بہت دیر چلتی رہی۔ موڑ مڑتی رہی۔ رشی منت سماجت کرتی رہی کہ وہ پاکستان سے آئی ہے اُسے چھوڑ دیا جائے۔

کار رک گئی۔ رشی کے سر پر ایک چادر ڈال دی گئی اور اُس کی آنکھوں سے پٹی کھول دی گئی۔ اُسے کہا گیا کہ وہ خاموشی سے گاڑی سے نکلے اور ان کے ساتھ چلے اور چادر کا گھونگھٹ نیچے رکھے ورنہ یہی چادر اُس کا کفن بن جائے گی۔

اُسے ایک مکان کے ایک کمرے میں لے گئے اور اُس سے چادر اُتار لی گئی۔ اُس کے سامنے دو آدمی تھے — ہاشمی اور عبدالقدیر۔

"تم ہماری مہمان ہو" — عبدالقدیر نے کہا — "تمہاری عزت محفوظ رہے گی۔ ہم مسلمان ہیں۔ ہم جو کچھ پوچھیں، سچ سچ بتا دینا.... کیا تم انڈیا کی جاسوس ہو؟"

"نہیں" — رشی نے گھبرائے ہوئے لہجے میں جواب دیا — "میں اپنے خاوند کے ساتھ سیر کے لئے آئی ہوں۔"

"کیا تم جانتی ہو کہ عزیز انڈیا کا جاسوس ہے؟" — عبدالقدیر نے پوچھا — "اور تمہارا خاوند بھی ...."

"نہیں" — رشی نے ہکلاتے ہوئے کہا — "یہ جھوٹ ہے۔"

"پھر تم کچھ دن ہماری مہمان رہو گی" — عبدالقدیر نے کہا۔

رشی جن کی مہمان تھی وہ غروبِ آفتاب کے ایک گھنٹہ بعد ہوٹل میں واپس آ گئے۔ وہ رابی کو واپس لاتے تھے۔ اُس کے ساتھ عزیز اور اُس کا ایک ساتھی تھا جو دراصل ہندو تھا لیکن رابی کے ساتھ اُس کا تعارف عبدالرحمٰن کے نام سے کرایا گیا تھا۔ اُس شام رابی کو بھارت کی انٹیلی جنس "را" کے ایک بڑے افسر کے پاس لے جایا گیا تھا۔ یہ بڑا افسر رابی سے اس طرح بغلگیر ہو کر ملا تھا جس طرح اُس کا اپنا باپ بھی کبھی نہیں ملا تھا پھر اس افسر نے رابی کے ساتھ جس والہانہ پیار کا اظہار کیا تھا وہ تو رابی کے دل کی گہرائیوں میں اُتر گیا تھا۔

رابی تھا ہی کیا! اُس کی شخصیت میں ذرا سی بھی پختگی نہیں تھی۔ نہ قوتِ مدافعت تھی۔ عیش و عشرت میں وہ جنا پلا تھا۔ اُس کا کردار ریت کی ایک ڈھیری تھی جو ہوا کے تیز جھونکوں سے ذرہ ذرہ ہو کر اُڑتی اور غائب ہو جاتی ہے۔

انٹیلی جنس کے اس ہندو افسر کی پیار بھری دوستانہ باتیں ہوا کے جھونکوں کی مانند تھیں۔

پیار و محبت دو دھاری تلوار ہے۔ اس تلوار نے رابی کے کردار اور شخصیت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اُسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ اُس کا مذہب کیا اور وطن کونسا ہے۔ اُس کے مذہبی نظریات اور حُب الوطنی پر تو عزیز، مریم اور نبیلہ نے پہلے ہی اپنا سحر طاری کر دیا تھا۔ کچھ کسر اگر رہ گئی تھی تو وہ دِلّی میں آکر پوری ہو گئی۔ آخر انٹیلی جنس کے اس ہندو افسر نے رابی کے کردار کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔

"اس دیس کو تم جیسے نوجوانوں کی ضرورت ہے" ـــــ اس ہندو افسر

نے رابی سے کہا ـــــ "یہ دیس ہمارا نہیں تمہارا ہے۔ یہ مغلِ اعظم شہنشاہ اکبر کا وطن ہے۔ میں ہندو ہوں۔ تم میری زبان سے یہ سُن کر حیران ہو گے کہ ہم لوگ ہندوستان کو مسلمانوں کا وطن سمجھتے ہیں۔ پاکستان میں بڑا غلط پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ ہندوستان ہندوؤں کا دیس ہے۔ تمہیں یہاں گھما پھرا کر مسلمان حکمرانوں کی یادگاریں، اُن کے مقبرے اور اُن کی بنائی ہوئی مسجدیں اور دیگر عمارتیں دکھائی جائیں گی۔ میرے کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ تم خود محسوس کرو گے کہ آج کی ہندو حکومت نے کس احترام اور پیار سے مسلمانوں کی یادگاروں کو سنبھال کر رکھا ہوا ہے اور ہر سال اُن کی مرمت وغیرہ کی جاتی ہے۔ پھر تم دیکھو گے کہ یہاں کروڑہا مسلمان آباد ہیں۔ یہ بھی پاکستان کے مفاد پرست لیڈروں کا پروپیگنڈہ ہے کہ ہندو مسلمانوں کو جینے ہی نہیں دیتے۔ وہ اسی قسم کے لیڈر تھے جنہوں نے اس دیس کے دو ٹکڑے کئے اور مسلمانوں کو ہندوستانی مسلمان اور پاکستانی مسلمان میں بانٹ دیا۔ وہ لیڈر دراصل ایک خطہ چاہتے تھے جس کے وہ بادشاہ بن سکیں۔ تم نے خود دیکھا ہے کہ پاکستان میں باری باری یہ لیڈر بادشاہ بن رہے ہیں۔ چونکہ دونوں ملکوں کے درمیان دشمنی پیدا کر دی گئی ہے اس لئے دونوں ملک اپنے اپنے دفاع پر اربوں روپیہ صرف کر رہے ہیں۔ یہ دشمنی پاکستان کی طرف سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر دونوں ملک ایک ہو جائیں تو دفاعی ضروریات اور مسلح افواج پر خرچ ہونے والا اتنا کثیر روپیہ بچ جاتے اور یہ عوام کی فلاح و بہبود اور خوشحالی پر صرف کیا جاتے ..... میرا خیال ہے کہ تمہیں بتا دیا گیا ہے کہ تمہارا مشن کیا ہے؟"

"جی ہاں" ـــــ رابی نے جواب دیا ـــــ "عزیز بھائی نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے لیکن آپ نے جو باتیں کی ہیں یہ مجھے زیادہ اچھی لگی ہیں۔"

"یہ ایک مقدس مشن ہے رابی!" ـــــ انٹیلی جنس کے اس ہندو افسر نے کہا ـــــ "معاف رکھنا۔ میں تمہیں تمہارے پورے نام سے

نہیں پکار رہا۔ رابی مجھے بڑا پیارا نام لگتا ہے ..... تم نے لاہور میں عزیز کو جن کاغذات کی فوٹوسٹیٹ کاپیاں دی تھیں۔ وہ تمہارا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ یہ سلسلہ جاری رکھنا۔ تمہیں اتنی زیادہ قیمت ملے گی جو تم سنبھال نہیں سکو گے۔"

یہی نہیں، اس ہندو افسر نے رابی کے ساتھ بہت سی باتیں کی تھیں اور رابی کو بولنے کا بہت موقع دیا تھا تاکہ یہ پتہ چلتا رہے کہ اس پاکستانی نوجوان کی سوچیں اور اس کے خیالات کیا ہے اور یہ بھی معلوم ہو جاتے کہ اس کی برین واشنگ ہو رہی ہے یا نہیں۔

رابی کی برین واشنگ تو پہلے ہی ہو چکی تھی۔ اُس کی اور اُس جیسے پاکستانی نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی برین واشنگ تو امریکہ اور یورپ سے برآمد کئے ہوئے پاپ اور ڈسکو کلچر نے پہلے ہی کر دی تھی۔ اس اخلاق سوز اور ایمان کُش کلچر کے خالق یہودی تھے اور اُن کا یہ حربہ کامیاب تھا۔ یہ نوجوان پاکستان کے دشمن کے لئے خام مال تھے۔ پاکستان نے انہیں نظر انداز کر دیا لیکن ہمارے دشمن کی نظر ان پر پڑی تو اُس نے انہیں حیوانی جذبات کی آگ میں پگھلا کر اپنے سانچے میں ڈھالنا شروع کر دیا۔

رابی نے ہندو افسر سے کہا تھا کہ اُسے اُس کی باتیں زیادہ اچھی لگی ہیں۔ اس افسر کی باتوں میں جو جادُو تھا وہ ایک تو اس وجہ سے تھا کہ انٹیلی جنس کا یہ افسر ہندو تھا۔ ہندو مکاری، عیاری اور فریبکاری کا ایک نام ہے۔ کسی مسلمان کو گمراہ کرنے اور پاکستان کی جڑیں کھوکھلی کرنے کے لئے اُس کا ہندو ہونا ہی کافی ہے لیکن وہ انٹیلی جنس کا تجربہ کار افسر بھی تھا۔ رابی کے ساتھ اُس کا پیار ایسے ہی تھا جیسے بلی چُوہے کو ہڑپ کرنے کے لئے اُس کے ساتھ پیار و محبت کا کھیل کھیل رہی ہو۔

اس پاکستانی نوجوان کو انڈیا کے دو ڈسکو کلبوں میں لے جایا گیا تھا۔ ان کلبوں کی فحاشی اور حیاسوزی رابی کی رُوح کی غذا تھی۔ وہ اسی کو سارا

ہندوستان سمجھ بیٹھا تھا۔ اُس نے وہاں وہ مسجدیں نہیں دیکھی تھیں جو ویران پڑی تھیں۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کو اس قدر دہشت زدہ کر رکھا تھا کہ مسلمانوں نے ان مسجدوں میں جانا چھوڑ دیا تھا۔

رابی نے بابری مسجد نہیں دیکھی تھی جسے مندر بنانے کے لئے ہندوؤں نے اس پر قبضہ کر لیا تھا۔

رابی نے دلی اور دو تین دوسرے شہروں میں مغلوں کے دَور کی تعمیر کی ہوئی وہ مسجدیں نہیں دیکھی تھیں جنہیں بھارت کی حکومت نے اس حکم کے ساتھ مقفل کر دیا تھا کہ انہیں آثارِ قدیمہ کے طور پر محفوظ رکھا جاتے گا۔

رابی نے بھارت میں گھوم پھر کر وہ جلے ہوتے کھنڈر نہیں دیکھے تھے جو مسلمانوں کے مکان ہُوا کرتے تھے اور ہندوؤں نے انہیں جلا ڈالا تھا۔

رابی نے بھارت کی گلیوں میں مسلمانوں کا خون بہتا نہیں دیکھا تھا۔

اس پاکستانی نوجوان کو اور اس کی قماش کے اور اس سوسائٹی کے پاکستانی نوجوانوں کو بتانے والا کوئی نہ تھا کہ پاکستان کیوں بنایا گیا تھا، نہ کوئی یہ بتانے والا تھا کہ بھارت اتنی زیادہ جنگی طاقت کیوں اکٹھی کرتا چلا جا رہا ہے۔

رابی جب "را" کے اس افسر کی کوٹھی سے نکلا تو اُس پر نشہ سا طاری تھا۔

❦

وہ عزیز اور اُس کے ساتھی عبدالرحمٰن کے ساتھ ہوٹل کی لفٹ میں داخل ہُوا۔ لفٹ اُنہیں اُس منزل پر لے گئی جس میں رابی کا کمرہ تھا۔ لفٹ سے نکل کر وہ کمرے میں گئے۔ بُشریٰ کمرے میں نہیں تھی۔ وہ زیادہ سے زیادہ باتھ روم میں جا سکتی تھی۔ تینوں اس انتظار میں بیٹھ گئے کہ وہ باتھ روم سے نکلے گی۔

پانچ منٹ گزر ے..... دس منٹ گزر ے .... پھر پندرہ منٹ گزر گئے ۔

دو تین منٹ اور انتظار کر کے رابی نے باتھ رُوم کے دروازے پر ہلکی سی دستک دی ۔

"نکل آئے گی بھائی!" — عزیز نے ہنستے ہوئے کہا — "اتنے بے قرار کیوں ہوئے جا رہے ہو"۔

رابی ہنستا ہُوا پیچھے ہٹ آیا اور بیٹھ گیا۔

پندرہ منٹ اور گزر گئے ۔

"اتنی دیر؟" — رابی نے کہا اور اُٹھ کر باتھ رُوم کے دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر دروازے کے ناب کو آہستہ سے گھمایا۔ دروازہ کھُل گیا۔ رابی نے دروازہ پورا کھولنے سے پہلے رشی کو آہستہ سے آواز دی لیکن باتھ روم میں خاموشی تھی۔

"رشی!" — اب رابی نے بلند آواز دی ۔

اب کے بھی اندر سے کوئی جواب نہ آیا تو رابی باتھ رُوم کے اندر چلا گیا۔ اُس کے مُنہ سے بے اختیار گھبراہٹ کے عالم میں رشی کا نام نکلا اور وہ دوڑتا ہُوا باہر آیا ۔

"باتھ روم میں تو نہیں" — رابی نے اپنے ساتھیوں کو بتایا — "کہاں چلی گئی ہے!"

"کیوں گھبراتے ہو یار!" — عزیز نے کہا — "یہیں کہیں نکل گئی ہو گی"۔

"ڈائننگ ہال میں نہ چلی گئی ہو" — عبدالرحمٰن نے کہا۔

"نہیں!" — رابی نے کہا — "ہم اُسے بتا گئے تھے کہ ہم جلدی آجائیں گے پھر ڈنر کے لئے نیچے چلیں گے"۔

تقریباً ایک گھنٹہ مزید گزر گیا تب عزیز اور عبدالرحمٰن کو بھی پریشانی سی محسوس ہونے لگی۔ اب تینوں اس مسئلے پر تبادلۂ خیالات کرنے لگے کہ رشی کہاں چلی گئی ہے۔ اگر اُس نے ہوٹل میں ٹھہری ہوئی کسی لڑکی کے ساتھ راہ و رسم پیدا کر لی ہوتی اور وہ اُس کے کمرے میں چلی گئی ہوتی تو بھی اُسے اب تک واپس اپنے کمرے میں آجانا چاہیئے تھا۔ اگر وہ باہر نکل گئی ہوتی تو کمرہ کھُلا ہُوا نہ ہوتا۔ وہ چابی کاؤنٹر پر دے جاتی۔ چونکہ کمرہ کھُلا ہُوا تھا اس لئے اس خیال کو تقویت ملتی تھی کہ وہ ہوٹل کے اندر ہی ہے ۔

تینوں نیچے چلے گئے۔ کاؤنٹر پر ہوٹل کے تین آدمی کھڑے تھے۔ اُن سے پوچھا تو ان میں سے دو نے بتایا کہ رشی ایک آدمی کے ساتھ باہر نکل گئی تھی۔ یہ کوئی معمولی سا ہوٹل نہیں تھا یہ شاہانہ فائیو سٹار ہوٹل تھا جس میں خاص قسم کے لوگ آتے تھے۔ رابی اور رشی کچھ دنوں سے یہاں ٹھہرے ہوتے تھے اس لئے کاؤنٹر پر کام کرنے والے انہیں پہچانتے تھے۔

"کون تھا وہ آدمی؟" — رابی نے پوچھا ۔

"وہ کس حُلیے کا تھا؟" — عزیز نے کاؤنٹر والوں سے پوچھا۔

"حلیہ تو آپ جیسا ہی تھا" — کاؤنٹر کے ایک آدمی نے کہا — "عمر بھی آپ جتنی ہی لگتی تھی"۔

وہاں رشی کی جان پہچان والا کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ کس کے ساتھ باہر گئی ہوگی! کاؤنٹر کے یہ دونوں آدمی پورے یقین کے ساتھ کہہ رہے تھے کہ رشی ایک آدمی کے ساتھ باہر جاتی دیکھی گئی تھی اور وقت ساڑھے چار کے لگ بھگ تھا۔ اس کے بعد اُسے واپس آتے نہیں دیکھا گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اُسے ہوٹل سے نکلے ہوئے کم و بیش پانچ گھنٹے گزر چکے تھے۔

ہوٹل کے اندر اور باہر، ڈائننگ ہال میں ایک بار پھر اُوپر کمرے میں جا کر رشی کو دیکھا گیا۔ اُس کا کہیں کھُرا کھوج نہ ملا۔ گیٹ پر کھڑے ہوٹل کی وردی پہنے ہوئے دربان سے پوچھا تو وہ کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔ ہوٹل میں کام کرنے والوں اور اُن سے ملنے جُلنے والوں کی

آمدورفت لگی رہتی تھی۔ دربان کا کام تھا ہر کسی کے لئے دروازہ کھولنا جھکنا اور جھک کر سلام کرنا۔ یہی اُس کی روزی کا ذریعہ تھا اور ہر کسی سے وہ ٹپ کی توقع رکھتا تھا۔ وہ اتنے زیادہ آتے جاتے چہرے یاد نہیں رکھ سکتا تھا۔

عزیز احمد اور اُس کا ہندو ساتھی جو رابی کے لئے عبدالرحمٰن بنا ہُوا تھا، تربیت یافتہ اور تجربہ کار جاسوس تھے، لیکن رشی کی گمشدگی نے انہیں چکرا دیا۔ انہیں تسلیم کرنا پڑا کہ رشی لاپتہ ہو چکی ہے۔

"کچھ دیر اور انتظار کرلیں عزیز؟" — رابی نے پوچھا۔

"نہیں" — عزیز نے بڑے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا — "وہ چلی گئی ہے یا لے جائی گئی ہے، بہرحال وہ واپس آنے کے لئے نہیں گئی"۔

"کیا کہہ رہے ہو عزیز؟" — رابی نے پریشان ہو کر کہا۔

"مَیں بندوبست کرتا ہوں" — عزیز نے کہا اور وہ ٹیلیفون کے قریب جا کھڑا ہُوا۔

اُس نے یکے بعد دیگرے چار یا پانچ نمبر ملا کر رشی کی گمشدگی کی اطلاع دی۔

❦

آدھا گھنٹہ گزرا ہو گا کہ جنہیں عزیز نے فون کئے تھے وہ ہوٹل میں پہنچنے لگے۔ سب سے پہلے وہی ہندو افسر آیا جس کے پاس رابی کو لے جایا گیا تھا۔ وہ اچھا خاصا پریشان تھا۔ اس کے بعد انٹیلی جنس کے ہی دو اور آدمی آ گئے۔ ان کے پیچھے پیچھے پولیس کی ایک جیپ ہوٹل کے سامنے آ رُکی۔ اس میں سے ایک ایس پی، ایک ڈی ایس پی اور ایک پولیس انسپکٹر دو ہیڈ کانسٹیبلوں کے ساتھ اُترے اور دوڑتے ہوتے ہوٹل کی لابی میں آئے۔ ہوٹل کی انتظامیہ میں کھلبلی مچ گئی۔ انٹیلی جنس اور پولیس کے افسر اُوپر اُس کمرے میں گئے جس میں رابی اور رشی کو ٹھہرایا گیا تھا۔ پولیس کے افسروں نے اپنے انداز سے اور انٹیلی جنس والوں نے اپنی عقل اور سُوجھ بُوجھ کے مطابق کمرے کا جائزہ لیا اور اس کے ساتھ ہی تفتیش اور سراغرسانی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کمرے والی منزل پر ساڑھے چار بجے کے وقت جتنے بیرے اور کمروں کی صفائی کرنے والی لڑکیاں موجود تھیں اُنہیں بلا کر پوچھا گیا۔

ہوٹل میں کام کرنے والی ان لڑکیوں کو ہاؤس کیپر کہا جاتا ہے۔

ایک ہاؤس کیپر لڑکی نے بیان دیا کہ اُس نے ایک آدمی کو رشی کے کمرے سے نکلتے دیکھا تھا اور رشی اُس کے ساتھ تھی۔

اتنا سا بیان دینے پر انٹیلی جنس اور پولیس کے افسروں نے اس لڑکی پر سوالوں کی بوچھاڑ کردی — "پہلے رشی کمرے سے باہر نکلی تھی یا وہ آدمی؟ لفٹ تک رشی آگے تھی یا آدمی؟ کیا وہ باتیں کرتے جا رہے تھے؟ رشی کے چہرے کے تاثرات کیسے تھے؟ اُس آدمی کا چہرہ اور لباس کیسا تھا؟" — یہ سوال یہ معلوم کرنے کے لئے پوچھے گئے تھے کہ رشی کو زبردستی لے جایا گیا ہے یا وہ اپنی مرضی سے گئی ہے۔

اتنے بڑے اور اس قسم کے ہوٹل میں سے ایک لڑکی کو زبردستی لے جانا ناممکن تھا۔ اُسے ورغلا کر یا کسی دھوکے میں لا کر لے جایا جا سکتا تھا۔

ہاؤس کیپر لڑکی نے ہر ایک سوال کا جواب دیا۔ اُس نے بتایا کہ کمرے سے پہلے رشی نکلی تھی پھر وہ آدمی نکلا۔ رشی کا چہرہ ہشاش بشاش تھا اور جو آدمی اُس کے ساتھ جا رہا تھا وہ تیس سال سے زیادہ عمر کا لگتا تھا۔ اس نے وُرسٹڈ کی پتلون اور پورے بازوؤں کا سویٹر پہن رکھا تھا۔ سوالوں کا جواب دیتے ہوتے لڑکی نے بتایا کہ یہ آدمی رشی کے آگے جھکا جھکا سا لگتا تھا۔

اسی منزل کے ایک بیرے نے بھی کچھ اسی قسم کا بیان دیا۔ اس نے بھی رشی کو اس آدمی کے ساتھ جاتے دیکھا تھا، لیکن وہ ایسی جگہ کھڑا تھا جس طرف ان دونوں کی پیٹھ تھی۔

نیچے لابی میں کاؤنٹر پر کھڑے ہوٹل کے جن دو کلرکوں نے رشی کو اس آدمی کے ساتھ جاتے دیکھا تھا، اُن سے الگ الگ بیان لئے گئے اور ایسے اور اتنے زیادہ سوال پوچھے گئے کہ دونوں کے مُنہ جواب دے دے کر خشک ہو گئے۔

کمرے میں سے کوئی ایسا رُقعہ بھی نہیں ملا تھا جو رِشی لکھ کر چھوڑ گئی ہو کہ وہ کہاں اور کیوں جا رہی ہے۔

رات کے بارہ بج رہے تھے جب انٹیلی جنس اور پولیس کے افسر ہوٹل کے دفتر میں ایک اجلاس کی صورت میں بیٹھ گئے اور تبادلہ خیالات کرنے لگے۔

"لڑکی خود گئی ہے" — انٹیلی جنس کے ایک افسر نے کہا — "یا اُسے ورغلا کر لے جایا گیا ہے۔"

"لیکن کیوں؟" — دوسرے افسر نے کہا — "کسی لڑکی کے یوں لاپتہ ہو جانے کی کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے۔ ایک وجہ عداوت ہوتی ہے۔ رقابت بھی ایک وجہ ہوتی ہے یعنی پہلے لڑکی کے مراسم کسی اور کے ساتھ تھے پھر اُس نے کسی اور کے ساتھ دوستی گانٹھ لی۔ پہلے آدمی نے لڑکی کو ورغلا کر یا کسی بہانے اغوا کر لیا۔ پھر ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ لڑکی غیر معمولی طور پر حسین ہے، کمسن ہے اور بازارِ حُسن میں سونے کے انڈے دینے والی مُرغی ثابت ہو سکتی ہے .... ایک وجہ یہ بھی ہے کہ لڑکی نے اپنا راستہ کوئی اور بنا لیا ہے اور وہ اپنی مرضی سے گئی ہے۔"

"اس پہلو کو سامنے رکھیں کہ لڑکی یہاں اجنبی تھی" — انٹیلی جنس کے ایک اور افسر نے کہا — "اور وہ پہلی بار انڈیا میں آئی ہے۔ یہاں اُس کا کوئی سوشل کنٹیکٹ نہیں۔ لڑکی کے خاوند اور ہمارے اپنے آدمی عزیز اور (عبدالرحمن) کا بھی یہی بیان ہے کہ نہ لڑکی کسی کو یہاں جانتی ہے نہ ہمارے دونوں آدمیوں کے سوا اسے کوئی جانتا ہے .... میں نے لڑکی کو دیکھا ہے۔ وہ خوبصورت لڑکی ہے، لیکن ایسی خوبصورت بھی نہیں کہ اُسے طوائف یا سوشل گرل یا کال گرل بنانے کے لئے اغوا کیا گیا ہو۔ آپ نے جو وجوہات بیان کی ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی یہاں فٹ نہیں ہوتی۔"

"اس پر بھی غور کریں" — ایس پی نے کہا — "کہ لڑکی کو کمرے میں آکر ورغلانا اور دھوکے میں ساتھ لے جانا کسی معمولی آدمی کا کام نہیں۔ یہ کوئی غیر معمولی عقل اور جرأت والا آدمی ہو سکتا ہے .... ہم نے لڑکی کے خاوند سے یہ بھی معلوم کیا ہے کہ ایسا تو نہیں کہ پاکستان کا کوئی ایسا آدمی دِلّی آیا ہوا ہو جس کے ساتھ لڑکی کے مراسم رہے ہوں اور رِشی نے شادی رابی کے ساتھ کر لی ہو .... یہ خاص طور پر پیشِ نظر رکھیں کہ لڑکی کس سوسائٹی سے تعلق رکھتی ہے اور اس کا چال چلن کیسا ہے۔"

انٹیلی جنس کا ایک سینئر افسر ہنس پڑا۔

"اگر لڑکی کا چال چلن ٹھیک ہوتا تو وہ اپنے خاوند کے ساتھ ہماری مہمان نہ ہوتی" — اس سینئر افسر نے کہا — "اور اگر وہ ہماری مہمان نہ ہوتی تو ہم اُس کی گمشدگی میں ذرا سی بھی دلچسپی نہ لیتے۔ ہمیں خطرہ صرف یہ نظر آ رہا ہے کہ لڑکی کو پاکستان کی آئی ایس آئی نے نہ اُڑا لیا ہو۔"

"یہ بھی پیشِ نظر رکھیں کہ لڑکی کو یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ اُس کے خاوند کو انڈیا کی سیر کس سلسلے میں کرائی جا رہی ہے" — انٹیلی جنس کے ایک اور افسر نے کہا پھر اُس نے چونک کر ایس پی اور ڈی ایس پی کی طرف دیکھا اور اُن سے کہنے لگا — "میرے منہ سے ایسی بات نکل گئی ہے جو انٹیلی جنس کے صرف ہمارے شعبے کو معلوم ہونی چاہیئے، لیکن میں نے یہ بات آپ دونوں پولیس افسروں کے سامنے کہہ دی ہے۔ کسی کھُلی میٹنگ میں یا کسی اور کے ساتھ اس کا ذکر نہیں ہونا چاہیئے۔"

"آپ کو اتنا پریشان نہیں ہونا چاہیئے سر!" — ایس پی نے کہا — "کیا ہم نہیں جانتے کہ ہماری انٹیلی جنس کے مقاصد اور مشن کیا ہیں؟"

"ہم بھی ہندو ہیں سر!" — ڈی ایس پی بولا — "پاکستان ہمارا بھی اتنا ہی دشمن ہے جتنا آپ کا ہے۔ آپ صرف یہ بتا دیں کہ لڑکی کو برآمد کرانا ہمارا کام ہے یا یہ آپ اپنے ذمے رکھیں گے۔"

"یہ کام آپ کا بھی ہے اور ہمارا بھی" — انٹیلی جنس کے سینئر افسر نے کہا۔

یہ میٹنگ رات دو بجے تک جاری رہی اور یہ لوگ کسی نتیجے پر نہ

پہنچ سکے۔

اس ہوٹل میں صرف ایک آدمی تھا جسے معلوم تھا کہ لڑکی کہاں ہے۔

یہ آدمی یوں ہوٹل میں گھوم پھر رہا تھا جیسے اُسے بیراگیری کے سوا کسی اور کام سے دلچسپی نہ ہو۔ لیکن وہ بڑی غور سے دیکھ رہا تھا کہ پولیس اور انٹیلی جنس کے جو افسر تفتیش کے لئے آتے ہیں وہ کیا کر رہے ہیں۔

یہ بیرا ہاشمی کے محاذ کا ممبر تھا۔ اُسے یہ معلوم تو نہیں ہو سکتا تھا کہ پولیس اور انٹیلی جنس کے ان افسروں نے بند کمرے میں بیٹھ کر کیا باتیں کی ہیں اور کیا فیصلہ کر کے اُٹھے ہیں لیکن اتنا ہی معلوم ہو جانا اُس کے لئے کافی تھا کہ تفتیش کے لئے کون آیا تھا اور یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ لڑکی کہاں چلی گئی ہے۔ اس بیرے نے یہ رپورٹ ہاشمی اور عبداللہ ریکو دی تھی۔

پولیس اور انٹیلی جنس کے یہ افسر بند کمرے میں تبادلہ خیالات کر رہے تھے اور رابی، عزیز اور عبدالرحمٰن لابی میں بیٹھے قیاس کے گھوڑے دوڑا رہے تھے۔ اُس وقت تک جو شہادت سامنے آئی تھی اس سے عزیز اور عبدالرحمٰن کہتے تھے کہ لڑکی خود گئی ہے۔ اُسے ورغلایا گیا ہوگا۔

"رابی!" — عزیز نے کہا — "تمہیں میری یہ بات اچھی تو نہیں لگے گی لیکن حقیقت کو چھپائے رکھنا بھی ٹھیک نہیں ہوتا .... تم نے مجھے رشی کی فیملی بیک گراؤنڈ بتائی تھی۔ ذرا اس پر غور کرو۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ رشی نے ان دو چار دنوں میں ہی کسی کے ساتھ راہ و رسم پیدا کر لی ہو اور وہ شخص چپکے سے اُسے اپنے ساتھ لے گیا ہو؟"

"ہو سکتا ہے" — رابی نے کہا — "اس کی ماں بھی جوانی میں یہی کچھ کرتی رہی ہے۔"

"مجھے رشی کی بیک گراؤنڈ کا علم تو نہیں" — عبدالرحمٰن نے کہا — "لیکن اس پر ضرور غور کریں کہ اس ہوٹل میں جو لوگ آکر ٹھہرتے ہیں وہ دولتمند ملکی اور غیر ملکی ہوتے ہیں۔ ان میں بڑے اُونچے درجے کے سمگلر بھی ہوتے ہیں جنہیں اس قسم کی جوان لڑکیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ بعض غیر ملکی آدمی بھی انڈیا اور پاکستان کی خوبصورت لڑکیوں کو پسند کرتے اور ان کے ساتھ شادی کرنا چاہتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ لڑکی کسی کے جال میں آگئی ہے .... ایک بات بتاؤ رابی! کیا رشی تمہارے گھر میں مطمئن تھی اور کیا تمہارے والدین بھی اسے تمہاری ہی طرح چاہتے تھے؟"

"نہیں" — رابی نے جواب دیا — "میری ماں تو اس لڑکی سے نفرت کرتی ہے۔ ادھر آنے سے پہلے میری ماں نے اس کی ماں کی بہت بے عزتی کی تھی۔ اُس نے ان دونوں کو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ میں جس وقت چاہوں، رشی کو طلاق دلوا سکتی ہوں۔"

یہ تینوں بھی اسی نتیجے پر پہنچے کہ لڑکی کو زبردستی اغوا نہیں کیا گیا اور وہ کسی کے چکر میں آگئی ہے۔

اس پہلو پر بند کمرے میں پولیس اور انٹیلی جنس کے افسروں نے بھی غور اور تبادلہ خیالات کیا تھا کہ لڑکی کو اُڑا لے جانے والا کوئی ایسا آدمی ہے جو اس ہوٹل میں قیام پذیر ہے یا آج چلا گیا ہے۔ انہوں نے منیجر کو بلا کر کہا تھا کہ وہ ہوٹل میں ٹھہرنے والوں کا ریکارڈ لائے۔ پہلے تو یہ دیکھا گیا کہ اُس شام کوئی آدمی ہوٹل کا کمرہ چھوڑ کر گیا ہے یا نہیں۔ ریکارڈ سے پتہ چلا کہ اُس شام کوئی بھی ہوٹل سے نہیں گیا۔ پھر ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تمام افراد کی لسٹ دیکھی گئی۔ انہوں نے اپنے جو پیشے لکھوائے تھے وہ دیکھے گئے۔ ظاہر ہے کہ کوئی بین الاقوامی سمگلر یا بردہ فروش تھا تو اُس نے اپنا پیشہ کچھ اور لکھوایا ہوگا۔ یہ مناسب نہ سمجھا گیا کہ اتنی اونچی حیثیت کے افراد کو جو ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے، شامل تفتیش کیا جاتا۔ اس کا یہ انتظام کیا گیا کہ انٹیلی جنس کے تربیت یافتہ مخبروں کو بیروں اور دیگر ملازموں کے بہروپ میں ہوٹل میں بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا۔ انہیں پوری طرح بریفنگ دے کر ہوٹل میں بھیجنا تھا۔ انہوں نے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے لوگوں پر نظر رکھنی تھی اور اگر کسی پر شک تھا تو اُس وقت بھی اُس کا تعاقب کرنا تھا جب اُس نے ہوٹل سے باہر کہیں بھی جانا تھا۔

اُس وقت لڑکی پرانی دِلّی میں جس حویلی میں تھی وہ ایک قلعے کی مانند تھی۔ یہ پرانے زمانے کی حویلی تھی۔ یہ اُس دَور کی یادگار تھی جب شہروں کے اردگرد دیوار ہُوا کرتی تھی۔ یہ ہاشمی کے آبا وَاجداد کی حویلی تھی جس کے کئی کمرے تھے۔ ہاشمی کے باپ نے حویلی کو کچھ جدید بنا دیا تھا پھر ہاشمی نے کمروں کو نئی طرز کا بنایا اور باہر سیمنٹ کا پلستر کروا دیا تھا۔

اتنی بڑی حویلی میں صرف دو افراد رہتے تھے — ایک ہاشمی اور دوسرا اُس کی بیوی — ایک کمرہ نوکروں کے لئے مخصوص تھا۔ اُن دنوں اس کمرے میں دو ادھیڑ عمر میاں بیوی رہتے تھے۔ ہاشمی کو دوستوں نے مشورہ دیتے تھے کہ وہ اتنی بڑی حویلی کو فلیٹوں کی صورت دے دے اور ہزار ہا روپیہ ماہوار کرایہ وصول کرے لیکن ہاشمی اسی پر مطمئن تھا۔ اُس کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اُس نے دوستوں کو بتایا تھا کہ وہ یہ وصیت لکھ کر اس دُنیا سے رخصت ہوگا کہ اُس کے بعد اُس کی بیوی زندہ رہی تو وہ اس حویلی کی مالک ہوگی اور اس کی موت کے بعد یہ اختیار جامع مسجد کے امام کو حاصل ہوگا کہ وہ حویلی بیچ کر رقم مسلمانوں کی فلاح وبہبود کے لئے استعمال کریں یا اس حویلی کو ایسا مدرسہ یا مرکز بنادیں جس میں مسلمان بچوں اور بچیوں کو تعلیم اور جہادِ آزادی کی تربیت دی جائے۔

رِشی اس حویلی کے ایک کمرے میں بند تھی۔ صرف ہاشمی کی بیوی تھی جسے رِشی کی موجودگی اور موجودگی کی وجہ کا علم تھا بوڑھے نوکر اور نوکرانی کو اس کمرے اور ایسے ہی دو تین اور کمروں میں بلا اجازت جانے کی اجازت نہیں تھی۔

رِشی کو جب اس کمرے میں لایا گیا تھا تو اُس وقت انڈین انٹیلی جنس کا ریٹائرڈ آدمی عبدالقدیر ہاشمی کے ساتھ اس کمرے میں موجود تھا۔ انہوں نے رِشی سے کہا تھا کہ عزیزہ اور اُس کا خاوند رابی انڈیا کے جاسوس ہیں تو رِشی نے یہ ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ عبدالقدیر نے اُسے کہا تھا کہ وہ کچھ دن ان کی مہمان رہے گی۔ یہ کہہ کر دونوں باہر نکل آئے تھے اور اُنہوں نے کمرے کو باہر سے مقفل کر دیا تھا۔

ایک خوبصورت اور جوان لڑکی جسے اغوا کر کے ایک کمرے میں بند کر دیا گیا ہو، اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ کیسے کیسے جذباتی مد وجزر سے گزری ہوگی۔ عورت کو سب سے بڑا خطرہ یہ نظر آتا ہے جو اس کے لئے بڑا ہی ہولناک ہوتا ہے کہ اُس کی عزت محفوظ نہیں رہے گی اور نہ جانے کتنے ہی آدمی اُس کے جسم کو نوچیں گے۔ رِشی کو یہ سہولت حاصل تھی کہ وہ شریف لڑکی نہیں تھی۔ شادی سے پہلے ہی وہ آبرو باختہ تھی۔ ایسی بھی نہیں کہ جو چاہتا اُس کے ساتھ تعلقات قائم کر لیتا۔ صرف رابی تھا جس کی وہ شادی سے پہلے ہی بیوی بن چکی تھی۔ اُس کے ذہن میں عصمت اور آبرو کا تصور کچھ اور تھا۔ پھر بھی وہ رات بھر اس ذہنی اذیت میں مبتلا رہی کہ نہ جانے یہ کون لوگ ہیں اور انہوں نے اسے کیوں اغوا کیا ہے۔

رات بھر ایک لمحے کے لئے بھی اُس کی آنکھ نہ لگی۔ خیالات کا اور آنے والے وقت کے تصور کا جب ایک ریلا آتا تو وہ اُٹھ کر دروازے پر زور زور سے ہاتھ مارتی اور چلاتی کہ مجھے یہاں سے نکالو، مجھ پر رحم کرو لیکن وہاں دیواروں کے سوا اُس کی چیخ وپکار سُننے والا کوئی نہ تھا۔ ہر لمحہ اُسے یہ توقع تھی کہ دروازہ کُھلے گا اور ایک آدمی آکر اُس پر ٹوٹ پڑے گا۔

لمحہ بہ لمحہ رات گزر گئی۔ دروازہ نہ کُھلا۔

جب دروازہ کُھلا تو دن کی روشنی کمرے میں داخل ہوتی۔ اُس وقت رِشی رو رو کر تھک ہار کر پلنگ پر گر پڑی تھی۔ شب بیداری کے اثرات الگ تھے۔ ایک رات میں ہی وہ لاش بن چکی تھی۔ کواڑ کُھلے تو اِس توقع کے ساتھ گھبرا کر اُٹھی کہ یہ رات والے آدمی ہوں گے لیکن وہ ایک عورت تھی اور اس کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی اور ٹرے میں ناشتہ تھا۔

رِشی نے رات کھانا نہیں کھایا تھا۔ اس کمرے میں لاکر اُسے پانی بھی نہیں دیا گیا تھا۔ اُس نے اس عورت کے ہاتھ میں ٹرے اور ٹرے میں پانی کا گلاس دیکھا تو جھپٹ کر گلاس اُٹھا کر مُنہ سے لگا لیا اور ایک ہی

سانس میں خالی کر دیا۔ اُس نے گلاس عورت کی طرف کرتے ہُوئے کہا کہ اور پانی لاؤ۔

"نہ بیٹی!" —— عورت نے کہا —— "مَیں جانتی ہوں تم رات بھر کی پیاسی ہو لیکن خالی پیٹ اتنا پانی نہ پیو۔ پہلے کچھ کھا لو۔"

رشی نے کبھی بھوک اور پیاس نہیں دیکھی تھی۔ پاکستان کے غریب اور بھوکے ننگے عوام کو وہ ناپسندگی کی نظروں سے دیکھا کرتی تھی۔ اُسے صرف ایک رات کی بھوک اور پیاس نے احساس دلا دیا کہ پاکستان کے عوام کس حال میں جی رہے ہیں لیکن اُس وقت اُس کے سامنے ایک مسئلہ تو یہ تھا کہ کھانے کو کچھ ملے اور اس کے بعد یہ معلوم ہو کہ اسے یہاں کیوں لایا گیا ہے۔

اُس نے بیتابی سے اس عورت کے ہاتھ سے ٹرے لے کر پلنگ کے قریب رکھی ہوئی تپائی پر رکھ لی اور بڑی تیزی سے ناشتہ کیا۔ یہ پرانی وضع کا انڈوں اور پراٹھوں کا ناشتہ تھا اور اس کے ساتھ چائے تھی۔ پیٹ میں غذا جانے سے رشی کے جسم میں جان آگئی۔ تب اُس نے ناشتہ لانے والی عورت کو غور سے دیکھا اور اُس نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ بڑی بے صبری سے کھاتی رہی ہے اور یہ عورت اس پر نظریں جما کر بیٹھی رہی ہے۔ رشی کے دماغ میں ناشتے کے بعد پہلا خیال یہ آیا کہ وہ عصمت فروشوں کے بازار میں آگئی ہے۔ اُس نے لڑکیوں کے اغوا کی کچھ کہانیاں پڑھی تھیں اور ایک دو واقعات سُنے بھی تھے۔ ان کہانیوں اور واقعات میں ایک ادھیڑ عمر عورت کا ذکر ضرور آتا تھا جو مغویہ پر تشدد کرتی ہے یا پیار و محبت سے اُس کے دل پر قبضہ کرتی ہے اور اُسے ناچنے گانے اور عصمت فروشی کے لئے تیار کرتی ہے۔

اس عورت کو دیکھ کر اُسے یقین ہو گیا کہ یہ اُسی قماش کی عورت ہے۔

"اگر مَیں تمہاری لائن پر نہ چلوں تو میرے ساتھ کیا سلوک کرو گے؟" —— اُس نے اس عورت سے پوچھا۔

"کون سی لائن؟"

"یہ طوائفوں کی منڈی ہے نا؟" —— رشی نے کہا —— "یہ پوچھنا تو بیکار ہے کہ تمہارا مذہب کیا ہے .... تم لوگوں کا کوئی مذہب تو ہوتا ہی نہیں۔"

"مَیں تمہیں صرف یہ یاد دلانا چاہتی ہوں کہ تم کسی مسلمان باپ کی بیٹی ہو" —— اس عورت نے کہا —— "اور تمہیں کسی مسلمان کی بیٹی نے جنم دیا ہے .... کیا یہ غلط ہے؟"

"یہ درست ہے۔"

"اور مَیں تمہیں یہ بتا دیتی ہوں کہ میرا مذہب اسلام ہے" —— عورت نے کہا —— "اور تمہیں کسی غلط مقصد کے لئے یہاں لایا گیا ہوتا تو تمہیں یہاں لانے والے آدمی رات کو اکیلا نہ رہنے دیتے۔ وہ تمہارے ساتھ ہوتے اور اس وقت تمہاری حالت کچھ اور ہوتی۔ تم نے اُن دو آدمیوں کو جو یہاں کمرے میں موجود تھے، اچھی طرح دیکھا ہوگا۔ کیا وہ تمہیں بردہ فروش یا طوائفوں کو نچانے والے لگتے تھے؟"

"بردہ فروشوں کے سروں پر سینگ تو نہیں ہوتے" —— رشی نے کہا۔

"بردہ فروش یہ بھی نہیں پوچھا کرتے کہ تمہیں پاکستان سے دلی لانے والا عزیز احمد اور تمہارا خاوند ہندوستان کے جاسوس ہیں" —— اس عورت نے کہا —— "یہ طوائفوں اور ان کے دلالوں کی حویلی نہیں۔ میں تمہیں گھما پھرا کر یہ حویلی دکھاؤں گی۔ یہ انگریزوں کے خلاف جہادِ آزادی لڑنے والے مجاہدوں اور شہیدوں کی حویلی ہے۔"

"تم ۱۹۴۷ء کی بات کر رہی ہو؟" —— رشی نے کہا —— "میں تعلیم یافتہ لڑکی ہوں۔ مجھے تاریخ جغرافیہ نہ پڑھاؤ۔"

"میں ۱۸۵۷ء کی بات کر رہی ہوں" —— اس عورت نے فخریہ انداز میں ذرا بارُعب لہجے میں کہا —— "یہ ہمارے اُن آباؤ اجداد کی حویلی ہے جو انگریزوں کے خلاف لڑے تھے۔ وہ تم جیسے یا تمہارے والدین جیسے غداروں کی وجہ سے شکست کھا گئے تھے۔ ان میں کچھ تو لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ ایک دو کو سرِعام پھانسی دی گئی۔ پھر یہ حویلی انگریزوں، سکھوں اور ہندوؤں کے ہاتھوں لُوٹی گئی۔ میں صرف اپنے اور اپنے خاوند کے آباؤ اجداد اور صرف

اس حویلی کی بات کر رہی ہوں۔ اگر تم تعلیم یافتہ ہو تو شاید کہیں تم نے پڑھا ہو گا کہ ۱۸۵۷ء میں پورے کا پورا دِلّی شہر لُوٹا گیا تھا اور سینکڑوں نہیں، ہزاروں مسلمان لڑتے ہوتے یا بعد میں درختوں سے لٹکا کر یا توپوں کے آگے کھڑے کر کے شہید کیے گئے تھے۔ وہ شہید مرے نہیں، ہم نے انہیں زندہ رکھا۔ انہی شہیدوں کے صدقے ہم نے پاکستان بنایا.... آج تم اپنے خاوند کے ساتھ اُس پاکستان سے غداری کرنے کے لئے آتی ہو جس کی بنیادوں میں دِلّی کی اس حویلی کے رہنے والوں کا خون شامل ہے.... ہم اب بھی لڑ رہے ہیں۔ اب ہمارا دشمن انگریز نہیں ہندو ہے۔"

اس عورت کے بولنے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ رشی مسحور سی ہو گئی۔ اُس نے کچھ اطمینان سا بھی محسوس کیا کیونکہ اُسے اس عورت نے بتا دیا تھا کہ وہ عصمت فروشوں کے قبضے میں نہیں۔ اس عورت کی عمر پچاس سال سے ذرا کم تھی۔ اُس کے چہرے پر جلالی سا تاثر تھا۔

"آپ کون ہیں؟" — رشی نے ایسے لہجے میں پوچھا جس میں مرعوبیت تھی۔ پہلے وہ اس عورت کو تم کہتی رہی اور اب اُس کے مُنہ سے بے اختیار آپ نکل گیا۔

"مَیں اس حویلی کے مالک کی بیوی ہوں" — اس عورت نے جواب دیا۔

"وہ کون ہیں؟" — رشی نے پوچھا — "ان کا نام اور کام کاج کیا ہے؟"

"ان کا نام تمہیں خود ہی کسی وقت معلوم ہو جائے گا" — اس عورت نے جو ہاشمی کی بیوی تھی جواب دیا — "اور ان کا کام کاج ہندوستان اور پاکستان میں اسلام کی حفاظت ہے۔"

"لیکن مجھے دھوکے سے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟" — رشی نے جھنجھلا کر پوچھا — "میرے اغوا سے اسلام کی کیا خدمت ہو سکتی ہے؟"

"ہم صرف یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ عزیز اور تمہارا خاوند ہندوستان

کے جاسوس ہیں" — ہاشمی کی بیوی نے کہا — "ظاہر ہے کہ تم بھی ان کے ساتھ ہو۔"

"مَیں رات کو ان دونوں آدمیوں کو بتا چکی ہوں کہ عزیز اور میرے خاوند پر جاسوسی کا الزام بالکل غلط ہے" — رشی نے پُر زور لہجے میں کہا — "اگر مَیں کہہ دیتی ہوں کہ ہاں، یہ الزام صحیح ہے تو آپ لوگ کیا کریں گے؟"

"ہم تمہیں کوئی پند و نصیحت نہیں کریں گے" — ہاشمی کی بیوی نے کہا — "ہم وعظ نہیں کریں گے اور تمہیں قرآن کی آیتیں اور حدیثیں نہیں سنائیں گے اور ہم یہ بھی نہیں بتائیں گے کہ ہم کیا کریں گے۔"

"آپ ہی بتائیں" — رشی نے روتی ہوئی آواز میں پوچھا — "مَیں کون سی قسم کھاؤں جس سے آپ کو یقین آ جائے کہ میرا خاوند اور عزیز انڈیا کے جاسوس نہیں۔"

"دیکھو بیٹی!" — ہاشمی کی بیوی نے کہا — "قسم خدا کی، رسولِ خدا کی یا قرآن پاک کی کھائی جاتی ہے۔ تم لوگوں کے دلوں میں ان تینوں کا ذرا سا بھی احترام نہیں۔ تم اگر ان تینوں کی بھی قسم کھا لو گی تو مَیں اپنے آپ کو گناہگار سمجھوں گی۔"

"گناہگار کیوں؟"

"کیا تم قرآنِ پاک کی کوئی ایک آیت سُنا سکتی ہو؟" — ہاشمی کی بیوی نے پوچھا۔

رشی نے دو تین سیکنڈ خالی خالی نگاہوں سے ہاشمی کی بیوی کے چہرے پر نظریں جمائیں پھر اُس نے آہستہ آہستہ سر کو دائیں بائیں کی جنبش دی جس کا مطلب تھا، نہیں۔ اس کے ساتھ ہی اُس کے چہرے پر شرمندگی کا تاثر آ گیا۔

"نماز تو تمہیں آتی ہو گی۔"

رشی کا سر پھر اُسی طرح ہلا اور اُس کے چہرے پر شرمندگی کا جو تاثر اُبھا تھا وہ اور زیادہ گہرا ہو گیا۔

"میں تمہیں یقین دلاتی ہوں" — ہاشمی کی بیوی نے کہا — "کہ یہاں تمہاری عزت محفوظ رہے گی۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا کہ میں تمہارے پاس آتی ہوں، میرا خاوند یا کوئی اور مرد تمہارے پاس آتا ہے۔ ہم تمہیں سوچنے کا پورا موقع دیں گے۔ ہندوستان میں آنے کا صحیح مقصد بتا دو تو تمہیں ہمارے آدمی وہیں چھوڑ آئیں گے جہاں سے لاتے تھے۔"

ہاشمی کی بیوی اُٹھ کھڑی ہوئی اور ناشتے کی ٹرے اُٹھا کر دروازے کی طرف چل پڑی۔ رِشی نے اُسے پکارا، لیکن وہ نہ رُکی اور اُس نے دروازہ بند کر دیا۔

"آنٹی!" — رِشی نے بند کواڑوں پر زور زور سے ہاتھ مارتے ہوئے کہا — "خالہ جان!... آنٹی!... میری بات سن کر جائیں.... مجھے یوں بند نہ کریں۔"

اُسے دروازے کے باہر زنجیر چڑھنے کی آواز سنائی دی پھر اُسے ہاشمی کی بیوی کے جاتے ہوتے قدموں کی آہٹ سنائی دیتی رہی۔ آخر وہ بھی دُور چلی گئی۔

❦

انڈین انٹیلی جنس نے رِشی کی گمشدگی کی تفتیش پولیس کے سی آئی اے کے شعبے کو دے دی لیکن خود بھی تلاش جاری رکھی اور یہ کام ایک ہندو افسر کے سپرد کر دیا۔

گزشتہ رات سب افسر اس پر متفق ہو گئے تھے کہ لڑکی کسی کے درغلا[illegible] میں آگئی ہے یا کسی کے ساتھ خود ہی مراسم پیدا کر کے چلی گئی ہے اور اغو[illegible] نہیں ہوئی۔ اب انٹیلی جنس اور سی آئی اے اس لائن پر چل پڑیں کہ لڑکی[illegible] مراسم کس کے ساتھ پیدا ہو سکتے تھے۔ انہیں بتایا گیا کہ رابی اور رِشی کو د[illegible] ڈسکو کلبوں میں لے جایا گیا تھا جہاں رابی یہاں کی لڑکیوں میں اور رِشی لڑکو[illegible] میں گھُل مل گئے تھے۔ اس سے یہ شک پیدا ہوا کہ اسی دوران یعنی انہی تی[illegible] چار دنوں میں لڑکی کسی کی محبت کو اپنے دل میں بٹھا بیٹھی یا کسی امیرزادے

نے اس لڑکی کو اپنے اعصاب پر سوار کر لیا پھر یُوں ہُوا ہو گا کہ لڑکی خود نکلی یا دوسری صورت میں اُس امیرزادے نے لڑکی کو کوئی دھوکہ دے کر ہوٹل سے باہر بلایا اور گاڑی میں بٹھا کر لے گیا۔

ان دو کلبوں پر شک ہُوا تو دونوں کلب چلانے والوں کو تھانے بلایا گیا اور ان سے کلب کے باقاعدہ ممبروں کے نام اور پتے معلوم کئے گئے جو کلبوں کے رجسٹروں میں محفوظ تھے۔ کلبوں کے منتظمین سے کہا گیا کہ وہ کسی کو بھی پتہ نہ چلنے دیں کہ انہیں تھانے بلایا گیا تھا اور ممبروں کے نام پتے لئے گئے تھے۔

ان سے یہ بھی پوچھا گیا کہ ان ممبروں میں کوئی ایسے بھی ہیں جو بہت ہی نڈر، بدمعاش اور امیر کبیر ماں باپ کے بیٹے ہوں؟

"ہر طرح کے لوگ ہیں جناب!" — ایک کلب کے منیجر نے جواب دیا — "یہ تو آپ نے معلوم کر لیا ہے کہ یہ کلب شریف لوگوں کے لئے نہیں۔ یہاں ڈانس اور میوزک کے نام سے جو اُدھم مچتا ہے وہ کبھی آکر دیکھیں۔ آپ نے دیکھا بھی ہو گا۔ جب یہ لڑکے اور لڑکیاں وہسکی، کاک ٹیل اور ہیروئن وغیرہ کے نشے میں ہوتے ہیں تو بھگوان بھی ان پر قابو نہیں پا سکتا۔"

"تم لوگ غور سے سُن لو" — انٹیلی جنس کے افسر بھاٹیہ نے جسے یہ تفتیش دی گئی تھی، دونوں کلبوں کے منتظمین سے کہا — "ہمیں مشتبہ چاہئیں۔ خود دیکھو کہ اتنا دلیر کون سا لڑکا یا کون سا گروہ ہو سکتا ہے جو لڑکی کو درغلا کر یا کسی طرح پھانس کر اُڑا لے گیا ہو۔ اگر ذرا سا بھی شک ہُوا کہ تم لوگ انہیں کوَر کر رہے ہو تو تمہاری باقی عمر جیل میں گزرے گی۔"

طے پایا کہ اگلے ویک اینڈ کی شام یعنی ہفتے کی شام دونوں کلب خصوصی ڈسکو نائٹ منعقد کریں گے۔

دو دنوں بعد دونوں کلبوں میں دِلّی کے نوجوانوں کے ہجوم اکٹھے ہو گئے۔ یہ سب باقاعدہ ممبر تھے۔ رات گیارہ بجے کے بعد جب یہ نوجوان نشے میں بدمست ناچ گانے میں پوری طرح اُلجھ گئے تھے تو دونوں کلبوں میں پولیس اور انٹیلی جنس کے آدمی پرائیویٹ کپڑوں میں پہنچ گئے۔ دونوں

کلبوں کے منتظمین نے کچھ نام لکھ کر رکھے ہوتے تھے۔ انہیں الگ کر لیا گیا اور جیپوں میں بٹھا کر انہیں پولیس ہیڈ کوارٹر لے گئے۔ یہ سب مشتبہ تھے۔ ان میں بعض انڈین گورنمنٹ کے افسرانِ اعلیٰ کے بیٹے تھے۔ کچھ سیٹھوں کی اولاد تھے۔ اینگلو انڈین بھی تھے اور ایک دو سمگلر قسم کے باپوں کے بیٹے تھے۔

سی آئی اے کے انٹیروگیشن سنٹر میں ٹارچر سیل بنے ہوتے تھے۔ ان لڑکوں کو ان میں لے گئے اور ایذا رسانی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ لڑکے پوری رات، اگلا دن اور اس سے اگلی رات بھی گھروں سے غائب رہے تو ان کے ماں باپ انہیں ڈھونڈنے لگے۔ انہیں آخری بار کلبوں میں دیکھا گیا تھا۔ کلبوں کے منتظمین کہتے تھے کہ انہیں کچھ پتہ نہیں۔ کانوں کان یہ خبر باہر نکل گئی کہ لڑکے سی آئی اے کے پاس ہیں۔ معاملہ سیدھا مرکزی حکومت کے پاس چلا گیا۔ حکومت کی مشینری ہل گئی۔ انٹیلی جنس کے چیف سے پوچھا گیا تو پتہ چلا کہ لڑکوں کو کیوں سی آئی اے نے اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔

بھارت نے اپنی انٹیلی جنس کو اتنے زیادہ اختیارات دے رکھے تھے اور خود انٹیلی جنس خصوصاً "را" نے ایسی پوزیشن حاصل کر لی تھی کہ وزیرِ اعظم اور صدر بھی ان کے آگے بے بس ہو جاتے تھے۔ یہ کوئی شریف لڑکے تو نہیں تھے کہ انہیں پکڑا نہ جاتا۔

ان سب کو چھڑانے کے لئے اُوپر سے بہت دباؤ پڑا لیکن انٹیلی جنس نے اپنی تسلی کر کے لڑکوں کو چھوڑا۔

اُدھر ہوٹل میں سی آئی اے اور انٹیلی جنس کے مُخبر بُوگیر کتوں کی طرح کسی سراغ یا کسی مشتبہے کی مُشک سُونگھتے پھر رہے تھے لیکن کوئی سراغ نہ ملا۔ پھر سی آئی اے اور انٹیلی جنس کے افسروں کی ایک اور میٹنگ ہوئی۔

"سوال یہ پیدا ہوتا ہے" —— انٹیلی جنس کے افسر بھاٹیہ نے افسروں کی میٹنگ میں کہا —— "کہ ہم اس لڑکی کو اتنی اہمیت کیوں دے رہے ہیں کہ دو محکمے صبح و شام اس کی تلاش میں مصروف ہیں .... میں چونکہ انٹیلی جنس کا آدمی ہوں اس لئے میں اس سوال کا جواب دینے کی بہتر پوزیشن میں ہوں۔

وہ ایک عام لڑکی ہے اور وہ پاکستانی ہے۔ اگر اُس کی حیثیت یہی ہوتی تو ہم اس کی گمشدگی اور اُس کے قتل میں بھی کوئی دلچسپی نہ لیتے۔ ہم دلچسپی اس لئے لے رہے ہیں کہ اس کا تعلق ہمارے محکمے کے ساتھ ہے۔ تعلق لاپتہ لڑکی کا نہیں بلکہ اس کے خاوند کا ہے جس سے لڑکی بے خبر ہے۔ ہمیں خطرہ صرف یہ ہے کہ کسی پاکستانی ایجنٹ نے اُسے نہ اُڑا لیا ہو۔"

"پاکستانی ایجنٹ نے کیوں اُڑایا ہو گا؟" —— سی آئی اے کے ڈی ایس پی نے پوچھا۔

"لڑکی کو جاسوس سمجھ کر" —— بھاٹیہ نے جواب دیا —— "اگر ایسے ہی ہُوا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان کی کاؤنٹر انٹیلی جنس زیادہ تیز ہے۔ لڑکی کو اگر پاکستان تک پہنچا دیا گیا تو ہمارے پورے رِنگ کے پکڑے جانے کا خطرہ ہے۔ اگر لڑکی کو انڈیا میں ہی ختم کر دیا جاتا ہے تو خطرہ کچھ کم ہو سکتا ہے۔"

"میرا خیال کچھ اور ہے" —— انٹیلی جنس کے ایک افسر نے جو بھاٹیہ کا جونیئر تھا، کہا —— "پاکستانی انٹیلی جنس کو تو جسے وہاں آئی ایس آئی کہتے ہیں، وہاں حکمرانوں نے اپنے سیاسی چکروں میں مصروف رکھا ہُوا ہے۔ وہاں انٹیلی جنس سے اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔"

"یہ بالکل صحیح ہے" —— بھاٹیہ نے کہا —— "لیکن دشمن کو اتنا کمزور بھی نہ سمجھو۔ ہم پاکستان کی لمحہ بہ لمحہ اور ہر کونے کھدرے کی خبر رکھتے ہیں۔ تم بھی جانتے ہو کہ پاکستان میں کیا ہو رہا ہے۔ وہاں کا حکمران فوجی ہو یا سیاسی، وہ فوج، پولیس، ملٹری اور سول انٹیلی جنس کو اپنے اقتدار کو مستحکم اور لمبا کرنے کے لئے استعمال کرتا ہے۔ ہر نیا پاکستانی حکمران ان چاروں محکموں کی کمانڈ اپنے مفادات کے مطابق تبدیل کرتا ہے، لیکن میں اپنے تجربے کی بنا پر آپ سب کو بتاتا ہوں کہ جہاں تک آئی ایس آئی کا تعلق ہے، اس کے متعلق کسی غلط فہمی یا خوش فہمی میں نہ رہنا۔ یہ پاکستان کی تینوں مسلح افواج کی مشترکہ انٹیلی جنس ہے اور پاکستان کی آرمی، نیوی اور ایئر فورس ہمیں اس طرح اپنا دشمن

سمجھتی ہیں جس طرح دیہات میں خاندانی دشمنیاں چلتی ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان کی آئی ایس آئی اپنے حکمرانوں کا حکم ماننے پر مجبور ہے، لیکن اس کا اپنا ایک جذبہ بھی ہے ..... صرف یہ یقین ہو جاتے کہ لڑکی کو پاکستانی انٹیلی جنس نے غائب نہیں کرایا تو ہمارا مسئلہ ختم ہو جاتا ہے، لڑکی ملے یا نہ ملے۔"

❦

انڈین انٹیلی جنس اور سی آئی اے کی تفتیش اور سراغرسانی زور و شور سے جاری رہی۔ جہاں کہیں بھی انہیں ذرا سا شک ہُوا، دونوں محکموں کے افسر وہاں تک پہنچے۔ انہوں نے اس طرح تفتیش کی جیسے زمین کی تہوں میں اُتر رہے ہوں لیکن لڑکی کا کہیں بھی سراغ نہ ملا۔

آٹھ دس دن گزر چکے تھے جب تفتیشی افسروں نے ڈسکو کلبوں سے کچھ لڑکے پکڑے تھے، اُس وقت رشی ہاشمی کی حویلی کے اُسی کمرے میں تھی جس کمرے میں اُسے لے جایا گیا تھا اور اس کمرے میں اُس کا تیسرا دن تھا۔ اُسے کھانا وغیرہ ہاشمی کی بیوی دیتی تھی اور اس کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتی تھی۔ رشی کو یہ خاتون بیت الخلاء اور غسل خانے تک لے جاتی تھی۔

ایک روز وہ رشی کو حویلی کے تین چار کمروں میں لے گئی۔ رات کا وقت تھا۔ اُس نے رشی کو ایک کمرہ دکھایا جس کے فرش پر دری بچھی ہوئی تھی۔ درمیان میں ایک تپائی تھی۔ تپائی پر بچوں کے قاعدے اور سپارے پڑے ہوتے تھے۔

"یہ کمرہ محلے کے بچوں اور بچیوں کے لئے ہے" ــــ ہاشمی کی بیوی نے رشی کو بتایا ــــ "یہاں میں ان بچوں کو قرآن پڑھاتی ہوں۔"

"کیا یہ آپ کا ذریعۂ معاش ہے؟"

"نہیں" ــــ ہاشمی کی بیوی نے جواب دیا ــــ "یہ میرا فرض ہے ..... میں انہیں صرف پڑھاتی ہی نہیں بلکہ انہیں یہ تربیت دیتی ہوں کہ وہ کس قوم کے بچے ہیں اور اس قوم کا ماضی کیا ہے اور قوم کے حال اور مستقبل کو ماضی کے سانچے میں کس طرح ڈھالنا ہے۔ تیس پارے پڑھ لینے سے یہی کہا

جا سکتا ہے کہ ہمارے بچے نے قرآن ختم کر لیا ہے۔ میں قرآن کی رُوح کو بچوں کی روح میں اُتارنے کی کوشش کرتی ہوں۔ قوم بچوں کی تعلیم و تربیت سے بنتی ہے۔ تعلیم و تربیت نہ ہو تو بچے اُسی سانچے میں ڈھل جاتے ہیں جس سانچے میں تم ڈھلی ہو۔"

رشی نے چونک کر اس خاتون کی طرف دیکھا۔ اُسے یوں لگا جیسے اس خاتون کا چہرہ وہ نہیں رہا جو اُس نے پہلے روز دیکھا تھا۔ اب اس چہرے پر اُسے مقدس سا رُعب نظر آ رہا تھا اور رشی پر مرعوبیت سی طاری ہو رہی تھی۔ رشی نے یہ بھی نہ سوچا کہ وہ اس مکان کو اچھی طرح دیکھ لے تاکہ کسی وقت اُسے یہاں سے نکل بھاگنے کا موقع مل جاتے یا یہ لوگ اُسے نکال دیں تو وہ پولیس کو بتا سکے کہ اس مکان کی شناخت کیا ہے جس میں اُسے قید رکھا گیا تھا۔

"آپ کی اپنی اولاد بھی ہو گی!" ــــ رشی نے ہاشمی کی بیوی سے کہا ــــ "آپ کے بچے جوان ہوں گے۔"

"نہیں!" ــــ بیگم ہاشمی نے جواب دیا ــــ "ہماری کوئی اولاد نہیں۔ ان بچوں کو ہی ہم اپنی اولاد سمجھتے ہیں جو یہاں پڑھنے آتے ہیں۔"

"آپ اولاد سے محرومی کو محسوس تو بہت کرتی ہوں گی!" ــــ رشی نے کہا۔

"کبھی محسوس کیا تھا" اس معزز خاتون نے کہا ــــ "یہیں بیٹھ جاؤ" ــــ اُس نے رشی کو وہیں دری پر بٹھا لیا اور کہنے لگی ــــ "لیکن یہ احساس تھوڑے ہی عرصے بعد ختم ہو گیا تھا۔"

"مایوس ہو کر صبر ہی کرنا پڑتا ہے" ــــ رشی نے کہا ــــ "کہتے ہیں کہ مجبوری کا نام صبر ہے۔"

"لیکن میں نے اور میرے میاں نے اپنے آپ کو کوئی دھوکہ نہیں دیا" ــــ بیگم ہاشمی نے کہا ــــ "میں نے ڈاکٹروں کے اس فیصلے کو کہ میں اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں، حکمِ الٰہی کا درجہ دے کر تسلیم کر لیا تھا۔ میرے میاں کے دل میں میرا اتنا پیار تھا کہ صرف میں نے ہی نہیں بلکہ میرے والدین

نے بھی انہیں کہا کہ وہ اولاد کی خاطر دوسری شادی کر لیں لیکن وہ نہ مانے۔ کچھ عرصہ ہم دونوں نے یہ خلش محسوس کی کہ ہمارے بچے نہیں ہوں گے لیکن ایک روز اچانک یہ خلش دل سے نکل گئی ....

"اس کا سبب یہ بنا کہ ساتھ والے محلّے کی ایک مسلمان لڑکی کالج میں پڑھتی تھی۔ ایک روز وہ کالج گئی اور واپس نہ آئی۔ تیسری رات تھانے سے لڑکی کے گھر اطلاع آئی کہ اُن کی بیٹی ایک ہوٹل کے کمرے سے ناجائز اور غیر قانونی حالت میں پکڑی گئی ہے .... اُس باپ کی حالت کا اندازہ کرو جو اپنی بیٹی کو اتنے ذلیل الزام سے چھڑانے گیا ہوگا۔ میرے میاں نے کچھ دنوں بعد بتایا تھا کہ اس لڑکی کے باپ کی حالت ٹی بی کے مریضوں جیسی ہو گئی ہے اس لڑکی کے پکڑے جانے کی خبر اخباروں میں بھی آئی تھی ...

"اُس وقت مَیں خود جوان تھی۔ مَیں نے دس جماعت تک تعلیم حاصل کی ہے۔ مَیں کوئی عالم فاضل نہیں۔ مَیں تو اپنے مذہب کی روایات اور اپنے معاشرے کی اقدار کی پابند ہوں .... پھر زمانہ ایسا بدلا کہ نوجوان لڑکے لڑکیاں اخلاقی قدروں سے بھٹکنے لگے، طرح طرح کے نشوں کے نشئی ہونے لگے اور بعض تو دین کے رہے نہ دنیا کے۔ انہیں دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ وہ بیٹی میری ہوتی جو ہوٹل کے ایک کمرے میں اپنے دوست کے ساتھ پکڑی گئی اور باپ اُسے تھانے سے گھر لایا تھا تو میری حالت پاگلوں سے بدتر ہو جاتی اور میرے میاں ٹی بی کے مریض ہو جاتے .... پھر مَیں نے اور میرے میاں نے سوچا کہ ہمارا کوئی بیٹا کسی نشے کا نشئی ہو جاتا، آوارہ اور بدچلن ہو جاتا تو مَیں اور میرے میاں جل جل اور کُڑھ کُڑھ کر وقت سے پہلے بڑھاپے یا دل کے کسی مرض کا شکار ہو جاتے اور اپنے اللہ کے آگے ہر وقت شرمسار رہتے کہ ہم نے اپنی اولاد کو اچھی تعلیم و تربیت نہیں دی۔ ایسی اولاد سے بے اولادی اچھی"

ہاشمی کی بیوی نے یہ بھی نہ سوچا کہ یہ لڑکی اُس کی مہمان نہیں۔ اس کے ساتھ وہ اس طرح باتیں کرتی رہی جیسے اُس کے پاس تعلیم حاصل کرنے آئی ہو۔ باتوں باتوں میں اُس نے رشی کو اُٹھایا اور واپس اُسی کمرے میں لے گئی

جو اُس کا قید خانہ تھا۔

"آنٹی!" — رشی نے کہا۔

"نہیں بیٹی!" — بیگم ہاشمی نے اُسے آگے بولنے نہ دیا — "مجھے خالہ کہو۔ یہ لفظ آنٹی مجھے بہت بُرا لگتا ہے .... تمہارا نام تو مَیں نے ابھی تک پوچھا ہی نہیں"۔

"مجھے رشی کہتے ہیں"۔

"میرا خیال ہے تم مسلمان ہو" — ہاشمی کی بیوی نے کہا۔

"ہاں خالہ جان!" رشی نے جواب دیا "مَیں مسلمان ہوں"۔

"وہ نام بتاؤ جو ماں باپ نے رکھا تھا" — بیگم ہاشمی نے کہا۔

"ماں باپ نے میرا نام راشدہ رکھا تھا" — رشی نے جواب دیا۔

"جو قوم اپنی پہچان اور جو انسان اپنا نام بھول جاتا یا تبدیل کر لیتا ہے اُس کا یہی حال ہوتا ہے جس حال میں تم پہنچ چکی ہو" — بیگم ہاشمی نے بڑے ہی خوشگوار اور پُراثر لہجے میں کہا — "اب کہو کیا کہنا چاہتی ہو"۔

"میرے کہنے والی ایک ہی بات ہے خالہ جان!" — رشی نے کہا — "میں کس جرم میں پکڑی گئی ہوں؟ آپ کی باتیں سُنی ہیں جو آپ نے اُس کمرے میں کہی تھیں تو مَیں اس کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتی کہ آپ بڑی ہی نیک اور دیانتدار خاتون ہیں، لیکن جس طریقے سے آپ نے مجھے اغوا کرایا ہے یہ دیکھتی ہوں تو آپ کے متعلق میری رائے بدل جاتی ہے"۔

"یہ جرم کیا کم ہے کہ تم ہندوستان کے ایک جاسوس کے ساتھ اُس ملک کی سیر کو آئی ہو جو اسلام کا اور ہندوستان اور پاکستان کے مسلمانوں کا دشمن ہے" — بیگم ہاشمی نے کہا۔

"مَیں مرتے دم تک یہی کہتی رہوں گی کہ یہ جھوٹ ہے" — رشی نے پُرزور طریقے سے کہا — "آپ کے متعلق میری غلط فہمی دُور ہو گئی ہے۔ اب میں یہ کہوں گی کہ میرا خاوند اور عزیز اگر انڈیا کے جاسوس ہیں تو مَیں نہیں جانتی۔ آپ کے پاس اگر کوئی ثبوت ہے تو مجھے بتا دیں۔ میرے پاس نہ اس

کا کوئی ثبوت ہے کہ میرا خاوند انڈیا کا جاسوس بن گیا ہے نہ میں یہ ثابت کر سکتی ہوں کہ وہ انڈیا کا جاسوس نہیں۔ اگر وہ ہے بھی تو مجھے آپ نے کیوں قید میں ڈال دیا ہے؟"

اتنے میں ہاشمی کمرے میں داخل ہوا۔ اُس کی بیوی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ہاشمی کے اشارے پر وہ دروازے کی طرف چل پڑی۔ ہاشمی اُس کے پیچھے پیچھے کمرے سے نکلا اور باہر سے دروازہ بند کر دیا۔ برآمدے میں ہی کھڑے کھڑے اُس نے اپنی بیوی سے رپورٹ لی۔ بیوی نے اُسے تفصیل سے بتایا کہ لڑکی کے ساتھ کیا باتیں ہوتی ہیں اور وہ کیا کہتی ہے۔

ہاشمی نے بیوی کو اپنے کمرے میں بھیج دیا اور خود رشی کے کمرے میں چلا گیا۔

"کیوں لڑکی!" — ہاشمی نے رشی سے پوچھا — "یہاں سوائے قید کے اور کوئی تکلیف تو نہیں ہوتی؟"

"نہیں"۔

"کیا تمہارا یہ شک رفع ہو گیا ہے کہ ہم نے تمہیں کہیں غلط یا بے ہودہ مقصد کے لئے اغوا کیا ہے؟" — ہاشمی نے پوچھا۔

"جی ہاں" — رشی نے جواب دیا — "وہ شک رفع ہو گیا ہے۔ آپ کی بیگم نے اپنے متعلق اور آپ کے خلاف کوئی شک نہیں رہنے دیا۔ اب میں آپ سے التجا کرتی ہوں کہ اپنے دل سے میرے خلاف شک اتار دیں۔ اب تو میں یہ کہوں گی کہ میں جاسوس نہیں اور میں نہیں جانتی کہ میرا خاوند اور عزیز جاسوس ہیں یا نہیں"۔

"تم جانتی ہو" — ہاشمی نے رُعب دار آواز میں کہا — "اور تم سب کچھ جانتی ہو۔ ہمیں صرف یہ بتا دو کہ اس وقت تک پاکستان کے خلاف کیا کیا خفیہ کارروائیاں ہو چکی ہیں اور پاکستان سے تم کس قسم کی انفارمیشن عزیز کو دے چکی ہو!"

رشی نے اپنے سر کو زور زور سے ہلا ہلا کر انکار کیا۔ اُس کی حالت تو ایسی ہو گئی تھی جیسے تڑپ رہی ہو۔ وہ بار بار پوچھتی تھی کہ اُس پر شک کیوں کیا

جا رہا ہے۔

"اس لئے کہ پاکستان کا کوئی مسلمان یہاں دو چار دنوں کے لئے آ جاتے تو سی آئی ڈی کا پورا محکمہ اُس کے پیچھے لگ جاتا ہے" — ہاشمی نے کہا — "ایک تم اور تمہارا خاوند ہے جنہیں اُس ہوٹل میں ٹھہرایا گیا ہے جہاں دوسرے ملکوں کے حکمرانوں اور وزیروں کو ٹھہرایا جاتا ہے۔ کیا تم نے عزیز احمد سے کبھی پوچھا تھا کہ تمہاری حیثیت کیا ہے کہ تم نے ہمیں اتنے بڑے ہوٹل میں ٹھہرایا ہے؟ کیا تم نے اپنے خاوند سے بھی نہیں پوچھا کہ عزیز کو اور تم دونوں کو ایئرپورٹ سے ہوٹل میں لانے کے لئے جو مرسیڈیز گاڑی گئی تھی، وہ کس کی تھی؟ پاکستان میں تمہاری یا تمہارے خاوند کی کوئی سرکاری حیثیت نہیں نہ تم انڈین گورنمنٹ کے سرکاری مہمان ہو..... جب تک صحیح بات نہیں بتاؤ گی تمہیں نہیں چھوڑا جائے گا"۔

رشی کو ہچکی سی آئی اور وہ رونے لگ گئی۔ رونے کے سوا وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ ہاشمی اُسے روتے دیکھتے رہا۔

"کیا آپ کو ایک مجبور اور بے بس لڑکی پر ذرا سا بھی رحم نہیں آتا؟" — رشی نے روتے ہوتے کہا۔

"سن چھیالیس اور سنتالیس میں ہم پر کسی نے رحم نہیں کیا تھا" — ہاشمی نے کہا — "ہماری تم جیسی بیٹیاں ہندو اور سکھ اُٹھا لے گئے تھے۔ قوم کی وہ بیٹیاں تم جیسی ہی تھیں جن کے ساتھ درندوں جیسا سلوک کیا گیا اور اُن کی برہنہ لاشیں کھیتوں اور گلیوں میں پھینک دی گئی تھیں..... کیا تم جانتی ہو کہ اس ملک کے کفار نے ہم سے پاکستان کی کیا قیمت وصول کی تھی؟"

ہاشمی نے اُسے تفصیل سے بتانا شروع کر دیا کہ مسلمانوں نے پاکستان کس طرح بنایا تھا اور ہندوؤں اور سکھوں نے کس طرح مسلمانوں کا خون بہایا اور اُن کے گھروں کو لوٹا اور جلایا تھا۔ ہاشمی تحریکِ پاکستان کو دُور پیچھے سید احمد شہیدؒ کی تحریکِ مجاہدین تک لے گیا اور اس تحریک کے مجاہدین کی داستانِ جہاد سنائی پھر سنایا کہ مسلمان ۱۸۵۷ء میں اُٹھے مگر غداروں نے اور مسلمانوں کی بے اتفاقی نے انہیں شکست سے دوچار کیا۔ اُس نے بتایا کہ ہندو اور سکھ

بھی انگریزوں کے ساتھ مل گئے تھے۔

ہاشمی بڑے جذباتی انداز میں یہ سارے واقعات سُنا رہا تھا۔ وہ بار بار کہتا تھا کہ ہندوؤں نے مسلمانوں پر کیسے کیسے ستم ڈھاتے اور اس ملک سے اسلام کا نام و نشان مٹانے کے لئے کیا کیا ڈھنگ کھیلے۔

رشی پر سکتہ سا طاری ہُوا جا رہا تھا۔ جب ہاشمی نے اُسے یہ سنایا کہ تحریکِ پاکستان میں مسلمانوں کی اُس جیسی بیٹیوں نے میدان میں اُتر کر کیا رول ادا کیا تھا تو رشی کے جسم نے جھرجھری لی۔ اُس نے دیکھا کہ کتنی بار ہاشمی کی آنکھوں میں جذبات کی شدت سے آنسو آ گئے۔ وہ اپنے آپ میں تبدیلی سی محسوس کرنے لگی۔ اُس کی ذات میں کشمکش سی بپا ہو گئی۔

"انکل!" — رشی نے دبی دبی سی آواز میں کہا — "آپ تو انڈین مسلم ہیں۔ مَیں حیران ہوں کہ آپ پاکستان کے متعلق اتنے زیادہ حساس اور جذباتی ہیں۔ آپ پاکستان کیوں نہیں چلے گئے یا اب کیوں نہیں چلے جاتے؟"

"ہم نہیں جائیں گے" — ہاشمی نے کہا — "پاکستان یہاں آئے گا۔ ہندو لیڈر اپنی قوم کو یہ بتا رہے ہیں کہ پاکستان ہندوستان کا حصّہ ہے اور اسے ہندوستان میں شامل کرنا ہے، لیکن ہم اپنے بچّوں کو یہ سبق دے رہے ہیں کہ ہندوستان پاکستان کا حصّہ ہے اور یہ ایک اسلامی ملک ہے اور اس پورے ملک کو پاکستان بنانا ہے۔ ہم سب سے پہلے تم، تمہارے خاوند اور عزیز احمد جیسے غدّاروں کو خاک میں ملائیں گے .... سوچو اور مجھے سوچ کر جواب دو۔"

ہاشمی کمرے سے نکل گیا اور باہر سے اُس نے کواڑوں کی زنجیر چڑھا دی۔

انہی دنوں کے دوران جب انڈین انٹیلی جنس اور پولیس رشی کی گمشدگی کی تفتیش اور سراغرسانی کر رہی تھی، ایک روز عزیز کا باپ ادریس احمد، ہاشمی کے گھر آیا۔ ہاشمی اُسے گھر ہی مل گیا۔

"ہاشمی صاحب!" — ادریس احمد نے کہا — "آج ہی کسی نے بتایا ہے

کہ عزیز دلّی آیا ہُوا ہے۔ مَیں اُسے ملنا چاہتا ہوں۔ عرصہ گزر گیا ہے آپ نے بتایا تھا کہ عزیز ہندوستان کی انٹیلی جنس کا ایجنٹ بن چکا ہے۔ اب اطلاع ملی ہے کہ وہ آیا ہے۔ مَیں نے آپ کو بتایا تھا کہ وہ گھر نہیں آتا اور اُس نے کہیں اپنی کوٹھی بنا لی ہے۔ وہ اب بھی گھر نہیں آئے گا لیکن میں اُسے ملنا ضرور چاہتا ہوں۔ سمجھ نہیں آتی کہ یہ کس سے معلوم کروں کہ وہ کہاں رہتا ہے۔"

"کیا آپ اُسے راہِ راست پر لے آئیں گے؟" — ہاشمی نے پوچھا۔

"مجھے امید تو نہیں" — ادریس احمد نے کہا — "لیکن میں اُس کا باپ ہوں اور آپ جانتے ہیں کہ ہم نے پاکستان کس طرح بنایا تھا۔ مَیں اُسے اپنے خون کا واسطہ دوں گا۔ ہو سکتا ہے میری بات یا میری آہ و زاری اُس کے دل میں اُتر جائے .... یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اُس کے خلاف یہ الزام غلط ہی نکلے۔ ثبوت تو آپ کے پاس بھی کوئی نہیں۔"

"ادریس صاحب!" — ہاشمی نے کہا — "مجھے آپ پر اعتماد ہے پھر بھی وعدہ کریں کہ عزیز احمد سے آپ کی ملاقات ہو جائے تو میرے حوالے سے اُس کے ساتھ کوئی بات نہ کریں۔ مَیں آپ کو اُس کی کوٹھی دکھا دوں گا۔ آپ نے ٹھیک سُنا ہے کہ عزیز دلّی میں آیا ہُوا ہے۔ مَیں نے اُسے دیکھا ہے۔"

"ہاشمی بھائی!" — ادریس احمد نے ہاشمی کا ایک ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر بیتابی سے کہا — "مَیں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں یہ ظاہر نہیں ہونے دوں گا کہ آپ نے مجھے عزیز کا ایڈریس یا سراغ دیا تھا۔ خدا کے لئے مجھے بتائیں آپ نے اُسے کہاں دیکھا تھا؟"

"مَیں نے اُسے اشوکا ہوٹل سے نکلتے دیکھا تھا" — ہاشمی نے کہا — "مَیں آپ کو اُس کی کوٹھی دکھا دوں گا۔ اگر وہ وہاں نہ ملا تو آپ اُسے اشوکا ہوٹل میں جا کر دیکھیں۔ وہ وہاں ٹھہرا ہو گا۔"

"کیا وہ اتنے بڑے اور اتنے مہنگے ہوٹل میں ٹھہر سکتا ہے؟" — ادریس احمد نے حیران سا ہو کے پوچھا۔

"وہ اس سے بھی بڑے ہوٹل میں ٹھہر سکتا ہے" —— ہاشمی نے کہا —— "انڈین انٹیلی جنس اپنے مسلمان ایجنٹوں کو بہت ہی زیادہ پیسے دیتی ہے۔ آپ کا بیٹا تو پاکستان سے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو پھانس کر لاتا ہے اور یہاں ان کی برین واشنگ کر کے انہیں پاکستان میں تخریب کاری کے لئے اور پاکستان میں نوجوان ذہن کو پاکستان کے خلاف گمراہ کرنے کے لئے ٹریننگ دی جاتی ہے۔ اپنے اس قسم کے مسلمان ایجنٹوں کو تو یہاں کی انٹیلی جنس شہزادہ بنا کر رکھتی ہے۔"

"ہاشمی صاحب!" —— ادریس نے کہا —— "کیا آپ اُس کی کوٹھی دکھانے کے لئے مجھے ابھی لے چلیں گے؟"

"اس وقت نہیں" —— ہاشمی نے کہا —— "احتیاط کا تقاضا ہے کہ شام کے بعد چلیں اور میں آپ کو کوٹھی دکھا کر واپس آجاؤں۔"

"یہ بہتر ہے" —— ادریس احمد نے کہا —— "میں آپ کو پس پردہ رکھوں گا۔"

اُسی رات ساڑھے دس بجے کے لگ بھگ ہاشمی اور ادریس احمد عزیز احمد کی کوٹھی سے ذرا دُور ٹیکسی سے اُترے۔ ہاشمی ادریس احمد کو عزیز کی کوٹھی کے قریب لے گیا اور اُسے کوٹھی دکھا کر واپس آگیا۔

کوٹھی کے گیٹ پر دو گلوب جل رہے تھے۔ برآمدے میں بھی روشنی تھی اور ایک دو کمروں میں بھی بلب روشن تھے۔ کوٹھی کے سامنے دو کاریں اور پانچ چھ موٹر سائیکل اور سکوٹر کھڑے تھے۔ کوٹھی تو چھوٹی سی تھی لیکن اتنی خوبصورت کہ جدید طرزِ تعمیر کا نمونہ تھی۔

ادریس احمد کو یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ اُس کے بیٹے کی کوٹھی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا کوٹھی کے گیٹ تک پہنچا اور وہاں رُک گیا۔ اُسے کوٹھی میں سے اُٹھتی ہوئی انگریزی موسیقی کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ یہ تیز موسیقی تھی۔ ڈرم کی دھب دھب بڑی صاف سنائی دے رہی تھی۔ ادریس احمد کے قدم جب کوٹھی کے گیٹ میں رُک گئے تو اس کوٹھی سے اور

کوٹھی کے سامنے کھڑی کاروں نے اُس پر مرعوبیت طاری کر دی۔ اُس کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ وہ آگے جاتے یا واپس چلا جاتے۔ اُس نے اپنے آپ کو یہ دھوکہ بھی دیا کہ یہ اُس کے بیٹے کی کوٹھی نہیں اور ہاشمی نے جھوٹ بولا ہے لیکن وہ ہاشمی کے پُرعظمت ماضی اور کردار سے واقف تھا۔ اُس کے ذہن میں ہاشمی کے یہ الفاظ گونجنے لگے کہ ایسے ایجنٹوں کو انڈین انٹیلی جنس شہزادہ بنا کر رکھتی ہے۔

ادریس احمد پر کچھ اور ہی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ کوٹھی کے اندر سے انگلش میوزک کے ساتھ ڈرم کی جو دھمک سنائی دے رہی تھی وہ ادریس احمد کے دل کی دھڑکن سے ہم آہنگ ہو گئی۔ اُسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے یہ ڈرم نہیں بلکہ اس کے اپنے دل کی دھڑکن ہے۔

اُس کے قدم نہ آگے کو اُٹھ رہے تھے نہ پیچھے کو۔ اُس نے سر جھکا لیا اور وہ اپنے آپ میں ایسا گم ہو گیا کہ اُس نے اپنی طرف بڑھتے ہوتے قدموں کی آہٹ سُنی ہی نہیں۔ اگر سُنی تھی تو اُسے بھی وہ آرکسٹرا کے ڈرم کی دھمک یا دل کی دھڑکن سمجھا تھا۔

"فرمائیے صاحب!"

اس آواز نے ادریس احمد کو چونکا دیا۔ اُس نے جھکے ہوتے سر کو اُٹھایا اور دیکھا۔ اُس کے سامنے جو کھڑا تھا وہ اس کوٹھی کا ملازم معلوم ہوتا تھا۔

"یہاں کیسے کھڑے ہیں آپ؟" —— ملازم نے پوچھا —— "کس سے ملنا ہے؟"

"یہ عزیز احمد صاحب کی کوٹھی ہے نا؟"

"جی ہاں!" —— ملازم نے جواب دیا —— "فرمائیے۔"

"عزیز صاحب ہیں؟"

"جی ہاں" —— ملازم نے جواب دیا —— "موجود ہیں آپ کو اُن سے کوئی کام ہے؟"

"انہیں اطلاع دو کہ آپ کے والد صاحب آتے ہیں" — ادریس احمد نے کہا۔

ملازم کچھ کہے بغیر بڑی جلدی چلا گیا۔ دو منٹ بھی نہیں گزرے ہوا گے کہ عزیز احمد بڑی تیز تیز چلتا ادریس احمد کی طرف آیا۔ باپ بیٹا ایک مدت بعد ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ عزیز کے چہرے پر مسرت کا ایسا تاثر تھا جیسے باپ کو دیکھ کر وہ بہت ہی خوش ہوا ہو لیکن ادریس احمد کے چہرے کے تاثرات ایسے تھے جیسے وہ اپنے بیٹے کو پہچاننے کی یا نہ پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کے چہرے پر اس باپ کے تاثرات بھی تھے جسے بڑی مدت بعد بچھڑا ہوا بیٹا نظر آیا ہو اور یہ جنگِ آزادی کے اس مجاہد کے تاثرات بھی تھے جس کا بیٹا اپنے دشمن کا جاسوس بن گیا ہو۔

"ہیلو ابا جان!" — عزیز احمد اپنے دونوں بازو پھیلاتے ہوتے ادریس احمد کی طرف بیتابی سے بڑھتا آیا — "آپ نے یہاں آنے کی زحمت کیوں کی؟ میں کل صبح خود ہی گھر آ رہا تھا" — اور دوسرے لمحے وہ باپ کو اپنے بازوؤں میں لے کر اس کے سینے سے لگا ہوا تھا۔

باپ نے جذبات سے مغلوب ہو کر اپنے بیٹے کے گرد اپنے بازو لپیٹ دیتے اور اس کے آنسو بہہ نکلے پھر اس کی سسکیاں نکلنے لگیں۔

"اندر چلتے ابا جان!" — عزیز احمد نے کہا اور باپ کے پہلو کے ساتھ ہو گیا۔ اس نے اپنا بازو باپ کی کمر کے گرد لپیٹے رکھا اور اسے دوسری طرف سے کوٹھی کے ایک اور کمرے میں لے گیا۔ اس نے دروازہ تو بند کر لیا لیکن انگلش آرکسٹرا کی ہنگامہ خیز آواز آتی رہی اور اس کے ساتھ دوسری آوازیں بتا رہی تھیں کہ کوٹھی کے کسی کمرے میں کچھ لوگ جمع ہیں اور وہ ناچ گانے میں لگے ہوتے ہیں۔

یہ آوازیں ادریس احمد کو پریشان کر رہی تھیں۔ وہ کبھی اپنے بیٹے

کو اور کبھی اس کمرے کو یوں دیکھتا جیسے وہ کسی اجنبی جگہ میں آگیا ہو اور ایک اجنبی کے پاس اسے بٹھا دیا گیا ہو۔

"امی جان ٹھیک ہیں نا؟" — عزیز احمد نے بڑے شگفتہ اور جذباتی سے لہجے میں پوچھا۔ پھر اس نے اپنی ہر ایک بہن کا نام لے لے کر خیریت پوچھی۔ پھر ادریس احمد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بڑے پیار سے مسلنے لگا اور پوچھا — "ابا جان، آپ کی صحت کیسی رہتی ہے .... میں کل گھر آؤں گا۔"

"سب خیریت سے ہیں" — ادریس احمد نے کہا — "صرف تمہارے لئے ہم سب پریشان رہتے ہیں۔ کیا تمہیں ہم لوگ کبھی بھی یاد نہیں آتے؟ حساب کرو، کتنے سال گزر گئے ہیں" — اس پر رقت طاری ہو گئی اور وہ کچھ اور کہہ نہ سکا۔

"اب آگیا ہوں ابا جان!" — عزیز احمد باپ کی طرف لپکا اور بازو بچوں کی طرح اس کی گردن میں ڈال کر بولا — "اب باقی عمر آپ کے اور امی جان کے قدموں میں گزرے گی .... ملازمت ایسی ملی ہے کہ زیادہ عرصہ دلّی سے باہر اور ملک سے بھی باہر گزارنا پڑا!"

"ایسی کون سی ملازمت ہے؟" — ادریس احمد نے پوچھا — "کسی سفیر کے ساتھ ملک سے باہر چلے گئے تھے؟"

"ہے تو ٹورازم ڈیپارٹمنٹ" — عزیز احمد نے جواب دیا — "لیکن اس ڈیپارٹمنٹ کا سیکرٹری مجھ پر اتنا مہربان ہے کہ باہر بھی مجھے بھیج دیتا ہے بلکہ مجھے ہی باہر بھیجتا ہے .... اس کے علاوہ ابا جان، میں نے اپنا ایک بزنس بھی چلا رکھا ہے۔ یہ امپورٹ ایکسپورٹ جیسا بزنس ہے۔ اس کی مصروفیت الگ ہے۔"

باپ بیٹے کی ان باتوں پر اعتبار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ٹورازم ڈیپارٹمنٹ میں اتنا زیادہ باہر جانے کا امکان نہیں ہوتا جتنا عزیز بتا رہا تھا لیکن عزیز باپ کی محبت میں اس قدر جذباتی ہوا جا رہا تھا کہ ادریس احمد

ہیپناٹائز سا ہوگیا۔ ادریس احمد کی کمزوری یہ تھی کہ وہ باپ تھا۔ اُس کا دل کہتا تھا کہ اُس کے بیٹے کے خلاف جاسوسی کا الزام غلط ہے۔ اُسے ذرا سا بھی شک نہ ہُوا کہ اُس کا بیٹا چرب زبانی کی مہارت رکھتا ہے اور انڈین انٹیلی جنس کا تربیت یافتہ اور تجربہ کار ایجنٹ ہے۔ اپنے باپ پر جو اُس کی محبت میں دیوانہ ہُوا جا رہا تھا، اپنا جادو چلانا کوئی مشکل نہیں تھا۔

کوٹھی کے کسی کمرے میں آرکسٹرا اور کچھ آدمیوں کا اُودھم ادریس احمد کو پریشان کر رہا تھا لیکن اُس نے اپنی توجہ اپنے بیٹے پر مرکوز کر رکھی تھی۔

"عزیز بیٹا!" — ادریس احمد نے اپنے دل کو مضبوط کر کے کہا — "اپنے ماں باپ کی محبت کے صدقے میرا ایک وہم دُور کر دو۔ باپ خوش ہو جائے گا کہ بیٹے نے ساری عمر کے گِلے شکوے دھو ڈالے ہیں ....

اُڑتی اُڑتی سُنی ہے کہ تم انڈین جاسوس ہو۔"

عزیز احمد اُس گیند کی طرح کرسی سے اُچھلا جیسے فرش پر پٹخا گیا ہو۔

"وہ کون ہے جس نے آپ کے دل میں یہ وہم ڈالا ہے کہ مَیں ہندو جیسے مکار دشمن کا جاسوس ہوں؟" — عزیز احمد نے سخت غصیلے لہجے میں پوچھا — "کیا ادریس احمد کا بیٹا غدار اور ایمان فروش ہو سکتا ہے! .... مجھے اُس شخص کا نام بتائیں۔"

"مَیں نے سُنا ہے کہ تم اشوکا ہوٹل میں بھی قیام کرتے ہو" — ادریس احمد نے کہا — "اللہ کرے میرے بیٹے کے خلاف یہ الزام غلط ثابت ہوں، لیکن تمہیں ان دنوں اشوکا ہوٹل سے نکلتے دیکھا گیا ہے۔"

"اشوکا ہوٹل میں آنا جانا تو لگا ہی رہتا ہے" — عزیز احمد نے کہا — "غیر ملکی ٹورِسٹ اسی ہوٹل میں ٹھہرتے ہیں اور اُن کے ساتھ میرا تعلق ہوتا ہے .... لیکن ابّا جان! مجھے یہ ضرور بتائیے کہ وہ کون ہے جو آپ کو میرے خلاف بھڑکا رہا ہے۔"

ادریس احمد ہاشمی کا حوالہ نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ یہ مان سکتا تھا کہ اُس کے بیٹے پر ہاشمی کا جو شک ہے وہ غلط ہے لیکن وہ یہ نہیں مان سکتا

تھا کہ ہاشمی نے کسی عداوت یا بدنیتی کی بنا پر اُس کے بیٹے پر الزام عائد کیا ہے کیونکہ اُسے یقین تھا کہ ہاشمی دل میں عداوت اور بدنیتی رکھنے والا آدمی نہیں۔

"ابّا جان!" — عزیز نے پوچھا — "آپ کو میری کوٹھی کا ایڈریس کس نے بتایا تھا اور مجھے اشوکا ہوٹل سے نکلتے کس نے دیکھا تھا؟ .... یہ کوئی میرا دشمن معلوم ہوتا ہے۔"

"یہ شک تو میرے دل میں بھی پیدا ہو سکتا ہے" — ادریس احمد نے کہا — "اس کا ثبوت تمہا[illegible]صی [illegible] تمہارا کردار ہے۔ تم نے جس طرح زندگی گزاری ہے اور جس طرح تم نے روپے پیسے کو اپنا دین اور دھرم بنا لیا تھا، اس سے میں اب بھی اس شک میں مبتلا ہوں کہ تمہاری یہ آمدنی جائز ذرائع سے حاصل کی ہوئی نہیں۔ یہ حلال کی آمدنی نہیں۔"

"ابّا جان!" — عزیز احمد نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا — "مَیں آپ کو کس طرح یقین دلاؤں کہ میں شریفانہ زندگی بسر کر رہا ہوں۔"

ادریس احمد اُٹھ کھڑا ہُوا اور کسی اور کمرے میں کھُلنے والے دروازے تک گیا۔ دروازہ کھول کر وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔ یہ چھوٹا سا کاریڈور تھا جہاں کسی کمرے میں ہنسنے اور اُودھم مچانے کی بلند آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ عزیز اُس کے پیچھے گیا۔ ادریس احمد کاریڈور میں چلتا ایک اور دروازے تک پہنچا اور یہ دروازہ کھولا۔ سگریٹوں کے دُھوئیں اور شراب کی بدبُو کے ایک زوردار تھپیڑے نے اُسے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔

کمرے میں دس بارہ نوجوان اور جواں سال لڑکے اور لڑکیاں تھیں۔ کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ کس کا کون سا مذہب ہے یا ان کا کوئی مذہب ہے بھی یا نہیں۔ یہ ڈسکو سوسائٹی کی نسل تھی۔ لڑکے لڑکیوں کے ساتھ بیہودہ اور حیا سوز حرکتیں اور باتیں کر رہے تھے۔ باہر کی شراب کی بوتلیں ایک طرف تپائی پر رکھی تھیں۔ کچھ کھانے کی چیزیں بھی رکھی تھیں۔ وہ کچھ دیر پہلے ناچ کر صوفوں وغیرہ پر گرے تھے۔ سب نشے کی حالت میں تھے۔ کیسٹ پلیئر ڈسکو

میوزک کا ایک انگریزی گانا بڑی بلند آواز سے الاپ رہا تھا۔

عزیز احمد اپنے باپ کے پہلو میں آن کھڑا ہُوا۔

"یہ سب ٹورسٹ ہیں اباجان!" — عزیز نے کہا — "میرا ان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں .... یہ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔"

"ہاں، ان کے ساتھ تمہارا کوئی تعلق نہیں" — ادریس احمد نے کہا — "لیکن شراب کے ساتھ تمہارا گہرا تعلق ہے۔ تمہارے مُنہ سے شراب کی بُو آرہی ہے .... یہ ہے تمہاری شریفانہ زندگی!"

ادریس احمد وہیں سے پلٹا، کاریڈور میں سے بڑا تیز تیز چلتا کوٹھی سے باہر نکل گیا۔

ادریس احمد اپنے گھر پہنچا۔ اُس کی بیوی بے تابی سے اُس کی منتظر تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ اُس کا خاوند بیٹے سے ملنے گیا ہے۔ باپ پریشانی کے عالم میں گھر میں داخل ہُوا۔ بیوی بڑے اشتیاق سے اُس کے پاس آبیٹھی اور اُس سے پوچھا کہ بیٹا ملا یا نہیں!

ادریس نے بیٹے سے ملاقات کی ساری رُوداد سُنا دی۔

"تو اُسے بتا دینا تھا کہ یہ شک ہاشمی نے ڈالا ہے کہ ہمارا بیٹا پاکستان کے خلاف جاسوسی کر رہا ہے" — ادریس احمد کی بیوی نے کہا۔

"چلو مان لیتے ہیں کہ وہ جاسوس نہیں" — ادریس احمد نے کہا — "لیکن جو منظر مَیں اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں اس سے تو میں انکار نہیں کرسکتا۔ وہاں شراب پارٹی ہو رہی تھی اور میں نے وہاں جو بیہودگی دیکھی ہے وہ میں بیان کر چکا ہوں۔ یہ سب ناجائز ذرائع کی آمدنی ہے۔"

عزیز احمد کی ماں چونکہ ماں تھی اس لئے اپنے بیٹے کے خلاف اتنی زیادہ باتیں گوارا نہیں کرتی تھی۔ وہ اپنے خاوند کی منتیں کرنے لگی کہ وہ اُسے بیٹے سے ملوا دے۔ باپ غصے میں بھی تھا اور پریشان بھی۔ وہ بار بار کہتا تھا کہ وہ آئندہ اپنے بیٹے کی صورت بھی نہیں دیکھے گا۔

ان دونوں نے اسی ذہنی کیفیت میں رات گزار دی۔ اگلی صبح دس

بجے کے قریب ادریس احمد کہیں باہر چلا گیا اور اُس کے جانے کے کچھ دیر بعد عزیز احمد گھر آگیا۔ گھر میں ماں تھی اور اس کی ایک شادی شدہ بہن آئی ہوئی تھی۔ ماں جس دیوانگی سے اپنے بیٹے کو ملی وہ ایسے ہی تھا جیسے کسی ماں کا اپنا دُودھ پیتا بچہ کچھ دنوں کی گمشدگی کے بعد مل گیا ہو۔ عزیز کو ماں نے اپنے بازوؤں سے نکالا تو وہ بہن کے بازوؤں کی گرفت میں آگیا۔ ماں اور بہن نے اُس کا مُنہ اس طرح چُوما جیسے اُسے چاٹ رہی ہوں۔

"اتنا عرصہ کہاں رہے عزیز؟"

"شادی کر لی ہوگی؟"

"بیوی کہاں ہے؟ .... کیسی ہے؟ ایک دو بچے بھی ہوں گے؟"

"لاؤ نا اُنہیں بھی!"

"ہمیں وہاں لے چلو۔"

"تمہارے اباجان نے بتایا تھا کہ تمہاری کوٹھی بہت خوبصورت ہے۔"

ماں اور بہن اُس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر رہی تھیں اور کسی سوال کے جواب کا انتظار نہیں کرتی تھیں۔ یہ اُن کی بے تابی کا عالم تھا۔

"تم نہ آتے تو ہم اباجان کی طرح تمہاری کوٹھی میں پہنچ جاتیں" — عزیز کی بہن نے کہا۔

"اباجان کو دیکھ کر مجھے جو خوشی ہوتی وہ مَیں بیان نہیں کرسکتا" — عزیز نے کہا — "لیکن کسی کے کہنے میں آکر مجھ پر جو الزام لگایا ہے اُس کی پریشانی کو بھی مَیں بیان نہیں کرسکتا .... کچھ سرکاری مہمان گورنمنٹ نے میرے حوالے کر دیتے تھے۔ وہ مسلمان نہیں تھے۔ ہندو اور اینگلو انڈین تھے۔ انہوں نے شراب پارٹی رچا دی۔ اباجان اُس کمرے میں جا دھمکے اور مجھ پر ایک الزام یہ لگایا کہ میں انڈیا کا جاسوس ہوں اور دوسرا یہ کہ مَیں بھی شراب پیتا ہوں اور انہی لوگوں جیسی زندگی میری بھی ہے۔ میں تو گھر آ ہی رہا تھا۔ میں نے ارادہ یہ کیا تھا کہ آپ سب کو اپنی کوٹھی میں لے جاؤں گا۔ میں نے ابھی تک شادی نہیں کی۔ مَیں نے پکا فیصلہ کر رکھا ہے کہ میری شادی آپ اپنی پسند اور مرضی کے مطابق کرائیں گی .... گھر آکر اباجان نے کیا

بتایا تھا؟"

عزیز کی ماں کا دل اُس کی اتنی سی باتوں سے ہی شیشے کی طرح صاف ہو گیا۔ الفاظ نے اتنا اثر نہ کیا جتنا اثر عزیز کے بولنے کے انداز نے دکھایا۔

"امی جان!" — عزیز نے ماں سے کہا — "میں اس لئے پریشان نہیں کہ اباجان نے میرے خلاف ایک الزام کو صحیح مان لیا ہے۔ اصل پریشانی یہ ہے کہ اباجان نے یہ نہیں بتایا کہ وہ کون ہے جس نے میرے باپ کے دل میں میرے خلاف نفرت پیدا کر دی ہے۔ اگر میں نے آج اُس آدمی کو نہ پکڑا تو کل وہ میری کسی نہ کسی بہن پر کوئی غلط الزام تھوپ دے گا۔ وہ شخص آپ کے دامادوں کو آپ کے خلاف کر سکتا ہے۔ خدا کے لئے امی جان اباجان سے پوچھ کر مجھے بتائیں وہ کون ہے۔"

"میں بتاتی ہوں بیٹا!" — اُس کی ماں نے کہا — "اُس کا نام فریدالدین ہاشمی ہے۔ تمہارے اباجان مجھے بتا چکے ہیں۔"

"یہ برابر کے محلے والا ہاشمی؟" — عزیز احمد نے پوچھا — "وہ جن کی بہت بڑی حویلی ہے اور اس میں صرف میاں بیوی رہتے ہیں؟ ... اُس شخص کو میرے ساتھ کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟"

"دشمنی نہیں بیٹے!" — ماں نے کہا — "وہ اچھے لوگ ہیں۔ تمہارے اباجان کے دوست بھی ہیں۔ اُن کی بیوی کے ساتھ میرے اچھے خاصے مراسم ہیں۔ یہ لوگ دراصل اُن جذباتی مسلمانوں میں سے ہیں جو امام مہدی کے آنے سے پہلے پہلے ساری دنیا میں اسلام پھیلا دینا چاہتے ہیں۔ جو مسلمان ان کی مخالفت کرتا ہے اُسے یہ ہندوستان کا جاسوس کہہ دیتے ہیں۔"

"کیا یہ ہاشمی یہاں کے مسلمانوں کا لیڈر تو نہیں بن بیٹھا؟" — عزیز نے پوچھا — "اس عمر میں آکر بعض آدمی محلے کی مسجد کمیٹی کے ممبر بن جاتے ہیں اور اپنے آپ کو لیڈر سمجھنے لگتے ہیں۔"

"میرا خیال ہے وہ اس قسم کے لیڈر تو نہیں ہیں" — ماں نے کہا — "میں یہ بتا سکتی ہوں کہ ہاشمی صاحب اُن ہندوستانی مسلمانوں میں سے ہیں جو پاکستان سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ پورے ہندوستان کو پاکستان بنانے

کے منصوبے بناتے رہتے ہیں۔"

"میں آؤں گا امی جان!" — عزیز نے اُٹھتے ہوئے کہا — "اباجان نے آپ کو بتایا ہو گا کہ میں ایک سرکاری محکمے میں بڑے اچھے عہدے کا افسر ہوں۔ میں رات کے سرکاری مہمانوں کو بھگتا کر آؤں گا۔"

❦

عزیز احمد کے رات کے مہمانوں میں رابی بھی تھا۔ رشی کی گمشدگی کی سراغرسانی کے دوران عزیز کو کہا گیا تھا کہ وہ رابی کو اپنے گھر میں ٹھہرائے۔ اس کا عزیز کو اچھا خاصا الاؤنس ملتا تھا۔ وہ رابی کو اپنی کوٹھی میں لے گیا تھا۔ گزشتہ رات اس کوٹھی میں انگریزی ناچ گانے کی اور شراب نوشی کی جو محفل منعقد کی گئی تھی وہ رابی کی مزید برین واشنگ کا ایک ذریعہ تھا اور اُس کے دل سے رشی کو اُتارنے کا ایک ذریعہ بھی۔

عزیز اپنے ساتھی ورما سے ملا اور اُسے ہاشمی کی اس الزام تراشی کے متعلق بتایا۔ رات ورما بھی جس کا رابی سے تعارف عبدالرحمٰن کے نام سے کرایا گیا تھا، عزیز کی کوٹھی میں موجود تھا۔ اُس نے عزیز کے باپ کے چلے جانے کے بعد پوچھا تھا کہ یہ کون تھا اور عزیز نے اُسے بتایا تھا کہ یہ اُس کا باپ تھا۔

"ورما بھائی!" — عزیز نے ماں سے ملنے کے بعد ورما سے کہا — "یہ پتہ چل گیا ہے کہ میرے ماں باپ کو کس نے بتایا ہے کہ میں انٹیلی جنس میں ہوں۔ اس کا نام فریدالدین ہاشمی ہے اور وہ ہمارے ساتھ والے محلے میں رہتا ہے۔ محلے میں کسی کو میری کوٹھی کا ایڈریس معلوم نہیں۔ یہ بھی ہاشمی نے میرے باپ کو بتایا ہے بلکہ وہ خود میرے باپ کے ساتھ میری کوٹھی تک آیا تھا۔ اس شخص نے مجھے اشوکا ہوٹل سے نکلتے بھی دیکھا تھا اور میرے باپ کو بتایا تھا ... میں سوچ یہ رہا ہوں کہ اس شخص پر رشی کے اغوا کا شبہ کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔"

"کیا یہ ہاشمی بدمعاش لوگوں میں سے ہے؟" — ورما نے پوچھا — "کس ٹائپ کا آدمی ہے؟"

"جذباتی سا مسلمان ہے" — عزیز نے جواب دیا — "بدمعاش نہیں، نیک اور پارسا آدمی ہے۔ اتنی بڑی واردات کا اُس پر شبہ تو نہیں کیا جاسکتا، لیکن ان جذباتی مسلمانوں کا کچھ پتہ بھی نہیں۔ مجھے اپنی ماں نے اُس کے متعلق کچھ باتیں بتاتی ہیں۔"

"ایسی بات ہے تو اس کا نام مشتبہوں میں لکھوا دیتے ہیں" — ورما نے کہا — "سی آئی اے یا اپنا انویسٹی گیشن سیل کھرا کھوٹا الگ الگ کر لے گا۔"

"نہیں" — عزیز نے کہا — "چونکہ وہ ہماری جان پہچان کے لوگ ہیں اس لئے مجھے ذرا اپنی مخبری کرنے دیں۔ مَیں مان نہیں سکتا کہ اس معزز آدمی نے اتنی جرأت کی یا کرواتی ہوگی۔ رِشی کا اغوا باقاعدہ پلان کا نتیجہ ہے.... مَیں تم سے مشورہ لینا چاہتا ہوں۔ میں انہیں نظر انداز بھی نہیں کرسکتا۔ اگر میرا شک پکا ہوگیا تو چیف کو اس شخص کا اتا پتہ بتا دیں گے۔"

"عزیز بھائی!" — ورما نے کہا — "مَیں حیران ہوں کہ کس صفائی سے اس لڑکی کو اُڑایا گیا ہے۔ کبھی تو مجھے شک ہوتا ہے کہ لڑکی کو یہاں کا کوئی لڑکا پسند آیا ہے اور وہ اُس کے ساتھ چلی گئی ہے۔"

"یہ باتیں پہلے ہوچکی ہیں" — عزیز نے کہا — "ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ لڑکی کو کسی پاکستانی ایجنٹ نے نہ اُڑا لیا ہو۔ اگر وہ خود گئی ہے یا اُسے کسی نے عصمت فروشی کی خاطر اغوا کیا ہے تو ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

❦

شام کھانے کے بعد ہاشمی اور اُس کی بیوی رِشی کے پاس اُس کمرے میں بیٹھے ہوتے تھے جو اُس کے لئے حوالات کا کمرہ بنا ہُوا تھا۔ رِشی ابھی تک اپنی اس بات پر قائم تھی کہ اُسے بالکل معلوم نہیں کہ رابی اور عزیز انڈیا کے جاسُوس ہیں۔ اُس کے دل پر اب ایسا کوئی بوجھ نہیں تھا کہ اُسے کسی غلط مقصد کے لئے اغوا کیا گیا ہے۔ صرف یہی نہیں کہ اُس کا یہ شک رفع ہوگیا تھا بلکہ وہ ہاشمی اور اُس کی بیوی سے ایسی متاثر ہوتی

تھی کہ اُس نے اپنی ذات میں اور اپنے خیالات میں تبدیلی محسوس کرنی شروع کردی تھی۔ اُس نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ ہاشمی کے سوا کوئی اور مرد اس کمرے میں نہیں آتا تھا اور ہاشمی آتا تھا تو اُس کا انداز بزرگوں جیسا ہوتا تھا۔

"کیا آپ آج مجھے کچھ کہنے کی اجازت دیں گے؟" — رِشی نے ہاشمی اور اُس کی بیوی سے کہا۔

"کیوں نہیں!" — ہاشمی نے کہا — "ہم تو چاہتے ہیں کہ تم کچھ کہو۔ تم نے ہمارا مقصد جان لیا ہے.... کہو کیا کہنا ہے۔"

"مَیں سمجھتی تھی کہ جس انداز سے میں زندگی گزار رہی ہوں یہی جینے کا انداز ہے اور باقی سب لوگ جاہل اور گمراہ ہیں" — رِشی نے اُداس سے لہجے میں کہا — "مَیں آپ کو تفصیل سے بتاتی ہوں کہ میری اور مجھ جیسی نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں کی زندگی کیسے گزر رہی ہے۔"

"تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں راشدہ!" — ہاشمی نے کہا — "مَیں تمہیں رِشی نہیں کہوں گا۔ تم مسلمان ماں باپ کی بیٹی ہو۔ میں تمہیں اُسی نام سے پکاروں گا جو نام تمہیں ماں باپ نے دیا تھا.... تم جو مجھے بتانے لگی ہو وہ میں جانتا ہوں۔ تم ڈسکو سوسائٹی کی لڑکی ہو۔ یہ سوسائٹی ہندوستان میں بھی موجود ہے۔ اگر اس میں ہندو، سکھ اور عیسائی شامل ہوتے تو ہمیں کوئی افسوس نہ ہوتا۔ افسوس یہ ہے کہ مسلمانوں کے بچے بھی اس سوسائٹی میں شامل ہوگئے ہیں اور وہ اپنے مذہب سے بھی دستبردار ہوچکے ہیں۔ انگریزی گانے گانا، پاگلوں کی طرح انگریزی گانوں کے ساتھ ناچنا، بے حیائی کو جائز سمجھنا اور جنسی کھیل کھیلنا اس سوسائٹی میں جائز ہے۔ تم بچی ہو راشدہ! تم نہیں جانتیں کہ یہ اخلاق سوز کلچر کون پھیلا رہا ہے۔ ہماری دلچسپی صرف پاکستان اور ہندوستان کے مسلمان نوجوانوں کے ساتھ ہے۔ چونکہ یہ نوجوان اپنے مذہب اور اپنی وطنیت سے منحرف ہوجاتے ہیں اس لئے دشمن ملک انہیں اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتا ہے۔ اگر تم نہیں جانتیں کہ تمہارا خداوند ہندوستان کا

جاسُوس ہے یا نہیں تو مجھ سے سنو۔ تمہارے خاوند کو اسی جال میں پھانس کر یہاں لایا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے تمہارے خاوند کو روپے پیسے اور تم جیسی نوجوان اور حسین لڑکیوں کے چکر میں بھی ڈالا گیا ہو۔"

"اب میرے دماغ میں ایک بات آتی ہے"۔۔۔ رشی نے کہا ۔۔۔ "وہ مَیں آپ کو بتاتی ہوں۔ پاکستان میں عزیز کے ساتھ ایک لڑکی تھی جسے وہ اپنی بیوی بتاتا تھا۔ پھر لاہور میں اُس نے نبیلہ نام کی ایک لڑکی کے ساتھ ملوایا تھا۔ عزیز کی بیوی مریم کہتی تھی کہ نبیلہ اُس کی کزن ہے۔ یہ دونوں لڑکیاں ہم عمر ہیں اور خاصی خوبصورت ہیں۔ اب مجھے خیال آتا ہے کہ وہ بہت ہی تیز طرار، ہنستی مسکراتی اور چالاک لڑکیاں ہیں۔ اب مجھے یاد آتا ہے کہ یہ دونوں رابی کو اپنے ساتھ لگائے رکھتی تھیں۔ رابی شام کے بعد گھر سے چلا جاتا اور رات دیر سے آیا کرتا تھا۔ وہ باہر جانے کا کوئی نہ کوئی بہانہ بنا لیتا تھا۔ پھر میں نے اُس کے پاس اتنے زیادہ پیسے دیکھے تھے جو مجھے یقین ہے کہ اُس کے ماں باپ نے اُسے نہیں دیئے تھے۔"

"کیا عزیز کی بیوی اُس کے ساتھ آتی ہے؟"۔۔۔ ہاشمی نے پوچھا۔

"نہیں!"۔۔۔ رشی نے جواب دیا ۔۔۔ "یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں کہ وہ اپنی بیوی کو اپنے ساتھ نہیں لایا۔"

"اب کہو"۔۔۔ ہاشمی نے کہا ۔۔۔ "تم کچھ کہنا چاہتی تھیں .... میرا خیال ہے کہ تم جان گئی ہو کہ عزیز اور تمہارے خاوند پر ہمارا الزام یا شک غلط نہیں۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں"۔۔۔ رشی نے کہا ۔۔۔ "مَیں آپ سے درخواست کروں گی کہ میں جو بات کہنے لگی ہوں اس پر ہمدردی سے غور کریں .... مَیں نے اسی سوسائٹی میں آنکھیں کھولی تھیں جس کا ابھی ابھی ہم نے ذکر کیا ہے۔ اپنا باپ مجھے اچھی طرح یاد نہیں، میرے بچپن میں ہی مر گیا تھا۔ مَیں اپنے باپ کا نام احترام سے نہیں لُوں گی۔ دِلّی آنے سے کچھ دن پہلے تک میں اپنے باپ کو یاد کرتی رہی ہوں کہ میرا باپ نہیں ہے لیکن یہاں آنے سے پہلے مجھے کچھ ایسی باتوں کا پتہ چلا جن سے

میرے دل سے اپنے باپ کا اور اپنی ماں کا بھی احترام نکل گیا۔ مجھے پتہ چلا کہ میرا باپ پاکستان گورنمنٹ میں اونچے درجے کا افسر تھا۔ وہ سرکاری روپے پیسے میں غبن کا ماہر تھا۔ رشوت خور بھی تھا اور جعل ساز بھی۔ وہ کئی بار پکڑا گیا اور میری ماں جو عمر کے لحاظ سے میرے باپ سے خاصی چھوٹی تھی، خوبصورت اور چالاک بھی تھی، میرے باپ کو پکڑنے والے افسروں سے مل کر کیس دبوا لیتی تھی۔"

رشی نے ہاشمی اور اُس کی بیوی کو تفصیل سے سنایا کہ اُس کی ساس نے کس طرح اُس کی ماں کی بے عزتی کی اور اُسے کہا تھا کہ میری ماں میرے سُسرال میں نہ آیا کرے۔ رشی نے یہ بھی سنایا کہ اُس نے اپنی ساس سے کہا کہ وہ اپنی ماں کی بے عزتی برداشت نہیں کر سکتی تو ساس رشی پر برس پڑی اور بولی کہ میں تمہیں بڑی مشکل سے اپنے گھر میں برداشت کر رہی ہوں۔

"میری ماں چلی گئی"۔۔۔ رشی نے رابی اور اپنی ماں کی لڑائی کی تفصیل سُنا کر ہاشمی اور اُس کی بیوی کو بتایا ۔۔۔ "مَیں اپنے کمرے میں چلی گئی۔ جب میرا خاوند گھر آیا تو میں نے بڑے غصے سے اُسے بتایا کہ اُس کی ماں نے میری ماں کو کس قدر گھٹیا اور ناقابلِ برداشت باتیں کہی ہیں۔ میں نے اُسے وہ ساری باتیں سُنائیں۔ میرے خاوند نے کہا کہ اُس کی ماں نے جتنی بھی باتیں کہی ہیں وہ بالکل صحیح ہیں۔ مَیں نے خاوند سے کہا کہ وہ میرے باپ اور میری ماں کا ماضی مجھے کھُل کر سُنائے .... اُس نے مجھے وہ باتیں بھی سنا دیں جو اُس کی ماں نے میری ماں سے نہیں کہی تھیں۔ میرے خاوند نے مجھے یہ بھی کہا کہ اس سوال کا جواب تو تمہاری ماں بھی نہیں دے سکتی کہ تم کس کی بیٹی ہو ....

"خاوند نے مجھے جو کہانیاں سنائیں ان سے میں یہی سمجھی کہ میرے والدین بڑے اونچے درجے کی عصمت فروشی کرتے رہے ہیں۔ اُن کی جتنی بھی جائیداد ہے وہ سب رشوت، غبن اور بدعنوانی کے ذریعے بنائی گئی ہے۔ اپنے ماں باپ کے گناہوں کی یہ داستان سُن کر مجھے بہت

دُکھ ہُوا۔ آپ مجھے شریف لڑکی نہیں کہیں گے، لیکن میں جس سوسائٹی سے تعلق رکھتی ہوں اس میں بھی شرافت کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس سوسائٹی میں شرافت کا معیار کچھ اور ہے۔ اسے وقار کہہ لیں، پریسٹیج کہہ لیں۔ میں اگر آپ کے اخلاقی پیمانوں کے مطابق شریف نہیں تو بھی یقین جانیں کہ مَیں نے اپنے آپ کو اتنی گھٹیا سطح تک نہیں گرایا تھا۔ مَیں نے اپنے خاوند کے مُنہ سے ماں باپ کی یہ باتیں سُن کر خاوند کا شکریہ ادا کیا کہ اُس کے دل میں میری محبت پیدا ہو گئی تھی اور اسی محبت کی خاطر اُس نے اپنی ماں کو ناراض کر کے میرے ساتھ شادی کر لی ہے ....

"میرے خاوند نے میرا شکریہ قبول نہ کیا۔ اس کی بجائے اُس نے بڑے صاف الفاظ میں مجھے کہا کہ مَیں نے تمہارے ساتھ اُس محبت کی خاطر شادی نہیں کی جو تم فلموں اور ناولوں کی کہانیوں میں پڑھتی رہی ہو۔ مجھے تو تمہارا جسم اتنا اچھا لگا تھا کہ میں نے اسے اپنی ملکیت میں رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔"

رِشی کے آنسو نکل آئے اور اُس کا سَر جُھک گیا۔ ہاشمی نے اُس کے سَر پر ہاتھ رکھا۔ اُس کی بیوی نے اُٹھ کر رِشی کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ اس اپنائیت اور ہمدردی نے رِشی کے جذبات کو ہلا کر رکھ دیا اور وہ پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی۔

"مَیں کون ہوں خالہ جان؟" — رِشی نے ہاشمی کی بیوی سے لپٹ کر روتے ہوئے کہا — "مَیں کیا ہُوں؟ مَیں کہاں سے آئی تھی، کہاں جا رہی ہوں؟ مجھے کوئی نہیں بتاتا۔ مجھے اپنے راستے کا علم نہیں، اپنی منزل کا علم نہیں۔ مَیں جسے اپنا باپ سمجھتی تھی وہ کچھ اور نکلا۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ میری رگوں میں کس کا خون ہے۔ اپنی ماں کو میں کیا سمجھتی تھی اور وہ کیا نکلی۔ میں خوش تھی کہ میرے ساتھ تعلقات پیدا کرنے والے سینکڑوں لڑکوں میں ایک رابی ہے جس کے دل میں میری محبت ہے، لیکن وہ بھی میرے جسم کا خریدار نکلا۔"

"تم ابھی بچی ہو" — ہاشمی کی بیوی نے کہا — "اس دنیا کو اور دنیا کے انسانوں کو اور ہر انسان کے دل میں چھُپے ہُوئے بھید کو جاننے کے لئے تم ابھی کمسن ہو۔ اپنے دل کو اتنا دکھی نہ کرو۔ ہم نے تمہیں سچ بولنے پر اُکسایا ہے۔ یہی وہ سیدھا راستہ ہے جو ہم تمہیں دکھا سکتے ہیں۔"

"اور ہم تمہیں تمہاری منزل بھی دکھا دیں گے" — ہاشمی نے کہا — "اور اُس منزل تک پہنچا بھی دیں گے۔"

رِشی اور زیادہ رونے لگی۔ اُس نے اپنا سر ہاشمی کی بیوی کی آغوش میں پھینک دیا۔ اس معزز خاتون نے اُسے بہلا لیا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں" — رِشی نے بڑی لمبی آہ بھر کر کہا — "مَیں کچھ نہیں سمجھتی، کچھ نہیں جانتی۔ مَیں آپ کو کچھ اور سمجھتی تھی اور آپ کچھ اور نکلے۔ مَیں نے اس پر بھی غور کیا ہے کہ جو آدمی مجھے ہوٹل سے دھوکے میں لے گیا تھا وہ جوان آدمی تھا۔ راستے میں گاڑی میں جو دو آدمی بیٹھے تھے وہ بھی جوان تھے۔ وہ مجھے کہیں اور لے جا سکتے تھے۔ اُنہیں بھی میرا جسم اچھا لگا ہو گا، لیکن وہ مجھے ایک امانت کے طور پر آپ کے حوالے کر کے چلے گئے .... انکل! آپ اتنے بوڑھے تو نہیں۔ آپ کی نیت بھی مجھ پر خراب ہو سکتی تھی، لیکن آپ نے مجھے اپنی بیٹی کہا اور خالہ نے مجھے اسلام کی بیٹی کہا۔ مَیں تو انکل سے اور اس گھر میں لانے والوں سے یہ کہنا چاہتی تھی کہ مَیں کوئی شریف اور کنواری لڑکی نہیں۔ میرے جسم کو نوچ لو اور جب طبیعت بھر جائے تو جہاں بیچنا چاہتے ہو بیچ ڈالو۔ میرے پاس اپنا جسم تھا۔ میں اپنی رہائی کے لئے یہی پیش کر سکتی تھی، لیکن ہُوا وہی کہ میں سمجھی کچھ اور، اور نکلا کچھ اور۔ مَیں آپ کو سچ بتاتی ہوں کہ میرا فیصلہ کیا ہے۔ فیصلہ یہ ہے کہ آپ مجھے اس گھر سے نکالیں گے تو بھی میں یہاں سے نہیں نکلوں گی۔"

"نہیں بیٹی!" — ہاشمی نے کہا — "تمہیں یہاں سے ایک نہ ایک دن جانا ہی ہو گا۔ ہم تمہیں رکھ نہیں سکیں گے۔ ہم نے تمہیں اغوا کیا ہے اور یہ جرم ہے۔ اگر تم یہاں کسی عدالت میں بیان بھی دے دو کہ تم اپنی

مرضی سے یہاں آئی ہو تو یہ تمہارا جُرم ہو گا کہ تم اپنے خاوند کو چھوڑ کر بغیر طلاق کے بھاگی ہو۔ دوسری مشکل ہمارے لئے یہ پیدا ہو گئی ہے کہ تم یہاں کی حکومت کا قیمتی مال ہو۔ تمہارا تعلق انٹیلی جنس کے ساتھ ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ تمہیں اپنی یا اپنے خاوند کی اس حیثیت کا علم نہیں۔ اگر تم ہمارے قبضے سے برآمد ہوئیں تو ہندوؤں کی حکومت مجھے اور میری بیوی کو بغیر مقدمے کے یا ہم پر پاکستانی جاسوس کا لیبل لگا کر ساری عمر کے لئے جیل میں ڈال دے گی۔ ہمیں اُس وقت تک تشدد کا تختۂ مشق بنا کے رکھا جاتے گا جب تک ہم اُن سب کی نشاندہی نہیں کر دیتے جو تمہیں یہاں لاتے تھے"۔

"نہیں"۔۔۔۔ رِشی نے کہا ۔۔۔ "مَیں آپ کو ایسے جہنم میں نہیں ڈالوں گی.... لیکن یہ سوچ بھی آتی ہے کہ مَیں واپس جاؤں گی تو وہ مجھ سے پوچھیں گے کہ تم کہاں گئی تھیں"۔۔۔ وہ بولتے بولتے چُپ ہو گئی اور اُس نے یوں چونک کر ہاشمی کی طرف دیکھا جیسے اُسے اچانک کچھ یاد آگیا ہو۔ کہنے لگی ۔۔۔ "آپ مجھے یہاں آزاد کرنے کی بجاتے کسی طرح پاکستان بھجوا دیں۔ اگر میرا خاوند جاسوس ہے تو ہو سکتا ہے اُس کا باپ بھی جاسوس ہو۔ میں انہیں پکڑوا دوں گی۔ مَیں آپ کی محبت کی خاطر اپنا مستقبل قربان کر دوں گی"۔

"ہماری محبت کی خاطر نہیں"۔۔۔ ہاشمی نے کہا ۔۔۔ "پاکستان کی محبت کی خاطر اور ہندوستانی مسلمانوں کی محبت کی خاطر"۔

"مجھے کہنا تو یہی چاہیئے تھا"۔۔۔ رِشی نے کہا ۔۔۔ "مَیں نے شاید یہ اس لئے نہیں کہا کہ میرے دل میں پاکستان کی اور ہندوستانی مسلمانوں کی محبت یہاں آکر پیدا ہوتی ہے اور یہ آپ نے پیدا کی ہے"۔

"تم نے اپنے والدین کے متعلق تو بہت کچھ بتا دیا ہے"۔۔۔ ہاشمی نے کہا ۔۔۔ "مجھے صرف اپنے سُسر کا ایڈریس بتا دو اور یہ بھی کہ وہ کون سے محکمے میں افسر ہیں"۔

رِشی نے رابی کی کوٹھی کا صحیح ایڈریس بتا دیا اور یہ بھی کہ رابی کا باپ ایسے نازک محکمے کا اعلیٰ افسر ہے جس کا تعلق پاکستان کے دفاع اور دفاعی پالیسیوں کے ساتھ ہے۔ رِشی نے پوچھے بغیر اپنی ماں کا ایڈریس بھی بتا دیا۔

اُس نے یہ سب کچھ بتا تو دیا، لیکن ہاشمی کے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہ تھا جس سے یہ تصدیق کی جاتی کہ رِشی نے جو بتایا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ اپنی رہائی کے لئے غلط ایڈریس دے رہی ہو۔

دروازے کی گھنٹی بجی۔ ہاشمی اور اُس کی بیوی کمرے سے نکل گئے اور اُنہوں نے باہر سے دروازہ بند کر دیا۔ ہاشمی باہر چلا گیا۔ باہر عبدالقدیر کھڑا تھا۔ ہاشمی اُسے اندر لے آیا اور وہ بیٹھنے والے کمرے میں جا بیٹھے۔

ہاشمی اور اُس کی بیوی کی رِشی کے ساتھ جو باتیں ہوئی تھیں وہ ہاشمی نے عبدالقدیر کو سنائیں۔ عبدالقدیر چونکہ انٹیلی جنس کا پرانا آدمی تھا اس لئے اُس کی سوچ اور نظر ہاشمی کی نسبت زیادہ گہری تھی۔ اُس کا خیال یہی تھا کہ لڑکی رہائی کی خاطر غلط ایڈریس دے رہی ہے اور اُس کا رونا اُس طرح کا جذباتی نہیں جس طرح وہ ظاہر کرتی ہے بلکہ اُس کا رونا دھوکہ ہے۔ عبدالقدیر نے کہا کہ آج وہ خود رِشی سے تفتیش کرے گا۔

ہاشمی اُسے رِشی کے کمرے میں لے گیا اور عبدالقدیر نے اُس سے انٹیلی جنس کے انداز سے تفتیش شروع کر دی۔ یہ ایک خاص انداز ہوتا ہے جس میں مشتبہ یا ملزم کے جوابوں سے سوال نکالے جاتے ہیں اور ایک ہی سوال گھُما پھرا کر بار بار پوچھا جاتا ہے۔ ملزم کی ذہنی حالت ایسی بگڑنے لگتی ہے کہ اُس پر تشدد کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ اکثر سخت جان ملزم سوال و جواب کے اس انداز سے بھی راز اُگل دیتے ہیں، رِشی تو کمزور سی لڑکی تھی۔ وہ ایک گھنٹے کی تفتیش سے ہی تنگ آکر رو پڑی۔

عبدالقدیر کو یقین ہو چلا تھا کہ اس لڑکی سے وہ جو راز لینا چاہتا ہے وہ اس کے سینے میں نہیں۔ اُس نے یہ سلسلہ کچھ دیر اور جاری رکھا اور اس کمرے سے نکل کر ہاشمی کے پاس بیٹھنے والے کمرے میں چلا گیا۔

دروازے کی گھنٹی ایک بار پھر بجی۔ ہاشمی باہر نکلا۔ وہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ باہر عزیز کھڑا تھا۔

"آؤ عزیز میاں!" — ہاشمی نے پُرتپاک طریقے سے عزیز کا استقبال کیا اور بولا — "اتنی مدت بعد تم کدھر آ نکلے؟"

ہاشمی نے اُس کا استقبال تو بڑی مسرت سے کیا لیکن اندر سے وہ ہل گیا کہ یہ یہاں آنکلا ہے اور اس کا آنا بلا مقصد نہیں ہو سکتا۔ ہاشمی نے بڑی تیزی سے سوچ کر یہ فیصلہ کیا کہ اسے اندر بٹھایا جائے، شاید عبدالقدیر اس کے ارادے اور اس کی نیت کو بھانپ سکے۔

عزیز ہاشمی کے گلے لگ گیا جیسے وہ والہانہ انداز سے اپنے باپ سے ملا تھا۔

"اباجان نے بتایا تھا کہ آپ مجھے بہت یاد کرتے ہیں" — عزیز احمد نے کہا — "آپ تو میرے بزرگ ہیں۔ مَیں خاص طور پر آپ کی دعائیں لینے آیا ہوں۔"

"تو اندر آؤ نا عزیز میاں!" — ہاشمی نے کہا اور اُسے اُس کمرے میں لے گیا جہاں عبدالقدیر بیٹھا ہُوا تھا۔

عزیز عبدالقدیر کو اچھی طرح جانتا تھا اور عبدالقدیر اُسے جانتا تھا.

عزیز کو معلوم تھا کہ عبدالقدیر انڈین انٹیلی جنس میں رہ چکا ہے لیکن اُسے یہ بھی یقین تھا کہ عبدالقدیر کو معلوم نہیں کہ عزیز انٹیلی جنس کا ایجنٹ ہے. عبدالقدیر کے متعلق عزیز کو یہ بھی معلوم تھا کہ وہ اندرونِ ملک انٹیلی جنس کی ڈیوٹی دیتا تھا اور وہ اس محکمے کا باقاعدہ ملازم تھا اور اُسے پاکستان کا کبھی کوئی جاسوسی مشن نہیں دیا گیا تھا۔

عبدالقدیر عزیز سے بڑے پیار سے ملا اور اُس کے باپ کے حوالے سے اُس کی ذات میں دلچسپی کا اظہار کیا۔

"کہو عزیز بیٹے!" — عبدالقدیر نے پوچھا — "کیا ہو رہا ہے آج کل! کہیں نوکری کر رہے ہو یا کاروبار کا کوئی سلسلہ ہے؟"

عزیز نے وہی جواب دیا جو اپنے باپ کو دے چکا تھا کہ وہ ٹورازم کے محکمے میں اچھے عہدے پر لگا ہُوا ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ اپنا

ایک کاروبار بھی چلا رہا ہے۔ عزیز نے عبدالقدیر اور ہاشمی سے اُن کی اور ان کے گھر والوں کی خیر خیریت اس طرح پوچھی جیسے وہ اتنی لمبی مدت سے ان سب کے لئے فکرمند رہا ہو۔

"میں ساڑھے تین سال سے کچھ زیادہ عرصہ ملک سے باہر رہا ہوں" — عزیز احمد نے کہا — "واپس آکر دیکھا ہے کہ مسلمانوں کی حالت ان ہندوؤں نے پہلے سے کچھ زیادہ ہی خراب کر دی ہے۔ یہ دیکھ کر بہت دُکھ ہُوا۔"

"ہونا چاہیئے" — ہاشمی نے کہا۔

"کیا آپ یہ محسوس نہیں کرتے کہ مسلمانوں کو اپنے تحفظ کے لئے کچھ کرنا چاہیئے؟" — عزیز نے کہا — "اتحاد کی ضرورت ہے۔ یہاں کے مسلمان کمزور تو نہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ ہی بسم اللہ کریں۔ مَیں جس قدر تعاون کر سکتا ہوں کروں گا۔ مَیں نے اباجان سے بھی کہا ہے کہ وہ اس طرف توجہ دیں۔"

اس موضوع پر عزیز احمد نے پُرجوش باتیں کیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے عزیز پورے بھارت کو فتح کر لینے اور یہاں مسلمانوں کی حکومت قائم کر دینے کے لئے بےتاب ہو اور وہ صرف ذرائع پیدا کرنے کے لئے گلی گلی گھوم پھر رہا ہو۔

عبدالقدیر نے ہاشمی کی طرف دیکھا اور آنکھ کا ہلکا سا اشارہ کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ محتاط ہو کر بات کرنا۔

عزیز احمد بے شک انڈین انٹیلی جنس کا تربیت یافتہ جاسوس تھا۔ ہندوؤں کی طرح وہ طبعاً بھی فریب کار اور عیار تھا، لیکن اُس کا یہ سمجھنا کہ جن دو آدمیوں پر وہ اپنا جادو چلانے آیا ہے وہ اُس کی جادوگری کو قبول کرلیں گے، اُس کی خوش فہمی تھی۔ یہ جانتے ہوتے کہ عبدالقدیر بھی انٹیلی جنس میں رہ چکا ہے، عزیز خوش فہمی میں مبتلا رہا۔ اُس نے یہ بھی نہ سوچا کہ یہ دو بزرگ افراد یہ تو ضرور سوچیں گے کہ عزیز کے دل میں اچانک مسلمانوں کی ہمدردی اور ہندوؤں کے خلاف جذبہ کیسے پیدا ہو گیا ہے۔ عزیز نے یہ بھی نہ سوچا کہ لڑکپن سے اُس کی شہرت اچھی نہیں بلکہ وہ آوارہ اور بدنام نوجوان مشہور تھا اور دِلّی کی اس آبادی کے مسلمان اُس سے اچھی طرح واقف تھے۔

ہاشمی اور عبدالقدیر نے اُس کے متعلق یہ باتیں سوچی تھیں یا نہیں، عزیز نے بہرحال ان کے پاس آکر جرأت کا مظاہرہ کیا تھا۔

ہاشمی کچھ کہنے لگا تھا لیکن عبدالقدیر نے اُسے ہلکا سا اشارہ کیا کہ وہ چُپ رہے۔ عبدالقدیر نے یہ بہتر سمجھا تھا کہ عزیز کو بولنے کا موقع دیا جاتے۔

"ہاشمی صاحب!" — عزیز نے کہا — "مَیں آپ کا شکر گزار ہُوں۔ آپ نے میرے ابّاجان کو میری کوٹھی تک پہنچایا تھا .... آپ کو میرا ایڈریس کس طرح معلوم ہُوا تھا؟"

"یہ محض اتفاق کی بات ہے" — ہاشمی نے جواب دیا — "مَیں دو چار روز پہلے اُدھر سے گزر رہا تھا تو تمہیں وہاں دیکھا تھا۔"

"ابّاجان نے بتایا تھا کہ آپ نے مجھے اشوکا ہوٹل میں بھی دیکھا تھا"

— عزیز نے کہا۔

"یہ بھی اتفاق کی بات ہے" — ہاشمی نے کہا — "اُس روز مَیں وہاں سے گزر رہا تھا۔ اس کے بعد ادریس صاحب سے ملاقات ہوئی تو مَیں نے اُن سے خوشی کا اظہار کیا کہ عزیز بیٹا آگیا ہے۔"

"اسے کہتے ہیں، دل کو دل سے راہ ہوتی ہے" — عزیز نے ہنستے ہوتے کہا — "آپ کی محبت ہے جو مجھے یہاں کھینچ لاتی ہے .... لیکن ہاشمی صاحب! خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گِلہ بھی سُن لے .... آپ میرے بزرگ ہیں۔ بڑا بھائی کہوں تو بجا، باپ کہوں تو بھی بجا ہے۔"

"کہو عزیز میاں!" — ہاشمی نے کہا — "ایسی تمہید باندھنے کی کیا ضرورت ہے!"

"شکریہ ہاشمی صاحب!" — عزیز نے کہا اور بڑے خوشگوار سے لہجے میں پوچھا — "یہ کس دشمن نے اڑائی ہے کہ میں انڈیا کا جاسوس ہوں اور میں پاکستان میں جاسوسی کے لئے جاتا ہوں اور وہاں سے نوجوان پاکستانیوں کو ورغلا کر یہاں لاتا ہوں اور . . ."

"نہ عزیز بھائی!" — ہاشمی نے اُس کی بات کاٹ کر کہا — "میرے کانوں تک تمہارے خلاف اتنی لمبی چوڑی بات تو نہیں پہنچی۔"

"آپ کے کانوں تک شاید نہ پہنچی ہو" — عزیز نے کہا — "آپ کی زبان تک پہنچ کر باہر نکل چکی ہے۔"

"عزیز میاں!" — عبدالقدیر نے دخل اندازی کرتے ہوئے کہا — "یہ کیا فتنہ چھیڑ بیٹھے ہو! ذرا صاف بات کرو۔"

"مجھے تو بات کرتے بھی شرم آتی ہے محترم!" — عزیز نے کہا۔ "ہاشمی صاحب نے میرے ابّاجان سے کہا ہے کہ مَیں انڈیا کا جاسوس ہوں اور مَیں پاکستان کو نقصان پہنچا رہا ہوں۔"

"کیا ادریس صاحب نے تمہیں یوں کہا ہے؟" — عبدالقدیر نے پوچھا۔

"انہوں نے ان کا حوالہ نہیں دیا" — عزیز نے کہا — "انہوں

نے مجھ پر شک کیا ہے۔ میری امّی جان نے مجھے بتایا ہے کہ جاسوسی کا الزام ہاشمی صاحب نے مجھ پر عائد کیا ہے۔ اس کی تصدیق اور تردید صرف ہاشمی صاحب ہی کر سکتے ہیں۔"

"اِس کی تصدیق یا تردید مَیں بھی کر سکتا ہُوں" — عبدالقدیر نے کہا — "ہاشمی صاحب بھی اپنی پوزیشن واضح کر دیں گے۔ تمہارے خلاف یہ شک معلوم نہیں کہاں سے اُٹھا ہے۔ ہم نے بھی اُڑتے اُڑتے سُنی تھی۔ ہو سکتا ہے مسلمانوں میں نفاق پیدا کرنے کے لئے یہ بات کسی ہندو نے اُڑائی ہو۔"

"تمہارے اباجان سے مَیں نے اتنا ضرور پوچھا تھا کہ عزیز کہاں ہے" — ہاشمی نے کہا — "وہ بیچارے تمہارے متعلق بہت پریشان تھے۔ ہو سکتا ہے مَیں نے انہیں یہ کہہ دیا ہو کہ تمہارے متعلق یہ افواہ سُنی ہے۔"

"وہ کوئی ہمارا دشمن ہوگا" — عزیز نے کہا — "آپ نے جس سے یہ افواہ سُنی ہے اُس کا نام بتا دیں۔"

"کیا کرو گے نام پوچھ کر عزیز بیٹے!" — عبدالقدیر نے کہا — "کیا ہمارے لئے یہ خوشی کا باعث نہیں کہ تمہارے خلاف یہ شک غلط ہے؟"

"یہ معلوم کرنا بہت ضروری ہے قبلہ!" — عزیز نے کہا — "اگر ہم نے آج اُس کی زبان بند نہ کی تو کل وہ آپ پر ایسا ہی کوئی گھٹیا الزام لگا دے گا یا ہماری ماؤں بہنوں کو رُسوا کر دے گا۔ آپ مجھے اُس کا نام بتا دیں۔"

"میری بات کان کھول کر سُن لو عزیز میاں!" — ہاشمی نے ایسے سنجیدہ لہجے میں کہا جس میں طیش کی جھلک بھی تھی — "تم نے مجھے اپنا بڑا بھائی بھی کہا ہے، باپ بھی کہا ہے، لیکن تمہارے دل میں ہم دونوں بزرگوں کی ذرا سی بھی عزت نہیں۔ ہماری عزت تمہارے دل میں پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔"

"وہ کیوں ہاشمی صاحب!" — عزیز احمد نے شگفتہ سے لہجے

میں پوچھا۔

"وہ اس لئے" — ہاشمی نے جواب دیا — "کہ جس کے دل سے اپنے اتنے معزز باپ کا احترام نکل گیا ہو اُس کی نظروں میں ہم کون ہیں ... مَیں تمہیں ایسی کھری کھری باتیں نہیں کہنا چاہتا تھا، لیکن تم تو ہمارے پیچھے ہی پڑ گئے ہو۔ مَیں کون ہوتا ہوں تمہیں انڈیا کا جاسوس کہنے والا، یہاں کے لوگ کہتے ہیں۔"

"آخر وہ لوگ کون ہیں؟"

"وہ ہندو ہیں" — ہاشمی نے کہا۔

"وہی ہندو جو تمہارے جگری یار تھے" — عبدالقدیر بول پڑا — "تمہیں نہیں بھولنا چاہیئے کہ ان ہندوؤں کے ساتھ تم نے کیسی زندگی گزاری ہے۔ تم اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے کہ ہندو مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کر رہے ہیں۔ معلوم نہیں ہمارے متعلق انہوں نے کیا کچھ مشہور کر رکھا ہو گا۔ تمہاری عیش و عشرت کی اُس زندگی کو دیکھتے ہوئے جو تم نے اپنے والدین سے باغی ہو کر ہندوؤں کے ساتھ گزاری تھی تمہارے متعلق یہ افواہ کہ تم انڈیا کے جاسوس ہو اکثر لوگوں کی زبان سے سُنی گئی ہے۔"

"مجھے کوئی دو تین نام بتا دیں" — عزیز نے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے تم نے ہندوؤں کا اچھا خاصا اثر قبول کیا ہے" — ہاشمی نے کہا — "تم تو ہم پر ہندوؤں کی طرح دھونس جمانے آ گئے ہو۔"

عزیز ہنس پڑا۔ عبدالقدیر اور ہاشمی نے اُسے کچھ اور سخت باتیں کہہ دیں، لیکن اس شخص کا ردِ عمل ایسا تھا جیسے اُس پر کچھ اثر ہوا ہی نہ ہو۔

عزیز احمد کو ٹالنا خاصا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ یہی اصرار کئے جا رہا تھا کہ اُسے اُن اشخاص کے نام بتائے جائیں جن سے ہاشمی نے یہ افواہ سُنی ہے کہ عزیز انڈیا کا جاسوس ہے .... عبدالقدیر انٹیلی جنس کا آدمی تھا۔ اُس نے بڑی استادی سے عزیز کو ٹالا۔

عزیز بھی پورا اُستاد تھا۔ وہ جب وہاں سے جانے لگا تو اُس نے

نا راضگی یا خفگی کا اظہار نہ کیا، بلکہ ہاشمی اور عبدالقدیر کے ساتھ بڑے ہی احترام اور پیار و محبت کا اظہار کیا اور چلا گیا۔

❁

"ہاشمی صاحب!" — عبدالقدیر نے عزیز احمد کے جانے کے بعد کہا — "اب تو ہمیں اور زیادہ محتاط ہونا پڑے گا۔ مجھے اندازہ ہی نہیں تھا کہ یہ شخص اس قدر ہوشیار اور ڈھیٹ ہو گیا ہے۔ آپ نے اس کی باتیں ایک عام انسان کی حیثیت سے سُنی ہوں گی لیکن میں نے اس کے بولنے کے انداز کو انٹیلی جنس کی نظروں سے دیکھا اور اس کے ایک ایک لفظ کو انٹیلی جنس کے دماغ سے پرکھا ہے۔"

"مجھ سے غلطی ہوتی ہے کہ میں نے اس کے باپ سے کہہ دیا تھا کہ عزیز کے متعلق میں نے یہ بات سُنی ہے" — ہاشمی نے کہا۔

"آپ نے غلطی کی ہے یا نہیں" — عبدالقدیر نے کہا — "اس شخص نے یہاں آنے میں کوئی غلطی نہیں کی۔ وہ صحیح جگہ آیا تھا۔ آپ نے نوٹ نہیں کیا کہ جب ہم اُسے خدا حافظ کہنے کے لئے ڈیوڑھی میں گئے تو اندر والا دروازہ ذرا سا کھلا ہوا تھا۔ عزیز نے ڈیوڑھی میں رُک کر ایک بات شروع کر دی تھی جو اُس نے صرف اس لئے شروع کی تھی کہ وہ تھوڑی دیر اور رُکا رہنا چاہتا تھا۔ میں نے نوٹ کیا کہ وہ بار بار ٹیڑھی آنکھوں سے دروازے کے کھلے ہوئے کواڑ کی طرف بار بار دیکھتا تھا۔ وہ یقیناً حویلی کا جائزہ لے رہا تھا۔"

"کیا آپ یہ محسوس کر رہے ہیں کہ عزیز کو یہ شک ہے کہ لڑکی اس گھر میں ہے؟" — ہاشمی نے پوچھا۔

"جی ہاں" — عبدالقدیر نے کہا — "اسے یہی شک ہے.... ہاشمی صاحب یہ ذہن میں رکھیں کہ ضروری نہیں ہوتا کہ شک سو فیصد پختہ ہو۔ شک اگر بال برابر ہو تو بھی محتاط ہو جانا چاہئے۔ خیال رکھیں کہ یہ پولیس کا نہیں انٹیلی جنس کا معاملہ ہے۔ تھانیدار کو آپ سو دو سو روپیہ دے کر

دو چار دنوں کے لئے ٹال سکتے ہیں اور اس دوران اپنے بچاؤ کا کچھ بندوبست بھی کر سکتے ہیں لیکن انٹیلی جنس والے پوائنٹ زیرو زیرو ایک جتنے شک پر بھی پکڑ لیتے اور ایذا رسانی کی چکی میں پیس ڈالتے ہیں۔ یہ شخص یہاں سے کچھ زیادہ ہی شک لے کر گیا ہے۔ میری یہاں موجودگی نے شک میں اور اضافہ کر دیا ہو گا۔"

"وہ کیسے؟"

"عزیز کو یقیناً معلوم ہو گا کہ میں اسی انٹیلی جنس سے ریٹائر ہوا ہوں جس کے ساتھ اس کا تعلق ہے" — عبدالقدیر نے کہا — "اگر اسے پہلے معلوم نہیں تو اب یہ اپنے افسروں کو آپ کا اور میرا نام بتائے گا اور ایڈریس بھی بتائے گا تو یہ راز اس کے سامنے آجائے گا کہ میں انٹیلی جنس میں سروس کر چکا ہوں۔ میرے ملنے جُلنے والوں کو بھی معلوم نہیں کہ میں نے گورنمنٹ کے کون سے محکمے میں سروس کی ہے.... کیا آپ نے اس کا ڈھیٹ پن نہیں دیکھا؟ ہم نے اسے کتنی سخت باتیں کہی ہیں، لیکن اس کے ماتھے پر بَل نہیں پڑا، یہاں سے ہنستا کھیلتا گیا ہے۔"

"تو کیا ہمیں یقین کر لینا چاہئے کہ عزیز ہندوستان کا جاسوس ہے؟" — ہاشمی نے پوچھا۔

"سو فیصد یقین!" — عبدالقدیر نے کہا — "میں نے لڑکی کے سینے سے جو باتیں اگلوائی ہیں ان سے کوئی شک نہیں رہ گیا۔ اب صورت یہ پیدا ہو گئی ہے کہ لڑکی کو یہاں سے کہیں اور منتقل کرنا ہو گا۔"

"لیکن لڑکی کو ہم کریں گے کیا؟" — ہاشمی نے پوچھا — "وہ بھی کہے جا رہی ہے کہ اُسے عزیز اور اپنے خاوند کی خفیہ سرگرمیوں کا کچھ علم نہیں۔"

"میں اس پر بھی غور کر چکا ہوں" — عبدالقدیر نے کہا — "میرا خیال ہے کہ لڑکی کو رات کے وقت آنکھوں پر پٹی باندھ کر اشوکا ہوٹل سے کچھ دُور چھوڑ آئیں گے لیکن اس میں ایک خطرہ ہے۔ لڑکی سے پوچھا جاتے

گا کہ وہ کہاں رہی ہے۔ ظاہر ہے وہ آپ کے مکان کی نشاندہی نہیں کر سکے گی۔"

"وہ صرف یہ بتائے گی کہ اُسے کس طرح اغوا کیا گیا تھا"— ہاشمی نے کہا —"اور اُس کے ساتھ ہم نے جو باتیں کی ہیں وہ انٹیلی جنس کے افسروں کو سُنا دے گی۔"

"خطرہ یہ ہے کہ عزیز کو ہم پر شک ہو گیا ہے"— عبدالقدیر نے کہا —"تفتیش شکوک پر ہی کی جاتی ہے۔ عزیز خود تو آگے نہیں آئے گا، وہ اپنے افسروں کو ہم دونوں کے نام دے دے گا۔ آپ جانتے ہیں کہ پولیس خصوصاً سی آئی اے اور انٹیلی جنس خصوصاً 'را' کو کتنے اختیارات حاصل ہیں۔ ہم دونوں کو بُلا لیا جائے تو ہم انہیں کوئی بات نہیں بتائیں گے لیکن انہوں نے لڑکی کو ہمارے سامنے کھڑا کر دیا تو وہ کہہ دے گی کہ ان دو آدمیوں نے مجھے قید میں رکھا تھا۔ اسے ہم دونوں کے مکان دکھائے جائیں گے اور وہ آپ کے مکان کے اُس کمرے کی شناخت کرے گی جس میں اسے رکھا ہُوا ہے.... اگر ایسا ہو گیا تو اپنا انجام سوچ لیں۔"

"مَیں نے آپ کو بتایا نہیں"— ہاشمی نے کہا —"میری بیوی نے لڑکی کو اس کمرے سے نکال کر اندر کے تین چار کمرے دکھاتے تھے اور اسے اُس کمرے میں لے گئی تھی جس میں بچوں اور بچیوں کو قرآن پاک پڑھایا کرتی ہے۔ وہاں میری بیوی نے اسے بتایا تھا کہ وہ بچیوں اور بچوں کو کیا تعلیم دے رہی ہے۔"

"اس لڑکی کو مکان کے اندر اتنی آزادی دینے کی کیا ضرورت تھی؟"— عبدالقدیر نے حیران سا ہو کے پوچھا۔

ہاشمی نے عبدالقدیر کو پوری تفصیل سے بتایا کہ لڑکی کس طرح اُس کی بیوی سے متاثر ہو گئی تھی۔ ہاشمی نے یہ بھی بتایا کہ اُس کی بیوی نے لڑکی کے ساتھ کیا باتیں کی تھیں اور لڑکی کا ردِعمل کیا تھا۔ ہاشمی نے عبدالقدیر

کو وہ باتیں بھی سنائیں جو اُس نے رشی کے ساتھ کی تھیں اور رشی نے جس ردِعمل کا اظہار کیا تھا اور جو کچھ کہا تھا وہ بھی عبدالقدیر کو سنایا۔

"لڑکی کا یہ ردِعمل دھوکہ بھی ہو سکتا ہے"— ہاشمی نے کہا —"لیکن وہ اس قدر روئی کہ اسے بہلانا مشکل ہو گیا۔ وہ کہتی ہے کہ وہ یہاں سے جانا ہی نہیں چاہتی۔ اس نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر ہم اسے یہاں نہیں رکھنا چاہتے تو اسے عزیز احمد اور اس کے خاوند کے حوالے نہ کریں، اس کی بجائے اسے پاکستان پہنچا دیں جہاں وہ رابی کے باپ کو جاسوسی کے جرم میں پکڑوا دے گی۔"

"کسی بھی حال میں ہمیں اس لڑکی پر اعتبار نہیں کرنا چاہیئے"— عبدالقدیر نے کہا۔

"میرا خیال کچھ اور ہے"— ہاشمی نے کہا —"آپ بھی لڑکی کے دوسرے پہلو کو دیکھ لیں۔ اگر یہ قابلِ اعتبار ہے تو اسے ہم ہوٹل میں واپس بھیجنے کی بجائے پاکستان کی انٹیلی جنس کے حوالے کر سکتے ہیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں کہ ایسا کرنا چاہیئے تو یہ کام آپ ہی کر سکتے ہیں۔"

"ہاں!"— عبدالقدیر نے کہا —"یہ کام مَیں ہی کر سکتا ہُوں۔ مَیں نے آپ کو ایک بار بتایا تھا کہ پاکستان کی انٹیلی جنس کے ایک آدمی کو جو یہاں ہندوستانی مسلمان کی حیثیت سے موجود ہے، مَیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ مَیں نے آپ کو یہ بھی بتایا تھا کہ کسی کو پتہ نہ چلے کہ مَیں نے آپ کو یہ بات بتائی تھی۔ آج بھی یہی کہوں گا۔ یہ ہے تو بہت بڑا خطرہ لیکن یہ ضروری ہے کہ مَیں لڑکی کو ایک بار پھر دیکھ لوں۔ ہونا تو یہی چاہیئے کہ یہ لڑکی ہمارے کسی کام آئے، لیکن ہمیں اپنی اور اپنے محاذ کی حفاظت بھی کرنی ہے لیکن ایسا نہ ہو کہ ابتدا میں ہی ہم پکڑے جائیں اور سارا مشن دھرا دھرایا رہ جائے۔"

عبدالقدیر اس مسئلے پر اپنے خیال کا اظہار تو کر رہا تھا لیکن اُس کا لہجہ اور بولنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ کچھ پریشان ہے اور گہری سوچ

میں پڑا ہوا ہے۔

"مجھے انہی لوگوں پر شک ہے" — عزیز ایک دو روز بعد اپنے ساتھی ورما سے کہہ رہا تھا — "ہاشمی تو شریف آدمی لگتا ہے۔ میں یقین نہیں کر سکتا کہ اُس نے لڑکی کو اغوا کیا ہوگا لیکن اُس کے گھر میں جس آدمی کو دیکھا ہے وہ مجھے مشکوک اور مشتبہ لگتا ہے۔ وہ انڈین انٹیلی جنس میں سروس کر کے ریٹائر ہو چکا ہے۔ ذہنی طور پر وہ خاصا تیز اور ہوشیار لگتا ہے۔ میں کوئی بات ہاشمی سے پوچھتا تھا تو اس کا جواب وہ شخص دیتا تھا۔"

"کون ہے وہ؟" — ورما نے پوچھا — "کیا میں اُسے جانتا ہوں؟"

"ہو سکتا ہے" — عزیز احمد نے کہا — "اُس کا نام عبدالقدیر ہے۔"

"ہاں!" — ورما نے کہا — "میں نے یہ نام پہلے بھی سُنا ہے۔"

"شہر کے اس علاقے میں جہاں یہ دونوں آدمی رہتے ہیں اور جہاں میرا گھر بھی ہے میرے پرانے دوست اور بچپن کے ساتھی موجود ہیں" — عزیز نے کہا — "میں نے ان ایک دو دنوں میں ہاشمی اور عبدالقدیر کے متعلق کچھ معلومات حاصل کی ہیں۔ پتہ چلا ہے کہ چند ایک مسلمان ہاشمی کے گھر میں اکٹھے ہوتے ہیں اور ہندوستانی مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کی اور کچھ اسی قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ میں دو آدمیوں کو اس کام پر لگا چکا ہوں کہ وہ مجھے زیادہ سے زیادہ معلومات دیں۔ ضروری نہیں کہ رشی کو انہوں نے ہی اغوا کیا یا کروایا ہو، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمیں یہاں سے کوئی اور شکار مل جاتے۔"

"میرا خیال ہے عزیز!" — ورما نے کہا — "تم نے اتنی لمبی چوڑی جو باتیں بتائی ہیں یہ سُن کر میں بھی مشورہ دوں گا کہ ہمیں ان لوگوں کے نام چیف کو دے دینے چاہئیں۔"

"لیکن ورما سیٹھ!" — عزیز احمد نے کہا — "میں پوری طرح یقین کر لینا چاہتا ہوں۔ آخر چیف کو ہی ان کے نام دینے ہوں گے۔ مجھے تم جانتے ہو کہ میں کمان سے تیر اُس وقت چھوڑا کرتا ہوں جب میرا نشانہ بالکل صحیح ہوتا ہے۔ میں ہوا میں تیر نہیں چلایا کرتا۔"

"پھر کیا کرو گے؟"

"ایک تو میں نے تمہیں بتایا ہے کہ دو آدمی اِن کے پیچھے ڈال دیتے ہیں" — عزیز نے جواب دیا — "ایک طریقہ لڑکی کا سراغ لینے کا اور ذہن میں آتا ہے۔ میں اپنی ایک بڑی بہن کو ایک بڑی حویلی کے اندر دیکھنے کے لئے استعمال کرنا چاہتا ہوں۔ یہ اُس شخص کی حویلی ہے جس کا نام میں نے تمہیں فریدالدین ہاشمی بتایا تھا۔"

"تم مجھ سے یقیناً زیادہ عقلمند اور تجربہ کار ہو" — ورما نے کہا — "لیکن میں صرف ایک بات سوچ رہا ہوں کہ تمہارے پاس کوئی حقیقی یا واقعاتی شہادت موجود نہیں جس سے اس شک کو تقویت ملے کہ رشی کو ان لوگوں نے اغوا کیا ہے اور اُسے ہاشمی کے گھر میں رکھا ہوا ہے۔ تم نے شاید یہ بھی نہیں سوچا کہ اگر تمہارا تیر خطا گیا تو اصلی ملزم زمین کے نیچے چلے جائیں گے اور اگر یہ کوئی گروہ ہے تو وہ چوکنا ہو جاتے گا۔"

"میں اس بات پر غور کر چکا ہوں" — عزیز نے کہا — "تم نے چھٹی حِس تو سُنی ہو گی۔ وہ مجھ میں ہے۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ میں کیوں محسوس کر رہا ہوں کہ لڑکی مسلمانوں کی اسی آبادی میں ہے۔ ہاشمی اور قدیر کے ساتھ میری بہت باتیں ہوئی ہیں۔ اُن کی باتوں سے کم اور بولنے کے انداز سے زیادہ میرا شک کچھ پختہ ہوا۔ تمہیں یاد ہو گا کہ ٹریننگ کے دوران ہمیں انڈیا اور پاکستان کی مختلف قوموں کی اجتماعی نفسیات پر لیکچر دیتے گئے تھے۔ تم خود ہندو ہو۔ ہندوؤں کا یہ وصف اچھا ہے یا بُرا، یہ الگ بات ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہندو امیر ہو یا غریب، مشتعل نہیں ہوتا۔ گالی گلوچ اور ہر طرح کی بے عزتی برداشت کر لیتا ہے اور جوابی کارروائی سوچ

سمجھ کر کرتا ہے۔ مسلمانوں کے متعلق یہ بتایا گیا تھا اور یہ ہے بھی بالکل صحیح
کہ مسلمان کو مشتعل کرنا کوئی مشکل نہیں۔ مذہب کے معاملے میں تو تم مسلمان
کو کوئی جھوٹی خبر سُنا کر بھی ایسا بھڑکا سکتے ہو کہ وہ بم کی طرح پھٹتا ہے۔
کسی مسلمان کو ویسے ہی کہہ دیں کہ فلاں جگہ ہندوؤں نے ایک مسجد کی
بے حُرمتی کی ہے تو مسلمان وہی حرکت کریں گے کہ اپنا کان دیکھے بغیر
کُتے کے پیچھے دوڑ پڑیں گے۔"

"یہ تو مَیں مانتا ہوں"— ورما نے کہا۔

"یہ دونوں مسلمان ہاشمی اور قدیر اسی ذہن کے مسلمان ہیں"—
عزیز نے کہا— "مجھے ان پر شک اس وجہ سے بھی ہُوا ہے کہ مَیں نے
ان کے مذہبی جذبات کو مشتعل کرنے کے لئے بڑی اشتعال انگیز باتیں
کیں، لیکن وہ جذباتی طور پر بالکل ٹھنڈے رہے۔ مجھے یہ بھی شک ہے کہ
انہیں میری نیت پر شُبہ ہو گیا ہے۔ مجھے ان پر اس لئے زیادہ شُبہ ہوتا
ہے کہ اُنہیں کس نے بتایا ہے کہ مَیں انڈین انٹیلی جنس میں ہُوں۔"

"یہ باتیں تو پہلے بھی ہو چکی ہیں میرے بھائی!"— ورما نے کہا—
"اب یہ بتاؤ کہ تم اپنی بہن کو کس طرح استعمال کرو گے؟"

"میری سب سے بڑی بہن جس کی عمر اس وقت چالیس سال سے
کچھ زیادہ ہے، مجھے ماں سے زیادہ چاہتی ہے"— عزیز نے کہا—
"دوسری بہنوں کے دلوں میں بھی میرا اتنا ہی پیار ہے جتنا بہنوں کو اکلوتے
بھائی کے ساتھ ہونا چاہیئے، لیکن یہ بہن تو مجھے دیوانگی کی حد تک چاہتی
ہے۔ پاکستان سے آکر مَیں دو بار اُس کے ہاں جا چکا ہُوں۔ وہ اصرار کرتی
ہے کہ مَیں اُس کے پاس رہوں۔ یہ تو مَیں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ
میرے ماں باپ بہنوئی اور دوسری بہنیں مجھ سے نالاں ہیں۔ مجھے یہ
سب لوگ آوارہ اور بدمعاش سمجھتے ہیں۔ دوسری بہنیں مجھ سے محبت تو
کرتی ہیں، لیکن نہیں چاہتیں کہ مَیں اُن کے ہاں رہوں کیونکہ اُن کے خاوند
مجھے اچھا آدمی نہیں سمجھتے۔ بڑی بہن کا معاملہ مختلف ہے۔ اُس کا خاوند

اُس کی خوشی کی خاطر مجھے قبول کر لیتا ہے۔۔۔

"اب میری بات ذرا غور سے سُنو اور مجھے مشورہ دو۔ میری یہ بہن
بھی مجھے کہہ چکی ہے کہ یہاں کے مسلمانوں نے جن کے لیڈر ہاشمی اور عبدالقدیر
بنے ہوتے ہیں، میرے متعلق یہی مشہور کر رکھا ہے کہ مَیں بہت ہی بُرا
آدمی ہوں اور میں انڈیا کا جاسوس بھی ہوں۔ مَیں نے بہن کو بتایا کہ یہ لوگ
صرف اس لئے مجھ پر جاسوسی کا الزام عائد کر رہے ہیں کہ میرے دوستوں
میں زیادہ تر ہندو ہیں اور میری گزشتہ زندگی آوارگی اور عیش و عشرت میں
گزری ہے۔ مَیں نے کچھ ایسی ہی باتیں کہہ سُن کر بہن کو قائل کر لیا ہے
کہ میرے خلاف یہ الزام بالکل غلط ہے ..... اب مَیں اپنی بہن سے کہوں
گا کہ مَیں اپنی نوکری کی ایک ڈیوٹی کے سلسلے میں پاکستان گیا تھا اور وہاں
رابی اور رِشی میرے دوست بن گئے تھے اور دوستی کی وجہ یہ تھی کہ
مَیں ہندوستانی مسلمان ہوں۔ وہ میرے ساتھ یہاں آ گئے۔ یہاں آکر
میرے دوست کی نوجوان بیوی دھوکے میں آکر کسی کے ساتھ چل پڑی
اور لاپتہ ہو گئی ہے۔ مَیں بہن کو یہ بھی بتاؤں گا کہ مجھے ہاشمی پر شک ہے۔
بہن سے کہوں گا کہ ہاشمی کی بیوی کے ساتھ اُس کا میل جول تو ہے ہی،
کسی روز وہ ہاشمی کے گھر اُس کی بیوی سے ملنے کے بہانے جائے اور
دیکھے کہ لڑکی وہاں ہے یا نہیں۔"

"نہیں عزیز!"— ورما نے کہا— "بات بنی نہیں۔ اگر لڑکی
اُسی گھر میں ہوئی تو کیا اُنہوں نے اُسے گھر کے اندر کُھلا چھوڑ رکھا ہو گا؟"

"مَیں اپنی بہن کے ساتھ اتنی سی ہی بات تو نہیں کروں گا جتنی
تمہیں بتائی ہے"— عزیز نے کہا— "اُسے قائل کرلے اور اپنی
سکیم پر لانے کے لئے بہت سی باتیں کرنی پڑیں گی۔ مجھے امید ہے
کہ وہ میری باتوں میں آجائے گی۔ مَیں اُسے مکمل طور پر سمجھا کر
بھیجوں گا۔"

"یہ بھی کر کے دیکھ لو"— ورما نے کہا۔

اگلے ہی روز عزیز کی بڑی بہن ہاشمی کے گھر میں داخل ہوئی۔ ہاشمی کی بیوی نے اُسے دیکھا تو اُٹھ کر اور کچھ آگے جا کر اُس کا استقبال کیا، لیکن وہ حیران بھی ہوئی کہ یہ کیسے آئی ہے۔

"آؤ زبیدہ!" — ہاشمی کی بیوی نے اُسے گلے لگاتے ہوئے کہا — "عید کا چاند تو ہر سال نظر آجاتا ہے، لیکن تم نہ جانے کتنے سالوں بعد نظر آئی ہو.... آج ہماری یاد کیسے آگئی؟"

"یاد تو دل سے کبھی بھی نہیں اُتری" — زبیدہ نے بڑے پیارے انداز میں کہا — "لیکن گھر گرہستی میں اور بچوں میں ایسی پھنسی رہتی ہوں کہ گھر سے چند منٹ کے لئے بھی نکلنا محال ہو جاتا ہے۔ آج اِدھر سے گزرنے کا اتفاق ہوا تو اندر چلی آئی۔"

"بسم اللہ بسم اللہ" — ہاشمی کی بیوی نے وضعداری سے کہا — "سر آنکھوں پر۔ کہو بچے کیسے ہیں، میاں تو ٹھیک ہیں؟"

دونوں عورتیں ایک دوسری کے گھر کی خیر خیریت پوچھنے لگیں پھر اپنی اپنی سنانے لگیں۔ ہاشمی کی بیوی نے محسوس کیا کہ زبیدہ باتیں تو اُس کے ساتھ کر رہی تھی، لیکن اُس کی نظریں حویلی میں گھوم رہی تھیں۔

"ماشاء اللہ" — زبیدہ نے کہا — "حویلی پہلے سے زیادہ خوبصورت لگتی ہے۔ کمرے اور برآمدے وغیرہ کچھ بدلے بدلے سے لگتے ہیں۔"

"دو مہینے ہوتے کچھ ردو بدل کیا ہے" — بیگم ہاشمی نے کہا — "مرمت بھی کرائی ہے۔ پلستر اور سفیدی بھی ہوئی ہے۔"

"اگر مجھے اچھی طرح یاد ہے" — اُس نے کہا — "تو یہاں آتے مجھے کم و بیش پانچ سال گزر گئے ہیں۔ جی چاہتا ہے کمرے اندر سے جا کر دیکھوں۔"

بیگم ہاشمی ابھی سوچ بھی نہ پائی تھی کہ اس عورت کو کمرے دکھاؤں یا کسی بہانے ٹال دوں کہ اُس کمرے کا دروازہ کھلا جس میں رشی کو رکھا گیا تھا۔ عزیز کو توقع نہیں تھی کہ اُس کی بہن رشی کا سراغ پا سکے گی۔ اُس کے پیشِ نظر دو وجوہات تھیں۔ ایک یہ کہ اُسے صرف شک تھا کہ رشی

یہاں ہے اور دوسری وجہ یہ کہ رشی یہاں ہوتی بھی تو اُسے ان لوگوں نے کسی کمرے میں بند کر کے رکھا ہو گا۔ اپنی بہن کو عزیز نے گزشتہ رات بہت ہی ہدایات دی تھیں اور اُسے بریفنگ بھی دی تھی۔ اُس نے زبیدہ سے یہ بھی کہا تھا کہ لڑکی یہاں سے یا کہیں سے بھی برآمد ہو جائے تو عزیز کے چہرے سے یہ الزام دُھل سکتا ہے کہ وہ انڈیا کا جاسوس ہے۔

ہاشمی کے ہاں معاملہ کچھ اور تھا۔ رشی کی ذات میں، اُس کی شخصیت اور کردار میں جو انقلاب آیا تھا وہ تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔ رشی نے جب اپنے کردار کے اس انقلاب کا اظہار ہاشمی سے کیا تھا تو ہاشمی نے اسے مکاری اور فریب کاری سمجھا تھا حالانکہ رشی بچوں کی طرح بلک بلک کر روئی تھی۔ عبدالقدیر نے ہاشمی سے اُس کا یہ ردِعمل سُن کر اس سے تحقیقات کی تھی تو عبدالقدیر کو بھی یہی شک ہوا تھا کہ لڑکی مکاری کر رہی ہے، لیکن وہ مان گیا تھا کہ لڑکی کا ردِعمل قدرتی ہے اور لڑکی واقعی یہاں سے نہیں نکلنا چاہتی۔

ہاشمی اور اس کی بیوی کا یہ فیصلہ صحیح تھا یا غلط کہ رشی کے کمرے کا دروازہ آئندہ باہر سے بند نہ کیا جاتے، ایک الگ بات ہے، اُس روز ہوا یہ کہ رشی نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا تو بیگم ہاشمی کے پاس ایک عورت کو بیٹھا دیکھ کر دروازہ بند کر لیا۔ اسی سے اُس کی نیک نیتی کا پتہ چلتا تھا۔ یہ تو اُسے معلوم ہی نہیں تھا کہ جس اجنبی عورت کو اُس نے دیکھا ہے وہ عزیز کی بہن ہے اور وہ اُسی کا سراغ لگانے آئی ہے۔ رشی کو ہاشمی اور اُس کی بیوی نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ اُن کے نوکر اور نوکرانی کے سامنے بھی نہ آئے۔

رشی نے دیانتداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے زبیدہ کو دیکھ کر کواڑ تو بند کر لیا لیکن وہ محسوس نہ کر سکی کہ اُس کا اس عورت کے سامنے ہونا کس قدر خطرناک ہے۔

"یہ لڑکی کون ہے؟" — زبیدہ نے بیگم ہاشمی سے پوچھا۔

"ہاشمی صاحب کے ایک عزیز کی بیٹی ہے" — بیگم ہاشمی نے جواب دیا — "آگرہ سے آئی ہے۔"

"یہ باہر کیوں نہ آئی؟" — زبیدہ نے پوچھا اور مسکرا کر کہنے لگی — "ایسی بچی تو نہیں لگتی کہ مجھ سے شرما گئی ہو۔ اس نے تو مجھے دیکھتے ہی دروازہ بند کر لیا ہے۔"

بیگم ہاشمی چکرا سی گئی۔ یہ صورتِ حال اُس کے بس سے باہر ہو گئی تھی لیکن نیک نیت عورت تھی، عزم اس کا نیک تھا اس لئے اللہ نے اُس کی مدد کی اور اُس کے ذہن میں ایک جواز ڈال دیا۔

"بے چاری ذہنی مریض ہے" — بیگم ہاشمی نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا — "اس کے والد صاحب اسے علاج کے لئے لائے ہیں۔"

"ذہنی امراض کا علاج آگرہ میں زیادہ بہتر نہیں ہوتا؟" — زبیدہ نے کہا — "وہاں تو سُنا ہے ایک سے ایک بڑھ کر قابل ڈاکٹر اور ذہنی امراض کا ماہر موجود ہے۔"

"نہیں زبیدہ!" — بیگم ہاشمی نے کہا — "آگرہ ذہنی امراض کے علاج کے لئے اس لئے مشہور ہے کہ وہاں ملک کا ایک بہت بڑا پاگل خانہ ہے۔ لڑکی کو اگر پاگل خانے میں داخل کرانا ہوتا تو وہیں کرا دیتے۔"

"کرتی کیا ہے؟"

"کسی غیر مرد یا عورت کو دیکھ کر ڈر جاتی ہے" — بیگم ہاشمی نے جواب دیا — "بلا وجہ رونے اور چیخنے لگتی ہے۔ اس کی اسی تکلیف کی وجہ سے اس کا کوئی رشتہ مانگنے بھی نہیں آتا۔"

زبیدہ اپنے بھائی جیسی چالاک عورت تھی۔ وہ کچھ اور ہی ہدایات لے کر آئی تھی۔ وہ اُٹھی اور یہ کہتی ہوئی رشی والے کمرے کی طرف چل پڑی کہ میں اسے ذرا اچھی طرح دیکھتی ہوں۔

"نہیں زبیدہ!" — بیگم ہاشمی اُٹھ کر اس کی طرف لپکی اور بولی — "نہ میری بہن! اُس کے کمرے میں نہ جانا ورنہ وہ چیخ چیخ کر محلہ اکٹھا کر لے گی۔"

"مجھے شک ہے آپا!" — زبیدہ نے ذرا رُک کر کہا — "یہ کوئی ذہنی مرض نہیں۔ مَیں نے بالکل ایسی ہی تکلیف والی ایک لڑکی دیکھی ہے۔ اُس پر کسی نے تعویذ کروا دیئے تھے۔ میں ایک عامل کو جانتی ہوں۔ اُس نے اُس بیچاری کو اس روگ سے نجات دلائی تھی۔"

رشی والا کمرہ اتنا دُور تو نہیں تھا کہ وہاں تک پہنچتے کچھ وقت لگتا۔ زبیدہ نے جا دروازہ کھولا۔ رشی پلنگ پر بیٹھی تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑے زبیدہ کو دیکھنے لگی۔ ہاشمی کی بیوی کمرے میں داخل ہوئی۔ زبیدہ کی اُس کی طرف پیٹھ تھی۔ ہاشمی کی بیوی نے رشی کو سر کا ہلکا سا اشارہ کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ اس عورت کی طرف وہ کوئی توجہ نہ دے۔

"لیٹ جا بیٹی!" — بیگم ہاشمی نے رشی سے کہا — "لیٹ جا۔ یہ کوئی غیر نہیں۔ تم انہیں نہیں جانتیں۔ یہ تمہاری دُور پار کی خالہ ہے۔"

"کیوں بیٹی!" — زبیدہ نے رشی سے پوچھا — "کیا ہوتا ہے تمہیں؟"

ہاشمی کی بیوی ابھی تک زبیدہ کی پیٹھ پیچھے کھڑی تھی۔ اُس کے اشارے پر رشی لیٹ گئی۔

"ہاں بیٹی!" — زبیدہ نے اُس پر جُھک کر اور اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر ایک بار پھر پوچھا — "کیا محسوس کرتی ہو؟"

"کچھ نہیں" — رشی نے بے رُخی سے جواب دیا — "میں کچھ بھی محسوس نہیں کرتی۔ آپ کو میرے متعلق کیا بتا دیا گیا ہے؟"

ہاشمی کی بیوی نے زبیدہ کا بازو پکڑا اور اُسے باہر گھسیٹ لائی۔

"ادھر آجاؤ زبیدہ!" — ہاشمی کی بیوی نے زبیدہ کو باہر لا کر دروازہ بند کر کے سرگوشی میں کہا — "کیوں میرے لئے مصیبت کھڑی کر رہی ہو؟ مَیں تو ہاشمی صاحب سے بھی کہہ چکی ہوں کہ اس پاگل کو یہاں کیوں بلوا لیا ہے۔"

"صاف پتہ چل رہا ہے کہ اس لڑکی پر تعویذوں کا اثر ہے"۔۔۔ زبیدہ نے کہا۔۔۔ "مَیں آؤں گی۔ اس کے والد صاحب سے مجھے ملوا دینا۔ انہیں کہنا کہ دوائیاں دے دے کر اس کا دماغ اور خراب نہ کرو۔ مَیں انہیں اس عامل کے پاس لے جاؤں گی.... اچھا آپا! اب مجھے اجازت دو۔"

"ہائے خالہ زبیدہ!"۔۔۔ بیگم ہاشمی نے کہا۔۔۔ "پانی کا گھونٹ بھی نہیں پیا اور چل پڑیں.... ذرا دیر اور بیٹھو۔ چائے کی پیالی بنا لیتی ہوں۔"

زبیدہ شکریہ ادا کر کے معذرت خواہی کے انداز سے چل پڑی۔ جاتے جاتے کہہ گئی کہ وہ دوبارہ آئے گی۔

ہاشمی کی بیوی دروازے تک زبیدہ کے ساتھ گئی۔ اُسے رخصت کر کے دروازہ اندر سے بند کیا اور تقریباً دوڑتی ہوئی رِشی کے پاس گئی۔

"مجھ سے غلطی ہوئی خالہ جان!"۔۔۔ رِشی نے بیگم ہاشمی سے کہا۔۔۔ "مَیں نے اس خیال سے دروازہ کھولا تھا کہ نوکر اور نوکرانی پچھلے کمرے میں چلے گئے ہوں گے۔"

"جانتی ہو یہ عورت کون ہے؟"۔۔۔ بیگم ہاشمی نے کہا۔۔۔ "یہ عزیز کی بڑی بہن تھی۔"

"سچی خالہ؟"۔۔۔ رِشی نے حیرت اور گھبراہٹ کے ملے جُلے لہجے میں پوچھا۔۔۔ "یہ کدھر آ دھمکی تھی۔ کہیں یہ میری ٹوہ لگانے نہ آئی ہو۔"

"نہیں"۔۔۔ بیگم ہاشمی نے کہا۔۔۔ "یہ سی آئی ڈی میں تھوڑا ہی ہے۔ مجھے یہ خطرہ اس لئے بھی محسوس نہیں ہوتا کہ ان لوگوں کے ساتھ عزیز کا میل جول ہے ہی نہیں۔ اگر ہے بھی تو عزیز نے اسے یہ تو نہیں بتایا ہو گا کہ وہ ہندوستان کا جاسوس ہے اور ایک پاکستانی لڑکی کو یہاں لایا تھا اور اُسے اغوا کر لیا گیا ہے۔ بہرحال تم نے اچھا کیا کہ میرا اشارہ سمجھ گئیں اور زیادہ نہ بولیں۔"

"آپ نے اُسے میرے متعلق کیا بتایا تھا؟"

بیگم ہاشمی نے اُسے سُنا دیا کہ اُس کے متعلق زبیدہ کو اُس نے کیا بتایا تھا۔

"خالہ جان!"۔۔۔ رِشی نے سنجیدگی سے پوچھا۔۔۔ "میرا کیا بنے گا؟"

"پریشان نہ ہو بیٹی!"۔۔۔ بیگم ہاشمی نے جواب دیا۔۔۔ "اگر تم نے اسی طرح وفا کی جس طرح آج کی ہے تو ہاشمی صاحب اور قدیر صاحب تمہارے لئے کوئی بہتر فیصلہ کریں گے۔"

اتنے میں ہاشمی گھر آ گیا۔ اُس کی بیوی اُسے الگ لے گئی اور بتایا کہ عزیز کی بڑی بہن آئی تھی اور جو ڈرامہ ہُوا وہ ہاشمی کو سُنا دیا۔

"کون سی بہن؟"۔۔۔ ہاشمی نے پوچھا۔۔۔ "زبیدہ تو نہیں تھی؟"

"وہی تھی"۔۔۔ بیگم ہاشمی نے جواب دیا۔

"اللہ محفوظ رکھے"۔۔۔ ہاشمی نے کہا۔۔۔ "تم شاید نہیں جانتیں کہ وہ کس قدر چالاک اور مکار عورت ہے۔"

"کچھ کچھ تو جانتی ہوں۔"

"نہیں"۔۔۔ ہاشمی نے کہا۔۔۔ "جو ہم باہر گھومنے پھرنے والے مرد جانتے ہیں وہ گھروں میں بیٹھی عورتیں نہیں جان سکتیں۔ زبیدہ اگر عزیز سے بڑھ کر شیطان نہیں تو اس سے کم بھی نہیں۔ اس کا خاوند شریف، وضعدار اور ہم جیسا جذبہ رکھنے والا آدمی ہے۔ کوئی اور ہوتا تو کبھی کا اسے طلاق دے چکا ہوتا۔ ویسے وہ بڑا دلیر اور جرأت مند آدمی ہے۔ اب تو بیچارہ بچّوں کو دیکھ کر بیوی کی سرکشی کو برداشت کر رہا ہے۔"

"اس کا یہاں آنا خطرناک تو نہیں؟"

"مَیں کچھ کہہ نہیں سکتا"۔۔۔ ہاشمی نے جواب دیا۔۔۔ "دونوں صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ ویسے ہی آ ٹپکی ہو۔ یہ خیال بھی آتا ہے کہ اُسے عزیز نے بھیجا ہو گا، لیکن عزیز کا ان کے ہاں آنا جانا ہے ہی نہیں۔ بہرحال مَیں قدیر صاحب سے بھی بات کر لوں گا۔ ڈرو نہیں۔ ہم نے کون سا جرم کیا ہے۔"

اگلے دن کا پچھلا پہر تھا۔ عزیز کی بہن زبیدہ ایک بار پھر ہاشمی کے گھر میں داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ ایک اور عورت تھی جس نے کالا بُرقعہ لے رکھا تھا۔ وہ پردے کی اتنی زیادہ پابند معلوم ہوتی تھی کہ اندر آ کر اُس نے ایک نقاب تو اُوپر کر لیا لیکن دوسرا نقاب مُنہ اور ناک پر لپیٹے رکھا۔ اِس سے اُس کی سادگی اور شرافت کا اظہار ہوتا تھا۔ اُس نے تو پیشانی کو بھی ڈھانپ رکھا تھا۔ صرف آنکھیں نظر آتی تھیں۔ ہاشمی کی بیوی نے اُن کا استقبال بڑے پیار سے کیا اور کمرے میں بٹھایا۔

"یہ ہمارے محلے میں رہتی ہیں" — زبیدہ نے اس عورت کا تعارف بیگم ہاشمی سے کراتے ہوئے کہا "مَیں نے کل جس لڑکی کا ذِکر کیا تھا، وہ اس کی چھوٹی بہن ہے۔ تعویذ بھی کسی نے ایسا کیا کہ دونوں بہنوں پر اثر ہو گیا۔ چھوٹی کے تو دماغ پر اثر ہُوا اور اُس کے جسم پر۔ اس کا تو بولنا ہی بند ہو گیا تھا۔ اب یہ کچھ کچھ بول تو سکتی ہے لیکن ڈاکٹر نے اسے بولنے سے منع کر رکھا ہے۔ اس کی زبان سُوج گئی تھی۔ مُنہ کے اندر پھنسیاں نکل آئی تھیں۔ اُس عامل نے کوئی ایسا عمل کیا کہ دونوں بہنیں ٹھیک ہو گئیں۔ اس کا اب ڈاکٹری علاج ہو رہا ہے اور یہ پہلے سے بہت بہتر ہے۔ اس کی جگہ مَیں ہی باتیں کروں گی۔ مَیں نے اسے آپ کی اس رشتہ دار لڑکی کا حال سنایا تو یہ کہنے لگی کہ مَیں بھی ساتھ چلتی ہوں۔ یہ لڑکی کو دیکھنا چاہتی تھی۔ پھر یہی لڑکی کو عامل کے پاس لے جائے گی۔ اگر آپ چاہیں تو عامل یہاں بھی آسکتا ہے .... کیوں فردوس؟"

"آسکتا ہے" — اُس عورت نے سَر ہلا کر اس طرح کہا جیسے اس کا گلا بیٹھا ہُوا ہو اور اُس نے بڑی ہی مشکل سے یہ الفاظ زبان سے نکالے ہوں۔

"بولو نہیں، بولو نہیں" — زبیدہ نے اس عورت سے کہا — "پھر مُنہ سے خون جاری ہو جائے گا" — اُس نے بیگم ہاشمی سے کہا — "اس لڑکی کو یہیں بلا لیں یا وہ جس کمرے میں ہے وہاں لے چلیں۔ منٹ کے منٹ تو اُسے دیکھیں گے۔"

زبیدہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس کے ساتھ آئی ہوئی عورت بھی اٹھی۔ بیگم ہاشمی کا دم خشک ہو گیا۔ وہ انہیں روک نہیں سکتی تھی۔ دونوں کمرے سے نکلیں۔ زبیدہ کا رُخ اُسی کمرے کی طرف تھا جس کمرے میں ایک روز پہلے اُس نے رشی کو دیکھا تھا۔ ہاشمی کی بیوی حیران و پریشان اُن کے پیچھے جا رہی تھی۔

"ذرا ٹھہرو زبیدہ!" — یہ ہاشمی کی آواز تھی جو ساتھ والے کمرے سے باہر نکل آیا تھا۔

زبیدہ برقعے کے بغیر تھی۔ وہ ہاشمی کی آواز پر رُک گئی۔ اُس نے بڑے پُر تکلف انداز سے ہاشمی کو آداب کیا۔ بھائی جان کہہ کر خیر خیریت پوچھی، لیکن ہاشمی کے تیور کچھ اور تھے۔ اُس نے زبیدہ کے ساتھ آئی ہوئی عورت کے اس نقاب پر ہاتھ رکھا جو اُس نے مُنہ اور ناک پر لپیٹ رکھا تھا۔ ہلکا سا جھٹکا دے کر ہاشمی نے نقاب اُس کے چہرے سے ہٹا دیا۔ اس نقاب سے جو چہرہ سامنے آیا وہ کسی عورت کا نہیں بلکہ ایک آدمی کا چہرہ تھا جس کی چھوٹی چھوٹی مونچھیں بھی تھیں۔ اس آدمی کی آنکھیں ٹھہر گئیں۔

"باہر والا دروازہ اندر سے بند کر دو" — ہاشمی نے اس آدمی کے سر پر ہاتھ رکھ کر برقعہ بڑی زور سے کھینچتے ہوئے اپنی بیوی سے کہا۔

ہاشمی کی بیوی دوڑی اور ڈیوڑھی کے اندر والا دروازہ بند کر کے زنجیر چڑھا دی۔ گھبراہٹ سے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ زبیدہ گم صم صحن میں کھڑی تھی۔ ہاشمی نے اُس آدمی کا برقعہ اتنی زور سے کھینچا تھا کہ سر سے برقعہ اُتر گیا اور وہ آدمی پیچھے برآمدے کے ستون کے ساتھ جا لگا۔

یہ آدمی عزیز کا ہندو ساتھی ورما تھا جس کا عزیز نے رابی کے ساتھ عبدالرحمٰن کے نام سے تعارف کرایا تھا۔ ورما نے بڑی تیزی سے برقعے کے سامنے والے دو بٹن کھولے اور ہاتھ بُرقعہ کے اندر لے گیا۔ اُس کا ہاتھ باہر آیا تو ہاشمی نے دیکھ لیا کہ اُس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ یہ اعشاریہ ۳۲ بور کا پستول تھا جس میں میگزین لگتی ہے۔ یہ اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ ہاتھ میں چھپایا

بھی جا سکتا ہے۔ ورما کا ہاتھ برقعے سے باہر آ ہی رہا تھا کہ ہاشمی نے پستول دیکھ لیا۔ اس نے اُچھل کر ورما کے پستول والے ہاتھ پر ِکک ماری۔ ِکک پستول والے ہاتھ کو لگنے کی بجائے ورما کی ناف کے نیچے لگی۔ پیٹ کے اس مقام پر لگا ہُوا ٹھڈ کوئی پہلوان بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ ورما تو دُبلا پتلا آدمی تھا۔ اُس کی عمر تیس بتیس سال ہو گی۔ وہ درد سے دُہرا ہو گیا۔ ہاشمی نے نیچے سے اُس کے مُنہ پر مُکّہ مارا اور اس کے ساتھ ہی اُس نے ورما کی کلائی پکڑ لی۔ پستول اسی ہاتھ میں تھا۔ ِکک اور مُکّے کی دَرد کی شدّت نے ورما کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی کر دی۔ ہاشمی نے بڑے آرام سے پستول اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

"اب بتاؤ"— ہاشمی نے پستول کی نالی ورما کے سینے پر رکھ کر پوچھا۔ "کیا لینے آتے تھے یہاں؟"— اُس نے زبیدہ کی طرف دیکھا اور بولا— "اِدھر آ تو بھی بدمعاش عورت! اب تم دونوں یہاں سے زندہ نہیں نکل سکو گے اور تمہیں جاننے والوں کو تمہاری لاشیں بھی نہیں ملیں گی۔... سچ سچ بتاؤ یہ ڈھونگ اس گھر میں کیوں آ رچایا ہے؟"— ہاشمی نے ورما کا جواب سُنے بغیر زبیدہ سے پوچھا— "تُو بتا بدکار عورت! اِس خصم کو یہاں کیوں لائی ہے؟"

زبیدہ کا تو خون ہی خشک ہو گیا تھا۔ ورما ڈرا ہُوا تو تھا لیکن اُس کے انداز سے پتہ چلتا تھا جیسے وہ ذرا سا بھی خوفزدہ نہیں۔ وہ کچھ بھی نہیں بولتا تھا۔ اُس نے نظریں گھما کر حویلی کا جائزہ لے لیا تھا اور اُسے احساس ہو گیا تھا کہ اس حویلی میں اُسے یا اس کی لاش کو غائب کیا جا سکتا ہے۔

ہاشمی کے کہنے پر اُس کی بیوی نوکر کو بلا لائی۔ ہاشمی نے نوکر سے کہا کہ وہ عبدالقدیر کو بلا لائے۔ اُس نے نوکر کو تین چار نام بتا کر کہا کہ وہ عبدالقدیر سے کہے کہ ان سب کو ساتھ لیتا آئے۔

بوڑھے نوکر نے جو منظر دیکھا وہ اُس کے لئے بڑا ہی عجیب تھا۔ ہاشمی کے ہاتھ میں پستول تھا اور اس کے سامنے ایک آدمی کھڑا تھا جو کندھوں

سے ٹخنوں تک کالے بُرقعے میں لپٹا ہُوا تھا اور اُس کے ساتھ ایک عورت بھی کھڑی تھی۔ نوکر باہر کو دوڑ پڑا۔ عبدالقدیر کا گھر زیادہ دُور نہیں تھا۔ اتفاق سے عبدالقدیر اُسے گھر پر ہی مل گیا۔ نوکر نے اُسے وہ منظر سنایا جو وہ دیکھ آیا تھا۔

❦

نصف گھنٹے کے اندر اندر عبدالقدیر چار آدمیوں کے ساتھ آن پہنچا۔ ان میں ایک تو ادھیڑ عمر تھا اور تین جوان سال آدمی تھے۔ اس آدھے گھنٹے کے دوران ہاشمی نے ورما اور زبیدہ کے ساتھ کوئی بات نہیں کی سوائے اس کے کہ اس نے دونوں سے کہا تھا کہ وہ دیوار کی طرف مُنہ کر کے فرش پر بیٹھ جائیں۔ وہ دونوں اُس کے کہنے کے مطابق بیٹھ گئے تھے۔

"مسٹر ہاشمی!"— ورما نے ہاشمی سے کہا تھا— "جو کچھ کرنا ہے سوچ سمجھ کر کرنا۔ میں ویسے ہی یہاں بھیس بدل کر نہیں آ گیا تھا۔ میرے پیچھے طاقت ہے جسے معلوم ہے کہ میں اس وقت کہاں ہوں۔ تم مجھے زندہ یا مُردہ غائب کر سکتے ہو لیکن تمہیں اور تمہاری بیوی کو ایسی چکی میں ڈال دیا جائے گا کہ باقی عمر پستے رہو گے، مرو گے نہیں۔"

ہاشمی نے اُس کی پیٹھ پہ اتنی زور سے لات ماری کہ اُس کا مُنہ دیوار سے جا لگا۔

"زبان بند رکھو"— ہاشمی نے کہا۔

اس کے بعد ان کے درمیان کوئی بات نہ ہوئی اور عبدالقدیر چار آدمیوں کے ساتھ پہنچ گیا۔ عبدالقدیر نے ہاشمی کو اپنی طرف بلایا اور اسے اور اپنے ساتھ لاتے ہوئے آدمیوں سے سرگوشی میں کہا کہ ان کے سامنے باتیں کرتے وقت ایک دوسرے کا نام نہ لینا۔ میرا نام تو بالکل ہی نہ لینا بلکہ مجھے قریشی صاحب کہنا.... اُس نے ہاشمی سے پوچھا کہ کیا اور کیسے ہُوا ہے۔

"یہ تو مَیں کل شام آپ کو بتا چکا ہوں"— ہاشمی نے کہا— "کہ عزیز کی بہن کس طرح میری غیر حاضری میں میری بیوی کے پاس آئی تھی اور اس نے کیا باتیں کی تھیں۔"

"رات کی بات چھوڑیں ہاشمی صاحب!" ——— عبدالقدیر نے کہا ——— "وہ تو آپ نے سب کچھ بتا دیا تھا اور ہم نے جو کچھ کرنا تھا وہ کر دیا تھا۔ ان چاروں ساتھیوں کو بھی علم ہے۔ آج بتائیں کہ یہ دونوں کس طرح آتے تھے؟"

"بڑا اچھا اتفاق ہے کہ میں گھر میں موجود تھا" ——— ہاشمی نے کہا ——— "دو عورتیں آئیں تو میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے انہیں دیکھا۔ زبیدہ کو تو میں جانتا ہوں۔ اسے کون نہیں جانتا۔ اس کے ساتھ برقعے میں جو عورت تھی اسے غور سے دیکھا۔ میری بیوی ابھی کسی کمرے میں تھی۔ ان دونوں عورتوں کو معلوم نہیں تھا کہ انہیں کوئی دیکھ رہا ہے۔ زبیدہ نے اس برقعہ پوش عورت کے کان میں کچھ کہا۔ اس عورت نے زبیدہ کا ہاتھ پکڑ کر دبایا پھر زبیدہ نے اس عورت کا نقاب جو اس کی ناک تک لپٹا ہُوا تھا، ذرا اُوپر کر دیا .... مَیں بتا نہیں سکتا قدیر صاحب کہ مجھے کیوں محسوس ہُوا کہ بُرقعے میں لپٹا ہُوا یہ جسم عورت کا نہیں، کسی آدمی کا ہے۔"

"ذرا آہستہ بولیں" ——— عبدالقدیر نے سرگوشی میں ہاشمی سے کہا۔

"وہ دُور ہیں" ——— ہاشمی نے درما اور زبیدہ کی طرف دیکھ کر کہا ——— "اُن تک آواز نہیں پہنچے گی .... میری بیوی باہر آئی ان دونوں سے ملی اور انہیں ساتھ والے کمرے میں لے جا کر بٹھایا۔ دونوں کمروں کے درمیان والا دروازہ بڑا پرانا ہے۔ اس میں ایک درز ذرا کھلی ہوتی ہے۔ مَیں نے اس میں سے اُدھر جھانکا۔ زبیدہ کی باتیں بھی میرے کانوں تک پہنچتی رہیں۔ یہ تو میرے ذہن میں کل سے ہی کانٹا اٹکا ہُوا تھا کہ اتنی مدت بعد زبیدہ میری بیوی کے پاس کیوں آئی تھی اور جس طرح وہ راشدہ کے کمرے میں چلی گئی تھی اس سے بھی ایک شک میرے دل پر بیٹھ گیا تھا۔"

ہاشمی نے عبدالقدیر اور چاروں ساتھیوں کو وہ باتیں سنائیں جو زبیدہ نے اُس کی بیوی کے ساتھ کی تھیں۔ ہاشمی نے انہیں بتایا کہ دروازے میں سے وہ بُرقعہ پوش عورت کو دیکھتا رہا۔ اسے شک اس لئے ہُوا کہ زبیدہ نے کہا تھا کہ یہ عورت بول نہیں سکتی کیونکہ اس کی زبان اور مُنہ

پر ورم یا سوزش ہے۔ اس عورت نے دو تین لفظ ہی بولے۔ پتہ تو یہ چلتا تھا کہ اس کا گلا خراب ہے لیکن عورت کا گلا کتنا ہی خراب کیوں نہ ہو اور وہ اپنی آواز کتنا ہی کیوں نہ بدل لے اُس کی آواز مردوں جیسی نہیں ہو سکتی۔ اس عورت کی آواز مردوں جیسی لگ رہی تھی۔

"میں سی آئی ڈی اور انٹیلی جنس میں کبھی بھی نہیں رہا" ——— ہاشمی نے کہا ——— "یہ اللہ کی قدرت ہے یا اسے ایمان کا کرشمہ کہئے کہ دماغ میں ایک چمک سی پیدا ہوتی جس نے مجھے اس برقعہ پوش کا اصل روپ دکھا دیا۔ زبیدہ میری بیوی کی اجازت کے بغیر راشدہ کے کمرے کی طرف چل پڑی۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ یہ آدمی جو برقعہ پوش ہے زبیدہ کے ساتھ لگ کر بیٹھا ہُوا تھا اور اس نے کئی بار زبیدہ کو ٹھوکا دیا۔ اس سے میرے لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ زبیدہ اُس کی ہدایت کاری پر بول رہی تھی۔"

اس کے بعد ہاشمی نے بتایا کہ کس طرح اُس نے اس شخص کو بے نقاب کیا، اس نے پستول نکالا اور ہاشمی نے کس طرح پستول چھینا۔

"اب بتائیں ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتے" ——— ہاشمی نے کہا۔

"عزیز کی اس بہن کے خاوند کو یہاں بلواتے ہیں" ——— عبدالقدیر نے کہا ——— "لیکن اُسے ابھی یہ نہیں بتانا کہ یہاں کیا دیکھنے آئی تھی۔ یہ آدمی جو زبیدہ کے ساتھ آیا بیٹھا ہے، یقیناً عزیز کا ساتھی ہے اور یہ انٹیلی جنس کا یا سی آئی اے کا آدمی ہے۔ اس کی ہم مار پٹائی کر سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اگر ہم نے اسے قتل کر کے غائب کر دیا تو سی آئی اے یا انٹیلی جنس آپ کو اور آپ کی بیوی کو بخشے گی نہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ ان کا یہ آدمی اس وقت کہاں ہے اور کس مشن پر ہے۔ ہمارے لئے دوسرا خطرہ یہ ہے کہ یہ کم بخت اگر ہندو ہُوا تو یہ جس محکمے کا بھی ہے وہ ہندوؤں کو یہ کہہ کر مسلمانوں کے خلاف بھڑکا دے گا کہ مسلمانوں نے ایک بے گناہ ہندو کو اغوا کر کے غائب کر دیا ہے ....

پہلے تو ہم اس سے یہ اگلوائیں گے کہ اس کا تعلق کون سے محکمے کے ساتھ ہے۔ اس کا مشن تو ہمیں معلوم ہے۔ زبیدہ نے کل عزیز کو بتایا ہوگا کہ اُس نے اس گھر میں ایک لڑکی دیکھی ہے جو ان کی کچھ نہیں لگتی۔ عزیز نے یہ دیکھنے کے لئے کہ یہ رشی ہی تو نہیں، اپنے اس ساتھی کو بھیجا ہوگا۔"

ہُوا بھی ایسے ہی تھا کہ زبیدہ نے پہلی بار اس گھر میں رشی کو دیکھ کر اور واپس جا کر عزیز کو بذریعہ ٹیلی فون بلایا اور بتایا تھا کہ اُس نے اس حلیے اور اس شکل کی ایک لڑکی کو جس نے فلاں رنگ اور فلاں قسم کے کپڑے پہن رکھے ہیں، ہاشمی صاحب کے گھر دیکھا ہے۔ عزیز نے پہلے یہ سوچا تھا کہ وہ مصنوعی داڑھی لگا کر عامل کے بھیس میں وہاں خود جاتے گا، لیکن ورما نے اُسے روک دیا تھا پھر دونوں نے یہ بہروپ دھارنے کا فیصلہ کیا تھا۔ عزیز نے ورما سے یہ بھی کہا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہو جاتے تو بلا خوف و خطر گولی چلا دینا۔

"اس کا مجھے کوئی ڈر نہیں" ——— ورما نے کہا تھا ——— "اگر کوئی ایسی ویسی ہو گئی تو ہم شہر کے ہندوؤں کو اس محلے کے مسلمانوں پر چڑھا دیں گے۔ ہندوؤں کو تو بہانہ چاہیئے۔"

اب ایسی ویسی ہو گئی تھی اور ورما ان چھ مسلمانوں کے ہاتھوں میں بے بس تھا۔

عبدالقدیر ورما کے پاس پہنچا۔ اُس کے سر کے بال مٹھی میں لئے اور جھٹکا دے کر اُوپر کو کھینچے۔ ورما اُٹھ کھڑا ہُوا۔ عبدالقدیر نے ہاشمی سے اتنا ہی پوچھا کہ کون سا کمرہ بہتر رہے گا۔ ہاشمی آگے آگے چل پڑا۔ عبدالقدیر ورما کے بالوں کو پکڑے ہوتے اور جھٹکے دیتا ہُوا ہاشمی کے پیچھے پیچھے ایک کمرے میں چلا گیا جس میں پرانی چارپائیاں اور کچھ اور پرانی چیزیں پڑی ہوتی تھیں۔ زیادہ تر کمرہ خالی تھا۔ اس کے چاروں ساتھی بھی کمرے میں چلے گئے اور دروازہ اندر سے بند کر دیا۔

"سچ سچ بتا جوان!" ——— عبدالقدیر نے ورما سے پوچھا ——— "کون ہو اور یہاں کیا لینے آتے تھے؟"

"احمق نہ بنو" ——— ورما نے بڑی دلیری سے کہا ——— "مجھے جانے دو..... پچھتاؤ گے۔"

"ہندو ہو یا مسلمان؟"

"ہندو ہوں" ——— ورما نے جواب دیا ——— "اور تم جانتے ہو کہ میرے ساتھ تم نے کوئی زیادتی کی تو یہاں کے ہندو صرف تم سے نہیں بلکہ اس آبادی کے تمام مسلمانوں سے....."

عبدالقدیر کے ایک زوردار تھپڑ نے اُسے اس سے آگے کچھ کہنے نہ دیا۔ اس کے ساتھ ہی ورما پر عبدالقدیر، ہاشمی اور ان کے چار ساتھیوں کے تھپڑوں اور گھونسوں کا مینہ برس پڑا۔

ہاشمی نے اپنے ساتھیوں کو روک دیا۔ ورما کی حالت خاصی بُری ہو گئی تھی۔

"ہندو کے بچے!" ——— عبدالقدیر نے ورما سے کہا ——— "سچ بول"۔

ورما میں ابھی کچھ دم باقی تھا۔ اُس نے ایک بار پھر انہیں دھمکی دی۔

عبدالقدیر جانتا تھا کہ انٹیلی جنس کے انویسٹی گیشن سنٹر میں کیسے کیسے طریقوں سے ملزموں کے سینوں سے راز نکالے جاتے ہیں۔ اُس نے ایسا ہی ایک طریقہ آزمایا۔ ورما نے خود بھی ملزموں کو اس قسم کی اذیتیں دی تھیں لیکن خود پہلی بار اس ایذارسانی میں ڈالا گیا تھا۔ اس کی چیخیں اس کمرے سے باہر تو سُنی جا رہی تھیں لیکن اس حویلی سے باہر نہیں جا سکتی تھیں۔ اتنے میں کمرے کے دروازے پر دستک ہوتی۔ ہاشمی نے دروازہ کھولا۔ باہر اس کی بیوی کھڑی تھی۔

"ذرا اُسے آ کر دیکھیں" ——— ہاشمی کی بیوی نے زبیدہ کے متعلق ہاشمی کو بتایا ——— "وہ میرے پاؤں پر بار بار سر رکھتی اور کہتی ہے کہ مجھے جانے دو، اگر بات باہر نکل گئی تو میری بڑی بے عزتی ہو گی..... وہ رو رو کر بُرا حال کر رہی ہے۔"

ہاشمی نے عبدالقدیر کو بتایا۔ عبدالقدیر نے اسے کچھ کہا اور ہاشمی

کمرے سے نکل گیا۔ اُس نے زبیدہ کو ساتھ لیا اور ایک کمرے میں لے جا کر اس سے پوچھا کہ وہ اس آدمی کو اپنے ساتھ کیوں لائی تھی۔

"اگر سچ نہیں بولو گی تو تمہاری بے عزتی اُس سے کہیں زیادہ ہو گی جتنی تم سمجھ رہی ہو" — ہاشمی نے کہا — "تم ایک غیر مرد کو بہروپیا بنا کر بُری نیت سے یہاں آئی تھیں۔ ابھی تمہارے خاوند کو اطلاع دیں گے۔ وہ آتے چاہے نہ آتے، ہم تمہیں تھانے لے جائیں گے ...."

زبیدہ ہاشمی کے پاؤں میں بیٹھ گئی اور اس کے قدموں میں سر رکھنے کے لئے جھکی، لیکن ہاشمی نے اُس کا سر اُوپر کر دیا۔

"اب تھانیدار اور اپنے خاوند کے قدموں میں ماتھا رگڑنا" — ہاشمی نے کہا۔

زبیدہ مکّار اور عیّار ہو سکتی تھی، وہ جرائم پیشہ نہیں تھی کہ ذہنی یا جسمانی ایذا رسانی کو کچھ دیر کے لئے برداشت کر سکتی۔ وہ بہرحال ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اس لئے اپنی عزت کو بچانے کے لئے وہ ہر قیمت دینے کو تیار تھی۔ ہاشمی نے اُس کے ساتھ جھوٹا وعدہ کیا کہ وہ اس پر پردہ ڈال لے گا بشرطیکہ وہ صحیح بات بتا دے۔

زبیدہ نے صحیح بات بتا دی۔

"ہاشمی بھائی جان!" — زبیدہ نے پوچھا — "یہ قصّہ کیا ہے؟ مَیں نے تو اپنے بھائی کی بات مانی تھی۔ اُس کے ساتھ مجھے پیار ہے۔ اُس نے میرے ساتھ اِس آدمی کو بھیجا تھا۔"

"کیا اِس آدمی کو تم پہلے سے جانتی تھیں؟" — ہاشمی نے پوچھا — "یہ کون ہے؟ کہاں رہتا ہے؟"

"نہیں!" — زبیدہ نے جواب دیا — "عزیز نے مجھے اتنا ہی بتایا تھا کہ یہ اُس کا دوست ہے۔"

"یہ ہندو ہے" — ہاشمی نے کہا — "خود کہتا ہے کہ مَیں ہندو ہوں۔"

"عزیز نے مجھے اس کا نام عبدالرحمٰن بتایا ہے" — زبیدہ نے کہا

اور بھکاریوں کی طرح بولی — "یہ میرے بھائی اور اس کے دوست کا دین ایمان ہے کہ انہوں نے مجھے کیا بتایا اور حقیقت کیا ہے۔ میں جو کچھ جانتی تھی وہ آپ کو بتا دیا ہے۔ اب آپ اپنا وعدہ پورا کریں اور مجھے جانے دیں۔ میرے خاوند کو پتہ چل گیا تو...."

"خاموشی سے یہاں بیٹھی رہو" — ہاشمی نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

ہاشمی اُس کمرے میں گیا جہاں اُس کے محاذ کے آدمیوں نے ورما کو گھیر رکھا تھا۔ اُس وقت تک عبدالقدیر یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ ورما کے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے۔

"اُس نے ساری بات بتا دی ہے" — ہاشمی نے زبیدہ کے متعلق اپنے ساتھیوں کو بتایا — "یہ ڈرامہ عزیز کھیل رہا ہے۔"

"اب تم بھی بول پڑو میرے دوست!" — عبدالقدیر نے ورما سے کہا۔

اُس وقت تک یہ لوگ ورما کی حالت خاصی بُری کر چکے تھے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ وہ مزید تشدد برداشت نہیں کر سکتا تھا اور دوسرے اس وجہ سے بھی کہ اُسے معلوم تھا کہ عزیز کو پتہ ہے کہ وہ کہاں ہے۔ عزیز اُسے اور اپنی بہن کو کسی خطرے میں نہیں ڈال سکتا تھا۔ اُس نے اپنے ایک دو آدمیوں کو ہاشمی کے گھر پر نظر رکھنے کے لئے بھیج رکھا تھا۔ یہ انتظام بھی عزیز کا ذاتی تھا۔ اُس نے اور ورما نے ابھی اپنے محکمے کو نہیں بتایا تھا۔ عزیز اپنے چیف کو بتانے سے پہلے یقین کر لینا چاہتا تھا کہ رشی ہاشمی کے گھر میں ہی ہے یا ہاشمی کو معلوم ہے کہ لڑکی کہاں ہے۔ عزیز اور ورما کے ان دو آدمیوں کو معلوم ہی نہ ہو سکا کہ ہاشمی کے گھر کے اندر کیا ہو رہا ہے۔

"مَیں تمہیں یہ بتانے سے نہیں ڈرتا کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں" — ورما نے کہا — "میں انٹیلی جنس کا آدمی ہوں۔"

"تم جو کوئی بھی ہو" —— عبدالقدیر نے کہا —— "یہ بتاؤ کہ یہاں کیا لینے آئے ہو..... ہم کس طرح مان لیں کہ تم انٹیلی جنس کے یا سی آئی ڈی کے آدمی ہو؟ کیا یہ عورت بھی انٹیلی جنس میں ہے اور کیا اس عورت کا بھائی عزیز احمد بھی انٹیلی جنس کا آدمی ہے؟"

"نہ یہ عورت انٹیلی جنس میں ہے نہ اس کا بھائی" —— ورما نے جواب دیا —— "میں ایک لڑکی کی تلاش میں یہاں آیا ہوں۔ عزیز احمد میرا دوست ہے۔"

"کون ہے وہ لڑکی؟" —— عبدالقدیر نے پوچھا —— "اس کا اس گھر والوں کے ساتھ کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ کیا تمہیں کسی نے یہ بتایا ہے کہ یہ بدمعاشوں اور بردہ فروشوں کا گھر ہے؟"

"میں آپ کے ساتھ زیادہ باتیں نہیں کر سکتا" —— ورما نے کہا —— "ہمارے محکمے کو اطلاع ملی ہے کہ وہ لڑکی اس گھر میں ہے۔"

"اور تمہیں یہ اطلاع عزیز کی بہن نے دی ہے" —— عبدالقدیر نے کہا۔

ورما ابھی کچھ کہنے نہ پایا تھا کہ عبدالقدیر نے اس کا بازو پکڑا اور اسے کمرے سے باہر لے گیا۔

"یہ سارا مکان تمہارے سامنے ہے" —— عبدالقدیر نے کہا —— "تم اگر انٹیلی جنس میں ہو تو تم جانتے ہو گے کہ کسی مشتبہ کے گھر کی تلاشی کس طرح لی جاتی ہے۔ تم آگے آگے چلو، ہم تمہارے پیچھے پیچھے چلیں گے۔ ہر کمرے میں جاؤ۔ پلنگوں کے نیچے اور الماریوں کے اندر بھی دیکھو۔ کسی کمرے میں فرشی دری بھی ہو تو وہ اُٹھا کر دیکھو کہ اس کے نیچے کہیں کسی تہہ خانے کا دروازہ نہ ہو۔ پھر ہم تمہیں اُوپر لے چلیں گے اور تمہیں اُس وقت یہاں سے نکلنے دیں گے جب تمہاری تسلی ہو جائے گی۔ اب ہم میں سے کوئی بھی تم پر ہاتھ نہیں اُٹھائے گا۔ تمہیں خانہ تلاشی کی کھلی اجازت ہے۔"

ورما ساتھ والے کمرے میں گیا اور اس کمرے کو اُسی طرح دیکھا

جس طرح پولیس کسی گھر کی تلاشی لیتے وقت دیکھا کرتی ہے۔ اس حویلی کے بہت سے کمرے تھے۔ ورما کمروں کے اندر جا کر دیکھتا جا رہا تھا اور وہ اُس کمرے میں داخل ہُوا جس میں رشی کو رکھا گیا تھا۔ وہاں بھی رشی نہیں تھی۔

اُس نے تمام کمرے دیکھ لیے۔ پھر اُسے اُوپر والی منزل میں لے گئے۔ وہاں بھی کسی کمرے میں اُسے رشی نظر نہ آئی۔ اُسے نوکر اور نوکرانی کا کمرہ بھی دکھایا گیا پھر اُسے نیچے لے آئے۔ زبیدہ برآمدے میں کھڑی تھی۔ اُس کے چہرے پر پریشانی کا گہرا تاثر تھا۔ عبدالقدیر نے اُسے اپنی طرف بلایا۔

"اپنے اس دوست کو بتاؤ کہ تم نے کسی لڑکی کو کون سے کمرے میں دیکھا تھا" —— عبدالقدیر نے زبیدہ سے کہا۔

زبیدہ نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

"وہ کمرہ ایک بار پھر دیکھ آؤ" —— عبدالقدیر نے ورما سے کہا۔

ورما نے آہستہ سے سر ہلایا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اُس کمرے میں دوبارہ جانے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔

"میری بات غور سے سن میرے دوست!" —— عبدالقدیر نے زبیدہ کی طرف اشارہ کر کے ورما سے کہا —— "اس عورت کو اور اس کے بھائی کو ہم بڑی اچھی طرح جانتے ہیں۔ یہ ہاشمی صاحب کو بلیک میل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بہن بھائی بڑے شریف باپ کی اولاد ہیں لیکن یہ اتنے ہی شیطان ہیں جتنا ان کا باپ شریف اور وضعدار آدمی ہے۔ اس اتنے بڑے گھر میں یہ ہاشمی صاحب اور ان کی بیگم اکیلے رہتے ہیں جناب عزیز صاحب اس مکان پر یا کم از کم آدھے مکان پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ انہیں ایسے چکر میں پھنساؤ کہ یہ ہتھیار ڈال دیں۔"

"کیا آپ ان کے وکیل ہیں؟" —— ورما نے قدرے مسکراتے ہوئے

کہا — "گھر ان کا ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ باتیں صرف آپ کر
رہے ہیں۔"

"اس ملک میں مسلمانوں کا وکیل صرف خدا ہے" — عبدالقدیر
نے کہا — "میں اس لئے ان کی جگہ بول رہا ہوں کہ یہ انتہائی شریف
انسان ہیں اور ان کے لئے ایسی شرمناک اور پیچیدہ صورتِ حال پیدا کر
دی گئی ہے کہ یہ بات کرنے کے بھی قابل نہیں رہے۔ انہوں نے مجھے
کو ہم سب کو بلا لیا۔ ہم سب ایک ہی محلے کے رہنے والے ہیں۔ یہ اس قدر
سیدھے آدمی ہیں کہ ہم اگر انہیں اس صورتِ حال میں اکیلا چھوڑ دیں تو
بلیک میلنگ کے چکر میں آکر اتنا بڑا مکان چھوڑ کر بھاگ جائیں اور عورت
کا مقصد پورا ہو جاتے۔"

"کیا اب مجھے جانے کی اجازت ہے؟" — ورما نے پوچھا —
"میں نے اپنی تسلی کر لی ہے" — اس نے ہاشمی کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا
— "ہاشمی صاحب! میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ آپ کو کوئی بلیک میل
نہیں کرے گا۔ میں آپ کی شرافت کا قائل ہو گیا ہوں۔ کسی سے ڈرنے
کی یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

ورما انٹیلی جنس کا تربیت یافتہ آدمی تھا۔ اتنی زیادہ پٹائی کروا کے
بھی وہ بڑے شگفتہ انداز میں ہاشمی سے معافی مانگ رہا تھا جیسے اس
پر کوئی زیادتی نہ ہوئی ہو بلکہ اس نے ہاشمی کے ساتھ زیادتی کی ہو۔

"نہیں مہاراج!" — عبدالقدیر نے کہا — "آپ کی تسلی تو ہو گئی
ہے، ہماری نہیں ہوئی .... تمہارا یہ کہنا کہ تم انٹیلی جنس کے آدمی ہو، ہمارے
لئے قابلِ قبول نہیں۔ تمہارے پاس انٹیلی جنس کے محکمے کا کوئی شناختی کارڈ
نہیں۔ ہم تمہیں اور اس خاتون کو تھانے لے چلیں گے تاکہ تمہاری
شناخت بھی ہو جاتے اور یہ جو ڈرامہ کھیلا گیا ہے، یہ پولیس کے نوٹس
میں آ جاتے۔"

زبیدہ پاس ہی کھڑی تھی۔ اس نے جب تھانے کا نام سنا تو وہ
بالکل اسی طرح تڑپنے لگی جس طرح پانی سے باہر پھینکی ہوئی مچھلی تڑپا

کرتی ہے۔ کبھی وہ ہاشمی کے آگے ہاتھ جوڑتی تھی، کبھی ہاشمی کی بیوی کی ٹھوڑی
کو ہاتھ لگاتی، کبھی عبدالقدیر کی منت سماجت کرتی تھی۔

عبدالقدیر نے اپنے ایک جواں سال ساتھی کو پرے لے جا کر کہا
کہ وہ زبیدہ کے خاوند کو ساتھ لے کر تھانے پہنچ جائے۔

ورما نے تھانے کا نام سنا تو اس کا چہرہ چمک اٹھا۔ اس کی
خیریت اسی میں تھی کہ اسے تھانے پہنچا دیا جاتے لیکن زبیدہ پر تو جیسے غشی
طاری ہونے لگی تھی۔ جب یہ سب آدمی گھر سے نکلنے لگے تو زبیدہ نے
جانے سے انکار کر دیا۔

"زبیدہ!" — عبدالقدیر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اور آہستہ
سے جھنجھوڑتے ہوتے کہا — "تمہیں تھانے جانا پڑے گا۔ نہیں جاؤ گی تو
پولیس تمہیں لینے یہاں آ جاتے گی اور تم نہیں جانتیں کہ پولیس کس بدتمیزی
سے تمہیں تھانے لے جاتے گی۔"

زبیدہ نے رونا شروع کر دیا۔ آخر ورما کے کہنے پر وہ ساتھ
چل پڑی۔

اس علاقے کا تھانہ انچارج ایک سکھ پولیس انسپکٹر تھا۔ یہ لوگ اس
کے پاس گئے۔ عبدالقدیر نے بیان کیا کہ ہاشمی کے گھر میں کیا ہوا ہے۔
ہاشمی نے اس سکھ تھانیدار کو بتایا کہ یہ شخص کالا برقعہ اوڑھ کر آیا تھا۔ زبیدہ
کے متعلق تھانیدار کو بتایا کہ یہ ایک روز پہلے ہاشمی کے گھر میں گئی تھی۔ تھانیدار
کو پوری واردات سنائی گئی۔

تھانیدار نے سب کو باہر نکال دیا۔ صرف زبیدہ کو اپنے پاس
رہنے دیا۔ اس سے بیان لینا تھا۔ ورما کو اس نے الگ بٹھا دیا تھا۔ ورما کا
پستول اور برقعہ بھی تھانیدار کو دیا گیا تھا۔ ورما کی حیثیت ملزم کی تھی۔ زبیدہ
بھی ملزم تھی لیکن تھانیدار نے ورما سے پہلے زبیدہ کا بیان لینا بہتر سمجھا
تھا۔ اس کا خیال تھا کہ عورت جرم کا اقبال نہ کرے تو اسے جلدی توڑا جا
سکتا تھا کیونکہ عورت مرد جتنا تشدد برداشت نہیں کر سکتی۔

تھانیدار زبیدہ کا بیان لے رہا تھا کہ اُس کا خاوند آگیا۔ ہاشمی اور
عبدالقدیر اُسے جانتے تھے۔ اتنا زیادہ میل ملاپ نہیں تھا اس لئے آپس
میں بے تکلفی نہیں تھی۔ اُس کا رنگ اُڑا ہوا تھا۔ وہ ہاشمی اور عبدالقدیر
سے پوچھنے سے گھبرا رہا تھا کہ اُس کی بیوی کو تھانے کیوں لایا گیا ہے۔

ہاشمی اور عبدالقدیر اُسے الگ لے گئے اور اُسے پوری بات
سنا دی لیکن یہ نہ بتایا گیا کہ گمشدہ لڑکی واقعی ہاشمی کے گھر تھی اور انہوں
نے اُسے اغوا کیا تھا۔ عزیز کے متعلق انہوں نے بتایا کہ وہ انٹیلی جنس کا
جاسوس ہے۔

"میرے بھائی!" — ہاشمی نے زبیدہ کے خاوند سے کہا —
"یہ شخص جسے آپ کی بیگم برقعے میں لپیٹ کر میرے گھر لاتی تھی، ہندو ہے۔
مجھے افسوس ہے کہ یہ عورت آپ کی بیوی ہے۔ میں آپ کو جانتا ہوں۔ آپ
صاحبِ کردار ہیں لیکن اس وقت ہم اس عورت کو عزیز احمد کی بہن کی
حیثیت سے دیکھ رہے ہیں۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ عورت کا اور عزیز کا
باپ بھی آپ کی طرح صاحبِ کردار اور باوقار آدمی ہے لیکن اس عورت
کی واردات دیکھیں۔"

زبیدہ کے خاوند کے آنسو نکل آئے۔

"ہمیں بہت افسوس ہے جمیل صاحب!" — عبدالقدیر نے کہا —
"آپ کے ساتھ ہماری کوئی عداوت نہیں۔ اگر بات معمولی سی ہوتی تو ہم
تھانے تک نوبت نہ پہنچنے دیتے۔ شاید آپ سے گلہ بھی نہ کرتے لیکن
آپ خود سوچیں کہ یہ معاملہ کس قدر سنگین ہے۔"

"میں تو کچھ کہنے کے قابل نہیں رہا" — زبیدہ کے خاوند نے کہا — "
اس عورت کو صرف اس لئے برداشت کرتا رہا ہوں کہ یہ ادریس احمد کی
بیٹی ہے۔ ادریس صاحب کو شاید آپ بھی جانتے ہوں گے۔"

"ہاں ہاں!" — ہاشمی نے کہا — "اُن جیسا نیک سیرت اور نیک
فطرت کون ہو گا۔"

"اگر عزیز اس عورت تک ہی محدود ہوتا تو میں کبھی کا اس عورت

کو طلاق دے چکا ہوتا" — زبیدہ کے خاوند نے کہا — "اس عورت
کے اخلاق اور کردار سے میں بڑی اچھی طرح واقف ہوں۔ اب میں دیکھوں
گا کہ یہ معاملہ کیا ہے پھر آپ دیکھیں گے کہ میں کیا کارروائی کرتا ہوں۔"

ایک گھنٹے سے کچھ زیادہ وقت تھانیدار نے زبیدہ کو تفتیش کے
لئے اپنے کمرے میں بٹھائے رکھا۔ اُسے باہر لا کر ایک طرف بٹھا دیا
اور ورما کو اندر بلایا۔

زبیدہ نے اپنے خاوند کی طرف دیکھا۔ خاوند نے منہ پھیر لیا۔

ورما تقریباً ایک گھنٹے بعد تھانیدار کے کمرے سے نکلا۔ اس
کے بعد تھانیدار باہر آیا اور اُس نے ہاشمی، عبدالقدیر اور اُس کے ساتھیوں
کو بلایا۔ زبیدہ کا خاوند بھی اُن کے ساتھ چلا گیا۔ تھانیدار نے ان سب کو
عزت واحترام سے بٹھایا۔ جمیل کو دیکھ کر تھانیدار نے پوچھا کہ یہ کون ہے۔
اُسے بتایا گیا کہ یہ اس عورت کا خاوند ہے۔

"آپ سب معزز لوگ ہیں" — اس سکھ تھانیدار نے کہا —
"میں آپ سے امید رکھوں گا کہ جو بات میں آپ کو بتانے لگا ہوں اسے
آپ سچ مانیں گے .... میں خود حیران تھا کہ یہ واردات ایک شریف آدمی
کے گھر میں کیوں ہوتی اور کس طرح ہوتی لیکن یہ کچھ اور ہی معاملہ نکلا ہے
.... یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ میں سکھ ہوں اور آپ مسلمان ہیں۔ ہندوؤں سے
جتنے نالاں آپ ہیں اُتنے ہی ہم ہیں۔ میں جو بھی بات کروں گا وہ آپ کی
حمایت میں ہو گی اور اس میں آپ کا ہی فائدہ ہو گا۔ یہ شخص جو آپ کے گھر
میں اس عورت کے ساتھ برقعے میں گیا تھا، انٹیلی جنس کا آدمی ہے اور یہ
ہندو ہے۔"

"کیا آپ نے اس کی باقاعدہ شناخت کی ہے؟" — عبدالقدیر
نے پوچھا — "اس کی تصدیق کرائی ہے؟"

"اپنی تسلی کر کے ہی آپ کے ساتھ بات کر رہا ہوں" — تھانیدار
نے جواب دیا — "میں آپ کو اس کا نام نہیں بتا سکتا۔ میں یہ بھی نہیں بتا

سکتا کہ میں نے کہاں سے تصدیق کرائی ہے۔ صرف یہ بتاتا ہوں کہ میں
نے ڈی ایس پی کو فون کیا تھا اور انہوں نے انٹیلی جنس کے متعلقہ شعبے کو فون
کر کے مجھے بتایا ہے کہ اس شخص کا تعلق انٹیلی جنس کے ساتھ ہے۔"
"لیکن سردار جی!" —— ہاشمی نے پوچھا —— "اس نے یہ چکر میرے
گھر میں کیوں چلایا ہے؟ اس نے ہمیں بتایا تھا کہ ان کی کوئی لڑکی لاپتہ ہو
گئی ہے اور انہیں شک ہے کہ وہ میرے گھر میں ہے۔ میں آپ کو پہلے
بتا چکا ہوں کہ ہم نے اسے مکان کے تمام کمرے دکھائے اور اسے
اجازت دی کہ پولیس کی طرح خانہ تلاشی لے لے۔ اس نے ہمیں بھی
بتایا تھا کہ یہ انٹیلی جنس کا آدمی ہے لیکن ہم یہ معاملہ آپ کے نوٹس میں لانا
چاہتے تھے۔"
"جو ہو گیا ہے اُسے برداشت کریں اور بھول جائیں" —— سکھ تھانیدار
نے کہا —— "اس شخص نے کوئی قابلِ گرفت واردات نہیں کی۔ میں نے
اُوپر بات کر لی ہے۔ اوپر سے مجھے جو بتایا گیا ہے وہ میں آپ کو نہیں بتا
سکتا۔ آپ خوش قسمت ہیں کہ میں اس تھانے کا انچارج ہوں اور میں سکھ
ہوں۔ میری جگہ کوئی ہندو انسپکٹر ہوتا تو وہ آپ کی شکایت سُننے کی بجائے
آپ کو ملزم بنا دیتا اور انٹیلی جنس والوں سے کہہ سُن کر آپ کو وہاں کے
انویسٹی گیشن سنٹر میں پہنچا دیتا۔ آپ نے انٹیلی جنس کے ایک آدمی کو
مارا پیٹا ہے۔ ہندوؤں کی ذہنیت کو آپ جانتے ہیں۔ یہ مسلمانوں کے بھی
اتنے ہی دشمن ہیں جتنے سکھوں کے ہیں۔ ہمارے دربار صاحب امرتسر
پر حملہ کرنے اور آپ کے کعبہ جیسے ہمارے دربار صاحب کو تباہ کرنے
والوں نے آپ کی مسجدیں اُجاڑ دی ہیں۔ پہلے یہ مسلمانوں کا خون بہاتے رہتے
تھے پھر انہوں نے سکھوں کے خون کی ندیاں بہا دیں۔ ۱۹۴۷ء میں ہندو لیڈروں
نے سکھ لیڈروں کو سبز باغ دکھا کر اور روپیہ دے کر سکھ قوم کو مسلمانوں کا دشمن
بنایا جب ہندوؤں کا مطلب پورا ہو گیا تو انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ
سکھوں کو بھی اپنا دشمن سمجھنا شروع کر دیا۔"

سکھ تھانیدار آہستہ آہستہ بول رہا تھا کہ اس کی آواز دروازے سے
باہر نہ جائے۔ اس کی باتوں کی گہرائی کو عبدالقدیر زیادہ اچھی طرح سمجھتا تھا
کیونکہ وہ انٹیلی جنس میں رہ چکا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ ہندو حکومت ہاتھ دھو
کر سکھوں کے پیچھے پڑی ہوتی ہے۔
"ہم آپ کے بہت ہی مشکور ہیں سردار جی!" —— عبدالقدیر نے
کہا —— "ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ یہ واردات یا یہ واقعہ تھانے کے ریکارڈ
پر آجائے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ہم نے اس شخص کو زدوکوب نہیں کیا۔ ہم تو
اس کی پٹائی کرتے کرتے تھانے لانا چاہتے تھے۔"
"ریکارڈ پر آگیا ہے" —— تھانیدار نے کہا —— "اور آپ نے اچھا
کیا ہے کہ اس کی پٹائی کرتے کرتے تھانے نہیں لائے۔ ہندو لُومڑی اور
بھیڑیئے کی نسل ہے۔ یہ اس معاملے کو فرقہ وارانہ فساد بنا سکتا ہے۔ میں
نے اس شخص کو بڑی مشکل سے ٹھنڈا کیا ہے۔ یہ ہندوؤں کو مسلمانوں
کی آبادی پر چڑھا سکتا ہے۔"
"حکومت اِن کی ہے صاحب!" —— ہاشمی نے کہا —— "شیطان کی
یہ اولاد جو چاہے کر سکتی ہے۔"
"میں آپ سے ایک ضروری بات کہنا چاہتا ہوں گا" —— تھانیدار نے
کہا —— "کبھی کسی محفل اور مجلس میں، دفتر یا کنٹین میں یا کہیں بھی، پاکستان
کی حمایت میں کوئی بات نہ کرنا۔ آپ کو میری یہ بات شاید اچھی نہ لگے کہ
پاکستان کے لیڈروں نے پاکستان کو ایک کمزور ملک بنا دیا ہے۔ ہم
تو کہتے تھے کہ جس طرح ہندوؤں نے ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان میں بنگالیوں
کی مدد کی تھی اس طرح پاکستان مشرقی پنجاب میں سکھوں کی مدد کرے گا
لیکن پاکستان تو بھارت کے مسلمانوں کی بھی مدد کرنے سے گھبراتا ہے۔"
"مدد تو دُور کی بات ہے سردار صاحب!" —— ہاشمی نے کہا —— "پاکستان
کی حکومت سرکاری طور پر بھارت میں مُسلم کُشی پر احتجاج بھی نہیں کرتی۔ ہم
یہ جانتے ہیں کہ پاکستان کے لوگ ہمارے ہمدرد ہیں۔"

"لوگوں کی کون سُنتا ہے"— تھانیدار نے کہا اور وہ اچانک بول پڑا جیسے اُسے کچھ یاد آ گیا ہو۔ ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بولا — "یہ ملکوں کی سیاست کی باتیں ہیں میرے بھائیو! اب جاؤ.... میری نوکری کا خیال رکھنا۔ میں نے کچھ فالتو باتیں کہہ دی ہیں"— وہ سب اُٹھ رہے تھے تو تھانیدار نے کہا — "ایک اور فالتو بات کہہ دیتا ہوں۔ انٹیلی جنس کے ساتھ ٹکر لینے کی حماقت کبھی نہ کرنا۔"

"میری بیوی کو انٹیلی جنس کے ساتھ کیوں وابستہ کیا گیا ہے؟"— زبیدہ کے خاوند جمیل نے پوچھا۔

"یہ آپ کے گھر کا معاملہ ہے"— تھانیدار نے کہا — "آپ کو خوش ہونا چاہیئے کہ آپ کی بیوی جیل سے بچ گئی ہے۔ کچھ اور پوچھنا ہے تو وہ اپنی بیوی سے پوچھیں.... اور اسے اپنے ساتھ لے جائیں۔"

❦

سب باہر نکل آئے۔ درما جا چکا تھا۔ زبیدہ وہیں تھی۔ اُس کے خاوند پر یہ بڑا ہی تلخ، شرمناک اور ناقابلِ برداشت انکشاف ہو چکا تھا کہ اُس کی بیوی کا تعلق انڈین انٹیلی جنس کے ساتھ ہے۔ اُس نے باہر آ کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا ہی نہیں اور دوسروں کے ساتھ تھانے سے نکل آیا۔

ان میں سے کسی نے پیچھے دیکھا تو جمیل کو بتایا کہ اُس کی بیوی آ رہی ہے۔ زبیدہ کو تھانیدار نے باہر نکل کر کہا تھا کہ وہ گھر چلی جائے۔

جمیل بیوی کے لئے رُکنا نہیں چاہتا تھا۔ عبدالقدیر، ہاشمی اور دوسرے ساتھیوں نے اُسے کہا کہ بیوی کو ساتھ لے لے، گھر جا کر اس کے ساتھ جیسا سلوک چاہے کرے، یہاں غیروں کے سامنے تماشہ نہ بنائے۔

"آپ سب رُک جائیں"— جمیل نے کہا — "میں اپنا فیصلہ آپ سب کے سامنے سناؤں گا۔"

سب رُک گئے۔ زبیدہ ان کے پاس آئی اور سر جھکا کر رُک گئی۔

"تم یہاں سے سیدھی اپنے ماں باپ کے گھر چلی جاؤ"— جمیل

نے اُسے کہا — "بچّے میرے پاس رہیں گے، تم اپنے ماں باپ کے پاس رہو گی۔ تحریری طلاق نامہ تمہیں مل جائے گا۔"

زبیدہ نے چونک کر سر اُٹھایا اور نظریں اپنے خاوند کے چہرے پر گاڑ دیں۔ اُس کی آنکھوں میں رُکے ہوئے آنسو بہہ نکلے۔

"اپنے گریبان میں مُنہ ڈالو"— جمیل نے کہا — "تمہیں اپنا اخلاق اور کردار نظر آئے گا اور تمہیں میری شرافت اور برداشت بھی نظر آئے گی"— جمیل نے ہاشمی اور عبدالقدیر کی طرف دیکھا اور کہنے لگا — "اگر میرے بچّے نہ ہوتے تو میں اسے کبھی کا طلاق دے چکا ہوتا۔ اس کے باپ کی شرافت کا بھی مجھے خیال رہا۔"

"میں عزیز کی باتوں میں آ گئی تھی"— زبیدہ نے کہا — "اُس نے کہا تھا کہ میرے ایک پاکستانی دوست کی بیوی لاپتہ ہو گئی ہے اور شک ہے کہ وہ ہاشمی صاحب کے گھر میں ہے...."

"یہ سب بکواس ہے"— جمیل نے بارُعب آواز میں کہا — "میں اب تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گا۔ صرف یہ سُن لو کہ تمہارا پیارا بھائی عزیز احمد انڈیا کا جاسوس ہے اور وہ پاکستان کی جڑیں کاٹ رہا ہے اور وہ ہندوستان کے مسلمانوں کا اتنا ہی دشمن ہے جتنے ہندو ہیں.... اور یہ بھی سُن لو کہ تم جس آدمی کو برقعے میں لپیٹ کر ایک معزز اور پردہ دار گھر میں لے گئی تھیں وہ ہندو ہے۔ تم بھی انڈیا کی جاسوس ہو اور اس ہندو کے ساتھ تمہارا ناجائز یارانہ ہے۔"

"نہیں.... نہیں!"— زبیدہ نے تڑپ کر کہا — "مجھ پر اتنا ذلیل الزام نہ لگائیں.... میرا بھائی جاسوس نہیں ہو سکتا۔"

"تمہارے اس ایمان فروش بھائی کو تمہاری عزّت اور عصمت کا ذرا سا بھی پاس نہیں"— جمیل نے کہا — "اُسے معلوم تھا کہ اُس کی یہ سکیم اُلٹ گئی تو تمہاری کتنی بے عزّتی ہو گی۔"

"جمیل صاحب!"— ہاشمی نے کہا — "لوگ رُک رُک کر سُن رہے

ہیں۔ اس کے ساتھ اس کے والدین کے گھر چلے جائیں یا اسے اپنے گھر لے جائیں اور وہاں بات کریں۔"

"مجھے اس کے ساتھ کوئی بات نہیں کرنی ہاشمی صاحب!" — جمیل نے کہا — "مَیں اپنا فیصلہ سُنا چکا ہوں۔ یہ اپنے ماں باپ کے گھر جاتے گی۔ آپ کو معلوم نہیں کہ مَیں نے اس عورت کے ساتھ اکیس سال کس طرح گزارے ہیں۔ مَیں نے تو اللہ کا شکر ادا کیا تھا کہ عزیز کہیں غائب ہوگیا ہے۔ اِس بہن بھائی نے مِل کر میرا گھر خالی کر دیا تھا۔"

اتنے سارے آدمیوں میں زبیدہ کی حالت ایسی تھی جیسے اُس پر سکتہ طاری ہوگیا ہو۔ وہ سڑک کے کنارے کھڑے تھے۔ لوگ اُن کے قریب سے گزرتے تو قدم ذرا روک کر دیکھتے اور سُنتے تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

"تم اپنے والدین کے گھر چلی جاؤ" — جمیل نے زبیدہ سے کہا — "مَیں ان کے ساتھ جا رہا ہوں۔"

وہ سب چل پڑے اور زبیدہ وہیں کھڑی رہی۔ اُس نے جان لیا تھا کہ اُس کے خاوند کا فیصلہ اٹل ہے۔ اُس کا اپنا ضمیر بھی اُس پر لعنت بھیج رہا تھا۔ اس انکشاف نے تو اُس کا دم خم ہی توڑ دیا تھا کہ عزیز انڈیا کا جاسوس ہے۔ تھانے کی دہشت اور شرمساری بھی اُس کے اعصاب پر سوار تھی۔ وہ اُس سپاہی کی طرح جو زخمی اور شکست خوردہ ہو اور جس سے ہتھیار چھین لئے گئے ہوں، اپنے وجود کو گھسیٹنے لگی۔

وہ سب ہاشمی کے گھر جا بیٹھے۔ موضوعِ سخن عزیز، زبیدہ اور اُن کی یہ واردات تھی۔ جمیل غصے سے بھرا ہوا تھا۔ اُس نے یہاں تک کہا کہ اپنا بھائی، بیٹا یا باپ بھی بھارت کا جاسوس ہو تو اُسے قتل کر دو۔ اس کے باوجود اُسے نہ بتایا گیا کہ ایسا ہی ایک محاذ بنایا جا چکا ہے۔ اُسے یہ راز بھی نہ دیا گیا کہ رِشی کو ہوٹل سے دھوکے میں لانے والوں میں سے دو اُس کے سامنے بیٹھے ہیں۔

عبدالقدیر کے تجربے اور دُور اندیشی نے ہاشمی کو بچا لیا تھا۔ اُس نے گزشتہ رات رِشی کو ہاشمی کے گھر سے نکلوا دیا تھا۔ ہاشمی نے جب عبدالقدیر کو بتایا تھا کہ زبیدہ اُس کے گھر آئی تھی اور اتفاق سے رِشی نے کمرے کا دروازہ کھول دیا تھا پھر جس طرح زبیدہ اُس کمرے میں گئی، وہ ہاشمی نے عبدالقدیر کو سنایا تو عبدالقدیر کو یقین ہوگیا کہ عزیز کی یہ بہن رِشی کو ہی دیکھنے یا رِشی کی ٹوہ لگانے کے لئے آئی تھی اور اس صورتِ حال میں ضروری ہوگیا ہے کہ رِشی کو وہاں سے نکال دیا جاتے۔

اِن لوگوں کے لئے صورتِ حال بہت ہی پُرخطر ہوگئی تھی۔ صرف ہاشمی کا مکان ایسا تھا جس میں لڑکی کو چھپایا جا سکتا تھا۔ ایک تو اس مکان کے کمرے بے شمار تھے دوسرے یہ کہ اتنے بڑے مکان میں صرف میاں بیوی رہتے تھے، پھر بھی لڑکی کو وہاں دیکھ لیا گیا۔ عبدالقدیر کا اپنا مکان رِشی کو چھپانے کے قابل نہیں تھا کیونکہ اس گھر میں بہت سے افراد رہتے تھے۔ انہوں نے جو زمین دوز محاذ بنایا تھا اس کے کسی بھی ممبر کا گھر اغوا کی ہوتی ایک لڑکی کو چھپانے کے لئے موزوں نہیں تھا، لیکن لڑکی کو ہر قیمت پر کوئی خطرہ مول لے کر بھی ہاشمی کے گھر سے نکالنا تھا۔

ہاشمی اور عبدالقدیر کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا تھا۔ اُنہوں نے جذبے کے جوش میں آکر ایک لڑکی کو اغوا تو کر لیا تھا لیکن اب اُن کے لئے یہ لڑکی ایک ٹیڑھا مسئلہ بن گئی تھی۔ رِشی کو صرف یہ معلوم کرنے کے لئے اغوا کیا گیا تھا کہ وہ عزیز کے ساتھ کیونکر آئی ہے۔ یہ بھی معلوم کرنا تھا کہ عزیز واقعی ہی "را" کا کارندہ ہے اور وہ پاکستان سے نوجوانوں کو ورغلا کر یہاں لے آتا ہے۔

لڑکی کو اس معاملے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ جب اُنہیں یقین ہوگیا تھا کہ اس لڑکی کو واقعی کچھ بھی معلوم نہیں تو اُس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اشوکا ہوٹل کے قریب چھوڑ آتے لیکن لڑکی کو جب عزیز اور اپنے خاوند کے متعلق پتہ چلا کہ وہ بھارت کے جاسوس ہیں تو اُس کے جذبات بیدار

ہوگئے۔ ہاشمی اور اُس کی بیوی کے معاملے میں وہ جذباتی ہوگئی اور یہ میاں
بیوی اُس کے جذباتی انقلاب سے متاثر ہو گئے۔ رشی نے اپنے خاوند کے
پاس جانے یا پاکستان کو واپس چلے جانے سے انکار کر دیا تھا۔

عبدالقدیر اور ہاشمی نے اُس شام اپنے محاذ کے چیدہ چیدہ ممبروں
کا اجلاس بلایا جس میں ان دونوں کے علاوہ تین اور آدمی شامل تھے۔ عبدالقدیر
نے انہیں نئی صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ احتیاط کے طور پر یہ سب ایک اور
آدمی کے گھر اکٹھے ہوتے تھے۔

"ہم بہت بڑی غلطی کر چکے ہیں"۔۔۔ ایک ممبر نے کہا۔۔۔ "لڑکی کے
معاملے میں ہاشمی صاحب کو جذباتی نہیں ہونا چاہیئے تھا۔"

"غلطی تو ہو چکی ہے"۔۔۔ عبدالقدیر نے کہا۔۔۔ "ابھی ہم سے مزید
غلطیاں سرزد ہوں گی۔ تجربہ غلطیوں سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ ہمیں خطرے
مول لینے پڑیں گے۔ کبھی ہمیں اپنے جذبات دھوکا دیں گے، کبھی ہم دشمن
کی کسی چال سے دھوکا کھائیں گے۔ جب دو ملکوں کی فوجیں آپس میں لڑتی ہیں
تو دونوں فوجوں کے جرنیلوں کے پاس لڑائی کے باقاعدہ پلان موجود ہوتے
ہیں لیکن اپنے ہی بنائے ہوئے پلان شکست کا باعث بھی بن جاتے ہیں۔
میدانِ جنگ میں انسان اپنی لغزشوں اور دشمن کے رحم وکرم پر ہوتا ہے....
اس لڑکی کا اغوا ہمارے محاذ کا پہلا مشن ہے۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ لڑکی
کو اغوا کرنا ہی غلط تھا، کوئی اور طریقہ اختیار کیا جا سکتا تھا۔ نہیں میرے رفیقو!
ہمیں آگ میں کودنا ہی پڑے گا۔ اسلام کو دنیا میں پھیلانے کے لئے ہمارے
اُس وقت کے مجاہدین نے جانیں قربان کی تھیں۔ آج اسلام کے تحفظ اور
فروغ کے لئے اور پاک و ہند کے مسلمانوں کے وقار کے لئے ہمیں جان و مال
کی قربانیاں دینی ہوں گی.... اس وقت مسئلہ یہ ہے کہ اس لڑکی کو ہاشمی کے
گھر سے نکال کر کسی اور گھر میں رکھنا ہے لیکن کوئی اور گھر موزوں اور محفوظ
نظر نہیں آتا۔"

"لڑکی کو کتنے دن اور رکھنا ہے؟"۔۔۔ ایک ممبر نے پوچھا۔

"ایک یا دو دن!"۔۔۔ عبدالقدیر نے جواب دیا۔

"پھر اُسے میرے گھر میں رکھ لیں"۔۔۔ دوسرا ممبر بولا۔۔۔ "خدا یقیناً
ہماری مدد کر رہا ہے۔ آج صبح میری بیوی تین چار دنوں کے لئے اپنے
والدین کے ہاں فیض آباد چلی گئی ہے۔ میں لڑکی کو بیوی کی واپسی تک اپنے
گھر میں رکھ سکتا ہوں۔"

"آپ نے لڑکی کے متعلق سوچا کیا ہے؟"۔۔۔ ایک ممبر نے پوچھا۔

"لڑکی میں ایسا جذباتی انقلاب آیا ہے کہ وہ پاکستان کو واپس جانا
ہی نہیں چاہتی"۔۔۔ عبدالقدیر نے کہا۔۔۔ "لیکن ہمیں اُس کی ضرورت
نہیں رہی۔ ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ لڑکی کو اشوکا ہوٹل کے قریب چھوڑ
آئیں گے۔"

"اس میں بھی ایک خطرہ ہے"۔۔۔ ہاشمی نے کہا۔۔۔ "لڑکی کو یہ تو
معلوم ہی نہیں کہ وہ دلی کے کون سے علاقے یا محلے میں ہے۔ اُسے یہ
بھی معلوم نہیں کہ وہ نئی دلی میں ہے یا پرانی دلی میں لیکن وہ میری، میری
بیوی کی، قدیر صاحب اور آپ کی شناخت آسانی سے کر سکتی ہے۔ آپ
اُسے ہوٹل سے لاتے تھے۔ یہ تو آپ نے دیکھ لیا ہے کہ عزیز کے ذریعے
ہمیں کتنا پختہ شک ہو گیا ہے کہ انٹیلی جنس کے آدمی کو میرے گھر میں
بہروپ میں بھیجا گیا ہے۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ ہمیں تھانے میں یا انٹیلی جنس
کے ہیڈ کوارٹر میں بلایا جائے اور لڑکی سے ہماری شناخت کرائی جائے۔
وہ واپس جا کر یہ تو ضرور بیان دے گی کہ اُسے ہوٹل سے دھوکے میں
لے جایا گیا تھا۔"

"ہوگا ہی"۔۔۔ عبدالقدیر نے کہا۔۔۔ "لڑکی کو ہاشمی صاحب
کے گھر لایا جائے گا۔ میں چونکہ لڑکی کے پاس بہت دیر تک رہا تھا اس لئے
ہاشمی صاحب کے ساتھ مجھے بھی لڑکی کے سامنے کھڑا کیا جائے گا۔ مجھے یہ
بھی شک ہے کہ عزیز کی بہن کے ساتھ انٹیلی جنس کا جو ہندو برقعے میں آیا تھا
وہ مجھے جانتا ہے۔ کچھ غلطی مجھ سے بھی ہوئی کہ اُس کے ساتھ زیادہ باتیں

میں نے ہی کی تھیں۔"

"اب بتائیے کرنا کیا ہے؟" ـــــ اُس ممبر نے پوچھا جس نے کہا تھا کہ اُس کی بیوی فیض آباد چلی گئی ہے اور وہ لڑکی کو اپنے گھر رکھ لے گا۔

"تم نے خود ہی کہا ہے کہ خدا ہماری مدد کر رہا ہے؟" ـــــ عبدالقدیر نے کہا ـــــ "خدا کی ذات سے تو ہم کبھی مایوس نہیں ہوتے۔ خدا نے تمہارا گھر خالی کر دیا ہے۔ یہی تو مسئلہ تھا جو حل ہو گیا ہے۔"

"اگر لڑکی کو ہوٹل میں ہی چھوڑنا ہے تو کیا آج رات ہی یہ کام نہیں کیا جا سکتا؟" ـــــ ایک ممبر نے پوچھا۔

"نہیں!" ـــــ عبدالقدیر نے جواب دیا ـــــ "ہر قدم پھونک کر اُٹھانا ہے۔ لڑکی کو جس گاڑی میں ہوٹل سے لایا گیا تھا وہ گاڑی آج رات نہیں مل سکتی۔ شاید کل بھی نہ ملے۔ آپ جانتے ہیں کہ وہ میرے ایک دوست کی گاڑی ہے۔"

سکیم کے باقی پہلوؤں پر غور کر کے فیصلہ کر لیا گیا کہ کیا کرنا ہے۔

ہاشمی اپنے گھر آیا اور اپنی بیوی کو اجلاس کی کارروائی سنائی پھر دونوں رشی کے کمرے میں چلے گئے۔

"راشدہ بیٹی!" ـــــ ہاشمی نے کہا ـــــ "تم نے ہم پر اعتماد کیا ہے۔ ہمیں تم پر اعتبار ہے۔ ہمارے درمیان یہ اعتماد اور اعتبار قائم رہے گا۔ آج رات ہم تمہیں ایک اور جگہ منتقل کر رہے ہیں۔"

"کیوں؟" ـــــ رشی نے قدرے گھبراہٹ کے لہجے میں پوچھا ـــــ "کہاں؟ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں؟"

"وہ ہمارے گھر جیسا ایک گھر ہے" ـــــ ہاشمی نے کہا ـــــ "تمہیں وہاں لے جانے کی ضرورت اس لئے پیش آئی ہے کہ آج عزیز کی بہن یہاں آئی تھی اور اُس کا یہاں آنا بلاوجہ نہیں تھا، پھر جس طرح وہ تمہارے کمرے میں آئی اس سے ہمارا شک پکا ہو گیا ہے کہ وہ تمہیں ہی دیکھنے آئی تھی۔"

"وہ تو مجھے جانتی ہی نہیں" ـــــ رشی نے کہا ـــــ "وہ ایسی لگتی بھی نہیں تھی۔ اُس نے مجھے کب دیکھا تھا کہ وہ عزیز کو بتائے گی کہ یہ وہی لڑکی ہے...؟"

"احتیاط لازمی ہے راشدہ بیٹی" ـــــ ہاشمی نے کہا ـــــ "ہو سکتا ہے کل یا کسی بھی وقت یہاں چھاپہ پڑ جائے۔ ہم تو خطرے میں ہیں ہی، تم بھی خطرے میں ہو۔ جیسا کہ تم بتاتی ہو کہ تم نہیں جانتیں کہ عزیز انڈین انٹیلی جنس کا آدمی ہے اور وہ تمہارے خاوند کو بھی اپنا ایجنٹ بنا چکا ہے۔ اگر تم یہاں پکڑی گئیں تو یہاں کی انٹیلی جنس تمہارے ساتھ بہت بُرا سلوک کرے گی۔ تمہارا مسلمانوں کے ساتھ رہنا تمہارے خلاف شبہ پیدا کرے گا۔ یہاں کا ہر مسلمان یہاں کی پولیس اور انٹیلی جنس کی نظروں میں مشتبہ ہے....

میں تمہیں زیادہ کیا بتاؤں۔ اتنا ہی کہنا کافی سمجھو کہ تمہیں یہاں سے منتقل کر دینا ضروری ہو گیا ہے۔ ڈرنا بالکل نہیں۔ تم جہاں بھی رہو گی، ہماری نظر میں رہو گی۔ آج آدھی رات کے بعد میں خود تمہیں نئی جگہ لے جاؤں گا۔"

رات بارہ بجے کے لگ بھگ عبدالقدیر، ہاشمی کے گھر آیا۔ دروازے پر رُک کر اُس نے گلی میں نظریں دوڑائیں۔ دو بلبوں کی روشنی میں اُسے کوئی مشکوک آدمی نظر نہ آیا بلکہ گلی میں کوئی اور تھا ہی نہیں۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق ہاشمی کے گھر کا دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ عبدالقدیر نے کواڑ کھولا اور ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔ اُس نے اندر والے دروازے پر دستک دی۔ ہاشمی اسی دستک کے انتظار میں تھا۔ اُس نے دروازہ کھولا اور عبدالقدیر کو رشی کے کمرے میں لے گیا۔

فوراً بعد وہ آدمی آ گیا جس کے گھر میں رشی کو لے جانا تھا۔

تقریباً نصف گھنٹہ بعد اس گھر سے تین آدمی نکلے۔ ایک عبدالقدیر، دوسرا اُس کا ساتھی اور تیسرا آدمی پاجامے اور سیاہ اچکن میں ملبوس تھا۔ اُس کے سر پر ٹوپی تھی اور ٹوپی کے اوپر بڑا رومال اس طرح ڈالا ہوا تھا کہ یہ کندھوں پر بھی پھیل گیا تھا۔ اس آدمی نے باہر نکل کر رومال ایک طرف

سے اس طرح دوسرے کندھے پر ڈال لیا کہ اس کا منہ رومال میں چھپ گیا۔

تینوں آدمی چلے گئے۔ وہ پرانی دِلّی کی کئی گلیوں کے موڑ مُڑے اور ایک گھر میں داخل ہو گئے۔ عبدالقدیر نے دروازے کی چٹخنی چڑھا دی۔

یہ پرانے زمانے کا ایک مکان تھا جس کے چار ہی کمرے تھے۔

وہ ایک کمرے میں داخل ہُوئے۔

"اب ٹوپی، اچکن اور پاجامہ اُتار دو" ـــــ عبدالقدیر نے کہا۔

جب ٹوپی، رومال، اچکن اور پاجامہ اُترے تو اُن میں سے ایک لڑکی برآمد ہوئی جس نے زنانہ کپڑے پہن رکھے تھے۔ اُس کے بال کٹے ہوئے تھے اور وہ تھی ہی عورت ـــــ اور یہ عورت رِشی تھی۔

"لو راشدہ بیٹی!" ـــــ عبدالقدیر نے رِشی سے کہا ـــــ "اب تم ایک دو راتیں یہاں رہو گی۔ یہ ہیں ہمارے اپنے ہی عزیز، رفیقی صاحب۔ انہیں تم ہاشمی صاحب جیسا ہی پاؤ گی۔"

"ان کی بیگم تو ہوں گی؟" ـــــ رِشی نے پوچھا۔

"نہیں" ـــــ عبدالقدیر نے جواب دیا ـــــ "وہ تین چار دنوں کے لئے باہر گئی ہوئی ہیں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا سوائے اس کے کہ تم تنہائی محسوس کرو گی۔"

رِشی نے رفیقی کی طرف دیکھا۔ وہ ایک جواں سال اور خوبرو آدمی تھا۔ عمر تیس سال سے ڈیڑھ دو سال زیادہ ہو گی۔ رِشی کے ذہن میں کچھ وسوسے آئے۔ اُس کے چہرے کا تاثر عبدالقدیر نے پڑھ لیا۔

"نہیں نہیں میں راشدہ!" ـــــ عبدالقدیر نے کہا ـــــ "چہرے پر اتنی گہری سنجیدگی طاری نہ کرو۔"

"آرام سے سو جاؤ" ـــــ رفیقی نے رِشی سے کہا ـــــ "اور دروازہ اندر سے بند کر لو۔ میں ساتھ والے کمرے میں ہوں گا۔"

عبدالقدیر اور رفیقی کمرے سے نکل آئے۔ رِشی پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اُس نے دروازے کے کواڑ بند ہوتے دیکھے۔ پھر اُس نے باہر سے کُنڈی

لگنے کی آواز سُنی۔ یہ اندرونی کمرہ تھا جس کی کوئی کھڑکی باہر کی طرف نہیں کھلتی تھی۔

عبدالقدیر، رفیقی کو ایک دو ضروری باتیں سمجھا کر چلا گیا۔ وہ جلدی میں تھا کیونکہ اُسے ہاشمی کے ہاں پہنچنا اور یہ بتانا تھا کہ لڑکی ٹھکانے پر پہنچ گئی ہے۔ خطرہ تھا کہ لڑکی کو جب باہر نکالا جائے گا تو وہ شور مچا دے گی کہ اُسے اغوا کر کے محبوس رکھا گیا ہے۔

عبدالقدیر نے ہاشمی کو یہ اطلاع دی تو ہاشمی نے سکون کا لمبا سانس لیا جیسے وہ بھی اس خطرے کو بُری طرح محسوس کر رہا تھا۔

❦

یہ احتیاطی تدبیر بر وقت اور نہایت کارآمد ثابت ہوئی۔ اگر رِشی کو وہاں سے منتقل نہ کیا جاتا تو بھانڈہ پھوٹ گیا تھا۔ ہاشمی اور اُس کے ساتھیوں کا گرفتار ہونا لازمی تھا۔ انتہائی تکلیف دہ صورت یہ پیدا ہوتی کہ ہاشمی کی بیوی بھی گرفتار ہو جاتی۔

زبیدہ نے اتفاق سے رِشی کو ہاشمی کے گھر میں دیکھ لیا تھا۔ یہ بڑا ہی خطرناک اتفاق تھا۔ زبیدہ یہی تو دیکھنے آئی تھی کہ اس گھر میں باہر کی کوئی لڑکی موجود ہے یا نہیں۔ عزیز نے اُسے رِشی کی کچھ نشانیاں بتائی تھیں۔ وہ زبیدہ نے دیکھیں اور عزیز کو جا کر بتائی تھیں۔ عزیز نے ورما کو بتایا۔

ان دونوں نے مل کر یہ سوچنا شروع کیا کہ اس لڑکی کو کس طرح دیکھا جائے۔

پہلے انہوں نے یہ ترکیب سوچی کہ عزیز کسی درویش فقیر یا عامل کا بہروپ دھار کر جائے، لیکن پکڑے جانے کا ڈر تھا اس لئے یہ بہروپ زیادہ موزوں اور محفوظ لگا کہ ورما بُرقعہ اوڑھ کر جائے۔ اُس کا جسم دُبلا پتلا تھا اور قد بھی زیادہ اونچا نہیں تھا۔ اُس نے بُرقعہ اوڑھ کر دیکھا تو وہ لڑکیوں جیسا ہی لگتا تھا۔

زبیدہ نے ورما کو ساتھ لے جا کر اس کے متعلق جو باتیں ہاشمی کی بیوی کو سنائیں وہ عزیز اور ورما کے فن کا کمال تھا، لیکن خداوند تعالیٰ دوسری طرف تھا۔

ورما پکڑا گیا اور معاملہ پولیس سٹیشن تک جا پہنچا اور نوبت زبیدہ

کی طلاق تک پہنچ گئی۔ ورما پولیس سٹیشن سے بھاگم بھاگ عزیز کے ہاں پہنچا اور اُسے یہ سارا واقعہ سنایا۔ ورما کو یہ معلوم نہیں تھا کہ عزیز کا بہنوئی بھی تھانے پہنچ گیا تھا۔ ورما کی جو پٹائی ہوئی تھی وہ بھی اُس نے سنائی۔

"اس کا انتقام ہم لے لیں گے"۔۔۔ عزیز نے ورما سے کہا۔۔۔ "افسوس یہ ہے کہ ہماری ساری سکیم غارت گئی"۔

"مجھے دو خیال پریشان کر رہے ہیں"۔۔۔ عزیز نے کہا۔۔۔ "ایک یہ کہ لڑکی کہاں گئی۔ تم کہتے ہو کہ تم نے اُس مکان کا کوئی کونہ کھدرا نہیں چھوڑا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ ان کی کوئی رشتہ دار ہی ہو"۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے"۔۔۔ ورما نے کہا۔۔۔ "کہ تمہاری بہن نے جس طرح لڑکی کو دیکھا تھا اس سے اُن لوگوں کو شک ہو گیا۔ وہ کوئی احمق لوگ تو نہیں۔ گھاگ معلوم ہوتے ہیں۔ انہوں نے لڑکی کو اُسی روز کہیں اور غائب کر دیا ہو۔۔۔۔ دوسرا کیا خیال تمہیں آتا ہے؟"

"دوسرا خیال یہ ہے"۔۔۔ عزیز نے کہا۔۔۔ "کہ پولیس ڈیپارٹمنٹ نے ہمارے ہیڈ کوارٹر سے تمہارے اور میرے متعلق تصدیق کرائی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ہمارے باس میجر بھاٹیہ سے پوچھا گیا ہو گا۔ اب سمجھو کہ اُس کا بلاوا آنے والا ہے"۔

"تو اس میں پریشانی کی کون سی بات ہے؟"۔۔۔ ورما نے کہا۔۔۔ "ہم اُسے صاف بتا دیں گے کہ ہمیں شک تھا کہ لڑکی اس گھر میں ہے۔ تم اُسے بتاؤ گے کہ تمہیں شک کیوں ہوا۔ پھر ہم دونوں اُسے بتائیں گے کہ ہم اپنے انتظامات کے تحت شک رفع کرنا چاہتے تھے۔ اگر ہمارا شک صحیح نکلتا تو ہم میجر بھاٹیہ کو اطلاع دیتے۔۔۔۔ یہ کوئی فکر والی بات نہیں۔ مجھے افسوس یہ ہو رہا ہے کہ تمہاری بہن ہمارے کام میں آکر بدنام ہو گئی ہے۔ ہاشمی وغیرہ تو اُسے ذلیل کر کے رکھ دیں گے"۔

"کیا کریں بھائی!"۔۔۔ عزیز نے کہا۔۔۔ "بہن کی عزت کو دیکھیں یا اپنے کام کو؟"

اتنے میں فون کی گھنٹی بجی۔ ورما نے ریسیور اُٹھایا۔ میجر بھاٹیہ بول رہا تھا۔

"ورما بول رہا ہوں سر!"

"اچھا ہوا تم بھی یہیں مل گئے"۔۔۔ بھاٹیہ نے کہا۔۔۔ "عزیز کو ساتھ لے کر فوراً میرے دفتر میں آجاؤ"۔

"ابھی آتے سر!"۔۔۔ ورما نے کہا اور ریسیور رکھ کر عزیز کو بتایا۔۔۔ "چل بھائی، باس کا بلاوا آگیا ہے"۔

دونوں بھاگم بھاگ انٹیلی جنس کے اُس شعبے میں پہنچے جس کے ساتھ عزیز اور ورما کا تعلق تھا اور ایک گھاگ فوجی افسر میجر بھاٹیہ اِس کا انچارج تھا۔ پاکستان میں "را" کے لئے پاکستانی ایجنٹ تیار کرنا اور پاکستان میں انہیں استعمال کرنا اِسی شعبے کا کام تھا۔ رابی کا انٹرویو بھاٹیہ نے ہی لیا اور اس کی برین واشنگ مکمل کر دی تھی۔

"یہ کیا ڈرامہ کھیلا گیا ہے؟"۔۔۔ بھاٹیہ نے پوچھا اور کہنے لگا۔۔۔ "چیف کا فون آیا اور اُس نے پوچھا کہ ورما پولیس سٹیشن کیوں پہنچا ہوا ہے تو میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اُس نے پوچھا کہ عزیز اور ورما کس مشن پر کام کر رہے ہیں تو بھی میں کوئی جواب نہ دے سکا۔ جب چیف نے کہا کہ عزیز کی بہن بھی پولیس سٹیشن میں ہے اور چند ایک مسلمان بھی وہاں کوئی رپورٹ لے کر پہنچے ہوتے ہیں تو میں پریشان ہو گیا"۔

"معافی چاہتے ہیں سر!"۔۔۔ عزیز نے کہا۔۔۔ "یہ رابی کی بیوی رشی کے اغوا کے سلسلے میں تھا"۔

"یہ میں سُنوں گا"۔۔۔ بھاٹیہ نے کہا۔۔۔ "میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ پولیس ہیڈ کوارٹر نے چیف کو فون پر پوچھا تھا کہ ورما اور عزیز انٹیلی جنس کے آدمی ہیں یا نہیں۔ چیف نے مجھ سے پوچھ کر پولیس کو مطمئن

کر دیا لیکن اُس نے مجھے کہا ہے کہ مَیں اُسے پوری رپورٹ دُوں ....
اب بتاؤ یہ کیا معاملہ ہے اور مجھے اِس سے کیوں بے خبر رکھا گیا ہے"۔

"ہم دونوں ہاشمی کو ڈھونڈ رہے ہیں" — عزیز نے جواب دیا اور
نہایت باریک تفصیلات سے بھاٹیہ کو سنایا کہ اُسے اپنی آبادی کے
ایک شخص فریدالدین ہاشمی پر شک تھا کہ اِس لڑکی کے اغوا میں اُس کا
ہاتھ ہے۔ اگر اُس کا ہاتھ نہیں تو اُسے یہ ضرور معلوم ہوگا کہ لڑکی کہاں ہے۔

عزیز نے یہ بھی بتایا کہ اُسے ہاشمی پر کیوں شک پیدا ہُوا۔ اُس
نے اپنے باپ اور اپنی ماں کی باتوں کا حوالہ دیا۔ اُس نے بھاٹیہ کو یہ بھی
بتایا کہ اُس نے اپنے دو قابلِ اعتماد دوستوں کو جو اُسی آبادی میں رہتے
ہیں، مُخبری کے لئے ہاشمی، عبدالقدیر اور اُن سے ملنے جُلنے والے
مسلمانوں کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے پر لگا دیا تھا۔ اُن سے اُسے جو
باتیں معلوم ہوتی تھیں وہ بھاٹیہ کو سُنا کر کہا کہ اِس سے اُس کا شک
مزید پختہ ہو گیا تھا۔ وہ زیادہ زور اس پر دے رہا تھا کہ ہاشمی کو کیسے پتہ
چلا کہ وہ انٹیلی جنس میں ہے اور اُس کی کوٹھی کہاں ہے اور ہاشمی کو یہ بھی
معلوم ہو گیا تھا کہ وہ (عزیز) اشوکا ہوٹل میں ٹھہرا ہُوا تھا۔

عزیز نے بھاٹیہ کو اتنی زیادہ باتیں سنائیں جن سے بھاٹیہ بھی قائل
ہو گیا کہ ہاشمی وغیرہ اُن کے ملزم ہیں یا نہیں، لیکن اُن کے خلاف شک
پیدا کرنے کے لئے اچھی خاصی واقعاتی شہادت موجود ہے۔ بھاٹیہ نے
عبدالقدیر کا نام سُنا تو وہ چونکا اور اُس نے پوچھا کہ یہ وہ عبدالقدیر تو نہیں
جو کچھ عرصہ پہلے ہمارے محکمے سے ریٹائر ہُوا تھا؟ بھاٹیہ کو معلوم تھا کہ
عبدالقدیر کہاں رہتا ہے۔

"یس سر!" — عزیز نے کہا — "یہ وہی عبدالقدیر ہے۔ ورما بھی
اُسے جانتا ہے۔ غالباً قدیر کو معلوم نہیں کہ ہم اُسے جانتے ہیں ..... سر! ہم
نے اگر غلطی کی ہے تو ہم معافی چاہتے ہیں۔ مَیں نے جو باتیں آپ کو بتائی ہیں
یہ ورما کی تھیں۔ ہم دونوں نے بہت غور کیا کہ آپ کو فوراً اطلاع دی جاتے

یا پہلے کچھ دیکھ لیا جاتے۔ ہم نے سوچا کہ اگر آپ کو بتایا تو آپ فوراً چیف
کو اطلاع دیں گے اور چیف کے حکم پر کارروائی ہوگی اور شک غلط نکلا
تو ہمارے ساتھ آپ بھی چیف کے سامنے شرمسار ہوں گے۔ ہم اس فیصلے
پر پہنچے کہ پہلے اپنے طور پر کچھ دیکھ سُن لیا جاتے"۔

"پر تو تم نے اچھا ہی کیا ہے" — میجر بھاٹیہ نے کہا — "اب
مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے کیا کیا تھا اور نوبت تھانے تک کس طرح پہنچی"۔

عزیز نے اُسے تفصیل سے بتایا کہ اُس نے اپنی بڑی بہن کو کس
طرح استعمال کیا تھا۔ یہ بھی سنایا کہ اُس کی بہن نے ہاشمی کے گھر کے ایک
کمرے میں ایک لڑکی دیکھی جس نے دروازہ کھولا اور بند کر لیا۔ پھر یہ سنایا
کہ اُس کی بہن کس اُستادی سے لڑکی کے کمرے میں گئی اور اُس نے لڑکی
کے متعلق کیا باتیں کیں۔

"عزیز یار!" — بھاٹیہ نے ہنستے ہوئے کہا — "تم اپنی اس بہن کو
بھی انٹیلی جنس میں کیوں نہیں لے آتے۔ مَیں اُس کے دماغ کی تعریف
کرتا ہوں"۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں سر!" — عزیز نے کہا — "اگر وہ میری
بیوی ہوتی تو میں اُسے انٹیلی جنس میں لے آتا، لیکن وہ بہن ہے۔ خاوند
اور بچوں والی ہے اور اُس کا خاوند روایتی قسم کا مسلمان ہے۔ وہ اسے
عام سی نوکری بھی نہ کرنے دے، انٹیلی جنس میں وہ کیسے آسکتی ہے؟"

"اس کے بعد کیا ہُوا؟" — بھاٹیہ نے پوچھا۔

عزیز نے اُسے بتایا کہ ورما کے ساتھ سوچ بچار کر کے انہوں نے
یہ فیصلہ کیا کہ ورما برقعے میں وہاں جاتے اور بات نہ کرے۔ عزیز کی بہن کو
یہ بتایا گیا تھا کہ وہ ہاشمی کی بیوی سے کہے کہ اس لڑکی (ورما) کے مُنہ کے
اندر اتنے زخم ہیں کہ یہ بول نہیں سکتی۔ ورما کو یہ بتایا گیا تھا کہ وہ دو چار
لفظ اس طرح بولے جیسے اُس کے حلق سے آواز بڑی مشکل سے نکل
رہی ہو۔

عزیز نے ورما سے کہا کہ میجر بھاٹیہ کو وہ خود سناتے جو ہاشمی کے گھر کے اندر اُس پر بیتی تھی۔ ورما نے سب سُنا ڈالا۔ اُس کی جو پٹائی ہوتی تھی وہ بھی سنائی۔ یہ بھی سنایا کہ اس حویلی کی اُس نے خانہ تلاشی لی۔ بظاہر اُس نے کوئی کونا کھدرا دیکھے بغیر نہیں چھوڑا۔ پھر اُسے اور عزیز کی بہن کو تھانے لے گئے۔ ورما نے بھاٹیہ کو بتایا کہ اُس نے تھانیدار کو بتا دیا کہ وہ انٹیلی جنس سے تعلق رکھتا ہے اور یہ بھی بتایا کہ جس عورت کو تھانے لایا گیا ہے یہ عزیز احمد نام کے ایک آدمی کی بہن ہے اور عزیز احمد بھی انٹیلی جنس کا آدمی ہے۔

"سر!" — ورما نے سارا واقعہ سُنا کر کہا — "اس طرح یہ معاملہ چیف تک اور چیف سے آپ تک پہنچ گیا۔ میں ابھی عزیز کے گھر میں سُنا ہی رہا تھا کہ ہماری یہ چال کس طرح ناکام ہوگئی ہے کہ آپ کا بلاوا آگیا۔ ہم ابھی یہ سوچ ہی نہیں سکے تھے کہ آپ کو کس طرح یا کس وقت یہ ساری بات سنائی جاتے۔"

"اب تمہاری رائے کیا ہے؟" — میجر بھاٹیہ نے ورما سے پوچھا — "کیا لڑکی وہاں ہے یا نہیں یا وہاں تھی اور غائب کر دی گئی یا وہ کوئی اور لڑکی تھی جو اُن لوگوں کی رشتہ دار ہو سکتی ہے؟"

"سر!" — عزیز نے جواب دیا — "میری بہن نے جو نشانیاں بتائی تھیں وہ ہماری ہی لڑکی کی معلوم ہوتی ہیں۔ تین نشانیاں تو بالکل نمایاں تھیں" — عزیز نے اِن نشانیوں کو واضح کیا۔

"میرا خیال ہے تم دونوں کو مزید ٹریننگ کی ضرورت ہے" — بھاٹیہ نے کہا — "لڑکی کو اغوا کیا گیا ہے۔ کیسے کیا گیا ہے، یہ ہم نہیں جانتے اگر لڑکی اسی گھر میں تھی یا ہے تو اُسے باقاعدہ قید میں رکھا گیا ہوگا۔ تمہاری بہن نے تمہیں بتایا تھا کہ لڑکی نے خود دروازہ کھولا اور ہاشمی کی بیوی کے ساتھ تمہاری بہن کے ساتھ بیٹھا دیکھ کر اُس نے دروازہ بند کر لیا۔ پھر تمہاری بہن نے یہ بتایا کہ لڑکی کچھ بولی ہی نہیں۔"

"سر! لڑکی کے نہ بولنے کی ایک اور وجہ بھی ہو سکتی ہے" — ورما نے کہا — "ہو سکتا ہے لڑکی کو کسی انجکشن یا ویسے ہی دوائی سے خاموش اور گم صُم رکھا گیا ہو۔"

"کیا ہاشمی پیشہ ور غنڈہ ہے؟" — بھاٹیہ نے پوچھا — "ہسٹری شیٹر ہے؟ جرائم پیشہ ہے؟"

"نہیں سر!" — عزیز نے جواب دیا — "وہ معزز آدمی ہے۔ معزز تو عبدالقدیر بھی ہے، لیکن اُس نے انٹیلی جنس میں بڑی لمبی سروس کی ہے اور مجھے یہ بھی بتایا گیا تھا کہ اس سے پہلے وہ پولیس میں ہیڈ کانٹیبل رہ چکا ہے اور اس لائن میں اُس کا دماغ بہت ہی تیز ہے۔ آپ اس شخص کی سروس کا ریکارڈ دیکھ سکتے ہیں۔ وہ ہر ڈھنگ کھیل سکتا ہے۔"

"لڑکی کو اگر دوائیوں کے ذریعے خاموش رکھا گیا ہے تو بھی اُس کے کمرے کو کُھلا رکھنا میرے ذہن کے لئے قابلِ قبول نہیں" — میجر بھاٹیہ نے کہا۔

"یہ معلوم کیا جاتے کہ وہ لڑکی جو کوئی بھی تھی، گئی کہاں" — ورما نے کہا — "کسی طرح یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ کیا واقعی آگرہ سے ہاشمی کے ہاں ان کا کوئی عزیز اپنی بیٹی کو لے کر آیا تھا.... سر! میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ پولیس سٹیشن میں ہاشمی نے یہ بیان دیا تھا کہ اُس کے گھر میں کوئی جوان لڑکی نہیں آئی۔ اُس نے مجھے بھی یہی بتایا تھا۔"

"یہ معاملہ بڑا نازک سا ہے" — بھاٹیہ نے کہا — "ان لوگوں یہ مخبر چھوڑے جا سکتے ہیں، لیکن کمزور سے شک پر سوسائٹی کے کسی معزز آدمی کو مشتبہ قرار دے کر شاملِ تفتیش کرنا ٹھیک معلوم نہیں ہوتا۔ یہ بھی سوچو کہ یہ لوگ مسلمان ہیں۔ حکومت کی در پردہ پالیسی مسلمانوں کے متعلق جو کچھ بھی ہو، بظاہر پالیسی یہ ہے کہ مسلمانوں کو خوش رکھا جاتے۔ تم خود جانتے کہ الیکشن آرہے ہیں اور کانگریس (آئی) مسلمانوں کے ووٹ ضائع نہیں کرنا چاہتی۔ اگر شک پختہ ہے تو پھر کوئی کارروائی کی جا سکتی ہے .... میں یہ

بھی کہوں گا کہ تم دونوں نے جلدی بازی سے کام لیا ہے۔ اگر لڑکی وہاں تھی بھی تو اب وہاں نہیں ہوگی۔ ہمیں اتنا اختیار حاصل ہے کہ آدھی رات کے وقت اُس مکان پر چھاپہ مار سکتے ہیں، لیکن حاصل کچھ نہ ہُوا تو مسلمان اسے فرقہ وارانہ مسئلہ بنا لیں گے اور اگر انہوں نے کوئی احتجاجی مظاہرہ کیا تو ہندو مشتعل ہو کر اِس مسئلے کو اور زیادہ پیچیدہ بنا ڈالیں گے۔ پھر ہم سے بازپُرس ہوگی کہ ایسی کارروائی کیوں کی گئی جس کے لئے زمین مضبوط نہیں تھی.... بہرحال مَیں چیف کو فون کر لوں تو ساری صورتِ حال اُسے بتائیں گے۔"

میجر بھاٹیہ نے اپنے محکمے کے چیف کو فون کیا۔ چیف نے ان تینوں کو اُسی وقت بلا لیا۔ یہ ساری رُوداد اُسے سنائی گئی۔ بھاٹیہ نے اپنی رائے دے کر چیف کو اپنا فیصلہ سُنایا۔

"ہاں بھاٹیہ!"— چیف جو ایک ہندو میجر جنرل تھا، کہنے لگا — "میں تمہارے ساتھ اتفاق کرتا ہوں .... اور تم دونوں ....." اُس نے عزیز اور ورما سے کہا — "آئندہ ایسی کوئی کارروائی بھاٹیہ کی منظوری کے بغیر نہ کرنا۔ مَیں تمہاری حوصلہ شکنی نہیں کر رہا۔ تم نے جس لگن سے اپنا فرض ادا کیا ہے وہ یقیناً قابلِ تعریف ہے، لیکن اب خود سوچو کہ جن پر تمہیں شک تھا وہ ہوشیار ہو گئے ہیں اور اگر لڑکی اُن کے پاس تھی تو اب تک معلوم نہیں اُسے کہاں غائب کر دیا گیا ہوگا .... میجر بھاٹیہ! اُس آبادی میں مخبروں کا انتظام کر دو۔ زیادہ تر نظر عبد القدیر پر رکھی جاتے .... اور اُس لڑکے کی کیا رپورٹ ہے؟ .... کیا نام ہے اُس کا؟ .... راہی؟ .... پاکستانی ہپی .... والدین نے رب نواز نام رکھا تھا"— اُس نے طنزیہ مسکراہٹ سے کہا — "پاکستان کے مولوی کہتے ہیں یہ اسلامی ملک ہے۔"

"وہ خوش ہے سر!"— بھاٹیہ نے کہا — "اُس کی کھوپڑی ہمارے قبضے میں ہے۔ اُس کا ویزا ختم ہو گیا تھا۔ ہم نے مزید دنوں کا بندوبست کر لیا ہے۔ وہ خوش ہے۔ اُسے صرف یہ پریشانی ہے کہ اپنی بیوی کے بغیر

واپس گیا تو اپنے والدین اور اپنی سوسائٹی کو کیا جواب دے گا۔ دو مرتبہ خود ہی کہہ چکا ہے کہ لڑکی بدمعاش نکلی، انڈیا میں ایک اینگلو انڈین کے ساتھ دوستی لگا کر انگلینڈ بھاگ گئی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سب اسے سچ مان لیں گے کہ جیسی ماں پتن پتن کی پاپی تھی ویسی بیٹی نکلی۔"

"تم صرف یہ دیکھو کہ لڑکی مخالف کیمپ میں نہ پہنچ گئی ہو"— چیف نے کہا — "اب تم جا سکتے ہو۔"

❦

اُس وقت جب عزیز اور ورما میجر بھاٹیہ کو اپنی کارگزاری سُنا رہے تھے، زبیدہ خاوند کی دھتکاری ہوئی اپنے ماں باپ کے گھر پہنچی۔ اُس کی آنکھیں اور ناک کی سُرخی بتا رہی تھی کہ وہ روتی رہی ہے۔ اُس کا رنگ اُڑا ہُوا تھا۔ اُس کا باپ ادریس احمد کسی کمرے میں تھا۔ زبیدہ اپنی ماں کے پاس جا بیٹھی۔ ماں نے اُس کا چہرہ دیکھتے ہی پوچھا کہ اُسے کیا ہُوا ہے۔

جو ہُوا تھا وہ زبیدہ نے من و عن سُنا دیا۔

"تُو نے اِس بھاتی پر اعتبار کیوں کیا؟"— ماں نے زبیدہ سے پوچھا — "یہ تو وہ موا ہاشمی پہلے ہی تیرے ابا کو بتا چکا ہے کہ عزیز ہندوستان کا جاسوس ہے۔ مَیں نے یہ بات عزیز کو بتا دی۔ اب عزیز ہاشمی کے پیچھے پڑ گیا ہے۔"

"یہ تب مجھے ہاشمی کے گھر میں پتہ چلا کہ عزیز ہندوؤں کا جاسوس ہے"— زبیدہ نے کہا — "سکھ تھانیدار نے مجھ سے پوچھا تھا کہ تم بھی انڈیا کی جاسوس ہو؟ .... عزیز نے مجھے کہا تھا کہ اُس کے ایک پاکستانی دوست کی بیوی لاپتہ ہو گئی ہے اور اُس کا سراغ لگانا ہے۔ مَیں تو بھاتی کے پیار کی خاطر ذلیل ہوئی۔"

"اگر یہ ذِلت اندر خانے رہتی تو کڑوا گھونٹ سمجھ کر حلق سے اُتاری جا سکتی تھی"— ماں نے کہا — "لیکن یہ بات تو کوٹھوں چڑھی اور تھانے بھی چڑھی۔ ہاشمی کے سارے محلے کو یہ واردات معلوم ہوئی اور اب

سارے شہر میں پھیلے گی۔ اللہ ہی جانے کہ ہاشمی اور عزیز کی آپس میں کیا دشمنی ہے۔"

"مجھے بتاؤ امّی!" ——— زبیدہ نے کہا ——— "مَیں کیا کروں، ابّاجان کو پتہ چلا تو...."

"وہ کمرے میں لیٹے ہوتے ہیں" ——— زبیدہ کی ماں نے کہا ——— "آہستہ سے نکل جا اور عزیز کو بتا کہ تُو اُس بہن کو بھی دھوکہ دینے سے نہیں ٹلا جو تجھے ماں سے زیادہ پیار کرتی ہے اور یہ بھی اُسے کہہ کہ مَیں اِس عمر میں طلاق لے کر کہاں جاؤں؛ تیرے باپ کو پتہ چلے گا تو کیا وہ مر نہیں جائے گا؟ اِس بیٹے نے تو ہمیں جیتے جی مار ڈالا ہے۔"

"وہ رہتا کہاں ہے؟" ——— زبیدہ نے پوچھا ——— "اُس نے مجھے اتنا ہی بتایا ہے کہ وہ مکان بنا رہا ہے۔ اُس کا ٹیلی فون نمبر میرے پاس ہے۔ کل پرسوں اُس نے مجھے ایک اور نمبر دیا تھا۔ کہتا تھا کہ دونوں میں سے کسی نمبر پر فون کر لینا۔"

ماں کو ایسے غم میں چھوڑ کر جیسے گھر کا کوئی فرد مر گیا ہو، زبیدہ دبے پاؤں گھر سے نکل گئی۔ اُس کے باپ کو پتہ ہی نہ چلا کہ زبیدہ آئی تھی۔ وہ اپنی ایک ملنے والی کے ہاں گئی۔ وہاں ٹیلی فون موجود تھا۔ اُس نے عزیز کے پہلے دیئے ہوئے نمبر پر فون کیا تو جواب ملا کہ عزیز گھر نہیں ہیں۔ زبیدہ نے پوچھا کہ یہ کونسی جگہ ہے تو اُدھر سے جواب ملا کہ یہ صرف عزیز صاحب بتا سکتے ہیں۔ فون بند ہو گیا۔

زبیدہ کو معلوم نہیں تھا کہ یہ عزیز کی کوٹھی کا نمبر ہے اور جس نے فون اٹھایا تھا وہ رابی تھا۔ عزیز نے رابی کو سختی سے کہہ رکھا تھا کہ اُس کی غیر حاضری میں باہر سے کسی کا بھی فون آئے تو صرف اتنی سی بات کرے کہ عزیز صاحب نہیں ہیں اور فون بند کر دے اور وہ کوٹھی کا ایڈریس کسی کو بھی نہ بتائے۔

زبیدہ نے دوسرے نمبر پر فون کیا۔ یہ میجر بھاٹیہ کا نمبر تھا۔ کہیں سے

فون آتا تو بھاٹیہ کا پی اے سُنتا اور بھاٹیہ سے بات کرواتا تھا۔ زبیدہ نے جب اس نمبر پر فون کیا اُس وقت عزیز اور ورما چیف سے فارغ ہو کر بھاٹیہ کے دفتر میں آ چکے تھے۔ بھاٹیہ کے پی اے نے اُسے بتایا کہ ایک عورت کا فون ہے جس نے اپنا نام زبیدہ بتایا ہے۔ عزیز نے لپک کر ریسیور لے لیا۔

زبیدہ نے عزیز کی آواز سُنتے ہی بولنا شروع کر دیا۔

"مجھے پتہ چل چکا ہے آپا!" ——— عزیز نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ——— "مجھے عبدالرحمٰن سارا واقعہ سُنا چکا ہے۔"

"وہ عبدالرحمٰن نہیں" ——— زبیدہ نے بھڑک کر کہا ——— "وہ کافر ہندو ہے۔ وہ جاسوس ہے اور تم بھی ہندوؤں کے جاسوس ہو۔"

"میری بات سُن لو آپا!" ——— عزیز نے کہا ——— "تمہیں ہو کیا گیا ہے۔ میری تو...."

"تمہاری بلا سے مجھے کیا ہو گیا ہے" ——— زبیدہ نے روتے ہوئے کہا ——— "مجھے طلاق ہو گئی ہے۔ تمہارے بہنوئی (جمیل) کو بھی تھانے میں بلایا گیا تھا۔ سینکڑوں لوگوں نے تماشہ دیکھا۔ میرے خاوند نے سڑک پر کھڑے ہو کے مجھے کہا کہ یہیں سے اپنے ماں باپ کے ہاں چلی جاؤ، طلاق تحریری تمہیں مل جائے گی۔ خاوند نے مجھے اور جو کچھ کہا، وہ کوئی غیرت والا بھائی سُنے تو ڈوب مرے۔"

"پھر تم نے کیا کیا اب؟"

"کرنا کیا تھا!" ——— زبیدہ نے جواب دیا ——— "مَیں گھر گئی۔ ابّاجان اپنے کمرے میں تھے۔ امّی جان کو یہ ساری خرافات سنائی۔ انہوں نے کہا کہ عزیز کو جا کر بتاؤ اور ابّاجان کو ابھی پتہ نہ چلنے دینا۔ مَیں وہاں سے آ گئی اور تمہیں فون کیا.... تم نے مجھے کس گناہ کی سزا دی ہے عزیز! تم جانتے ہو کہ اس گھر کے تم دھتکارے ہوئے آدمی ہو۔ صرف مَیں ہوں جس نے تمہیں گلے لگا رکھا ہے۔ جمیل صاحب کہہ کہہ کر چُپ ہو گئے تھے کہ اپنے اس

بھائی کو اس گھر میں نہ آنے دیا کرو، یہ لڑکا بہت بدنام ہو گیا ہے۔"

"میں سب ٹھیک کر دوں گا آپا!" ــــ عزیز نے کہا۔

"تم خاک ٹھیک کر دو گے" ــــ زبیدہ نے کہا ــــ "تمہارا تو کوئی دین اور مذہب رہا ہی نہیں بےعزت بےعزتی کا تمہیں کوئی احساس نہیں، مجھے بھی تم نے ذلیل کر ڈالا ہے۔"

"آپا زبیدہ!" ــــ عزیز نے کہا ــــ "تمہیں طلاق نہیں ہو گی۔ تم نہیں سمجھ رہیں کہ یہ معاملہ کیا ہے... تم کہاں سے فون کر رہی ہو؟"

"نوشابہ کے گھر سے!" ــــ زبیدہ نے جواب دیا ــــ "تم اسے جانتے ہو۔"

"اس کا فون نمبر مجھے دے دو" ــــ عزیز نے کہا ــــ "اور میرے فون کا انتظار کرو۔"

زبیدہ نے فون نمبر دے دیا۔

❁

عزیز نے ورما کو بتایا کہ اُس کی بہن کو تو طلاق مل رہی ہے۔

"چلو باس سے بات کرتے ہیں" ــــ ورما نے عزیز سے ساری بات سُن کر کہا ــــ "کوئی راستہ نکل آئے گا۔"

دونوں میجر بھاٹیہ کے دفتر میں چلے گئے اور عزیز نے اُسے بتایا کہ اُس کی بہن کو کیا سزا مل رہی ہے۔

"مشکل یہ پیش آگئی ہے سر!" ــــ عزیز نے کہا ــــ "ابھی میرے والد صاحب کو پتہ نہیں چلا۔ انہیں پتہ چلا تو اُن کا ہارٹ بھی فیل ہو سکتا ہے۔"

"یہ تمہاری غلطی ہے" ــــ بھاٹیہ نے کہا ــــ "تمہیں اپنی بہن کو استعمال ہی نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"غلطی تو ہو چکی ہے سر!" ــــ ورما نے کہا ــــ "عزیز نے اور میں نے اپنے ذاتی مفاد کے لئے یہ خطرہ مُول نہیں لیا تھا۔"

"میں نے تو اپنی بڑی بہن کی عزت داؤ پر لگا دی تھی سر!" ــــ

عزیز نے کہا ــــ "اب آپ کوئی مشورہ دیں، کوئی مدد کریں۔"

"تمہارا بہنوئی کیسا آدمی ہے؟" ــــ بھاٹیہ نے پوچھا ــــ "شریف ہے، بدمعاش ہے؟ امیر ہے، غریب ہے؟"

"فوڈ ڈیپارٹمنٹ میں بڑی اچھی پوسٹ پر ہے" ــــ عزیز نے جواب دیا ــــ "اَپر مڈل کلاس کا شریف اور وضع دار آدمی ہے۔"

"بچے ہیں؟"

"ہیں سر!" ــــ عزیز نے جواب دیا ــــ "چار ہیں۔ سب سے بڑا لڑکا ہے۔ عمر پندرہ سولہ سال ہے۔ اس کے بعد دو لڑکیاں ہیں اور ان کے بعد دو اڑھائی سال عمر کا ایک لڑکا ہے۔"

"کیا اس آدمی کے آگے ہتھیار ڈالنے کی بجائے تم اس سے ہتھیار ڈلوا نہیں سکتے؟" ــــ بھاٹیہ نے کہا ــــ "کیا تم اس کا طریقہ نہیں جانتے؟"

"جانتا ہوں سر!" ــــ عزیز نے کہا ــــ "کوئی اور ہوتا تو میں آپ سے مشورہ نہ لیتا۔ وہ میرا بہنوئی ہے۔ اُس پر یہ نسخہ آزمانا اچھا نہیں لگتا۔ کام کوئی مشکل تو نہیں۔"

"یہ نسخہ اچھا نہیں لگتا تو بہن کو طلاق دلوا لو" ــــ بھاٹیہ نے کہا ــــ "اُس کے گھر نہیں جانا چاہتے تو یہیں سے فون پر بات کر لو۔"

"اُس کے گھر فون نہیں ہے" ــــ عزیز نے کہا ــــ "میں اُس کے گھر چلا جاتا ہوں۔"

"عزیز بھائی!" ــــ ورما نے کہا ــــ "میں تمہارے حالات جانتا ہوں۔ اپنے خاندان سے تمہارے تعلقات کبھی کے ختم ہو چکے ہیں۔ تم کوئی نیک نام آدمی بھی نہیں ہو۔ تمہارا باپ تمہاری کوٹھی میں آیا تھا۔ اُس نے وہاں جو کچھ دیکھا اور جس ردعمل کا اظہار کیا اور جس طرح چلا گیا تھا وہ مجھے معلوم ہے۔ صرف یہ بہن ہے جو اب بھی تم سے محبت کرتی ہے اور اُس نے تمہارے کہنے پر اپنی عزت اور اپنی ازدواجی زندگی بھی قربان کر دی ہے۔ تم تو جرأت والے ہو، عقل والے ہو۔ چلو میں تمہارے

ساتھ چلتا ہوں۔"

"تم نہیں!" ــــ بھاٹیہ نے کہا ــــ "تم ہی تو اس کی بہن کے ساتھ تھے اور تمہیں عزیز کے بہنوئی نے پولیس سٹیشن میں دیکھا تھا.... میرا خیال ہے بلراج کو ساتھ لے جاؤ۔ وہ شکل وصورت اور ڈیل ڈول سے بھی غنڈہ لگتا ہے اور باتیں بھی غنڈوں جیسی کرتا ہے۔"

"معافی چاہتا ہوں سر!" ــــ ورما نے کہا ــــ "صرف غنڈہ گردی نہ کی جائے۔"

"وہ میں جانتا ہوں" ــــ عزیز نے کہا ــــ "دوسرا کام میں خود کرلوں گا۔"

"اگر وہ کسی طرح بھی نہ مانے تو مجھے بتانا" ــــ میجر بھاٹیہ نے کہا ــــ "میں اُس کے ڈیپارٹمنٹ سے کہہ کر یہ کام کرا دوں گا... جاؤ بلراج کو ساتھ لے جاؤ۔"

❦

میجر بھاٹیہ کے دفتر سے نکل کر عزیز نے ورما سے کہا کہ وہ بلراج کو بلا لاتے اور خود اُس نے فون کا وہ نمبر ملایا جو اُسے زبیدہ نے دیا تھا۔ زبیدہ اپنی ملنے والی عورت نوشابہ کے گھر عزیز کے فون کے انتظار میں بے تاب ہو رہی تھی۔ آخر فون کی گھنٹی بجی۔ زبیدہ ریسیور پر ٹوٹ پڑی۔

"تم لیسے کر دو آپا!" ــــ عزیز بول رہا تھا ــــ "فوراً اجمیری گیٹ کے باہر پہنچ جاؤ۔ میں آ رہا ہوں۔ ڈرو گھبراؤ نہیں آپا! میں سب ٹھیک کرلوں گا اور تمہاری غلط فہمیاں بھی دُور کر دوں گا۔"

سورج غروب ہو چکا تھا۔ زبیدہ اجمیری گیٹ کے باہر کھڑی عزیز کا انتظار کر رہی تھی۔ اُس کی تو جان پر بنی ہوئی تھی۔ دماغ چکی کی طرح چل رہا تھا۔ ایک دوسری کے پیچھے کتنی سوچیں آئیں، بہت خیال آئے۔ یہ سب سوچیں اور خیال دماغ کی چکی میں پستے گئے۔ زبیدہ کسی بھی فیصلے پر نہ پہنچ سکی۔ اُسے اپنے بچے یاد آ رہے تھے۔ ساتھ یہ خیال پریشان کر رہا تھا کہ گھر میں ہانڈی روٹی کس نے کی ہو گی۔ بڑی لڑکی کی عمر ابھی تیرہ

سال نہیں ہوتی تھی۔ وہ ابھی کھانا پکانا نہیں جانتی تھی۔

یہ سوچ کر اُسے کچھ اطمینان ہُوا کہ اُس کا خاوند ہوٹل سے کھانا لے آتے گا مگر چھوٹا بچہ یاد آیا تو ذرا سا جو اطمینان آیا تھا وہ غائب ہو گیا اور زبیدہ کا دل تڑپنے لگا۔ بچہ رو رہا ہو گا۔ رات سوتے گا نہیں۔

زبیدہ ایک فیصلے پر پہنچ گئی ــــ "عزیز کچھ دیر اور نہ آیا تو اپنے بچوں کے پاس چلی جاؤں گی۔ خاوند کے قدموں میں سر رکھ دوں گی۔"

اِس فیصلے نے اُسے کچھ سکون دیا مگر یہ سکون بھی قائم نہ رہا۔ اُسے ایک قہقہہ سا سنائی دیا۔ یہ اُس کے ضمیر کا قہقہہ تھا۔ زبیدہ اجمیری گیٹ کے اندر جانے والی سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر کھڑی تھی۔ شام گہری ہو چکی تھی۔ لوگوں کا ریلا اُس کے آگے اور پیچھے سے گزر رہا تھا۔ زبیدہ کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے یہ لوگ جو اُس کے قریب سے گزر رہے تھے اُسے جانتے ہوں اور ایک دوسرے کو بتانے جا رہے ہوں کہ یہ عورت ایک شریف خاوند کی بے وفا بیوی ہے۔ خاوند سے جھوٹ بول کر پیسے لیتی اور اپنے آوارہ اور بدمعاش بھائی کو دیتی رہی ہے۔

یہ زبیدہ کا ضمیر تھا جو بول رہا تھا۔ جوانی میں زبیدہ نے بدچلنی سے بھی گریز نہیں کیا تھا۔ اُس کے خاوند نے اُسے تھانے کے باہر کہا تھا کہ وہ اُسے بڑی مشکل سے برداشت کرتا رہا ہے۔

زبیدہ ڈوب ڈوب کر اُبھر رہی تھی۔ اُسے ٹھنڈے پسینے آنے لگے تھے اور غشی کی سی کیفیت طاری ہو رہی تھی کہ ایک ٹیکسی اُس کے سامنے رُکی۔ اس میں سے عزیز نکلا۔

"آؤ آپا!" ــــ عزیز نے کہا ــــ "گاڑی میں بیٹھو۔"

زبیدہ ٹیکسی کی طرف دوڑ پڑی۔ عزیز نے اُسے اگلی سیٹ پر بٹھا کر دروازہ بند کیا اور ٹیکسی ڈرائیور کو بتایا کہ کہاں چلنا ہے۔ وہ خود پچھلی سیٹ پر بیٹھا۔ اُس کے ساتھ ایک اور آدمی تھا۔

❦

جمیل اپنے لئے اور بچوں کے لئے بازار سے کھانا لے آیا تھا۔ بچے
کئی بار پوچھ چکے تھے کہ امی جان کہاں ہیں اور جمیل انہیں بتاتا کہ ان کی امی
اپنی امی کے پاس چلی گئی ہے، کل آجائے گی۔ سب سے چھوٹا بچہ دو اڑھائی
کا تھا اور اس سے بڑی بچی چھ سال کی تھی۔ ان دونوں بچوں نے رو رو کر
اپنا بُرا حال اور باپ کو پاگل کر دیا تھا۔ سب سے بڑا لڑکا جو پندرہ سولہ سال
کا تھا، باپ سے کہہ چکا تھا کہ وہ نانا ابا کے گھر جا کر امی کو بلا لاتا ہے لیکن
جمیل نے اُسے بڑے پیار سے کہا تھا کہ تمہاری امی آجائے گی۔

جب عزیز نے جمیل کے دروازے پر دستک دی اُس وقت تک
بچوں نے جمیل کو ادھ مؤا کر دیا تھا۔ جمیل نے بچوں کی ماں کو طلاق
دینے کا اور بچوں کو اپنے پاس رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا، لیکن شام تک وہ
صرف اس فیصلے پر قائم تھا کہ زبیدہ کو طلاق دے گا۔ بچوں کے متعلق
وہ سوچ میں پڑ گیا تھا۔ اُس نے ایک صورت یہ سوچی تھی کہ انہیں بھی زبیدہ
کے ساتھ بھیج دے اور ماہوار خرچ دے۔ وہ بڑے لڑکے کو اور اس
سے چھوٹی لڑکی کو جو بارہ تیرہ سال کی تھی، اپنے پاس رکھ سکتا تھا۔ دوسری صورت
دوسری شادی تھی اور ایک صورت اُس کے ذہن میں یہ بھی آتی تھی کہ ایسی
نوکرانی رکھ لے جو بچوں کو بھی اور باورچی خانہ بھی گھر کی عورت کی طرح سلیقے
سے سنبھال لے۔

اُسے زبیدہ کے باپ کا انتظار تھا۔ ادریس احمد شریف آدمی تھا۔
جمیل کو توقع تھی کہ زبیدہ اُسے بتائے گی کہ خاوند نے اُسے طلاق دے
دی ہے تو وہ دوڑا آئے گا لیکن رات ہوگئی تھی، وہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔
اس کا مطلب یہ تھا کہ ادریس احمد نے اپنی بیٹی کو مطلقہ کے طور پر قبول کر لیا
تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی تو جمیل سمجھا کہ زبیدہ کا باپ آیا ہے۔ زبیدہ کی
ماں کا ساتھ ہونا بھی متوقع تھا۔

"امی جان آگئیں" ـــــ وہ تین بچوں نے مل کر نعرہ لگایا۔
جمیل دروازہ کھولنے گیا تو دو بچے بھی باپ کے پیچھے چلے گئے۔ دروازہ
کھلا تو ایک بار پھر بچوں نے ـــــ "امی جان!" ـــــ کا نعرہ لگایا۔ باقی بچے بھی

دوڑے گئے۔ انہوں نے پُرمسرت ہنگامہ بپا کر دیا لیکن جمیل کا مزاج برہم
ہوگیا۔ وہ زبیدہ کو دیکھ کر خوش نہ ہُوا۔ اگر زبیدہ اکیلی آتی تو جمیل کا ردِ عمل کچھ
اور ہوتا۔ وہ برہم ہی ہوتا لیکن زبیدہ کے ساتھ عزیز اور ایک اجنبی کو دیکھ
کر جمیل آگ بگولہ ہوگیا۔ اُس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ عزیز اور اُس کے ساتھی
کو خوش آمدید کہنے پر آمادہ نہیں ہو سکے گا۔

چند سیکنڈ اِن کے درمیان خاموشی طاری رہی۔ عزیز جمیل کا ردِ عمل
دیکھنا چاہتا تھا۔ اُس نے جمیل کا چہرہ پڑھ لیا۔ چہرے کے تاثرات ٹھیک
نہیں تھے۔ عزیز نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھ کر
جمیل سے بغلگیر ہوگیا۔

"میرے بھائی جان!" ـــــ عزیز نے جمیل کو اپنے بازوؤں میں
بھینچ کر جذباتی لہجے میں کہا ـــــ "آپ کی تو صورت کو ترس گیا ہوں۔ واللہ
مدّت گزر گئی ہے۔"

اتنی دیر میں زبیدہ اپنے بچوں کے ساتھ اندر چلی گئی تھی۔ یہی عزیز کا
مقصد تھا۔ اُسے ڈر تھا کہ جمیل زبیدہ کو اپنے گھر میں داخل نہیں ہونے دے گا۔

عزیز نے جمیل کو چھوڑا۔ اُس کے ساتھ جو آدمی تھا۔ وہ ہندو تھا اور
اُس کا نام بلراج تھا۔

"بھائی جان!" ـــــ عزیز نے بلراج کی طرف اشارہ کر کے کہا ـــــ
"اِن سے ملیے۔ یہ ہیں میرے دوست، میرے محسن، تابش اجمیری۔ باغ و
بہار شخصیت ہیں۔"

بلراج نے اپنا دایاں ہاتھ اس طرح جمیل کی طرف کیا کہ جمیل کے
نہ چاہتے ہوئے بھی اُس نے جمیل کا ہاتھ پکڑ لیا اور بڑے جوش و خروش
سے مصافحہ کیا۔ جمیل نے ابھی انہیں نہیں کہا تھا کہ آیئے، اندر تشریف رکھئے
عزیز کو غالباً احساس تھا کہ جمیل اُنہیں اندر آنے کے لئے نہیں کہے گا۔
اُس نے جمیل کو ایک بار پھر اپنے ایک بازو کے گھیرے میں لے لیا اور
پیار و محبت کا اظہار کرتے ہوئے اُسے آہستہ آہستہ دھکیلتا دروازے
کے اندر لے گیا۔ بلراج اِن دونوں کو دھکیلتا اُن کے پیچھے مکان میں

داخل ہُوا۔ جمیل آخر شریف آدمی تھا، اُس نے دونوں کو بیٹھنے والے کمرے کی طرف لے جاکر اندر چلنے کو کہا۔

"عزیز میاں!" ___ جمیل نے کہا ___ "میں تمہارے ساتھ الگ بات کرنا چاہتا ہوں۔ تابش اجمیری صاحب سے معذرت چاہوں گا۔"

"تابش صاحب میرے لئے ایسے ہی ہیں جیسے آپ ہیں بھائی جان!" ___ عزیز نے کہا ___ "آپ ان کی موجودگی میں بات کریں۔ مجھے معلوم ہے آپ کیا بات کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں بھی معلوم ہے۔ آپا زبیدہ نے مجھے ساری بات بتادی ہے اور زبیدہ نے جو کچھ کیا ہے وہ میرے کہنے پر کیا ہے اور صرف میں جانتا ہوں کہ یہ سب کیا تھا۔ آپ کا ردِعمل یہی ہونا چاہیئے تھا جس کا اظہار آپ نے کیا ہے۔"

"دیکھو میاں!" ___ جمیل نے کہا ___ "تم بھول گئے ہو کہ زبیدہ تمہاری بہن ہے، لیکن میں نہیں بھول سکتا کہ یہ میری بیوی ہے، میرے بچوں کی ماں ہے۔ تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ زبیدہ نے جو ناٹک کھیلا ہے یا تم نے اسے استعمال کیا ہے، اگر جائز ہے تو بھی اسے چاہیئے تھا کہ مجھے پہلے بتا دیتی۔ میرا خیال ہے کہ تم مجھے یہ یقین دلانے آئے ہو کہ زبیدہ نے جو کیا ٹھیک کیا ہے لیکن اس واقعہ سے جو انکشاف ہوتے ہیں اور پولیس سٹیشن میں پولیس انسپکٹر نے جو باتیں بتائی ہیں وہ کوئی عزت مند مسلمان برداشت نہیں کر سکتا۔"

"یہی تو میں آپ کو بتانے آیا ہوں بھائی جان!"

"تابش صاحب!" ___ جمیل نے عزیز کی بات سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے بلراج سے کہا ___ "معلوم نہیں آپ کو یہ واقعہ پوری طرح معلوم ہے یا نہیں۔ اس شخص نے میری بیوی کو ایک ہندو کے ساتھ ایک باوقار آدمی کے گھر برقعے میں لپیٹ کر بھیج دیا۔"

"جمیل صاحب!" ___ بلراج نے کہا ___ "میں یہ سارا واقعہ جانتا ہوں۔ مَیں عزیز صاحب کے ساتھ اسی لئے آیا ہوں کہ آپ کی غلط فہمی

رفع کی جائے۔ مَیں آپ کو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جسے آپ نے باوقار اور نہ جانے کیا کچھ سمجھ رکھا ہے، وہ اصل میں یعنی اندر سے کچھ اور ہے۔ میں بھی مسلمان ہوں اور الحمدللہ صرف نام کا مسلمان نہیں ہوں بلکہ صحیح معنوں میں مسلمان ہوں۔ آپ کے باوقار دوست جناب عزیدالدین ہاشمی صاحب مسلمانوں کی جڑیں کاٹ رہے ہیں۔ یہ ہم آپ کو دو چار روز بعد بتائیں گے۔ آپ اپنا گھر نہ اُجاڑیں۔"

جمیل عزیز کو اچھی طرح جانتا تھا اور اپنی بیوی کے اخلاق سے بھی اچھی طرح واقف تھا۔ ہاشمی کو تو وہ بہت ہی اچھی طرح جانتا تھا۔ پھر اُس نے تھانے میں سکھ تھانیدار کی باتیں سُنی تھیں اور پھر اتنی بڑی واردات کو تھانے میں ہی رفع دفع ہوتے دیکھا تھا۔ وہ تسلیم نہیں کر سکتا تھا کہ عزیز اور اُس کا ساتھی تابش اجمیری جو دراصل بلراج نام کا ہندو تھا، سچ کہہ رہے ہیں۔

"کیوں عزیز!" ___ جمیل نے پوچھا ___ "تم مجھے کس طرح یقین دلا سکتے ہو کہ جو کچھ ہُوا ہے یہ جائز تھا اور یہ یہاں کے مسلمانوں کے حق میں ہُوا ہے۔ میں شاید تمہاری کسی بھی بات پر اعتبار نہیں کر سکوں گا۔"

"آپ کچھ روز انتظار کریں بھائی جان!" ___ عزیز نے کہا۔

"پھر یوں کرو" ___ جمیل نے کہا ___ "کچھ دنوں کے لئے اپنی بہن کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ جب مجھے یقین دلا دو گے کہ یہ واردات کسی بڑے اچھے مقصد کے لئے کی گئی تھی تو....."

یہاں سے عزیز اور جمیل کے درمیان تلخ کلامی شروع ہو گئی۔ عزیز نے زبان کا جادو چلانے کی بہت کوشش کی لیکن جمیل پر اس کا کچھ اثر نہ ہُوا۔ جمیل جانتا تھا کہ چرب زبانی ہی عزیز کا اصل کمال ہے جس سے وہ پتھر سے بھی دُودھ نکال سکتا ہے۔ جمیل نے اپنا آخری فیصلہ سنا دیا۔

"اپنی بہن کو یہاں سے لے جاؤ" ___ جمیل نے عزیز سے کہا ___ "جس روز مجھے یقین دلا دو گے کہ تم انڈیا کے جاسوس نہیں ہو اُس روز میں خود جاکر والد صاحب سے معافی مانگوں گا اور تمہاری بہن کو لے آؤں گا اور

تم سے بھی معافی مانگوں گا۔"

"جمیل صاحب!" — بلراج نے کہا — "آپ عزیز کو قابلِ اعتماد آدمی نہیں سمجھتے تو مجھے بھی شریف آدمی نہ سمجھیں۔ مَیں آپ سے سیدھی بات کروں گا۔ عزیز کی بہن کو اپنے گھر میں رہنے دیں۔ اگر آپ نے ہماری بات نہ مانی تو آپ کو ایسا نقصان پہنچے گا جس کی تلافی نہیں ہو سکے گی۔"

"بھائی جان!" — عزیز نے کہا — "یہ میری شرافت ہے کہ میں آپ کو ابھی تک بھائی جان کہہ رہا ہوں۔ آپ مجھے انڈیا کا جاسوس کہہ رہے ہیں۔ اس کو سچ سمجھیں اور سوچیں کہ جو شخص انڈین انٹیلی جنس میں ہے وہ کیا کچھ کر سکتا ہے۔"

"یہ مت بھُولو جمیل بھائی!" — بلراج نے کہا — "کہ تم مسلمان ہو اور یہاں کی حکومت کو مسلمان کے خلاف براتے نام بہانہ چاہیئے۔ آپ جس محکمے میں ہیں اُس محکمے سے آپ کو بڑی آسانی سے نکلوایا جا سکتا ہے۔ اگر آپ پھر بھی اپنے فیصلے سے باز نہیں آئیں گے تو آپ کا چھوٹا یا بڑا بیٹا اغوا ہو سکتا ہے۔"

"یہ کیا بکواس ہے عزیز!" — جمیل نے سخت غصیلی آواز میں کہا — "تم دونوں مجھے ڈرانے دھمکانے کے لئے آئے ہو؟"

"ہاں بھائی جان!" — عزیز نے مسکراتے ہوئے کہا اور اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اُس نے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا — "لاتوں کے بھُوت باتوں سے نہیں مانا کرتے۔"

عزیز کا ہاتھ جب اُس کی پتلون کی جیب سے نکلا تو اُس کے ہاتھ میں ویسا ہی پستول تھا جو ورما سے ہاشمی کے گھر میں چھینا گیا تھا۔ بلراج بھی اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اُس کے ہاتھ میں خنجر تھا۔

جمیل نے اتنی قریب سے نہ کبھی پستول دیکھا تھا نہ خنجر اور کبھی اس صورتِ حال سے بھی دوچار نہیں ہُوا تھا جو عزیز اور بلراج نے اس کے لئے پیدا کر دی تھی۔ ایک طرف سے میگزین والا پستول اور دوسری طرف سے خنجر اُس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جمیل پر سکتے کی سی کیفیت طاری

ہو گئی۔ اُس میں اتنی ہمت بھی نہ رہی کہ اُٹھ کھڑا ہوتا۔

"آپا زبیدہ یہیں رہے گی" — عزیز نے آنکھیں اُس کی آنکھوں میں ڈال کر اور پستول کی نالی اُس کے مُنہ کے قریب کر کے کہا — "اور آپ اُس سے کچھ نہیں پوچھیں گے ورنہ آپ کا انجام بڑا ہی بھیانک ہو گا۔"

"وعدہ کریں کہ ہماری بات پر عمل ہو گا" — بلراج نے خنجر کی نوک جمیل کی گردن کے ساتھ لگا کر کہا۔

جمیل نے وعدہ کیا کہ ایسے ہی ہو گا جیسے اُنہوں نے کہا ہے۔ عزیز اور بلراج کمرے سے نکل گئے۔

عزیز اور بلراج کمرے سے نکل گئے۔ جمیل کی ذہنی حالت ایسی ہوگئی جیسے اُن دونوں کے ساتھ جمیل کی رُوح بھی نکل گئی ہو۔ اُس پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ آنکھیں ٹھہر گئی تھیں۔ اُس میں صرف اتنی سی ہمت رہ گئی تھی کہ اُٹھ کھڑا ہُوا تھا۔ اس سے آگے وہ کوئی حرکت نہ کرسکا تھا۔ ساتھ والے کمرے میں بچوں نے ہنگامہ بپا کر رکھا تھا۔ اُن کی ماں سارا دن گھر سے غیر حاضر رہی تھی۔ وہ ماں کے آنے کی خوشی میں اودھم مچا رہے تھے۔ باپ کو وہ بھُول گئے۔

بچوں کا شور و غل جمیل کے کانوں سے ٹکرا رہا تھا، لیکن ایسے جیسے طوفانی ہوائیں کسی چٹان سے ٹکرا رہی ہوں۔ جمیل بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ اُس کے ساتھ جو سلوک ہُوا وہ غیر متوقع تھا۔ اس نے تو بڑی جرأت سے فیصلہ کیا تھا کہ زبیدہ کو طلاق دے دے گا اور کسی قیمت پر اُسے واپس نہیں لائے گا۔ اُسے عزیز احمد کے متعلق کوئی خوش فہمی نہیں تھی لیکن اُسے یہ توقع بھی نہیں تھی کہ عزیز اُس کے ساتھ ایسی غنڈہ گردی کرے گا جو وہ کر گیا تھا۔

جمیل کو وقت کا احساس نہ تھا۔ اُس کے لئے وقت پر بھی سکتہ طاری ہوگیا تھا۔ ایک دوسرے کے پیچھے گزرتے لمحے اُسی مقام پر رُک گئے تھے جہاں جمیل کھڑا تھا۔

کم و بیش ایک گھنٹہ گزر گیا۔

ساتھ والے کمرے میں بچوں کا ہنگامہ ختم گیا تھا۔ وہ باپ کو تو جیسے بھُول ہی گئے تھے لیکن زبیدہ ان کے باپ کو نہیں بھُولی تھی۔ اُس کا دھیان اُس کمرے کی طرف تھا جس میں جمیل کھڑا تھا۔ زبیدہ کو معلوم نہ تھا کہ جمیل کھڑا ہے، بیٹھا ہے یا کس حالت میں ہے۔ وہ فوراً معلوم کرنے کو بے تاب

ہو رہی تھی کہ اُس کے بھائی عزیز نے اُس کے خاوند جمیل کو راضی کر لیا ہے یا جمیل ابھی تک طلاق کے فیصلے پر ڈٹا ہُوا ہے۔ زبیدہ یہ سوچ سوچ کر بھی پریشان ہو رہی تھی کہ اُس کے بھائی اور خاوند کی لڑائی نہ ہو جاتے۔ اُسے جب خیال آتا تھا کہ اُس کا خاوند شریف آدمی ہے اور عزیز کا شرافت کے ساتھ دُور پار کا بھی تعلق نہیں تو وہ اور زیادہ پریشان ہو جاتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ عزیز اکھڑ طبیعت کا آدمی ہے، اگر جمیل نے اُس کی بات کو رَدّ کر دیا تو عزیز بدتمیزی پر اُتر آئے گا۔

زبیدہ بچوں سے پریشانی اور اضطراب چھپا رہی تھی اور بچوں کو سُلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

اُسے جب خیال آتا تھا کہ عزیز نے اُسے دھوکہ دے کر کتنا ذلیل کیا ہے کہ اُسے تھانے تک پہنچا دیا ہے تو اُس کا جی چاہتا تھا کہ چیخ چیخ کر روتے اور عزیز کو چوک میں کھڑا کر کے جُوتے مارے۔ عزیز نے یہ بھی نہ سوچا تھا کہ اُس کی بہن کو دو چار دنوں کے لئے حوالات میں بند کیا جا سکتا تھا۔ اُسے جیل کی حوالات میں بھی بھیجا جا سکتا تھا۔

زبیدہ پر سب سے بڑی چوٹ تو یہ پڑی تھی کہ اُس کے خاوند نے اُسے دھتکار دیا تھا اور معلوم نہ تھا کہ اُسے قبول کرے گا یا نہیں۔ وہ بظاہر بچوں میں دلچسپی لے رہی تھی لیکن اندر سے وہ بڑی بُری کشمکش میں مبتلا تھی۔

ایک گھنٹہ گزر گیا تو وہ اُس دروازے کے ساتھ جا کھڑی ہوتی جو ساتھ والے کمرے میں کھُلتا تھا۔ چھوٹے بچے سو گئے تھے۔ ساتھ والے کمرے میں خاموشی تھی۔ ایک آدھ منٹ بعد زبیدہ نے نہایت آہستہ سے ایک کواڑ کھولا اور کمرے میں جھانکا۔ اُسے جمیل اکیلا کھڑا نظر آیا۔ اُس کے کھڑا ہونے کا انداز اور چہرے کا تاثر زبیدہ کے لئے نیا اور عجیب تھا۔ زبیدہ نے جمیل کے ساتھ بائیس تئیس سال گزارے تھے۔ اُس نے جمیل کو اس طرح کھڑے اور چہرے پر یہ تاثر لئے ہوتے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

زبیدہ کو ایک خیال یہ آیا کہ عزیز اُسے ملے بغیر چلا گیا ہے۔

وہ کواڑ کو ذرا سا اور کھول کر اس کمرے میں آگئی اور آہستہ آہستہ جمیل تک پہنچی۔ جمیل یوں کھڑا رہا جیسے پتھر کا بُت ہو۔

زبیدہ نے اُس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

جمیل نے کوئی حرکت نہ کی۔

زبیدہ نے اُسے آہستہ سے جھنجھوڑا۔ جمیل نے بڑی آہستہ آہستہ گردن گھمائی اور زبیدہ کو دیکھا۔ اُس کے چہرے کے تاثر میں کچھ ایسی تبدیلی آئی جیسے وہ زبیدہ کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ زبیدہ اُسے دیکھ کر پریشان ہوگئی۔ پریشان تو وہ پہلے ہی تھی لیکن جمیل کو اس کیفیت میں دیکھ کر اُس کی پریشانی میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیا۔ اگر حالات نارمل ہوتے، زبیدہ سے یہ حرکت سرزد نہ ہوئی ہوتی جو وہ عزیز کے کہنے پر کر بیٹھی تھی تو جمیل کو وہ اپنے بازوؤں میں لے کر بٹھا دیتی یا اُسے پلنگ پر لٹا دیتی اور اُس سے پوچھتی کہ اُسے کیا ہوا ہے لیکن زبیدہ کے ضمیر پر ایک بڑے ہی گھناؤنے جرم کا بوجھ تھا۔ وہ جمیل کا سامنا کرنے سے ڈر رہی تھی۔ اگر عزیز اُس کے ساتھ نہ آتا تو بھی وہ اس گھر میں داخل ہونے کی جرأت نہ کرتی حالانکہ یہ اُس کا اپنا گھر تھا، پھر بھی جمیل کی یہ حالت اُس سے دیکھی نہ گئی۔ وہ اتنا ہی سمجھ سکی کہ عزیز اس کے ساتھ بہت بُرا سلوک کر گیا ہے۔

جمیل کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں سرخی تھی اور آنکھوں میں خمار سا بھی تھا۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ وہاں نہیں جہاں کھڑا ہے۔ یہ خود فراموشی کی کیفیت تھی۔

زبیدہ نے اُس کے دونوں کندھوں پر اپنے ہاتھ رکھ کر آہستہ سے اُسے اُس صوفے پر بٹھا دیا جس کے ساتھ وہ کھڑا تھا۔

"کیا ہوا؟" — زبیدہ نے اُس پر جھک کر سرگوشی میں پوچھا۔

جمیل نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ زبیدہ کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے اُسے دیکھتا رہا۔

"کیا عزیز کوئی بدتمیزی کر گیا ہے؟" — زبیدہ نے پوچھا۔

"عزیز؟ ..... وہ ..... تمہارا بھائی!" — جمیل اس طرح بول رہا تھا جیسے زبان اُس کا ساتھ نہ دے رہی ہو۔ اُس نے کچھ اور کہنے کی کوشش کی لیکن اتنا ہی کہہ سکا — "وہ تمہارا بھائی نہیں ہو سکتا۔"

"یہ میری غلطی تھی کہ میں اُسے اپنا بھائی سمجھتی رہی" — زبیدہ نے کہا اور اس کے ساتھ ہی اُس کے آنسو نکل آئے۔ اُس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا — "مجھے اتنی سی اجازت دے دیں کہ میں آپ سے معافی مانگ لوں۔ میں نے آپ کو ہمیشہ پریشان رکھا ہے" — زبیدہ جمیل کے پاؤں میں بیٹھ گئی اور اپنے دونوں ہاتھ اُس کے پاؤں پر رکھ کر کہا — "میں نے آج سے عزیز کو اپنا بھائی سمجھنا چھوڑ دیا ہے۔ مجھے بات کرنے کی مہلت دیں۔ میں آپ کے تمام گلے شکوے دھو ڈالوں گی۔"

جمیل پر جو کیفیت طاری تھی، اُس میں ذرا سی بھی تبدیلی نہ آئی۔ وہ کبھی زبیدہ کو دیکھتا اور کبھی خلا میں گھورنے لگتا تھا۔

"بچے کہاں ہیں؟" — جمیل نے سرگوشی میں پوچھا۔ اُس کا انداز ایسا تھا جیسے خواب میں بڑبڑا رہا ہو۔ کہنے لگا — "میرے بچے کہاں ہیں؟"

"یہیں ہیں" — زبیدہ نے ذرا جاندار آواز میں کہا — "چھوٹے بچے سو گئے ہیں۔ بڑے بھی سونے والے ہیں۔"

جمیل یکلخت بیدار ہوگیا جیسے اُسے کوئی خطرہ نظر آ رہا ہو۔ اُس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ ایک کواڑ ذرا سا کھلا ہوا تھا۔ عزیز اور بلراج اسی دروازے سے نکل کر گئے تھے۔ اچانک جمیل اُٹھا اور دوڑ کر دروازہ بند کیا اور دونوں کواڑوں کی چٹخنیاں چڑھا دیں۔ پھر دروازے کے ساتھ پیٹھ لگا کر وہیں کھڑا رہا۔ زبیدہ نے جمیل کی یہ حرکت دیکھی تو اُس پر خوف وہراس جیسی کیفیت طاری ہوگئی۔ اُسے اب پتہ چلا کہ اُس کے خاوند کی ذہنی حالت صحیح نہیں۔ حقیقت بھی یہی تھی۔ عزیز اور بلراج اُسے جو دھمکی پستول اور خنجر دکھا کر دے گئے تھے وہ اس کے اعصاب برداشت نہیں کر سکے تھے۔

زبیدہ اُٹھی اور آہستہ آہستہ چلتی جمیل تک پہنچی۔

"کیا ہو گیا ہے آپ کو؟" — زبیدہ نے اُس سے پوچھا — "کیا آپ میری کوئی بات نہیں سُن رہے؟"

حقیقت یہی تھی کہ جمیل پر ایسی کیفیت طاری تھی کہ زبیدہ کی باتیں اُس کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں مگر وہ سُن نہیں رہا تھا۔ یہ غصے، دہشت زدگی اور بے بسی کی انتہا تھی جس نے جمیل کے دماغ کو ماؤف کر دیا تھا۔ ایک تو وہ پستول اور خنجر کے درمیان بے بس ہو گیا تھا اور دوسری وہ بے بسی تھی جو بھارت کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھ دی گئی تھی۔ جمیل کو معلوم نہیں تھا کہ عزیز کے ساتھ جو آدمی تھا وہ ہندو تھا یا مسلمان۔ عزیز نے اُس کا تعارف تابش اجمیری کے نام سے کرایا تھا لیکن یہ نام غلط بھی ہو سکتا تھا۔

جمیل نے جب عزیز کے پستول اور بلراج کے خنجر کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا تھا تو اُسے پہلا خیال یہ آیا تھا کہ اس ملک میں مسلمان کتنا بے بس ہے۔ عزیز اور بلراج اس لئے شیر ہو گئے تھے کہ وہ انڈین انٹیلی جنس میں تھے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر اور سوچ کر اُس کے ذہن میں ایک دھماکہ سا ہوا تھا پھر اُس نے یوں محسوس کیا تھا جیسے وہ ریزہ ریزہ ہو گیا ہو اور پھر اُس پر یہ کیفیت طاری ہو گئی جو زبیدہ کے لئے ناقابلِ فہم اور پریشان کُن تھی۔

زبیدہ جمیل کو بازو سے پکڑ کر صوفے کی طرف چلی تو جمیل ہپناٹائز کئے ہوتے آدمی کی طرح اُس کے ساتھ چل پڑا۔ زبیدہ نے اُسے لمبے صوفے پر بٹھایا اور اُس کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔

"مجھے کچھ بتائیں" — زبیدہ نے اُس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا — "خدا کے لئے کچھ بتائیں"۔

"وہ .... وہ کہتے ہیں ...."

"کیا کہتے ہیں وہ؟" — زبیدہ نے جمیل کو اُسی کیفیت میں دیکھا تو جھنجھلا کر پوچھا — "وہ کیا کہہ گئے ہیں؟" — زبیدہ کی اپنی جذباتی حالت بگڑ گئی۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے سر پر مارے اور روتے ہوئے بولی — "او میرے خدا! میرے گناہ معاف کرنا۔ یہ سزا مجھ سے برداشت

نہیں ہو گی"۔

اس دو ہتڑ کے دھماکے سے جو زبیدہ نے اپنے سر پہ مارا تھا، جمیل بیدار ہو گیا۔ وہ چونک پڑا۔ اُس نے زبیدہ کی طرف دیکھا اور اُسے دیکھتے ہوتے آہستہ آہستہ اُٹھا۔

"میری آستین میں پلنے والی ناگن!" — اُس نے زبیدہ سے کہا — "اپنے بچوں کو کھانے والی ...."

"مجھے کوئی اور سزا دے لیں" — زبیدہ نے روتے ہوئے کہا — "میں آپ کے ہاتھ سے زہر پی لوں گی۔ اپنی زبان پر ایسی باتیں نہ لائیں۔ میں اپنے بچوں کو اپنی جان دے دوں گی"۔

"اگر تم انہیں اپنے بچے سمجھتی ہو تو سنو" — جمیل نے کہا — "تمہارا بھائی مجھے دھمکی دے گیا ہے کہ میں نے تمہیں طلاق دی تو وہ میرے چھوٹے یا بڑے بچے کو اغوا کر لے گا .... کیا یہ تمہارے بچے نہیں ہیں؟ کیا یہ تمہارا بھائی ہے؟"

"کیا اُس نے آپ کو یہ دھمکی دی ہے؟" — زبیدہ نے غم و غصے کے لہجے میں پوچھا۔

"اُس نے یہ دھمکی مجھے پستول دکھا کر دی تھی" — جمیل نے کہا — "اُس کے ساتھ جو آدمی آیا تھا اُس نے خنجر نکال لیا تھا" — اُس نے آہ بھری اور بولا — "میں کتنا مجبور ہوں" — اُس نے ہاتھ زبیدہ کے مُنہ کی طرف کر کے گرج کر کہا — "مجھے مجبور تم نے بنایا ہے۔ میری عزت اور شرافت کو تھانے میں جا کر خراب کیا ہے"۔

"آپ نے شاید میری بات نہیں سُنی" — زبیدہ نے کہا — "آپ نے دھیان نہیں دیا۔ میں نے کہا تھا کہ آج سے میں نے عزیز کو بھائی سمجھنا چھوڑ دیا ہے"۔

"فتح تمہاری ہے" — جمیل نے کہا — "یہ کلجگ ہے۔ یہ بدی کی فتح کا زمانہ ہے۔ یہ اپنا دین اور ایمان بیچنے والوں اور بہنوں کی عزت

کے ساتھ کھیلنے والوں کا زمانہ ہے..... مَیں تمہیں طلاق نہیں دے سکتا۔ دُوں گا تو تمہارا بھائی مجھے بہت بُرے انجام تک پہنچاتے گا، لیکن زبیدہ! مجھے کوئی مجبور نہیں کر سکتا کہ اپنے دل میں تمہاری محبت پیدا کروں۔"

"وہ میں خود پیدا کر لوں گی" ___ زبیدہ نے کہا ___ "اب اپنے بھائی کے ساتھ مَیں جو سلوک کروں گی وہ آپ خود دیکھیں گے۔ مَیں آپ سے صرف یہ عرض کرتی ہوں کہ ایک بار سُن لیں کہ مجھ سے اتنا بڑا جرم میرے اپنے بھائی نے کس طرح کروایا ہے۔"

جمیل خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا۔

"آپ مجھ پر اعتبار کریں نہ کریں، مَیں آپ کو مجبور نہیں کر سکتی" ___ زبیدہ نے جمیل کے جواب کا انتظار کئے بغیر کہا ___ "عزیز نے مجھے بتایا تھا کہ اُس کا ایک دوست اپنی بیوی کے ساتھ آیا ہُوا ہے اور یہ نوجوان جوڑا ہے۔ لڑکی لاپتہ ہو گئی ہے اور سراغ ملا ہے کہ وہ ہاشمی کے گھر میں ہے۔ عزیز نے مجھے کہا کہ وہ اپنے ایک دوست کو جس کا نام عبدالرحمٰن ہے، میرے ساتھ ہاشمی کے گھر بھیجے گا۔ وہ لڑکی کو پہچانتا تھا لیکن پہلے ہاشمی کے گھر مجھے اکیلے جانا تھا۔"

"یہ روئیداد میں پہلے سُن چکا ہوں" ___ جمیل نے کہا ___ "میں حیران ہوں کہ تم نے یہ بھی نہ سوچا کہ فریدالدین ہاشمی شریف اور صاحبِ حیثیت ہیں، بزرگ ہیں اور وہ اس قماش کے آدمی نہیں کہ اغوا کی ہوئی کسی لڑکی کو اپنے گھر میں رکھیں۔ میں جانتا ہوں کہ تم نے اپنے بھائی کی محبت میں اندھی ہو کر یہ حرکت کی ہے لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ تم ذِلّت کی حد میں پھلانگ بھی سکتی ہو۔"

"مَیں آپ کو کیسے یقین دلاؤں کہ مجھے دو باتوں کا ذرا سا بھی علم نہیں تھا" ___ زبیدہ نے کہا ___ "ایک یہ کہ عزیز ہندوستان کا جاسوس ہے اور دوسری بات یہ کہ اُس نے میرے ساتھ ہاشمی کے گھر جس آدمی کو بھیجا تھا وہ ہندو ہے۔"

جمیل زبیدہ کی کوئی بات سننے کے لئے تیار نہ تھا لیکن بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔ زبیدہ اب اپنی پوزیشن جن الفاظ میں واضح کر رہی تھی وہ اُس کے دل کی گہرائیوں سے نکل رہے تھے۔ اُس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو گواہی دے رہے تھے کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے خلوصِ نیّت سے کہہ رہی ہے۔

"تم اپنے بھائی سے قطع تعلق تو نہیں کر سکتیں" ___ جمیل نے کہا ___ "تم اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔"

"میرا کوئی بھائی نہیں" ___ زبیدہ نے کہا ___ "مَیں نے دل کو سمجھا لیا ہے کہ میرا بھائی مر گیا ہے..... مَیں صرف ایک بار اُسے ملوں گی۔ آپ ساتھ ہوں گے۔ اگر وہ یہاں آ گیا تو آپ کے سامنے بات کروں گی پھر اُس کی کبھی صورت بھی نہیں دیکھوں گی۔"

جمیل پر زبیدہ کی باتوں نے اثر کیا اور اُس نے زبیدہ سے علیحدگی کا فیصلہ منسوخ کر دیا لیکن اُس پر عزیز اور بلراج جو اثرات مرتب کر گئے تھے، انہوں نے بھی بہت کام کیا تھا۔ وہ اپنے فیصلے میں آزاد نہیں رہا تھا۔

اُسی رات اور اُسی وقت ہاشمی اور عبدالقدیر اُس گھر میں بیٹھے تھے جس گھر میں رشی کو رکھا گیا تھا۔ یہ حسن طارق رفیقی کا گھر تھا۔ وہ محاذ کا ممبر تھا۔

"راشدہ!" ___ ہاشمی نے رشی سے کہا ___ "تمہیں یہاں سے جانا پڑے گا۔"

"کہاں؟"

"اشو کا ہوٹل!" ___ ہاشمی نے کہا ___ "حالات ایسے ہو گئے ہیں کہ ہم تمہاری یہ خواہش پوری نہیں کر سکتے کہ تمہیں یہیں رکھا جاتے۔"

"کیا آپ مجھے سیدھا پاکستان نہیں پہنچا سکتے؟"

"چوری چھپے اور خفیہ طریقے سے پہنچا سکتے ہیں" ___ عبدالقدیر نے

جواب دیا — "لیکن اس میں خطرہ ہے۔ اگر تم پکڑی گئیں تو تمہیں گرفتار کر کے جیل بھجوا دیا جائے گا۔ دو خطرے تمہارے ساتھ پہلے ہی ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ تم خوبصورت اور نوجوان ہو اور دوسرا خطرہ یہ کہ تم مسلمان ہو۔ تمہیں یہاں کی انٹیلی جنس کے حوالے کر دیا جائے گا۔ تم پر پہلا الزام یہ ہوگا کہ تم پاکستان کی جاسوس ہو۔ تمہارے ساتھ بہت بُرا سلوک ہوگا۔ بہتر ہے کہ اپنے خاوند کے پاس چلی جاؤ۔ پاکستان کو جانے کا یہی ایک ذریعہ ہے۔"

"میں اُسے کیا بتاؤں گی میں کہاں رہی ہوں؟"

"کیا تم ہماری نشاندہی نہیں کرنا چاہو گی؟" — عبدالقدیر نے پوچھا — "کیا اپنے خاوند اور پولیس کو نہیں بتاؤ گی کہ تمہیں کس طرح اغوا کیا گیا تھا؟"

"نہیں!" — رشی نے بغیر سوچے جواب دیا۔

"کیوں؟"

"میں آپ کے احسان کا بدلہ اسی طرح چکا سکتی ہوں" — رشی نے کہا — "مجھے تو کسی اور ہی سلوک کی توقع تھی لیکن آپ سب نے ..."

عبدالقدیر ایسا کچا آدمی نہیں تھا کہ رشی کی باتوں میں آجاتا۔ اُسے، ہاشمی اور رفیقی کو رشی کے خراجِ تحسین کی ضرورت نہیں تھی۔ رشی نے رہائی کے لئے ان لوگوں کی خوشامد ہی کرنی تھی۔ انہیں فرشتہ ثابت کرنا تھا۔ اُس کی یہ باتیں خلوص کی حامل بھی ہو سکتی تھیں لیکن اب مسئلہ اور معاملہ ہی کچھ اور ہو گیا تھا۔ اس لڑکی کو اب وہاں نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ اُسے رہا کرنے کا خطرہ مول لینا ہی تھا۔

ہاشمی اور عبدالقدیر کا ایک دوست ایڈووکیٹ تھا۔ وہ اِن کا ہم خیال ہی نہیں بلکہ ان کے محاذ سے بھی واقف تھا۔ محاذ کا وہ باقاعدہ ممبر تو نہیں بنا تھا، لیکن محاذ کو اس کا ہر طرح کا تعاون حاصل تھا۔ اُسے بتا دیا گیا کہ ایک پاکستانی لڑکی کو اغوا کیا گیا ہے۔ اُس نے اِس خطرناک اقدام کو پسند نہیں کیا تھا۔ وہ احتیاط اور دور اندیشی کا قائل تھا۔ بہرحال اُس نے انہیں کچھ ہدایات

دی تھیں۔

اب رشی کو رہا کرنے کا وقت آیا تو ہاشمی اور عبدالقدیر اس ایڈووکیٹ کے ہاں گئے اور اُسے بتایا کہ لڑکی کو رہا کیا جا رہا ہے۔

"ہمیں یہ بتائیں" — عبدالقدیر نے اُس سے پوچھا — "اگر لڑکی ہماری نشاندہی کر دے تو کیا ہم قانون کی گرفت میں آ سکتے ہیں؟"

ایڈووکیٹ نے ان سے اس طرح سوال پوچھنے شروع کر دیئے جس طرح کسی مشتبہ یا ملزم سے تفتیش کی جاتی ہے۔ انہوں نے ہر سوال کا جواب تفصیل اور وضاحت سے دیا اور اُسے وہ باتیں بھی بتائیں جو اُس نے نہیں پوچھی تھیں۔ اُسے کچھ واقعات کا علم ہی نہیں تھا۔ مثلاً عبدالقدیر نے اُسے سنایا کہ کس طرح عزیز کی بہن ہاشمی کے گھر گئی اور رشی اُس کے سامنے ہو گئی پھر دوسرے روز عزیز کی بہن انٹیلی جنس کے ایک ہندو کو برقعے میں ہاشمی کے گھر لے گئی۔ عبدالقدیر نے یہ سارا واقعہ سنایا۔ ورما کی پٹائی سنائی اور تھانے میں جو کچھ ہُوا وہ سنایا۔

"پھر آپ محفوظ ہیں" — ایڈووکیٹ نے کہا — "ہندو نے حویلی کی خانہ تلاشی لی تھی۔ لڑکی برآمد نہیں ہوئی۔ اُس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ یہ بات تھانے کے ریکارڈ پر آ گئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ انٹیلی جنس کے اِس آدمی نے اپنے محکمے کو بتایا ہوگا کہ لڑکی اس گھر میں نہیں ہے۔"

"میں خود انٹیلی جنس میں رہا ہوں" — عبدالقدیر نے کہا — "عزیز اور اس ہندو جیسے انٹیلی جنس کے کارندے ذرا ذرا سی بات اپنے افسروں کو بتاتے ہیں۔ یہ رپورٹ اُوپر تک پہنچ چکی ہوگی کہ لڑکی اُس گھر میں نہیں ہے۔"

"یہ چیز آپ کے حق میں جاتی ہے" — ایڈووکیٹ نے کہا — "اگر آپ لڑکی کو گھر سے نکال دیں گے تو وہ بتا بھی دے گی کہ اُسے ہاشمی صاحب کے گھر میں رکھا گیا تھا تو بھی آپ قانون کی گرفت میں نہیں آتے کیونکہ لڑکی کو آپ کے گھر سے برآمد نہیں کیا گیا .... یہ بتائیں کہ لڑکی کو معلوم ہے یا نہیں کہ

آپ کا گھر کون سے علاقے یا محلے میں ہے اور کیا لڑکی کو آپ کے گھر کا راستہ معلوم ہے؟"

"نہیں!" ـــ ہاشمی نے جواب دیا ـــ "اُسے میرے گھر پر رات کو لایا گیا تھا اور اُس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوتی تھی۔"

"زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ آپ کو انٹیلی جنس ہیڈ کوارٹر میں طلب کیا جاتے گا" ـــ ایڈووکیٹ نے کہا ـــ "لڑکی سے آپ کی شناخت کراتی جاتے گی۔ لڑکی آپ کو دیکھتے ہی کہہ دے گی کہ مجھے ان دونوں نے حبس بیجا میں رکھا تھا، پھر لڑکی کو ہاشمی صاحب کے گھر میں لے جایا جاتے گا اور اُس سے پوچھا جاتے گا کہ اُسے کون سے کمرے میں رکھا گیا تھا۔ وہ اُس کمرے کی نشاندہی کر دے گی۔ وہ ہاشمی صاحب کی بیوی کو بھی شناخت کر لے گی۔ آپ کو ذہنی طور پر تیار ہونا چاہیئے کہ آپ کو مشتبہ قرار دے کر آپ سے اقبالِ جُرم کروانے کی کوشش کی جاتے گی۔ آپ جانتے ہی ہوں گے کہ اقبالِ جُرم کرانے کے لئے اذیت ناک طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔ تشویشناک بات یہ ہے کہ بیگم ہاشمی بھی اس کارروائی میں ملوث ہیں۔ ایک پردہ نشین اور معزز عورت انٹیلی جنس انویسٹی گیشن سنٹر میں جاتے ہی ہاتھ پاؤں چھوڑ بیٹھے گی۔ اگر آپ کی بیگم کے ساتھ ذرا سی بھی بدتمیزی کی گئی تو وہ حوصلہ ہار کر یہ راز فاش کر دیں گی۔"

"ہم اپنی جانیں قربان کرنے کے لئے تیار ہیں" ـــ ہاشمی نے کہا ـــ "ہم نے کوئی جُرم نہیں کیا۔ ہمارے مقصد سے آپ واقف ہیں۔ اس قسم کے مقصد پر ہم ہر طرح کی قربانی دینے کے لئے تیار ہیں۔ اگر ہم اذیتیں برداشت کرنے اور مرنے سے ڈرنے لگیں تو وہ وقت جلدی آجاتے گا جب ہندوستان میں اسلام کی شمع ٹمٹما کر بجھنے لگے گی۔"

"مجھے آپ کے خیالات اور جذبات سے پورا پورا اتفاق ہے" ـــ ایڈووکیٹ نے کہا ـــ "لیکن میں اس وقت آپ کو بتا رہا ہوں کہ کیا ہو گا یا کیا ہونے کا امکان ہے۔ مجھے آپ کی بیگم کا خیال آتا ہے۔"

"کوئی اور صورت آپ کے ذہن میں آتی ہے؟" ـــ عبدالقدیر نے پوچھا۔

"صورت یہی بہتر ہے کہ آپ لڑکی کو اپنے گھر سے نکال دیں" ـــ ایڈووکیٹ نے جواب دیا ـــ "نکالتے وقت اُس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہونی چاہیئے۔ دوسری صورت زیادہ خطرناک ثابت ہوگی۔ وہ یہ ہے کہ لڑکی آپ کے قبضے میں ہی رہے۔ آپ کے گھر پر اچانک چھاپہ پڑے گا۔ لڑکی آپ کے قبضے سے برآمد ہوگی پھر ہاشمی صاحب! آپ کی اور آپ کی بیگم کی باقی عمر جیل میں گزرے گی۔ آپ کے بچنے کا کوئی امکان نہیں رہے گا۔ بچنے کا امکان اس صورت میں موجود ہے کہ لڑکی کو وہاں سے ہٹا دیا جاتے اور اُس کی کوئی نشانی وہاں نہ رہنے دی جاتے۔ اب لڑکی رفیقی صاحب کے گھر میں ہے جہاں اُسے زیادہ دن رکھا بھی نہیں جا سکتا۔ باقی اللہ پر چھوڑیں۔"

ایڈووکیٹ نے انہیں کچھ اور ہدایات بھی دیں اور متفقہ طور پر یہی فیصلہ کیا گیا کہ لڑکی کو وہاں سے نکال دیا جاتے۔

❀

عبدالقدیر اور ہاشمی کے لئے مشکل یہ تھی کہ اُن کے پاس گاڑی نہیں تھی۔ گاڑی کا انتظام اگلے دن ہو سکتا تھا۔ اب تو ایک ایک منٹ قیمتی تھا۔ اگر چھاپہ پڑنا ہی تھا تو کسی بھی وقت پڑ سکتا تھا۔

اگلے روز عبدالقدیر نے کھٹارا سی ایک گاڑی کا انتظام کر لیا۔

رات بارہ بجے سے کچھ دیر بعد گاڑی اُس گلی کے سامنے لے جائی گئی جس گلی میں رفیقی کا گھر تھا۔ گاڑی میں عبدالقدیر نہیں تھا اور ہاشمی بھی نہیں تھا۔ محاذ کے تین آدمی گاڑی لے کر گئے تھے۔ ہاشمی اور عبدالقدیر پہلے ہی رفیقی کے گھر موجود تھے۔ انہوں نے رشی کو بتا دیا تھا کہ اُسے اُس کے خاوند اور عزیز کے پاس بھیجا جا رہا ہے۔ اُنہوں نے رشی سے ایسی درخواست نہیں کی تھی کہ وہ اُن کی نشاندہی نہ کرے۔ رشی خاموش رہی تھی۔ اُس کے چہرے کے تاثرات سے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ کیا محسوس کر رہی ہے اور

یہاں سے جاکر اُس کا ردِ عمل کیا ہوگا اور وہ کیا کرے گی۔

جو تین آدمی گاڑی لے کر گئے تھے اُن میں سے دو آدمی گلی میں داخل ہو گئے اور ایک گاڑی میں ہی بیٹھا رہا۔ وہ رفیقی کے دروازے پر پہنچے۔ اُن کی مخصوص دستک پر رفیقی نے دروازہ کھولا اور یہ دونوں اندر چلے گئے۔ ان دونوں آدمیوں نے سروں پر صافے اس طرح باندھ رکھے تھے کہ اُن کے چہرے بھی ڈھانپے ہوتے تھے۔ صرف آنکھیں نظر آتی تھیں۔ رشی کو چلنے کے لئے کہا گیا۔ رشی اُٹھی۔

"میں آپ لوگوں کو ساری عمر نہیں بھولوں گی" ـــ رشی نے کہا ـــ "آپ کے ہاں میری عزت محفوظ رہی ہے۔"

عبدالقدیر کے ہاتھ میں ایک سیاہ کپڑا تھا اور وہ رشی کے پیچھے کھڑا تھا۔ اُس نے پیچھے سے یہ کپڑا رشی کے چہرے کے آگے کیا اور اُس کی آنکھوں پر رکھ کر اُس کے سر کے پیچھے باندھ دیا۔ ان سب پر ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ رشی کو گھر سے نکال کر وہ اپنی قسمت کا فیصلہ کر رہے تھے۔ دراصل یہ فیصلہ اُن کے اختیار میں نہیں تھا۔ یہ تو رشی کے جانے کے بعد معلوم ہونا تھا کہ فیصلہ کیا ہوگا۔ یہ اچھا بھی ہو سکتا تھا بُرا بھی اور یہ بہت بُرا بھی ہو سکتا تھا۔ توقع یہی تھی کہ یہ بہت بُرا ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ سب پر ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ انہیں احساس تھا کہ محاذ اور محاذ کا مقصد اُن سے پہلی قربانی مانگ رہا ہے۔ انہوں نے آپس میں کوئی بات نہ کی۔ کسی کے ذہن میں کوئی بات آتی تھی تو یہ بات زبان پر آکر بھاپ کی طرح اُڑ جاتی تھی۔

رشی کی آنکھوں پر کپڑا باندھ کر عبدالقدیر نے نقاب پوشوں کو سر سے اشارہ کیا۔ ایک نے رشی کا دایاں اور دوسرے نے اُس کا بایاں ہاتھ پکڑ لیا اور وہ باہر کی طرف چل پڑے۔ ہاشمی نے اُنہیں روک لیا۔ اُس نے ایک چادر اُٹھائی اور رشی کے سر پر ڈال دی۔ رشی نے خود ہی یہ چادر اوڑھ لی۔ ہاشمی نے اُس کے ماتھے سے چادر نیچے کو کھینچ کر گھونگھٹ نکال دیا۔ ہیجانی کیفیت میں وہ نہایت اہم احتیاطی تدبیر بھول چکے تھے۔ گھر سے گاڑی تک جاتے

کوئی آدمی رشی کو چادر کے بغیر دیکھ لیتا تو اُسے فوراً پتہ چل جاتا کہ یہ جوان لڑکی ہے اور اس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوتی ہے۔ وہ رشی کو باہر لے گئے۔

"راستہ بالکل سیدھا ہے" ـــ ایک نقاب پوش نے رشی سے کہا ـــ "اور راستہ بالکل صاف ہے۔ تیز چلی چلو۔"

رشی اُن کے ساتھ اُن کی رفتار سے چلتی گئی۔ دونوں آدمیوں نے اُس کے ہاتھ تھامے ہوتے تھے۔ گلی میں صرف ایک آدمی اور عورت سامنے سے آکے اُن کے قریب سے گزرے۔ اُنہیں دیکھ کر ان دونوں نے رشی کے ہاتھ چھوڑ دیئے تھے۔

وہ گاڑی تک پہنچے۔ اُن کے ساتھی نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا۔ ایک آدمی پہلے پچھلی سیٹ پر بیٹھا پھر رشی کو بٹھایا گیا پھر ان کا دوسرا ساتھی گاڑی میں بیٹھا۔ ان کے تیسرے ساتھی نے گاڑی سٹارٹ کی اور گاڑی چلی گئی۔

پرانی دِلّی سے نکل کر گاڑی نئی دِلّی میں داخل ہو گئی۔ جوں جوں گاڑی آگے بڑھتی جا رہی تھی سڑکوں پر ٹریفک زیادہ ہوتی جا رہی تھی۔ نئی دِلّی آدھی رات کے بعد زندہ و بیدار تھی۔ پیچھے سے ایک کار گاڑی کے قریب سے گزری۔ اُس میں سے نسوانی قہقہے بلند ہوئے۔ یہ ہندوستان کی ڈسکو سوسائٹی کی نوجوان لڑکیاں اور لڑکے تھے جو رات کو جاگتے اور دن کو سوتے ہیں۔ ایسی دو تین اور کاریں اس گاڑی کے قریب سے گزریں۔ ان کاروں میں بیٹھے نوجوانوں کو معلوم نہ ہو سکا کہ اُن کی قبیل کی ایک لڑکی آنکھوں پر پٹی بندھے لے جائی جا رہی ہے۔ آگے وہ دوراہا آگیا جہاں سے ایک سڑک اشوکا ہوٹل کی طرف جاتی تھی۔ گاڑی اس سڑک کو چھوڑ کر دوسری سڑک پر چلی گئی۔ یہ سڑک شہر سے باہر جا رہی تھی۔

آگے کوٹھیوں کی ایک نئی کالونی تھی جس میں داخل ہو کر گاڑی کی رفتار کم ہوگئی۔

رِشی کو اشوکا ہوٹل تک پہنچانا تھا لیکن عبدالقدیر کو کچھ خطرہ سا محسوس ہُوا۔ اشوکا ہوٹل ایسی جگہ پر تھا جہاں دُور دُور تک ساری رات ٹریفک چلتی اور گہما گہمی رہتی تھی۔ لڑکی کو وہاں اُتارنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ لڑکی گاڑی سے اُترتے ہی شور مچادے۔ وہاں پولیس موجود ہوتی تھی اِس کے علاوہ وہاں بے انداز کاریں موجود تھیں۔ لڑکی کو لے جانے والی کار کا تعاقب ہو سکتا تھا۔ احتیاطی تدابیر کو صرف عبدالقدیر سمجھ سکتا تھا۔

اس محاذ کا جو آدمی اشوکا ہوٹل میں بیرا تھا، اُس نے خبر دی تھی کہ رابی اس ہوٹل سے چلا گیا ہے۔ اس بیرے نے رابی کو دو مرتبہ عزیز کے ساتھ دیکھا تھا۔ عبدالقدیر نے یہ بہتر سمجھا تھا کہ رِشی کو عزیز کی کوٹھی میں پہنچا دیا جائے۔

"مَیں چاہتا ہوں کہ لڑکی عزیز کے گھر سے برآمد ہو" — عبدالقدیر نے ہاشمی اور اپنے دیگر ساتھیوں سے کہا تھا — "لڑکی کو عزیز کے ہاں بھیجنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہی لڑکی کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے اور وہ ہم تک آپہنچا تھا۔ لڑکی اُسی کے پاس چلی جاتے تو اچھا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس لڑکی کا خاوند عزیز کے پاس ہی ٹھہرا ہُوا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ واپس پاکستان چلا گیا ہو۔"

سب نے عبدالقدیر کی اس بات کو مان لیا تھا۔ اُسے سب اپنا اُستاد اور لیڈر سمجھتے تھے۔

"لڑکی کو جہاں بھی چھوڑا گیا، ہمارے لئے خطرہ موجود ہے" — عبدالقدیر نے کہا تھا — "مَیں عزیز کے ساتھ ایک گیم کھیلنا چاہتا ہوں۔ دیکھتے ہیں کہ بازی کون جیتے گا۔"

ہاشمی اور عبدالقدیر نے عزیز کی کوٹھی دیکھ رکھی تھی۔ ہاشمی نے اپنے ان ساتھیوں کو جو رِشی کو لے جا رہے تھے، یہ کوٹھی دکھا دی تھی۔ رِشی کو لے جانے والی گاڑی اس کوٹھی سے پچیس تیس قدم دُور رُکی۔ وہاں سڑک پر ٹیوب لائٹیں روشن تھیں۔ ایک آدمی نے رِشی کی آنکھوں

سے کپڑا کھول دیا۔ رِشی نے اپنی آنکھیں ہاتھوں سے مَلیں اور چند سیکنڈ بعد اُس کی آنکھیں دیکھنے کے قابل ہو گئیں۔

"وہ سبز گیٹ والی کوٹھی نظر آرہی ہے" — ایک آدمی نے رِشی سے کہا — "اس سے آگے سفید گیٹ والی کوٹھی ہے۔ گیٹ کی لائٹیں روشن ہیں۔ ایک لائٹ کے نیچے 'کاشانہ عزیز' لکھا ہے۔ گاڑی سے اُترو اور اس کوٹھی میں چلی جاؤ۔"

"یہ کس کی کوٹھی ہے؟" — رِشی نے ایسے لہجے میں پوچھا جس میں گھبراہٹ تھی — "آپ لوگ مجھے کس کے حوالے کر کے جا رہے ہیں؟"

"یہ آدمی تمہارے لئے کوئی اجنبی نہیں" — سٹیئرنگ پر بیٹھے ہوئے آدمی نے جواب دیا — "یہ کوٹھی اُس عزیز کی ہے جو تمہیں یہاں لایا تھا۔ ہو سکتا ہے تمہارا خاوند بھی تمہیں یہیں مل جائے۔"

"میں آپ کے قبضے میں ہوں" — رِشی نے مغموم سی آواز میں کہا — "مَیں آپ کے رحم و کرم پر ہوں۔ مَیں آپ کے ہاتھوں میں مجبور ہوں۔ آپ مجھے دریا میں پھینک دیں گے تو میں آپ کو نہیں روک سکتی۔ میں صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ میرے ساتھ کوئی دھوکہ تو نہیں ہو رہا .... اگر آپ کو بُرا نہ لگے تو میں آپ سے پوچھوں کہ آپ مجھے کسی کے ہاتھ بیچ تو نہیں رہے؟"

"اگر ہم یا وہ جن کے ہاں رہ آئی ہو، بردہ فروش ہوتے تو کیا تمہاری عصمت ہمارے ہاتھوں محفوظ رہتی؟" — ایک آدمی نے کہا — "ہم جلدی میں ہیں۔ گاڑی سے اُترو۔ ہمیں جانا ہے۔"

"کیا آپ مجھے اکیلی چھوڑ کر چلے جائیں گے؟" — رِشی نے خوفزدہ آواز میں پوچھا — "اگر کوٹھی بند ہوتی، یہاں کوئی نہ ہُوا ...."

"ہم یہاں سے اُس وقت جائیں گے جب تم کوٹھی میں داخل ہو جاؤ گی" — اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے نقاب پوش نے اُسے کہا۔

رشی اس طرح گاڑی سے اُتری جیسے اُترنا نہ چاہتی ہو۔ وہ آہستہ آہستہ سفید گیٹ والی کوٹھی کی طرف چل پڑی۔ اُسے وہاں تک لانے والے گاڑی میں بیٹھے اُسے دیکھتے رہے۔ وہ گیٹ تک پہنچ کر رُکی اور دیکھنے لگی۔ اُس نے "کاشانۂ عزیز" پڑھا۔ اس کے ساتھ ہی گھنٹی کا بٹن تھا۔ اُس نے بٹن دبایا اور ایڑیاں اُٹھا کر اُوپر سے اندر دیکھنے لگی۔

ذرا دیر بعد گیٹ کھُلا۔ یہ نوکر تھا۔

"مسٹر عزیز ہیں؟" رشی نے پوچھا۔

"نہیں!" — نوکر نے جواب دیا — "آنے ہی والے ہیں"

"مسٹر رب نواز ان کے ساتھ رہتے ہیں" — رشی نے کہا — "رابی .... انہیں رابی کے نام سے پکارتے ہیں"

"محترمہ!" — نوکر نے کہا — "آپ انتظار کریں .... آپ کا نام کیا ہے؟"

"راشدہ!" — رشی نے جواب دیا — "رشی"

"نہیں محترمہ!" — نوکر نے کہا — "مَیں نے یہ نام پہلے کبھی نہیں سُنا"

"کیا تم مجھے اندر نہیں آنے دو گے؟" — رشی نے پوچھا۔

"آجائیں" — نوکر نے کہا — "لیکن آپ کو برآمدے میں بیٹھنا پڑے گا"

"کیوں؟" — رشی نے پوچھا — "برآمدے میں کیوں؟"

"میرے لئے یہی حکم ہے مس صاحبہ!" — نوکر نے جواب دیا۔

عین اُس وقت ایک کار اس طرف مُڑی۔

"ذرا ٹھہریں" — نوکر نے کہا — "یہ عزیز صاحب کی گاڑی لگتی ہے"

رشی کو ساتھ لانے والے اپنی گاڑی میں بیٹھے رہے۔ کار سامنے

سے آرہی تھی۔ گاڑی کے سٹیئرنگ پر بیٹھے آدمی نے گاڑی سٹارٹ کی تاکہ خطرے کی صورت میں وہاں سے گاڑی فوراً نکال لی جاتے۔

سامنے سے آنے والی کار رشی اور نوکر کے پاس رُک گئی۔ نوکر نے دوڑ کر گیٹ کھولا۔ وہاں ٹیوب لائٹوں کی روشنی خاصی زیادہ تھی۔ کار گیٹ کے اندر جانے کی بجائے باہر ہی کھڑی رہی۔ اس میں سے عزیز اور رابی نکلے پھر اس میں سے ایک لڑکی نکلی جو رشی کی ہم عمر تھی لیکن رشی سے زیادہ حسین اور پُرکشش تھی۔

عزیز اور رابی رشی کے قریب گئے اور اُسے غور سے دیکھا۔

"رشی؟" — رابی نے حیرت سے کہا۔

"کہاں سے آئی ہو؟" — عزیز نے پوچھا۔

رشی نے اُس گاڑی کی طرف دیکھا جس میں اُسے لایا گیا تھا۔ عزیز اور رابی نے اُس طرف دیکھا۔ اس گاڑی میں بیٹھے ہوتے تین آدمیوں میں سے ایک عزیز کو پہچانتا تھا۔

"یہ عزیز ہے" — اُس نے اپنے ساتھیوں سے کہا — "چلو نکلو یہاں سے .... لڑکی ٹھکانے پر پہنچ گئی ہے"

عزیز اور رابی اُس گاڑی کی طرف چلے۔ پچیس تیس قدم کا فاصلہ تھا۔ ڈرائیور نے گاڑی چلا دی۔ پیچھے کو موڑنے کی بجائے وہ گاڑی کو سیدھا لے گیا۔

"کم آن رابی!" — عزیز نے اپنی کار کی طرف دوڑتے ہوتے کہا — "انہیں پکڑیں گے" — کار میں بیٹھ کر اُس نے نوکر سے کہا — "ان لڑکیوں کو اندر لے جاؤ"

❦

عزیز صرف جاسوس اور مُخبر ہی نہیں تھا، اُسے تقریباً اُس قسم کی ٹریننگ دی گئی تھی جو کمانڈو کو دی جاتی ہے۔ اس میں بغیر ہتھیار کے لڑائی خاص طور پر شامل تھی۔ خنجر، چاقو اور ریوالور سے مسلح آدمی کو بغیر ہتھیار

کے یعنی نہتہ حالت میں بے بس کر دینا اور اس سے ہتھیار چھین لینا بھی شامل تھا۔ کار یا کوئی بھی گاڑی انتہائی رفتار سے چلانے اور گاڑی کو بے قابو نہ ہونے دینے کی ٹریننگ بھی شامل تھی۔

یہ کوٹھیوں کا علاقہ تھا۔ سڑکوں کا جال سا بچھا ہوا تھا۔ عزیز اس علاقے سے واقف تھا۔ محاذ کے آدمیوں کو ان سڑکوں سے واقفیت نہیں تھی۔ ان کی دوسری کمزوری یہ تھی کہ ان کی گاڑی بڑی پرانی اور گھسی پٹی تھی۔ عزیز کی گاڑی نئے ماڈل کی تھی۔

عزیز نے اپنی گاڑی اس قدر تیزی سے ریورس اور سیدھی کی کہ پہیوں کی چیخیں نکل گئیں۔ اُس نے ایکسیلیٹر پر پاؤں دبایا۔ رات کا وقت تھا۔ محاذ کی گاڑی جاتی نظر آرہی تھی۔ اُس نے دو موڑ کاٹے تھے۔ اُن تینوں کا خیال تھا کہ وہ دُور نکل آئے ہیں اور عزیز کی گاڑی اُن تک نہیں پہنچ سکے گی لیکن یہ ان کا خیال ہی تھا۔ عزیز ایک چھوٹے راستے سے اُن تک پہنچ گیا۔ اُنہوں نے بروقت دیکھ لیا اور قریبی موڑ سے مُڑ گئے۔

عزیز کی رفتار اتنی تیز تھی کہ وہ یہ موڑ مُڑ نہ سکا۔ کار کے اُلٹنے کا خطرہ تھا۔ بریک لگاتے لگاتے کار آگے نکل گئی۔ عزیز نے کار کو پیچھے موڑا اور اس موڑ سے مُڑ کر رفتار تیز کر دی۔

"رابی!" — عزیز نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے رابی سے کہا — "تین چار دنوں سے میں ریوالور لے کر نہیں نکل رہا۔ آج بھی وہی غلطی کی ہے۔ ڈیش بورڈ کھولو۔ اس میں خنجر پڑا ہے۔ نکال کر ہاتھ میں رکھ لو۔"

"معلوم نہیں اس گاڑی میں کتنے آدمی ہیں" — رابی نے کہا — "اُن کے پاس ریوالور ہوں گے۔"

"ہونے دو" — عزیز نے کہا — "مَیں گاڑی کا نمبر دیکھ لوں اور صرف ایک چہرہ پہچان لوں .... ہو سکتا ہے ان کے پاس کوئی ہتھیار نہ ہو۔ ڈرو نہیں رابی! تمہیں بھی یہ ٹریننگ دیں گے۔"

"مَیں نے فلموں میں اس طرح کے بہت سے تعاقب دیکھے ہیں" —

رابی نے کہا۔

"فلموں میں دیکھنے سے تو بہت مزہ آتا ہے" — عزیز نے گاڑی کی رفتار اور تیز کرتے ہوئے کہا — "لیکن حقیقی تعاقب میں دل اوپر حلق تک پہنچ جاتا ہے .... کیا تمہیں مزہ آرہا ہے؟"

"نہیں" — رابی نے جواب دیا۔

"گئے کہاں؟" — عزیز نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا — "وہ رہے .... وہی گاڑی لگتی ہے۔ معلوم نہیں یہ کون لوگ ہیں۔"

وہ وہی گاڑی تھی۔ اُس نے ایسے موڑ کاٹے تھے کہ گھوم پھر کر گاڑی واپس آرہی تھی۔ دو متوازی سڑکیں تھیں۔ ان کے درمیان کھُلا میدان تھا جو گہرائی میں تھا۔ سٹیڈیم بنانے کے لئے یہ میدان خالی رکھا گیا تھا۔ عزیز کی گاڑی اس سڑک پر اور محاذ کی گاڑی اس کے متوازی سڑک پر جا رہی تھی۔ دونوں کی سمت ایک دوسرے کے خلاف تھی۔

عزیز نے اپنی گاڑی روک کی اور پیچھے موڑ لی۔ اُسے معلوم تھا کہ جس گاڑی کا وہ تعاقب کر رہا ہے وہ ادھر ہی آئے گی کیونکہ آگے کوئی اور سڑک نہیں تھی۔ جس سڑک پر وہ جا رہی تھی وہ مُڑ کر اِدھر ہی آتی تھی۔ وقت آدھی رات کے بعد کا تھا اس لئے اس علاقے میں ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔

عزیز نے آگے جا کر گاڑی ایک بلڈنگ کی اوٹ میں روک لی اور گاڑی کی بتیاں بجھا دیں۔ تھوڑی دیر بعد دوسری گاڑی کی روشنی سامنے سے گزرتی سڑک پر دکھائی دینے لگی۔ وہ سڑک اس سڑک کو کاٹ کر گزرتی تھی جس پر عزیز کی گاڑی کھڑی تھی۔ جونہی عزیز کو اس گاڑی کی روشنی نظر آئی اُس نے اپنی گاڑی چلا کر اُس گاڑی کے راستے میں کھڑی کر دی۔

اس جگہ کوٹھیاں نہیں تھیں۔ فوجی بارکوں کی طرح گودام کھڑے تھے۔ ورکشاپیں اور دو تین فیکٹریاں تھیں۔ محاذ والے دیکھ نہ سکے تھے کہ عزیز کی گاڑی گھات میں ہے۔ سڑک اتنی چوڑی نہیں تھی کہ محاذ کی گاڑی اس کے

آگے یا پیچھے سے گزر جاتی۔ عزیز نے گاڑی اس طرح کھڑی کی تھی کہ سڑک کی پوری چوڑائی رُک گئی تھی۔

محاذ کی گاڑی کے ڈرائیور نے گاڑی اس طرح گھما کر روکی کہ عزیز اور رابی اس کا نمبر نہیں پڑھ سکتے تھے۔

"لائٹیں آف نہ کرنا"— اس گاڑی کے ایک آدمی نے ڈرائیور سے کہا —"چاروں لائٹیں آن کر دو۔ فل لائٹیں دو۔"

گاڑی کی چاروں لائٹیں آن ہو گئیں۔ عزیز ہاتھ میں خنجر لئے گاڑی کی طرف آیا۔ رابی اُس کے ساتھ تھا۔ اِدھر سے دونوں نقاب پوش گاڑی سے اُترے اور اُن دونوں کی طرف بڑھے۔

"میں سی آئی ڈی کا ایس پی ہوں"— عزیز نے کہا —"چہروں سے کپڑے ہٹا دو۔"

دونوں نقاب پوش بڑھتے گئے اور اُن دونوں کے قریب چلے گئے۔ عزیز کا خیال تھا کہ اُس کا رُعب کام کر گیا ہے لیکن اچانک وزنی ہتھوڑے جیسا ایک گھونسہ اُس کے مُنہ پر پڑا۔ ایسا ہی ایک گھونسہ رابی کی پسلیوں کے نیچے پیٹ میں لگا۔ عزیز چند قدم پیچھے گرا اور رابی دُہرا ہو گیا۔ عزیز کے ہاتھ سے خنجر گر پڑا۔ ایک نقاب پوش نے دوڑ کر خنجر اُٹھا لیا۔

عزیز اُٹھ ہی رہا تھا کہ اُس کے پہلو میں پہلے جیسا گھونسہ پڑا۔ اُدھر رابی کے مُنہ پر گھونسہ لگا۔ اُس کے پاؤں سڑک سے اُٹھ گئے اور وہ پیٹھ کے بل اس طرح گرا کہ اُس کی ٹانگیں اُوپر کو اُٹھ گئیں۔ ڈسکو میوزک اور سیکس لبرٹی کا مارا ہوا نوجوان اپنے ملک کے خلاف جاسوسی اور غداری کر سکتا تھا، ایک تنومند مجاہد کا گھونسہ برداشت کرنا اُس کے بس سے باہر تھا۔

عزیز صرف دو اور گھونسے برداشت کر سکا اور سڑک پر بیٹھ گیا۔ رابی اُٹھ ہی نہیں سکا تھا۔

"گاڑی کی چابی نکالو"— ایک نقاب پوش نے خنجر کی نوک اُس کی گردن کے ساتھ لگا کر کہا —"ہم خون نہیں بہائیں گے اور تمہاری گاڑی

بھی نہیں لے جائیں گے۔"

عزیز نے جیب سے اپنی گاڑی کی چابی نکال کر دے دی۔

"لو بھائی!"— چابی لینے والے نقاب پوش نے اپنے ڈرائیور کو بلایا اور کہا —"یہ لو چابی اور ایس پی صاحب کی گاڑی سڑک سے ہٹا دو۔"

ڈرائیور آیا اور چابی لے کر وہ عزیز کی گاڑی میں بیٹھا۔ گاڑی سڑک سے ہٹ گئی۔

"چابی اپنے ساتھ لے آؤ"— ایک نقاب پوش نے ڈرائیور سے کہا۔

عزیز اور رابی آہستہ آہستہ اُٹھ رہے تھے۔ نقاب پوشوں کی گاڑی چل پڑی اور وہاں سے غائب ہو گئی۔ عزیز اُس کا نمبر نہ پڑھ سکا۔ اُس کی گاڑی کی چابی محاذ کی گاڑی کے ساتھ ہی چلی گئی اور عزیز کا خنجر بھی چلا گیا۔ یہ ساری کارروائی چند سیکنڈ میں ہو گئی۔

"یہ کوئی پیشہ ور معلوم ہوتے ہیں"— عزیز نے رابی سے کہا —"کوئی بات نہیں، پکڑ لیں گے۔"

❦

عزیز کی کوٹھی کے سامنے جب عزیز اور رابی گاڑی سے اُترے تھے تو ان کے ساتھ ایک لڑکی بھی اُتری تھی۔ اسے انہوں نے وہیں چھوڑ دیا تھا اور وہ رشی کے پاس کھڑی ہو گئی تھی۔

"میرا نام زینی ہے"— اُس لڑکی نے کہا —"پورا نام زینت آفتاب ہے.... اور تم؟"

"رشی!"— رشی نے جواب دیا —"پورا نام راشدہ ہے۔ میں رابی کی بیوی ہوں۔ رابی کو جانتی ہو نا! عزیز کے دوست ہیں۔"

"ہاں ہاں!"— زینی نے جواب دیا —"رابی میرا بھی دوست ہے.... تم اسے چھوڑ کر کہاں چلی گئی تھیں؟"

"میں خود تو نہیں گئی تھی"— رشی نے جواب دیا —"میں ایک دھوکے کا شکار ہو گئی تھی۔"

"یہ کون لوگ ہیں جن کے ساتھ تم واپس آتی ہو؟" ——— زَینی نے پوچھا۔

"مَیں ان کے ساتھ نہیں آئی" ——— رِشی نے جھنجھلا کر جواب دیا ——— "یہ مجھے یہاں ڈراپ کرنے کے لئے لاتے تھے۔"

زَینی رِشی کو کوٹھی کے اندر لے گئی اور اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ نوکر کو کہا کہ کافی لائے۔ پھر اُس نے رِشی سے اس طرح سوال پوچھنے شروع کر دیئے جیسے رِشی مشتبہ یا ملزم ہو اور زینی اُس سے اقبالِ جرم کروانے کی کوشش کر رہی ہو۔ رِشی صاف طور پر محسوس کرنے لگی کہ اُس پر یہ شُبہ کیا جا رہا ہے کہ وہ اغوا نہیں ہوئی تھی بلکہ وہ اپنی مرضی سے گئی تھی۔ اُس نے زینی کو کسی ایک سوال کا بھی سیدھا اور صحیح جواب نہ دیا۔

"کیا رابی کو بھی یہی شک ہے کہ مَیں خود کسی کے ساتھ گئی تھی؟" ——— رِشی نے پوچھا۔

"وہ بیچارہ تو بہت ہی اَپ سیٹ ہے" ——— زَینی نے جواب دیا ——— "اُسے یہی شُبہ ہے کہ تم خود کسی کے ساتھ چلی گئی تھیں ..... انڈیا میں آتے ہی تم نے اتنی جلدی کِس سے دوستی لگا لی تھی؟ پھر تم واپس کیوں آ گئی ہو؟"

"میں تمہیں کسی ایک بھی سوال کا جواب نہیں دینا چاہتی" ——— رِشی نے غصیلی آواز میں کہا ——— "معلوم ہوتا ہے یہاں میرے لئے کوئی اور ہی جال بچھا ہُوا ہے۔"

رِشی اُٹھ کر ڈرائنگ روم میں تیز تیز قدم ٹہلنے لگی۔ زَینی اُس سے کچھ نہ کچھ پوچھتی رہی لیکن اُس نے زینی کی کسی بات کا جواب نہ دیا۔ وہ اتنی زیادہ بے قرار اور مضطرب ہو گئی کہ باہر نکل کر اور گیٹ میں کھڑے ہو کر اُس طرف دیکھنے لگی جس طرف دونوں گاڑیاں چلی گئی تھیں۔

چند منٹ بعد زَینی بھی باہر آ کر اُس کے قریب آ کھڑی ہُوئی۔

"باہر کھڑی کیا کر رہی ہو!" ——— زَینی نے کہا ——— "اندر آ جاؤ۔"

"تم کہتی ہو کہ رابی تمہارا دوست ہے" ——— رِشی نے کہا ——— "لیکن تم

ذرا سی بھی پریشان نہیں لگتیں کہ وہ اُن آدمیوں کے پیچھے چلا گیا ہے جو مجھے اغوا کر کے لے گئے تھے۔ وہ پکے مجرم ہیں۔ اگر عزیز اور رابی ان تک پہنچ گئے تو وہ مجرم ان دونوں کو گولی مار سکتے ہیں یا انہیں اُٹھا کر اپنے ساتھ بھی لے جا سکتے ہیں۔"

"فکر مت کرو رِشی!" ——— زَینی نے لاپرواہی سے کہا ——— "عزیز ہر وقت اپنے ساتھ ریوالور رکھتا ہے۔ وہ بزدل نہیں اور رابی بھی دلیر آدمی ہے۔"

کچھ دیر اور انتظار کے بعد رِشی اندر آنے لگی۔ گیٹ میں داخل ہو رہی تھی کہ ایک کار کی روشنی نظر آئی۔ کار اِدھر ہی آ رہی تھی۔ رِشی پھر باہر آ گئی۔ یہ عزیز کی ہی کار تھی جو کوٹھی کے سامنے آ کر مُڑی اور اندر چلی گئی۔ رِشی دوڑ کر اُن تک پہنچی۔ عزیز اور رابی کار سے نکلے اور رِشی اور زینی کو اندر لے گئے۔

ڈرائنگ روم میں جا کر رِشی نے عزیز اور رابی کے چہرے دیکھے۔ دونوں کے چہروں پر گھونسوں کے اُبھرے ہُوئے نشان تھے جن کا رنگ نیلا ہو گیا تھا۔ رابی کا ایک ہونٹ بھی ایک طرف سے سُوجھا ہُوا اور کچھ پھٹا ہُوا تھا۔ وہاں خون جم گیا تھا۔ دونوں کے کپڑوں کے ساتھ مٹی لگی ہوئی تھی اور دونوں کے مزاج اکھڑے اکھڑے سے تھے۔ ان کی جو پٹائی ہوئی تھی اسے وہ چھپا نہیں سکتے تھے۔ دونوں اس طرح صوفوں پر بیٹھے جیسے گِر پڑے ہوں۔

رِشی نے آگے بڑھ کر رابی کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اُس کے آنسو نکل آئے۔

"یہ کون تھے؟" ——— رابی نے سخت غصّے کی کیفیت میں گرج کر رِشی سے پوچھا ——— "کیا ان میں وہ آدمی بھی تھا جس کے ساتھ تم گئی تھیں؟"

"رابی!" ——— رِشی نے پیچھے ہٹتے ہوئے چلّا کر کہا ——— "ہوش میں آؤ۔ کیا تم یہاں مجھے اس طرح ذلیل و رسوا کرنے کے لئے لاتے تھے؟" ———

رِشی نے زینی کی طرف اشارہ کر کے کہا ——"یہ لڑکی معلوم نہیں کون ہے۔ یہ بھی مجھ پر یہی شک کر رہی ہے کہ میں خود کسی کے ساتھ چلی گئی تھی۔"

رِشی کو معلوم نہیں تھا کہ رابی کی ذہنی حالت بہت بُری ہو رہی ہے۔ اُس نے اتنی مار کبھی نہیں کھائی تھی۔ اس کا ذمہ دار وہ رِشی کو ٹھہرا رہا تھا۔ اُس کے مُنہ میں جو آیا اُس نے کہہ ڈالا۔

رِشی کی ذہنی اور جذباتی حالت بھی قائم نہیں تھی۔ وہ بھی بھڑک اُٹھی۔ رابی آخر مرد تھا، وہ رِشی کو مارنے کے لئے اُٹھ کھڑا ہُوا۔ عزیز تیزی سے اُٹھا اور اُس نے رابی کو پکڑ لیا۔

"یہ خود کسی کے ساتھ چلی گئی تھی"—— رابی نے سخت غصّے کے عالم میں کہا۔

"میں تمہیں بتاؤں گی کہ میں کہاں گئی تھی"—— رِشی نے رابی سے زیادہ چلاّتے ہوئے کہا ——"میں تم پر ثابت کردوں گی کہ مجھے دھوکے میں لے جایا گیا تھا۔"

عزیز رابی کو دوسرے کمرے میں لے گیا۔

"زبان بند رکھو رابی!"—— عزیز نے کہا ——"یہ معلوم کرنا تمہارا کام نہیں کہ یہ کہاں گئی تھی اور کس طرح گئی تھی۔ ایسی باتیں معلوم کرنے کے لئے خاص طریقہ اور انداز ہوتا ہے جو تم نہیں جانتے"—— عزیز نے اپنی گھڑی دیکھی اور بولا ——"دو بج چکے ہیں .... کوئی بات نہیں۔ میں باس کو ابھی فون کرتا ہوں اور اس کا حکم لے لیتا ہوں۔ اس مسئلے کو معمولی نہ سمجھو۔ ابھی اسے کچھ نہ کہو۔"

عزیز نے میجر بھاٹیہ کو فون کیا۔ یہ انٹیلی جنس کے کل پُرزے تھے جو فوج کی طرح ہر وقت چوکس رہتے تھے۔ رات سوا دو بجے میجر بھاٹیہ کے فون کی گھنٹی بجی تو اُس نے ناک بھوں چڑھاتے بغیر ریسیور اُٹھایا۔ وہ بڑی گہری نیند سویا ہُوا تھا۔ اُس نے غنودگی کی کیفیت میں ہیلو کہا۔ اُدھر سے عزیز بول رہا تھا۔

"اِس وقت کیا مصیبت آپڑی ہے عزیز!"—— میجر بھاٹیہ نے پوچھا۔

"سر!"—— عزیز نے کہا ——"وہ آگئی ہے .... رِشی۔"

"کس حالت میں؟"—— میجر بھاٹیہ نے پوچھا۔

"حالت تو اس کی نارمل لگتی ہے سر!"—— عزیز نے جواب دیا ——"میں نے اس کے چہرے پر کوئی ابنارمل تاثر نہیں دیکھا۔"

"اسے ابھی میرے آفس میں لے آؤ"—— میجر بھاٹیہ نے کہا ——"میں وہاں سنوں گا کہ وہ کس طرح آئی ہے"—— اُس نے فون بند کر دیا۔

عزیز ڈرائنگ روم میں گیا۔ رابی کو بتایا کہ باس نے ابھی بلایا ہے۔ وہ رابی اور رِشی کو ساتھ لے کر باہر نکل گیا۔ دونوں کو گاڑی میں بٹھایا۔ سیلف سٹارٹر کی تاریں جوڑ کر کار سٹارٹ کی۔ کار کی چابی وہ نقاب پوش لے گئے تھے جو رِشی کو ساتھ لاتے تھے۔ وہاں سے وہ سیلف کی تاریں نکال کر جوڑ کر کار لایا تھا۔

یہ تینوں جب میجر بھاٹیہ کے دفتر کی طرف جا رہے تھے اُس وقت محاذ کے آدمی رفیقی کے گھر پہنچ گئے تھے۔ عبدالقدیر، ہاشمی اور رفیقی بڑی بے تابی سے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ان کے پکڑے جانے میں کوئی کسر رہ نہیں گئی تھی۔ یہ تو محض اتفاق تھا کہ عزیز کے ساتھ اُس کا کوئی ساتھی یا دوست الگ گاڑی میں نہیں تھا اور دوسرا اتفاق، یہ کہ عزیز کے پاس ریوالور یا میگزین والا پستول نہیں تھا جو وہ اپنے پاس رکھا کرتا تھا۔

خدا خدا کر کے یہ تینوں واپس آتے۔ انہوں نے عبدالقدیر، ہاشمی اور رفیقی کو سنایا کہ وہ کس طرح عزیز کی کوٹھی تک پہنچے اور کس طرح وہاں سے نکلے۔

"زندہ باد"—— عبدالقدیر نے کہا ——"نہیں اس کا حصلہ

اللہ دے گا۔"

"اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔" — ہاشمی نے کہا۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ گاڑی کا نمبر کسی نے نہیں دیکھا؟" — عبدالقدیر نے ان سے پوچھا۔

"میں نے اس کی گاڑی دیکھتے ہی اپنی گاڑی کی چاروں بتیاں آن کرا دی تھیں۔" ان تینوں کے لیڈر نے کہا — "پھر گاڑی موڑ کر رکوا دی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ گاڑی کا نمبر نہیں دیکھ سکے۔"

"وہ چادر کہاں ہے جو لڑکی پر ڈال کر لے گئے تھے؟" — عبدالقدیر نے پوچھا۔

تینوں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

"گاڑی میں نہ ہو" — ایک نے کہا — "معلوم ہوتا ہے چادر لڑکی کے ساتھ ہی چلی گئی ہے۔"

ایک آدمی باہر کو دوڑا۔ اس نے واپس آکر بتایا کہ چادر گاڑی میں نہیں ہے۔

"رفیقی!" — عبدالقدیر نے رفیقی سے پوچھا — "چادر تمہارے گھر کی تھی۔ اس پر دھوبی کا نشان ہوگا۔ کپڑے گھر تو نہیں دھلتے تھے؟"

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا چچا جان!" — رفیقی نے کہا — "چادریں دھوبی کے پاس بھی جاتی ہیں اور کبھی گھر میں دھلتی ہیں۔"

"اگر چادر پر دھوبی کا نشان ہے تو ہمارا سراغ مل سکتا ہے" — عبدالقدیر نے کہا — "ہاشمی صاحب پر شک تو ہے ہی۔ عزیز اور ورما موجود ہیں۔ وہ ہمارے محلے کے دھوبیوں کو یہ نشان دکھا کر معلوم کر لیں گے کہ یہ کون سے گھر کے کپڑوں کا نشان ہے۔"

"اللہ کرے یہ چادر دھوبی کے پاس کبھی نہ گئی ہو" — رفیقی نے کہا — "یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ چادر کی طرف کوئی توجہ ہی نہ کرے۔ دھوبی کا نشان شاید کسی کو نظر ہی نہ آتے۔"

"یہ انٹیلی جنس کا معاملہ ہے رفیقی!" — عبدالقدیر نے کہا — "وہ اس چادر کو غور سے دیکھیں گے۔ اگر لڑکی نے ہمیں شناخت کر لیا تو ہم صاف انکار کریں گے کہ لڑکی کبھی یہاں رہی ہے لیکن دھوبی کا نشان ہمارے خلاف شک کو یقین میں بدل دے گا۔ بہرحال دعا کرو۔ تم سب کی ٹریننگ بہت ضروری ہے۔ میدان میں لڑنا آسان ہے۔ دل مضبوط ہو تو ایک آدمی دو تین آدمیوں کا مقابلہ کر سکتا ہے لیکن چھوٹی چھوٹی چیزوں کا خیال رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ہمارے یہ تین شیر بڑی دلیری سے وہاں سے گاڑی نکال کر لے آتے ہیں لیکن دھوبی کے نشان کی چھوٹی چھوٹی دو تین لکیریں ان کے گلے کا پھندہ بن جائیں گی۔ اللہ نہ کرے ایسا ہو۔"

عبدالقدیر اسی وقت گاڑی لے گیا اور اپنے دوست کے گھر پہنچا۔ اسے جگایا اور گاڑی اس کے حوالے کر دی۔

گاڑی تو چلی گئی۔ ہاشمی اور دیگر تمام آدمی اپنے گھروں کو چلے گئے لیکن آنے والے وقت کے متعلق سب مضطرب اور پریشان تھے۔ ان کے سروں پر ایک سوالیہ نشان پھانسی کے پھندے کی طرح لٹک رہا تھا۔ فضا میں خطرے کی بو صاف محسوس ہو رہی تھی۔ ہاشمی اپنے گھر گیا تو بیوی نے اس سے پوچھا کہ اب کیا ہوگا تو ہاشمی اس کے سوا کوئی جواب نہ دے سکا تھا کہ دعا کرو، اللہ کوئی بہتر صورت پیدا کر دے۔

اس پُراسرار رات کے بطن سے جس صبح نے جنم لیا وہ ہر روز کی صبح جیسی تھی۔ اس کے اجالے میں کوئی انوکھا پن نہیں تھا، کوئی ندرت اور کوئی حیرت انگیز تبدیلی نہیں تھی لیکن عبدالقدیر، ہاشمی، رفیقی اور ان تین آدمیوں کے لئے جو گزشتہ رات رشی کو عزیز کی کوٹھی تک لے گئے تھے، یہ صبح بدلی بدلی سی تھی۔ اس صبح کا اجالا انہیں پھیکا پھیکا سا لگ رہا تھا۔

ان سب کے دلوں پر بوجھ سا تھا۔ سب وقت سے پہلے جاگ اٹھے اور فجر کی نماز کے لئے مسجد میں چلے گئے تھے۔ نماز تو وہ ہر روز پڑھتے تھے لیکن اس صبح وہ مکمل یکسوئی سے اس طرح نماز پڑھ رہے تھے جیسے اللہ

سے ہمکلام ہوں۔ نماز کے فوراً بعد وہ ایک دوسرے سے ملنے چل پڑے تھے۔ دو ہاشمی کے گھر جا پہنچے اور تین عبدالقدیر کے ہاں چلے گئے۔ ہر کسی کے ذہن میں یہی ایک سوال تھا — "اب کیا ہوگا؟"

صرف عبدالقدیر تھا جو انہیں تسلی دلاسہ دے سکتا تھا۔ انٹیلی جنس کے طریقۂ کار کو وہی سمجھتا تھا۔ اُس نے محسوس کر لیا کہ اُس کے ساتھی ڈرے ہوتے ہیں اور ڈر کو چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ سب کو اکٹھا کر کے اُن کے حوصلے بلند کرنا چاہتا تھا لیکن سب کو اکٹھا کرنے میں خطرہ تھا۔ اُس کے ہاں جو دو آدمی گئے تھے انہیں حوصلہ دیا پھر ہر ایک کے ہاں جا کر سب کی حوصلہ افزائی کی۔

"مجاہد کا جذبہ کتنا ہی مضبوط اور حوصلہ کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو" — اُس نے سب سے کہا — "وہ جب دشمن کے سامنے میدان میں آتا ہے تو اُس پر ہیجانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جس میں خوف بھی شامل ہوتا ہے۔ لڑائی شروع ہوتے ہی نہ ہیجان رہتا ہے نہ خوف۔ تم اس میدان میں پہلی بار اُترے ہو اس لئے تمہاری ذہنی کیفیت یہی ہونی چاہیئے۔ اپنے مقصد اور نصب العین کو سامنے رکھو اور دیکھو کہ یہ مقصد اللہ کو کس قدر عزیز ہے۔ تم کوئی جرم نہیں کر رہے۔ مقصد کے حصول کے لئے ہم میں سے کسی کو تو خون اور جان کا نذرانہ دینا پڑے گا... خیال رکھو کہ ہم میں سے کوئی بھی پکڑا جاتے تو چاہیے اُس کی جان چلی جاتے وہ اپنے کسی ساتھی کی نشاندہی نہ کرے۔ اپنے محاذ سے غداری نہ کرنا۔ محاذ سے غداری اللہ اور رسولؐ سے غداری ہے۔ سب سے زیادہ خطرہ میرے اور ہاشمی صاحب کے لئے ہے۔ لڑکی ہم دونوں کو شناخت کرے گی۔ ہم دونوں کی عمر دیکھو۔ کیا ہم اذیتیں سہنے کے قابل ہیں؟ ... نہیں... ہم بوڑھے ہیں لیکن تم دیکھ لینا کہ ہم تم میں سے کسی کی بھی نشاندہی نہیں کریں گے۔ تم اپنا کام جاری رکھنا۔"

وہ دن گزرنے میں ہی نہیں آتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے سورج ایک مقام پر آ کر رُک گیا ہو۔ ہاشمی اور عبدالقدیر ریٹائرڈ زندگی گزار رہے تھے، دوسرے اپنے اپنے کام کاج پر چلے گئے۔ ہاشمی اور عبدالقدیر کے

دروازے پر دستک ہوتی تو وہ سمجھتے کہ انٹیلی جنس کا بلاوا آیا ہے۔

آخر عبدالقدیر کے دروازے پر وہ دستک ہوتی جس کا وہ بے تابی سے انتظار کر رہا تھا۔ وہ باہر نکلا۔ دو اجنبی کھڑے تھے۔ وہ سویلین لباس میں تھے۔ انہوں نے عبدالقدیر کو اپنے کارڈ دکھاتے۔ وہ انٹیلی جنس کے آدمی تھے۔

"مسٹر عبدالقدیر؟"

"جی ہاں!" — عبدالقدیر نے جواب دیا — "میں عبدالقدیر ہوں۔"

"آپ انٹیلی جنس سروس سے ریٹائر ہوتے ہیں" — ایک نے اُس سے ہاتھ ملاتے ہوتے مُسکرا کر کہا — "آپ کا ایڈریس آفس سے لیا ہے۔"

"حکم!"

"حکم نہ کہیں" — انڈین انٹیلی جنس کے اس افسر نے کہا — "درخواست ہے، ہمارے ساتھ چلیں۔ کپڑے بدلنے کی ضرورت نہیں۔"

"میں گھر والوں کو بتا آؤں؟"

"نہیں مسٹر عبدالقدیر!" — افسر نے کہا — "آپ خود انٹیلی جنس میں رہ چکے ہیں۔ دستور آپ کو معلوم ہے۔"

یہ دونوں آگے بڑھے۔ ایک عبدالقدیر کے دائیں اور دوسرا بائیں ہو گیا۔ دونوں نے اُس کے بازوؤں پر ہاتھ رکھ دیتے اور اُسے اپنے ساتھ لے کر چل پڑے۔ وہ بڑے پیار سے باتیں کرتے جا رہے تھے جیسے ایک دوست کو پکنک پر لے جا رہے ہوں۔

گلی سے نکلے تو باہر ایک فوجی ڈاج گاڑی کھڑی تھی۔ عبدالقدیر کو اس گاڑی میں داخل کر دیا گیا۔ اس میں ہاشمی پہلے سے موجود تھا۔ عبدالقدیر یہ دیکھ کر پریشان ہو گیا کہ ہاشمی کے ساتھ اُس کی بیوی بھی برقعے میں لپٹی بیٹھی تھی۔ گاڑی میں دو آدمی اور تھے جو انٹیلی جنس کے کارندے معلوم ہوتے تھے۔ عبدالقدیر کو لانے والے ان کے ساتھ بیٹھ گئے اور گاڑی چل پڑی۔

ہاشمی کے گھر کا پتہ عزیز نے دیا تھا اور اُس نے انٹیلی جنس کے ایک آدمی کو دُور سے یہ گھر دکھا یا بھی تھا۔

راستے میں کسی نے کسی کے ساتھ کوئی بات نہ کی اور گاڑی ایسی جگہ پہنچ گئی جس سے عبدالقدیر اچھی طرح واقف تھا۔ چھوٹی سی ایک عمارت تھی جس کے اردگرد دیوار تھی۔ اس کا گیٹ لوہے کا تھا۔ باہر سے دیکھنے سے پتہ چلتا تھا کہ یہ کوئی خاص جگہ ہے۔ اس کے باہر کوئی بورڈ نہیں تھا۔

گاڑی اس گیٹ میں داخل ہوگئی۔ عبدالقدیر کو معلوم تھا کہ اندر کیا ہے۔ اس عمارت کو اندر سے وہ اس طرح جانتا تھا جس طرح وہ اپنے جسم سے واقف تھا۔ جس طرح آج وہ یہاں لایا جا رہا تھا اس طرح وہ کئی آدمیوں کو یہاں لایا تھا۔ ان میں زیادہ تر وہ آدمی تھے جن پر پاکستانی جاسوس ہونے کا شبہ ہوتا تھا۔ ان میں بھارتی مسلمان بھی ہوتے تھے، پاکستانی بھی۔ عبدالقدیر نے ان کے ٹارچر میں بھی حصہ لیا تھا۔

اُس وقت عبدالقدیر کچھ اور قسم کا انسان ہُوا کرتا تھا بلکہ وہ عبدالقدیر کوئی اور تھا۔ وہ بھارتی انٹیلی جنس کا ایک اہم کل پُرزہ تھا۔ اُس کی نگاہ میں ہندو، مُسلم، سِکھ، عیسائی، ملکی اور غیر ملکی برابر تھے۔ وہ اپنا مذہب بھُول گیا تھا۔ اُس کا دین اور اُس کا دھرم اُس کا وہ فرض تھا جو انٹیلی جنس نے اُسے سونپا تھا۔

ہندو افسروں کی خوشنودی اُس کی زندگی کا مشن تھا۔ پاکستان کے نام نے اُس کے خیالوں میں کبھی ہلچل پیدا نہیں کی تھی۔ اسلام کے ساتھ اُس نے تعلق توڑ لیا تھا۔ دِلی کی جامع مسجد کے امام عبداللہ بخاری کا نام سُن کر اُسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی مشتبہ کا اور بھارت کے کسی دشمن کا نام لیا گیا ہو۔

وہ کبھی پولیس میں ہیڈ کانسٹیبل ہُوا کرتا تھا۔ سراغرسانی اُس کی فطرتِ ثانی تھی۔ اُس کی ذہانت کو دیکھ کر اُسے سی آئی اے میں بھیج دیا گیا تھا۔ وہاں انٹیلی جنس کے کسی بڑے افسر نے اُسے دیکھا تھا۔ وہ کوئی ایسا کیس تھا جس کی تفتیش سی آئی اے بھی کر رہی تھی اور انٹیلی جنس بھی۔ عبدالقدیر نے عہدہ اتنا چھوٹا ہونے کے باوجود سراغرسانی میں اتنا نمایاں رول ادا کیا تھا کہ

انٹیلی جنس کا ایک افسر اُس سے بہت متاثر ہُوا اور اُسے پولیس سے نکلوا کر انٹیلی جنس میں لے لیا تھا۔ اس محکمے میں آتے ہی اُس کی مُسلم دشمنی مشہور ہوگئی تھی۔ یہاں اُسے کسی پاکستانی ایجنٹ کی بُو مل جاتی وہ اُس کے ساتھ سائے کی طرح لگ جاتا تھا۔

اُس کی عمر پچپن سال ہوگئی۔ کہتے ہیں اس عمر میں انسان اپنی فطرت نہیں بدل سکتا لیکن عبدالقدیر کی فطرت میں ایسا انقلاب آیا جیسے کاغذ کا ایک پُرزہ بگولے کی لپیٹ میں آگیا ہو۔ اُس کی فطرت میں یہ بگولہ اس طرح اُٹھا کہ وہ ایک پاکستانی جاسوس کا پیچھا کر رہا تھا۔ اُسے وہ فوراً پکڑ سکتا تھا لیکن وہ اُس کے پورے رِنگ (گروہ) کو پکڑنے کی کوشش میں تھا۔ اُس کے پیچھے وہ انبالہ، امرتسر اور جالندھر تک گیا اور اُس کے چار ٹھکانے دیکھ لیے۔

یہ جاسوس جن لوگوں سے ملا ان سب کے ایڈریس معلوم کر لیے، اور ایک روز عبدالقدیر اس پاکستانی جاسوس کے ساتھ تین آدمیوں کو گاڑی میں بٹھا کر اس عمارت کے آہنی گیٹ میں داخل ہُوا تھا جس میں آج اُسے ملزم کی حیثیت سے داخل کیا گیا تھا۔

اگلے ہی روز اس رِنگ کے دو اور آدمی جو بھارتی مسلمان تھے، گرفتار کر کے لائے گئے۔ پاکستان کی انٹیلی جنس کا ایک پورا رِنگ نہ صرف ٹوٹ گیا بلکہ انڈین انٹیلی جنس کے قبضے میں آگیا۔

یہ مارچ اپریل ۱۹۷۲ء کا واقعہ تھا۔ بھارت کی کوششوں سے مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن چکا تھا۔

”عبدالقدیر!“ — اُس کے شعبے کے چیف نے اُسے مبارکباد اور خراجِ تحسین کے بعد کہا تھا — ”تمہارا کام ختم ہو چکا ہے لیکن مَیں چاہتا ہوں کہ اس رِنگ سے مزید راز تم ہی اُگلواؤ اور ان سے اقبالِ جُرم کراؤ۔ پاکستانی ایجنٹ سے جو انفارمیشن لینی ہے اس کی بریفنگ میں تمہیں دوں گا۔ یہ کام تم ہی کر سکتے ہو۔ تمام کریڈٹ تم ہی لو۔“

عبدالقدیر کو بہت خوشی ہوتی تھی جیسے اُسے روح کی غذا مل

گئی ہو۔

وہ پاکستانی ایجنٹ کو ٹارچر سیل میں لے گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس تاریک کوٹھڑی میں جانور ذبح کئے جاتے ہوں۔ خون اور غلاظت کی اتنی بدبُو کہ دماغ چکراتا تھا۔ عبدالقدیر نے اپنی ناک پر کپڑا باندھ لیا تھا۔

"یہاں تم مر بھی جاؤ گے تو تمہیں کوئی نہیں پوچھے گا"— عبدالقدیر نے پاکستانی سے کہا — "لیکن میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھ سے یہ گناہ نہ کراؤ۔ مسلمان کے ہاتھوں مسلمان کا خون گناہِ کبیرہ ہے۔"

"تم اگر واقعی مسلمان ہو تو اپنے آپ کو میرے ساتھ نہ ملاؤ"— پاکستانی نے کہا — "میں سچا مسلمان ہوں اور تم نام کے مسلمان ہو۔ میں اس کوشش میں ہوں کہ میری روح بھوکی نہ رہے اور تم اس فکر میں ہو کہ تمہارا پیٹ خالی نہ رہے۔ مَیں اللہ اور رسول اللہ کی خوشنودی کا طلبگار ہوں اور تمہیں کافر کی خوشنودی درکار ہے۔ تم بے ضمیر ہو اور میں سرتاپا ضمیر ہوں۔ تم وہ مسلمان نہیں ہو جس کے لئے کسی مسلمان کا خون گناہِ کبیرہ ہے۔ تم میرا خون کر دو۔ میں تمہارا مشکور ہوں گا۔"

"بیوقوف!"— عبدالقدیر نے ہنستے ہوئے کہا — "یہاں صرف پاکستانی جاسوسوں کو لایا جاتا ہے۔ جو بھی آتا ہے وہ تمہاری طرح پہلے تقریر کرتا ہے.... یوں کرو"— عبدالقدیر نے اُس کے آگے ایک کاغذ رکھ کر کہا — "یہ پڑھ لو اور ان سوالوں کے جواب دے دو"— وہ اُٹھا اور بولا — "اچھی طرح سوچ لو۔ میں تمہیں دو گھنٹے، تین گھنٹے مہلت دوں گا۔ صحیح جواب دے دو گے تو تمہاری بہتری کے لئے تمہارے سامنے ایسی تجویز رکھوں گا کہ عش عش کر اُٹھو گے۔ خدا کی قسم، تمہیں انڈیا اور پاکستان کا شہزادہ بنا دوں گا۔"

"ہندو کا دیا کھانے والا کسی کو کیا شہزادہ بنائے گا"— پاکستانی نے کہا — "بیٹھے رہو۔ مجھے مہلت نہیں چاہئے۔ مَیں ان میں سے کسی ایک بھی سوال کا جواب نہیں دوں گا .... میں تمہیں صرف ایک چیز دے سکتا ہوں۔"

"کیا؟"

"اپنی جان"— پاکستانی نے جواب دیا۔

"تمہاری جان محفوظ رہے گی"— عبدالقدیر نے کہا — "اور تم ہر سوال کا جواب دے دو گے۔ میرے پاکستانی دوست! تم سمجھ نہیں رہے کہ مَیں تم پر کتنی بڑی نیکی کر رہا ہوں .... یہ بھی سن لو۔ تمہارا مغربی پاکستان بھی چند دنوں کا مہمان ہے۔ اُس ملک کے لئے کام کرو جو ہمیشہ رہنے والا ہو۔ انڈیا کے لئے کام کرو۔"

پاکستانی کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ آگئی۔

سات آٹھ دنوں بعد اس پاکستانی کی حالت یہ ہو گئی تھی کہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ اُس کی گردن اُس کے سر کا بوجھ نہیں سہار سکتی تھی۔ اُس کی ہڈیاں چیخ رہی تھیں۔ وہ خون تھوکتا تھا۔ اُس پر غنودگی طاری تھی۔ آنکھیں نہیں کھلتی تھیں۔ مُنہ سے اونچی آواز نہیں نکلتی تھی۔

"تم پاکستان کے جاسوس ہو"— اُسے ہر روز بارہا کہا جاتا تھا۔

"ہاں!"— وہ ہر بار یہی جواب دیتا — "مَیں پاکستان کا جاسوس ہوں۔"

"اب ان سوالوں کے جواب دو۔"

"نہیں!"— وہ ہر بار کہتا — "کسی اور سوال کا جواب نہیں دوں گا۔ کسی کے خلاف بیان نہیں دوں گا۔"

ہر بار اُس پر ایذارسانی کا کوئی نیا طریقہ آزمایا جاتا۔

"سر!"— ایک روز عبدالقدیر نے اپنے چیف سے کہا — "یہ پتھر نہیں فولاد ہے۔ پتھر ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ نہیں ٹوٹتا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کو جو انفارمیشن چاہئے وہ اس کے سینے میں ہے۔ اس کے سینے میں ذرا سی جان رہ گئی ہے لیکن وہ راز نہیں دے رہا۔"

"دے گا"— چیف نے کہا — "اسے کچھ کھلاؤ پلاؤ۔ ایک دو دن آرام دو، پھر اس سے پوچھو۔"

عبدالقدیر اپنے کمرے میں بیٹھ گیا۔ اُس نے میز کا دراز کھولا۔ اس میں چاندی کا ایک تعویذ پڑا تھا۔ اس چوکور تعویذ کے ساتھ ایلاسٹک تھا۔ یہ عبدالقدیر نے اس پاکستانی کے بازو سے اُتارا تھا۔ یہ اُس نے زبردستی اُتارا تھا۔ پاکستانی کہتا تھا کہ یہ اُس کے ساتھ قبر میں جائے گا۔ عبدالقدیر نے یہ اُس کے بازو سے اُتار کر اپنے دراز میں رکھ لیا تھا۔

چیف سے بات کر کے وہ اپنے کمرے میں آیا اور تعویذ نکالا۔ چاندی کے خول کو دیکھا۔ اس پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کھُدا ہُوا تھا۔ عبدالقدیر نے پہلے نہیں سوچا تھا۔ اُسے اب خیال آیا کہ اس میں کوڈ (خفیہ) الفاظ میں کوئی پیغام نہ ہو۔ اُس نے چاقو کی نوک سے خول کھولا۔ اس میں سے ایک کاغذ نکلا۔ اس پر لکھا تھا ___ لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ ___ کاغذ کے دوسری طرف لکھا تھا ___ کیونکر خس و خاشاک سے دب جاتے مسلمان!

عبدالقدیر یوں چونک پڑا جیسے اُس کے کمرے میں بڑا ہی زوردار دھماکہ ہُوا ہو جس نے اُسے ہوا میں اچھال کر زمین پر پٹخ دیا ہو۔ اُسے اس پاکستانی جاسوس کی کچھ باتیں یاد آنے لگیں۔ یہ کوئی لمبی چوڑی باتیں نہیں تھیں۔ صرف یہ کہ اُسے ٹارچر سے ادھ موا کر کے عبدالقدیر کہتا تھا کہ وہ ان سوالوں کے جواب دے دے تو وہ غنودگی یا نیم غشی کی حالت میں کہتا تھا ___ "مَیں نے اپنے اللہ کے پاس لَوٹ کر جانا ہے" ___ کبھی کہتا ___ "مسلمان ہو تو اللہ سے پوچھو" ___ یہ الفاظ تو وہ بار بار کہتا تھا ___ "تم ہندو کی اولاد ہو؟"

"کیا تمہیں معلوم ہے حضرت بلالؓ نے اسلام قبول کیا تو کفارِ مکّہ انہیں کس طرح اذیتیں دیتے تھے؟" ___ پاکستانی نے ایک روز پہلے عبدالقدیر سے کہا اور اس کا جواب سنے بغیر کہا تھا ___ "حضرت بلالؓ ہوش میں آتے تو اُن کے مُنہ سے احد کے کلمے نکلتے تھے..... میں بھی رسولؐ کے انہی عاشقوں میں سے ہوں۔ میرے مُنہ سے تم بھی

کچھ سُنو گے۔"

عبدالقدیر چاندی کے خول سے نکالے ہوئے کاغذ کے پُرزے کو دیکھ رہا تھا اور پاکستانی جاسوس کی باتیں اُس کے ذہن میں گونج رہی تھیں۔ وہ اپنے خون میں حرارت سی محسوس کر رہا تھا جو بڑھتی جا رہی تھی۔

"کیونکر خس و خاشاک سے دب جاتے مسلمان!"

اُسے اپنی آواز سنائی دی۔ اُس نے کاغذ کے پُرزے کو اور زیادہ غور سے دیکھا۔

"لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ۔"

اُس کے جسم نے جھرجھری لی۔ اُسے سات آٹھ روز پہلے کی بات یاد آئی۔ وہ شام کو گھر گیا تو بیوی نے اُسے بتایا کہ صبیحہ کو ایک ہندو لڑکا روزانہ تنگ کرتا ہے۔ صبیحہ عبدالقدیر کی بڑی بیٹی تھی۔ وہ بی اے کے آخری سال میں تھی۔ کالج سے چُھٹی کے وقت ایک ہندو لڑکا اس کے پیچھے لگ جاتا اور محبت کا اظہار کرتا تھا۔

دوسرے دن عبدالقدیر بیٹی کے کالج چلا گیا اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ اُس کی بیٹی دوسری لڑکیوں کے ساتھ باہر آئی تو وہ لڑکا اُس کے ساتھ چل پڑا۔ عبدالقدیر نے اُسے پکڑ لیا۔

"کیوں؟" ___ اس ہندو لڑکے نے بڑی دلیری سے عبدالقدیر سے کہا ___ "کیا کیا ہے مَیں نے؟ اس سے پوچھو۔ مَیں اسے چھیڑتا تو نہیں۔ میں کوئی فضول بکواس نہیں کرتا۔ مَیں تو اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا تم نہیں جانتے کہ یہ مسلمان ہے اور تم ہندو ہو؟" ___ عبدالقدیر نے پوچھا۔

"تو کیا ہُوا؟" ___ ہندو لڑکے نے جواب دیا ___ "یہاں کتنی ہندوؤں نے مسلمان لڑکیوں کے شادیاں کی ہیں۔ اگر آپ اس کے باپ ہیں تو میری بات مان لیں۔ مَیں بڑے امیر باپ کا بیٹا ہوں" ___ اس

نے اپنے باپ کا نام اور پتہ بتا کر کہا ——"اگر آپ کی بیٹی نے میرے ساتھ شادی کر لی تو ہماری حکومت کی طرف سے آپ کو بہت فائدہ ملے گا"۔

عبدالقدیر ایک ہندو لڑکے کی اس دلیری کو دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ اُس نے غصہ دباتے ہوئے اِس لڑکے سے کہا کہ وہ اس کی بیٹی کا پیچھا چھوڑ دے۔

"تم مسلمانوں کا دماغ پھر گیا ہے"—— ہندو لڑکے نے کہا —— "ہمارے مُلک میں رہ کر تم اپنے مذہب کی پابندی کرتے ہو۔ تم پاکستان کیوں نہیں چلے جاتے؟"

"ہندو کی اولاد!"—— عبدالقدیر نے اُس کے کان میں کہا —— "میں کل تمہیں یہاں نہ دیکھوں"۔

وہ اپنی بیٹی کو ساتھ لے کر گھر آگیا۔

دوسرے دن لڑکی نے بتایا کہ لڑکا پھر اُس کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اپنے باپ کو سمجھالو ورنہ وہ بہت خراب ہوگا۔

اس سے اگلے روز عبدالقدیر نے اپنے چیف کو بتایا کہ اِس طرح ایک لڑکا اُس کی بیٹی کو تنگ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ اس کی بیٹی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔

"یہ تو بہت اچھا ہے"—— چیف نے کہا۔ چیف بھی ہندو تھا —— "اگر آپ اپنی بیٹی اس ہندو لڑکے کو دے دیں تو آپ کو فوری ترقی مل سکتی ہے۔ حکومت ایسی شادیوں کی حوصلہ افزائی کر رہی ہے۔ آپ کے خیالات تو پہلے ہی عام مسلمانوں سے مختلف ہیں"۔

"لیکن میں اپنی بیٹی کسی ہندو کو نہیں دے سکتا"—— عبدالقدیر نے کہا۔

"کیوں؟"—— چیف نے کہا —— "ہندو اچھوت ہوتے ہیں؟ میں حیران ہوں کہ مسلمان ہندو کی برتری کو قبول کیوں نہیں کرتے؟ تم تو اچھے خاصے فرمانبردار آدمی ہو۔ اپنا بھلا بُرا سوچ لو"۔

عبدالقدیر نے دو تین غنڈوں کے ساتھ بات کی۔ یہ اُس کے اپنے آدمی تھے۔ انہوں نے کالج جا کر اس ہندو لڑکے سے اُس کی بیٹی کو نجات دلائی اور اُس نے فیصلہ کر لیا کہ بی اے کا امتحان ختم ہوتے اپنی بیٹی کی شادی کر دے گا۔

یہ سات آٹھ روز پہلے کا واقعہ تھا۔ اُس کے دل پر، ذہن اور خیالات پر اس کا بہت بُرا اثر تھا۔ پاکستانی جاسوس کے تعویذ نے اس اثر کو اور زیادہ گہرا کر دیا اور اُس کے سینے میں سویا ہُوا مسلمان بیدار ہو گیا۔ اُسے خیال آیا کہ یہ پاکستانی اللہ کا پیارا بندہ ہے اور وہ خود اللہ کے دھتکارے ہوئے بندوں میں سے ہے۔

پاکستانی جاسوس اُس کے ذہن پر غالب آگیا۔

اُس کے چیف نے کہا تھا کہ اُسے کھلاؤ پلاؤ اور ایک دو دن آرام دے کر اُس سے پوچھو۔ عبدالقدیر نے کاغذ کا پُرزہ چاندی کے خول میں ڈالا اور خول بند کر کے جیب میں ڈال لیا۔ وہ اُٹھا اور ٹارچر سیل میں چلا گیا۔ پاکستانی جاسوس سویا ہُوا یا بیہوش پڑا تھا۔ وہ تو لاش بن چکا تھا۔ اس کی ناک اور مُنہ سے خون نکلا اور وہیں جم گیا تھا۔ وہ پیٹھ کے بل پڑا تھا۔

عبدالقدیر کچھ دیر اُسے دیکھتا رہا اور اُس کے ذہن میں طوفان اُٹھتا رہا۔ اُسے اس پاکستانی کی آواز سنائی دی —— "مسلمان ہو تو اللہ سے پوچھو.... تم ہندو کی اولاد ہو.... لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ" —— یہ آواز اس کمرے کی ہیبت ناک اور متعفن فضا میں لرزتی ہوئی گونج کی طرح سنائی دے رہی تھی۔

عبدالقدیر کے ذہن میں ایسے خیال آنے لگے جو پہلے کبھی نہیں آتے تھے۔ کسی بھی مشتبہ اور ملزم کے لئے اُس نے ایسے کبھی نہیں سوچا تھا۔ اُسے خیال آیا کہ یہ پاکستانی زندہ نہیں رہ سکے گا۔ زندہ رہا بھی تو بہت بُری اذیت میں زندہ رہے گا۔ ایک ہی روز پہلے اس کا ڈاکٹری معائنہ

کرایا گیا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اس کا جگر مجروح معلوم ہوتا ہے۔ ٹارچر سیل کی چکی میں پسنے والے ملزموں کا ڈاکٹری معائنہ اس لئے نہیں کرایا جاتا تھا کہ ان کا علاج کیا جاتے بلکہ یہ معلوم کرنا مقصود ہوتا تھا کہ یہ کتنا اور ٹارچر برداشت کرنے کے قابل ہے اور کیا یہ مطلوبہ راز اُگلنے سے پہلے ہی تو نہیں مرجاتے گا؛

پاکستانی جاسوس کی ڈاکٹری رپورٹ مخدوش اور تشویشناک تھی عبدالقدیر کا چیف کہتا تھا کہ اسے آرام اور خوراک دے کر مزید ایذارسانی میں ڈالو۔ عبدالقدیر دیکھ چکا تھا کہ یہ شخص کچھ نہیں بتاتے گا۔ اس نے ہتھیار ڈالنے ہوتے تو ایک دو روز بعد ہی ڈال دیتا۔ اس کی نجات کا کوئی راستہ، کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ اسے نہ جانے کب تک نہ زندہ رہنا تھا نہ مُردہ۔ انٹیلی جنس کے اِس جہنم سے نکل کر اس نے بھارت کی کسی جیل میں باقی عمر گزارنی تھی جہاں پاکستانی قیدیوں کو مسلسل اذیت اور ذِلّت میں رکھا جاتا تھا۔

"مَیں اسے نجات دلاؤں گا" ـــ عبدالقدیر نے اپنے آپ سے کہا۔

اُس نے کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ ایک کونے میں پھٹا پرانا، میلا کچیلا تولیہ پڑا تھا۔ عبدالقدیر نے دروازے کی سلاخوں سے جھانکا۔ سنتری پرے چلا گیا تھا۔ وہاں سنتری کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ رسمی طور پر برآمدے میں ملٹری پولیس کا ایک سنتری گھومتا پھرتا رہتا تھا۔

عبدالقدیر نے تولیہ اُٹھایا۔ اسے تہہ در تہہ کر کے پیڈ سا بنایا اور یہ پیڈ پاکستانی جاسوس کے مُنہ پر رکھ دیا۔ اُس کا مُنہ اور ناک پیڈ کے نیچے آگئے۔ عبدالقدیر نے پیڈ پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر دباؤ ڈالا۔ پاکستانی نہ مُنہ کے راستے سانس لے سکتا تھا نہ ناک کے راستے۔ وہ بیہوش پڑا تھا۔ عبدالقدیر نے اور زیادہ دباؤ ڈالا۔ دم گھٹنے سے پاکستانی کا جسم تڑپا اور ذرا سی دیر تڑپ کر بے جان ہوگیا۔

عبدالقدیر نے اُس کی نبض دیکھی۔ نبض خاموش ہو چکی تھی عبدالقدیر

نے سکون اور اطمینان کی آہ بھری۔ اُس نے پاکستانی کے لئے بہت بڑی نیکی کی تھی کہ اسے اس جہنم سے نجات دلادی تھی۔ اس کے سوا نجات کا کوئی اور ذریعہ نہیں تھا۔ اُس نے تولیہ پرے پھینک دیا اور جیب سے تعویذ نکال کر اسے دیکھا پھر اسے چُوما، آنکھوں سے لگایا اور پاکستانی کا بازو اُٹھا کر اس کا دھاگہ بازو میں آگے کہنی سے اُوپر تک کر دیا اور آستین اُوپر کر دی۔

اس لاش کا کون سا پوسٹ مارٹم ہونا تھا کہ پتہ چل جاتا کہ اِس ملزم کو قتل کیا گیا ہے۔ اس کال کوٹھڑی میں آتے دن قتل ہوتے تھے۔

عبدالقدیر اپنے چیف کے پاس گیا اور اُسے بتایا کہ پاکستانی ملزم مر گیا ہے۔

"اوہ بیوقوف!" ـــ چیف نے کہا ـــ "تم نے ایک ذریعہ ضائع کر دیا ہے۔"

"یہ اکیلا ہی تو نہیں تھا سر!" ـــ عبدالقدیر نے کہا ـــ "اس کے ساتھی موجود ہیں۔ صرف ایک ذریعہ ضائع ہوا ہے۔"

"لاش ہسپتال کو دے دو" ـــ چیف نے کہا۔

ایسی لاشیں سرکاری ہسپتال کو بھیج دی جاتی تھیں جہاں انہیں لاوارث قرار دے کر میڈیکل کالجوں کو دے دیا جاتا تھا۔

"سر!" ـــ عبدالقدیر نے کہا ـــ "ایک عرض ہے۔"

"ہاں ہاں!" ـــ چیف نے کہا۔

"مَیں اس لاش کو باقاعدہ دفن کرنا چاہتا ہوں" ـــ عبدالقدیر نے کہا۔

"کیا لگتا تھا یہ تمہارا؟" ـــ چیف نے پوچھا۔

"معلوم نہیں سر!" ـــ عبدالقدیر نے مغموم سے لہجے میں کہا ـــ "یہ مسلمان تھا۔ میں نے آپ کی، آپ کے ملک کی اور انٹیلی جنس کی بہت خدمت کی ہے سر! میں نے اپنے مذہب کا کبھی خیال نہیں کیا تھا۔"

"کیا یہ ملک تمہارا نہیں؟" ـــ چیف نے پوچھا اور جواب سُنے بغیر

کہنے لگا — "تم اپنے ملک کے دشمن کا باقاعدہ جنازہ بھی پڑھو گے؟ .... نہیں کیا ہو گیا ہے عبدالقدیر؛ تم ایسے جذباتی تو نہیں ہوا کرتے تھے۔"

"میں بوڑھا ہو گیا ہوں سر!" — عبدالقدیر نے کہا — "شاید میری یہ جذباتی حالت بڑھاپے کی وجہ سے ہو گئی ہے۔ سر! پولیس کی سروس ملا کر تیس سال سروس ہو گئی ہے۔ دن رات بھاگتا دوڑتا رہا ہوں۔ اب مجھے ریٹائر ہو جانا چاہیئے۔"

عبدالقدیر جانتا تھا کہ اُسے اِس پاکستانی جاسوس کی لاش نہیں ملے گی اور اگر وہ لاش کے لئے ضد کرے گا تو اُسے پاکستان کا جاسوس سمجھ لیا جاتے گا۔ اُس نے سوچا کہ وہ دو بیٹیوں اور تین بیٹوں کا باپ ہے۔ ان کا مستقبل تباہ ہو جاتے گا۔ پنشن نہیں ملے گی بلکہ پنشن کی بجاتے سزا ملے گی۔ اُس نے جب اپنے اور اپنی اولاد کے مستقبل کے متعلق سوچا تو اُس نے محسوس کیا کہ ہندو اُس کا ہمدرد اور بہی خواہ نہیں ہو سکتا چاہے اُس نے ساری عمر ہندوؤں کی خدمت میں گزار دی ہو۔ اُس کا دل تو ایک ہفتہ پہلے ہی اکھڑ گیا تھا جب اُس کے چیف نے اُسے کہا تھا کہ اپنی بیٹی اُس ہندو نوجوان کو دے دو جو اُس کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔

"سر!" — عبدالقدیر نے اپنے چیف کو خوش کرنے کے لئے ہنس کر کہا — "میں معافی چاہتا ہوں۔ معلوم نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔ مجھے غلط نہ سمجھنا سر! میری اِس درخواست پر ضرور غور کرنا کہ مجھے ریٹائر ہو جانا چاہیئے۔ میرے اعصاب بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھ سے کوئی کام بگڑ جاتے۔ یہ محکمہ بہت نازک ہے سر!"

عبدالقدیر ذہانت اور فہم و فراست کے لحاظ سے بہت ہوشیار اور گہرا آدمی تھا۔ اُس نے باتوں میں اپنے چیف کو جو کٹر برہمن تھا، رام کر لیا اور اپنے خلاف کوئی شک پیدا نہ ہونے دیا، لیکن اُس نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ مزید سروس نہیں کرے گا اور ریٹائر ہو جاتے گا۔ ایک مہینے بعد اُسے پنشن پر بھیج دیا گیا۔ دو مرتبہ اُسے سروس میں ایک ایک سال

کی توسیع دی گئی تھی۔

یہ چار ساڑھے چار سال پہلے کا واقعہ ہے عبدالقدیر نے جب چیف کو بتایا تھا کہ پاکستانی جاسوس مر گیا ہے اور یہ بھی کہا تھا کہ وہ اُسے باقاعدہ دفن کرنا چاہتا ہے تو چیف کا ردِ عمل دیکھ کر اُس نے پاکستانی کی لاش حاصل کرنے کا خیال ذہن سے نکال دیا تھا۔ اُس نے صرف یہ کیا تھا کہ ٹارچر سیل میں جا کر لاش کے بازو سے تعویذ اُتار لیا تھا اور اسے بڑے احترام سے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ اس تعویذ نے اُس کے خیالات کو اس راستے پر ڈال دیا تھا جس پر وہ اب نہ صرف خود چلا جا رہا تھا بلکہ پورے ایک گروہ کو اپنی رہنمائی میں اس راستے پر لے جا رہا تھا۔ اس کا دین و ایمان بھارت کے مسلمانوں اور پاکستان کا اتحاد اور وقار تھا۔

چار ساڑھے چار سال بعد وہ خود اس عمارت میں ملزم کی حیثیت سے لایا گیا تھا اور پاکستانی جاسوس کا تعویذ اُس کے بازو کے ساتھ بندھا ہُوا تھا جس کے خول پر لکھا تھا، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور اس کے اندر کاغذ کے ایک پُرزے پر ایک طرف کلمۂ طیبہ اور دوسری طرف لکھا تھا — کیونکر خس و خاشاک سے دب جاتے مسلمان!

عبدالقدیر، ہاشمی اور اُس کی بیوی کو گاڑی سے اتار کر ایک کمرے میں لے جایا گیا جو میجر بھاٹیہ کا دفتر تھا۔ وہ خود دفتر میں موجود تھا۔ ان تینوں کو دیکھ کر وہ اُٹھ کھڑا ہُوا اور پُرتپاک طریقے سے اُن کا استقبال کیا اور انہیں احترام سے بٹھایا۔ صرف عبدالقدیر کو معلوم تھا کہ ایسے پُرتپاک استقبال اور احترام کے پیچھے کتنی بڑی خباثت اور انٹیلی جنس کی نیت کام کر رہی ہے۔

"آپ شاید انٹیلی جنس میں رہ چکے ہیں" — میجر بھاٹیہ نے عبدالقدیر سے کہا — "ہم تو آپ کے بچے ہیں۔ آج بھی کسی نہ کسی کیس میں آپ کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ ہم تو آپ کو اپنا اُستاد مانتے ہیں۔"

"لیکن مائی ڈیئر!" — عبدالقدیر نے کہا — "آج تو میری اُستادی جواب دے گئی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے میں نے انٹیلی میں سروس نہیں کی بلکہ تیس سال جھک ماری ہے یا بھاڑ جھونکتا رہا ہوں۔"

"کیوں جناب!"

"دو آدمی گئے" — عبدالقدیر نے کہا — "مجھے اپنے کارڈ دکھاتے اور ملزموں کی طرح پکڑ کر یہاں لے آتے۔ اب اپنے خلاف الزام سُننے کو بے تاب ہوں۔"

"میرا خیال ہے ہمارے چیف کو آپ سے کچھ زیادہ ہی محبت ہے" — بھاٹیہ نے ایسے منافقانہ لہجے میں کہا جیسے عبدالقدیر بڑی اچھی طرح سمجھتا تھا۔

میجر بھاٹیہ ہنستا مُسکراتا اُٹھا اور باہر نکل گیا۔ دس پندرہ منٹ بعد وہ دو آدمی کمرے میں داخل ہُوئے جو عبدالقدیر، ہاشمی اور اس کی بیوی کو یہاں لاتے تھے۔ اُن کے ساتھ رِشی تھی۔ وہ دروازے کے قریب ہی رُک گئے۔

"کیا آپ صاحبان ذرا اُس دیوار کے ساتھ کھڑے ہو جائیں گے؟" — ان میں سے ایک آدمی نے انہیں کہا — "میں گستاخی کی معافی چاہتا ہوں۔"

عبدالقدیر، ہاشمی اور اس کی بیوی کرسیوں سے اُٹھ کر دیوار کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ اتنے میں میجر بھاٹیہ بھی کمرے میں آ گیا اور انٹیلی جنس کے ان دو افسروں کے پاس کھڑا ہو گیا۔

"مسز رب نواز!" — انٹیلی جنس کے ایک افسر نے رِشی سے کہا — "ان تین چہروں کو تم پہچانتی ہو گی!.... اچھی طرح دیکھ کر بتاؤ کہ انہیں تم نے کہاں دیکھا تھا۔"

رِشی نے ان تینوں کو دیکھنا شروع کر دیا۔

عبدالقدیر، ہاشمی اور اس کی بیوی کی یہ کیفیت تھی جیسے اُن پر سکتہ طاری ہو گیا ہو۔ اندر سے وہ کانپ رہے تھے۔ عبدالقدیر بھی جسے تیس سال

کا تجربہ تھا، یوں محسوس کرنے لگا جیسے اندر سے کھوکھلا ہو گیا ہو۔ اُس نے آنکھیں رِشی کی آنکھوں میں ڈال دیں اور کلمہ طیبہ کا وِرد دل ہی دل میں شروع کر دیا۔ یوں لگتا تھا جیسے وقت اس لمحے پر آ کر رُک گیا ہو، زمین نے اپنی گردش اور سورج نے اپنا سفر روک لیا ہو۔ عبدالقدیر کو ٹارچر سیل نظر آنے لگا، لیکن اُس نے دل ہی دل میں کلمہ طیبہ کا وِرد جاری رکھا۔

رِشی ان تینوں کو باری باری سر سے پاؤں تک اور پاؤں سے سر تک دیکھ رہی تھی۔ اُس کے چہرے کے تاثر میں کوئی تبدیلی نہیں آ رہی تھی۔

بمشکل آدھا منٹ گزرا تھا، لیکن لگتا تھا آدھا گھنٹہ گزر گیا ہے۔ اس کمرے میں کوئی بھی کوئی حرکت نہیں کر رہا تھا۔ لگتا تھا سب پتھر کے بُت بن گئے ہیں۔ آخر رِشی نے اپنے سر کو جنبش دی۔ اُس نے انٹیلی جنس کے ایک افسر کی طرف دیکھا۔

"یہ کون لوگ ہیں؟" — رِشی نے پوچھا — "آپ کہتے ہیں کہ میں ان چہروں کو پہچانتی ہوں، لیکن میں انہیں پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔"

"اچھی طرح دیکھ لو مسز رب نواز!" — میجر بھاٹیہ نے کہا۔

"کیا دیکھ لوں!" — رِشی نے جھنجھلا کر کہا — "آپ کیوں میرا تماشا بنا رہے ہیں؟ معلوم ہوتا ہے آپ مجھے اپنے کسی مقصد کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔ خدا کے لئے مجھے پاکستان واپس بھیج دیں۔ میں آپ کے کسی کام نہیں آ سکتی۔"

رِشی کو جس طرح اس کمرے میں لایا گیا تھا اسی طرح باہر لے گئے۔ میجر بھاٹیہ بھی اُن کے پیچھے نکل گیا۔ نکلتے نکلتے اُس نے عبدالقدیر وغیرہ سے کہا کہ کرسیوں پر بیٹھ جائیں۔ اُس کے جانے کے بعد عبدالقدیر نے اپنی ایک آستین اُوپر کر کے پاکستانی جاسوس کے تعویذ کو چُوما، پھر دونوں ہاتھ اُٹھا کر اُوپر دیکھا اور بولا — "یا اللہ! تیرا شکر کس طرح ادا کروں!"

ہاشمی اور اُس کی بیوی کے چہروں پر رنگت لوٹ آئی۔

"گستاخی معاف!" — پندرہ بیس منٹ بعد میجر بھاٹیہ کمرے

میں یہ کہتے ہوئے داخل ہوا — "میں آپ سے معافی مانگنے کے سوا اور کوئی بات نہیں کروں گا۔ اب فرمائیے، چائے چلے گی یا پانی؟"

"کچھ بھی نہ چلے مائی ڈیئر!" — عبدالقدیر نے کہا — "اجازت ہو تو ہم ہی چل پڑیں۔"

"ہاں ہاں" — میجر بھاٹیہ نے بڑے خوشگوار لہجے میں کہا — "آپ فارغ ہیں۔ چلئے گاڑی باہر کھڑی ہے۔"

میجر بھاٹیہ تینوں کو باہر لے گیا۔ جس ڈاج پر وہ آئے تھے، وہ باہر کھڑی تھی۔ میجر بھاٹیہ نے ڈرائیور سے کہا کہ ان تینوں کو وہیں چھوڑ آئے جہاں سے لایا تھا۔ اُس نے بڑے تپاک سے عبدالقدیر اور ہاشمی سے ہاتھ ملایا اور ہاشمی کی بیوی کے آگے جھک کر الوداع کہا۔

ان کے جانے کے بعد میجر بھاٹیہ عزیز کو چیف کے دفتر میں لے گیا۔ یہ عبدالقدیر والا چیف نہیں تھا بلکہ انڈین انٹیلی جنس کا ڈائریکٹر ایک ہندو میجر جنرل تھا۔ عزیز پہلے سے وہاں موجود تھا، لیکن اُس نے اپنے آپ کو عبدالقدیر وغیرہ سے چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ ان تینوں کی نشاندہی عزیز نے ہی کی تھی، لیکن رشی نے ان تینوں کی شناخت سے انکار کر دیا تھا۔

"اب بتاؤ عزیز!" — چیف نے عزیز سے پوچھا — "معلوم ہوتا ہے تمہارے دل میں عبدالقدیر اور ہاشمی کے خلاف کوئی ذاتی دشمنی ہے۔ لڑکی نے اپنے بیان میں ان تینوں کا ذکر تک نہیں کیا تھا۔ اُس نے تو یہ بیان دیا تھا کہ اُسے اُسی کی سوسائٹی کے لڑکوں جیسے لڑکے دھوکے سے لے گئے تھے اور اُسے دو تین کوٹھیوں میں رکھا تھا، لیکن تم نے زور دے کر کہا کہ لڑکی غلط بیان دے رہی ہے اور یہ ہاشمی کے گھر رہی ہے۔"

"تم نے مجھے ان تینوں کے سامنے ذلیل کر دیا ہے" — میجر بھاٹیہ نے کہا۔

"تمہیں ہی نہیں" — میجر جنرل نے کہا — "سارے محکمے کو ذلیل کر دیا ہے۔"

"میں ابھی ہارا نہیں سر!" — عزیز نے کہا — "میری بہن نے ایک لڑکی کو ہاشمی کے گھر میں دیکھا تھا۔ میں اپنی یہ کارگزاری آپ کو سنا چکا ہوں۔ میں اپنی بہن کو کل بلکہ آج ہی یہاں لاؤں گا اور لڑکی کو اُس کے سامنے کھڑا کر کے آپ کی موجودگی میں پوچھوں گا کہ اُس نے اس لڑکی کو ہاشمی کے گھر دیکھا تھا یا وہ کوئی اور تھی۔"

"یہ بھی کر کے دیکھ لینا" — بھاٹیہ نے کہا — "میں خود چاہتا ہوں کہ شک پوری طرح رفع کر لیا جاتے، لیکن لڑکی پہلے جو بیان دے چکی ہے، وہ پرانی دلی کے کسی بھی محلے کی طرف نہیں جاتا۔"

عزیز میں یہی ایک خوبی تھی کہ وہ انتہا درجے کا ڈھیٹ اور ضدی تھا۔ انٹیلی جنس میں اُس کی کامیابی کی وجہ یہی تھی۔۔۔ لڑکی ہاشمی کے گھر رہی تھی، لیکن اس کی کوئی شہادت عزیز کے ہاتھ میں نہیں تھی نہ کوئی ثبوت تھا۔ شہادت ایک ہی رہ گئی تھی۔ یہ اُس کی بہن تھی۔

"مسٹر عزیز!" — چیف نے کہا — "معلوم ہوتا ہے تمہارا دماغ پہلے جیسا کام نہیں کر رہا۔ تمہارے بیان کو میں نے غور سے سنا ہے۔ لڑکی کو واپس لانے والی گاڑی تمہارے سامنے کھڑی تھی۔ لڑکی نے اس گاڑی کی طرف اشارہ کر کے تمہیں کہا کہ وہ اس گاڑی میں لائی گئی ہے۔ تم سے اتنا بھی نہ ہوا کہ سب سے پہلے اُس گاڑی کا نمبر، میک اور ماڈل دیکھتے۔ انگریزی فلموں کی طرح تم نے اپنی گاڑی اُس گاڑی کے پیچھے دوڑا دی۔ نمبر پھر بھی نہ دیکھا اور مار کھا کر آ گئے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں، عبدالقدیر اور فریدالدین ہاشمی اس ٹائپ کے لوگ نہیں کہ وہ یوں تم پر حملہ کرتے جس طرح تم سناتے ہو۔ یہ کوئی پیشہ ور غنڈے تھے یا یہ آج کل کے بگڑے ہوئے نوجوان تھے۔ یہ سب کچھ سوچ کر لڑکی کا بیان صحیح معلوم ہوتا ہے۔"

"ایک منٹ کے لئے اجازت چاہتا ہوں سر!" — عزیز نے اُٹھ کر کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

دو تین منٹ بعد وہ واپس آیا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک سفید چادر تھی۔ اُس

نے چادر کا ایک کونہ چیف کی میز پر اُس کے سامنے رکھا۔ اُس کونے پر دھوبی
کا نشان تھا۔

"یہ دیکھیں سَر!" — عزیز نے اُنگلی دھوبی کے نشان پر رکھ کر کہا —
"یہ دھوبی کا نشان ہے۔ آپ حکم دیں کہ عبدالقدیر اور ہاشمی وغیرہ جس علاقے میں
رہتے ہیں وہاں کے دھوبیوں کو یہ نشان دکھا کر پوچھا جاتے کہ یہ کس کے
گھر کا نشان ہے۔"

چیف نے آگے ہو کر اور میجر بھاٹیہ نے جھک کر دھوبی مارک کو دیکھا۔

"یہ ایک سراغ ہے" — چیف نے کہا — "بھاٹیہ! یہ نشان معلوم
کرنے کا انتظام کرو.... ہاں عزیز! یہ سراغ سامنے لانے پر میں تمہاری تعریف
کرتا ہوں۔ ایک دن میں ملزم سامنے آجائیں گے۔"

عبدالقدیر، ہاشمی اور اُس کی بیوی کو فوجی گاڑی وہیں گلی کے باہر
اُتار گئی جہاں سے لے گئی تھی۔ عبدالقدیر، ہاشمی کے گھر چلا گیا۔ واپس
آتے ہوتے اُنھوں نے آپس میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ اپنے گھر آ
کر بیٹھ گئے تو بھی ان پر خاموشی طاری تھی۔

"عبدالقدیر صاحب!" — آخر ہاشمی نے سکوت توڑا — "یقین
نہیں آتا۔ یہ کوئی دھوکہ ہی تو نہیں؟ آپ کو انٹیلی جنس کا تجربہ ہے۔"

"میں تو اسے معجزہ کہوں گا" — عبدالقدیر نے کہا — "بیشک ہم
نے لڑکی کے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا جس کی اسے توقع تھی۔ ہم نے اُس
کی عزت کا پورا خیال رکھا تھا لیکن ہم نے اُسے اغوا کیا تھا، اُسے قید
میں رکھا تھا۔ اُس کا ردِّعمل یہی ہونا چاہیئے تھا کہ ہمیں پکڑوا دیتی۔ یہ اُس
کلاس کی لڑکی ہے جس کے لئے وطن اور مذہب کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔
یہ لوگ عزت اور آبرو کو کچھ نہیں سمجھتے۔ اُن کے ہاں شخصی وقار کا تصور
کچھ اور ہوتا ہے.... ہاشمی صاحب! یہ اللہ کا خاص کرم ہے.... میرا خیال
ہے کہ یہ کوئی چال نہیں۔ ہم جیسے مشتبہوں کو دھوکے دیئے جاتے ہیں۔
انہیں یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ ان کے خلاف شبہ صاف ہو گیا ہے لیکن مخبروں
کو اُن کے ساتھ سائے کی طرح لگا دیا جاتا ہے۔"

"بھائی جان!" — ہاشمی کی بیوی نے عبدالقدیر سے کہا — "اس
لڑکی نے میرے ساتھ جو باتیں کی تھیں وہ یاد کرتی ہوں تو خیال آتا ہے
کہ اس کی فطرت میں انقلاب آگیا تھا اور وہ ہمیں پہچاننے سے انکار کر
دے گی۔"

"میرے ساتھ بھی اُس نے ایسی ہی باتیں کی تھیں" — ہاشمی نے
کہا — "لیکن آج جب انٹیلی جنس کا بلاوا آیا تو میں نے اپنے آپ کو

ذہنی طور پر تیار کر لیا تھا کہ ہم پکڑے گئے ہیں اور باقی عمر جیل میں گلتے سڑتے رہیں گے۔"

"مجھے صرف بھابی کا غم تھا" ___ عبدالقدیر نے کہا۔

"وہ ہمارے پاس رہنا چاہتی تھی" ___ ہاشمی کی بیوی نے کہا ___ "کہتی تھی پاکستان نہیں جاؤں گی۔ میرا تو جی چاہتا ہے کہ اسے ایک بار پھر اغوا کر کے لے آئیں۔"

"نہیں بھابی!" ___ عبدالقدیر نے کہا ___ "یہ جذباتی باتیں ہیں۔ معاملہ بڑا ہی سنگین ہے۔ ہمیں ابھی کچھ عرصہ بہت ہی محتاط ہونا پڑے گا۔"

"ہمارے دوست پریشان ہوں گے" ___ ہاشمی نے کہا ___ "آج شام انہیں یہاں بلا کر بتا دیا جائے گا کہ کیا ہُوا ہے۔"

"نہیں ہاشمی صاحب!" ___ عبدالقدیر نے کہا ___ "یہ نہ سمجھیں کہ انٹیلی جنس نے ہم سے توجہ ہٹا لی ہوگی۔ مجھے ابھی ایک اور خطرہ نظر آ رہا ہے۔ ہو سکتا ہے اور شاید ایسا ہی ہو کہ لڑکی کو ڈرا دھمکا کر اُس سے کہلوا لیں کہ وہ ہمارے پاس ہی رہی ہے۔ یہ تو عین ممکن ہے کہ ہمیں چھوڑ کر ایک دو مخبر ہم پر نظر رکھنے کے لئے مقرر کر دیئے گئے ہوں۔ اگر ہم یہاں اکٹھے ہوتے تو ہمارے خلاف شک پیدا ہو سکتا ہے۔ دوستوں کو بتانے کا انتظام میں یہ کروں گا کہ فرداً فرداً سب کو بتا دوں گا.... معلوم نہیں لڑکی نے کیا بیان دیا ہوگا۔"

"اُس نے کچھ تو بتایا ہوگا" ___ ہاشمی نے کہا ___ "ہمارے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔"

"یہ تو جو ہُوا سو ہُوا" ___ ہاشمی کی بیوی نے کہا ___ "اور جو ہوگا وہی ہوگا جو منظورِ خدا ہوگا۔ اب یہ سوچیں کہ ہم نے اتنا بڑا خطرہ کیوں مول لیا تھا اور اب ہمیں اس سلسلے میں کیا کرنا چاہیئے۔"

"مَیں اس سوال کا جواب دیتا ہوں" ___ عبدالقدیر نے کہا ___ "ہم یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ ہندوستان کی انٹیلی جنس پاکستان سے

ایسے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو جو یورپی اور امریکی بے حیائی کو اپنا کلچر بنا بیٹھے ہیں، ورغلا کر اور سبز باغ دکھا کر یہاں لے آتی ہے۔ اتفاق سے انڈین انٹیلی جنس کا ایک ایجنٹ ہمارے سامنے آ گیا جسے ہم بڑی اچھی طرح جانتے اور پہچانتے تھے۔ یہ عزیز ہے۔"

"یہ تو پتہ چل گیا ہے" ___ ہاشمی نے کہا ___ "اس میں کوئی شک نہیں رہا کہ انڈین انٹیلی جنس کا یہ کام عزیز بھی کرتا ہے اور اس لڑکی اور اس کے خاوند کو وہ اسی مقصد کے لئے یہاں لایا تھا۔ اب ہمیں یہ یقین ہو گیا ہے کہ یہ لڑکی نہیں جانتی کہ اُس کا خاوند انٹیلی جنس کا ایجنٹ بن چکا ہے۔ ہم یہی معلوم کرنا چاہتے تھے اور ہمارا شک یقین میں بدل چکا ہے۔ اب بتائیے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔"

"مَیں بتاتا ہوں" ___ عبدالقدیر نے مسکراتے ہوئے کہا ___ "یہ تو مَیں پہلے ہی سوچ چکا ہوں۔ یہاں یعنی انڈیا میں ہم اس رِنگ کو نہیں توڑ سکتے۔ یہ پاکستان میں توڑا جائے گا۔ مَیں نے لڑکی سے اُس کے ماں باپ اور اُس کے خاوند کے باپ کے متعلق پوری تفصیلات اسی لئے لی تھیں کہ مجھے اصل کارروائی پاکستان میں کرنی تھی۔ مَیں آپ کو پہلے بتا چکا ہوں کہ پاکستان کی انٹیلی جنس کا ایک آدمی جو یہاں مقیم ہے میری نظر میں ہے۔ وہ مجھے جانتا ہے اور میں اُسے جانتا ہوں۔"

"میرے ساتھ آپ نے اُس کا تعارف کبھی نہیں کرایا" ___ ہاشمی نے کہا۔

"اور کراؤں گا بھی نہیں" ___ عبدالقدیر نے کہا ___ "ہو سکتا ہے آپ اُسے ملے بھی ہوں لیکن مَیں اپنی زبان سے کبھی نہیں کہوں گا کہ یہ ہے وہ آدمی۔"

"نہیں نہیں!" ___ ہاشمی نے کہا ___ "مَیں آپ کا مطلب سمجھتا ہوں۔ مجھے نہ بتائیں۔ کبھی نادانستہ طور پر بات مُنہ سے نکل جاتی ہے۔"

"ہاشمی صاحب!" ___ عبدالقدیر نے ذرا آگے ہو کر راز داری

کے لہجے میں کہا — "ہمارا محاذ پھیلتا جا رہا ہے اور اس میں مجاہدین کا اضافہ ہو رہا ہے۔ اس خطرے کو ہر وقت ذہن میں رکھیں کہ انڈین انٹیلی جنس کا کوئی مخبر بھی مجاہد کے بہروپ میں ہمارے محاذ میں شامل ہو سکتا ہے۔"

"میں تو اور زیادہ شکی مزاج ہوں" — ہاشمی نے کہا — "جوں جوں محاذ کی نفری بڑھتی جا رہی ہے مجھے یہ خدشہ نظر آنے لگا ہے کہ انہی میں سے کوئی غدار نہ نکل آئے۔ آپ جانتے ہیں کہ جہاں ولولہ اور شجاعت تاریخِ اسلام کا طرۂ امتیاز ہے وہاں غداری اور ایمان فروشی بھی ہماری تاریخ کا ایک لازمی حصہ ہے۔"

"ہمیں محتاط ہونا پڑے گا" — عبدالقدیر نے کہا — "اور اس کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ خطرے قبول کرنے پڑیں گے۔ ... میں آپ کو بتا رہا تھا کہ ایک پاکستانی ایجنٹ کے ساتھ میرا رابطہ ہے۔ میں اُسے اس لڑکی کا اور اس کے سُسر کا پاکستان کا ایڈریس دوں گا اور اُسے بتاؤں گا کہ اس لڑکی کا خاوند رب نواز جو اپنی سوسائٹی میں رابی کہلاتا ہے، انڈین انٹیلی جنس کا کل پُرزہ بن چکا ہے اور پاکستان کا یہ نوجوان پاکستان کے لئے اس لئے خطرناک ہے کہ اس کا باپ وہاں کی ڈیفینس سروسز میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہے اور انتہائی قیمتی اور خطرناک راز اس کی فائلوں میں موجود ہوں گے۔"

ان کے درمیان پھر خاموشی طاری ہو گئی۔ وہ فضا میں ایک خطرے کی بُو سونگھ رہے تھے۔ اُن کے دلوں سے گھبراہٹ کم ہو گئی تھی لیکن ختم نہیں ہوئی تھی۔ تینوں کے ذہنوں میں یہی ایک سوال کلبلا رہا تھا کہ رِشی نے انٹیلی جنس کے افسروں کو کیا بتایا ہو گا کہ وہ کہاں چلی گئی تھی۔

❦

رِشی نے انڈین انٹیلی جنس کے میجر بھاٹیہ کو پھر میجر جنرل کو جو بیان دیا تھا وہ انڈین انٹیلی جنس کو بڑی حد تک قابلِ قبول تھا۔

"اُس روز عزیز اور رابی مجھے ہوٹل میں چھوڑ کر چلے گئے تھے" —

رِشی نے بیان میں کہا تھا — "شام کے وقت ایک نوجوان جو زبان سے اینگلو انڈین معلوم ہوتا تھا، میرے کمرے میں آیا۔ مجھے اس طرح شک ہوتا ہے کہ اسے میں نے اُن دو کلبوں میں سے ایک میں دیکھا تھا جن میں مجھے اور رابی کو لے جایا گیا تھا۔ اگر وہ میرے سامنے آئے تو میں اُسے پہچان سکتی ہوں ....

"اُس نے مجھے کہا کہ عزیز اور رابی مجھے بلا رہے ہیں۔ وہ ایک انگریزی پکچر دیکھیں گے۔ اس اینگلو انڈین نے مجھے کہا تھا کہ وہ ہمیں پکچر دکھا رہا ہے۔ میں اُس کے ساتھ چل پڑی۔"

"تم نے کمرہ لاک کر کے چابی کاؤنٹر پر نہیں دی تھی؟" — میجر بھاٹیہ نے اُس سے پوچھا۔

"خیال ہی نہیں رہا تھا" — رِشی نے جواب دیا — "یہ پہلا موقع تھا کہ میں اتنے بڑے ہوٹل میں ٹھہری تھی۔ مجھے اس ہوٹل کا دستور معلوم نہ تھا .... میں کمرہ لاک کئے بغیر اس اینگلو انڈین نوجوان کے ساتھ چل پڑی۔ وہ مجھے ہوٹل کے گیٹ سے باہر لے گیا۔ کچھ دُور ایک کار کھڑی تھی۔ اس کے سٹیئرنگ پر اسی کی عمر کا ایک نوجوان بیٹھا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا اور ہیلو بھی کہا۔ مجھے پچھلی سیٹ پر بٹھایا گیا۔ مجھے ہوٹل سے لانے والا میرے ساتھ بیٹھ گیا اور گاڑی چل پڑی۔"

"تمہیں ہوٹل سے لانے والا تمہارے ساتھ باتیں کرتا رہا تھا؟" — میجر بھاٹیہ نے پوچھا — "اگر کرتا رہا تھا تو اُس کا مُوڈ کیسا تھا؟"

"اُس کا مُوڈ سنجیدہ نہیں تھا" — رِشی نے جواب دیا — "وہ بڑی بے تکلفی سے باتیں کر رہا تھا جیسے میرا دوست ہو۔ میں بھی اُس کے ساتھ بے تکلف رہی۔ اُس نے ذرا سا بھی شک نہ ہونے دیا کہ مجھے اغوا کیا جا رہا ہے۔ گاڑی چل پڑی۔ مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ یہ دونوں مجھے کہاں لے جا رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد گاڑی ایک ایسی سڑک پر چلی گئی جہاں روشنی بھی کم تھی۔ گاڑی ایک موڑ مُڑ کر رُک گئی۔ فٹ پاتھ پر دو آدمی کھڑے تھے۔ دونوں گاڑی کی طرف آئے۔ ایک میرے ساتھ پچھلی سیٹ پر اور دوسرا

اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا"۔

"اُنہوں نے کچھ کہا تھا؟"

"نہیں!" — رشی نے جواب دیا — "وہ خاموشی سے بیٹھ گئے تھے اور خاموش ہی رہے تھے۔ گاڑی چل پڑی اور پھر اچانک میرے دائیں اور بائیں بیٹھے ہوئے دونوں آدمیوں نے مجھے جکڑ لیا پھر ایک نے ایک کپڑا میری آنکھوں پر رکھ کر میرے سر کے پیچھے باندھ دیا میرا دوپٹہ میرے سر پر ڈال دیا گیا۔ وہ جو مجھے ہوٹل سے لایا تھا اُس نے مجھے کہا کہ مُنہ سے آواز نہ نکالنا ورنہ ماری جاؤ گی۔ ہم تمہیں ہمیشہ کے لئے اغوا نہیں کر رہے۔ دو تین دن تمہیں ساتھ رکھیں گے۔ تم ہماری کمپنی کو انجوائے کرو گی۔ ہم تمہیں یہیں چھوڑ جائیں گے۔ میں نے انہیں کہا کہ جس طرح تم مجھے لے جا رہے ہو اس طرح میں خاک انجوائے کروں گی؟ کیا تم مجھے میرے خاوند کے ساتھ انوائیٹ نہیں کر سکتے تھے؟....

"اُس نے کہا کہ خاوند ساتھ ہو تو سارا مزہ بگڑ جاتا ہے۔ پھر بھی گھبراؤ نہیں۔ تم واپس آ رہی ہو۔ ہم تمہاری ہی سوسائٹی کے لڑکے ہیں۔ فرق صرف انڈین اور پاکستانی کا ہے۔ ہم نے سُنا ہے کہ اس سوسائٹی کی پاکستانی لڑکیاں بہت سویٹ اور فری ہوتی ہیں .... یہ کہہ کر اُس نے ایک بازو میرے گلے میں ڈال دیا اور میرا سُر اپنے کندھے پر رکھ کر اپنا ایک گال میرے سر پر رکھ دیا۔ دوسرے نے میرا ایک ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ میں انہیں روک نہ سکی۔ میں ان کے قبضے میں تھی۔ گاڑی بڑی تیز رفتار سے جا رہی تھی۔ میں نے انہیں کہا کہ میں ان کی مہمان ہوں اور کیا وہ مہمانوں کے ساتھ یہ سلوک کیا کرتے ہیں؟ میرے دوسرے پہلو میں بیٹھے ہوئے نوجوان نے انڈیا اور پاکستان کو گالی دے کر کہا کہ ہمارا کوئی ملک نہیں۔ ہر وہ ملک ہمارا ہے جس میں عیش و عشرت اور پیار و محبت کی آزادی ہے۔ تم نہ پاکستانی ہو نہ انڈین ہو"۔

"بولنے کے انداز اور لہجے سے وہ چاروں اینگلو انڈین لگتے تھے؟"

"دو تو یقیناً اینگلو انڈین تھے" — رشی نے جواب دیا — "دوسرے دو صرف انڈین لگتے تھے۔ معلوم نہیں مسلمان تھے یا ہندو۔ وہ ہمارے لہجے میں انگریزی بولتے تھے"۔

رشی نے بڑی ہوشیاری اور چالاکی سے جھوٹ بولا۔ اُس نے باقی جو بیان دیا تھا وہ کچھ اس طرح تھا کہ یہ نوجوان ٹولہ اُسے سیڑھیاں چڑھا کر اُوپر ایک جگہ لے گیا۔ اُس کی آنکھوں سے پٹی ہٹائی گئی تو اُس نے دیکھا کہ کسی کوٹھی کا ایک کمرہ ہے۔ وہاں یہ چاروں نوجوان موجود تھے۔ انہوں نے اُسے یقین دلایا کہ وہ اُن کی مہمان ہے اور سوائے عیش موج کرنے کے اور کچھ بھی نہیں ہوگا۔ رشی نے کہا کہ اتنے دن اُسے اسی کمرے میں رکھا گیا۔

"تم اتنے دن اُن کے ساتھ رہیں" — اُس سے پوچھا گیا — "اور اسی کمرے میں رہیں۔ کیا تم نے کھڑکیوں میں سے باہر دیکھنے کی کبھی کوشش کی تھی؟"

"کی تھی" — اُس نے جواب دیا — "یہ فلیٹ کا کمرہ تھا اور شاید یہ تیسری منزل تھی"۔

اُس نے ویسے ہی کچھ بتا دیا کہ کھڑکی میں سے اُسے کیا منظر آیا۔ اُس نے کہا کہ اُسے کچھ فلیٹ اور باقی سب کوٹھیاں دکھائی دیں۔ اُس سے کچھ نشانیاں پوچھی گئیں لیکن وہ دِلّی کی نشانیوں کو نہیں سمجھتی تھی۔ اُس نے کہا کہ وہ انڈیا پہلی بار آئی ہے۔

اُس نے خود اعتمادی سے جھوٹ بولا۔ کہا کہ ان لڑکوں میں سے دو نے صرف ایک ایک بار اُس پر مجرمانہ حملہ کیا لیکن اسے وہ زبردستی نہیں کہہ سکتی کیونکہ وہ اُسے شراب پلاتے تھے۔ وہ نشے میں لڑکوں کے کیسٹ پلیئر پر انگریزی گانوں پر ناچتی تھی اور نشے میں ہی سب کچھ ہوتا تھا۔

واپسی کے متعلق اُس نے یہ کہانی گھڑ کر سنائی کہ جو اینگلو انڈین

نوجوان اُسے ہوٹل کے کمرے سے دھوکے میں لے گیا تھا، اُس نے اُس کے ساتھ کوئی نازیبا حرکت نہیں کی تھی۔ کچھ روز بعد وہ دن کے وقت اکیلا اُس کے پاس آیا اور جذباتی انداز میں والہانہ محبت کا اظہار کیا اور کہنے لگا کہ وہ اُس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔ اُس نے رشی کی منت سماجت کی کہ وہ اُس کی محبت کو قبول کرلے۔ اس اینگلو انڈین نے کہا کہ اُس نے اُسے تفریح طبع کے لئے اغوا کیا تھا لیکن وہ اُس کی محبت میں گرفتار ہوگیا ہے۔

"میں ان سے آزاد ہونا چاہتی تھی"۔۔۔ رشی نے بیان دیتے ہوتے کہا۔۔۔ "اس کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ میں نے اس نوجوان سے جھوٹ موٹ کہہ دیا کہ میں اس کے ساتھ شادی کرلوں گی۔ اُسی رات اُس نے اپنے ساتھیوں سے کہہ دیا کہ یہ لڑکی میری ہے اور اب کوئی اسے بُری نظر سے نہ دیکھے۔ اُس کے دوستوں نے اُس کی بات نہ مانی۔ اس پر اُن کا آپس میں زبانی جھگڑا ہوا پھر رات کو ان کی آپس میں ہاتھا پائی ہوتی۔ نوبت خون خرابے تک پہنچ گئی تھی۔ اینگلو انڈین یہ دھمکی دے کر چلا گیا کہ وہ ریوالور لے کر آتا ہے....

"اُس کے جانے کے بعد باقی تین لڑکوں نے میری موجودگی میں آپس میں صلاح مشورہ کیا اور اس فیصلے پر پہنچے کہ مجھے واپس چھوڑ آئیں ورنہ وہ دوست ایک دوسرے کا خون بہادیں گے۔ انہوں نے اُسی وقت مجھے کمرے سے نکالا اور میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر کمرے سے لے گئے۔ دو لڑکوں نے مجھے سہارا دے کر سیڑھیوں سے اُتارا پھر گاڑی میں بٹھایا"۔

"وہ تمہیں عزیز کے گھر کیوں لے گئے تھے؟"۔۔۔ میجر بھاٹیہ نے رشی سے پوچھا۔۔۔ "کیا اُنہوں نے تمہارے سامنے کوئی بات کی تھی؟"

"یہ بات گاڑی میں ہوتی تھی"۔۔۔ رشی نے جواب دیا۔۔۔ "وہ مجھے ہوٹل میں لے جارہے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ ہوٹل کے علاقے میں پکڑے جانے کا خطرہ ہے۔ اسے عزیز کے گھر چھوڑ آتے ہیں۔ اس

کا خاوند ہوٹل سے عزیز کے گھر شفٹ ہوگیا ہے۔ ایک نے پوچھا تم کیسے جانتے ہو؟ اُس لڑکے نے جواب دیا کہ میں اس کے خاوند رابی کی دعوت پر جو عزیز نے دی تھی وہاں جاچکا ہوں۔ عزیز تو اپنا یار ہے۔ گریٹ آدمی ہے"۔

میجر بھاٹیہ اور انٹیلی جنس کے چیف ہندو میجر جنرل نے رشی پر اس طرح جرح کی تھی جس طرح عدالت میں وکیل کیا کرتے ہیں اور پوچھ گچھ اُس طرح کی تھی جس طرح جاسوسی کے مشتبہ سے کی جاتی ہے لیکن رشی اپنے بیان پر قائم رہی۔ اُس نے شک نہ ہونے دیا کہ اُس نے سارا بیان جھوٹا دیا ہے۔

جس وقت عبدالقدیر، ہاشمی کے گھر بیٹھا ہوا تھا اور وہ، ہاشمی اور اُس کی بیوی آنے والے خطروں کے متعلق باتیں کر رہے تھے، اُس وقت میجر بھاٹیہ، ایک کرنل اور ایک سکھ میجر انٹیلی جنس کے چیف میجر جنرل کے کمرے میں بیٹھے ہوتے تھے۔ وہ اس مسئلے پر غور کر رہے تھے کہ رشی کا کیا کیا جاتے۔ چیف اور بھاٹیہ نے کرنل اور سکھ میجر کو تفصیلاً بتایا تھا کہ رشی اپنے خاوند کے ساتھ کیوں یہاں آئی تھی۔ رشی کے اغوا کی تفصیل بھی انہیں سنائی گئی اور اُس کا بیان بھی سنایا گیا اور یہ بھی بتایا گیا کہ رشی کو معلوم نہیں کہ اُس کا خاوند ہماری انٹیلی جنس میں نہ صرف شامل ہوچکا ہے بلکہ اُس نے دلی طور پر اس کام کو قبول کیا ہے۔

"ہمیں یہ خطرہ محسوس ہو رہا تھا"۔۔۔ میجر جنرل نے کہا۔۔۔ "کہ اس لڑکی کا اغوا پاکستان کی کاؤنٹر انٹیلی جنس کی کارروائی ہے۔ اس سے ہم انکار نہیں کرسکتے کہ پاکستان کی انٹیلی جنس جو ساری دنیا میں آئی ایس آئی کے نام سے مشہور ہوگئی ہے، انڈیا میں موجود ہے۔ اس کے ایجنٹ پاکستانی بھی ہیں اور انڈین مسلمان بھی۔ پاکستانی اور انڈین مسلمان کے درمیان فرق معلوم کرنا مشکل ہوجاتا ہے"۔

"سر! اتنا مشکل بھی نہیں" ——— ہندو کرنل نے کہا ——— "اگر ہمارے انڈین مسلم انہیں پناہ نہ دیں ..."

"کرنل اوجھا!" ——— میجر جنرل نے کہا ——— "تم نے کتنی کمزور بات کہی ہے۔ یہی تو اصل مسئلہ ہے کہ انڈین مسلم پاکستانی ایجنٹوں کو پناہ میں لے لیتے ہیں اور انہیں اپنے رشتہ دار ظاہر کرتے ہیں۔ مسجدوں اور مدرسوں میں انہیں مولوی بنا دیتے ہیں۔ بعض کو دکانیں کھول دیتے ہیں۔ انہیں داماد تک بنا لیتے ہیں۔ اسی لئے تو ہماری حکومت انڈیا اور پاکستان کے درمیان اسلام کا رشتہ توڑنے کی کوشش کر رہی ہے۔ مسلمانوں کو انعام اور مراعات کے ذریعے اُکسایا جا رہا ہے کہ وہ ہندو لڑکیوں کے ساتھ شادی کریں۔ یہ تو تم سب جانتے ہو کہ مسلمانوں کو کیسے کیسے زمین دوز طریقوں سے اسلام سے دُور کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ایسی ہندو لڑکیاں سامنے آگئی ہیں جو مسلمانوں کے ساتھ شادیاں کر رہی ہیں۔"

"سر!" ——— سکھ میجر نے کہا ——— "ضرورت یہ ہے کہ پاکستان اور بھارت کے مسلمانوں کے درمیان نفرت پیدا کی جائے۔ یہ میں جانتا ہوں کہ ہماری 'را' یہ کام کر رہی ہے لیکن اس کام کو اور تیز کرنا چاہئے۔"

"میجر سوہن سنگھ!" ——— چیف نے طنزیہ مسکراہٹ سے کہا ———

"یہ کام پاکستان کی حکومت خود ہی کر رہی ہے۔ وہاں حکومت ایوب کی ہو، بھٹو یا ضیاء کی ہو، وہ اپنی حکومت کو مضبوط اور اپنے دورِ حکومت کو لمبا کرنے میں مگن ہو جاتے ہیں۔ کھاتے پیتے اور عیش موج کرتے ہیں۔ پیسوں، اناج اور اسلحہ کے لئے امریکہ کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ امریکہ نے پاکستان کو خرید لیا ہے۔ انڈیا میں مسلمان ہندوؤں کے ہاتھوں قتل ہو رہے ہیں۔ پاکستان کی کسی حکومت کو آج تک جرأت نہیں ہوئی کہ ہماری حکومت سے احتجاج کرے۔ پاکستان کے اس رویے سے انڈیا کے مسلمانوں کے دلوں سے پاکستانیوں کی محبت نکلتی جا رہی ہے۔ 'را'

اس مہم کو تیزی سے سر کر رہی ہے۔ یہ تمہیں معلوم ہوگا کہ ہم بھی اس سلسلے میں بہت کچھ کر رہے ہیں۔ علی گڑھ میں ہندوؤں نے مسلمانوں کے خلاف جو فساد شروع کیا تھا اور جو ختم ہونے میں ہی نہیں آتا تھا، وہ ہم نے ہی یعنی انٹیلی جنس نے شروع کرایا تھا۔ وہاں مسلمانوں نے اسلحہ اکٹھا کرنا شروع کر دیا تھا اور وہاں پاکستانی کچھ زیادہ ہی تعداد میں اکٹھے ہو گئے تھے۔ اُن کے پاس باقاعدہ پاسپورٹ اور ویزے تھے لیکن انہیں وہاں سے نکالنا ضروری تھا۔ مسلمانوں کے گھروں سے اسلحہ بھی نکالنا تھا اور مسلمانوں کے اس تعلیمی اور ثقافتی مرکز علی گڑھ کی اہمیت کو بھی ختم کرنا تھا۔ حکومت نے یہ کام ہمارے سپرد کیا اور ہم نے یہ کام کر دیا۔"

"سر!" ——— کرنل اوجھا نے چیف سے کہا ——— "آپ ہمیں ایک لڑکی کے متعلق بریفنگ دے رہے تھے۔"

"ہاں!" ——— چیف نے کہا ——— "میں کہہ رہا تھا کہ اس لڑکی کا اغوا آئی ایس آئی کی کارروائی ہو سکتی تھی لیکن لڑکی کے بیان اور ہماری تفتیش سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ اسے پاکستانی جاسوسوں نے اغوا نہیں کیا تھا۔ ہم اگر مزید غور کریں تو خیال آتا ہے کہ پاکستانی ایجنٹوں نے اسے اغوا کر کے اس سے کیا حاصل کیا؟ وہ اس لڑکی کے خاوند کو اغوا کرتے .... پیشتر اس کے کہ میں اپنی رائے دوں، میں تمہاری رائے معلوم کرنا چاہتا ہوں .... کرنل اوجھا!"

"میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں سر!" ——— کرنل اوجھا نے کہا۔

"مجھ سے صرف اس لئے اتفاق نہ کرو کہ میں میجر جنرل اور تمہارے محکمے کا چیف ہوں" ——— میجر جنرل نے کرنل کی بات سُنے بغیر کہا ——— "آزادانہ رائے دو۔"

"لڑکی کو ان آوارہ اور مغرب زدہ لڑکوں نے ہی اغوا کیا تھا" ——— کرنل اوجھا نے کہا ——— "میں نے انہیں آوارہ کہا ہے لیکن یہ لوگ اس آوارگی کو کلچر کہتے ہیں۔ یہ پاپ سوسائٹی ہے جو ترقی یافتہ ملکوں سے شروع ہوئی اور ساری دنیا میں پھیل گئی ہے۔ ہم جیسے تیسری دنیا کے

ملکوں نے اس کا زیادہ اثر قبول کیا ہے۔ یہ امیر کبیر خاندانوں کے لڑکوں اور لڑکیوں کی سوسائٹی ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں کے نوجوانوں نے شاید کوئی اخلاقی حد مقرر کی ہو گی لیکن ہم لوگ انتہا پسند ہیں۔ ہمارے نوجوانوں نے باقاعدہ غنڈہ گردی شروع کر رکھی ہے۔ ان کے ذہنوں پر جنس، سیکس سوار ہے۔ ان میں ہم جنسی کا رجحان بھی پیدا ہو گیا ہے۔ ایسے کیس تو ہوتے ہی رہتے ہیں کہ دو تین لڑکے کسی لڑکی کو اٹھا کر لے گئے اور رات اپنے پاس رکھ کر صبح اُسے چھوڑ دیا .... سر! یہ میرا مشاہدہ ہے کہ ایک رات کے لئے اغوا ہونے والی لڑکی اگر اسی سوسائٹی کی ہے تو وہ اس سے لطف اُٹھاتی ہے، شکایت نہیں کرتی۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس لڑکی کا ردِ عمل کیا ہے۔ اگر میں اس کا ری ایکشن دیکھ لوں تو ہی بتا سکتا ہوں کہ اسے واقعی اس کے اپنے جیسے نوجوانوں نے اغوا کیا تھا۔"

"گُڈ!" —— چیف نے داد دیتے ہوئے کہا —— "لڑکی بہت خوش نہیں لیکن پریشان اور خفا بھی نہیں۔"

"میں کہہ سکتا ہوں کہ اس نے انجوائے کیا ہے" —— میجر بھاٹیہ نے کہا —— "اس نے ایک بار بھی نہیں کہا کہ اس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے اور انڈیا میں آکر وہ ذلیل ہوئی ہے، یا یہ کہ پولیس اِن لڑکوں کو گرفتار کرے .... ہم اِس لڑکی اور اس کے خاوند کو اِن نوجوانوں کے دو کلبوں میں لے گئے تھے۔ یہ اِس کے خاوند کی برین واشنگ کے سلسلے میں ایک اقدام تھا۔ ہمارا ایک ایجنٹ عزیز ان کلبوں اور چند ایک ڈسکو ٹائپ نوجوانوں کا دوست ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ جن پاکستانی نوجوانوں کو انڈیا میں ہم اپنے مقصد کے لئے لاتے ہیں انہیں اِن کلبوں میں لے جایا جاتا ہے۔ وہاں جو کچھ ہوتا ہے یہ اِن نوجوانوں کی روحانی غذا ہے۔ ہمارے اینگلو انڈین لڑکوں کو یہ لڑکی اچھی لگی تو اسے اپنے ساتھ لے گئے۔"

"یہ تو اس لڑکی کا اپنا بیان ہے" —— میجر جنرل نے کہا —— "اُس شام لڑکی ہوٹل میں اکیلی تھی۔ عزیز اِس کے خاوند کو کہیں لے گیا ہو گا۔ اتفاق سے یہ لڑکے ہوٹل میں چلے گئے ہوں گے اور لڑکی ان کے ساتھ اپنی شام منانے نکل گئی ہو گی۔ لڑکوں نے یہ دیکھ کر کہ لڑکی ان کے ساتھ خوش ہے تو اسے اتنے دن اپنے پاس رکھا۔"

"سر!" —— سکھ میجر نے کہا —— "اگر یہ پاکستانی ایجنٹوں کے ہاتھ نہیں چڑھ گئی تھی تو اسے چلتا کریں۔ اس کے خاوند کو توجہ میں رکھیں .... اُس کا ردِ عمل کیا ہے؟"

"وہ اس لڑکی پر شک کرتا ہے کہ یہ خود گئی تھی" —— چیف نے کہا —— "یہ اِس مسئلے کا دوسرا پہلو ہے جو میں تمہیں بتانا چاہتا ہے۔ چونکہ تم اِسی شعبے سے تعلق رکھتے ہو اس لئے تمہارا اس پہلو سے باخبر ہونا ضروری ہے .... لڑکی کا خود ان لڑکوں کے ساتھ چلے جانا یا اغوا ہونا ہمارے کام آ رہا ہے۔ ہم نے اِس کے خاوند کو جو رابی کہلاتا ہے اور پورا نام رب نواز ہے، اپنی ایک لڑکی کے ساتھ اٹیچ کر دیا ہے۔ یہ لڑکی ہندو ہے، لیکن اِس کا تعارف زینت آفتاب کے نام سے کرایا گیا ہے اور اس کا نِک نام زَینی رکھا ہے۔ یہ ایک نوجوان بیوہ ہے۔ اسے ہم نے دو سال پہلے ایک آشرم سے لیا اور اسے ٹریننگ دی تھی۔ ہم چاہتے ہیں کہ رابی اس لڑکی کے جال میں آجائے اور اس کے ساتھ شادی کر لے۔ ہم اِس لڑکی کو پاکستان میں داخل کرنا چاہتے ہیں۔ میجر بھاٹیہ بتاتا ہے کہ رابی زَینی کے جال میں آگیا ہے" —— چیف نے میجر بھاٹیہ کی طرف دیکھا اور چُپ ہو گیا۔

"ہمارے ایجنٹ عزیز نے یہ رپورٹ دی ہے" —— میجر بھاٹیہ نے کہا —— "کہ رابی نے اپنی بیوی کا یہ بیان تسلیم نہیں کیا کہ اُسے اغوا کیا گیا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ وہ خود گئی تھی۔ وہ دراصل اپنی بیوی کے حق میں کوئی بات سُننا ہی نہیں چاہتا کیونکہ اُس پر زَینی کا جادو چل گیا ہے۔ عزیز نے بتایا ہے کہ زَینی رِشی کے پاؤں اُکھاڑ رہی ہے اور رابی کے دل میں رِشی کے خلاف زہر بھر رہی ہے۔ وہ کامیاب جا رہی ہے۔"

"کیا اِن کی شادی یہاں کرائی جاتے گی؟" — کرنل ادجھا نے پوچھا۔

"نہیں!" — چیف نے جواب دیا — "یہ ایک ڈرامہ کھیلا جاتے گا .... میرا خیال ہے کہ اِس میٹنگ کو ہم وائنڈ اَپ کریں۔ رابی اور اُس کی بیوی رشی کو ہم واپس پاکستان بھیج رہے ہیں۔ رابی کی برین واشنگ ہو چکی ہے۔ یہ سونے کے انڈے دینے والی مُرغی ہے۔"

"سر!" — کرنل ادجھا نے پوچھا — "مَیں نے تو سُنا تھا کہ عزیز اور اُس کے ساتھی ورما نے بڑی پکّی رپورٹ دی تھی کہ لڑکی کو یہاں کے ...."

"مسلمانوں نے اغوا کیا تھا" — میجر جنرل نے اُس کی بات پوری کرتے ہُوتے کہا — "اور اسے پُرانی دِلّی کے ایک محلّے میں رکھا تھا .... لڑکی کے بیان نے اس کی تردید کر دی ہے۔ ہمارے لئے لڑکی کا بیان زیادہ قابلِ قبول ہے۔ تم نے آج دیکھا ہے کہ عزیز اور ورما کی نشاندہی پر دو آدمیوں اور ایک عورت کو یہاں بلایا گیا تھا اور لڑکی کو اِن کے سامنے کیا گیا تھا لیکن لڑکی نے ان کی شناخت نہیں کی۔ عزیز کے پاس ایک چادر ہے جو لڑکی پر ڈال کر اغوا کرنے والے اُسے واپس لاتے تھے۔ چادر پر دھوبی کا نشان ہے۔ میجر بھاٹیہ پولیس سے معلوم کراتے گا کہ یہ نشان اُس محلے کے دھوبی کا ہے یا نہیں جس کی نشاندہی عزیز کرتا ہے۔"

❁

عزیز کی تو یہ بہت بڑی شکست تھی۔ اُس کا ساتھی ورما بھی پریشان تھا۔ اُس کی جو پٹائی عبدالقدیر، ہاشمی اور ان کے دوستوں نے کی تھی، وہ اس کا بھی انتقام لینا چاہتا تھا۔

عزیز نے میجر بھاٹیہ سے کہا تھا کہ وہ اپنی بہن کو ساتھ لاتے گا اور رشی کو اُس کے سامنے کر کے پوچھے گا، کیا وہ لڑکی یہی نہیں تھی جسے اُس نے ہاشمی کے گھر دیکھا تھا؟ میجر بھاٹیہ نے اُسے کہا تھا کہ وہ بہن کو ضرور لاتے اور رشی کی شناخت کراتے۔

رات نو بجے کے کچھ بعد عزیز کی گاڑی اپنی بہن کے گھر کے سامنے رُکی۔ اُس نے گاڑی سے نکل کر دروازے پر دستک دی۔ اُس کے بہنوئی جمیل نے دروازہ کھولا۔ عزیز بازو پھیلا کر اُس کے ساتھ لپٹ گیا جیسے اُن کی ملاقات بڑے لمبے عرصے کے بعد ہوتی ہو۔ جمیل نے اپنے بازو نیچے ہی رکھے۔ وہ عزیز کا والہانہ استقبال کرنے کے مُوڈ میں نہیں تھا۔ جمیل نے اُسے اتنا بھی نہ کہا کہ اندر چلو۔

"آپا ہیں نا!" — عزیز نے کہا اور جمیل کو دروازے میں ہی کھڑا چھوڑ کر اندر چلا گیا۔

عزیز کی بہن زبیدہ نے شاید عزیز کی آواز سن لی تھی۔ وہ بچوّں کے کمرے سے نکل کر دیوان خانے کے دروازے تک آگئی۔ عزیز کو دیکھ کر اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور اُس کی سانسیں تیز ہو گئیں۔

"میری آپا!" — عزیز بازو پھیلا کر نعرہ سا لگاتے ہوئے اُس کی طرف بڑھا۔

زبیدہ کا ردِعمل اپنے خاوند جمیل سے زیادہ سرد تھا، لیکن عزیز کے ڈھیٹ پن کی انتہا یہ تھی کہ بہن کی سرد مہری بھانپنے کے باوجود بھی اُس نے بہن کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ بہن کے کہے بغیر وہ دیوان خانے میں چلا گیا جہاں بتیاں بجھی ہوتی تھیں۔ عزیز نے خود ہی سوئچ آن کئے اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ جمیل اور زبیدہ بھی اندر آگئے، لیکن وہ بیٹھے نہیں۔

"کیا لینے آتے ہو یہاں؟" — زبیدہ نے عزیز سے پوچھا تو دھیمی آواز میں لیکن اس آواز میں قہر و غضب بھرا ہُوا تھا۔

"آپا!" — عزیز نے بڑے شگفتہ لہجے میں کہا — "وہ جس لڑکی کو تم نے ہاشمی کے گھر دیکھا ہے ...."

"میں کسی لڑکی اور کسی ہاشمی کو نہیں جانتی" — زبیدہ نے کھڑے کھڑے کہا۔

جمیل بازو اپنے سینے پر لپیٹے ٹیڑھی آنکھوں سے عزیز کو دیکھ

رہا تھا۔

"آپا!" — عزیز نے حیرت زدگی کے لہجے میں پوچھا — "کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ .... مَیں اُس لڑکی کی بات کر رہا ہُوں"۔

"دیکھ عزیز!" — زبیدہ نے ذرا تحمل سے کہا — "چلا جا یہاں سے۔ بہت ہو چکی"۔

"کیا ہو چکی آپا؟" — عزیز نے بدستور شگفتہ لہجے میں کہا۔ پھر ہنس کر بولا — "معلوم ہوتا ہے جمیل بھائی جان نے تمہارے دماغ میں کوئی اُلٹی بات ڈال دی ہے"۔

جمیل اُسے پہلے کی طرح ٹیڑھی نظروں سے دیکھتا رہا۔

"میرا دماغ خود ہی جاگ اُٹھا ہے" — زبیدہ نے غصّے پر قابو پاتے ہوئے کہا — "میرے بے غیرت بھائی! تُو نے مجھے کچھ اور بتایا اور راز یہ کھُلا کہ تُو ہندوؤں کا جاسوس ہے"۔

"اوہ میری کم فہم آپا!" — عزیز نے اپنے ماتھے پہ ہاتھ مار کر عام سے لہجے میں کہا — "کیسا بے ہُودہ خیال کسی نے تمہارے ذہن میں ٹھونس دیا ہے"۔

"اپنی بڑی بہن کو تھانے چڑھا کر بھی تجھے شرم نہ آئی" — زبیدہ نے دانت پیستے ہوئے کہا — "تُو اپنی بڑی بہن کو بھی ہندوؤں کی جاسوسی میں استعمال کرنے پر اُتر آیا۔ تُو نے یہ بھی نہ سوچا کہ یہ بہن خاندان کی واحد فرد ہے جس کے دل میں تمہارا پیار ابھی تک موجود ہے۔ تمہاری کوئی بہن اور کوئی بہنوئی برداشت نہیں کرتا کہ تم اُن کے گھر میں قدم بھی رکھو۔ تُو نے ماں کا دماغ خراب کر رکھا ہے اور تُو نے باپ کے وقار کو دلی کی گلیوں میں مسل ڈالا ہے اور باپ کو تُو نے دل کا مریض بنا دیا ہے"۔

"میری بات تو سُنو آپا!" — عزیز نے ذرا دبی ہوئی آواز میں کہا — "میں تمہاری سب غلط فہمیاں دُور کر دوں گا۔ اس لڑکی کا اغوا میری عزت کا سوال ہے۔ وہ اپنے خاوند کے ساتھ میرے پاس آئی تھی"۔

"نکل جا یہاں سے" — زبیدہ نے ایک بازو پھیلا کر انگلی دروازے کی طرف کرتے ہوئے کہا — "تُو نے مجھے ہاشمی صاحب جیسے شریف لوگوں میں ذلیل کر دیا ہے۔ تُو نے ایک ہندو کے ساتھ مجھے وہاں بھیجا اور یہ جھوٹ بولا کہ یہ مسلمان ہے اور اس کا نام عبدالرحمٰن ہے"۔

عزیز کچھ کہنے لگا تھا کہ زبیدہ نے جمیل کی طرف دیکھا۔

"عزیز!" — جمیل نے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا — "گیٹ آؤٹ"۔

عزیز کے چہرے سے شگفتگی دُھل گئی اور اس کی جگہ سنجیدگی آ گئی۔

جمیل کی گرجدار آواز نے کمرے کو ہلا ڈالا — "گیٹ آؤٹ"۔

عزیز اُٹھا۔

"نکل جا اس گھر سے" — زبیدہ نے غصیلی اور رندھی ہوئی آواز میں کہا — "ہندو کے جاسوس! پھر کبھی تیری صورت نہ دیکھوں"۔

"جمیل صاحب!" — عزیز نے جاتے جاتے دروازے میں رُک کر کہا — "مجھ سے بچ کے رہنا"۔

"نکل جا مردود!" — زبیدہ نے چلّا کر کہا اور بچوں کی طرح پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی۔

عزیز اس قدر غصّے میں نکلا کہ بڑے دروازے تک اُس کے قدموں کی آواز سنائی دیتی رہی۔

جمیل نے زبیدہ کی پیٹھ پر تھپکی دی اور اُسے چُپ کرانے لگا۔

"کیا مَیں نے آپ کے دل سے وہ کدورت نکال دی ہے جو میری ہی غلطیوں نے پیدا کی تھی؟" — زبیدہ نے جمیل سے پوچھا۔

"ہاں زبیدہ!" — جمیل نے آہ بھر کر کہا — "دل صاف ہوں تو بچھڑے ہوئے بھی مل جاتے ہیں"۔

گلی میں عزیز کی گاڑی سٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی اور

رات خاموش ہو گئی۔

❦

عبدالقدیر اور ہاشمی، رفیقی کے گھر بیٹھے ہوتے تھے۔ اُن کے سامنے حسن طارق رفیقی کے گھر کی تمام چادریں، پلنگ پوش اور تکیوں کے غلاف بکھرے ہوتے تھے۔ عبدالقدیر نے اُسے بتایا تھا کہ جو چادر رِشی پر ڈالی گئی تھی وہ واپس نہیں آئی تھی۔

"کیا اُس چادر پر دھوبی مارک تھا؟" — عبدالقدیر نے اُس سے پوچھا تھا۔

ان کے سامنے جو کپڑے بکھرے ہوتے تھے، وہ اُن تینوں نے دیکھ لئے تھے۔ دو پلنگ پوشوں پر دھوبی کے نشان تھے۔

"پریشان نہ ہوں" — رفیقی نے کہا — "یہ نشان یہاں کے کسی دھوبی کے نہیں۔ یہاں میری بیوی کپڑے واشنگ مشین میں دھوتی ہے۔ یہ دھوبی مارک جو آپ نے ان کپڑوں پر دیکھے ہیں، دِلّی کے کسی دھوبی کے نہیں۔ یہ کپڑے میری بیوی کے ساتھ کبھی اُس کے میکے گئے ہوں گے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہاں کپڑے دھوبی کے پاس جاتے تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ میری بیوی کا میکہ شہر دِلّی سے کتنا دُور ہے .... یہ نشان اُس صورت میں پکڑا جا سکتا ہے کہ میرے گھر کی نشاندہی ہو جاتے اور خانہ تلاشی ہو۔"

"یہاں تک نوبت نہیں پہنچے گی" — عبدالقدیر نے کہا۔

دوسرے دن اس علاقے کے تھانے کا سکھ تھانیدار ایک حوالدار اور دو کانسٹیبلوں کے ساتھ ایک دھوبی کی دکان میں داخل ہوا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک چادر تھی جس کا ایک کونہ دھوبی کے آگے رکھ کر اُس نے پوچھا کہ یہ کونسے گھر کا نشان ہے۔

دھوبی نے نشان کو غور سے دیکھا اور سر ہلا کر کہا کہ یہ کسی اور دھوبی کا نشان ہے۔

تھانیدار چونکہ سکھ تھا اور تھانیدار بھی تھا اور دھوبی غریب آدمی تھا اس لئے تھانیدار نے دھوبی کو گالیوں کی زبان میں کہا کہ بعد میں پتہ چلا کہ یہ تمہارا نشان ہے تو کم از کم پانچ سال کے لئے اندر کرا دوں گا۔

"دکان آپ کے سامنے ہے سردار صاحب!" — دھوبی نے ہاتھ جوڑ کر کہا — "آپ خود دیکھ لیں۔ میں اور میرے یہ دونوں بیٹے آپ کو کپڑے نکال نکال کر دیتے رہیں گے۔ میں غریب آدمی پولیس سے کچھ چھپانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔"

تھانیدار نے دو اور دھوبیوں کی دکانوں پر جا کر یہ نشان دیکھنے کے لئے ایسی کارروائی کی جیسے پولیس چھاپہ مارا کرتی ہے لیکن یہ نشان نہ ملا۔

عزیز نے اپنے ذاتی مخبروں کو اس کام پر لگا دیا کہ وہ کسی طرح معلوم کریں کہ ہاشمی اور عبدالقدیر کے کپڑے کس دھوبی کے پاس جاتے ہیں۔ یہ دونوں آدمی جب پہلے ہی دھوبی کے پاس گئے تو دھوبی نے انہیں بتایا کہ تھانیدار صاحب معلوم کر گئے ہیں۔

"مَیں جانتا ہوں کہ آپ لوگ پولیس کی طرف سے آتے ہیں" — دھوبی نے اُنہیں کہا — "مَیں نے تھانیدار صاحب سے بھی کہا تھا کہ تمام کپڑے خود دیکھ لیں لیکن اُنہوں نے نہیں دیکھے۔ آپ کو بھی مَیں یہی کہوں گا کہ دکان آپ کے سامنے ہے۔ خود دیکھ لیں۔ مَیں آپ کو بھٹی پر لے چلوں گا اور تمام کپڑے آپ کے سامنے رکھ دوں گا۔ خود دیکھ لیں۔"

"صرف ایک بات بتا دو" — عزیز کے ایک مخبر نے دھوبی سے کہا — "تم فریدالدین ہاشمی اور عبدالقدیر کو جانتے ہو؟ کیا اُن کے کپڑے تمہارے پاس آتے ہیں؟"

"نہیں صاحب!" — دھوبی نے جواب دیا — "میں نے یہ دونوں نام پہلی بار سُنے ہیں .... مَیں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ دھوبیوں کے پاس زیادہ تر کپڑے ہندوؤں کے آتے ہیں۔ مسلمان کپڑے خود دھوتے ہیں

یا اُنہوں نے واشنگ مشینیں رکھی ہوتی ہیں۔ معلوم نہیں کہ آپ جو نشان تلاش کر رہے ہیں یہ کسی ہندو کا ہے یا مسلمان کا۔"

"یہ کسی مسلمان کے کپڑوں کا نشان ہے" ___ ایک مخبر نے کہا۔

❁

شام کے بعد کا وقت تھا، عزیز اُسی وقت اپنے گھر پہنچا تھا۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ عزیز نے ریسیور اُٹھایا۔ سکھ تھانیدار بول رہا تھا۔

"عزیز صاحب!" ___ تھانیدار نے کہا ___ "دھوبی مارک مل گیا ہے .... یہ کوئی جمیل احمد ہے۔"

عزیز نے ایڈریس پوچھا تو یہ جمیل احمد اس کا اپنا بہنوئی نکلا۔ عزیز کا ردِ عمل ایسا تھا جیسے اُس کے وجود میں بڑی زور کا دھماکہ ہُوا ہو اور اُس کے جسم کے ٹکڑے بکھر گئے ہوں۔ کچھ دیر تک تو وہ سوچ بھی نہ سکا کہ اُسے کیا کرنا چاہیئے۔ اُس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ تھانیدار سے کہا کہ وہ اُسے ابھی فون کرتا ہے۔ فون بند کر کے وہ سوچ میں پڑ گیا۔

اُسے بہن کی لعن طعن یاد آئی اور اس کے ساتھ ہی اُسے خیال آیا کہ اپنے افسروں کے سامنے اُس کی بے عزتی ہوتی ہے۔ اگر اُس کی بہن اُس کے ساتھ انٹیلی جنس ہیڈ کوارٹر میں چلی جاتی اور رشی کو دیکھ کر کہہ دیتی کہ اُس نے اسی لڑکی کو ہاشمی کے گھر دیکھا تھا اور اس کے ساتھ یہ بھی کہہ دیتی کہ صاف پتہ چلتا تھا کہ اس لڑکی پر کسی نشہ آور دوائی کا اثر تھا تو عزیز کو اس سے بہت فائدہ مل سکتا تھا۔ یہ اُس کی بہت بڑی کامیابی ہوتی۔ اُس کی تنخواہ اور اُس کے گریڈ میں اضافہ ہو جاتا لیکن بہن نے اُس کے لیئے ایسی صورتِ حال پیدا کر دی تھی کہ ترقی ملنے کی بجائے افسروں نے اُس پر اس شک کا اظہار کیا تھا کہ وہ کسی ذاتی دشمنی کی وجہ سے ہاشمی وغیرہ کے پیچھے پڑا ہُوا ہے۔

اُسے یاد آیا کہ اُس کے بہنوئی جمیل نے اُسے بہت ہی بے آبرو کر کے اپنے گھر سے نکالا تھا۔ عزیز کے لیئے یہ بات بھی ناقابلِ برداشت

تھی کہ یہی ایک بہن تھی جس کے دل میں اُس کی محبت تھی۔ وہ بھی ہاتھ سے گئی۔

عزیز کا دماغ پھر گیا۔ اُس نے ریسیور اُٹھایا اور سکھ تھانیدار کے تھانے کا نمبر ملایا۔ اُدھر تھانیدار ہی بول رہا تھا۔ عزیز کی ذہنی کیفیت ایسی تھی جیسے وہ انسانیت سے اور انسانی جذبات سے دستبردار ہو گیا ہو۔

"سردار صاحب!" ___ عزیز نے سکھ تھانیدار سے کہا ___ "اس شخص جمیل احمد کو ابھی تھانے میں بلا کر حوالات میں بند کر دیں۔"

"نہیں عزیز صاحب!" ___ تھانیدار نے کہا ___ "مَیں آپ کے کہنے پر یا کسی کے بھی کہنے پر کسی کو حوالات میں بند نہیں کر سکتا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ انٹیلی جنس کے کارکن ہیں لیکن یہ سوچ لیں کہ انٹیلی جنس کا سب سے بڑا افسر بھی اگر مجھے زبانی کہے گا کہ میں فلاں آدمی کو گرفتار کر کے حوالات میں بند کر دوں تو بھی میں ایسا نہیں کروں گا۔ آپ اپنے محکمے کا ایک لیٹر میری طرف بھجوا دیں جس پر کسی بڑے افسر کے دستخط ہوں۔ لیٹر میں لکھوائیں کہ یہ آدمی ہمارا مشتبہ ہے اور اسے حوالات میں بند کر لیا جائے اور ہم اُسے حوالات میں لے آئیں گے۔"

"صبح آپ کو بتاؤں گا کہ لیٹر بھیجا جائے گا یا اُس شخص کو میرا محکمہ خود ہی گرفتار کرے گا" ___ عزیز نے کہا ___ "آپ کل اُس دھوبی کو ساتھ لے کر صبح دس بجے انٹیلی جنس ہیڈ کوارٹر میں پہنچ جائیں۔ میرا خیال ہے کہ اس کے لیئے آپ کو کسی لیٹر کی ضرورت نہیں ہوگی۔"

عزیز نے اُسے اپنے ہیڈ کوارٹر کا ایڈریس بتایا اور یہ بھی کہا کہ وہ اگر رکشے یا ٹیکسی پر آئے گا تو اُسے کرایہ مل جائے گا۔

"مَیں وقت پر پہنچ جاؤں گا" ___ سکھ تھانیدار نے کہا۔

❁

عزیز نے صبح دفتر پہنچتے ہی میجر بھاٹیہ کو بتایا کہ دھوبی کا نشان

ل گیا ہے اور تھانیدار نے اُسے اس شخص کے گھر کا یہ ایڈریس بتایا ہے۔

"مجھے اسی شخص پر شک تھا" — عزیز نے میجر بھاٹیہ سے کہا — "اس شخص نے میرا بلکہ انٹیلی جنس کا بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا ہے"۔

"وہ کیسے؟" — میجر بھاٹیہ نے پوچھا اور کہنے لگا — "بات صاف کرو عزیز!"

"صاف بات یہ ہے صاحب!" — عزیز نے کہا — "یہ جمیل احمد میرا بہنوئی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ میری بہن نے رشی کو ہاشمی کے گھر میں دیکھا تھا"۔

"ہاں ہاں!" — میجر بھاٹیہ نے کہا — "یہ سارا قصہ مجھے معلوم ہے۔ یہ معاملہ تھانے تک پہنچ گیا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ رشی ہاشمی کے گھر سے برآمد نہیں ہوتی تھی"۔

"میں اپنی بہن کے گھر گیا تھا" — عزیز نے کہا — "میں اپنی بہن کو یہاں لا کر رشی کو اُس کے سامنے کھڑا کر کے پوچھنا چاہتا تھا کہ اُس نے اس لڑکی کو ہاشمی کے گھر میں دیکھا تھا یا وہ کوئی اور تھی؛ میری یہ بہن مجھ سے اتنی زیادہ محبت کرتی ہے کہ مجھے پوری اُمید تھی کہ وہ میرے ساتھ آجائے گی لیکن خلافِ توقع اُس نے میری اتنی بے عزتی کی جیسے وہ بھول ہی گئی ہو کہ میں اُس کا بھائی ہوں۔ میرا بہنوئی خاموش کھڑا رہا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ اُس نے میری بہن کی برین واشنگ کی ہوتی ہے۔ اُس نے میری بہن کو بھی ایک دھمکی دی ہوگی کہ وہ اُسے طلاق دے دے گا۔ سر! یہ ایک ایسی دھمکی ہے جسے میری بہن برداشت نہیں کر سکتی۔ میری بہنیں ہی بہنیں ہیں۔ میری اس بہن کے تو بچے بھی جوان ہو چکے ہیں۔ میرے ماں باپ کیسے برداشت کر سکتے ہیں کہ میری یہ بہن یا کوئی بھی بہن طلاق لے کر گھر آ بیٹھے"۔

"عزیز بھائی!" — میجر بھاٹیہ نے کہا — "تمہاری ان باتوں سے ذاتی یا گھریلو دشمنی ظاہر ہوتی ہے۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تمہیں اپنے بہنوئی پر انٹیلی جنس کے سلسلے میں یعنی رشی کے اغوا کے سلسلے میں کیا شک ہے اور ایسا شک کیوں ہے؟"

"آپ کو وہ سارا واقعہ معلوم ہے جب یہ معاملہ تھانے تک پہنچ گیا تھا" — عزیز نے کہا — "میرا یہ بہنوئی بھی تھانے پہنچ گیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ وہ تھانے اس لئے گیا تھا کہ ہاشمی وغیرہ میری بہن کو بھی تھانے لے گئے تھے۔ اس کے بعد جو کچھ ہُوا وہ تو آپ جانتے ہی ہیں۔ میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تھانے سے نکل کر میرا بہنوئی میری بہن کے ساتھ جانے کی بجائے ہاشمی اور عبدالقدیر کے ساتھ چلا گیا تھا۔ مجھے شک ہے کہ رشی کو ہاشمی کے گھر سے میرے بہنوئی جمیل احمد کے گھر شفٹ کر دیا گیا تھا اور اُسے وہاں سے میرے گھر پہنچایا گیا.... میں نے متعلقہ پولیس انسپکٹر کو کہہ دیا ہے کہ وہ جمیل احمد کو آج دس بجے یہاں لے آئے۔ وہ اُسے لا رہا ہے۔ میں آپ سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ میری بہن کو بھی یہاں لایا جائے اور رشی کو بھی"۔

"میں سمجھتا ہوں تم کیا چاہتے ہو" — میجر بھاٹیہ نے کہا — "تم اپنی بہن سے رشی کی شناخت کرانا چاہتے ہو۔ میں اس سلسلے کو اب بیکار سمجھتا ہوں کیونکہ چیف نے اس معاملے کو ٹھپ کر دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُس نے رشی کے بیان کو سچ مان لیا ہے۔ ہمارا تعلق رابی کے ساتھ ہے اور رابی بالکل ٹھیک ہے۔ اُسے رشی کے ساتھ واپس پاکستان بھیجا جا رہا ہے.... کیا زینی ٹھیک چل رہی ہے؟"

"سو فیصد ٹھیک سر!" — عزیز نے جواب دیا — "اس لڑکی نے رابی پر اپنا جادو چلا لیا ہے۔ میں آپ کو ساتھ ساتھ رپورٹ دے رہا ہوں.... رشی کو تو رابی نے دھتکار دیا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ خود کسی کے ساتھ چلی گئی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ رشی کو جاتے ہی طلاق دے دے گا....

یہ کام تو بالکل اسی طرح ہو رہا ہے جس طرح آپ نے اور چیف نے سکیم بنائی ہے، لیکن سر! اس لڑکی کے اغوا کے سلسلے میں جو میری بے عزتی ہو رہی ہے اُس کا بھی خیال رکھیں۔ میری پوزیشن صرف اس طرح صاف ہو سکتی ہے کہ میری بہن کو یہاں بلائیں اور اُس سے رشی کی شناخت کروائیں۔ ہو سکتا ہے رشی میری بہن کو دیکھ کر یہ بھی کہہ دے کہ اُسے اس عورت کے گھر میں رکھا گیا تھا۔ میرے بہنوئی کو دیکھ کر شاید رشی کے ذہن میں انتقام کی تلخی پیدا ہو جائے اور وہ کہہ دے کہ اس آدمی نے اُسے قید میں رکھا تھا۔"

"میں تمہاری بہن کو بلوا لیتا ہوں" ـــــ میجر بھاٹیہ نے کہا ـــــ "لیکن تمہاری اور کوئی توقع پوری نہیں ہو گی۔ تمہیں معلوم نہیں کہ رشی کس قدر خود اعتمادی اور ذہنی پختگی سے بیان دے چکی ہے۔ اُس پر جو جرح کی گئی تھی، وہ ویسی ہی تھی جیسی کسی بھی مشتبہ پر کی جاتی ہے۔ اگر اُس کا بیان سچا نہ ہوتا تو وہ کہیں نہ کہیں ایسا جواب دے دیتی جس سے اُس کے بیان کی سچائی پر شک ہوتا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ چیف نے کرنل اوجھا اور میجر سجن سنگھ اور مجھے بلا کر باقاعدہ میٹنگ کی تھی جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ رشی کو پاکستانی ایجنٹوں نے اغوا نہیں کیا تھا اور اگر انہی ایجنٹوں نے ہی کیا تھا تو یہ لڑکی اُن کے کسی کام نہیں آسکتی تھی کیونکہ اسے معلوم ہی نہیں کہ اُس کا خاوند انٹیلی جنس کا رُکن بن چکا ہے۔"

"سر!" ـــــ عزیز نے کہا ـــــ "مجھے اپنے بہنوئی کے سامنے نہیں ہونا چاہیئے۔"

"تمہاری ضرورت ہی نہیں" ـــــ میجر بھاٹیہ نے کہا۔

❦

دس بجے کے لگ بھگ سکھ تھانیدار جمیل اور دھوبی کو ساتھ لے کر پہنچ گیا۔ عزیز نے اُنہیں کھڑکی میں سے دیکھا اور چپڑاسی کو بلا کر کہا کہ تھانیدار کو میرے پاس لے آؤ، لیکن یہ نہ بتانا کہ کس نے بلایا ہے۔

تھانیدار عزیز کے پاس آیا تو عزیز نے اُسے بتایا کہ وہ خود سامنے

نہیں ہو گا اور وہ یعنی تھانیدار میجر بھاٹیہ کے پاس جائے گا۔ عزیز نے تھانیدار کو یہ بھی بتایا کہ وہ کسی خاص مقصد کے تحت سامنے نہیں آنا چاہتا۔

"یہ مقصد میں جانتا ہوں" ـــــ تھانیدار نے کہا ـــــ "یہ شخص جمیل احمد تمہارا بہنوئی ہے۔ اگر ایسی بات تھی تو مجھے پہلے بتاتے۔ میں تو اُسے بتا چکا ہوں کہ عزیز احمد نام کا ایک آدمی اس تفتیش کی پیروی کر رہا ہے۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ یہ تمہارا بہنوئی ہے۔ اس نے مجھے ساری بیک گراؤنڈ بتائی ہے۔"

یہ سُن کر عزیز پریشان ہو گیا۔ اُس نے تھانیدار کو میجر بھاٹیہ کے کمرے میں بھجوا دیا۔ دھوبی مارک والی چادر تھانیدار کے ہاتھ میں تھی۔

میجر بھاٹیہ نے دھوبی کو باہر کھڑا رہنے دیا۔ تھانیدار اور جمیل کو اندر بُلا کر بڑے اچھے طریقے سے اُن کا استقبال کیا۔ انہیں بٹھایا۔ اُس کے کہنے پر تھانیدار نے چادر میجر بھاٹیہ کے آگے میز پر رکھ دی اور کونے پر جو دھوبی مارک تھا وہ اُسے دکھایا۔

"کیوں صاحب!" ـــــ میجر بھاٹیہ نے جمیل سے پوچھا ـــــ "کیا یہ دھوبی مارک آپ کے کپڑوں کا ہے؟"

"نہیں صاحب!" ـــــ جمیل نے جواب دیا ـــــ "یہ چادر ہماری نہیں ہے اور میرے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ یہ چادر میرے گھر کی نہیں۔ اس چادر کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں۔ البتہ اُس شخص کے ساتھ بدقسمتی سے میرا تعلق بڑا گہرا ہے جس نے پولیس کو میرے پیچھے ڈالا ہے۔"

"جمیل صاحب!" ـــــ میجر بھاٹیہ نے کہا ـــــ "میں نے آپ سے صرف یہ پوچھا ہے کہ یہ دھوبی مارک آپ کے کپڑوں کا ہے یا نہیں۔"

"میں پھر کہتا ہوں" ـــــ جمیل نے جواب دیا ـــــ "کہ یہ چادر میرے گھر کی نہیں۔ میرے کپڑوں کا دھوبی مارک ایسا ہی ہے۔ دھوبی ساتھ آیا ہے۔ آپ اُسے بلا کر پوچھیں۔"

دھوبی کو اندر بلایا گیا اور اُسے یہ نشان دکھا کر پوچھا گیا۔

"حضور!" ــــ دھوبی نے جواب دیا ــــ "یہ نشان جمیل صاحب کے کپڑوں جیسا ہی لگتا ہے، لیکن کچھ فرق معلوم ہوتا ہے۔"

"انسپکٹر صاحب!" ــــ میجر بھاٹیہ نے تھانیدار سے پوچھا ــــ "کیا آپ نے جمیل صاحب کے گھر کے کچھ اور کپڑے دیکھے تھے؟"

"نہیں صاحب!" ــــ تھانیدار نے جواب دیا۔

"اتنی سی تو بات آپ خود بھی سوچ سکتے تھے" ــــ میجر بھاٹیہ نے کہا ــــ "اِن کے گھر کا کوئی ایک آدھ کپڑا تو لے آتے۔"

"مَیں نے تو کبھی غور بھی نہیں کیا کہ دھوبی نشان کس جگہ لگاتا ہے" ــــ جمیل نے کہا۔

"آپ کی اس قمیض پر نشان ہوگا" ــــ دھوبی نے کہا۔

جمیل فوراً اُٹھا، کوٹ اُتارا، ٹائی کھولی اور دھوبی سے پوچھا کہ نشان کہاں ہوگا۔ دھوبی نے آگے بڑھ کر اُس کی قمیض کے بٹن کھولے اور وہاں سے قمیض کو ذرا سا اُٹھایا۔ نیچے والے کاج کے ساتھ دھوبی مارک تھا۔ میجر بھاٹیہ نے اُٹھ کر یہ نشان دیکھا، پھر چادر کا کونہ قریب کر کے اُس نشان سے ملایا۔ چادر کے نشان کی تین عمودی لکیریں تھیں جن کی لمبائی ایک ہی جیسی تھی، لیکن قمیض کا جو دھوبی مارک تھا اُس کی تین لکیروں میں سے درمیان والی لکیر ذرا لمبی تھی۔

"کیا یہ لکیر تم نے خود لمبی رکھی ہے؟" ــــ میجر بھاٹیہ نے دھوبی سے پوچھا اور اُسے نشان دکھایا۔

"ہاں حضور!" ــــ دھوبی نے جواب دیا ــــ "تین برابر لکیروں والے نشان کے کپڑے لالہ چرن داس کے ہیں۔"

"کیا تم نے تھانیدار صاحب کو یہ فرق بتایا نہیں تھا؟" ــــ میجر بھاٹیہ نے پوچھا۔

"انہوں نے مجھ سے اور کچھ پوچھا ہی نہیں" ــــ دھوبی نے جواب

دیا ــــ "ہم غریب آدمی ہیں حضور! تھانیدار صاحب نے میری لانڈری میں آکر ایسا غصہ جھاڑا کہ مَیں کچھ سوچ ہی نہ سکا۔ یہ نشان اچھی طرح دیکھ بھی نہ سکا۔ مَیں نے ان کے ڈر سے کانپتے ہوتے کہہ دیا کہ یہ جمیل صاحب کا دھوبی مارک ہے۔"

میجر بھاٹیہ نے دھوبی کو باہر نکال دیا اور تھانیدار سے کہنے لگا کہ اُس نے تفتیشی کارروائی صحیح طریقے سے کئے بغیر اپنا بھی اور دوسروں کا بھی وقت ضائع کیا ہے۔

انٹیلی جنس والے کسی کو اتنی جلدی نہیں چھوڑا کرتے۔ وہ بال کی کھال اُتارا کرتے ہیں، لیکن میجر بھاٹیہ اس معاملے میں سنجیدہ نہیں تھا کیونکہ اُس کا چیف رِشی کے اغوا کو نظر انداز کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اُس نے دھوبی کے اس جواب کو بھی قبول کر لیا تھا کہ یہ دو نشان جو اُس کے سامنے رکھے گئے ہیں دو مختلف لوگوں کے ہیں۔

میجر بھاٹیہ نے تھانیدار کو بھی باہر بھیج دیا۔

"جمیل صاحب!" ــــ اُس نے پوچھا ــــ "اپنے متعلق آپ کچھ بتانا چاہیں گے؟"

جمیل نے اپنے متعلق بتایا کہ وہ گریجویٹ ہے اور فوڈ ڈیپارٹمنٹ میں ملازم ہے۔ اپنے متعلق تو اُس نے زیادہ نہ بتایا البتہ عزیز کے متعلق اُس نے اُس کی پوری ہسٹری سنانی شروع کر دی۔

"یہ سب بلیک میلنگ ہے صاحب!" ــــ جمیل نے کہا ــــ "عزیز کا کوئی بھی بہنوئی اسے اپنے گھر میں داخل نہیں ہونے دیتا۔ میری بیوی جو اس کی بڑی بہن ہے اسے بہت چاہتی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک عزیز مجھ سے کسی نہ کسی بہانے پیسے لیتا رہا ہے۔ پھر اس نے مجھ سے اُدھار پیسے مانگنے شروع کر دیئے۔ مَیں اسے دیتا رہا۔ کرتے کرتے یہ میرا پانچ ہزار روپے کا مقروض ہو گیا۔ مَیں نے اسے مزید رقم دینی چھوڑ دی اور یہ بھی طے کیا کہ یہ میرے گھر نہ آیا کرے۔ ہمیں تو معلوم

ہی نہیں تھا کہ یہ انٹیلی جنس میں ہے۔ اس نے اپنی بہن تک کو اپنے
اس خفیہ کام میں استعمال کیا۔"

جمیل نے میجر بھاٹیہ کو وہ سارا واقعہ سنایا جو بھاٹیہ کو پہلے ہی
معلوم تھا۔ بھاٹیہ نے اُس سے کچھ باتیں پوچھیں۔ اسی دوران اُسے
اطلاع ملی کہ زبیدہ نام کی ایک خاتون کو لایا گیا ہے۔ اس کے فوراً بعد
بھاٹیہ کو یہ اطلاع ملی کہ رشی اور رابی بھی آگئے ہیں۔

جمیل کو دوسرے کمرے میں بھیج دیا گیا۔ میجر بھاٹیہ نے زبیدہ
کو اندر بلایا اور کرسی پر بٹھایا پھر وہ باہر نکل گیا۔ واپس آیا تو اُس کے
ساتھ رشی تھی۔ بھاٹیہ نے اُسے کھڑا رہنے دیا۔

"محترمہ!"—— بھاٹیہ نے زبیدہ سے کہا —— "آپ ذرا اُٹھ کر اس
لڑکی کے سامنے کھڑی ہو جائیں۔"

زبیدہ اُٹھی اور رشی کے سامنے ہو گئی۔

"آپ دونوں ایک دوسری کو دیکھیں"—— میجر بھاٹیہ نے ان سے
کہا —— "اور بتائیں کہ آپ نے ایک دوسری کو پہلے کبھی دیکھا ہے؟"

دونوں کے دل بڑی تیزی سے دھڑکنے لگے۔ رشی پر خوف
طاری ہو گیا۔ اُس نے جھوٹا بیان دیا تھا۔ اُسے ڈر تھا کہ زبیدہ نے کہہ
دیا کہ اُس نے اس لڑکی کو ہاشمی کے گھر دیکھا تھا تو اُسے نہ جانے کیسی
سزا دی جائے گی۔ زبیدہ کی سوچ بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ اُس نے تھانے
میں کہا تھا کہ اُس نے ہاشمی کے گھر کسی لڑکی کو نہیں دیکھا تھا۔ رشی تو
اُس سوسائٹی کی لڑکی تھی جس میں عزت اور بے عزتی کا، حیا اور بے حیائی
کا تصور کچھ اور تھا لیکن زبیدہ چار دیواری کی دُنیا کی عورت تھی جو برقع
تو نہیں لیتی تھی، لیکن اپنے آپ کو پردہ نشین کہہ سکتی تھی۔ وہ عزت اور
عصمت کی قدروقیمت کو سمجھتی تھی۔ اُس کے چہرے پر ایسا پھیکا سا رنگ
آگیا جو غشی سے پہلے آیا کرتا ہے۔

میجر بھاٹیہ باری باری دونوں چہروں کے بدلتے رنگ دیکھ
رہا تھا۔

زبیدہ کی ذات میں شکست و ریخت شروع ہو گئی۔ اُس کی
حالت اُس ریتلے ٹیلے کی سی ہو گئی جسے تیز و تند آندھی ریزہ ریزہ
کر کے اُڑا رہی ہو۔

"مجھے کس گناہ کی سزا دی جا رہی ہے!"—— زبیدہ نے روتی ہوتی
سی آواز میں کہا اور اُس کے آنسو بہنے لگے۔

"آپ کو ہم پریشان نہیں کر رہے مسز جمیل!"—— میجر بھاٹیہ
نے کہا —— "آپ صرف یہ بتا دیں کہ اس لڑکی کو آپ نے پہلے کبھی
دیکھا ہے؟"

"نہیں دیکھا"—— اُس نے روتے ہوئے احتجاج کے لہجے میں
کہا —— "نہیں دیکھا۔ اسے میں نے پہلے کہیں بھی نہیں دیکھا۔"

رشی کے چہرے کا اُڑا ہوا رنگ واپس آگیا۔

"میں آپ کو یاد دلاتا ہوں"—— میجر بھاٹیہ نے زبیدہ سے کہا ——
"آپ نے اسے فریدالدین ہاشمی کے گھر ایک کمرے میں دیکھا ہوگا۔"

"میں نے اسے کہیں نہیں دیکھا"—— زبیدہ کرسی پر اس طرح بیٹھ
گئی جیسے گر پڑی ہو۔ روتے ہوتے کہہ رہی تھی —— "اگر یہ کہتی ہے کہ
اس نے مجھے کہیں دیکھا ہے تو یہ جھوٹ بولتی ہے۔"

"مسٹر بھاٹیہ!"—— رشی بولی —— "میں آپ کو بتا چکی ہوں مجھے
کہاں لے گئے تھے اور کون لے گئے تھے۔ کیا آپ اس عورت سے
کہلوانا چاہتے ہیں کہ اس نے مجھے کہیں اور دیکھا تھا؟ یہ عورت میرے
لئے اجنبی ہے۔ آج پہلی بار اسے دیکھ رہی ہوں۔"

"آپ مجھ پر ایک کرم کریں"—— زبیدہ نے منت سماجت کے لہجے
میں کہا —— "میرے خاوند کو بلا دیں۔ اُن کا نام جمیل احمد ہے محکمہ خوراک
میں ہیں۔ میں اُن کا فون نمبر بتاتی ہوں۔ وہ آفس چلے گئے تو آپ کے آدمی

مجھے گاڑی میں زبردستی بٹھا کر لے آتے۔"

"جمیل صاحب نہیں ہیں" — میجر بھاٹیہ نے کہا۔

"وہ یہاں کیا کر رہے ہیں؟" — زبیدہ نے گھبراتے ہوئے لہجے میں پوچھا — "کہیں ایسا تو نہیں کہ انہوں نے مجھے بلوایا ہو؟"

"میں آپ کے ایسے سوالوں کے جواب نہیں دے سکوں گا" — بھاٹیہ نے کہا — "کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ نے اس لڑکی کو پہلے کہیں نہیں دیکھا؟"

"میں آپ کو کس طرح یقین دلاؤں؟" — زبیدہ نے جواب دیا۔

وہ رشی کی اس بات سے دلیر ہو گئی تھی کہ اُس نے زبیدہ کی شناخت سے انکار کر دیا تھا۔ کہنے لگی — "آپ ایک ہزار بار پوچھیں تو بھی میں یہی کہوں گی کہ میں نے اس لڑکی کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

"مسٹر بھاٹیہ!" — رشی نے کہا — "آپ مجھے پاکستان واپس کیوں نہیں بھیج دیتے؟"

"میرے ساتھ آئیں مسز رابی!" — میجر بھاٹیہ اُسے ایک اور کمرے میں لے گیا۔

وہاں جمیل بیٹھا ہوا تھا۔ میجر بھاٹیہ کے کہنے پر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

"انہیں دیکھیں" — بھاٹیہ نے رشی سے کہا — "انہیں تو آپ نے کہیں دیکھا ہو گا!"

"او ماتی گاڈ!" — رشی نے دونوں ہاتھ اپنے ماتھے پر مار کر کہا — "آپ کیوں میرا ٹارچر کر رہے ہیں! کبھی کسی کو کبھی کسی کو میرے سامنے لے آتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ اسے میں نے کہاں دیکھا تھا۔"

میجر بھاٹیہ خود بھی پریشان ہو گیا اور رشی کو یہ کہہ کر باہر بھیج دیا کہ رابی کے پاس چلی جائے۔ جمیل کو وہ اپنے کمرے میں لے گیا جہاں زبیدہ بیٹھی ہوئی تھی۔ اُسے دیکھ کر زبیدہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں" — زبیدہ نے جمیل سے کہا

— "میرا خیال ہے کہ عزیز ہم سے انتقام لے رہا ہے" — اُس نے کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھ کر پوچھا — "یہ کیا جگہ ہے؟ پولیس سٹیشن تو نہیں لگتا۔"

"یہ یہاں کی انٹیلی جنس کا ہیڈ کوارٹر ہے" — جمیل نے کہا — "تمہارا بھائی عزیز اسی محکمے میں ملازم ہے۔"

"نہیں جمیل صاحب!" — میجر بھاٹیہ نے پردہ پوشی کے لئے کہا — "عزیز اس محکمے میں باقاعدہ ملازم نہیں۔ آپ ہر کسی کو یہ نہ بتاتے پھرنا جو آپ اپنی مسز کو بتا رہے ہیں ورنہ آپ افواہیں پھیلانے کے جرم میں پکڑے جائیں گے۔"

زبیدہ نے میجر بھاٹیہ کو بتایا کہ اُس نے عزیز کو کس طرح بے عزت کر کے اپنے گھر سے نکالا تھا۔ زبیدہ نے بھاٹیہ کو یہ بھی بتایا کہ عزیز اس کے گھر کیوں آیا تھا اور عزیز نے اُسے کس طرح اپنے کام میں استعمال کرنے کی کوشش کی تھی۔

"اس بے غیرت کو اپنی بہن کی عزت بے عزتی کا بھی خیال نہیں" — زبیدہ نے کہا — "میں نے جب اسے کہا کہ میرے گھر سے نکل جاؤ تو یہ نہیں اُٹھ رہا تھا۔ جمیل صاحب نے اسے دو بار کہا گیٹ آؤٹ۔ تب عزیز اُٹھا اور کمرے سے نکلا۔ دروازے میں رُک کر اس نے جمیل صاحب کو دھمکی دی کہ اب مجھ سے ہوشیار رہنا۔"

"فوراً ہی اسے انتقام لینے کا بہانہ مل گیا" — جمیل نے کہا — "صاحب! آپ بھی اسی ملک کے شہری ہیں۔ آپ کے کپڑے دھوبی ہی دھوتے ہوں گے۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ ایک ہی شہر کے مختلف مختلف علاقوں کے دھوبی مارک آپس میں ملتے ہیں۔ یہاں لاتے ہوتے راستے میں اس سکھ پولیس انسپکٹر نے مجھ سے پوچھا تھا کہ عزیز کے ساتھ تمہاری کوئی دشمنی تو نہیں؟"

میجر بھاٹیہ پر خاموشی طاری تھی۔ وہ ان دونوں کو اپنے دفتر میں

چھوڑ کر کرنل اوجھا کے دفتر میں چلا گیا اور اُسے بتایا کہ آج اُس کے سامنے کیا مسئلہ آیا ہے۔ اُس نے دھوبی مارک کی ساری روئیداد سنائی، جمیل اور زبیدہ نے عزیز کے متعلق جو باتیں کی تھیں وہ سنائیں اور دھوبی مارک کے متعلق اپنی یہ رائے دی کہ یہ جمیل احمد کا معلوم نہیں ہوتا۔

"سر! میں عزیز کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں"۔۔۔ بھاٹیہ نے کہا ۔۔۔"یہ شخص ہمیں گمراہ کر رہا ہے۔ اس نے بہت کام کئے ہیں لیکن اس مشن میں اس نے میری نظروں میں اپنے اعتماد کو مجروح کر دیا ہے۔ اسے اپنی بڑی بہن کی عزت اور آبرو کا بھی خیال نہیں۔ اپنے بہنوئی سے پیسے بٹورتا ہے، اس کا مقروض بھی ہے اور اسی کو آنکھیں دکھاتا ہے"۔

"او احمق!"۔۔۔ کرنل اوجھا نے میجر بھاٹیہ سے کہا ۔۔۔"تم ابھی بچے ہو۔ تہہ تک پہنچنا سیکھو۔ تم عزیز کے کردار کی جو رپورٹ دے رہے ہو یہ دوسرے سرکاری محکموں کے ملازموں کے متعلق دی جاتی ہے۔ انٹیلی جنس کے کارکنوں کے کردار میں کچھ اور دیکھا جاتا ہے۔ تم عزیز کی جو خامیاں بیان کر رہے ہو یہ دراصل خوبیاں ہیں۔ اس شخص کا جو شعبہ ہے، اس میں ہمیں ایسے ہی آدمیوں کی ضرورت ہے جو اپنی بہنوں کی عزت کا بھی خیال نہ کریں اور جو بہنوئیوں کو کھاتے رہیں اور اُن کے مقروض ہو کر بھی اُنہیں ذلیل کرنے سے باز نہ آئیں۔ عزیز میں یہ خوبیاں موجود ہیں۔ یہ ہمارے کام کا آدمی ہے .... میجر بھاٹیہ! اس حقیقت کو ہمیشہ ذہن میں رکھو کہ ہندو لڑکی اپنی عصمت سے اور مسلمان مرد اپنے ایمان سے بڑی جلدی دستبردار ہو جاتا ہے۔ ہم دونوں ہندو ہیں عصمت سے دستبردار ہونے والی ہندو لڑکیوں سے ہمیں شرمسار نہیں ہونا چاہیئے۔ اپنے ملک کی خاطر اور مسلمانوں کو کمزور کرنے کے لئے ہمیں اپنی عصمتوں کی قربانی دینے سے شرمسار نہیں ہونا چاہیئے۔ مسلمان جو اپنے ملک اور اپنی قوم کے غدار بن جاتے ہیں وہ بھی تو شرمسار نہیں ہوتے"۔

"پھر میں اس دھوبی مارک والے معاملے کا کیا کروں سر؟"۔۔۔ میجر بھاٹیہ نے پوچھا۔

"یہیں ختم کر دو"۔۔۔ کرنل اوجھا نے کہا ۔۔۔"چیف فیصلہ کر چکا ہے کہ رشی کے اغوا پر مزید کوئی بات نہ ہو۔ تم خود اس میٹنگ میں موجود تھے .... عزیز کو تھوڑی سی تنبیہہ کر دو کہ وہ ذاتی دشمنی کو درمیان میں نہ لائے اور پوری توجہ اپنے کام کو دے، لیکن بھاٹیہ! اُسے بیک اپ کرنا کہ اُس نے اپنی ڈیوٹی میں اپنی بہن اور اپنے بہنوئی کی بھی پرواہ نہیں کی .... ان سب کو فارغ کر دو"۔

میجر بھاٹیہ نے سب کو فارغ کر دیا۔

رشی کے لئے یہ صورتِ حال بڑی ہی تکلیف دہ تھی۔ یہ صورتِ حال تو اُس کے لئے پیدا ہو گئی کہ اُسے اغوا کر لیا گیا، اسے اپنے لئے تکلیف دہ اُس نے خود بنایا تھا۔ اگر وہ ہاشمی، عبدالقدیر اور بیگم ہاشمی کو دیکھ کر کہہ دیتی کہ وہ انہی کی قید میں رہی ہے تو ہاشمی کے مکان کی اور اُس کمرے کی بھی نشاندہی ہو جاتی جس میں وہ قید رہی تھی پھر انٹیلی جنس والے رفیقی کے مکان کی بھی نشاندہی کرا لیتے لیکن رشی کو اس قید میں ایسی روشنی نظر آ گئی تھی جس سے اُس کی فطرت پر چھائی ہوئی تاریکی چھٹ گئی تھی۔ اُس کی ذات میں ایسا انقلاب آ گیا تھا جس نے اسے باطل کی گود سے نوچ کر حق کی گود میں پھینک دیا تھا۔

وہ اُس دنیا میں واپس آ گئی جہاں سے اُسے اغوا کیا گیا تھا تو اُس کی حالت اُس مچھلی کی سی ہو گئی جسے پانی سے نکال کر ریت پر پھینک دیا گیا ہو۔ وہ تڑپ تڑپ کر پانی کی طرف جانے کی کوشش کرتی تھی ۔۔۔ اُسے پانی اور ریت کا فرق معلوم ہو گیا تھا۔

اُس کے دل میں رابی کی، عزیز کی اور اُس سوسائٹی کی جس کی وہ پروردہ تھی، نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ اسی نفرت کے اثرات تھے کہ اُس

نے بڑی دلیری سے جھوٹ بولے تھے۔ اُس نے اُن سب کو پہچاننے سے انکار کر دیا تھا جنہیں وہ جانتی اور پہچانتی تھی۔ اُس کے لئے اس کے نتائج خطرناک بھی ہو سکتے تھے لیکن اُس نے نتائج کی پرواہ نہیں کی تھی۔

اُس کے دل میں یہ احساس پیدا ہو گیا تھا کہ ہاشی، اُس کی بیوی، عبدالقدیر، زبیدہ، رفیقی اور اُن آدمیوں کے ساتھ جو اُسے اشوکا ہوٹل سے دھوکے میں اپنے ساتھ لے گئے تھے، کوئی رشتہ ہے اور یہ رشتہ روحانی ہے۔ وہ تو ان کی قید سے آزاد ہونا ہی نہیں چاہتی تھی۔

رابی نے رشی کے دل میں اپنے خلاف نفرت میں اضافہ کر دیا۔

"تم خود ان کے ساتھ گئی تھیں" — رابی نے اُسے اُس کا یہ بیان سن کر کہ اُسے چار نوجوان دھوکے میں لے گئے تھے، کہا تھا — "اتنی جرأت کوئی نہیں کر سکتا کہ اتنے بڑے ہوٹل سے کوئی کسی ایسی لڑکی کو اغوا کر کے لے جائے جو سرکاری مہمان ہو اور وہ یہ جرأت بھی کریں کہ لڑکی کو واپس بھی چھوڑ جائیں۔"

رشی نے تڑپ تڑپ کر انکار کیا اور رابی کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ لے جائی گئی تھی خود نہیں گئی تھی۔

"تم مان کیوں نہیں لیتیں رشی کہ تم خود گئی تھیں!" — زینی نے کہا تھا جو اُس وقت وہاں موجود تھی۔ اُس نے کہا تھا — "رابی اتنا سویٹ ہے کہ میں اس کی بیوی ہوتی تو اس سے کبھی بیوفائی نہ کرتی۔"

"تم نہیں جانتیں زینی!" — رابی نے کہا — "یہ بیچاری بے قصور ہے۔ اس کی ماں نے اس کی فطرت کو جس سانچے میں ڈھالا تھا اس سے یہ تو باہر نہیں جا سکتی۔ اُس کی جوانی دوسرے مردوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے گزری تھی۔ قصور اُس کا بھی نہیں تھا۔ اُس کا باپ سرکاری رقمیں اور غیر ملکی قرضے غبن کرتا رہتا اور رشوت خور بھی تھا۔ پردہ پوشی کا اور پکڑے جانے کی صورت میں بچ نکلنے کا ذریعہ اس کی

ماں کو بنایا ہوا تھا۔ وہ خوبصورت اور جوان عورت تھی۔ پتھر جیسے مردوں کو موم کرنے کا ڈھنگ جانتی تھی۔ درندوں کو بھی رام کر لیتی تھی۔ اِس کا باپ مر گیا تو ماں نے اپنا یہ کام جاری رکھا۔ میں پہلے ایسی بات نہیں کرتا تھا۔ اب کہتا ہوں کہ یہ (رشی) جوان ہوئی تو ماں نے اسے بھی اپنی لائن پر چلا لیا۔"

"تم بکواس کرتے ہو" — رشی نے غصے سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا — "تم کُتے ہو رابی! تم بھونک رہے ہو۔"

"کیا تم نے مجھے نہیں پھانسا تھا؟" — رابی نے کہا — "تم نے مجھے محبت نہیں جسم پیش کیا تھا اور میں تمہارے جسم کی کشش میں پھنس گیا تھا۔"

"تم یہ بکواس اس لئے کر رہے ہو کہ اس وقت تم پر ایک اور جسم غالب آیا ہوا ہے" — رشی نے کہا اور زینی کی طرف اشارہ کر کے بولی — "یہ بھی مجھ جیسی ماں کی بیٹی ہے جو راتیں تمہارے ساتھ اور عزیز کے ساتھ گزار رہی ہے۔"

"مُنہ بند رکھ لڑکی!" — زینی نے اُسے انگریزی میں ڈانٹ کر کہا — "میں چار چار لڑکوں کے ساتھ خاوند کو دھوکہ دے کر غائب ہو جانے والی لڑکی نہیں۔"

"تم لڑکی ہو ہی نہیں" — رشی نے کہا — "تم کُتیا ہو۔"

"رشی!" — رابی غصے سے بھرا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا جیسے رشی کو جان سے مار ڈالے گا، کہنے لگا — "اگر تم نے ایسی بکواس پھر مُنہ سے نکالی تو...."

"جہاں ہو وہیں رہو رابی!" — رشی نے ایسے تحمل سے کہا جس میں قہر بھرا ہوا تھا — "اگر تم نے میرے جسم کو ہاتھ بھی لگایا تو بہت بُرا انتقام لوں گی۔"

زینی نے یہ ڈھونگ رچایا کہ رونی سی صورت بنا کر اس گھر سے

نکل گئی۔ رابی ایک بار پھر رِشی پر حملہ آور ہونے لگا لیکن عزیز کمرے میں آگیا۔ اُس نے رابی کو روک دیا اور اسے دوسرے کمرے میں لے گیا۔

رابی پر صرف زینی ہی سوار نہیں تھی بلکہ رِشی کو واپس لانے والے آدمیوں نے عزیز کے ساتھ اُس کی پٹائی کی تھی۔ اُس کے مُنہ پر دو جگہوں پر ابھار آگیا تھا جس نے اُس کے چہرے کو بھدا بنا دیا تھا۔ اس کا غصّہ بھی وہ رِشی پر جھاڑ رہا تھا۔ کہتا تھا کہ رِشی کے خفیہ دوستوں نے اُس کا یہ حُلیہ بنا دیا ہے۔

"بیوقوف نہ بنو رابی!" — عزیز نے اُسے کہا — "رِشی کے ساتھ یہاں ایسا سلوک نہ کرو جو تم نے شروع کر دیا ہے۔ اس لڑکی پر کوئی بڑا ہی خطرناک اثر کام کر رہا ہے۔ یہ جو بیان دے رہی ہے کہ اسے ایک اینگلو انڈین نوجوان ہوٹل سے دھوکے میں لے گیا تھا جھوٹا بیان ہے۔ یہ پرانی دِلّی کے اُن ہی مسلمانوں کے پاس رہی ہے جن کی مَیں نے نشاندہی کی تھی۔ میری بہن نے اسے وہاں دیکھا تھا۔"

"میں انٹیلی جنس کے افسروں پر حیران ہوں کہ انہوں نے تمہاری بات مانی ہی نہیں" — رابی نے کہا — "اور انہوں نے اس فلرٹ لڑکی کے جھوٹے بیان کو سچ تسلیم کر لیا۔"

"اِن افسروں کی بات چھوڑو" — عزیز نے کہا — "بعض غلطیاں دانستہ کی جاتی ہیں۔ ان میں کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ میں تمہیں کچھ اور سمجھا رہا ہوں۔ رِشی کو پیار اور محبت سے اپنے قابو میں رکھو۔ اس کے خیالات بدلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اس ناقابلِ برداشت سلوک سے رِشی یہاں سے بھاگ جائے اور ہمارے لیے کوئی مشکل پیدا کر دے۔"

"ہمارے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟" — رابی نے پوچھا —

"انٹیلی جنس کے لیے؟"

"ہم دونوں کے لئے!" — عزیز نے جواب دیا — "جو لوگ اسے لے گئے تھے وہ تمہیں بھی لے جا سکتے ہیں۔ یہ تو واپس آگئی ہے، تم واپس نہیں آسکو گے۔"

"اگر یہ ان لوگوں کے زیرِ اثر آگئی تھی تو واپس کیوں آگئی ہے؟" — رابی نے پوچھا۔

"یہ کوئی سازش معلوم ہوتی ہے" — عزیز نے جواب دیا — "اسے پاکستان لے جاؤ۔ وہاں جا کر اسے طلاق دے دینا۔ میں پاکستان جاتا ہی رہتا ہوں۔ وہاں ہمارے دوسرے ایجنٹ بھی موجود ہیں۔ وہ اس پر نظر رکھیں گے۔ اگر اس نے ہمارے خلاف کوئی کارروائی کرنے کی کوشش کی تو اسے غائب کر دیا جائے گا۔ زینی تمہارے عشق میں تڑپ رہی ہے۔ مَیں اسے پاکستان بھجوانے کا انتظام کر دوں گا اور تم اس کے ساتھ شادی کر لینا۔"

"یہ بات تو پہلے ہی طے ہو چکی ہے" — رابی نے کہا — "میرا خیال ہے کہ رِشی کو معلوم نہیں کہ میں انڈین انٹیلی جنس میں شامل ہو گیا ہوں۔"

"میں یقین کے ساتھ کچھ بھی نہیں کہہ سکتا" — عزیز نے کہا۔

"اگر اسے معلوم ہوتا تو یہ بول پڑتی" — رابی نے کہا — "مَیں نے اسے جو ذلیل کیا ہے اور جو بہتان اس پر لگا دیتے ہیں، ان کے جواب میں یہ مجھے ضرور کہتی کہ تم انڈیا کے جاسوس بن گئے ہو۔"

"اس نے کہا ہے یا نہیں" — عزیز نے کہا — "ہمیں بہت ہی محتاط ہونا پڑے گا۔"

رِشی کو معلوم تھا کہ رابی انڈین انٹیلی جنس میں شامل ہو چکا ہے۔ اگر پہلے اسے شک تھا تو یہ دیکھ کر اس کا شک یقین میں بدل گیا تھا کہ اس کے اغوا کی تفتیش پولیس سٹیشن کی بجائے انٹیلی جنس ہیڈکوارٹر میں

ہو رہی تھی۔ رابی جب رشی پر الزام تھوپ رہا تھا کہ وہ خود کسی کے ساتھ
گئی تھی، رشی کے ہونٹوں تک یہ بات آ گئی تھی کہ میں بدکار ہی سہی لیکن
میں پاکستان کے دشمن ملک کی جاسوسی نہیں۔ وہ کہنے ہی والی تھی کہ
تم ہندوؤں کے جاسوس ہو لیکن اُس نے یہ سچا الزام نگل لیا تھا۔

اُس نے ہاشمی کے گھر میں جو روشنی پائی تھی اور ہاشمی کی بیوی نے
اس کے ذہن کو جس نور سے منور کیا تھا، یہ اُسے راستے دکھا رہا تھا
اور خطرے اس کی روح کی آنکھ کو اپنے آپ ہی دکھائی دیتے تھے۔
اس کے ذہن میں یہ سوچ آ گئی تھی کہ وہ انڈیا میں ہے اور انڈیا کے
جاسوسوں کے قبضے میں ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ اُسے ایسا لاپتہ
کریں کہ اُس کی لاش بھی نہ ملے۔

وہ مرنے سے نہیں ڈرتی تھی۔ اُسے اپنی ماں سے محبت تھی
اور وہ ماں کو دنیا کی عظیم ترین عورت سمجھتی تھی لیکن رابی اور اُس کی ماں
نے اُسے بتایا تھا کہ اُس کی ماں آبرو باختہ عورت ہے اور اُس کی
جو جائیداد ہے اور بنک میں اُس کا جو بیلنس ہے یہ سب باپ کی حرام
کی اور ماں کی عصمت کی کمائی ہے۔

رشی نے رابی سے محبت کی تھی لیکن رابی نے شادی کے بعد اُسے
کہہ دیا تھا کہ اُسے رشی کا جسم اچھا لگا تھا۔

رابی کی ماں نے اُسے اور اُس کی ماں کو دھتکار دیا تھا۔

پھر اس انکشاف نے اُس کے دل پر کاری ضرب لگائی تھی کہ رابی
انڈیا کا جاسوس ہے۔ اب رابی اُس سے چھن گیا تھا لیکن رابی اُسے بیوفا
کہہ رہا تھا۔

رشی کو مر جانے میں ہی نجات نظر آتی تھی لیکن ہاشمی، اُس کی
بیوی اور عبدالقدیر کی باتیں اُسے زندہ رہنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ اُسے
یہ سوچ بھی آ گئی کہ اب اگر اُس نے یہ تیر رابی پر چلا دیا تو یہ نہ صرف خطا
جائے گا بلکہ واپس آ کر اُسی کے سینے میں پیوست ہو جائے گا، پھر کیوں نہ

یہ تیر اُس وقت چلائے جب یہ نشانے پر بیٹھے۔

اُس کے سینے میں انتقام کی آگ بھڑک اُٹھی۔ اُس نے ہونٹ
سی لیے۔

"یہاں نہیں!" — اُس کے ذہن سے ایک آواز اُٹھی —
"پاکستان پہنچ کر۔"

پاکستان تک یہ آواز پہنچانے کا انتظام عبدالقدیر کے پاس بھی
تھا۔ جس روز وہ رفیقی کے پاس یہ معلوم کرنے گیا تھا کہ چادر پر دھوبی
کا نشان تو نہیں تھا، اُس شام وہ اذان سے ذرا پہلے چاندنی چوک چلا
گیا۔ بازار میں آہستہ آہستہ چلتے چلتے ایک جنرل سٹور میں چلا گیا۔ یہ ایک مسلمان
کا خاصا بڑا جنرل سٹور تھا جس میں مالک کے علاوہ دو سیلزمین تھے۔ ان
میں سے ایک نے عبدالقدیر کو دیکھا تو وہ مُسکرایا۔ عبدالقدیر اُس کے
سامنے کاؤنٹر پر جا کھڑا ہُوا۔

"اچھی قسم کی بنیانیں دکھا دیں" — عبدالقدیر نے اس سیلزمین سے
کہا — "اچھی قسم کا مطلب ہے بہت ہی اچھی۔"

سیلزمین نے تین چار ڈبے اُس کے آگے رکھ کر کھول دیئے۔ عبدالقدیر
ان ڈبوں پر اس طرح جھک گیا جیسے بنیانیں بڑی غور سے دیکھ رہا ہو۔
دکان میں چند اور گاہک تھے۔ سیلزمین کاؤنٹر کی دوسری طرف سے ذرا
سا جُھکا۔ اُس کے اور عبدالقدیر کے سروں میں بمشکل چھ انچ فاصلہ رہ گیا۔

"کوئی خاص بات؟" — سیلزمین نے سرگوشی میں پوچھا۔

"ہاں!" — عبدالقدیر نے جواب دیا اور ایک ڈبے میں سے
ایک بنیان نکال کر سیدھا ہو گیا۔ اسے کھولا اور دھیمی آواز میں بولا
— "عشاء کی نماز کے بعد۔"

"اُسی مسجد میں؟" — سیلزمین نے سرگوشی کی۔

"ہاں!" — عبدالقدیر نے بنیان رکھ دی اور آہستہ آہستہ چلتا

جنرل سٹور سے نکل گیا۔

وہ اپنے گھر کی طرف جانے والی بس پر سوار ہُوا اور بس اُسے چاندنی چوک سے نکال لے گئی۔

عشاء کی نماز کے وقت وہ حوضِ قاضی کے قریب ایک مسجد میں تھا۔ وہ گھر بتا آیا تھا کہ ایک دوست کے ہاں جا رہا ہے، ذرا دیر سے لَوٹے گا۔ وہ سیلزمین بھی مسجد میں آگیا۔ انہوں نے باجماعت نماز پڑھی پھر سُنّت اور نوافل پڑھ کر الگ بیٹھ گئے۔ سیلزمین نے قرآن مجید کھول کر اپنے سامنے رکھ لیا۔ عبدالقدیر یوں اُس کے قریب بیٹھ گیا جیسے اُسے قرآن پڑھا رہا ہو۔ نمازی مسجد سے ایک ایک کر کے جا رہے تھے۔

"کیا خبر ہے؟" — سیلزمین نے پوچھا۔

"محمود بھائی!" — عبدالقدیر نے کہا — "ایک شکار ہے۔ مَیں تمہیں پاکستان کے دو ایڈریس دیتا ہوں" — اُس نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر اس کی تہیں کھولیں اور کُھلے ہوئے قرآن پر رکھ دیا سیلزمین جس کا نام محمود تھا، کاغذ پر لکھے ہُوئے ایڈریس پڑھنے لگا۔

"یہ ایڈریس ایم اے ملک کا ہے" — عبدالقدیر نے کہا — "ڈیفینس ڈیپارٹمنٹ میں ہے۔ ذرا دیکھو اس کی پوسٹ کتنی اہم ہے۔ یہ اس کے گھر کا ایڈریس ہے .... اور یہ اس کا بیٹا ہے۔ اس کا نام رب نواز ہے اور رابی کہلاتا ہے بلکہ رابی کے نام سے ہی جانا اور پہچانا جاتا ہے۔ یہ یہاں اپنی بیوی کے ساتھ آیا ہُوا ہے۔"

"خود آیا ہے؟" — محمود نے پوچھا — "یا لایا گیا ہے؟"

"لایا گیا ہے" — عبدالقدیر نے جواب دیا — "نوجوان ہے۔ اس کی بیوی بھی نوجوان ہے۔ تم تو جانتے ہو کہ 'را' کے مشن کے تحت لاتے گئے ہیں۔ کوئی شک نہیں رہا کہ یہ لڑکا یہاں کی انٹیلی جنس کا باقاعدہ آلۂ کار بن چکا ہے۔"

"یہ لڑکا زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے" — محمود نے کہا — "چونکہ اس کے ساتھ اس کی نوجوان بیوی ہے .... کیسی ہے؟ خوبصورت

ہو گی اور چالاک بھی!"

"خوبصورت بھی ایسی ہے کہ تم دیکھتے ہی رہ جاؤ" — عبدالقدیر نے جواب دیا — "بڑی سمارٹ لڑکی ہے۔ عقل اور ذہانت والی ہے۔ اگر انٹیلی جنس کی نظر سے دیکھیں تو اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ لڑکی بے حد خطرناک ثابت ہو سکتی ہے لیکن یہاں معاملہ اُلٹ ہو گیا ہے۔ رابی کو تو انڈین انٹیلی جنس نے پوری طرح اپنے جال میں لے لیا ہے لیکن اس لڑکی کو معلوم ہی نہیں کہ اس کا خاوند انڈین انٹیلی جنس کا ایجنٹ بن چکا ہے اور اسی سلسلے میں دِلّی لایا گیا ہے .... اب یہ سُنو کہ مَیں نے اُس لڑکی کے متعلق یہ معلومات کہاں سے اور کس طرح حاصل کی ہیں۔"

عبدالقدیر نے اُسے پوری تفصیل سے سنایا کہ اُسے کس طرح پتہ چلا تھا کہ یہ میاں بیوی دِلّی میں لاتے گئے ہیں۔ اُس نے عزیز کا نام لیا۔ عزیز کے متعلق محمود کو بتایا کہ اُس کا ذاتی کردار کیا اور فیملی بیک گراؤنڈ کیا ہے۔ عبدالقدیر نے محمود کو بتایا کہ رشی کو کس طرح اغوا کر کے لایا گیا اور اپنے دوست ہاشمی کے گھر میں رکھا گیا تھا۔ لڑکی کی قید کے دوران کی تمام باتیں عبدالقدیر نے محمود کو سنائیں۔ پھر یہ سنایا کہ کس طرح عزیز نے اپنی بہن کو ہاشمی کے گھر اس شبہے میں بھیجا تھا کہ لڑکی اس گھر میں ہے۔ پھر اُس نے محمود کو سنایا کہ دوسرے روز کس طرح عزیز کی بہن ایک ہندو ایجنٹ کو بُرقعے میں لپیٹ کر ہاشمی کے گھر لے گئی لیکن لڑکی کو وہاں سے شفٹ کر دیا گیا تھا۔ عبدالقدیر نے محمود کو یہ بھی بتایا کہ معاملہ تھانے تک پہنچ گیا تھا لیکن اللہ نے بڑی مدد کی اور معاملہ تھانے میں ہی ختم ہو گیا۔

اس کے بعد جو کچھ ہُوا وہ عبدالقدیر نے محمود کو بتایا۔

"مَیں آپ کی یہ روئیداد سُن کر محسوس کرتا ہوں کہ میں اسے سچ نہ مانوں" — محمود نے کہا — "آپ تربیت یافتہ انٹیلی جنس کا کام کر رہے ہیں۔ آپ کی باتیں سن کر میرا خون کھولنے لگا ہے۔ مجھے ایسے

محسوس ہوتا ہے جیسے میں آپ کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں کر رہا ....
اگر ہندوستان میں آپ جیسے کچھ اور مسلمان میدانِ عمل میں آجائیں تو
ہم انڈین انٹیلی جنس، ان کی 'را' اور دوسری تخریب کار ایجنسیوں کو بیکار
اور مفلوج کر سکتے ہیں۔"

"یہاں بیٹھے ہمیں بہت دیر ہو گئی ہے" — عبدالقدیر نے کہا
— "کوئی شک نہ کرے۔ باہر چلتے ہیں۔ پارک میں ٹہلتے ٹہلتے باقی بات
کر لیں گے۔ اپنے متعلق مجھے یہ خطرہ محسوس ہو رہا ہے کہ انٹیلی جنس نے
مجھے نگرانی میں رکھ لیا ہو گا۔ تم تو اس چکر سے واقف ہی ہو۔"

محمود نے قرآن بند کر کے الماری میں رکھا اور عبدالقدیر کے ساتھ
مسجد سے نکل آیا۔ کچھ دُور بچوں کا ایک وسیع اور سرسبز پارک تھا۔ دونوں
اس پارک میں سیمنٹ کے ایک بنچ پر جا کر بیٹھ گئے۔

❦

"میں تمہیں اس لڑکی کے متعلق کچھ بتانے لگا تھا" — عبدالقدیر
نے کہا — "ظاہر ہے کہ اس لڑکی کو جب ہم نے قید میں رکھا تو پہلے
روز بہت پریشان ہوئی۔ ہم نے اسے بتایا کہ اسے کیوں اغوا کیا گیا
ہے۔ ایک دو دن اور راتیں گزر گئیں تو لڑکی کو یقین ہو گیا کہ اس کے
ساتھ ہمارا اور کوئی مطلب نہیں اور ہم غنڈے بدمعاش اور بردہ فروش
نہیں۔ پتہ چلا کہ اسے معلوم ہی نہیں کہ اس کا خاوند کس چکر میں پڑا ہُوا
ہے۔ مَیں نے اور ہاشمی صاحب اور ان کی بیوی نے اس لڑکی کے ساتھ
اسلام، اسلامی جذبے، ذاتی اور قومی وقار کی باتیں کیں تو لڑکی کا ردِ عمل
ایسا تھا جیسے اُس نے یہ باتیں پہلے کبھی نہ سُنی ہوں اور یہ باتیں اُس
کے دل میں اترتی ہوئی صاف نظر آ رہی ہوں۔ تم یہ سمجھ لو کہ اُس کے
خاوند کی برین واشنگ 'را' نے کی ہے اور اُس کی بیوی کی برین واشنگ
ہم نے اپنے رنگ میں کر دی ہے۔"

"لیکن یہ تو یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ آپ کی کی ہوئی برین واشنگ

ہمیشہ قائم رہے گی" — محمود نے کہا — "وہ اپنے خاوند کے رنگ میں
کسی وقت بھی رنگی جا سکتی ہے۔"

"یہ خطرہ تو ہے" — عبدالقدیر نے کہا — "لیکن اس پر غور کرو
کہ ہمیں انٹیلی جنس ہیڈ کوارٹر میں بلایا گیا اور اس لڑکی سے شناخت پریڈ
کرائی گئی اور لڑکی نے ہماری شناخت سے انکار کر دیا.... پھر ہمارے
آدمی جو رِشی کو واپس عزیز کے گھر لے گئے تھے، عزیز اور اس لڑکی کے
خاوند رابی کی پٹائی کر کے آ گئے تھے۔ اس لڑکی نے اپنے خاوند
کی اور اپنے میزبان عزیز کی پٹائی بھی برداشت کر لی۔
اس سے ہمیں اُمید ملتی ہے کہ یہ لڑکی ہمیں دھوکا نہیں دے گی۔ پھر
بھی خطرہ تو ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہمارا تمہارا انحصار اس لڑکی پر ہو گا۔
میں تمہیں اس لڑکی کے گھر کا ایڈریس بھی دے رہا ہوں۔ تم نے پڑھ لیا
ہے یہ بھی لاہور کا ایڈریس ہے۔ لڑکی کے بیان کے مطابق اس گھر میں
اُس کی صرف ماں رہتی ہے۔"

"مجھے تو پاکستان کے ایڈریس چاہئیں" — محمود نے کہا —
"مَیں یہ ایڈریس اور دوسری تمام معلومات جو آپ نے مجھے دی ہیں پاکستان
آئی ایس آئی تک پہنچا دوں گا۔ آئی ایس آئی خود سنبھال لے گی۔ لڑکی
خواہ کسی بھی رنگ میں رنگی جاتے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لڑکی کی ماں کا کردار صحیح نہیں" —
عبدالقدیر نے کہا — "اُس کا خاوند غبی اور رشوت خور افسر تھا اور یہ
عورت اپنی عصمت کی قربانی دے کر اُسے بچاتی رہی ہے۔ ایسی عورت
دشمن کی انٹیلی جنس کا بڑی آسانی سے شکار ہو سکتی ہے۔"

"یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں" — محمود نے کہا — "یہ میرا اور آئی ایس آئی
کا کام ہے۔ پاکستان میں کون کیا ہے، اسے سنبھالنا ہمارا کام ہے۔"

"مَیں نے لڑکی کا نام بھی لکھ دیا ہے" — عبدالقدیر نے کہا —
"اصل نام راشدہ ہے اور رِشی کہلاتی ہے۔"

"اگر یہ معلوم ہو جاتے کہ یہ میاں بیوی کب واپس جا رہے ہیں تو بہتر ہوگا" ــــ محمود نے کہا ــــ "میں بہرحال تین چار دنوں کے اندر اندر یہ تمام معلومات پاکستان بھجوا دوں گا۔ آئی ایس آئی والے وہاں سے معلوم کر لیں گے کہ ان کا ویزہ کب تک ہے .... اس لڑکے کا باپ ڈیفینس میں ہے۔ وہ تو بڑے خطرناک راز انڈیا کو دے سکتا ہے۔"

"ہو سکتا ہے دے بھی چکا ہو" ــــ عبدالقدیر نے کہا ــــ "اگر تم نے کچھ اور پوچھنا ہو تو پوچھ لو۔"

"یہ انفارمیشن کافی ہے" ــــ محمود نے کہا ــــ "اور یہ بڑی قیمتی انفارمیشن ہے .... اب چلنا چاہیئے۔ اللہ پر بھروسہ رکھیں۔"

"اللہ پر ہی بھروسہ ہے" ــــ عبدالقدیر نے کہا ــــ "یہ میرا ایمان ہے کہ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ اس سلسلے میں ہم جن خطروں سے صاف بچ کر نکلے ہیں، اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہمیں اپنے اللہ کی خاص کرم نوازی حاصل ہے۔ لڑکی کا ہماری شناخت سے انکار معجزے سے کم نہیں۔"

"عبدالقدیر صاحب!" ــــ محمود نے کہا ــــ "ہماری سب سے بڑی کمزوری ہمارے حکمران ہیں۔ اب تک ہم نے یہ دیکھا ہے کہ پاکستان کے حکمران سیاسی لیڈر ہوں یا جرنیل، سب انڈیا کے آگے جھکے جھکے سے رہتے ہیں۔ پاکستان میں تو ایسا بھی ہوا ہے اور ہوتا رہتا ہے کہ آئی ایس آئی نے کسی بڑے افسر کی نشاندہی کی کہ وہ انڈیا کا جاسوس ہے تو معاملہ اُوپر ہی اُوپر رفع دفع کر دیا گیا۔ جس ملک کی انٹیلی جنس کو حکمران اپنے اقتدار کے تحفظ کے لئے اور سیاسی مخالفین کو دباتے رکھنے کے لئے استعمال کرتے رہیں وہ ملک اپنے دشمن سے کس طرح بچ سکتا ہے۔ خود ہی غور فرمائیں کہ ہمارا یہ دشمن ملک کس طرح ہمارے گمراہ نوجوانوں کو اپنے کام میں استعمال کر رہا ہے۔ کیا پاکستان نے کبھی ہندو، سکھ یا بھارت کے عیسائی نوجوانوں کو اس طرح برین واشنگ کر کے اپنے

کام میں لانے کی کوشش کی ہے؛ ہم یہ کام کر سکتے ہیں بشرطیکہ اس کے لئے موزوں آدمی یہاں بھیجے جائیں اور مطلوبہ سہولتیں فراہم کی جائیں۔ ادھر ہم دشمن کے ملک میں اپنی جانوں کو خطرے میں ڈال کر کام کر رہے ہیں، اُدھر ہمارے بادشاہ اپنے مفادات اور اپنی سوچوں میں مگن ہیں۔ بہرحال ہم اپنے فرائض جان کی بازی لگا کر بھی پورے کر رہے ہیں۔"

"پاکستان اللہ کی اور شہیدوں کی سرزمین ہے" ــــ عبدالقدیر نے کہا ــــ "اللہ ہی پاکستان کے حکمرانوں اور حکمرانی کے خواہش مند لیڈروں کو ہدایت دے گا۔"

عبدالقدیر اور محمود پارک سے اُٹھے، باہر نکلے اور ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ کر اپنی اپنی راہ لگ گئے ــــ خدا ہی ان کا حافظ اور نگہبان تھا۔

محمود پاکستان کی انٹیلی جنس آئی ایس آئی کا کارندہ تھا۔ وہ پاکستانی تھا اور گزشتہ دو سال سے دلی میں بھارتی شہری کی حیثیت سے رہ رہا تھا۔ یہ سب جعل سازی اور بہروپ تھا۔ ان دو سالوں میں وہ آئی ایس آئی کو بڑی قیمتی انفارمیشن دے چکا تھا۔ کوئی ایک سال پہلے عبدالقدیر نے اپنے طور پر محمود کو دریافت کیا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو اعتماد میں لے لیا تھا۔ گزشتہ ایک سال سے ان کی ملاقاتیں اسی مسجد میں ہو رہی تھیں جہاں اُس رات انہوں نے عشاء کی نماز پڑھی تھی۔

چار پانچ دنوں بعد رابی اور رشی طیارے میں بیٹھے ہوتے تھے اور طیارے کے انجن سٹارٹ ہو چکے تھے۔ مسافروں نے سیفٹی بیلٹیں باندھ لی تھیں۔ یہ بیلٹیں تو ایک ہی قسم کی تھیں لیکن رابی بھارت کی ایک بڑی ہی حسین بیلٹ سے بندھ چکا تھا۔ وہ اس بندھن کے حسن میں کھویا ہوا تھا۔ وہ ان خطروں سے بے نیاز تھا جو اس حسن میں پوشیدہ تھے۔ اُس کے ذہن میں رشی سمائی ہوئی تھی۔ اُس کی سوچوں اور خیالوں پر بھارت کی اسی ہندو لڑکی کا غلبہ تھا جو اُس کے دل کی دنیا میں

زینت آفتاب عرف زینی کے بہروپ میں داخل ہوتی تھی۔ اس بہروپ میں رابی کے لئے طلسماتی کشش تھی۔

طیّارہ رَن وے کے سرے پر پہنچ چکا تھا۔ رِشی باہر دیکھ رہی تھی۔ رابی زینی کے تصور میں ایسا گم تھا کہ اُسے معلوم ہی نہ تھا کہ طیارہ اُڑنے کے لئے رَن وے پر دوڑ پڑا ہے۔ رابی گزشتہ رات کے لمحوں میں کھویا ہُوا تھا۔ اُس کے نتھنوں میں زینی کے جسم کی بُوباس ابھی تک موجود تھی جس میں سینٹ بھی شامل تھی۔ یہ مسحور کُن تحفہ تھا جو وہ دِلّی سے لے جارہا تھا۔ زینی آدھی رات تک اُس کے بیڈروم میں رہی تھی۔ گناہ کی بدبو بھی اُس کے لئے عطر بیز تھی۔

رِشی اُس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ اتنی قریب کہ دونوں ایک دوسرے کو چھُو رہے تھے لیکن رابی اور رِشی کے درمیان بڑا لمبا فاصلہ حائل ہو گیا تھا۔ یہ میاں بیوی ندی کے دو کنارے بن گئے تھے جو کبھی بھی اور کہیں بھی نہیں مل سکتے۔ ان کے درمیان محبت اور نفرت کی ندی بہہ رہی تھی ——— رابی کے دل میں زینی کی محبّت اور رِشی کے دل میں رابی کی نفرت تھی۔

طیّارہ فضا میں بلند ہو چکا تھا اور دِلی پر چکر کاٹ کر پاکستان کی طرف محوِ پرواز تھا۔

جب طیّارہ پاکستان کی سرحد میں داخل ہُوا، اُس وقت بھارت کی ایک ریل گاڑی پاکستان کی سرحد میں داخل ہوتی جس میں بھارتی اور پاکستانی مسافر سوار تھے۔ ان میں اشتیاق علی نام کا ایک بھارتی مسلمان بھی تھا جو پاکستان میں اپنے عزیزوں سے ملنے آرہا تھا۔ اُس کے پاس رابی اور رِشی کے گھروں کے ایڈریس تھے۔ محمود نے اُسے وہ تمام روئیداد سُنا دی تھی جو عبدالقدیر نے اُسے سنائی تھی۔ اشتیاق کو معلوم تھا کہ یہ قصّہ پاکستان میں جاکر کہاں اور کیسے سنانا ہے ——— وہ آئی ایس آئی کا ایجنٹ تھا۔

ایک کہانی

بڑے ہی جذباتی، رومانی، سنسنی خیز اور چونکا دینے والے واقعات

عنایت اللہ

"ایک کہانی" کا دوسرا حصہ پیشِ خدمت ہے۔ اس میں کہانی اختتام کو پہنچتی ہے۔

اس کہانی کے متعلق میں نے جو کہنا تھا وہ پہلے حصے میں کہہ دیا ہے۔ ایک بات پھر کہوں گا۔ اس کہانی کو ایک دلچسپ ناول ہی سمجھ کر نہ پڑھیں۔ غور کریں۔ اپنے حلقۂ احباب کو غور سے دیکھیں۔ اگر آپ نوجوان ہیں تو اپنے آپ کو دیکھیں۔ اگر آپ صاحبِ اولاد ہیں تو اپنی اولاد کو دیکھیں، پھر اس راہ کو دیکھیں جس پر آپ کے یار دوست، آپ خود اور آپ کے بچے چلے جا رہے ہیں۔ پھر دیکھیں کہ یہ راہ کس منزل کو جاتی ہے اور کیا آپ صراطِ مستقیم سے بھٹک تو نہیں گئے؟

"ایک کہانی" کے اِس حصے میں آپ کو وہ جذبہ ملے گا جس نے قیصر و کسریٰ کو خس و خاشاک کی طرح اُڑا دیا تھا۔ یہ مردانِ حُر کا جذبہ تھا جو آج کے دَور میں قصۂ پارینہ بن گیا ہے۔ کیوں؟ یہ جذبہ کیوں ناپید ہو گیا ہے؟ اِس ناول میں اس کا جواب موجود ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ وہ کون سا طلسم ہے جو ہمارے دشمن نے ہمارے نوجوانوں پہ طاری کر کے انہیں اس جذبے سے محروم کر دیا ہے اور انہیں اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر رہا ہے۔

میں نے کہا ہے جذبہ ناپید ہو گیا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ جذبہ مر گیا ہے۔ اس جذبے کے امین زندہ ہیں۔ کہانی کے اِس حصے میں آپ کو یہ کردار ملیں گے —

بھارت کی ایک مسلمان خاتون جو پاکستان کے نام پر قربان ہو گئی اور اُس کا خاوند پاکستان میں آ کر شہید ہُوا۔

ایک باپ جس نے اپنے اکلوتے بیٹے کو جاسوسی کے جُرم میں گرفتار کرا دیا۔

ایک حریت پسند بوڑھے پٹھان نے دلی کی اُس حویلی کی لاج رکھ لی جس میں ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے مجاہدوں اور شہیدوں کی روحیں رہتی تھیں۔

آپ دیکھیں گے کہ ماضی اور حال کس موڑ پر آ کر ملتے ہیں۔

میں نے یہ ناول نوجوانوں کے لئے لکھا ہے۔ اُن نوجوانوں کے لئے جن کے متعلق حکیم الامت نے کہا تھا — ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند — میں ان نوجوانوں کو یہ بتا رہا ہوں کہ جن ستاروں پر کمند ڈالی جاتی ہے وہ فلمی ستارے نہیں۔

اس ناول میں وعظ اور لیکچر نہیں بلکہ ایسے واقعات ملیں گے جو آپ کے جذبات اور خیالات میں زلزلے بپا کر دیں گے۔ آپ خود سمجھ جائیں گے کہ میں نے یہ ناول کیوں لکھا ہے اور کس کے لئے لکھا ہے۔

عنایت اللہ

مدیر ماہنامہ "حکایت" لاہور

رابی اور رشی ایئر پورٹ سے نکلے تو رابی کے باپ نے رابی کو اور اُس کی ماں نے رشی کو گلے لگا لیا۔ رابی باپ کے بازوؤں سے نکلا تو ماں کے بازوؤں نے اُسے جکڑ لیا۔ رابی کے باپ نے رشی کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ رابی کی ماں نے رشی کو محض رسمی طور پر گلے لگایا تھا۔ اُس کے بازوؤں میں تو جیسے جان ہی نہیں تھی، لیکن اپنے بیٹے کو اپنے بازوؤں کی لپیٹ میں لیا تو اُس کے بازو لوہے کا شکنجہ بن گئے۔

رابی کا باپ خود ہی گاڑی لایا تھا جب یہ گاڑی ایئر پورٹ سے جا رہی تھی تو رابی کے باپ نے محسوس کیا کہ رابی اور رشی کچھ خوش نہیں یا اتنے خوش نہیں جتنا انہیں اتنی دُور کی سیر کے بعد ہونا چاہیئے تھا۔

گھر پہنچنے تک بھارت کی باتیں ہوتی رہیں۔ رابی اور رشی نے از خود کوئی بات نہ کی۔ رابی کا باپ کچھ پوچھتا تھا تو رابی اُسے جواب دے دیتا تھا۔ رابی کے انداز میں کچھ اُکتاہٹ سی تھی۔ ہر سوال کا جواب وہی دیتا تھا۔ رشی زیادہ دیر چُپ ہی رہی۔

"کیوں رشی!" — رابی کے باپ نے پوچھا — "یہ سفر کی تکان ہے یا سیر کی؟ .... کچھ چُپ چُپ سی لگتی ہو؟"

"نہیں انکل!" — رشی نے جواب دیا — "رابی آپ کو سب کچھ بتا رہا ہے۔"

جب یہ لوگ کوٹھی میں پہنچے تو گاڑی سے اُتر کر رشی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ رابی اپنی ماں اور باپ کے ساتھ ڈرائنگ روم میں جا بیٹھا۔ رابی کے باپ نے اُسے کہا کہ رشی کو یہیں بلا لو۔

"رہنے دو جہاں کہیں ہے" — رابی نے بڑی بے رُخی سے کہا — "یہ تو اتفاق کی بات ہے کہ وہ واپس آ گئی ہے ورنہ ...."

"کیوں؟" — ماں نے چونک کر پوچھا — "کوئی خاص بات ہو گئی تھی؟ .... واپس نہیں آنا چاہتی تھی؟"

"ہوٹل سے غائب ہو گئی تھی" — رابی نے جواب دیا۔

"تمہیں بتائے بغیر کہیں چلی گئی تھی؟" — باپ نے پوچھا — "کتنی دیر باہر رہی تھی؟"

"کتنی دیر کی آپ پوچھتے ہیں!" — رابی نے جواب دیا — "دو ہفتوں کے لگ بھگ غائب رہی۔ پولیس میں رپورٹ ہوئی۔ پولیس نے تلاش اور تفتیش میں بڑی ہی محنت اور دیانتداری سے کام کیا، لیکن اس کا کوئی سراغ نہ ملا اور ایک رات یہ خود ہی واپس آ گئی اور آکر یہ بتایا کہ اسے دھوکے سے ہوٹل کے کمرے سے کوئی آدمی بلا کر لے گیا تھا۔ باہر ایک کار کھڑی تھی۔ اسے اس کار میں بٹھا لیا گیا۔ آگے جا کر دو تین اور آدمی کار میں بیٹھ گئے اور اسے ایک کوٹھی میں لے گئے۔"

"کیا یہ آدمی کوئی جرائم پیشہ تھے؟"

"یہ بتاتی ہے کہ وہ نوجوان اینگلو انڈین اور ایک دو ہندو یا مسلمان تھے" — رابی نے جواب دیا — "جس روز یہ لاپتہ ہوئی اس روز میں اسے کمرے میں چھوڑ کر اپنے میزبان دوست عزیز کے ساتھ تھوڑی سی دیر کے لئے باہر چلا گیا تھا۔ میں شک سے نہیں بلکہ یقین سے کہتا ہوں کہ یہ خود ان کے ساتھ گئی تھی۔ اگر اسے جرائم پیشہ لوگ لے جاتے تو وہ اسے واپس نہ چھوڑ جاتے۔ یہ لڑکی بردہ فروشوں کے لئے بڑا قیمتی مال تھی۔ میں ہوٹل سے شفٹ ہو کر اپنے دوست عزیز کے گھر جا ٹھہرا تھا۔ اتفاق سے میں اور عزیز رات کو گاڑی میں واپس گھر کو آ رہے تھے کہ گھر کے سامنے ایک کار آکر رکی۔ اس میں سے رشی باہر آئی اور کار چل پڑی۔ ہم نے جلدی جلدی اس سے پوچھا کہ کہاں غائب ہو گئی تھی۔ اس نے بتایا کہ یہ لوگ اس کو دھوکے میں لے گئے تھے اور اب اتار گئے ہیں ....

"میں نے اور عزیز نے گاڑی میں ان کا پیچھا کیا۔ ایک جگہ ہم نے ان کی گاڑی کو روک لیا۔ وہ کوئی غنڈے سے تھے۔ انہوں نے مجھے اور عزیز کو

مارا پیٹا اور گاڑی لے کر بھاگ گئے۔ پولیس کو رشی نے وہی بیان دیا جو یہ ہمیں بتا گئی تھی۔ یہ دراصل دلّی کے کسی پرانے محلّے میں رہی تھی جہاں اسے پولیس کے ایک مخبر نے دیکھا تھا۔ یہ مخبر ایک عورت تھی پولیس نے ایک خاص طریقے سے اس لڑکی کو اس مکان میں دیکھنے کا انتظام کیا لیکن یہ وہاں نہیں تھی۔ یہ کہتی ہے کہ وہ کوئی پرانے ٹھاٹ کا مکان نہیں تھا بلکہ نئے دور کی بڑی اچھی کوٹھی تھی۔"

رابی نے زیبِ داستان کے لئے وہ ساری کارروائی سنائی جو انٹیلی جنس نے کی تھی، لیکن اس نے انٹیلی جنس کا نام لینے کی بجائے یہ کہا کہ وہ پولیس کا سی آئی اے کا شعبہ تھا۔ رابی کے ذہن پر زینی سوار تھی۔ اس نے اپنے ماں باپ کے دلوں میں رشی کے خلاف خوب نفرت پیدا کی۔

"میں تو اسے انڈیا سے لانا ہی نہیں چاہتا تھا" — رابی نے کہا — "اگر اسے انڈیا کے اینگلو انڈین اتنے ہی پسند تھے تو وہیں رہتی، لیکن امیگریشن کے قانون کے مطابق یہ وہاں نہیں رہ سکتی تھی۔ ویزہ کی معیاد پوری ہو چکی تھی" — رابی نے مزید جھوٹ بولا — "سی آئی اے کے ایک افسر نے یہ کہہ کر مجھے بہت شرمسار کیا کہ اسے پاکستان لے جاؤ ورنہ یہ پھر کسی کے ساتھ بھاگ جائے گی اور نام ہماری گورنمنٹ کا بدنام ہو گا۔"

"تم باپ بیٹا اس وقت سمجھتے ہو جب پانی سر سے اوپر ہو جاتا ہے" — رابی کی ماں نے کہا — "میں نے تمہیں شادی سے پہلے کہا تھا کہ اس لڑکی کو اِس گھر میں نہ لاؤ، لیکن نہ تم مانے نہ تمہارا باپ۔

اس کی ماں کا کیریکٹر تمہارے سامنے ہے۔ اس کی تربیت ماں نے کی ہے۔ ہو ہی نہیں سکتا کہ یہ لڑکی کسی ایک آدمی کی وفادار ہو کے رہے۔ اس کی ماں خاوند کے جیتے جی طوائف بن کے رہی۔ اس کی جوانی ڈھل گئی تو بیٹی جوان ہو گئی۔ ماں نے اسے اپنی لائن پہ چلا لیا۔"

"یہ تو ہُوا" — رابی کے باپ نے کہا — "میں اپنی غلطی تسلیم کر لیتا ہوں۔ اب بتاؤ کیا ہو سکتا ہے۔ کیا میں رشی سے پوچھوں کہ وہ کہاں رہی تھی؟"

"پوچھنے کی ضرورت نہیں ڈیڈی!" — رابی نے کہا — "مجھے وہاں جا کر پتہ چلا کہ یہ کس قدر چالاک اور فریب کار ہے۔ اس نے پولیس کے افسروں کے مُنہ پھیر دیتے تھے۔"

"طلاق کے سوا مجھے کوئی اور حل نظر نہیں آتا"۔ رابی کی ماں نے کہا۔

"پھر اس گھر کی کیا عزت رہ جاتے گی؟" — رابی کے باپ نے کہا۔

"تو کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ آتے دن یہ لڑکی نتے سے نتے بوائے فرینڈ بنا کر اُن کے ساتھ گلچھرے اُڑاتی رہے"؟ — رابی کی ماں نے کہا — "کیا اس وقت آپ کی عزت رہ جاتے گی جب لوگ ہمارا نام لے کر کہیں گے کہ یہ ان کی بہو ہے؟"

"میں اسے نہیں رکھ سکتا ڈیڈی!" — رابی نے کہا — "یہ ہر روز ہمیں اسی طرح پریشان اور بدنام کرتی رہے گی"۔

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ وہاں جو تین افراد بیٹھے تھے، اُن کی سوچیں ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔ رابی جھوٹ بول کر رشی سے آزاد ہونا چاہتا تھا تا کہ زینی کے ساتھ شادی کر سکے۔ رابی کی ماں کے دل میں شادی سے پہلے ہی رشی کے خلاف نفرت بیٹھی ہوئی تھی جو رشی کی ماں کی وجہ سے تھی۔ وہ اپنے گھر کو اس لڑکی سے پاک کرنا چاہتی تھی۔ رابی کا باپ اس سوچ میں کھو گیا تھا کہ طلاق سے بچا جا سکتا ہے یا نہیں۔ وہ اپنی بدنامی سے ڈرتا تھا۔

"میری ایک بات مان لو" — رابی کے باپ نے کہا — "جلد بازی میں فیصلہ نہ کرو۔ اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ رشی کی ماں کو معلوم ہو گا کہ رشی اور رابی آج آ رہے ہیں۔ وہ اس لئے ایئرپورٹ پر نہیں آئی نہ یہاں آتی ہے کہ اُسے اس گھر سے دھتکار کر نکال دیا گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ رشی کو اس کی ماں کے گھر بھیج دیا جاتے اور اسے کہا جاتے کہ کچھ دن

ماں کے پاس رہ آؤ"۔

کچھ بحث مباحثے کے بعد رابی کی ماں اور رابی نے یہ مشورہ قبول کر لیا۔

❋

رشی بیڈ روم میں پلنگ پر بیٹھی تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ رابی اپنے والدین کو اُس کے متعلق کیا رپورٹ دے گا۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ اُس کی ماں کیا فیصلہ سناتے گی اور اس فیصلے پر رابی کتنا خوش ہو گا۔ رشی اپنے آپ کو طلاق کے لئے ذہنی طور پر تیار کر رہی تھی۔ اُسے ڈریسنگ ٹیبل پر فریم میں لگا ہُوا اپنا اور رابی کا فوٹو نظر آیا۔ وہ کچھ دیر رابی کے فوٹو کو دیکھتی رہی۔ رابی کا یہی چہرہ تھا جو اُسے اپنے چہرے سے زیادہ پیارا لگا کرتا تھا، مگر آج وہی چہرہ بگڑتا بگڑتا شیطان کا چہرہ بن گیا۔

اُس نے اپنا فوٹو دیکھا تو اُسے اپنا چہرہ بھی بگڑا بھدا دکھائی دیا۔ اُس کا خون یکلخت اتنا زیادہ کھولنے لگا جیسے اُس کی رگوں میں پگھلا ہُوا سیسہ دوڑ رہا ہو۔ وہ آگ بگولے کی طرح اُٹھی اور فوٹو کی طرف لپکی۔ فریم کو توڑ کر وہ فوٹو کو ناخنوں سے نوچنا اور اسے پھاڑ کر پُرزے پُرزے کر دینا چاہتی تھی۔ اُس نے دو تین قدم ہی اُٹھاتے تھے کہ یُوں رُک گئی جیسے کسی نے سامنے آکر اُسے روک لیا ہو۔ اُس کے سامنے ڈریسنگ ٹیبل کا آئینہ تھا جس میں اپنے آپ کو دیکھ لیا اور وہ رُک گئی۔ اپنے عکس کو یوں دیکھا جیسے آئینے میں کوئی اجنبی لڑکی کھڑی ہو۔ اس کی شکل رشی سے ملتی جلتی تھی۔

آہستہ آہستہ اُسے یقین آنے لگا کہ وہ خود ہے۔ اُس کا ایک چہرہ فوٹو والا تھا جو اُسے بھدا، بدصورت اور قابلِ نفرت لگا تھا اور یہ بھی اُسی کا چہرہ تھا جو اُسے آئینے میں نظر آیا۔ یہ اُسے اچھا لگا۔ شاید اس لئے کہ اس چہرے پر رنگ برنگے میک اپ کا لیپ نہ تھا۔ بھنویں پنسل سے

بنی ہوئی نہیں تھیں۔ ہونٹوں پر کسی بھی لپ سٹک کا رنگ چڑھا ہُوا نہیں
تھا۔ چہرہ قدرتی حالت میں تھا اور اس کا رنگ قدرتی تھا۔ اس کے بال
پہلے کی طرح کٹے ہوتے ہی تھے لیکن آج یہ بال شانوں پر بکھرے ہوتے
نہیں بلکہ پیچھے بندھے ہوتے تھے اور ان پر دوپٹہ پڑا ہُوا تھا۔

دِلی سے چلتے وقت رشی کی جذباتی حالت ایسی دگرگوں تھی کہ اس
نے میک اپ کیا ہی نہیں تھا۔ میک اپ کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ اس
سوسائٹی کی تو نانیاں اور دادیاں بھی گھر سے میک اپ کے بغیر باہر نکلنے
کا تصوّر بھی نہیں کر سکتی تھیں لیکن رشی نے غسل کیا، کپڑے بدلے، بالوں
میں کنگھی کی اور رابی کے ساتھ چل پڑی تھی۔ رابی نے اُسے رسماً بھی نہیں
کہا تھا کہ چہرے پر پاؤڈر کا ہلکا سا پلف ہی کر لو۔

آئینے میں اپنے سر پر دوپٹہ دیکھ کر اُسے یاد نہ آیا کہ یہ اُس نے
کس وقت سر پر رکھا تھا۔ اُسے ایک بار پھر دھوکہ ہُوا کہ آئینے میں وہ نہیں
کوئی اور لڑکی ہے اور وہ جو کوئی بھی ہے اُسے اچھی لگ رہی ہے۔

اُسے شبِ عروسی یاد آئی۔ اس کمرے میں آکر اُس نے پہلا کام
یہ کیا تھا کہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے سراپا کا، اپنے
کپڑوں اور میک اپ کا جائزہ لیا تھا پھر مصنوعی جُوڑا اُتارا تھا۔ میک اپ
کی تہہ کو درست کیا تھا اور بھنوؤں پر ایک بار پھر پنسل پھیری تھی۔ یہ بیڈروم
شادی سے پہلے بھی رابی کا ہی تھا۔ پہلے یہاں سنگل بیڈ ہوتا تھا، شادی
کے پہلے روز یہاں ڈبل بیڈ رکھ دیا گیا تھا۔ شادی کی پہلی رات وہ اس بیڈ
میں پہلی بار نہیں آئی تھی۔ شادی سے پہلے دو بار وہ اس کمرے میں آ چکی
تھی۔ دونوں بار رابی کے ماں باپ کہیں باہر چلے گئے تھے اور رابی
نے رشی کو بلا لیا تھا۔

آج اُسے شبِ عروسی بھی یاد آ رہی تھی اور رابی سے اس کمرے
میں شادی سے پہلے کی دو ملاقاتیں بھی یاد آ رہی تھیں۔ اُسے یوں محسوس
ہونے لگا جیسے وہ مر گئی ہو اور اُس کی لاش سے بدبو اُٹھ رہی ہو۔

"مَیں تمہیں صرف یہ یاد دلانا چاہتی ہوں کہ تم کسی مسلمان باپ کی بیٹی
ہو" ـــــ اُسے ایک نسوانی آواز سنائی دی ـــــ "اور تمہیں کسی مسلمان کی
بیٹی نے جنم دیا ہے۔"

رشی نے بیڈروم میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ اُس کی نظریں واپس آئینے
پر آئیں تو اپنے عکس کے پیچھے اُسے معزز سی ایک عورت دکھائی دی۔
رشی نے اُسے فوراً پہچان لیا۔ وہ ہاشمی کی بیوی تھی اور یہ اُسی کے الفاظ تھے
جو رشی کے ذہن میں گونجے تھے۔ یہ تھا تو واہمہ لیکن آئینے میں ہاشمی کی بیوی
کا عکس حقیقی لگ رہا تھا۔

"جو قوم اپنی پہچان اور جو انسان اپنا آپ بھول جاتا یا تبدیل کر لیتا
ہے، اُس کا یہی حال ہوتا ہے جس حال میں تم پہنچ چکی ہو" ـــــ یہ آواز بھی
ہاشمی کی بیوی کی تھی۔

"سن چھیالیس اور سن سنتالیس میں ہم پر کسی نے رحم نہیں کیا تھا" ـــــ
یہ آواز ہاشمی کی تھی۔

آئینے سے ہاشمی کی بیوی کا عکس غائب ہو گیا تھا لیکن اُسے آوازیں
سنائی دے رہی تھیں۔

"مَیں کیا ہوں؟" ـــــ یہ اُس کی اپنی آواز تھی ـــــ "میں کہاں سے
آئی تھی؟ کہاں جا رہی ہوں؟ مجھے کوئی نہیں بتاتا۔ مجھے اپنے راستے کا
کوئی علم نہیں، اپنی منزل کا کوئی علم نہیں ..... ایک رابی ہے جس کے دل
میں میری محبت ہے لیکن وہ بھی میرے جسم کا خریدار نکلا۔"

"تم ابھی بچی ہو" ـــــ یہ ہاشمی کی بیوی کی آواز تھی جو اُسے یوں سنائی
دے رہی تھی جیسے پرانی دِلی کی یہ خاتون اسی بیڈروم میں بیٹھی اس کے ساتھ
باتیں کر رہی ہو ـــــ "اس دنیا کو اور دنیا کے انسانوں کو اور ہر انسان کے دل
میں چھپے ہُوئے بھید کو جاننے کے لئے تم ابھی کمسن ہو۔ اپنے دل کو اتنا
دکھی نہ کرو۔ ہم نے تمہیں سچ بولنے پر اُکسایا ہے۔ یہی وہ سیدھا راستہ ہے جو
ہم تمہیں دکھا سکتے ہیں۔"

لاہور میں اسی کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں رشی کے سہاگ کو سزائے موت دینے کا فیصلہ ہو رہا تھا اور رشی پرانی دلی کی اُس حویلی میں پہنچی ہوئی تھی جس میں وہ قید رہی تھی۔ اُسے ہاشمی اور اُس کی بیوی کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ اُسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے یہی میاں بیوی اُس کے والدین ہوں۔ اُس نے وہاں روحانی سکون پایا تھا۔

اس حویلی میں جانے سے پہلے وہ اپنے آپ کو صرف جسم سمجھتی تھی اور اس کی زیبائش اور اس کی ضروریات پوری کرنے میں لگی رہتی تھی۔ ہاشمی اور اُس کی بیوی نے اس کی ذات میں ایسی روشنی ڈال دی تھی جس نے اُسے روح دکھا دی تھی اور اس روشنی میں اسے اپنا ضمیر بھی نظر آ گیا تھا۔ اُسے روحانی سکون ملا تو وہ کچھ اس طرح محسوس کرنے لگی جیسے وہ پاپ اور ڈسکو ناچ گانوں اور آرکسٹرا کے ہنگاموں میں اسی سکون کو ڈھونڈتی رہی ہو۔

رابی نے اُس کے ساتھ جو سلوک کیا تھا اس سے تو وہ ان کوٹھیوں سے، کاروں سے اور اپنی سوسائٹی سے بیزار ہو گئی تھی۔ اُس نے ہاشمی کی صدیوں پرانی حویلی میں محسوس نہیں کیا تھا کہ وہ قید ہے۔ قید کا احساس اُسے اپنے بیڈ روم میں آ کر ہونے لگا۔

اُسے اچانک خیال آیا کہ رابی اپنے ماں باپ کے پاس جا بیٹھا ہے اور وہ اکیلی ادھر آ بیٹھی ہے، رابی اور اس کے ماں باپ کو اتنا بھی خیال نہیں کہ اسے بلا لیں۔ وہ سمجھ گئی کہ رابی اپنی ماں اور اپنے باپ کو دِلی کی رپورٹ دے رہا ہے۔ یہ تو اُسے معلوم ہی تھا کہ رابی کی ماں اسے پسند نہیں کرتی۔

اُسے جب یہ خیال آیا کہ رابی کیا رپورٹ دے رہا ہو گا تو اُس کے ذہن میں آئی کہ وہ رابی کے باپ کو بتائے گی کہ رابی انڈیا کا جاسوس ہے اور جاسوسی کے سلسلے میں انڈیا گیا تھا۔ رشی نے یہ بھی سوچا کہ وہ یہ بھی بتائے گی کہ زینی نام کی ایک لڑکی نے رابی کو پھانس لیا ہے۔

رشی کے پاس جوابی کارروائی کے لئے بہت کچھ تھا لیکن اس کے لئے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو گیا تھا کہ وہ رابی کے والدین کو بتائے یا نہ بتائے کہ رابی انڈیا کا جاسوس ہے اور زینی کا ذکر کرے یا نہ کرے۔ وہ گہری سوچوں میں کھو گئی۔ اُس کے ذہن میں جب یہ آتی تھی کہ وہ سب کچھ بتا دے تو ایک خیال یہ آ جاتا تھا کہ رابی کے والدین خصوصاً ماں اسے اپنے بیٹے پر جھوٹا الزام کہے گی۔ اپنی اولاد کے خلاف کون ایسی بات سننا پسند کرتا ہے۔ اس صورت میں جب کہ رشی پر الزام لگائے جا رہے تھے، اُس کی سچی باتوں کو بھی جھوٹا الزام سمجھا جانے کا امکان تھا۔ رشی کے پاس یہ صحیح الزامات ثابت کرنے کا کوئی ثبوت نہ تھا۔

سوچتے سوچتے اُس کے سامنے خاموش رہنے کی ایک وجہ اور آ گئی جو یہ تھی کہ وہ بہتر طریقے سے انتقام لے سکتی تھی۔ طریقہ یہ تھا کہ پاکستان کی انٹیلی جنس تک رسائی حاصل کرے اور بتائے کہ رابی انڈیا کا جاسوس ہے۔ پاکستان کی انٹیلی جنس (آئی ایس آئی) تک پہنچنے کا اُس کے پاس کوئی ذریعہ نہیں تھا۔

اُس کا ذہن یہیں پر اٹک گیا کہ وہ رابی کو پکڑوائے گی۔ اُسے یہ خیال بھی آیا کہ رابی جاسوس ہے تو اسے اپنے باپ کی مدد بھی حاصل ہو گی۔ اُسے معلوم تھا کہ رابی کا باپ جس محکمے کا اعلیٰ افسر ہے وہاں بڑے قیمتی راز ہوتے ہیں اور رابی کا باپ رابی کے ذریعے ان رازوں کی مُنہ مانگی قیمت وصول کرتا ہو گا۔

رشی یہ جوابی حملہ انتقام کے طور پر کرنا چاہتی تھی لیکن انتقام کے ساتھ ساتھ اس کے اندر ایک اور جذبہ پیدا ہو گیا جو دلی میں ہاشمی اور اُس کی بیوی کی باتوں سے بیدار ہوا تھا۔ دِلی میں اُس نے جب ہاشمی اور اس کی بیوی کی باتیں سُنی تھیں تو اس کے سامنے اپنی زندگی آ گئی تھی اور وہ اپنے آپ کو ایک معمّہ سمجھنے لگی تھی۔

اُسے جب دھوکے میں اغوا کر کے ہاشمی کی حویلی میں پہنچایا گیا تھا

تو وہ کچھ اور سمجھی تھی۔ اُسے توقع تھی کہ اُس کے ساتھ بہت بُرا سلوک ہوگا۔
وہ جانتی تھی کہ اُس جیسی خوبصورت اور نوجوان لڑکی کو اغوا کرنے کا مقصد
کیا ہوتا ہے۔ وہ ذہنی طور پر اس سلوک کے لئے تیار ہوگئی لیکن دو راتوں
کی تنہائی نے اُس کا یہ خوف دُور کر دیا اور جب اُسے یہ کہا گیا تھا کہ یہاں
اُس کی عزت محفوظ رہے گی تو اُسے ڈھکوسلا سا لگا تھا۔ سب سے زیادہ تو
وہ رفیقی سے متاثر ہوئی تھی۔ رفیقی جوان آدمی تھا۔ رشی کو اس کے پاس
تنہا رکھا گیا تھا۔ اُسے رفیقی کے گھر میں تنہائی کی دو راتیں یاد آنے لگیں۔
رات سوتے میں وہ اچانک جاگ اٹھتی اور انتظار کرنے لگتی کہ ابھی رفیقی
کمرے میں آجاتے گا لیکن رفیقی کی صورت وہ اُس وقت دیکھتی تھی جب
صبح طلوع ہوجاتی تھی۔ وہاں دن اور رات کا کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ رفیقی
نے تین چار دنوں کی چھٹی لے لی تھی تاکہ دن کے وقت بھی رشی پر پہرہ
دے سکے۔

"کیا آپ نے ناشتہ خود تیار کیا ہے؟" —— پہلی صبح رشی نے رفیقی
سے پوچھا تھا۔

"ہاں!" —— رفیقی نے جواب دیا تھا —— "میں ہانڈی روٹی بھی
کر سکتا ہوں۔"

"مجھے اُٹھا لیتے" —— رشی نے کہا تھا —— "یہ کام مرد کرتے اچھے
نہیں لگتے۔"

"اور یہ کام مہمان کریں تو بھی اچھا نہیں لگتا" —— رفیقی نے کہا تھا۔

رشی نے محسوس کیا تھا کہ اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہو رہی
ہے کہ وہ ان لوگوں کی خدمت ایک بیٹی اور بہن کی طرح کرے۔ وہ نہیں
جانتی تھی کہ یہ خواہش نہیں بلکہ ایک انقلاب ہے۔

❄

سوچ سوچ کر رشی پریشان ہونے لگی۔ اُس کا ہاتھ پکڑنے والا کوئی
نہ تھا، کوئی نہ تھا جس سے وہ مشورہ لیتی یا جسے وہ حالِ دل سناتی۔ اتنے

خوبصورت اور سجے سجائے کمرے میں اُس کا دم گھٹنے لگا۔ ایسی کیفیت میں
بیٹیوں کو مائیں یاد آتی ہیں لیکن رشی کو ماں کا اُڑتا سا خیال بھی نہ آیا۔

اُس کا ذہن پریشانی کے اُس مقام تک پہنچا جہاں انسان فرار
کے راستے پر چل پڑتا ہے۔ رشی کے سامنے فرار کے راستے کھلے۔
روکنے والا کوئی نہ تھا نہ کوئی اور رکاوٹ تھی۔ اُس کی ڈسکو سوسائٹی اُس
کے لئے بہترین پناہ گاہ تھی۔ رشی جسے چاہتی دوست بنا سکتی تھی۔ اس
کے لئے چاہنے نہ چاہنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ اُس کے چاہنے والے
بہت تھے۔ وہ اُسے ہر طرح کی آسائش فراہم کرنے کے لئے تیار تھے۔ اسے
شراب بھی مل سکتی تھی، کوئی اور نشہ چاہتی تو اُس کے چاہنے والے اُس
کے اشارے پر مہیا کرتے لیکن وہ سحر جو اُس پر ہاشمی کی حویلی میں طاری
ہُوا تھا وہ اتنا گہرا اُتر گیا تھا کہ اُس کے ذہن میں فرار کی سوچ آتی ہی نہیں۔

کمرے کا دروازہ کھلا۔ رشی نے چونک کر دیکھا۔ رابی آیا تھا۔

رشی کے دل میں نفرت کا طوفان سا اُٹھا۔ اُسے یُوں لگا جیسے یہ
کوئی اجنبی ہے جس نے اسے اغوا کر کے اس کمرے میں بند کر رکھا ہے
اور اب یہ اس پر مجرمانہ حملہ کرنے آیا ہے۔

"تم اپنی ماں کے ہاں چلی جاؤ" —— رابی نے اُسے بے رُخی کے
لہجے میں کہا —— "وہ تمہارے انتظار میں ہوگی۔ ڈرائیور تمہیں چھوڑ آئے گا۔"

"تم نہیں چلو گے؟"

"نہیں!" —— رابی نے جواب دیا —— "میں ذرا آرام کروں گا....
اپنا سارا سامان لے جاؤ۔"

"سارا سامان کیوں؟"

"اس لئے کہ تم نے وہاں کچھ دن رہنا ہے" —— رابی نے جھنجھلا
کر جواب دیا۔

"رابی!" —— رشی نے کہا —— "تم نے میرے متعلق جو فیصلہ کیا
ہے وہ کیوں نہیں بتا دیتے؟"

"وہ بھی بتادوں گا" ـــــ رابی نے جواب دیا ـــــ "تم چلی جاؤ۔"

رِشی سمجھ گئی کہ اُس کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اُس نے اپنا سامان الگ کرنا شروع کر دیا۔ اُسے زیورات کا خیال آیا۔ رابی کے گھر کی طرف سے اُسے بڑے ہی قیمتی زیورات ملے تھے جن میں ہیروں کی انگوٹھیاں بھی تھیں۔ اُس کی ماں نے بھی اُسے کچھ کم زیورات نہیں دیئے تھے۔ رِشی نے اپنی ماں کے دیئے ہوئے زیورات الگ کر کے اپنے اٹیچی میں رکھ لئے اور سُسرال سے ملے ہوئے زیورات کے ڈبے اُٹھا کر رابی کی ماں کے پاس چلی گئی۔

"آنٹی!" ـــــ رِشی نے زیورات کے ڈبے رابی کی ماں کے آگے رکھتے ہوئے کہا ـــــ "یہ رکھ لیں۔"

"مَیں کیوں رکھ لوں؟"

"اس لئے کہ یہ آپ کے ہیں" ـــــ رِشی نے جواب دیا ـــــ "مَیں اپنے گھر جا رہی ہوں۔"

"تو کیا واپس نہیں آؤ گی؟"

"اس سوال کا جواب رابی دے سکتا ہے" ـــــ رِشی نے جواب دیا ـــــ "اُس نے جس انداز سے مجھے ماں کے پاس جانے کو کہا ہے، اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ مَیں واپس آنے کے لئے نہیں جا رہی" ـــــ رِشی ڈبے رکھ کر باہر کو چل پڑی۔

"ذرا ٹھہرو رِشی!" ـــــ رابی کی ماں نے کہا۔

رِشی رُک گئی لیکن پوری طرح رابی کی ماں کی طرف نہ گھومی۔ ذرا سا گھوم کر اُس کی طرف دیکھا۔

"دِلّی میں تم کہاں چلی گئی تھیں؟" ـــــ رابی کی ماں نے پوچھا۔

"کیا رابی نے آپ کو بتایا نہیں؟"

"اُس نے کوئی خاص بات نہیں بتائی" ـــــ رابی کی ماں نے کہا۔

"آنٹی!" ـــــ رِشی نے کہا ـــــ "مَیں نے رابی سے بھی کہا ہے کہ میرے متعلق تم لوگوں نے جو فیصلہ کیا ہے وہ بتادو لیکن اُس نے نہیں بتایا۔ اُس کے انداز اور لہجے سے میں سمجھ گئی ہوں۔"

"میرا خیال ہے کہ تم خود کوئی فیصلہ چاہتی ہو" ـــــ رابی کی ماں نے کہا۔

"مَیں جو کچھ چاہتی ہوں وہ جلدی ہی آپ کے سامنے آجائے گا" ـــــ رِشی نے کہا ـــــ "مَیں اس وقت بحث کے موڈ میں نہیں۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہُوا کہ تمہارے ساتھ بات کرنے سے پہلے یہ دیکھا جائے کہ تم بات کرنے کے موڈ میں ہو یا نہیں" ـــــ رابی کی ماں نے کہا۔

اُس کا فقرہ ابھی پورا نہیں ہُوا تھا کہ رِشی کمرے سے نکل گئی۔

❄

رابی کے باپ کی کار جب رِشی کی ماں کی کوٹھی میں داخل ہوئی تو ماں دوڑتی ہوئی باہر نکلی۔ رِشی کو دیکھ کر اُس نے لپک کر کار کا دروازہ کھولا۔ رِشی باہر نکلی تو ماں نے اُسے اپنے بازوؤں کے شکنجے میں جکڑ لیا اور اُس کا مُنہ چُومنے لگی۔ ماں کے اتنے والہانہ استقبال کے جواب میں رِشی کے ملنے کے انداز میں والہانہ پن کا نام و نشان نہ تھا۔ ماں نے بیٹی کی یہ سرد مہری محسوس کی ہو گی، لیکن بیٹی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر ماں کے احساسات تڑپ اُٹھے۔ پیشتر اس کے کہ ماں اُس سے آنسوؤں کی وجہ پوچھتی، رِشی نے نوکر سے کہا کہ سامان گاڑی سے نکال کر اندر رکھے اور ڈرائیور سے کہا کہ سامان اُتار کر وہ چلا جائے۔

"کیوں رِشی!" ـــــ ڈرائنگ روم میں رِشی کو بٹھا کر ماں نے پوچھا ـــــ "کیا ہُوا؟ انڈیا سے آج ہی آئی ہو؟ مجھے تو ان لوگوں نے بتایا ہی نہیں کہ تم کب آرہی ہو۔"

رِشی کے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی نظریں ماں کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اُس کے دل میں ماں کے خلاف نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ نفرت بھی اتنی کہ اُسے کوئی اور ٹھکانہ نظر آتا تو وہ ماں کی صورت دیکھنے اس گھر میں نہ آتی، لیکن ماں کو اپنے سامنے بیٹھا دیکھ کر نفرت یوں پگھلنے لگی جیسے

سورج کی تپش سے برف پگھلنے لگتی ہے۔ وہ چُپ چاپ ماں کے چہرے پر ٹکٹکی باندھے بیٹھی رہی۔ اُس کے آنسو اُس کے گلابی رخساروں پر بہہ رہے تھے۔ اُسے تو جیسے آنسو پونچھنے کا خیال بھی نہ تھا۔ ماں اُٹھ کر اُس کے پاس صوفے پر آبیٹھی اور بازو اُس کے گلے میں ڈال کر اُس کے گال اپنے گالوں سے لگا لیئے۔ پھر اپنے دوپٹے سے اُس کے آنسو پونچھے۔ ماں کے گالوں کے لمس سے نفرت کی برف پگھل گئی۔ وہ آخر اُس کی ماں تھی، اُس کا خون تھا۔ اُس کی چھاتیوں کا ذائقہ جیسے ابھی تک رشی کی زبان پر موجود تھا۔ رشی ماتا اور نفرت کے درمیان ایک خلاء میں بھٹکنے لگی۔ ماں اُسے جھنجھوڑ کر پوچھ رہی تھی کر سسرال سے یا انڈیا سے وہ کیا دُکھ لے کے آئی ہے۔

"کیا اُس چڑیل ساس نے کچھ کہا ہے؟"

"رابی نے کوئی بدسلوکی کی ہے؟"

"سسر نے کسی بات پر ڈانٹ ڈپٹ کی ہے؟"

"نہیں ممی! نہیں"— رشی بارُود کی طرح پھٹتے ہُوتے بولی— "مجھ پر اتنے زیادہ سوال پھینک کر مجھے اور پریشان نہ کرو۔ مجھے صرف یہ بتادو کر میں کس کی بیٹی ہوں"۔

"یہ کیا پوچھا ہے تم نے؟"— ماں نے اُس سے پرے ہٹتے ہوتے کہا۔

"میں پوچھ رہی ہوں میں کس باپ کی بیٹی ہوں"— رشی نے جھنجھلا کر کہا۔

ماں نے حیرت سے پھٹی ہوئی نظروں سے اُسے دیکھا۔

"میں اپنے باپ کی بیٹی نہیں ہوں ممی!"— رشی نے اپنے سر کو زور زور سے ہلاتے ہوتے کہا— "میں اُس شخص کی بیٹی نہیں ہوں جو تمہارا خاوند تھا"۔

"شٹ اپ یُو ایڈیٹ!"— ماں نے اُسے انگریزی میں ڈانٹتے ہوتے کہا— "یُو تھنک یُو آر باسٹرڈ؟"

"ہاں"— رشی نے غصیلی آواز میں جواب دیا— "میں باسٹرڈ ہوں .... حرامی کو انگریزی میں باسٹرڈ کہہ دینے سے وہ حلالی نہیں ہو جاتا میں اُس باپ کی بیٹی نہیں ہوں جو تمہارا خاوند تھا"۔

"معلوم ہوتا ہے تمہاری ساس نے تمہارے دماغ میں وہی غلاظت ڈال دی ہے جو اُس نے معلوم نہیں کیوں میرے مُنہ پر تھوپی تھی"— ماں نے کہا۔

"نہیں ممی!"— رشی نے قدرے سنبھلی ہوئی آواز میں کہا— "میرا بس چلے تو میں اُس عورت کا گلا گھونٹ دوں، اپنے ہاتھوں اُسے زہر پلا دوں۔ اُس نے مجھے اس لئے آج یہاں نہیں بھیجا کہ میں اپنی ماں سے ملوں اور کچھ دن ماں کے پاس گزاروں۔ اُس نے صاف لفظوں میں کہا تو نہیں، لیکن مجھے یقین ہے کہ اُس نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے اور ہو سکتا ہے کہ ایک دو دنوں میں طلاق نامہ آجاتے"۔

"بس اتنی سی بات ہے؟"— ماں نے بڑے آرام سے کہا— "اچھا ہے کہ اُنہوں نے طلاق دینی تھی تو ابھی دے دی ہے۔ کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ ان لوگوں سے اچھا اور کوئی گھر نہیں ملے گا؟ کیا رابی سے بہتر کوئی اور آدمی نہیں .... اگر تمہیں رابی سے بہت ہی زیادہ محبت ہے تو پھر میں تمہارے دُکھ کو سمجھ سکتی ہوں"۔

"آئی ہیٹ دیٹ باسٹرڈ"— رشی نے دانت پیس کر کہا— "وہ قابلِ نفرت ہے۔ وہ مجھ جیسی لڑکیوں کا شکاری ہے۔ اگر وہ مجھے طلاق نہیں دے گا تو میں خود اُس سے طلاق لے لوں گی"۔

"مجھے کچھ تو بتاؤ رشی!"— ماں نے اُس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر پوچھا— "انڈیا سے آتے ہی یہ کیا ہو گیا ہے؟"

"وہاں رابی نے دِلی میں ایک اور لڑکی کو اپنے اُوپر سوار کر لیا ہے"— رشی نے کہا— "اور یہاں آکر وہ مجھے بدنام کرتا ہے کہ میں کسی کے ساتھ بھاگ گئی تھی"۔

"یہ کیا بکواس ہے!" — ماں نے پریشان ہو کر کہا — "کچھ بتاؤ رِشی! کچھ بتاؤ۔ مَیں کچھ نہیں سمجھی۔"

رِشی کی نظریں ایک بار پھر ماں کے چہرے پر جم گئیں۔ اُس کا وجود ایک بگولے کی لپیٹ میں آیا ہُوا تھا۔ وہ پناہ ڈھونڈ رہی تھی۔ کم سن تھی، ناتجربہ کار تھی۔ وہ اُچھل کُود کو، انگریزی ناچ گانوں کو، انگریزی بولنے اور بے حیائی کے مظاہروں کو ہی زندگی سمجھتی تھی، مگر اُس کے جذبات کا آتش فشاں پھٹا تو لال گرم لاوے نے اُس کی دنیا ہی بدل ڈالی، لیکن وہ سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتی تھی کہ اس بگولے سے نکلے کیسے اور جائے کہاں۔ اُس کی نظریں اپنی ماں کے چہرے پر ٹھہر گئیں تو اُس نے صاف طور پر دیکھا کہ اُس کی ماں کا چہرہ ہاشمی کی بیوی کا چہرہ بن گیا۔ اس چہرے کے ہونٹ ہلے۔ رِشی کو جیسے دِلّی کی اُس خاتون کی آواز سنائی دی ہو — "یہاں تمہاری عزت محفوظ رہے گی۔۔۔۔ کیا قرآن پاک پڑھ سکتی ہو؟"

پھر یہ چہرہ آہستہ آہستہ اُس کی ماں کا چہرہ بن گیا۔

رِشی نے لپک کر اپنا بازو ماں کے گلے میں ڈال دیا اور اُس کے ساتھ لگ کر سسکیاں لینے لگی۔

"ممّی!" — اُس نے سسک سسک کر کہا — "مجھے اپنی پناہ میں لے لو۔ لعنت بھیجو اُس باپ پر، جو کوئی بھی وہ تھا۔"

"رِشی!" — ماں نے اُس کا مُنہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لے کر بڑے پیار سے کہا — "کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ یہ تو مجھے ویسے ہی آتا ہے جیسے جاہل اور پسماندہ لوگ کہا کرتے ہیں کہ کسی نے تعویذ اور جادو کر دیا ہے۔ مَیں تمہاری ماں ہوں۔ اپنے دُکھ میرے سینے میں ڈال دو۔"

رِشی کے دل سے ماں کی نفرت کی برف پگھل کر بالکل ہی خشک ہو گئی۔ وہ آخر اُس کی ماں تھی۔

"معلوم نہیں تم سمجھ سکو گی یا نہیں ممّی!" — رِشی نے مغموم سے لہجے میں کہا — "تم پوچھتی ہو مجھے کیا ہُوا ہے۔ مجھے سسرال والوں اور رابی

کے اس سلوک کا کوئی غم نہیں کہ اُنہوں نے بے رخی سے مجھے یہاں بھیج دیا ہے۔ مجھے جو کچھ ہُوا ہے وہ کچھ یوں سمجھ لو کہ زندگی کا وہ راستہ نظر آ گیا ہے جو مجھے میری منزل تک پہنچا دے گا۔۔۔۔ میری مدد کرو ممّی!"

رِشی کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اُس کی ماں چال چلن کی ٹھیک تھی یا غلط، عورت بارُعب تھی اور اثر و رسوخ والی تھی اور یہ اُس کی ذہانت رِشی کی نگاہ میں غیر معمولی تھی۔ وہ جو کچھ بھی تھی، رِشی کے لئے بہرحال ایک فرشتہ تھی۔ جس ذہنی اور جذباتی کیفیت میں رِشی مبتلا تھی، اس کیفیت کا تقاضا تھا کہ وہ اپنا آپ کسی اپنے کے حوالے کر دے۔

رِشی نے رومال سے آنسو پونچھے، لمبا سانس لیا جیسے اُسے کچھ سکون محسوس ہُوا ہو۔

"ممّی!" — اُس نے ماں سے کہا — "اب مَیں تمہیں جو بات سنانے لگی ہوں، اسے سچ ماننا اور اسے ایک راز سمجھنا۔ اگر تم نے اس راز کی امانت میں خیانت کی تو سُن لو ممّی! میری ذہنی حالت پاگلوں جیسی ہو رہی ہے۔ مَیں تمہیں قتل کر دوں گی اور اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر کے بڑے سکون سے پھانسی کے تختے پر جان دے دوں گی۔ مَیں جب موت کو ذہن میں لاتی ہوں تو مجھے ویسا ہی سکون ملتا ہے جیسا بچپن میں تمہاری گود میں لیٹ کر ملا کرتا تھا، لیکن میں مرنے سے پہلے کچھ کر کے دکھانا چاہتی ہوں۔"

"کیا؟"

"ایک فرض ادا کرنا ہے" — رِشی نے کہا — "اگر یہ ادا ہو گیا تو تمہارے گناہ بھی بخشے جائیں گے۔"

"اب ذرا ہوش میں آؤ رِشی!" — ماں نے اُسے پیار سے کہا — "وہ بات سناؤ۔"

رِشی نے بات وہاں سے شروع کی جب اُس کی اور رابی کی ملاقات عزیز کے ساتھ پہلی بار کراچی میں ساحلِ سمندر پر ہوئی تھی۔ پھر یہ سنایا کہ عزیز کس طرح ان کا دوست بن گیا تھا۔ پھر یہ کہ رابی عزیز سے اکیلا ملتا رہا۔ اس

کے بعد جو کچھ بھی ہوُا وہ اُس نے ماں کو سنایا اور اس کہانی کو دِلّی اشوکا ہوٹل میں لے گئی۔ پھر جس طرح اُسے دھوکے سے ہوٹل سے ہاشمی کی حویلی تک پہنچایا گیا تھا، وہ پوری تفصیل سے سنایا۔

رِشی یہ فیصلہ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی تھی کہ یہ باتیں اپنی ماں سے چھپاتے یا بتا دے۔ اپنے خاوند اور سُسرال کی حد تک تو اس نے ٹھیک سوچا تھا کہ اس راز کو راز ہی رہنے دے اور رابی کو پتہ نہ چلنے دے کہ وہ اس کی خفیہ زندگی کو جان چکی ہے، لیکن ماں کو سب کچھ بتا دینا اُس نے بجا سمجھا۔ یہ ایک خطرہ تھا جو رِشی نے اُسے اپنی ماں سمجھ کر مُول لے لیا۔

ہاشمی کی حویلی میں قید ہو کر اُس نے جو دن گزارے اس کی تمام تر رُوداد باریک سے باریک تفصیلات اور ایک ایک لفظ کے ساتھ جو وہاں اُسے کہا گیا اور جو اس نے کہا، سُنا دی۔

جس طرح عزیز کی بہن زبیدہ نے ہاشمی کی حویلی میں جا کر جاسوسی کرنے کی کوشش کی تھی، وہ بھی سنائی اور رِشی کو جس طرح رنجیت کے گھر منتقل کیا گیا تھا، وہ سنایا۔ وہاں سے عزیز کے گھر تک اپنی واپسی کی پوری رُوداد سنائی۔ زینی کا تفصیلی ذکر کیا۔ پھر یہ سنایا کہ اُسے یعنی رِشی کو انٹیلی جنس کے ہیڈ کوارٹر میں لے جایا گیا جہاں ہاشمی، اُس کی بیوی اور عبدالقدیر کو شناخت کے لئے اُس کے سامنے کھڑا کیا گیا۔

"ممّی!" — رِشی نے اس مقام پر اپنی ماں سے کہا — "جب ان تینوں کو میرے سامنے کھڑا کیا گیا تو میں نے محسوس کیا کہ میرے لئے اس سے زیادہ سخت امتحان اور کوئی نہیں ہوگا۔ ہاشمی کی بیوی کو میں نے دیکھا تو بائی گاڈ! یوں لگا جیسے میرے سامنے تم کھڑی ہو۔ اُس کی آنکھوں میں ایسا تاثر تھا جس نے مجھے ہپناٹائز کر لیا۔ مجھے صاف طور پر محسوس ہُوا کہ ہاشمی میرا باپ اور اُس کی بیوی میری ماں ہے۔ میرے دل میں وہ روشنی چمکی جو ان دونوں نے ہی میرے دل میں ڈالی تھی۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا جیسے میں بجھی ہوئی ایک شمع تھی جسے ان دونوں نے روشن کر دیا ہے۔ میں اگر زبان سے نہ کہتی، صرف سر ہلا دیتی کہ یہی ہیں جنہوں نے مجھے حبس بے جا

میں رکھا تھا تو وہ ساری عمر انڈیا کی جیلوں میں گلتے سڑتے رہتے، لیکن میں نے ایسی ایکٹنگ کرتے ہوئے ان کی شناخت سے انکار کر دیا کہ انٹیلی جنس والوں نے میری بات مان لی۔"

"تم نے اچھا کیا رِشی!" — ماں نے کہا — "تم نے اُنہیں احسان کا صلہ دے دیا ہے۔"

"لیکن ممّی!" — رِشی نے کہا — "یوں لگتا ہے جیسے وہ میں نہیں تھی جس نے اُنہیں پہچاننے سے انکار کیا تھا۔ مجھ پر کسی ایسی قوت کا اثر تھا جسے میں نہیں سمجھ سکتی۔ عزیز کی بہن کو جب میرے سامنے شناخت کے لئے کھڑا کیا گیا تھا تو بھی میرے دماغ نے بڑی دُور کی سوچ لی تھی۔ میں اس عورت کو اچھی طرح پہچانتی تھی لیکن میں نے پھر ایکٹنگ کی اور اسے شناخت کرنے سے انکار کر دیا۔"

"ایک بات بتاؤ رِشی!" — ماں نے پوچھا — "کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ انٹیلی جنس ہیڈ کوارٹر تھا یا پولیس ہیڈ کوارٹر؟"

"وہاں مجھے پولیس کی وردی والا ایک بھی آدمی نظر نہیں آیا" — رِشی نے کہا — "البتہ دو فوجی جیپیں کھڑی دیکھی تھیں۔"

"پھر یہ انٹیلی جنس ہیڈ کوارٹر ہی تھا" — ماں نے کہا اور پوچھا — "کیا تم نے رابی یا اُس کے ماں باپ کو بتایا ہے کہ رابی انڈین انٹیلی جنس کا ایجنٹ بن گیا ہے؟"

"ان کے ساتھ تو میری بات بھی نہیں ہوتی" — رِشی نے کہا — "رابی اُن کے پاس بیٹھا رہا تھا۔ میں بیڈ روم میں بیٹھی رہی۔ رابی آیا اور مجھ سے کہنے لگا کہ اپنی ماں کے پاس چلی جاؤ۔ میں اُس کے انداز سے سمجھ گئی کہ وہ مجھے ہمیشہ کے لئے گھر سے نکال رہا ہے۔ اُسے معلوم نہیں کہ مجھے معلوم ہے کہ وہ انڈین ایجنٹ بن گیا ہے۔ اُس نے مجھ سے اس لئے نظریں نہیں پھیر لیں کہ میں نے اُس کا راز پا لیا ہے بلکہ وہ زینی کے زیر اثر مجھ سے کنارہ کشی اختیار کر گیا ہے.... ممّی! مجھے یہ اندازہ ہی نہیں تھا کہ رابی

کی شخصیت اس قدر کمزور اور کردار اتنا گھٹیا ہے۔"

"اب تم چاہتی کیا ہو؟" ــــ ماں نے پوچھا۔

"میں انہیں پکڑوانا چاہتی ہوں" ــــ رشی نے جواب دیا۔

"یہ بات کہی تم نے" ــــ ماں نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر دباتے ہوئے کہا۔

رشی کی ماں کا ردِعمل اُس کے چہرے پر عیاں ہوگیا۔ انتقامی جذبات کی شدت سے اُس کی آنکھوں میں سُرخی آگئی اور چہرہ تمتمانے لگا۔ اُس کے اندر صرف ایک ہی جذبہ پیدا ہوسکتا تھا اور وہ انتقامی جذبہ تھا۔ اُسے رابی کی ماں نے بے عزتی کر کے گھر سے نکال دیا تھا اور اس قسم کے توہین آمیز الفاظ کہے تھے کہ تمہارا اس گھر میں آنا میرے خاندان کی توہین ہے۔ اُس عورت نے یہ بھی کہا تھا کہ ہمیں یہ بتاتے ہوئے شرم آتی ہے کہ تم ہماری رشتہ دار ہو۔ اب رابی اور اُس کے والدین نے اس کی بیٹی کو گھر بھیج دیا تھا۔

"میں تمہارے ساتھ ہوں رشی!" ــــ ماں نے کہا ــــ "میں انہیں اپنے ہاتھوں ہتھکڑیاں لگواؤں گی، لیکن احتیاط کرنا رشی! کسی کے ساتھ اشارتاً بھی ذکر نہ ہو کہ تمہیں رابی کے اس کردار کا علم ہے۔"

"ممی!" ــــ رشی نے کہا ــــ "میری ایک بات سن لو۔ میں بھی رابی اور اس کے باپ کو پکڑوانا چاہتی ہوں، لیکن میرے اندر کوئی اور جذبہ بیدار ہو گیا ہے اور تم انہیں انتقاماً پکڑوانا چاہتی ہو۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں تم پنجابی فلموں کی طرح بڑھکیں مارنی شروع کر دو گی۔"

"جذبہ کوئی بھی ہو، مقصد ایک ہے" ــــ ماں نے کہا ــــ "میری طرف سے بے فکر رہو۔ میری ہر چال انڈر گراؤنڈ ہوتی ہے۔"

❄

رشی نے اپنے وجود میں سکون کی لہر دوڑتی ہوئی محسوس کی۔ اُس کے سینے کے اندر جما ہوا غبار نکل گیا تھا۔ وہ اپنی ماں کو جانتی تھی کہ وہ کچی عورت نہیں۔ مردوں میں بیٹھ کر ایسی پُراثر اور مدلل گفتگو کرتی تھی کہ اچھے

اچھے عقل مند مرد اُس کے قائل ہو جاتے تھے۔

اُسی رات کا ذکر ہے کہ آئی ایس آئی کے ایک میجر کے گھر کے فون کی گھنٹی بجی۔ وقت نصف شب کے کچھ بعد کا تھا۔ میجر نے ریسیور اُٹھایا تو اُسے آواز سنائی دی ــــ "اشتیاق"

"کب آئے؟" ــــ میجر نے پوچھا۔

"آج ہی" ــــ اُسے جواب ملا۔

"کوئی خبر؟"

"بہت بڑی" ــــ اشتیاق نے جواب دیا۔

"کوئی ایمرجنسی؟"

"نہیں" ــــ اشتیاق نے کہا ــــ "صبح بتاؤں گا۔"

"آٹھ بجے پہنچ جانا" ــــ میجر نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

صبح آٹھ بجے اشتیاق آئی ایس آئی کے دفتر میں اس میجر کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اشتیاق نے دو ایڈریس میجر کے آگے رکھے۔

"کون ہیں یہ؟"

"موٹے شکار معلوم ہوتے ہیں" ــــ اشتیاق نے جواب دیا ــــ "یہ آدمی، بی اے ملک ڈیفنس کے محکمے میں ہے۔ غور سے دیکھیں کہ یہ کتنے نازک اور حساس محکمے میں ہے۔ رب نواز جو لاہور کی ڈسکو سوسائٹی میں رابی کہلاتا ہے، اس کا بیٹا ہے اور یہ ملک کا ایک ہی بیٹا ہے" ــــ اشتیاق نے دوسرے ایڈریس پہ انگلی رکھ کر کہا ــــ "یہ آدمی مر چکا ہے۔ اس کی بیوی اس ایڈریس پر رہتی ہے۔ رشی اس کی بیٹی ہے۔ تین چار مہینے پہلے اس لڑکی کی شادی رابی کے ساتھ ہوئی تھی۔"

اشتیاق نے میجر کو تفصیل سے بتایا کہ یہ میاں بیوی دلی کے ایک عزیز احمد کے ساتھ انڈیا پہنچے تھے۔ عزیز احمد انڈین انٹیلی جنس کا ایجنٹ ہے اور پاکستان میں لاہور کا ایریا اس کے پاس ہے۔ اشتیاق نے میجر کو تفصیلاً بتایا کہ دلی میں چند ایک جذبے والے مسلمانوں نے ایک خفیہ

گروہ بنا رکھا ہے جو نہ صرف یہ کہ پاکستان کا حامی ہے بلکہ پاکستان کے تحفظ اور توسیع تک کی باتیں کرتا ہے۔ انہوں نے ایک زمین دوز محاذ قائم کیا ہے جس کے اغراض و مقاصد میں سرفہرست یہ کام ہے کہ انڈین انٹیلی جنس کے پاکستانی ایجنٹوں کی بیخ کنی کی جاتے اور پاکستان کی آئی ایس آئی کے جو ایجنٹ انڈیا میں موجود ہیں انہیں تحفظ دیا جاتے اور ان کی مدد بھی کی جاتے۔

"یہ تو خطرے والی بات ہے"— میجر نے کہا —"اس محاذ میں انڈیا کے ایجنٹ بھی پاکستانی ایجنٹوں کے بہروپ میں شامل ہو سکتے ہیں۔ مسلمان بڑی جذباتی قوم ہے۔ ان کی سوچیں بھی جذبات کے زیر اثر ہوتی ہیں"

"نہیں میجر صاحب!"— اشتیاق نے جواب دیا —"وہ بڑے ٹھوس لوگ ہیں۔ اُن میں جواں سال آدمی بھی ہیں، لیکن انہیں فیلڈ میں استعمال کیا جاتا ہے۔ سوچنے والے تین چار آدمی پچاس پچاس برس سے اُوپر کے ہیں۔ آپ کو یہ سُن کر یقیناً اطمینان ہو گا کہ ان کا ماسٹر مائنڈ عبدالقدیر نام کا ایک آدمی ہے جو انڈین انٹیلی جنس میں رہ چکا ہے اور اب ریٹائرڈ لائف گزار رہا ہے۔ محمود صاحب کے ساتھ اس کا مسلسل رابطہ ہے۔ آپ مطمئن رہیں۔ میں ذاتی طور پر عبدالقدیر صاحب کو جانتا ہوں"

"بہرحال"— میجر نے کہا —"یہ بتاؤ کہ انہوں نے کیا کیا ہے"

اشتیاق نے آئی ایس آئی کے اس میجر کو رشی کے اغوا کی پوری کہانی سنائی۔ یہ وہی کہانی تھی جو رشی نے ایک روز پہلے اپنی ماں کو سنائی تھی۔ میجر نے جب اس کہانی کا وہ حصہ سُنا جس میں عزیز اور رابی نے رشی کو واپس لے جانے والے آدمیوں کی کار کا تعاقب کیا اور دونوں نے اُن سے مار کھائی تھی تو اُس نے کرسی سے اُچھل کر داد و تحسین کے کلمے کہے۔ اُسے یقین آگیا کہ دلی میں واقعی کام ہو رہا ہے۔

"یہ لڑکی جس کا اصل نام راشدہ ہے اور رشی کے نام سے مشہور ہے، ہمارے لئے مشکوک تھی"— اشتیاق نے کہا —"لیکن اسے

اچھی طرح دیکھ لیا گیا تھا۔ عبدالقدیر صاحب نے پورے وثوق سے تصدیق کی ہے کہ اس لڑکی کی برین واشنگ ایسے طریقے سے کی گئی ہے جس کا اثر کبھی زائل نہیں ہو گا"

"یہ نہ کہو"— میجر نے کہا —"ان پاکستانی امریکنوں کا کوئی بھروسہ نہیں۔ یہ تو تھالی کے بینگن ہیں"

"یہ ٹیسٹ تو آپ کریں گے"— اشتیاق نے کہا —"یہ میری فیلڈ سے باہر ہے۔ میں نے جو رپورٹ پیش کی ہے، اسے مصدقہ سمجھیں"

محمود آئی ایس آئی کا وہ پاکستانی ایجنٹ تھا جو دلی میں ایک جنرل سٹور میں سیلزمین تھا۔ اُسے عبدالقدیر ملا تھا اور عزیز احمد، رابی اور رشی کے متعلق پوری رپورٹ دی تھی۔ اشتیاق بھی آئی ایس آئی کا ایجنٹ تھا جو آبائی طور پر دلی کا رہنے والا تھا۔ ان کے کچھ رشتہ دار پاکستان میں تھے۔ جب بھی اُس کے پاس کوئی انفارمیشن آجاتی تھی تو وہ رشتہ داروں سے ملنے کے بہانے ویزا حاصل کر لیتا اور ادھر آجاتا تھا۔ پاکستان کی طرح انڈیا میں بھی جعلی ویزوں کا کاروبار چلتا تھا۔ کچھ دے دلا کر قانونی ویزے بھی مل جاتے تھے۔ اشتیاق کے لئے یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ اُسے محمود نے عبدالقدیر کی دی ہوئی پوری رپورٹ ازبر کرا کے راولپنڈی بھیجا تھا۔ رابی کے گھر کا ایڈریس، اُس کے باپ کا نام اور رشی کی ماں کے گھر کا ایڈریس اور نام عبدالقدیر اور ہاشمی کو رشی نے لکھواتے تھے۔

❄

اس سے کچھ دیر بعد اشتیاق اور یہ میجر آئی ایس آئی کے چیف کے سامنے بیٹھے تھے۔ وہاں ایک بریگیڈیئر اور ایک کرنل بھی موجود تھا۔ اشتیاق نے وہی کہانی جو میجر کو سنائی تھی، چیف کے سامنے دہرائی۔ چیف نے جو ایک میجر جنرل تھا، بریگیڈیئر اور کرنل نے بھی اشتیاق سے اسی طرح جرح کی جیسے وہ خود جاسوسی کا ملزم ہو۔ اشتیاق انہیں جواب دے کر مطمئن کرتا رہا۔

چیف نے اشتیاق کا شکریہ ادا کیا اور اُس کی کاوش کو

بہت سراہا۔

"میجر عابد!" — چیف نے میجر سے کہا — "مسٹر اشتیاق کی خاطر تواضع کرنا تمہارا کام ہے۔ یہ جن رشتہ داروں سے ملنے آتے ہیں وہ ہم ہی ہیں۔ انہیں کنٹین کی چائے پر ہی نہ ٹرخا دینا۔"

"شکریہ سر!" — اشتیاق نے کہا — "آپ سے بڑھ کر ہمارا رشتہ دار اور کون ہے۔"

میجر عابد میجر جنرل کے اشارے پر اشتیاق کو ساتھ لے کر وہاں سے نکل آیا۔

"سن لیا آپ نے؟" — میجر جنرل نے اپنے بریگیڈیئر اور کرنل سے کہا — "یہ رپورٹ ہمارے لئے کوئی نئی خبر نہیں۔ امریکی اور یورپی خرافات نے ہمارے نوجوان طبقے کو پوری طرح ہپناٹائز کر لیا ہے۔"

"سر!" — بریگیڈیئر نے کہا — "ہمارا نوجوان طبقہ انڈیا کے لئے RAW MATERIAL ہے۔"

"یہ آپ نے ٹھیک کہا" — کرنل بولا — "آپ نے RAW کا استعمال اچھا کیا ہے۔ ہمارے ان بگڑے اور بھٹکے ہوئے نوجوانوں کو انڈیا کی 'را' ہی بہکا بہکا کر دِلی لے جا رہی ہے اور ان کی برین واشنگ کر کے پاکستان میں جاسوسی اور تخریب کاری کے لئے بھیج رہی ہے۔"

"میں تو یہ سوچتا رہتا ہوں کہ یہ سلسلہ کہاں رُکے گا" — چیف نے کہا — "وی سی آر انگریزی فلمیں شریفوں کے گھروں میں بھی پہنچا رہا ہے۔ بد تہذیبی کو ہم امریکہ، برطانیہ اور یورپ سے بلا روک ٹوک امپورٹ کر رہے ہیں۔"

"ماریجوانا اور ہیروئن نے ہماری نوجوان نسل کو تباہ کر دیا ہے" — کرنل نے کہا۔

"نشہ بازی تو روز بروز بڑھتی جا رہی ہے" — بریگیڈیئر نے کہا — "دو چار روز پہلے آپ نے خبر پڑھی ہو گی کہ ایک نوجوان ہیروئین کے نشے

میں جھومتا گھر آیا تو اُسے اپنی نوجوان بہن سوتی ہوئی نظر آئی۔ اُس نے اپنی بہن پر مجرمانہ حملہ کر دیا۔"

"ایسے ہی ایک نشئی نوجوان کو اپنی بہن نے قتل کر دیا تھا" — کرنل نے کہا — "یہ ڈیڑھ دو مہینے پہلے کی خبر ہے۔"

"ہاں ہاں!" — میجر جنرل نے کہا — "اس بہن پر بھی سگے بھائی نے مجرمانہ حملہ کیا تھا .... راہی جس سوسائٹی کا آدمی ہے، اس میں تو مہذب طریقے سے بیویوں اور بہنوں کا تبادلہ ہوتا ہے .... ان لوگوں کو کیا معلوم قومی وقار کیا ہوتا ہے۔"

"سر!" — بریگیڈیئر نے کہا — "ہم یہی کر سکتے ہیں کہ انڈیا کا تیار کیا ہوا جو پاکستانی تخریب کاری اور جاسوسی میں پکڑا جاتے اُسے انتہائی سزا دلائیں لیکن یہ کوئی علاج نہیں۔ ضرورت یہ ہے کہ اُن عناصر کا خاتمہ کیا جاتے جو اخلاق سوزی کے ذمہ دار ہیں۔ یہ تو ایسے ہی ہے کہ ٹی بی کے جو مریض ہسپتال میں آجائیں انہیں داخل کر لیا جائے اور انہیں ٹھیک کر کے پھر اُسی ماحول میں بھیج دیا جاتے جو ٹی بی کے جراثیم سے بھرا پڑا ہے۔ ماحول اخلاق سوزی سے پاک نہ ہو گا تو ہمارے دشمن کو یہاں سے خام مال ملتا رہے گا۔"

"یہ کام ہمارے حکمران ہی کر سکتے ہیں" — کرنل نے کہا۔

"اپنے حکمرانوں کی بات کرتے ہو کرنل مرزا؟" — چیف نے کہا — "بریگیڈیئر ارشد کو معلوم ہے۔ تم شاید نہیں جانتے۔ میں انڈیا کی ایک انتہائی اہم فائل لے کر اپنے ہیڈ آف دی سٹیٹ کے پاس گیا۔ مجھے توقع تھی کہ یہ رپورٹ پڑھ کر اُس کا رد عمل شدید ہو گا اور وہ اِس دُنیا اور اگلی دُنیا کو بھول کر مجھے فوری کارروائی کا حکم دے گا اور کہے گا کہ میں اُسے اپنی کارروائی کی لمحہ بہ لمحہ رپورٹ دیتا رہوں مگر اُس نے میری زبانی رپورٹ سُن کر فائل میرے ہاتھ سے لے لی اور الگ رکھ دی۔"

"رپورٹ کیا تھی؟" — کرنل مرزا نے پوچھا۔

"وہی میزائیلوں والا کیس تھا" ـــــ بریگیڈیئر ارشد نے کہا ـــــ "جس میں ہم نے دو انڈین ایجنٹ پکڑے تھے۔"

"بڑا ہی نازک اور خطرناک کیس تھا" ـــــ کرنل مرزا نے کہا۔

"اس نازک اور خطرناک کیس کے ساتھ ہمارے ہیڈ آف دی سٹیٹ نے یہ سلوک کیا کہ فائل الگ رکھ دی" ـــــ چیف نے کہا ـــــ "اور ملتان کے دو بہت بڑے جاگیرداروں کے نام لے کر کہنے لگا کہ اِن کے پَر کاٹنے ہیں۔ یہ دونوں اُس کے مخالف مورچوں میں چلے گئے تھے۔ ان کے ساتھ کم و بیش چار ہزار ووٹر ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ ان میں اثر و رسوخ والے اور طاقتور آدمی بھی تھے۔ ہمارے بادشاہ نے کہا کہ ان کی جاگیر میں کہیں انڈین میزائل پلانٹ کرو اور چھاپہ مار کر اُن کے خاص خاص چند ایک آدمیوں کو گرفتار کر لو۔ آپ یہ کام آسانی سے کر سکتے ہیں .... کوئی اور طریقہ سوچ لیں۔ آپ میرا مقصد سمجھ گئے ہیں ..... CUT THEM TO SIZE ..... اُن کے لئے ایسے حالات پیدا کر دو کہ وہ میرے قدموں میں آ کر بیٹھ جائیں۔"

"مَیں یہ بات سن کر حیران نہیں ہُوا" ـــــ کرنل مرزا نے کہا ـــــ "یہ ہماری سیاست کا دستور ہے .... ملک کا ڈیفنس بعد میں، پہلے اپنے اقتدار کا تحفظ۔"

"مَیں نے وعدہ کیا کہ آپ کے ان دونوں مخالفین کو آپ کے قدموں میں بٹھا دوں گا" ـــــ چیف نے کہا ـــــ "آپ یہ فائل دیکھ لیں۔ ایک ایک منٹ قیمتی ہے .... اُس نے کہا، فائل یہیں رہنے دیں۔ تسلی سے دیکھوں گا۔ آپ کل تک میرا ملتان آپریشن، پلان کریں .... میں اُٹھ کر چل پڑا تو اُس نے کہا، جنرل شبیر! آپ نے اس سال عمرہ کیا ہے؟ .... عجیب آدمی ہو۔ گورنمنٹ تمہاری اپنی ہے۔ میں تمہیں عمرے پر بھیجوں گا۔ ہر مسلمان کے لئے عمرہ ضروری ہے .... ہاں یاد آیا .... اسلام آباد والے پلاٹوں سے تم نے اپنا حصہ وصول کیا ہے یا نہیں؟ .... میں ایک پلاٹ دلوا دوں گا۔ چار کنال کافی ہے؟ مَیں یہ کہہ کر آ گیا کہ کافی ہے۔ اور کیا کہتا؟"

"اِس کی جگہ آنے والے بھی ایسے ہی ہوں گے" ـــــ بریگیڈیئر ارشد نے کہا ـــــ "کجا ماند مسلمانی!"

"اللہ ہمارے ملک پر رحم کرے" ـــــ چیف نے کہا ـــــ "اُوپر والے کرتے رہیں جو کرتے ہیں۔ ہم ان سب کے اُوپر والے کے حکم کے بندے ہیں .... مجھے ہے حکم اذاں لا الٰہ الا اللہ .... اب انڈیا کی اِس تازہ رپورٹ پر کچھ بات ہو جائے۔ اِس بی اے سے ملک کے ساتھ اپنے آدمی لگا دو۔ رابی کا بھی ایسا ہی انتظام کرو اور اِس لڑکی رِشی تک رسائی حاصل کرو۔ اپنے آدمیوں کو بریفنگ دو کہ اس لڑکی کے متعلق یہ معلوم کرنا ہے کہ اُس کی وفاداری کس کے ساتھ ہے اور کیا وہ قابلِ اعتماد ہے؟"

چیف، بریگیڈیئر اور کرنل نے آپس میں صلاح مشورہ کر کے اپنی مشینری کو متحرک کر دیا۔ اُن کے لئے یہ کوئی انوکھا کام نہیں تھا۔ یہی اُن کا کام اور یہی ان کا معمول تھا .... دشمن کے جاسوسوں اور تخریب کاروں کو پکڑنا۔

❋

نئی دِلّی میں انڈین انٹیلی جنس کے ہیڈکوارٹر میں اس مسئلے پر بحث مباحثہ ہو رہا تھا کہ عزیز کی جگہ اب لاہور کسے بھیجا جائے۔ لاہور عزیز کا علاقہ تھا لیکن رِشی کے رویّے کو دیکھ کر عزیز کا لاہور آنا خطرے سے خالی نہیں رہا تھا۔ عزیز کہتا تھا کہ رِشی کو معلوم نہیں ہو سکا کہ اُس کا خاوند انڈین انٹیلی جنس کا ایجنٹ بن چکا ہے اس لئے اُس کا لاہور رہنا خطرناک نہیں۔

"ایک پہلو اور بھی ہے" ـــــ اُس نے کرنل اوجھا سے کہا ـــــ "یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ پاکستان میں رِشی کیا کر رہی ہے۔ کیا وہ خاموش ہو گئی ہے یا اپنے خاوند کے خلاف کچھ کر رہی ہے۔ آپ کسی اور کو وہاں بھیجیں گے تو اُسے سب سے پہلے تو رابی کے ساتھ رابطہ قائم کرنا پڑے گا۔ ہو سکتا ہے رابی نئے چہرے کو دیکھ کر پیچھے ہٹ جائے اور ہمارے

ہاتھ سے نکل جاتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ رابی کی دُکھتی رگیں میرے ہاتھ میں ہیں۔ مَیں اُس کی نفسیات کو سمجھ گیا ہوں۔ یہ سونے کی چڑیا ہے سر!"

"اُس کی بیوی رِشی کے خطرے کو نظر انداز نہ کرو عزیز!" — کرنل اوجھا نے کہا۔

"حقیقت یہ ہے سر!" — عزیز نے کہا — "مَیں یہی دیکھنے جانا چاہتا ہوں کہ یہ لڑکی ہمارے لئے خطرہ ہے یا نہیں۔ اگر ہمارے لئے یا رابی کے لئے خطرہ بنتی دیکھی تو میں اسے پاکستان میں غائب کرادوں گا۔ پورا سندھ ایریا ہمارا اپنا ہے۔"

آخر یہ فیصلہ ہُوا کہ عزیز کی جگہ ورما عبدالرحمان بن کر لاہور جاتے گا۔ دِلّی میں ورما عزیز اور رابی کے ساتھ عبدالرحمٰن کے نام سے رہتا تھا۔ ورما لاہور سے واقف تھا۔ انڈین انٹیلی جنس اور "را" کے آدمی پاکستان میں موجود تھے جو ورما کو رہنمائی، مدد اور ٹھکانہ مہیا کر سکتے تھے۔ اُسے یہ بریفنگ دی گئی کہ وہ رابی سے انفارمیشن لیتا اور نئی دِلّی بھیجتا رہے اور رِشی سے محتاط رہے۔

ورما کا دوسرا کام یہ تھا کہ اُس نے زینی کو بھی اپنے ساتھ لے جانا اور رابی کے ساتھ اُس کی شادی کرانی تھی۔ ورما کو معلوم تھا کہ زینی نے رابی کو اپنے طلسماتی حُسن کے جال میں پھانس لیا تھا۔

"ورما بھائی!" — اس فیصلے کے بعد عزیز نے ورما کو الگ بٹھا کر کہا — "میرا لاہور جانے سے مقصد کچھ اور تھا۔ میرا یہ مقصد تم پورا کرد گے۔ مَیں اس کم بخت کی بچّی رِشی سے اپنی بے عزّتی کا انتقام لینا چاہتا ہوں۔"

"میری کم بے عزّتی ہوئی تھی؟" — ورما نے کہا — "میری جو پٹائی ہاشمی کے گھر میں ہوئی تھی وہ تم نے دیکھی نہیں۔ تم بتاؤ کرنا کیا ہے۔"

"اُسے اغوا کرا کے اتنا خراب کرنا ہے کہ ساری عمر یاد رکھے" — عزیز نے کہا — "تم جانتے ہو کہ یہ کام کس طرح کئے جاتے ہیں۔ پاکستان

میں تمام انتظام موجود ہے۔"

"انتقاماً نہ سہی" — ورما نے کہا — "ہوسکتا ہے اُسے ویسے بھی غائب کرنے کی ضرورت پڑ جاتے۔ تمہاری طرح مجھے یہ بھی شک ہے کہ ہاشمی وغیرہ نے اُس کی اچھی خاصی برین واشنگ کی ہے اور انہوں نے اُسے بریف کر کے بھیجا ہوگا۔"

"تم شک کی بات کرتے ہو" — عزیز نے کہا — "مجھے یقین ہے کہ وہ ہاشمی کے گھر میں رہی ہے اور وہاں سے اسے غائب کر دیا گیا تھا۔ میں ہاشمی اور عبدالقدیر کو تو نہیں چھوڑوں گا۔"

"ابھی چُپ رہو" — ورما نے کہا — "ہمارے افسروں کو شک ہے کہ ہاشمی کے ساتھ تمہاری کوئی ذاتی دشمنی ہے جس کی بنا پر تم نے یہ ڈرامہ بنایا ہے .... مجھے بھی پاکستان میں رِشی سے محتاط رہنا پڑے گا۔ ہو سکتا ہے رِشی نے مجھے بھی کہیں دیکھا ہو۔"

"ہاں" — عزیز نے کہا — "پہلے روز ایئرپورٹ پر اُنہیں لینے گئے تھے تو تم بھی ساتھ تھے۔ اس کے بعد بھی ایک بار ہوٹل میں اُس نے تمہیں دیکھا تھا۔ وہاں جا کر مونچھیں بڑھا لینا۔"

سات آٹھ دِنوں کے بعد رِشی اپنی ماں کے پاس بیٹھی اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہی تھی۔ اتنے دن رابی نے اُسے فون تک بھی نہیں کیا تھا۔ ماں نے اُسے تین چار بار کہا تھا کہ وہ خود ہی رابی کو فون کر لے۔ رِشی کے دل میں رابی کی اتنی زیادہ نفرت پیدا ہو گئی تھی کہ اُس کا نام سُننے سے بھی بیزار تھی۔

"رِشی بیٹی!" — ماں نے کہا — "یہ تو پتہ چلے کہ اُن کی نیت کیا ہے۔"

"ممی!" — رِشی نے اُکتائے ہوئے سے لہجے میں کہا — "کیا تم ابھی تک اُن کی نیت نہیں سمجھیں؛ ان کے ذہن میں طلاق ہے اور رابی

کے ذہن پر انڈیا والی لڑکی سوار ہے جس کا نام زینی ہے۔"

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ نوکر دوڑتا باہر نکلا اور آکر بتایا کہ ایک خاتون آئی ہے۔ رشی کی ماں نے اُسے کہا کہ اندر بھیج دو۔

ڈرائنگ روم میں ایک جوان سی لڑکی داخل ہوئی جو کپڑوں، کٹے ہوئے بالوں، ڈیل ڈول اور انداز سے اونچی سوسائٹی کی معلوم ہوتی تھی۔ رشی اور اس کی ماں نے مُسکرا کر اُس کا استقبال کیا اور اُسے بٹھایا۔

"فرمائیے" — رشی کی ماں نے کہا — "آپ کو شاید ہم پہلی بار دیکھ رہی ہیں۔"

"لیکن مَیں اپنا تعارف کراؤں گی تو ہو سکتا ہے ہماری یہ پہلی ملاقات آخری ثابت ہو" — اس لڑکی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ایسی کون سی بات ہے؟" — رشی نے اُس کی طرح ہنس کر پوچھا۔

"مَیں انشورنس ایجنٹ ہوں" — اُس نے جواب دیا — "میرا نام انجم ہے۔ آپ تعلیم یافتہ اور مہذب خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ آپ کو انشورنس کے فائدے بتانے کی ضرورت نہیں۔"

"او بیٹی!" — رشی کی ماں نے کہا — "ہمیں اپنی زندگی کی انشورنس کرانے کی بھی ضرورت نہیں۔"

"وہ کیوں؟" — انجم نے پوچھا — "کیا آپ کے میاں نے اپنی انشورنس نہیں کروائی؟ اگر نہیں کروائی تو انہوں نے آپ کے ساتھ بہت بڑی زیادتی کی ہے۔"

"وہ تو کبھی کے فوت ہو چکے ہیں" — رشی کی ماں نے آہ بھر کر کہا — "اُن کی انشورنس بھی تھی اور اللہ کے فضل سے اور بھی بہت کچھ چھوڑ گئے ہیں۔ میری اولاد بھی ایک بیٹی ہے۔"

"شادی شدہ؟"

"ہاں" — رشی نے جواب دیا۔

"کیا آپ کے شوہر نے انشورنس کروالی ہے؟" — انجم نے رشی سے پوچھا۔

رشی ماں کی طرف دیکھ کر ہنس پڑی۔

"لعنت بھیجو" — رشی نے کہا۔

"مَیں آپ کے گھریلو اور ذاتی معاملات میں دخل اندازی کو اچھا نہیں سمجھتی" — انجم نے کہا — "لیکن میں نے یہ ضرور محسوس کیا ہے کہ آپ کی ازدواجی زندگی مجھے کچھ مشکوک سی نظر آتی ہے .... اگر آپ نے بُرا جانا ہے تو مجھے معاف کر دینا۔"

"ایسی کوئی بات نہیں" — رشی کی ماں نے کہا — "یہ ہمارا گھریلو مسئلہ ہے۔"

"مَیں آپ کا تھوڑا سا وقت لُوں گی آنٹی!" — انجم نے کہا — "مَیں آپ کے اس گھریلو مسئلے کی طرف اس لئے آگئی تھی کہ مَیں خود ایسے ہی مسائل کی کچلی ہوئی ہوں اور اسی عمر میں دربدر ماری ماری پھر رہی ہوں۔ ڈیڈی کی موت نے مجھے یتیم کیا اور خاوند کے جیتے جی بیوہ ہو گئی ہوں.... مَیں آپ کا وقت ضائع تو نہیں کر رہی؟ میں انشورنس کی کوئی بات نہیں کروں گی۔ اب مجھے انشورنس ایجنٹ سمجھنا چھوڑ دیں۔ اس کی بجائے ایک معذور اور مجبور لڑکی سمجھیں۔"

اس لڑکی کے بولنے کا انداز اور اس کے چہرے کا تاثر ایسا تھا کہ رشی اور اُس کی ماں متاثر ہو گئیں۔ دونوں نے محسوس کیا کہ اس لڑکی کو یہ کہہ کر چلتا کرنا کہ ہمیں انشورنس کی ضرورت نہیں، زیادتی ہو گی۔

"نہ انجم بیٹی!" — رشی کی ماں نے کہا — "ہمارا وقت تو باتیں کرتے ہی گزرتا ہے" — اُس نے نوکر کو آواز دی۔ نوکر آیا تو اُسے چائے کے لئے کہا۔ پھر انجم سے کہنے لگی — "تمہارے جیسا ہی حال ہم ماں بیٹی کا ہے۔ مَیں بیوہ ہوں اور بیٹی میری یتیم ہے اور لگتا ہے کہ یہ بھی خاوند کے جیتے جی بیوہ ہو گئی ہے۔"

"طلاق ہوگئی ہے؟"

"ابھی ہوتی تو نہیں"— رشی نے کہا۔

"تم اپنی بات کرو انجم!"— رشی کی ماں نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ انہوں نے اپنے گھر کی باتیں ایک اجنبی لڑکی کے ساتھ شروع کر دی ہیں، کہا— "تم اچھی خاصی خوبصورت اور ذہین لڑکی معلوم ہوتی ہے .... تمہارے بھائی ہیں؟"

"ہیں تو سہی آنٹی!"— انجم نے دکھیاری سی آہ بھر کے کہا— "دو ہیں، لیکن عملاً ایک بھی نہیں۔ شادی کر کے دونوں اپنے اپنے گھروں میں جاکر آباد ہو گئے ہیں۔ گھر میں میری ماں ہے اور میں ہوں۔ ماں میرے ابو کے دکھ میں بے حال ہو چکی ہے۔ باقی کسر میرے بھائیوں نے پوری کر دی ہے۔ یہ صدمے میری ماں کو لے بیٹھے ہیں"— انجم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آنسو پونچھ کر بولی— "وہ دن رات ڈیپریشن میں پڑی رہتی ہے۔ میں اُسے ذہنی سکون کی گولیاں دیتی رہتی ہوں۔ ان گولیوں کا اثر اُترتا ہے تو ماں کی حالت پاگلوں جیسی ہو جاتی ہے۔ میرا دُکھ اُس کے لئے الگ ہے۔ اتنے شوق سے اُس نے میری شادی کی تھی، مگر میرا خاوند آوارہ اور اوباش نکلا۔ بڑی مشکل سے اُس سے طلاق حاصل کی ہے۔"

"چلو اچھا ہُوا"— رشی کی ماں نے کہا— "ایسے خاوندوں سے تو بیوگی اچھی ہوتی ہے .... طلاق کورٹ کے ذریعے لی ہوگی۔"

"یہ بھی ایک کہانی ہے آنٹی!"— انجم نے کہا— "دو معزز آدمیوں سے کہا کہ وہ کسی طرح طلاق لے دیں۔ سب دیکھ رہے تھے کہ میرا خاوند ہمارے گھر میں آکر غنڈہ گردی کرتا ہے۔ یہ دونوں میرے ابو کے دوست تھے۔ ان میں سے ایک کی دوستی ایک پولیس انسپکٹر کے ساتھ تھی۔ اُس نے اس انسپکٹر کے ساتھ ذکر کیا۔ انسپکٹر میرے گھر آیا۔ میں نے اُسے سب کچھ بتایا۔ پھر اُس نے مجھے پولیس ہیڈ کوارٹر میں اپنے دفتر میں بلایا۔ اس

طرح ہماری کتنی ملاقاتیں ہوئیں۔ ان ملاقاتوں کے دوران انسپکٹر میرے ساتھ بے تکلف ہوتا گیا۔ میں نے اُس سے اپنا کام نکلوانا تھا۔ ایک شام اُس نے ایک ہوٹل میں مجھے ملنے کو کہا۔ وہاں گئی تو وہ مجھے ہوٹل کے ایک کمرے میں لے گیا۔ اُس کی باتوں سے پتہ چلا کہ وہ مجھے رشوت کے طور پہ چاہتا ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ پہلے میرا کام کرا تے پھر مجھے ہمیشہ کے لئے اپنا سمجھے۔ وہ میری باتوں میں آگیا۔ پھر میں بات مختصر کرتی ہوں کہ اُس نے میرے خاوند کے پیچھے دو تین غنڈے لگا دیئے اور ایک روز مجھے تحریری طلاق نامہ مل گیا، لیکن اس انسپکٹر سے جان چھڑانا مشکل ہو گیا۔ وہ مجھ سے قیمت مانگتا تھا ... خیر آنٹی! جانے دو ان باتوں کو۔ آپ ماں بیٹی ہنستی مسکراتی آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ میں نے آکر آپ کے رنگ میں بھنگ ڈال دی ہے۔ میں بہت ذلیل و خوار ہو کر اس لائن میں آئی ہوں اور ذلیل و خوار ہو رہی ہوں۔"

انجم کی آواز دُکھ درد میں دبتی چلی گئی تھی کہ وہ چُپ ہو گئی اور اُس نے دوپٹہ اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔ اُس کے ہلتے ہوئے کندھے بتاتے تھے کہ وہ سسکیاں لے رہی ہے۔ رشی اور اُس کی ماں اُسے بہلانے لگیں۔

"میرے لئے کہیں جاب کرنا ضروری ہو گیا تھا"— انجم نے آنکھیں پونچھ کر اور اپنے آپ کو سنبھال کر کہا— "لیکن جہاں بھی جاب کے لئے گئی وہاں مجھ سے وہی فرمائش کی گئی جو پولیس انسپکٹر نے ہوٹل کے کمرے میں کی تھی۔ لڑکی جوان ہو، یتیم ہو، بیوہ ہو اور اس کے سر پہ کسی کا دستِ شفقت نہ ہو تو ہمارے معاشرے میں اُسے بڑا آسان شکار سمجھا جاتا ہے۔ ایسی مجبور لڑکیاں خوبصورت نہ ہوں تو بھی سب کو بڑی حسین لگتی ہیں۔ مجھے بھی سب نے آسان شکار سمجھا اور میں ان بھیڑیوں سے کمزور سے خرگوش کی طرح بھاگتی پھرتی رہی ....

"میرے لئے جاب بہت ہی ضروری ہو گیا تھا۔ ہماری کوٹھی آپ کی اس کوٹھی جیسی عظیم الشان تو نہیں تھی، لیکن اچھی کوٹھیوں میں شمار ہوتی

تھی۔ میرے بھائیوں نے کوٹھی بیچ کر رقم آپس میں بانٹ لی اور ہم ماں بیٹی کرائے کے ایک مکان میں چلی گئیں۔ ایک دردمند خاتون نے مجھے انشورنس کی لائن پر ڈال دیا۔ میں لوگوں کے گھروں میں جانے لگی۔ مرد حضرات نے اپنی اُسی ذہنیت کا اظہار کیا جو پہلے بیسیوں بار ہو چکا تھا۔ میں نے اِس کا علاج یہ کیا کہ صرف عورتوں کے پاس جاتی ہوں۔ میں تو لُٹی پُٹی لڑکی ہوں آنٹی! معلوم نہیں خدا نے کس گناہ کی سزا دی ہے۔ وہ وقت یاد آتا ہے جب میں بھی آپ کی بیٹی کی طرح اپنی ماں کے پاس بیٹھا کرتی اور ہنستے مسکراتے ہم آپس میں باتیں کیا کرتی تھیں۔"

❄

اس دوران چائے آ گئی تھی جو ان تینوں نے پی۔ انجم نے رشی اور اس کی ماں کے دل میں اپنی ہمدردی پیدا کر لی تھی۔ رِشی کی ماں اُٹھ کر چلی گئی۔ واپس آئی تو اُس کے ہاتھ میں سو سو کے چند نوٹ تھے۔ اُس کے ہاں دولت کی کمی نہیں تھی۔

"انجم بیٹی!" — رِشی کی ماں نے کہا — "انشورنس کی ہمیں ضرورت نہیں، لیکن میں تمہاری کچھ نہ کچھ مدد ضرور کرنا چاہتی ہُوں" — اُس نے سو سو کے نوٹ انجم کی طرف بڑھا کر کہا — "یہ رکھ لو۔ تمہارے کام آئیں گے۔ اپنی ماں کے لئے دوائیاں لے لینا۔ اگر اُسے کسی سپیشلسٹ کو دکھانے کی ضرورت سمجھو تو مجھے بتانا۔ مَیں تمہیں اپنے ملنے والے ایک بڑے اچھے سپیشلسٹ کے پاس بھیج دوں گی۔ یہ تھوڑے سے پیسے رکھ لو۔"

"نہیں آنٹی!" — انجم نے صوفے پر پیچھے ہٹتے ہوئے کہا — "یہ مجھ پر آپ کیا ظلم کر رہی ہیں۔ مجھے اپنی اُجرت کے ساتھ دلچسپی ہے۔ اس طرح پیسے لینے کو تو میں بھیک سمجھتی ہوں۔ اگر بغیر محنت کے پیسے کمانے ہوتے تو یہ راستہ میرے سامنے کُھلا تھا۔ میری عادت نہ بگاڑیں۔"

رشی اور اس کی ماں نے بہت اصرار کیا کہ وہ اِن پیسوں کو بھیک یا خیرات نہ سمجھے، لیکن انجم نے یہ رقم قبول نہ کی۔

"میں تو اب عورتوں کے ساتھ بات کرنے سے بھی ڈرتی ہوں" — انجم نے کہا — "میں تو سوشل لڑکی تھی، لیکن لڑکیوں کی حد تک۔ آپ کی اِس بیٹی جیسی لڑکیاں مجھے بہت اچھی لگتی تھیں اور انہی کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا ہوتا تھا.... کیا نام ہے ان کا؟"

"رِشی کہہ لو" — رِشی نے کہا — "نام راشدہ ہے۔"

"جس طرح آپ نے مجھے یہ رقم پیش کی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کے دل میں دُکھی انسانوں کا درد ہے" — انجم نے کہا — "مَیں تو پیسے پیسے کی محتاج ہوں، لیکن یہ بھی سمجھتی ہوں کہ ہر مسئلے کا حل پیسہ ہی نہیں۔ مجھ جیسی زندہ دل لڑکی پیسے کو تو کچھ سمجھتی ہی نہیں تھی۔ مجھے صرف جذباتی سہارے کی ضرورت ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اسی گھر میں بیٹھی رہوں۔ اگر رِشی اجازت دے تو کبھی کبھار ان کے پاس آجایا کروں۔"

"تو آجایا کرو نا!" — رِشی نے کہا — "مَیں بھی کچھ تنہائی محسوس کرنے لگی ہوں۔ میری زندہ دلی کی رُوداد سنو تو پریشان ہو جاؤ کہ یہ لڑکی کتنی آزاد خیال ہے، لیکن شادی کے بعد دل مُردہ ہو گیا۔"

"مَیں تو آسمان سے گری ہوتی ہوں" — انجم نے کہا — "آسمان سے گرنے والے کھجور میں اٹکا کرتے ہیں، لیکن میں سیدھی زمین پر آگری.... بہرحال آپ مجھے انشورنس ایجنٹ سمجھنا چھوڑ دیں۔ اگر رِشی مجھے اپنی فرینڈ سمجھے تو مَیں یہ احسان کبھی نہیں بھُولوں گی.... کیا آپ مجھے اپنا فون نمبر دیں گی؟"

رِشی نے اُسے اپنا فون نمبر دیا۔ انجم جانے کے لئے اُٹھی۔ رِشی دروازے تک اُس کے ساتھ گئی۔ اُس سے پوچھا کہ اُس کی آمدنی کتنی کچھ ہو جاتی ہے۔ اُس نے بتایا کہ آمدنی ٹھیک ٹھاک ہو جاتی ہے۔ گیٹ پر انجم اور رِشی کی کچھ اور باتیں ہوئیں۔ انجم انشورنس ایجنٹ تھی اس لئے دوسروں کے دلوں پر قبضہ کرنا جانتی تھی۔ رِشی پر وہ ایسا تاثر چھوڑ کر رخصت ہوتی کہ رِشی کے دِل میں اُس سے ایک بار پھر ملنے کی خواہش پیدا ہو گئی۔ رِشی

نے اُسے کہا تھا کہ وہ اسے گاڑی پر چھوڑ آتی ہے، لیکن انجم نے یہ لفٹ قبول نہ کی۔

❄

رابی رشی سے آزاد ہو کر اپنی ڈگر پر از سرِ نو چل پڑا تھا۔ اُس کی ڈسکو سوسائٹی پہلے کی طرح بلکہ پہلے سے کچھ زیادہ ہی زندہ موجود تھی۔ رابی کے دوستوں نے اُس کے استقبال میں ناچ گانے کی ایک محفل منعقد کی جس میں پچیس تیس نوجوان لڑکے اور لڑکیاں تھیں۔ اس میں اُنہوں نے ناچ گانے کا وہی ہنگامہ کیا جس میں پاکستان کی تہذیب و وقار اور دفاع تک ڈوب رہا تھا۔ ہال جیسے کمرے کی فضا مختلف نشوں کی بدبُو سے متعفن ہو رہی تھی۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے کپڑوں پر سپرے کئے ہوتے سینٹ بیکار ہو کر رہ گئے تھے۔

ہر کسی نے رابی سے رشی کے متعلق پوچھا۔ ہر ایک کو اُس نے یہی جواب دیا کہ بے وفا نکلی اور وہ اس سے آزاد ہو گیا ہے۔ سب نے رابی کے اس اقدام پر اُسے مبارکباد دی۔ وہ خوش تھے کہ اُن کا دوست آزاد ہو گیا ہے، لیکن چار پانچ نوجوان اس لئے خوش تھے کہ رشی آزاد ہو گئی ہے اور اب اُس سے ملیں گے۔ تنہائی میں ملاقاتیں ہوں گی اور پہلے والی دوستیاں چلیں گی۔

اس پُر ہنگامہ تقریب کے بعد رشی کے ٹیلیفون کی یہ حالت ہو گئی کہ ایک کال سُن کر ریسیور رکھتی تھی تو فون کی گھنٹی پھر بجنے لگتی تھی۔

"ہیلو رشی! تم خوش قسمت ہو کہ رابی جیسے بدکردار سے جان چھڑا لی ہے۔"

"ہائی رشی! اب تو ملنے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہی۔ کب ملو گی؟"

"آج ہی آجاؤ۔ بتاؤ گاڑی کہاں لاؤں؟"

"او شٹ اَپ رشی! پاکستانیوں جیسی باتیں نہ کرو۔"

رشی کو دن رات ٹیلیفون یہی پیغام دیتا رہتا تھا۔ رشی انہیں ٹالتی رہتی اور کبھی اُس سوسائٹی سے بے زاری کا اظہار کر دیتی جس میں اُس نے پرورش پائی اور اپنی عصمت بھی جس کی بھینٹ چڑھا دی تھی۔ اُس کے پرانے دوست حیران ہوتے تھے کہ اس لڑکی کو کیا ہو گیا ہے۔ تقریباً ہر لڑکے نے اُسے کہا کہ وہ تو سچ مچ پاکستانی ہو گئی ہے۔ اُسے طرح طرح کے اشتعال بھی دیئے گئے لیکن رشی نے اپنے آپ کو اس سوسائٹی سے نوچ لیا تھا۔ اس سوسائٹی سے قطع تعلق کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کہیں نہ کہیں رابی کے آمنے سامنے آجانے کا خطرہ تھا۔

نوجوانوں کی اس سوسائٹی کے لڑکوں اور لڑکیوں کے ٹیلیفون تو بجتے ہی رہتے تھے۔ عشق بازیاں ٹیلیفون پر چلتی تھیں۔ گھنٹہ گھنٹہ دو دو گھنٹے ٹیلیفون انگیج رہتے تھے۔ بل ماں باپ ادا کرتے تھے۔

رابی کا وقت ٹیلیفون پر ہی گزر رہا تھا۔ ایک روز اُس کے فون کی گھنٹی بجی۔ اُس نے ریسیور اُٹھایا اور نعرہ لگانے کے انداز سے کہا — "ہیلو رحمٰن! کب آتے ہو؟"

وہ ورما تھا جو لاہور کی ایک کوٹھی سے بول رہا تھا۔ رابی اُسے عبدالرحمٰن کے نام سے جانتا تھا اور اُسے معلوم ہی نہیں تھا کہ یہ عبدالرحمٰن دراصل ہندو ہے اور یہ ہندو انٹیلی جنس میں صرف روزی کمانے کے لئے نوکری نہیں کر رہا بلکہ پاکستان کی تخریب کاری اُس کی زندگی کا مشن ہے اور اسے وہ اپنا مذہبی فرض سمجھتا ہے۔ رابی کے ساتھ وہ جس محبت کا اظہار کر رہا تھا اُس محبت میں نفرت اور عداوت کا زہر بھرا ہوا تھا، لیکن رابی اُسے اپنا بہترین اور بڑا ہی پیارا دوست سمجھتا تھا۔

"پہلے یہ بتاؤ رحمٰن!" — رابی نے ٹیلیفون پر ورما سے پوچھا — "اُس کا کیا حال ہے؟"

"ساتھ آئی ہے" — ورما نے جواب دیا۔

"اوہ گریٹ!" — رابی نے خوشی سے پھٹتے ہوئے کہا — "کہاں ہو؟"

میں ابھی آتا ہوں۔"

"یار! اس نے تو ہماری جان کھالی تھی" — ورما نے کہا — "کہتی تھی کہ تم مجھے پاکستان نہیں لے جاؤ گے تو میں خود ہی سرحد پار کر جاؤں گی۔ اگر رینجرز نے مجھے گولی مار دی تو اور بھی اچھا ہوگا۔ تمہارا نام لے لے کر روتی رہی ہے۔ بڑی مشکل سے اس کا ویزہ بنوا کر لایا ہوں۔"

ورما اور زینی انڈین انٹیلی جنس کے کل پُرزے تھے بلکہ یہ بچھو جیسے ہندو کے وہ ڈنگ تھے جن میں زہر بھرا ہوتا ہے، وہ پاکستان میں کس طرح داخل ہوتے تھے؛ کیا وہ ویزے پر آتے تھے یا اُن کے پاس پاکستان کی جعلی شہریت تھی؛ اِن سوالوں کے کئی جواب تھے۔ یہ سب جواب صرف اس ایک جواب میں سمٹ آتے ہیں کہ جس ملک میں پیسہ چلتا ہو، ایمان کھُلی منڈی میں رکھا ہُوا ہو، غداری کو قابلِ فخر سمجھا جاتا ہو اور جہاں قانون اور قانون کے محافظوں کو بھی خرید لینے کا انتظام موجود ہو، وہاں سرحد کے اِدھر یا اُدھر ہو جانا کوئی مشکل نہیں ہوتا۔ سرحد کوئی دیوار نہیں ہوتی۔ کوئی ایسی خندق نہیں ہوتی جو گہرے پانی سے بھری ہوتی ہو۔ کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ سرحد نظر نہ آنے والی ایک لکیر ہے جس کے تقدس کو وہی قوم سمجھتی ہے جس نے اس کی قربان گاہ پر خون کے نذرانے دیے ہوں اور سرحد کے شہیدوں کو اپنے دل میں بٹھا رکھا ہو۔

خوددار قومیں اپنی سرحدوں کو اپنی بہنوں اور بیٹیوں کی عصمت سے زیادہ عزیز رکھتی ہیں۔

سرحد وہی ناقابلِ عبور رہتی ہے جس کے پیچھے قوم سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کے کھڑی ہو۔

زندہ اور آزاد قومیں دشمن کے آگے دیوار کھڑی نہیں کیا کرتیں بلکہ دیوار بن جایا کرتی ہیں۔

جس ملک کے لیڈر آپس میں اقتدار کی خاطر برسرِ پیکار ہوں، اُس کی سرحدیں کھیتوں کی مینڈھوں جیسی ہوتی ہیں جن پر چلتے چلتے اِدھر اُدھر ہو جانا کوئی مشکل نہیں ہوتا۔ پاکستان کی سرحدوں کا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔

ورما اور زینی لاہور آ کر لاہور کے ہجوم میں اس طرح گم ہو گئے جس طرح پانی کے گلاس میں نمک کی دو چٹکیاں ڈال کر پانی کو ہلا دیا جاتا ہے۔ کوٹھیوں کے علاقے میں ایک کوٹھی تھی جو کسی بھی وجہ سے دوسری کوٹھیوں سے مختلف نہیں تھی۔ وہاں کے رہنے والوں کو سب جانتے تھے۔ اس کوٹھی میں مہمان آتے جاتے رہتے تھے۔ کسی کو اتنی فرصت نہیں تھی نہ ضرورت کہ وہ تحقیقات کرے کہ فلاں مہمان کہاں سے آیا ہے اور کب تک یہاں ٹھہرے گا۔ ورما اور زینی بھی ایسے ہی مہمانوں میں سے تھے۔

رابی نے ورما کی کوئی اور بات ہی نہ سُنی۔ کوٹھی کا نمبر وغیرہ معلو[م] کیا، دوڑتا ہُوا باہر آیا، گاڑی میں بیٹھا اور اُس نے اتنی تیزی سے گاڑی گیٹ میں سے ریورس کی اور سیدھی کر کے اُڑا لے گیا کہ پہیّوں کی چیخیں سُن کر اُس کی ماں دوڑتی باہر نکلی۔ اُس وقت تک رابی کی گاڑی نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ نوکر نے رابی کی ماں کو بتایا کہ رابی صاحب گاڑی لے گئے ہیں۔

"سنو نذر!" — رابی کی ماں نے نوکر سے کہا — "سائیکل پکڑو اور رِشی کی ماں کی کوٹھی کے سامنے سے آہستہ آہستہ گزرو اور دیکھو کہ رابی کی گاڑی وہاں ہے یا نہیں۔"

"رابی صاحب کو کچھ کہنا ہے بیگم صاحب!"

"نہیں" — رابی کی ماں نے کہا — "کوٹھی کے اندر نہ چلے جانا۔ تمہیں کوئی دیکھ نہ سکے۔ اُن کا گیراج گیٹ کے سامنے ہے۔ وہ بھی اور کار پورچ بھی باہر سے نظر آتا ہے۔ باہر سے گزرتے ہوئے دیکھنا اور واپس آ جانا۔"

رابی کی ماں کو یہ خدشہ نظر آتا تھا کہ رابی رِشی کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوگا اور درپردہ وہ اُسے ملتا ہوگا۔ یہ تو وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کا بیٹا کس جال میں پھنسنے کے لئے کھچا ہُوا جا رہا ہے۔

جب ان کا نوکر نذر رِشی کی کوٹھی کے سامنے سے گزر کر واپس یہ

رپورٹ لے کر آرہا تھا کہ رابی کی گاڑی رشی کی کوٹھی کے اندر یا باہر نہیں،
اُس وقت رابی کی کار ایک اور کوٹھی میں جا کر رُک چکی تھی اور رابی اس
کوٹھی کے ایک کمرے میں جا بیٹھا تھا۔ زینی اُس کمرے میں داخل ہوتی۔
ورما یہ کہہ کر کمرے سے نکل گیا کہ وہ کھانے پینے کا کچھ انتظام کرتا ہے۔
اُس کے جاتے ہی رابی اور زینی ایک دوسرے کے بازوؤں میں جکڑے
گئے۔ رابی اپنے آپ کو، اپنے ماں باپ اور اپنے ملک کو بھی بھول گیا۔

چھ کنالوں کے احاطے میں کھڑی اس کوٹھی کے عقب میں اس کی
انیکسی تھی جو کوٹھی والوں نے کرائے پر دے رکھی تھی۔ یہ بھی اچھی خوبصورت
کوٹھی ہی تھی۔ وہاں ایک میاں بیوی رہتے تھے۔ ورما اور زینی اُن کے
ہاں تھے۔ کوٹھی کے مالکوں نے کبھی دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی
کہ وہ کون لوگ ہیں۔ وہ اتنا ہی جانتے تھے کہ ان کے پاس باہر کی کسی کمپنی
کی ایجنسی ہے اور ان کا دفتر لاہور میں کسی اور جگہ ہے۔ اڑوس پڑوس
کی کوٹھیوں والوں کا خیال تھا کہ یہ آدمی فلمی دُنیا سے تعلق رکھتا ہے۔ کوئی
کہتا تھا ڈسٹری بیوٹر ہے اور کوئی کہتا کہ فلم سٹوڈیوز میں مختلف سامان
سپلائی کرنے کا ٹھیکیدار ہے۔ لوگوں نے کبھی کریدنے کی ضرورت محسوس
نہیں کی تھی کیونکہ اس شخص میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ وہ ایک
عام سا آدمی تھا۔

"اُس سے نجات حاصل کی ہے یا نہیں؟" — زینی نے رشی کے
متعلق پوچھا۔

"لاہور میں پہنچتے ہی پہلا کام یہی کیا تھا" — رابی نے جواب دیا —
"ڈیڑھ دو گھنٹے بعد اُسے اُس کی ماں کے پاس بھیج دیا تھا۔"

"اب شادی کی بات کرو" — زینی نے کہا۔

"کیا تمہارے کہنے کی ضرورت ہے؟" — رابی نے اُسے اپنے
بازوؤں میں لیتے ہوئے کہا — "شادی تو دِلی میں ہی ہو گئی تھی۔ اب
باقاعدہ نکاح اور رخصتی باقی ہے۔ یہ رسم بھی پوری کر لی جائے گی۔"

ورما نے اس کمرے میں واپس آتے دانستہ دیر لگائی۔ ادھر کمرے
میں رابی زینی کو ایک ہوٹل میں دعوت دینے کی باتیں کر رہا تھا، لیکن زینی
اُسے ٹال رہی تھی۔ رابی کو معلوم نہیں تھا کہ اب زینی اُس کے ہاتھوں
میں کھلونا بننے کی بجائے ٹال مٹول کرے گی۔

کچھ دیر بعد ورما واپس آیا۔ اُس کے پیچھے نوکر چائے کی ٹرالی لے کر
آ گیا۔ اس دوران دِلی کی، عزیز کی اور رشی کی باتیں ہوتی رہیں اور اس
کے بعد ورما نے رابی سے کہا کہ اب وہ چلا جاتے اور شام کو فلاں ہوٹل
میں آ جاتے۔

"شکار اپنے ہاتھ میں ہی ہے" — رابی کے جانے کے بعد ورما
نے زینی سے کہا۔

"پہلے سے زیادہ" — زینی ہنس کر بولی — "میرا جادُو کام کر گیا ہے۔
اُس نے اپنی بیوی کو اُس کی ماں کے پاس بھیج دیا ہے۔ ابھی طلاق
نہیں ہوتی۔ میں نے اس کے ساتھ شادی کی بات بھی کر لی ہے۔"

"خیال رکھنا" — ورما نے کہا — "کہیں اس کا جادُو اپنے اُوپر چلا
کر شادی کر ہی نہ لینا۔"

"کیا مجھے مزید ٹریننگ کی ضرورت ہے؟" — زینی نے کہا —
"مَیں نے دیکھ لیا ہے کہ مسلمانوں کا ایمان ہمارے دھرم سے زیادہ کمزور
ہے۔ ہمارے بھگوان نے کم از کم اس رابی کے دل سے خدا کا نام نکال
دیا ہے۔ یہ تو اب بھی یہیں گڑبڑ پر اُتر آیا تھا۔ یہ میں تھی جس نے اپنے
آپ کو بچا کر رکھا۔ مَیں نے اُسے کہا کہ اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ تمہاری خاطر
ہی اپنا ملک اور اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر آتی ہوں۔ اب تو ہمیشہ تمہاری
ہو کر رہوں گی۔"

"مَیں تمہیں یاد دلاتا ہوں" — ورما نے کہا — "رابی سے ہم دو
بڑے ہی قیمتی راز حاصل کر چکے ہیں۔ یہ اس نے اپنے باپ کی فائلوں
سے نکال کر ان کی فوٹو سٹیٹ کرا کے دیتے تھے۔ یہ وہ انفارمیشن ہے جو

ڈیفنس سیکرٹری اور رابی کے باپ کے سوا کسی کو بھی معلوم نہیں۔ وزیرِ دفاع بھی اس سے لاعلم ہے۔ ان کے وزیر ایسے ہی ہوتے ہیں۔ انہیں وزیر تقریریں کرنے اور خزانہ خالی کرنے کے لئے بنایا جاتا ہے۔ یہ بھی یاد رکھو کہ پاکستان افسر شاہی کے قبضے میں ہے۔ سیاہ و سفید کی مالک یہی افسر شاہی ہے۔ میں تمہیں ایک بار پھر یاد دلاتا ہوں کہ تم یہاں رابی کی بیوی بننے کے لئے نہیں آئیں بلکہ رابی کو اپنی گرفت میں رکھنے کے لئے آئی ہو۔"

٥

شام کے وقت رابی وقت سے پہلے اُس ہوٹل میں پہنچ گیا جس میں ورما نے اُسے بلایا تھا۔ اُس شام اس فائیو سٹار ہوٹل میں ایک بارات آرہی تھی اور ایک دعوتِ ولیمہ تھی۔ ہوٹل کے باہر اور کار پارک میں کاریں کھڑی کرنے کی جگہ نہیں رہی تھی۔ ہوٹل کے دو ہال مہمانوں سے بھرتے جا رہے تھے۔ نئے نوٹوں کے ہاروں کی نمائش ہو رہی تھی۔ دولت اُڑ رہی تھی۔ میزوں پر کھانے لگ رہے تھے۔ ان دونوں دعوتوں کے جو بل بننے والے تھے، اس رقم سے کم از کم بیس ہزار بھوکے ایک وقت کا کھانا کھا سکتے تھے۔ اُس شام جب اتنی زیادہ دولت دعوتوں کے چند سو آدمی اپنے پیٹ میں ڈال رہے تھے، اس ملک کے لاکھوں بچے روکھی سوکھی کھا کر اور بعض بھوکے ہی سو گئے تھے، اور اُس شام بھی ٹی وی کے خبرنامے میں ملک کے سب سے بڑے حکمران کا یہ بیان سنایا جا رہا تھا کہ اُس نے عوام کو خوشحال بنانے کا تہیہ کر رکھا ہے اور اُس کی حکومت ملک کی کایا پلٹ دے گی۔

بارات اور ولیمے کی دو دعوتوں میں عوام کی خوشحالی کو چند ایک افراد نگل رہے تھے۔ ملک کو خوشحال بنانے والی حکومت کے دو وزیر اور افسر شاہی کے چند ایک نمائندے بھی اس دعوت میں شریک تھے۔

اُس وقت اسی ہوٹل کے ایک کمرے میں دشمن کے تین جاسوس ـــ رابی، ورما اور زینی ـــ بیٹھے ملک کی کایا پلٹ رہے تھے۔ ان میں

دو انڈین ہندو اور ایک پاکستانی مسلمان تھا۔

رابی کی ذہنی اور جذباتی حالت یہ تھی جیسے اُسے زینی نے ہپناٹائز کر رکھا ہو۔ زینی اگر اُسے کہتی کہ سر کے بل کھڑے ہو جاؤ یا میز کے نیچے بیٹھ جاؤ تو وہ حکم کی تعمیل کرتا۔ اُس کی حالت لال گرم لوہے جیسی تھی۔ اسے اپنی مطلوبہ شکل میں موڑنے توڑنے کا کام ورما نے کرنا تھا۔

"رابی یار!" ـــ ورما نے کہا ـــ "ہمارا چیف تمہیں اتنا چاہتا ہے کہ کئی بار پوچھ چکا ہے کہ رابی پھر کب دلّی آئے گا۔ تم نے جو انفارمیشن دی ہے، وہ صرف تم ہی دے سکتے تھے۔"

"یہ کام کوئی اتنا مشکل تو نہیں جتنا تم سمجھتے ہو" ـــ رابی نے کہا ـــ "مجھے بتاؤ اور کیا چاہیئے۔"

"تمہارے لئے ایک بڑا قیمتی اور خوبصورت تحفہ ہمارے چیف کی طرف سے آرہا ہے" ـــ ورما نے کہا ـــ "کل شام تک پہنچ جائے گا۔ ایک بہت بڑی رقم پاکستانی کرنسی میں تمہاری منتظر ہے۔ جب چاہو لے لو۔"

"زینی سے بڑھ کر قیمتی تحفہ اور کیا ہو سکتا ہے!" ـــ رابی نے میز کے نیچے اپنی ٹانگ زینی کی ٹانگ کے ساتھ رگڑ کر کہا ـــ "تم مجھے یہ بتاؤ کہ اتنی بڑی رقم کے عوض مجھے کیا کرنا ہے۔"

"اپنے ڈیڈی کے ساتھ دوستی کر لو" ـــ ورما نے رابی سے کہا ـــ "اُن کے ساتھ انڈیا اور پاکستان کے جھگڑوں کے متعلق اور پاکستان کے ڈیفنس کے متعلق باتیں کرتے رہا کرو، لیکن ایک خاص انداز سے۔

وہ اس طرح کہ ڈیڈی سے یہ کہو کہ ڈیڈی! پاکستان کا ڈیفنس تو بہت ہی کمزور ہے۔ تم یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ انڈیا نے اگنی اور پرتھوی کے نام کے جو میزائل تیار کئے ہیں ان کے مقابلے میں پاکستان کے پاس کچھ بھی نہیں۔ پھر یہ کہو کہ پاکستان سکھوں کی مدد کیوں نہیں کرتا۔ یہ بھی کہو کہ پاکستان

مقبوضہ کشمیر کے کشمیری مسلمانوں کی بھی مدد نہیں کر رہا۔ تمہارے ڈیڈی تمہیں ڈھیلا ڈھالا اور گول مول سا جواب دیں گے۔ تم اس طرح ان کے پیچھے پڑے رہنا جیسے تم پاکستان کے ڈیفنس کے متعلق اور سکھوں اور مقبوضہ کشمیر کے مسلمانوں کے متعلق بہت پریشان ہو.... میرا مطلب یہ ہے کہ ایسی ایکٹنگ کرو کہ وہ مجبور ہو جائیں کہ تمہاری تسکین کے لئے تمہیں صحیح صورت حال، پاکستان کی پالیسی اور دیگر اعداد و شمار فائلوں میں سے بتا دیں۔"

رابی کوئی ایسا بچہ تو نہیں تھا کہ ورما کی بات سمجھ نہ سکتا۔ دلّی میں عزیز نے زینی کے علاوہ دو تین لڑکیاں رابی کے سامنے بٹھا کر اور باہر کی شراب کی بوتل سامنے رکھ کر ٹریننگ دی تھی کہ اپنے باپ کی فائلوں اور اس کی زبانی وہ کس طرح انفارمیشن حاصل کر سکتا ہے۔ رابی جسے انڈیا کی سیر سمجھتا تھا وہ انڈین انٹیلی جنس کی نظر میں اُس کا ٹریننگ سیشن تھا۔ رابی نے اپنا دماغ اور اپنی پاکستانیت اُن کے حوالے کر دی تھی۔ ایمان تو پہلے ہی پاپ میوزک اور ڈسکو ناچ نے ختم کر دیا تھا۔ وہ پوری طرح سمجھ گیا تھا کہ وہ انڈیا کا جاسوس ہے اور اسے کیا کرنا ہے اور کس طرح کرنا ہے۔

❄

رابی کا باپ لاہور میں ڈیفنس کے سلسلے میں کسی سپیشل ڈیوٹی پر رہتا تھا۔ مہینے میں آٹھ دس دنوں کے لئے اسلام آباد جاتا اور ایک دو فائلیں لے کر لاہور آ جاتا تھا۔ اُس کی یہ ڈیوٹی خفیہ تھی۔ ان دنوں وہ لاہور میں تھا۔ ہوٹل سے گھر آ کر رابی باپ کے پاس بیٹھ گیا اور اُس کے ساتھ اس طرح کی باتیں شروع کر دیں کہ انڈیا کی سیر نے اُس کے اندر قومی جذبہ بیدار کر دیا ہے۔ اُس نے کہا کہ وہاں ہندو پاکستان کو بہت ہی کمزور ملک سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انڈین گورنمنٹ جب چاہے گی اپنی فوج کو پاکستان میں داخل کر دے گی۔

رابی نے ورما سے لی ہوئی بریفنگ کے مطابق اپنے باپ کے ساتھ ایسی باتیں کیں جیسے پاکستان کے ڈیفنس کی کمزوریوں کی وجہ سے اُس کی نیند اُڑ گئی ہو۔ اُس نے سکھوں اور کشمیری مسلمانوں کو مدد نہ دینے کی باتیں بھی کیں۔

"مجھے خوشی ہوتی ہے کہ انڈیا جا کر تم پکے پاکستانی بن آتے ہو" — اُس کے باپ نے کہا — "پہلے تم نے کبھی ایسی باتیں نہیں کی تھیں۔"

"مجھے کچھ بتائیں ڈیڈی!" — رابی نے بڑے کمال کی ایکٹنگ کی اور کہا — "پاکستان کے پاس کچھ بھی نہیں۔ پاکستان اپنے آپ کو بچانے کے قابل نہیں، یہ سکھوں اور کشمیریوں کو کیا دے گا۔"

رابی نے ایسی جوشیلی اور جذباتی باتیں کیں کہ اُس کا باپ اُس کے جال میں آ گیا۔ رابی نے یہ بھی کہا کہ پہلے وہ ملٹری اکیڈمی سے بھاگ آیا تھا، لیکن اب وہ فوج میں بلا تنخواہ سروس کرنے کے لئے تیار ہے۔

اُس کا باپ پکا پاکستانی تھا۔ وہ دلی طور پر اور پوری دیانتداری سے پریشان رہتا تھا کہ پاکستان کا دفاع اور زیادہ مضبوط ہونا چاہیئے اور انڈیا کے اندر انڈیا کے خلاف جو تحریکیں چل رہی ہیں، انہیں تقویت دی جاتے اور اس آگ پر تیل چھڑکا جاتے۔ اُس نے جب اپنے بیٹے کے قومی جذبات کا یہ عالم دیکھا تو اسے اعداد و شمار بتانے شروع کر دیئے۔ یہ سب ٹاپ سیکرٹ انفارمیشن تھی۔ باپ نے اُسے یہ بھی کہا کہ وہ اسے فائلیں نہیں دکھا سکتا کیونکہ اسے وہ بددیانتی سمجھتا ہے۔

رابی یہی سننا چاہتا تھا کہ یہ انفارمیشن فائلوں میں موجود ہے اور یہ فائلیں اُس کے باپ کے پاس ہیں۔ انفارمیشن تو اُس نے لے لی تھی۔ انڈین انٹیلی جنس سے معاوضہ وصول کرنے کے لئے فائلوں سے اس تحریری انفارمیشن کی فوٹو سٹیٹ ضروری تھی۔ یہ کام رابی کے لئے مشکل نہیں تھا۔

اگلی ہی صبح اُس نے درما کو فون کیا اور اُسے بتایا کہ وہ آرہا ہے۔
وہ درما کے پاس گیا اور انفارمیشن اُسے دے کر کہا کہ ایک دو دِنوں میں اُسے فوٹوسٹیٹ بھی مِل جائے گی۔ درما نے اُسے یہ انعام دیا کہ کسی کام کے بہانے کمرے سے نکل گیا اور زینی کو اُس کے پاس اکیلا چھوڑ گیا۔

❋

اس دوران انجم تین مرتبہ رِشی سے مِل چکی تھی اور وہ بے تکلف سہیلیاں بن گئی تھیں۔ رِشی نے انجم کو بتایا تھا کہ وہ اپنے خاوند کے ساتھ سیر سپاٹے کے لئے دِلّی گئی تھی، لیکن وہاں ایک لڑکی اُس کے خاوند کو مل گئی اور اس لڑکی نے اسے ایسا گمراہ کیا کہ وہ رِشی سے متنفر ہو گیا اور یہاں آتے ہی اُسے ماں کے پاس بھیج دیا۔ رِشی نے انجم کو اپنے اغوا کا واقعہ نہ سنایا۔ سنانے کی کوئی ضرورت بھی نہیں تھی۔

ایک روز انجم نے رِشی کو فون کیا اور کہا کہ وہ اس کے پاس آرہی ہے۔ رِشی نے اُسے کہا کہ وہ اس کا گھر دیکھنا چاہتی ہے۔

"نہیں رِشی!" — انجم نے کہا — "میرا گھر دیکھو گی تو مجھے ناپسند کرنے لگو گی۔ اگر ایسا نہیں ہوگا تو مجھ پر ایسا احساسِ کمتری طاری ہو جائے گا کہ میں تمہارے گھر آنا اور شاید تم سے ملنا ملانا بھی چھوڑ دوں گی۔ مجھ پر یہ ظلم نہ کرنا۔ دوسری بات یہ ہے کہ میری ماں ذہنی مریضہ ہے۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ وہ بگڑی ہوئی ذہنی کیفیت میں ہو اور تمہیں دیکھ کر تمہارے ساتھ اُلٹی سیدھی باتیں شروع کر دے۔"

"تم آجاؤ انجم!" — رِشی نے کہا — "ویسے آج میرا مُوڈ اپنے گھر میں بیٹھنے کا نہیں۔ کہیں باہر نکل چلیں گے۔"

کچھ انتظار کے بعد رِشی کی کوٹھی کے باہر ایک رکشہ رُکا اور انجم کوٹھی میں داخل ہوئی۔ رِشی تیار تھی۔ اُس نے انجم کو یہ کہہ کر گاڑی میں بٹھایا کہ چلو آج لارنس گارڈن چلتے ہیں۔ آج چائے بھی باہر سے ہی پئیں گے۔

انجم گاڑی میں بیٹھ گئی۔ یہ انجم کی زبان کی چاشنی اور دِلی محبت کا کمال تو تھا ہی کہ اُس نے رِشی کو ہمراز سہیلی بنا لیا تھا، لیکن اس میں رِشی کا اپنا کمال بھی شامل تھا۔ وہ اس طرح کہ رِشی نے باہر نکلنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس کی ذات میں جو انقلاب آیا تھا اس انقلاب کے راستے سے وہ ہٹنا نہیں چاہتی تھی۔ تنہا ہوتی تو یہی سوچتی رہتی کہ وہ کس طرح پاکستان کی انٹیلی جنس کو بتائے کہ رابی انڈیا کا جاسوس ہے۔ اُس کی ماں اثر ورسوخ والی اور سوشل سرکل میں گھومنے پھرنے والی عورت تھی لیکن اُسے بھی اب تک کوئی ایسا آدمی نہیں ملا تھا جس کے ذریعے وہ آئی ایس آئی تک پہنچ سکتی۔ اس کے سامنے مشکل یہ تھی کہ وہ احتیاط برت رہی تھی۔ یہ انٹیلی جنس کا معاملہ تھا۔ ہر کسی کے ساتھ ایسی بات نہیں کی جا سکتی تھی۔ اُسے یہ خطرہ بھی نظر آیا تھا کہ رابی کے باپ کو نہ پتہ چل جائے۔ وہ گورنمنٹ آف پاکستان کا افسر تھا۔ قبل از وقت اطلاع ملنے پر وہ رِشی اور اس کی ماں کا مُنہ بند کروا سکتا تھا اور اُنہیں کسی مصیبت میں بھی ڈال سکتا تھا۔ ان دشواریوں کے باوجود ماں بیٹی کا یہ ارادہ متزلزل نہیں ہُوا تھا۔

رِشی کی گاڑی لارنس گارڈن کے کار پارک میں رُکی۔ رِشی اور انجم گاڑی سے نکل کر ٹہلتے ٹہلتے باغ میں چلی گئیں۔

"رِشی!" — انجم نے کہا — "تم جس سوسائٹی کی لڑکی ہو وہ تم جیسی لڑکیوں اور لڑکوں کو ایسا مُردہ تو نہیں ہونے دیتی جیسی تم ہو گئی ہو۔ کیا تم شروع سے ایسی ہو؟"

"نہیں انجم!" — رِشی نے کہا — "مَیں ویسی ہی تھی جیسی ہماری سوسائٹی کی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ مَیں اس سوسائٹی کی ہر خرافات کی عادی تھی۔ پاکستانی کلچر کو مَیں پسماندہ لوگوں کا کلچر کہا کرتی تھی، لیکن اب اس پاپ کلچر کو جسے بعض لوگ ہپی کلچر بھی کہتے ہیں، دِل سے ایسا اُتارا ہے کہ اس سے نفرت ہو گئی ہے۔"

"یہ غالباً خاوند کے ناروا سلوک کا اثر ہے" — انجم نے کہا — "اس

کی وجہ سے تم اپنی دلچسپیوں سے ہی بیزار ہو گئی ہو۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک ہوا تھا۔ خاوند نے ہی نہیں، بھائیوں نے بھی، مجھے اور میری ماں کو دھتکار دیا۔"

"ہو سکتا ہے یہی وجہ ہو" — رشی نے کہا — "مَیں اس کی وجہ کچھ اور سمجھتی ہوں۔ مجھ میں یہ تبدیلی دِلّی میں آئی تھی۔"

"کوئی خاص بات ہوئی تھی؟"

"نہیں" — رشی نے جواب دیا — "کوئی ایسی بات تو نہیں ہوئی تھی۔ وہاں کے مسلمانوں کو دیکھا تھا۔ وہ شریف لوگ تھے۔ ویسے ہی اُن سے ملاقات ہو گئی تو انہوں نے کچھ ایسی باتیں کیں کہ مجھے یاد آگیا کہ مَیں بھی کسی مسلمان کی بیٹی ہوں۔"

"کون تھے وہ؟"

"تو کیا ہوا؟" — انجم نے اس آدمی اور لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا — "کوئی خاص بات ہے ان میں؟"

وہ آدمی ورما تھا اور اس کے ساتھ زبینی تھی۔ رشی کو اچھی طرح یاد تھا کہ ورما کا اس کے ساتھ تعارف عبدالرحمٰن کے نام سے کرایا گیا تھا۔ اُسے رفیقی کے گھر میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ عزیزہ کی بہن زبیدہ کے ساتھ جو آدمی سیاہ بُرقعے میں آیا تھا وہ اپنا نام عبدالرحمٰن بتاتا تھا لیکن وہ ورما نام کا ہندو تھا۔ رشی کی دلچسپی کی خاطر تفصیل سے بتایا گیا تھا کہ اس ورما کی پٹائی کس طرح کی گئی تھی۔

آج وہی ورما لاہور میں اچانک اُس کے سامنے آگیا تھا اور اس کے ساتھ وہ لڑکی تھی جس نے اس کے خاوند کو اس سے چھین لیا تھا۔ رشی کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ دونوں انڈین انٹیلی جنس کے بھیجے ہوئے یہاں آتے ہیں۔

ان کے اور رشی کے درمیان پچیس تیس قدم کا فاصلہ تھا۔ ان دونوں نے رشی کو دیکھا اور وہیں سے ایک طرف مُڑ گئے۔

"رشی!" — انجم نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا — "کچھ مجھے بھی بتاؤ۔"

"یہ انڈیا کے جاسوس ہیں" — رشی نے اپنے آپ سے باتیں کرنے کے انداز میں کہا — "میں انہیں پکڑوانا چاہتی ہوں۔"

رشی کی نظریں ان پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ محسوس ہی نہ کر سکی کہ انجم جو ابھی

"سٹوڈنٹ تھے" — رشی نے جھوٹ بولا — "وہ ہمارے ان نوجوانوں جیسے ہی تھے جو ہندی کلچر کے دلدادہ ہیں۔ وہ پاکستان کی محبت کی باتیں کرتے تھے۔ انڈیا میں اپنی مظلومیت کے قصے سُناتے تھے۔ میرے دل پر ایسا اثر ہوا کہ انگریزی کے اثرات کو ذہن سے اُتار دیا۔ ہو سکتا تھا کہ یہاں آکر میں پھر اسی سوسائٹی میں گھل مل جاتی، لیکن آتے ہی خاوند نے مجھے دھتکار دیا تو میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ یہ مجھے صرف اس لئے دھتکار رہا ہے کہ مَیں اس کے سامنے دوسرے لڑکوں کے ساتھ ناچتی گاتی اور ہر قسم کی خرافات میں شامل ہوتی رہی ہوں۔ اسے وہم ہو گیا ہو گا کہ میں اس کے ساتھ بیوفائی کرتی ہوں۔"

رشی بولتے بولتے چُپ ہو گئی اور چلتے چلتے رُک گئی۔ اُس کی نظریں سامنے سے آتے ہوئے ایک جوان آدمی اور اس کے پہلو میں چلتی ہوئی ایک جوان لڑکی پر جم گئیں۔ انجم تین چار قدم آگے نکل گئی۔ اُس نے گھوم کے دیکھا تو واپس رشی تک آئی۔ رشی کے چہرے کا رنگ اور تاثر بدل گیا تھا۔ اُس کی آنکھیں کسی ایک ہی مقام پر جمی ہوئی یوں کھلی تھیں جیسے کھڑے کھڑے اس پر سکتہ طاری ہو گیا ہو یا اسے ہپناٹائز کر لیا گیا ہو۔

"کیا ہوا رشی!" — انجم نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"اس لڑکی کو دیکھ رہی ہوں" — رشی نے کھوئے کھوئے سے انداز میں کہا — "مَیں اسے جانتی ہوں اور اس کے ساتھ جو آدمی ہے اسے بھی جانتی ہوں۔"

اس کے پاس کھڑی تھی، وہاں سے غائب ہو گئی ہے۔ ورما اور زینی جس طرف جا رہے تھے، رشی کی نظریں اُسی طرف گھوم کر ان کا تعاقب کر رہی تھیں۔ اسے انجم نظر آئی جو کچھ دُور عام سے ایک آدمی کے پاس کھڑی تھی۔ اُس آدمی کے ساتھ کوئی بات کر کے انجم تیز تیز قدم اُٹھاتی رشی کی طرف آئی۔ رشی نے دیکھا کہ جس آدمی کے ساتھ انجم نے بات کی تھی، وہ ٹہلتا ٹہلتا ورما اور زینی کے پیچھے پیچھے چند قدم کا فاصلہ رکھ کر چلنے لگا۔

"کون ہے یہ؟"— رشی نے پوچھا —"جس کے ساتھ تم باتیں کر رہی تھیں۔"

"میرا ایک عزیز ہے"— انجم نے جواب دیا —"میں نے ویسے ہی اُدھر دیکھا تو وہ کھڑا نظر آیا۔ اسے دیکھ کر ایک بات یاد آ گئی تھی جو اُسے بتانی تھی۔"

"کیا تم جھوٹ نہیں بول رہیں انجم؟"— رشی نے کہا —"ہم دونوں ابھی ابھی اس آدمی کے قریب سے گزر کر آئی ہیں اور اس نے ہم دونوں کو دیکھا بھی تھا۔ اب وہ ان دونوں کے پیچھے چلا گیا ہے۔ یہ کیا سلسلہ ہے انجم؟ مَیں بہت ڈری ہوئی ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو۔"

"ایک بات بتاؤ رشی!"— انجم نے پوچھا —"کیا دِلی میں تم ایک معزز آدمی فریدالدین ہاشمی کے گھر رہ کر آئی ہو اور کیا عبدالقدیر نام کا ایک معزز آدمی وہاں تمہیں ملا تھا؟"

رشی یوں بِدک اُٹھی جیسے انجم نے اُس کے پیٹ میں خنجر گھونپ دیا ہو۔ اس کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا اور اسے چکر آیا۔

"تم ہاشمی صاحب اور عبدالقدیر صاحب کو کس طرح جانتی ہو؟"— رشی نے گھٹی گھٹی سی آواز میں پوچھا۔

"ڈرو مت رشی!"— انجم نے کہا —"مَیں وہ سب کچھ جانتی ہوں جو تم سمجھتی ہو کہ مجھے معلوم نہیں ہو گا۔"

"سچ بتاؤ انجم!"— رشی نے کہا —"کیا تم مجھے کسی اور جال میں پھانسنا

چاہتی ہو یا کسی جال سے نکالنا چاہتی ہو؟"

"مَیں ابھی کچھ نہیں بتا سکتی"— انجم نے جواب دیا۔

"یہی بتا دو کہ یہ آدمی کون ہے؟"— رشی نے پوچھا —"اور تم نے اس کے ساتھ کیا بات کی تھی۔ میں تمہیں اپنی بہنوں سے بھی زیادہ عزیز سمجھتی ہوں۔"

"میں تمہیں اس آدمی سے ملوا دوں گی رشی!"— انجم نے جواب دیا— "لیکن آج نہیں۔ مجھ پر بھروسہ کرو.... چلو کہیں بیٹھ کر جاتے پیتے ہیں۔"

رشی اس کے ساتھ چل پڑی لیکن اس کا دل انجانے خوف کی گرفت میں آگیا تھا۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ ایک بار پھر اغوا ہو گی۔ انجم کے ہونٹوں پر جو مسکراہٹ آگئی تھی وہ اسے اور زیادہ پریشان کر رہی تھی۔

رِشی انجم کے ساتھ یوں چلی جا رہی تھی جیسے خواب میں چل رہی ہو۔ انجم کے چہرے پر ابھی تک بشاشت کے آثار تھے اور رِشی کا چہرہ تذبذب کا مظہر تھا۔ انجم اُسے لارنس گارڈن کے ریسٹورنٹ کے لان میں لے گئی اور دونوں لان کے ایک کونے میں رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔ انہیں دیکھ کر بیرہ دوڑا آیا۔

"بولو، کیا پیو گی؟" — انجم نے رِشی سے پوچھا — "چائے ٹھیک رہے گی؟"

"میرے لیئے اس وقت کچھ بھی ٹھیک نہیں" — رِشی نے دبے دبے سے غصّے سے کہا اور پوچھا — "تم مجھ سے کیا چھپا رہی ہو انجم؟"

"چائے لے آؤ" — انجم نے بیرے سے کہا اور اُس کے جانے کے بعد رِشی سے مخاطب ہوئی — "پریشان مت ہو رِشی! تم ٹھیک کہتی ہو کہ مَیں تم سے کچھ چھپا رہی ہوں۔ مَیں یہ راز تمہارے آگے رکھ دیتی ہوں۔

تم فریدالدین ہاشمی اور عبدالقدیر کے نام سُن کر گھبرا گئی تھیں۔ مَیں اُنہیں نہیں جانتی۔ اُن کا جاننے والا ایک آدمی دِلّی سے آیا ہے۔"

"کیا وہ بھی آدمی ہے جس کے ساتھ تم کھڑی باتیں کر رہی تھیں؟"

"نہیں" — انجم نے جواب دیا — "یہ پاکستان کی انٹیلی جنس کا آدمی ہے۔ تم جانتی ہو کہ پاکستان کی انٹیلی جنس آئی ایس آئی کے نام سے مشہور ہے۔ تمہیں یہ سُن کر پریشان نہیں ہونا چاہیئے کہ میرا تعلق بھی آئی ایس آئی کے ساتھ ہے۔ مَیں انشورنس ایجنٹ نہیں ہوں۔ یہ تو تم تک پہنچنے کا ایک بہانہ تھا۔ اصل مقصد یہ تھا کہ تمہارے ساتھ اور تمہاری ممّی کے ساتھ دوستی لگا کر رازدارانہ بے تکلفی پیدا کی جاتے۔"

"وہ تو تم نے بڑی خوبصورتی اور کامیابی سے پیدا کر لی ہے" — رِشی نے کہا — "لیکن جب تک یقین نہیں آجاتا کہ تمہارا تعلق آئی ایس آئی کے ساتھ ہے میری پریشانی ختم نہیں ہوگی۔"

بیرہ چائے لے آیا۔ اُس کے جانے تک دونوں لڑکیاں خاموش رہیں۔

"دیکھو رِشی!" — انجم نے کہا — "تم اپنے خاوند کے ساتھ انڈیا گئی تھیں اور تم دونوں کو نئی دِلّی میں اشوکا ہوٹل میں ٹھہرایا گیا تھا۔ مَیں تم سے نہیں پوچھوں گی کہ وہاں تمہارے دن اور تمہاری راتیں کس طرح گزریں۔ تمہارے اغوا سے لے کر پاکستان میں ہوائی جہاز سے اُترنے تک پوری داستان مجھ سے سُن لو۔ تم نے جب واپسی پر پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا تھا اُس وقت نئی دِلّی کا ایک آدمی ریل گاڑی سے لاہور میں داخل ہُوا تھا۔"

"کون ہے وہ؟"

"نہیں رِشی!" — انجم نے جواب دیا — "تمہارے لیئے یہ جاننا ضروری نہیں البتہ جس آدمی کے ساتھ تم نے مجھے کھڑے باتیں کرتے دیکھا تھا اُس کے ساتھ تمہیں ملوا سکتی ہوں۔"

انجم نے رِشی کو وہ تمام واقعات سُنا دیے جو اُسے نئی دِلّی میں پیش آئے تھے۔

"انجم!" — رِشی نے بے بسی کی سی کیفیت میں پوچھا — "تمہارا تعلق انڈین انٹیلی جنس سے تو نہیں؟"

"یقین کرو رِشی!" — انجم نے جواب دیا — "اگر ایسا ہوتا تو اب تک تم اغوا ہو چکی ہوتیں۔"

"تم اب کیا چاہتی ہو؟" — رِشی نے پوچھا۔

"میں بھی یہی سوال تم سے پوچھنا چاہتی ہوں" — انجم نے کہا — "مجھے یہ بتاؤ کہ تم کیا چاہتی ہو۔"

"میں انڈیا کے جاسوسوں کو پکڑوانا چاہتی ہوں" —— رِشی نے جواب دیا۔ وہ چُپ ہوگئی۔ اچانک چائے کی میز پر مُکّہ مار کر غصیلی آواز میں بولی —— "میں رابی کو پکڑوانا چاہتی ہوں۔ بلاشک وشبہ وہ انڈیا کا جاسوس ہے۔ اُسے اُس کے باپ کا تعاون بھی حاصل ہوگا۔ یہ خیال مجھے اُس وقت آیا تھا جب مجھے پتہ چلا کہ رابی انڈیا کا جاسوس ہے۔ خیال یہ آیا تھا کہ اُس کا باپ ڈیفنس ڈیپارٹمنٹ میں بڑی ذمہ دار پوسٹ کا افسر ہے۔ اُس کے محکمے میں ایسے ایسے راز ہوں گے جن کے لئے انڈیا بڑی سے بڑی قیمت دینے کو تیار ہوگا۔"

"میں تمہاری مدد کروں گی" —— انجم نے کہا —— "لیکن یہ سُن لو کہ تم نے دھوکہ دینے کی کوشش کی تو باقی عمر قید خانے میں گزارو گے .... اور یہ بھی سُن لو کہ تم انڈیا کے جاسوسوں اور تخریب کاروں کی طرف سے بھی خطرے میں ہو۔"

"اوہ!" —— رِشی نے گھبراہٹ کے عالم میں کہا —— "میں کس جال میں پھنس گئی ہوں۔"

"ڈرو نہیں رِشی!" —— انجم نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی آمیز لہجے میں کہا —— "تمہاری حفاظت کا پورا انتظام ہوگا .... کیا تم نے اپنی ممی کو نئی دِلی کی یہ ساری رُوداد سنائی ہے؟"

"ہاں!" —— رِشی نے جواب دیا —— "وہ بھی یہی چاہتی ہیں کہ پاکستان کے ان دشمنوں کو سرحد سے زندہ نہ نکلنے دیا جائے۔ پاکستان کی محبت تو اپنی جگہ ہے، ممی میں انتقام کا جذبہ بھی جوش مار رہا ہے۔ ان کم بختوں نے مجھے گھر بٹھا دیا ہے۔ ممی بھی اس کوشش میں ہیں کہ آئی ایس آئی تک رسائی ہو جائے۔ ممی کے مراسم تو کئی افسروں کے ساتھ ہیں لیکن یہ معاملہ ایسا ہے کہ اس کا ذکر ہر کسی کے ساتھ نہیں کیا جاسکتا۔"

"اب تمہیں ذریعہ مل گیا ہے" —— انجم نے کہا —— "تم نے جب اس آدمی اور اُس کے ساتھ جاتی ہوئی لڑکی کو دیکھا تھا اور رُک کر کہا تھا کہ یہ انڈیا

کے جاسوس ہیں تو میں تمہیں اکیلا چھوڑ کر فوراً اس آدمی کے پاس جا پہنچی تھی جس سے تم نے مجھے باتیں کرتے دیکھا تھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ اس آدمی اور لڑکی کا پیچھا کرو، یہ انڈیا کے جاسوس ہیں۔ مَیں نے تم سے تفصیلاً پوچھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی کہ تم کس طرح جانتی ہو کہ یہ انڈیا کے جاسوس ہیں، کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ تم انڈیا گئی تھیں اور نادانستہ طور پر تم انڈیا کے جاسوسوں کی مہمان تھیں .... اب بتاؤ تم نے انہیں کہاں اور کیسے دیکھا تھا؟"

رِشی نے اُسے بتایا کہ اس آدمی کو دلی میں دیکھا تھا اور اس کا تعارف عبدالرحمٰن کے نام سے ہُوا تھا۔ یہ بھی بتایا کہ یہ عزیز کا ساتھی ہے۔ زینی کے متعلق رِشی نے تفصیل سے بتایا کہ یہ ہے وہ لڑکی جس نے رابی کو اپنے حُسن کے جال میں لے لیا تھا۔

"یہ انڈین انٹیلی جنس کا بڑا ہی خطرناک ہتھیار ہے" —— انجم نے کہا —— "یہ لڑکی یقیناً ہندو ہوگی۔ ایسی کتنی لڑکیاں پاکستان میں موجود ہیں۔ یہ پتھروں سے بھی دُودھ نکال لیتی ہیں۔"

"ایک بات بتاؤ انجم!" —— رِشی نے پوچھا —— "تم بھی تو انٹیلی جنس میں ہو۔ کیا تم بھی ....؟"

"نہیں نہیں" —— انجم نے جواب دیا —— "میں جانتی ہوں تم کیا کہنا چاہتی ہو۔ آئی ایس آئی انڈیا کی طرح لڑکیوں کو استعمال نہیں کرتی۔ اپنی انٹیلی جنس کے ساتھ میرا تعلق کچھ اور قسم کا ہے۔"

"اب بتاؤ" —— رِشی نے پوچھا —— "یہ آدمی کون ہے جس کے ساتھ تم نے بات کی تھی؟"

"یہ بھی انٹیلی جنس کا ہی آدمی ہے" —— انجم نے جواب دیا —— "یہ میرے ساتھ آیا تھا۔ مَیں نے اسے بتایا تھا کہ میں تمہیں آج لارنس گارڈن لاؤں گی۔ یہ تو اتفاق کی بات ہے کہ انڈیا کے دو جاسوس سامنے آگئے۔ ویسے ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہم دونوں تمہیں یہاں بٹھا کر اپنا اصل تعارف

کرائیں گے اور تمہارے خیالات اور ارادوں کا جائزہ لیں گے۔ آئی ایس آئی میں اُوپر تک تمہاری پوری رپورٹ پہنچی تھی اور ہم خاص ہدایات لے کر یہاں آتے تھے۔"

❄

ایک کار گلبرگ کی چھ کنال کی ایک کوٹھی میں داخل ہوئی اور پیچھے انیکسی میں چلی گئی۔ یہ انیکسی کوٹھی کے مالکوں نے کرائے پر دے رکھی تھی۔ کار گیراج میں گئی۔ اس سے ورما اور زینی باہر آئے۔ گیراج سے نکل کر ورما نے گیراج کا گیٹ بند کر دیا اور تیز تیز چلتا، زینی کو ساتھ لئے انیکسی میں چلا گیا۔

"آ گئے!" —— ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے ایک آدمی نے پوچھا —— "کہو لڑکی! لاہور پسند آیا؟ تم پہلی بار پاکستان میں آئی ہو۔"

"پہلے ہماری سُنیں خاں صاحب!" —— ورما نے کہا —— "آج اُس کے ساتھ آمنا سامنا ہو گیا ہے۔"

"کس کے ساتھ؟"

"رابی کی رشی کے ساتھ" —— ورما نے کہا —— "ہم دُور سے دیکھ لیتے تو وہیں سے اِدھر اُدھر ہو جاتے لیکن وہ اُس وقت نظر آئی جب اُس کے اور ہمارے درمیان کچھ قدموں کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ اُس نے ہمیں اور ہم نے اُسے دیکھا اور ہم نے راستہ بدل دیا.... آپ کا کیا خیال ہے؟ اچھا ہُوا یا بُرا؟"

"بُرا بھی ہو سکتا ہے" —— خاں صاحب نے جواب دیا —— "تم رشی کی خود ہی رپورٹ لے کر آئے ہو کہ دِلی میں یہ مشکوک قسم کے مسلمانوں کے پاس رہی تھی اس لئے پاکستان میں یہ ہمارے آدمیوں کے لئے خطرہ بن سکتی ہے.... کسی نے تمہارا پیچھا تو نہیں کیا تھا؟"

"نہیں" —— ورما نے جواب دیا —— "پھر بھی میں یقین کے ساتھ

نہیں کہہ سکتا۔ یہ بتا سکتا ہوں کہ میں نے بہت دُور آ کر پیچھے دیکھا تو رشی کو ایک لڑکی کے ساتھ جو پہلے ہی اُس کے ساتھ تھی، آہستہ آہستہ کسی اور طرف جاتے دیکھا تھا۔"

"کار کی یہ نمبر پلیٹ بھی بدل دو" —— خاں صاحب نے کہا —— "پہلی نمبر پلیٹ بھی بوگس ہی ہے پھر بھی احتیاط لازمی ہے۔"

ورما کو معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ اُس کا تعاقب کیا گیا تھا۔ تعاقب میں نے والا وہ آدمی تھا جو انجم کے ساتھ تھا۔ اُس کا نام شرافت علی تھا اور وہ آئی ایس آئی کا آدمی تھا۔ ورما زینی کے ساتھ تیز تیز چلتا کار پارک تک پہنچا تھا۔ شرافت علی کے پہنچنے تک وہ کار نکال کر باہر کی طرف نکل گیا تھا۔ شرافت علی نے کار کا نمبر دیکھ لیا تھا۔ اُس کے پاس موٹر سائیکل تھا۔ جتنی دیر میں وہ موٹر سائیکل تک پہنچ سکتا کار نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ ٹریفک کے سیلاب میں کسی ایک خاص کار کو ڈھونڈنا ناممکن تھا۔

"میں چاہتا ہوں کہ اِس رشی کا بندوبست جلدی ہو جاتے" —— ورما نے کہا۔

"شہادت اور ثبوت کے بغیر کوئی بندوبست کرنا ہمارے لئے مناسب نہیں ہو گا" —— خاں صاحب نے کہا —— "ابھی ہم نے رشی کی نقل و حرکت کو دیکھنے کے لئے کوئی آدمی مقرر کیا ہی نہیں۔ اب کرنا پڑے گا۔"

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ انیکسی کے باہر ایک کار کا ہارن بجا۔

"یہ لو" —— زینی نے بڑے شگفتہ لہجے میں کہا —— "میرا منگیتر آ گیا ہے۔"

دروازے کی گھنٹی بجی۔ ورما نے بڑی بلند آواز سے کہا، آ جاؤ۔ رابی ڈرائنگ روم میں داخل ہُوا۔ خاں صاحب، ورما اور زینی نے اس طرح رابی کا پُرجوش استقبال کیا جیسے کوئی بہت بڑا آدمی اچانک اُن کے غریب خانے میں آ گیا ہو۔ رابی صوفے پر بیٹھ گئی۔ زینی اُٹھ کر آئی اور اُس

کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔

"آج اُسے دیکھا تھا رابی!" — زینی نے کہا۔

"کسے؟"

"تمہاری مسز کو" — زینی نے جواب دیا۔

"لعنت بھیجو" — رابی نے زینی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا — "وہ میری مسز نہیں رہی۔"

"تم نے کبھی غور کیا ہے؟" — خان صاحب نے کہا — "کہ رِشی ہمارے لئے خطرہ بن سکتی ہے؟"

"وہ ایسی جرأت نہیں کر سکتی" — رابی نے کہا — "دُنیا میں اُس کی صرف ماں ہے۔ آپ کہیں تو میں دونوں کو غائب کرا دُوں۔"

"اُسے طلاق دے دی ہے؟" — ورما نے پوچھا۔

"ابھی نہیں" — رابی نے جواب دیا — "طلاق ابھی دُوں گا بھی نہیں۔ اُس کی یہ دُکھتی رگ اپنے ہاتھ میں رکھوں گا۔"

"اُس پر نظر رکھنی ہے رابی!" — خان صاحب نے کہا — "ہم اُسے اپنی نگرانی میں رکھنے کا بندوبست کر رہے ہیں، لیکن تم بھی خیال رکھو۔"

"کیا دِلّی کے جن مسلمانوں کے پاس یہ رہی ہے وہ پاکستان کی انٹیلی جنس تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں؟" — رابی نے پوچھا۔

"کر سکتے ہیں" — ورما نے جواب دیا — "میرا خیال ہے کہ دِلّی میں ہماری انٹیلی جنس نے ہاشمی اور عبدالقدیر کو بری الذمہ قرار دے کر اچھا نہیں کیا تھا۔ ان دونوں کو اور ہاشمی کی بیوی کو صرف دو دن رگڑا دیتے تو وہ بول اُٹھتے کہ رِشی اُنھی کے پاس رہی ہے۔ عزیز کی بہن نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ رِشی ہمارے لئے خطرہ بن سکتی ہے۔"

"زیادہ بحث کی ضرورت ہی کیا ہے!" — خانصاحب نے کہا — "تم جس مشن پر پاکستان آتے ہو، اس میں رِشی کا بندوبست خاص طور پر شامل ہے۔"

"کوئی کام کی بات کرو رابی!" — ورما نے کہا — "کوئی تازہ انفارمیشن؟"

"ڈیڈی کے ساتھ گہری دوستی ہو گئی ہے" — رابی نے جواب دیا — "گزشتہ رات اُن کے ساتھ میں نے ایک بار پھر بڑے جذبے والے پاکستانی کی طرح باتیں کی تھیں۔ انہوں نے کچھ مزید انفارمیشن دی ہے لیکن مکمل طور پر نہیں۔ مجھے امید ہے کہ کچھ دِنوں تک ایک بڑی قیمتی فائل میرے ہاتھ میں آ جائے گی، لیکن پندرہ بیس روز انتظار کرنا پڑے گا کیونکہ ڈیڈی اسلام آباد گئے ہوتے ہیں۔"

خاں صاحب کسی کام کے بہانے ڈرائنگ روم سے باہر نکلے کچھ دیر بعد ورما بھی دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ وہ زینی اور رابی کو اکیلا چھوڑنا چاہتے تھے۔ اُن کے جاتے ہی زینی نے اپنے حُسن و جوانی کا جادو چلانا شروع کر دیا اور رابی جذباتی دُنیا کے اُوپر پھیلے ہوئے لامحدود خلا میں اُڑنے لگا۔

❄

رِشی اپنے گھر پہنچ چکی تھی اور وہ ماں کو بتا چکی تھی کہ لارنس گارڈن میں اُس نے کیا دیکھا اور انجم نے اپنی کیا اصلیت بے نقاب کی۔ اُس کی ماں نے اُس کی حوصلہ افزائی کی اور کہا کہ وہ نڈر ہو کر تمام باتیں بتاتے۔

انجم نے باغ میں ہی رِشی اور شرافت علی کو ملوا دیا تھا۔ شرافت علی نے بھی رِشی کی بہت حوصلہ افزائی کی تھی اور اُسے خراجِ تحسین بھی پیش کیا تھا کہ وہ اپنے ملک کی سلامتی کے لئے نہایت اہم کردار ادا کر رہی ہے۔ شرافت علی نے اُسے یہ بھی کہا تھا کہ اُسے آئی ایس آئی کے کسی آفیسر سے ملوایا جائے گا جو اُس سے دِلّی کی ساری باتیں تفصیل سے سُنے گا۔

تیسرے چوتھے روز انجم رِشی کے گھر آئی اور اُسے بتایا کہ آئی ایس آئی

کا ایک کرنل اگلے روز دس بجے لاہور کے دفتر میں اُسے ملے گا۔

"مَیں آجاؤں گی"— انجم نے رِشی سے کہا — "تم اور ممی تیار رہنا۔ مَیں تمہیں آئی ایس آئی کے یہاں کے دفتر میں لے چلوں گی۔"

اگلے روز آئی ایس آئی کا ایک کرنل اپنے لاہور آفس میں بیٹھا ہُوا تھا۔ اُسے یہ رپورٹ تفصیل سے دی جاچکی تھی کہ رِشی نے لارنس گارڈن میں ورما اور زَینی کو دیکھا تھا اور شرافت علی نے اُن دونوں کا تعاقب کیا تھا، لیکن وہ کار سے کر ٹریفک کے ہجوم میں گُم ہوگئے تھے۔

شرافت علی اور انجم نے اپنا پورا پورا بیان دیا تھا۔

"میجر امتیاز!"— کرنل نے اپنے پاس پرائیویٹ کپڑوں میں بیٹھے ہوئے ایک آدمی سے پوچھا — "کار کی رجسٹریشن چیک کی ہے؟"

"یس سر!"— میجر امتیاز نے جواب دیا — "مَیں نے پورا ایک دن رجسٹریشن آفس میں صَرف کیا ہے۔ یہ نمبر ایک سکوٹر کا ہے۔ اس کے مالک کے ایڈریس پر گئے تو اس نمبر کا سکوٹر ایکسیڈنٹ میں ٹوٹا ہُوا ڈیوڑھی میں پڑا تھا۔"

"اس کا مطلب یہ ہُوا"— کرنل نے کہا — "کہ نمبر پلیٹ جعلی تھی ..... رابی کی کیا رپورٹ ہے؟"

"اُس کی نقل وحرکت کو باقاعدہ دیکھا جارہا ہے"— میجر امتیاز نے ایک کوٹھی کا نمبر بتا کر کہا — "وہاں وہ چھ مرتبہ جاتا دیکھا گیا ہے۔"

میجر امتیاز نے کرنل کو بتایا کہ اُس کے مخبروں نے رابی کو اور کہاں کہاں دیکھا تھا۔

"سر!"— میجر امتیاز نے کہا — "رابی کے باپ کے متعلق مجھے کوئی حکم نہیں ملا اس لئے میں اُس کی کوئی رپورٹ نہیں دے سکتا۔"

"یہ تمہارا کام نہیں"— کرنل نے کہا — "یہ کام ہیڈ کوارٹر خود کر رہا ہے۔ اس لڑکے کا باپ زیرِ نگرانی ہے ..... میجر امتیاز! مزہ تو جب ہے کہ پُورا رِنگ ہاتھ آتے۔"

"لیکن سر!"— میجر امتیاز نے کہا — "کیا ہماری یہ حکومت اتنے بڑے افسر کو گرفتار کرے گی؟"

"ہم اپنا فرض ادا کریں گے"— کرنل نے کہا — "مَیں جانتا ہوں کہ حکومت کون کر رہا ہے۔ مارشل لاء ہو یا جمہوریت، حکومت کی باگ ڈور انہی افسروں کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ پھر بھی ہم اپنا کام پورا کریں گے۔"

اتنے میں کرنل کو اطلاع ملی کہ تین خواتین اُسے ملنے آئی ہیں۔ کرنل نے کہا کہ انہیں اندر بھیج دو۔

رِشی، اُس کی ماں اور انجم کمرے میں داخل ہوئیں۔ کرنل اور میجر امتیاز اُن کی تعظیم کو اُٹھے اور انہیں بٹھایا۔

"راشدہ آپ کا نام ہے"؟— کرنل نے رِشی سے پوچھا اور اُس کی ماں کی طرف دیکھ کر کہا — "یہ تو پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں کہ یہ آپ کی والدہ ہیں۔ انجم کو تو ہم جانتے ہیں .... کیا مَیں آپ کو رِشی کہوں؟ آپ کی سوسائٹی میں ایسے ہی نِک نیم چلتے ہیں۔"

"رِشی کے نام سے تو مجھے چِڑ سی ہوگئی ہے"— رِشی نے کہا — "راشدہ ہی کہیں تو اچھا ہے۔"

"آپ تو انڈیا کی سیر کر کے آئی ہیں"— کرنل نے کہا — "کیسی رہی وہاں کی سیر؟"

"اگر مَیں اُس سیر کو فلما سکتی تو آپ کو زیادہ لطف آتا"— رِشی نے جواب دیا — "میری سیر سُننے والی نہیں، دیکھنے والی تھی۔"

"سُنا ہی دیں"— کرنل نے مسکراتے ہُوتے کہا — "مَیں سُن تو چکا ہوں، لیکن آپ کی زبان سے ایک بار پھر سُنوں گا۔"

رِشی نے بات وہاں سے شروع کی جہاں اُنہیں کراچی میں عزیز ایک لڑکی کے ساتھ ملا تھا اور بات وہاں ختم کی جہاں اُس نے ورما اور زَینی کو دیکھا تھا۔ کرنل نے تفتیشی انداز سے رِشی سے بہت سے سوال پوچھے اور اس کا انداز جرح والا بھی تھا۔ رِشی پوری خود اعتمادی سے ہر سوال کا جواب دے رہی تھی۔

"اب میں آپ دونوں ماں بیٹی کو کچھ ضروری ہدایات دوں گا" — کرنل نے رشی اور اُس کی ماں سے کہا — "کسی اور کو نہیں بتانا کہ آپ کو یہاں بلایا گیا تھا اور کسی اور کے ساتھ بات بھی نہیں کرنی کہ آپ انڈیا کے جاسوسوں کو پکڑوا رہی ہیں یا یہ کہ رابی انڈیا کا جاسوس ہے .... راشدہ! اکیلے گھر سے باہر نہیں نکلنا۔ اپنی والدہ کو ہر جگہ اپنے ساتھ رکھیں۔ اگر آپ کا ڈرائیور ہو تو زیادہ بہتر ہے۔ اتنا زیادہ ڈرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ محتاط ہونا ضروری ہے۔ ہم آپ کی حفاظت کا انتظام کر دیں گے۔ سب سے زیادہ ضروری احتیاط یہ ہے کہ زبان بند رکھنی ہے اور کسی کے سامنے ہاشمی یا عبدالقدیر کا نام بھی نہیں لینا۔"

کرنل نے رشی کو کچھ اور ضروری ہدایات دیں اور دونوں ماں بیٹی کو رخصت کر دیا۔

❄

پرانی دِلّی میں عبدالقدیر اور فریدالدین ہاشمی کا محاذ زیرِ زمین سرگرم تھا۔ ہاشمی کی حویلی میں عبدالقدیر، حسن طارق رفیقی اور اُن کے تین ساتھی بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ان میں اشتیاق بھی تھا جو رشی اور رابی کی رپورٹ آئی ایس آئی کو دینے کے لئے دِلّی سے پاکستان گیا تھا۔ وہ اپنا کام کر گیا تھا اور اس نے یہ کام خوش اسلوبی اور کامیابی سے کیا تھا۔ جس طرح وہ پاکستان کی انٹیلی جنس کا کل پُرزہ تھا اسی طرح وہ اب ہاشمی کے زمین دوز محاذ میں شامل ہو گیا تھا۔ اُسے محمود نے اس محاذ سے متعارف کرایا تھا اور اُسے کہا تھا کہ وہ عبدالقدیر کے ساتھ براہِ راست رابطہ رکھے۔

اشتیاق نے اس میٹنگ میں بتایا کہ کس طرح اُس نے آئی ایس آئی کو رپورٹ دی تھی اور آئی ایس آئی نے کیا کارروائی کی ہے۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ انڈین انٹیلی جنس کے دو افراد، ورما اور زینی لاہور میں نظر آ گئے ہیں اور اُنہوں نے رشی کو بھی دیکھ لیا ہے۔

"رشی کے متعلق کیا رپورٹ ہے؟" — عبدالقدیر نے پوچھا — "کیا وہ دیانتداری سے پاکستان کی انٹیلی جنس کا ساتھ دے رہی ہے؟"

"پوری دیانتداری سے" — اشتیاق نے جواب دیا — "اور امید ہے کہ وہ دھوکا نہیں دے گی۔ یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ اُسے بہت بڑی چوٹ یہ پڑی ہے کہ رابی نے اُسے طلاق دیئے بغیر اپنے گھر سے نکال دیا ہے۔ رشی کی ماں بھی ان لوگوں کے خلاف بھڑکی ہوئی ہے۔ وہ اثرورسوخ والی اور سوسائٹی میں گھومنے پھرنے والی عورت ہے اور وہ آئی ایس آئی کے ساتھ پُورا پُورا تعاون کر رہی ہے۔"

"میرے دوستو!" — عبدالقدیر نے محاذ کے اس اجلاس کو باقاعدہ طور پر مخاطب کر کے کہا — "بھائی اشتیاق کی رپورٹ آپ سب نے سُن لی ہے۔ اب آپ کو مایوسی سے یہ نہیں کہنا چاہیئے کہ ہم محض جذباتی باتیں کر رہے ہیں۔ آپ نے دیکھ لیا ہے کہ ہمارے محاذ کی پہلی ہی کارروائی کتنی کامیاب ہوئی ہے۔ پاکستان میں انڈین انٹیلی جنس کے صرف ایک رِنگ کو توڑ کر اس کے تمام ممبروں کو پکڑوا دینا کوئی معمولی بات نہیں۔ یہ محمود غزنوی کا دَور نہیں کہ فوج اکٹھی کر کے سومنات پر حملہ کریں گے اور ہندوستان کا سب سے بڑا بُت خانہ توڑ دیں گے۔ مَیں انٹیلی جنس میں رہا ہوں اس لئے صرف میں ہی سمجھ سکتا ہوں کہ دشمن کے جاسوسوں کے ایک رِنگ کو توڑ دینا سومنات کا بُت توڑ دینے کے برابر ہوتا ہے ...."

"اگر عزیز پاکستان چلا جاتا تو اس کا بندوبست ہو گیا تھا" — اشتیاق نے کہا — "لیکن اس کی جگہ ورما کو بھیجا گیا ہے۔"

"اب میں کام کی باتوں کی طرف آتا ہوں۔ ہمارا اصل دشمن یہیں موجود ہے .... اب اس کا بندوبست کرنا ہے۔"

"یہیں" — عبدالقدیر نے اپنے زانو پر ہاتھ مار کر کہا — "اس کا بندوبست یہیں کریں گے اور یہ کارِ خیر ہمارے ہاتھوں ہو گا۔ مَیں نے اور ہاشمی صاحب نے آج آپ کو اسی لئے بلایا ہے کہ عزیز کی تازہ کارستانی بلکہ غنڈہ گردی آپ کے آگے رکھی جاتے۔"

سب چونک پڑے۔ عزیز کو وہ پاکستان کا ہی نہیں بلکہ انڈیا کے مسلمانوں کا بھی دشمن سمجھتے تھے۔ ہاشمی اور عبدالقدیر نے تو اُسے اپنا ذاتی دشمن سمجھنا شروع کر دیا تھا۔

"عزیز نے اپنے بہنوئی جمیل کو ایک دن اُس کے دفتر جا کر دھمکیاں دی ہیں" — عبدالقدیر نے کہا — "دھمکیاں بھی ایسی کہ مَیں تمہیں بغیر مقدمے کے کئی سالوں تک انٹیلی جنس کی حوالات میں رکھوں گا اور تمہارے بچوں کو بھکاری بنا دوں گا۔"

"اس بدبخت کا بندوبست تو پھر فوراً کرنا پڑے گا" — رفیقی نے کہا۔

"پھڑکیں نہیں رفیقی بھائی!" — عبدالقدیر نے کہا — "سوچ سمجھ کر کوئی کارروائی کرنی ہے۔ ابھی تو مَیں نے آپ کو پوری رپورٹ دی ہی نہیں۔ اس شخص نے ہاشمی صاحب کو بھی ایسی ہی دھمکیاں دی ہیں.... یہ تین روز پہلے کا واقعہ ہے۔ عزیز ہاشمی صاحب کے گھر آیا تھا.... ہاشمی صاحب! بہتر ہے کہ یہ واقعہ آپ خود ہی انہیں سنائیں۔"

"مَیں ہی سناؤں تو بہتر ہے" — ہاشمی نے کہا — "شام چار سوا چار بجے عزیز میرے گھر آیا۔ میں تو اُسے دیکھ کر جل اُٹھا پھر بھی اُسے احترام سے بٹھایا اور پوچھا کہ وہ کیسے آیا ہے۔ اُس نے کہا کہ وہ بڑی ضروری بات کرنے آیا ہے۔"

❄

ہاشمی نے اپنے محاذ کے ان آدمیوں کو یہ واقعہ اس طرح سنایا کہ عزیز خلافِ توقع آن ٹپکا۔ ہاشمی نے اُسے اندر بٹھایا اور اس کے آنے کا مقصد پوچھا۔

"ہاشمی صاحب!" — عزیز نے کہا — "نہایت ضروری بات کرنے آیا ہوں۔ آپ اور عبدالقدیر صاحب آگ کے ساتھ کھیل رہے ہیں۔ اگر آپ بچے ہوتے تو مَیں صرف یہ کہہ کر خاموش ہو جاتا کہ یہ آگ آپ کو جلا دے گی لیکن آپ دیدہ دانستہ اپنے انجام سے بے خبر بڑا ہی خطرناک کھیل کھیل رہے

ہیں۔ آپ بچے نہیں، دانا انسان ہیں۔ عقل اور ہوش سے کام لیں۔"

"عزیز بھائی!" — ہاشمی نے طنزیہ مسکراہٹ سے کہا — "تمہاری یہ باتیں سُن کر مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے کہ ہمارے ہاتھوں میں پلا ہوا بچہ دانشمندی کی باتیں کر رہا ہے۔ مجھے تمہارا بچپن اور لڑکپن اچھی طرح یاد ہے عزیز! .... مگر آج مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں تمہارے سامنے طفلِ مکتب ہوں۔ پہلے یہ تو بتا دو کہ وہ کون سی آگ ہے جس کے ساتھ میں اور بھائی عبدالقدیر کھیل رہے ہیں؟"

"اسے جہنم کی آگ سمجھیں ہاشمی صاحب!" — عزیز نے کہا۔

"جہنم میں ہی تو ہماری زندگی گزر رہی ہے" — ہاشمی نے کہا — "انڈیا یہاں کے مسلمانوں کے لئے جہنم ہی تو ہے .... کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ تم مطلب کی بات پر آ جاؤ!"

"مطلب کی بات سُن لیں" — عزیز نے کہا — "پاکستان کو دماغ سے نکال دیں۔"

"وہ کیوں؟"

"وہ اس لئے کہ پاکستان آپ کو پھانسی کے تختے سے نہیں اُتار سکے گا" — عزیز نے کہا — "اگر آپ پھنس گئے تو کوئی ایک بھی پاکستانی آپ کی مدد کو نہیں آئے گا۔ میری بات غور سے سُنیں ہاشمی صاحب!"

"مَیں سُن رہا ہوں" — ہاشمی نے کہا — "یہ جانتے ہوئے کہ شیطان بول رہا ہے، مَیں پھر بھی سُن رہا ہوں، لیکن بات مختصر اور مطلب کی کرو۔"

"مختصر بات یہ ہے کہ آپ پاکستان کی انٹیلی جنس کے لئے کام کر رہے ہیں" — عزیز نے کہا — "آپ نے ایک پاکستانی لڑکی جس کا نام رشی ہے، اغوا کر کے اپنی اس حویلی میں رکھی تھی۔"

"یہ معاملہ تو کبھی کا ختم ہو چکا ہے" — ہاشمی نے کہا — "پھر تم کیوں یہ قصہ لے کر میرے ہاں آ گئے ہو؟ کیا تم اب بھی جھوٹ بولو گے کہ تم انڈین انٹیلی جنس کے ایجنٹ نہیں؟"

"نہیں ہاشمی صاحب!" ـــ عزیز نے کہا ـــ "میں اب جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میں انڈین انٹیلی جنس کا ایک اہم فرد ہوں اور یہی میری پاور ہے ورنہ میں کسی کے گھر جا کر ایسی دھمکیاں دینے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔"

"پھر دھمکیاں دینے کی کیا ضرورت ہے؟" ـــ ہاشمی نے کہا ـــ "میرے خلاف اور بھائی عبدالقدیر کے خلاف سرکاری طور پر کارروائی کرو۔"

"آپ میرے بزرگ ہیں" ـــ عزیز نے کہا ـــ "آپ مسلمان بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ آپ کو اس جہنم میں ڈالوں جہاں سے کوئی زندہ نہیں نکل سکتا اور جو زندہ نکل آتا ہے، وہ جسمانی یا ذہنی یا دونوں لحاظ سے مفلوج اور معذور ہو کر نکلتا ہے۔"

"کیا تمہارے دل میں بھی مسلمانوں کی ہمدردی ہے؟" ـــ ہاشمی نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"کیوں؟" ـــ عزیز نے کہا ـــ "کیا آپ مجھے مسلمان نہیں سمجھتے؟"

"نہیں" ـــ ہاشمی نے کہا ـــ "تمہارے اعمال بتا رہے ہیں کہ تمہاری ولدیت اور تمہاری قومیت مشکوک ہے۔ بہرحال جو بات کہنے آتے ہو، وہ کہو۔"

"ہاشمی صاحب!" ـــ عزیز نے کہا ـــ "کوشش کریں کہ میرے دل میں آپ کا احترام برقرار رہے۔ جو ہو گیا سو ہو گیا۔ آئندہ انٹیلی جنس کے معاملات میں دخل نہ دیں۔ اگر میں نے آپ کو گولی مار دی تو مجھے پوچھنے والا کوئی نہیں۔ آپ نے میرے محکمے میں مجھے ذلیل و خوار کر دیا ہے اور میری بہن اور بہنوئی کو میرا دشمن بنا دیا ہے۔"

"تم نے اپنے بہنوئی کو جو دھمکیاں دی ہیں وہ ہم تک پہنچ چکی ہیں" ـــ ہاشمی نے کہا ـــ "ہم تمہیں ان دھمکیوں کا جواب دیں گے۔ اب میرا چیلنج سن لو۔ تم نے سچ بولا ہے کہ تم ہندوؤں کی انٹیلی جنس کے ایجنٹ ہو۔ میں بھی سچ بولوں گا لیکن ابھی نہیں .... تمہیں کچھ اور کہنا ہے؟"

"ہاں" ـــ اس نے کہا ـــ "آخری بات یہ کہنی ہے کہ میں ذاتی طور پر انتقام لینے پر آ گیا تو آپ کی اور عبدالقدیر صاحب کی لاشیں نہیں ملیں گی" ـــ وہ اٹھا اور بولا ـــ "میں آپ کو ایک ہفتے کی مہلت دیتا ہوں۔ آج جمعرات ہے۔ اگلی جمعرات کی شام، میں اسی وقت یہاں آؤں گا اور آپ کی زبان سے یہ الفاظ سنوں گا کہ عزیز بھائی! ہم نے تمہاری بات سمجھ لی ہے اور اس پر عمل کریں گے۔"

"کیا اس کا جواب ابھی نہ دے دوں؟" ـــ ہاشمی نے پوچھا۔

"ایسی کوئی جلدی نہیں ہاشمی صاحب!" ـــ عزیز نے کہا ـــ "سوچ لیں۔ اچھی طرح سوچ کر جواب دیں۔"

عزیز نے اپنی پتلون کی جیب سے چھوٹا سا پستول نکالا اور اسے ہاتھ میں اچھالنے لگا۔

"یہ ہر وقت میرے پاس رہتا ہے" ـــ عزیز نے مسکراتے ہوئے کہا ـــ "میں اس کے استعمال میں آزاد ہوں۔"

وہ مسکراتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

❄

"سن لیا آپ نے؟" ـــ عبدالقدیر نے محاذ کے افراد سے کہا ـــ "کیا ہمیں اس شخص سے ڈر جانا چاہیئے؟"

"ڈر گئے تو بات ہی ختم ہو گئی" ـــ محاذ کے ایک رکن نے کہا ـــ "کفر کی دھمکیوں سے ڈر گئے تو ہم مسلمان تو نہ ہوتے۔ یہ بتائیے کہ آپ نے کیا سوچا ہے۔ ہم تو آپ کے حکم کے منتظر ہیں۔"

"اب یہ تیسری رپورٹ ہے جو میں آپ کو سنانے لگا ہوں" ـــ عبدالقدیر نے کہا ـــ "آپ کو معلوم ہے کہ اشوکا ہوٹل کا ایک مسلمان بیرہ ہمارا آدمی ہے۔ کل ہی اس نے ہمیں بتایا ہے کہ پاکستان سے ایک اور نوجوان امیرزادہ دلی لایا گیا ہے اور اسے عزیز کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ ہمارے اس بیرے نے اس کمرے کو بھی اپنی ذمہ داری میں لے لیا ہے جس

میں اُس لڑکے کو ٹھہرایا گیا ہے۔ ہم نے ایک سکیم تیار کی ہے جس کا دارومدار اس بیرے کی رپورٹ پر ہے۔ اگر بیرے نے ہمیں بروقت اطلاع دے دی تو ہماری سکیم انشاءاللہ کامیاب ہوگی۔ میں نے بیرے کو ایک ٹیلیفون نمبر دے دیا ہے۔"

عبدالقدیر نے حاضرین کے کہنے پر سکیم بتائی پھر اس پر تبادلہ خیالات ہونے لگا۔ ہر کسی نے اپنی اپنی تجویز اور مشورے پیش کئے۔ عبدالقدیر جہاں دیدہ اور تجربہ کار آدمی تھا۔ سکیم خاصی خوفناک تھی۔ اس کے ناکام ہونے کے امکانات زیادہ تھے لیکن عبدالقدیر کہتا تھا کہ یہ خطرہ مول لینا ہی پڑے گا۔ سکیم کو آخری شکل دے دی گئی۔

اس سے تیسرے روز کا واقعہ ہے۔ صبح کے دس بج رہے تھے۔

❄

تین آدمی ہمایوں کے مقبرے کے بیرونی دروازے میں کھڑے تھے۔ انہیں کم و بیش دو گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔ وہ مایوس ہو چکے تھے کہ ان میں سے ایک نے کہا، وہ آگیا۔

وہ عزیز تھا اور اس کے ساتھ ایک نوجوان تھا جو چال ڈھال، لباس اور لمبے بالوں سے راہی کی قبیل کا معلوم ہوتا تھا۔ وہ دونوں مقبرے کے دروازے کی طرف آرہے تھے۔ تینوں آدمی مقبرے کے احاطے کے اندر چلے گئے اور بکھر گئے۔ تینوں عزیز کو دیکھ رہے تھے کہ وہ کدھر جاتا ہے۔ عزیز کے ساتھ جو نوجوان تھا وہ وہی پاکستانی لڑکا ہو سکتا تھا جس کے متعلق بیرے نے عبدالقدیر کو بتایا تھا کہ پاکستان سے لایا گیا ہے اور اس کی برین واشنگ کے لئے عزیز کے حوالے کیا گیا ہے۔ یہ اُسی سلسلے کی ایک اور کڑی تھی جس میں راہی کو دِلّی لایا گیا تھا۔ چونکہ پاکستان سے لاتے ہوئے نوجوان کو پہلے سیر سپاٹا کرایا جاتا ہے، اس لئے بیرے نے ان سے معلوم کر لیا تھا کہ آج وہ کدھر جائیں گے۔ عزیز نے اُسے بتا دیا تھا کہ وہ کہاں کہاں جائیں گے۔ ان جگہوں میں لال قلعہ اور ہمایوں کا مقبرہ بھی

شامل تھے۔

بیرے نے عبدالقدیر کے دیتے ہوئے ٹیلیفون نمبر پر اطلاع دے دی تھی۔ وہ یہ تو نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ پہلے کہاں جائیں گے اور کس ترتیب سے سیر کریں گے۔ میٹنگ میں طے کی ہوئی سکیم کے مطابق محاذ کے تین آدمی ہمایوں کے مقبرے پر چلے گئے۔ سکیم پر عمل کرنے کے لئے وہی جگہ موزوں تھی۔ یہ تینوں مقبرے کے اندر چلے گئے اور فصیل کے ساتھ ساتھ گھوم پھر کر ایک موزوں جگہ دیکھ لی۔

ہمایوں کا مقبرہ لاہور میں جہانگیر کے مقبرے کی طرح وسیع و عریض ہے بلکہ اس کا رقبہ جہانگیر کے مقبرے سے زیادہ ہے۔ فصیل قلعے کی دیوار جیسی ہے۔ اس کی اندرونی طرف بغیر دروازوں کے کمرے بنے ہوتے ہیں۔ بعض کمرے چھوٹے اور بعض بڑے ہیں جو تاریک ہیں۔ یہ خالی پڑے رہتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں جب انگریزوں نے غداروں کی خفیہ مدد سے دِلّی کا قلعہ بند شہر فتح کر لیا تھا تو مغلیہ خاندان کا آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر قلعے سے بھاگ کر ہمایوں کے مقبرے میں جا چھپا تھا۔ اُس کے ساتھ اُس کی ایک جوان سال بیوی تھی جس کے ساتھ اُس نے بڑھاپے میں شادی کی تھی اور اُس کے دو بیٹے بھی ساتھ تھے مگر غدّاروں نے یہاں بھی دھوکہ دیا اور بہادر شاہ ظفر کو انگریزوں کے حوالے کرا دیا تھا۔

عبدالقدیر اور ہاشمی کے محاذ کے تین آدمی عزیز کو دیکھتے رہے۔ وہ پاکستانی نوجوان کو ہمایوں کی قبر دکھانے کے لئے لے گیا۔ وہاں سے باہر آیا تو فصیل کی طرف چلا گیا۔ تینوں آدمی ان کے پیچھے گئے۔ کچھ اور لوگ مقبرے کی سیر کو آتے ہوتے تھے۔ وہ چونکہ چھٹی کا دن نہیں تھا اس لئے لوگ کم تھے۔ عزیز ایسی جگہ چلا گیا جہاں لوگ نہ ہونے کے برابر تھے۔

تینوں آدمیوں نے اپنے کندھوں پر فلسطینی حریت پسندوں جیسے بڑے رومال ڈال رکھے تھے۔ انہوں نے رومال اپنے سروں پر ڈال لیے اور ہر ایک نے اس طرح بُکل مار لی کر ان کے چہرے ڈھانپے گئے صرف آنکھیں نظر آتی تھیں۔ وہ تو مایوس ہو گئے تھے کہ ان کی سکیم کامیاب نہیں ہو گی لیکن ان کا شکار موزوں جگہ پر پہنچ گیا تھا۔ یہ جگہ عبدالقدیر کی سکیم کے عین مطابق تھی۔

تینوں عزیز کے پیچھے جا پہنچے۔ پاکستانی نوجوان اُس کے ساتھ جا رہا تھا۔ ایک آدمی نے پاکستانی کو بازو سے پکڑا اور وہیں روک لیا۔ عزیز نے اِدھر دیکھا۔ دو آدمی اُس کے ساتھ لگ گئے۔ دونوں کے ہاتھوں میں لمبے بلیڈوں والے چاقو تھے۔ انہوں نے عزیز کو اس طرح چاقو دکھائے کہ صرف وہی دیکھ سکا۔ اگر کوئی پاس سے گزر رہا ہوتا تو اُسے چاقو نظر نہ آتے۔

"خاموشی سے آگے آگے چلے چلو" — ایک نقاب پوش نے اُسے کہا۔

"ہاتھ اپنی کسی جیب میں نہ لے جانا" — دوسرے نے کہا۔ اُسے معلوم تھا کہ عزیز اپنے پاس میگزین والا پستول رکھتا ہے۔

تیسرے آدمی نے پاکستانی نوجوان کو دُور ہی روکے رکھا اور اُسے کہا کہ یہیں کھڑا رہے۔

اُس نقاب پوش کے دونوں ساتھی عزیز کو آگے لگا کر لے جا رہے تھے۔

"تم کون ہو بھائی!" — عزیز نے پوچھا — "چاہتے کیا ہو؟"

"تمہیں یہی بتانا ہے کہ ہم کیا چاہتے ہیں" — ایک نے کہا — "لیکن یہاں نہیں"

وہ اُسے فصیل کے ساتھ بنے ہوئے کمروں میں سے ایک میں لے گئے۔ وہ اُسے آہستہ آہستہ ہانک کر لے جا رہے تھے۔

"تم پاکستانی ہو نا!" — تیسرا ساتھی پاکستانی نوجوان سے پوچھ رہا تھا

"اشوکا ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہو؟"

"ہاں!" — لڑکے نے جواب دیا — "میں پاکستانی ہوں"

"تم انڈیا کے جاسوس بننے آتے ہو" — تیسرے آدمی نے کہا — "ویزا ختم ہونے سے پہلے انڈیا سے نکل جانا اور وہاں اپنے ساتھیوں سے کہنا کہ کسی مشکوک آدمی کو دوست سمجھ کر اُس کے ساتھ انڈیا کی سیر کو نہ آئیں"

اُس کے دونوں ساتھی اندھیرے کمرے سے باہر آتے۔ اُن کے چہرے ابھی تک ڈھکے ہوئے تھے۔ انہوں نے پاکستانی نوجوان کو ساتھ لیا اور اُسے کچھ دُور لے آئے۔

"اب آہستہ آہستہ اُس کمرے تک جاؤ جہاں ہم تمہارے دوست کو لے گئے تھے" — ایک نے پاکستانی نوجوان سے کہا — "ہندوؤں کا جاسوس بننے سے پہلے واپس چلے جانا .... جاؤ"

❄

پاکستانی نوجوان اُس کمرے کی طرف چل پڑا جس میں دو آدمی عزیز کو لے گئے تھے۔ اُس نے دیکھا کہ عزیز فرش پر پڑا ہے۔ لڑکے نے قریب جا کر دیکھا۔ اُسے بلایا پھر ہلایا لیکن عزیز نہ بولا نہ اُس نے کوئی حرکت کی۔ اُس کی نبض دیکھی۔ نبض خاموش تھی۔ دل پر ہاتھ رکھا۔ دل خاموش تھا۔ عزیز کا مُنہ کُھلا ہُوا اور آنکھیں بھی کُھلی ہوئی تھیں — انڈین انٹیلی جنس اپنے ایک ایجنٹ سے محروم ہو چکی تھی۔

پاکستان کا یہ نوجوان جو بھارت کی "را" کی خفیہ سکیم کے تحت جاسوس اور تخریب کار بننے گیا تھا، ایسا گھبرایا کہ اُس کا پسینہ نکل آیا۔ اُس کی شخصیت خام تھا۔ کردار کمزور تھا۔ اُسے کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اُس کے ہوش اُڑ گئے۔ اچانک اُسے خیال آگیا کہ اُسے کچھ کرنا چاہیے ورنہ اُسی پر شک کیا جا سکتا ہے کہ عزیز کو اُسی نے قتل کیا ہے۔

اُس کی گھبراہٹ میں اضافہ ہو گیا۔ وہ دوڑ کر باہر آیا۔ وہ اُن نقاب پوشوں

کو دیکھنے نکلا تھا جن میں سے ایک نے اُسے باہر روک لیا اور دو عزیز کو کمرے میں لے گئے تھے۔ وہ تینوں اُسے نظر نہ آتے۔ وہ غائب ہو گئے تھے دو آدمی باہر گھوم پھر رہے تھے۔ پاکستانی نوجوان نے انہیں روک کر بتایا کہ وہ پاکستان سے انڈیا کی سیر کو آیا ہے اور اپنے ایک ہندوستانی دوست کے ساتھ یہ مقبرہ دیکھنے آیا تھا۔ اُس نے تفصیل سے بتایا کہ "تین نقاب پوش چاقو دکھا کر کیا کر گئے ہیں۔

دونوں آدمی کمرے تک گئے لیکن اندر نہ گئے۔ نیم تاریکی میں انہوں نے لاش دیکھی اور واپس آ گئے۔

"پولیس سٹیشن جاؤ بھائی!" ــــ ان میں سے ایک نے کہا ــــ "ہم اس چکر میں نہیں پڑیں گے" ــــ اُس نے اپنے ساتھی کو بازو سے پکڑ کر کہا ــــ "چلو بھائی یہاں سے .... پولیس ہمیں بھی روک لے گی"۔

وہ لڑکے کو تھانے کا راستہ بتا کر وہاں سے کھسک گئے۔

عبدالقدیر اور ہاشمی کے محاذ کے دو آدمی عزیز کو کمرے میں لے گئے تھے۔ عزیز نے اُن سے ایک بار پھر پوچھا کہ وہ چاہتے کیا ہیں۔ اُس نے انہیں یہ بھی کہا کہ اُس کے پاس جو رقم ہے وہ لے لیں۔ سونے کی انگوٹھی ہے، بڑی قیمتی گھڑی ہے۔

"تم نے ہاشمی صاحب کو الٹی میٹم دیا تھا" ــــ ایک نقاب پوش نے کہا ــــ "تم نے انہیں جمعرات کی شام جواب دینے کو کہا تھا۔ ہم تمہیں دو دن پہلے جواب دے رہے ہیں"۔

اس دوران دوسرا نقاب پوش اُس کے پیچھے ہو گیا۔ اُس نے جیب سے رومال نکالا اور تین چار سیکنڈ میں اسے مروڑ کر عزیز کے گلے میں ڈال دیا۔ عزیز نے وہاں سے ہٹنے کی کوشش کی۔ دوسرے آدمی نے اُسے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ عزیز کی گردن کے گرد رسّی جیسے رومال کا پھندہ تنگ ہو گیا پھر یہ پھندہ کھنچنے لگا۔ عزیز کے جسم نے بے جان ہونے میں

زیادہ وقت نہ لگایا۔ دونوں اُس کی لاش وہیں پھینک کر باہر آ گئے۔ انہوں نے چاقو ڈرانے کے لئے اور اپنے دفاع کے لئے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ اگر وہ عزیز کو چاقوؤں سے قتل کرتے تو اپنے کپڑوں کو خون کے چھینٹوں سے نہیں بچا سکتے تھے۔

وہ بھی یہی تین آدمی تھے جو دلّی میں رشی کو کار میں عزیز کی کوٹھی تک لے گئے تھے۔ عزیز اور رابی نے اپنی کار میں ان کا تعاقب کیا اور ان کی کار کا راستہ روک لیا تھا۔ اس کار سے دو نقاب پوش نکلے اور انہوں نے عزیز اور رابی کی پٹائی کر دی تھی۔ وہ یہی دو آدمی تھے جنہوں نے عزیز کو قتل کیا۔ ان کے پاس کار بھی وہی تھی۔

جس طرح وہ اُس رات رشی کو عزیز کی کوٹھی میں چھوڑ کر اور عزیز اور رابی کے چہروں پر گھونسوں کے نشان چھوڑ کر کامیابی سے نکل آتے تھے، اسی طرح آج عزیز کو ہمیشہ کی نیند سُلا کر ہمایوں کے مقبرے سے دُور نکل گئے۔

جب پولیس پاکستانی نوجوان کی رہنمائی میں عزیز کی لاش اُٹھوا کر پوسٹمارٹم کے لئے بھجوا رہی تھی، اُس وقت یہ تینوں آدمی عبدالقدیر کے گھر میں بیٹھے اُسے بتا رہے تھے کہ انہوں نے اپنا کام پورا کر دیا ہے اور کس طرح کیا ہے۔

❄

رابی کا باپ چند دنوں کے لئے اسلام آباد سے لاہور آیا ہوا تھا۔ کور کمانڈر کے ساتھ اُس نے بڑی لمبی ملاقات کی تھی، پھر وہ لاہور میں مقیم دونوں ڈویژن کمانڈروں سے ملا تھا۔ وہ کسی بڑے ہی اہم کام کے لئے آیا تھا جو خفیہ تھا۔

ایک روز وہ اپنی کوٹھی میں سٹڈی میں بیٹھا کام کر رہا تھا۔ وہ اپنے ساتھ جو دو فائلیں لایا تھا وہ ٹاپ سیکرٹ تھیں۔ وہ رپورٹ تیار کر رہا تھا کہ ایک فون آگیا۔ اسلام آباد سے اطلاع دی گئی کہ دو امریکی مشیر جن کا تعلق

ڈیفنس کے ساتھ تھا، لاہور پہنچ رہے ہیں اور وہ ایئرپورٹ پر ان کا استقبال کرے اور انہیں ہوٹل میں ٹھہرا کر ان سے بات چیت کرے۔

اُس نے ایئرپورٹ فون کر کے فلائٹ کا وقت پوچھا۔ فلائٹ صحیح وقت پر آ رہی تھی۔ وقت تھوڑا رہ گیا تھا۔ اُس نے فائلیں بریف کیس میں رکھیں اور رابی کی ماں کو بتا کر کہ وہ دو تین گھنٹوں کے لیے جا رہا ہے، ڈرائیور کو بلایا اور ایئرپورٹ کو چلا گیا۔

ان امریکی مشیروں کو وہ جانتا تھا۔ انہیں وہ ایئرپورٹ سے ہوٹل لے گیا، دوپہر کا کھانا اُس کے ساتھ کھایا۔ وہ جس کام کے لیے آئے تھے اُس کے متعلق بات چیت ہوتی رہی اور شام کے پانچ بجے فراغت ہوئی۔

گھر کو واپس آتے ہوئے اُسے ایک دوائی یاد آگئی جو وہ کھا رہا تھا۔ یہ ختم ہو گئی تھی۔ اُس نے ایک کیمسٹ کی دکان کے آگے گاڑی رکوائی اور دکان میں چلا گیا۔ یہ دکان اُس کی کوٹھی کے قریب تھی۔ اس کیمسٹ نے فوٹوسٹیٹ مشین بھی رکھی ہوئی تھی۔ رابی کا باپ دکان میں گیا تو اُسے رابی نظر آیا۔ وہ فوٹوسٹیٹ مشین کے ساتھ لگ کر کھڑا تھا اور مشین سے کاغذ نکل رہے تھے۔

"کیا ہو رہا ہے رابی؟"۔۔۔ باپ نے رابی کے قریب جا کر پوچھا۔

رابی نے بدک کر باپ کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ چند سیکنڈ تو وہ بول ہی نہ سکا۔ باپ نے فوٹوسٹیٹ مشین کی طرف دیکھا تو اُس کا رنگ بھی اُڑ گیا۔ مشین کے پاس اُس کی ٹاپ سیکرٹ فائل پڑی تھی اور اس میں سے کئی کاغذات باہر نکلے ہوئے تھے اور رابی ان کی فوٹوسٹیٹ کاپیاں کروا رہا تھا۔ تقریباً آدھے کاغذات کی کاپیاں ہو چکی تھیں۔ باپ نے بڑی تیزی سے یہ تمام کاغذات اور اُن کی فوٹوسٹیٹ کاپیاں سمیٹیں اور فائل میں ڈال کر فائل اپنی بغل میں لے لی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟"۔۔۔ اُس نے رابی سے پوچھا۔

"اوہ ڈیڈی!"۔۔۔ رابی نے یکلخت بیدار سا ہو کے جواب دیا۔۔۔

"میں آپ کو بتاتا ہوں۔ میرے کچھ دوست میری باتوں پر یقین نہیں کرتے۔ میں اُن کے لیے۔۔۔"

"تم چل کر گاڑی میں بیٹھو"۔۔۔ باپ نے رابی سے کہا۔ رابی باہر کی طرف چل پڑا تو باپ نے کیمسٹ سے پوچھا۔۔۔ "کیا یہ پہلے بھی اس قسم کی فائلیں فوٹوسٹیٹ کے لیے یہاں لاتا رہا ہے؟"

"کیوں ملک صاحب!"۔۔۔ کیمسٹ نے پوچھا۔۔۔ "کیا یہ کوئی دفتری کاغذات ہیں یا کوئی اور بات ہے؟ میں رابی کو جانتا ہوں۔ یہ آپ کا بیٹا ہے۔"

"نہیں نہیں"۔۔۔ باپ نے شگفتہ سے لہجے میں جواب دیا۔۔۔ "یہ کوئی غلط حرکت نہیں کر رہا تھا۔ میں تو اسے ٹریننگ دے رہا ہوں۔ میں نے اس لیے پوچھا ہے کہ یہ بے احتیاطی سے کاغذات گم نہ کر دے۔"

رابی کا باپ جہاندیدہ، ذمہ دار اور دیانتدار آدمی تھا۔ اپنے بیٹے کو یہ کام کراتے دیکھ کر اُس کا ذہن فوراً تہہ تک پہنچ گیا تھا۔ کیمسٹ سے صحیح بات اگلوانے کے لیے اُس نے ایسی باتیں کیں جیسے یہ کاغذات عام سی نوعیت کے تھے۔

"ہاں ملک صاحب!"۔۔۔ کیمسٹ نے کہا۔۔۔ "رابی پہلے بھی چند مرتبہ اسی قسم کے کاغذات کی فوٹوسٹیٹ کاپیاں کرواتا رہا ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ رابی انڈیا گیا تھا۔ جانے سے کچھ دن پہلے بھی اُس نے ایک فائل میں سے کاغذ نکلوا کر ان کی فوٹوسٹیٹ کاپیاں کروائی تھیں۔"

"یہ جو کاپیاں ہو چکی ہیں ان کے کتنے پیسے بنتے ہیں؟"۔۔۔ رابی کے باپ نے پوچھا۔

کیمسٹ نے جو پیسے بتائے وہ رابی کے باپ نے ادا کئے، اپنی دوائی لی اور باہر جا کر گاڑی میں رابی کے ساتھ بیٹھ گیا۔

"آپ تو پریشان ہو گئے ہیں ڈیڈی!"۔۔۔ گاڑی چلی تو رابی کی زبان

بھی چل پڑی۔ وہ کہہ رہا تھا ——— "میرے دوست مانتے ہی نہیں کہ
گورنمنٹ آف پاکستان، پاکستان کے ڈیفنس کے لئے بہت کچھ کر رہی ہے۔
مَیں تو اب پاکستان کی سلامتی کے سوا اور کوئی بات ہی نہیں کرتا۔ میرے دوست
میرا مذاق اُڑاتے ہیں لیکن مَیں ان میں پاکستانی جذبہ پیدا کرنے کی کوشش
کر رہا ہوں۔ آج آپ کی اس فائل میں کچھ اعداد و شمار دیکھے تو میں نے سوچا
کہ ان کی فوٹوسٹیٹ کاپیاں کروا کے اپنے دوستوں کو دکھاؤں گا۔۔۔"

باپ نے اُسے انگریزی میں کہا کہ وہ گاڑی میں کوئی بات نہ کرے
کیونکہ ڈرائیور سن رہا ہے۔ گھر دُور نہیں تھا۔ گھر پہنچ کر رابی کو باپ اپنی سٹڈی
میں لے گیا اور بٹھا لیا۔

"تم نے یہ فائل کہاں سے لی تھی؟" —— اُس نے رابی سے پوچھا۔

"آپ کے بریف کیس میں سے" —— رابی نے جواب دیا۔

"بریف کیس کا تالا نمبروں والا ہے" —— باپ نے کہا —— "اور مجھے
یقین ہے کہ میرے سوا گھر میں کسی کو بھی معلوم نہیں کہ تالا کس نمبر پر
کھلتا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے ڈیڈی!" —— رابی نے بچوں کی سی شوخی سے کہا
—— "آپ نے میرے سامنے کئی بار بریف کیس کھولا ہے اور مَیں نے
نمبر دیکھ لیا تھا۔"

"کیا تم نے یہ نہیں دیکھا کہ اس فائل پر ٹاپ سیکرٹ لکھا ہُوا ہے؟" ——
باپ نے پوچھا۔

"دیکھا تھا ڈیڈی!" —— رابی نے جواب دیا —— "آپ فکر نہ کریں۔
مَیں نے یہ کسی مشکوک آدمی کو تو نہیں دکھائی تھی۔"

"اپنے کمرے میں چلے جاؤ" —— باپ نے رابی سے کہا —— "اور
مجھے بتائے بغیر گھر سے باہر نہیں جانا۔"

رابی کے جانے کے بعد اس کا باپ گہری سوچوں میں کھو گیا۔ اُس
فائل کی اور اس جیسی دو چار اور فائلوں کی ایک ایک تحریر کی قیمت سے

وہ آگاہ تھا۔ وہ اعلیٰ افسر تھا۔ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ راز انہی فائلوں میں
ہوتے ہیں جو دشمن حاصل کرنے کے لئے بڑی سے بڑی قیمت دے
دیتے ہیں۔ ہندو تو ہمارا وہ دشمن ہے جو یہ راز حاصل کرنے کے لئے اپنی
بیٹیوں کی آبرو تک قربان کر دیتا ہے۔ اُسے خیال آیا کہ رابی رشی کے ساتھ
انڈیا گیا تھا اور وہاں انہیں اشوکا ہوٹل میں ٹھہرایا گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ
سیر و سیاحت کے لئے انڈیا جانے والے پاکستانیوں کو مشکوک افراد
سمجھا جاتا ہے، لیکن رابی کو وہاں وی آئی پی بنا کر رکھا گیا۔ رابی اتنے پیسے
لے کر نہیں گیا تھا کہ وہ دو تین دن بھی اشوکا ہوٹل میں رہ سکتا۔ پھر وہ ایسا
دوست کون تھا جس نے رابی اور رشی کو اپنے گھر میں رکھا۔

اُسے یہ خیال بھی آیا کہ رابی اور رشی خوش و خرم گئے تھے لیکن
واپس آئے تو آپس میں اس قدر ناراض تھے کہ نوبت علیحدگی تک پہنچ
گئی۔ رابی اور اس کی ماں اس فیصلے پر متفق تھے کہ رابی رشی کو طلاق دے
دے لیکن رابی کا باپ سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا چاہتا تھا۔ اُس کا ارادہ تھا
کہ وہ باقاعدہ تفتیش کرے گا مگر رابی کی ماں نے اُسے اتنی مہلت ہی
نہ دی۔

رابی کے باپ کو خیال بھی آیا کہ رابی کوئی کام دھندہ نہیں کرتا۔ ماں
نے اُسے نکما اور نکھٹو بنا کر رکھا ہُوا ہے اور دونوں مستقبل کے حسین
خوابوں میں کھوئے رہتے ہیں پھر بھی رابی اپنے اتنے زیادہ ذاتی اخراجات
کہاں سے پورے کرتا ہے۔ اُس نے سوچا کہ رابی کا الگ بنک اکاؤنٹ
ہوگا، لیکن یہ معلوم کرنا مشکل تھا۔ اُس کا اکاؤنٹ نمبر معلوم کرنے کا ایک
ہی طریقہ تھا کہ رابی گھر سے باہر ہو تو اُس کے اٹیچی یا میز کی مقفل دراز
چابی سے کھول کر چیک بُک دیکھی جائے لیکن اتنی خفیہ فائل کے انتہائی
خفیہ کاغذات کی فوٹوسٹیٹ کرانا قابلِ یقین شہادت تھی کہ رابی کوئی
گڑبڑ کر رہا ہے اور یہ جاسوسی ہی ہو سکتی ہے۔

"کیا میرا بیٹا انڈیا کا جاسوس ہے؟"

اُس کے ذہن سے اس سوال نے اُٹھ کر اُسے بنیادوں تک ہلا ڈالا۔ اُسے معلوم تھا کہ انڈیا کی سیکرٹ سروس جسے "را" کہتے ہیں، پاکستان کے نوجوانوں کو جنت جیسے سبز باغ دکھا کر انڈیا لے جاتی اور انہیں پاکستان کے خلاف استعمال کرتی ہے۔ وہ اپنے بیٹے کو جانتا تھا۔ وہ بھی ایسے ہی خام نوجوانوں میں سے تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ رابی پاکستان کی اُسی ڈسکو سوسائٹی کا نوجوان تھا جس سے انڈیا کی سیکرٹ سروس کو جاسوسی اور تخریب کاری کے لئے خام مال ملتا تھا۔

رابی کے باپ کا ذہن دُور پیچھے اُس دور میں چلا گیا جب پاکستان کا نعرہ وجود میں آ چکا تھا اور برِصغیر کی فضا نعرۂ پاکستان سے گونجنے لگی تھی۔ رابی کا باپ انبالہ شہر کا رہنے والا تھا۔ اُس وقت وہ ایک انگریز افسر کا سٹینو تھا۔ تحریکِ پاکستان میں اُس نے بہت کام کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ پاکستان کبھی بن بھی گیا تو انبالہ بہت دُور رہے گا، لیکن وہ برِصغیر میں ایک اسلامی مملکت دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ تو پورے کے پورے ہندوستان کو مسلمان ملک بنانا چاہتا تھا۔ اُس کی یہ خواہش اُس کے اسلامی جذبے کی شدت کی مظہر تھی۔ اسے وہ وقت یاد آنے لگا جب ہر مسلمان حصولِ پاکستان کے لئے جان و مال کی قربانیاں دے رہا تھا۔

پھر اُسے وہ وقت یاد آیا جب ۳، جون ۱۹۴۷ء کے روز تقسیمِ ہند کا اعلان ہو گیا۔ اُس نے بڑے فخر سے لکھ دیا تھا کہ وہ پاکستان جانا چاہتا ہے۔ وہ اتنا محنتی اور دیانت دار تھا کہ جس انگریز افسر کا وہ سٹینو تھا، اُس نے یہ دیکھتے ہوئے کہ ہندوستان سے ان کی حکومت تو ختم ہو ہی رہی ہے، رابی کے باپ کو گزیٹڈ افسر نامزد کروا دیا۔ رابی کا باپ خوش قسمت تھا کہ وہ پاکستان کو آنے والے سرکاری ملازموں کی ریل گاڑی میں فسادات سے پہلے کراچی پہنچ گیا تھا۔ وہ اپنی بیوی، ماں اور باپ کو ساتھ لے آیا تھا۔ اُس کے خاندان کے باقی افراد جن میں اُس کا ایک سگا بھائی اور اُس کے بچے بھی شامل تھے، انبالہ میں ہندوؤں کے ہاتھوں شہید ہو گئے تھے۔

آج جب وہ اتنی اونچی پوسٹ پر لگا ہوا تھا، اُسے یاد آ رہا تھا کہ پاکستان کتنا مہنگا ملا تھا۔ اسے اپنے بھائی کے ہی نہیں ہر مسلمان کے وہ بچے یاد آ رہے تھے جو سرحد کے اُس طرف ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں کٹ گئے تھے۔

"کیا میرا بیٹا اُس دشمن کا جاسوس ہے؟"

وہ یوں میز پر دوہرا ہو گیا جیسے ایک تیر اُس کے دل میں اُتر گیا ہو۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُسے اپنا اکلوتا بیٹا دشمن نظر آنے لگا۔ اُسے رِشی کا خیال آیا اور ساتھ ہی یہ خیال بھی کہ رِشی ہی بتا سکتی ہے کہ یہ دونوں انڈیا گئے تھے تو وہاں کیا ہوا تھا اور وہ کون لوگ تھے جو رابی کو اپنے ساتھ لئے پھرتے رہے اور اسے کہاں کہاں لے جاتے رہے اور خود رِشی کہاں چلی گئی تھی۔ وہ اپنے بیٹے کے خلاف قابلِ اعتماد شہادت اکٹھی کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اُس نے فائل بریف کیس میں رکھی۔ بریف کیس کا تالہ لگایا لیکن تالے کا نمبر بدل لیا۔ کمرے سے نکل کر اُس نے رابی کی ماں سے کہا کہ وہ ایک ضروری کام سے جا رہا ہے، شاید کچھ دیر ہو جائے۔ باہر نکل کر وہ خود گاڑی میں بیٹھا۔ وہ ڈرائیور کو ساتھ نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ گاڑی بڑی تیزی سے کوٹھی سے نکل گئی۔

سورج کو غروب ہوئے کم و بیش دو گھنٹے گزر گئے تھے۔ رابی کا باپ بڑی تیز ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ گاڑی موڑ کاٹتی رِشی اور اُس کی ماں کی کوٹھی کے سامنے جا کر آہستہ ہوئی۔ اُس نے ہارن بجایا۔ نوکرانی دوڑتی آئی۔ رابی کے باپ کے اشارے پر نوکرانی نے گیٹ کھولا اور وہ گاڑی اندر لے گیا۔ گاڑی سے نکل کر اُس نے نوکرانی سے پوچھا کہ رِشی کون سے کمرے میں ہے۔ اتنے میں رِشی خود ہی برآمدے میں آ گئی تھی۔ اُس کے پیچھے اُس کی ماں بھی نکل آئی۔

"رِشی!" — رابی کے باپ نے کہا — "میں تم سے کچھ پوچھنے آیا ہوں۔"

"کیا آپ تحریری طلاق نامہ لے کر آتے ہیں؟"

"نہیں رِشی نہیں" — رابی کے باپ نے جھنجھلا کر کہا — "میں تم سے کچھ سُننے آیا ہوں۔ اندر چلو۔ میں کچھ دیر بیٹھوں گا۔"

"کیا پوچھنا ہے مجھ سے؟" — رِشی نے دبے دبے غصّے سے کہا — "اس گھر کے دروازے آپ کے لئے بند ہو چکے ہیں، ویسے ہی جیسے آپ نے اپنے گھر کے دروازے میرے لئے بند کر دیے ہیں۔"

"خدا کے لئے رِشی!" — رابی کے باپ نے بازو پھیلا کر رِشی اور اُس کی ماں کو بازوؤں میں لے کر دروازے کی طرف دھکیلا اور کہا — "مجھے شرمسار نہ کرو۔ مَیں تم سے وہ بات سُننے آیا ہوں جو تم میرے گھر میں سنانا چاہتی تھیں لیکن تمہیں اجازت نہ دی گئی۔"

"بات کیا ہے؟"

"مَیں ایک راز لینے آیا ہوں" — رابی کے باپ نے کہا۔

"راز تو آپ کے بیٹے کے پاس ہیں" — رِشی نے کہا — "اور ان کا خریدار انڈیا ہے۔ آپ خود بھی قیمتی رازوں کے سوداگر ہیں۔"

"خاموش رہو رِشی!" — ماں نے رِشی سے کہا — "انہیں آنے دو۔ بدتمیزی نہ کرو.... آئیے ملک صاحب!"

ماں بیٹی اُسے ڈرائنگ روم میں لے گئیں اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ رابی کے باپ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

رابی کے باپ نے جیب سے رومال نکالا اور اپنی آنکھیں پونچھ کر پہلے رِشی کی ماں کی طرف پھر رِشی کی طرف دیکھا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ جو بات کرنے آیا ہے وہ زبان پر لانے کی جرآت نہیں رکھتا۔

"کیا بات ہے ملک صاحب!" — رِشی کی ماں نے کہا — "آپ کچھ پریشان معلوم ہوتے ہیں۔"

"ہاں سلیمہ!" — رابی کے باپ نے کہا — "میں کچھ پریشان نہیں بہت پریشان ہوں" — اُس نے بڑا لمبا سالنس چھوڑ کر کہا — "میری اصل پریشانی یہ ہے کہ رِشی مجھ پر اعتبار نہیں کرے گی۔ اس کا غصّہ بجا ہے۔ اس کے جذبات پر جو چوٹ پڑی ہے، اس کا مجھے احساس ہے، بلکہ اس کا احساس صرف مجھے ہے۔ رابی کو نہیں، رابی کی ماں کو بھی نہیں۔"

"تو کیا مجھے واپس لے جانے آتے ہیں؟" — رِشی نے غصّے کو دباتے ہوئے پوچھا — "یا تحریری طلاق لاتے ہیں؟"

"نہ تمہیں واپس لے جانے کے لئے آیا ہوں نہ طلاق لایا ہوں" — رابی کے باپ نے جواب دیا — "نہ میں نے تمہیں اپنے گھر سے نکالا ہے نہ میں اپنے بیٹے کے اس فیصلے کو مانتا ہوں۔ میری تو کسی نے سنی ہی نہیں۔"

"میری کس نے سُنی ہے؟" — رِشی نے پوچھا۔

"مَیں تمہاری سُننے ہی تو آیا ہوں" — رابی کے باپ نے کہا — "ابھی ابھی باہر تم نے کہا تھا کہ راز تو آپ کے بیٹے کے پاس ہیں اور ان کا خریدار انڈیا ہے۔ تم نے مجھے بھی قیمتی رازوں کا سوداگر کہا ہے۔"

"ہاں! میں اب بھی یہی کہتی ہوں" — رِشی نے کہا — "انڈیا میں ہمارے میزبان وہاں کی انٹیلی جنس کے آدمی تھے۔ ہمیں یہاں سے اپنے ساتھ لے جانے والا آدمی بھی انڈیا کا جاسوس تھا۔ آپ اِسے ایک جھوٹا الزام کہیں گے۔"

"نہیں رِشی! نہیں!" — رابی کے باپ نے جھنجھلا کر کہا — "مجھے خود شک ہو گیا ہے کہ میرے بیٹے پر یہ الزام جھوٹا نہیں۔ میں یہ پوچھنے آیا ہوں کہ دِلّی میں کیا کوئی خاص بات ہو گئی تھی؟ تم دونوں خوش و خرم گئے تھے اور اس حال میں واپس آئے کہ نوبت علیحدگی تک پہنچ گئی۔ کیا مجھے اس کی وجہ بتا سکتی ہو؟"

"ملک صاحب!" — رِشی کی ماں نے کہا — "ہم ماں بیٹی اکیلی ہیں۔ ہمارے سروں پر کوئی مرد نہیں۔ آپ بہت بڑے افسر ہیں۔ ہمارے منہ بند رکھنے کے لئے جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ آپ نے میری بیٹی کو گھر سے نکال دیا ہے۔ ہم نے آپ کا کیا بگاڑ لیا ہے؟ ہمیں اور زیادہ پریشان نہ کریں۔"

"خدا کے لئے سلیمہ!" — رابی کے باپ نے صوفے پر بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا — "مَیں تمہیں پریشان کرنے نہیں آیا۔ میں خود بہت پریشان ہوں۔ مَیں رابی اور اُس کی ماں کو بتائے بغیر یہاں آیا ہوں۔ مَیں تمہیں اپنی پریشانی بتا دیتا ہوں" — اُس نے رِشی سے مخاطب ہو کر کہا — "مجھے شک ہو گیا ہے کہ رابی انڈیا کے لئے جاسوسی کر رہا ہے۔ تم اُس کے ساتھ دِلّی گئی تھیں۔ رابی کہتا ہے کہ تم دِلّی کے تین چار ہندو اور اینگلو انڈین لڑکوں کے ساتھ چلی گئی تھیں اور کچھ دن اُن کے ساتھ رہی تھیں .... مجھے کچھ بتاؤ رِشی! مَیں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں۔ یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ میرا بیٹا میرے ملک اور میرے مذہب کے دشمن کا جاسوس بن جائے۔"

"آپ کو اپنے بیٹے پر کس طرح شک ہُوا ہے؟" — رِشی نے پوچھا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ میرا تعلق ڈیفنس کے شعبے کے ساتھ ہے" — رابی کے باپ نے کہا — "میرے پاس تمام سرکاری کاغذات ٹاپ سیکرٹ ہوتے ہیں۔ یہی وہ قیمتی راز ہیں جو حاصل کرنے کے لئے دشمن کی انٹیلی جنس کوشاں رہتی ہے اور ہر قیمت دینے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ مَیں نے رابی کو اپنی ایسی ہی ایک فائل کے ساتھ پکڑا ہے۔ وہ ٹاپ سیکرٹ کاغذات کی فوٹو سٹیٹ کاپیاں کروا رہا تھا۔"

"آپ نے پوچھا تو ہو گا کہ یہ فوٹو سٹیٹ کس کے لئے کروا رہا ہے؟" — رِشی نے پوچھا۔

"یہ تو پوچھنا ہی تھا" — رابی کے باپ نے جواب دیا — "اُس نے ایسا جواب دیا جو میرے لئے قابلِ قبول نہیں۔ اس سے مجھے خیال آیا کہ تم دونوں کو دِلّی میں اشوکا ہوٹل میں رکھا گیا تھا۔ اتنے بڑے اور اتنے مہنگے ہوٹل میں بڑے ہی دولت مند لوگ ٹھہرتے ہیں یا وی آئی پی درجے کے سرکاری مہمانوں کو وہاں ٹھہرایا جاتا ہے۔ عام قسم کے پاکستانیوں کو جو انڈیا کی سیر و سیاحت کے لئے یا اپنے رشتہ داروں سے ملنے کے لئے انڈیا جاتے ہیں، انہیں مشکوک افراد سمجھا جاتا ہے اور وہ مشتبہوں کی طرح پولیس کی نگرانی میں رہتے ہیں۔ اس سے مجھے شک ہُوا کہ رابی کو اس کے میزبانوں نے خصوصی اہمیت دی تھی .... کیوں؟ رابی ان کے لئے وی آئی پی کیوں بن گیا تھا؟ کیا تم مجھے کچھ بتا سکتی ہو رِشی؟"

"بہت کچھ بتا سکتی ہوں انکل!" — رِشی نے کہا — "لیکن آپ پوچھ کر کیا کریں گے؟ میں یہ تو مان ہی نہیں سکتی کہ آپ اپنے بیٹے کے خلاف کوئی کارروائی کریں گے۔"

"ملک صاحب!" — رِشی کی ماں نے کہا — "ہو گا یہی کہ آپ پہلے سے زیادہ ہمارے دشمن بن جائیں گے۔"

"سلیمہ!" — رابی کے باپ نے کہا — "جو میں محسوس کر رہا ہوں وہ شاید تم محسوس نہ کر سکو۔ تمہارے اور میرے جذبات اور احساسات

میں زمین اور آسمان جتنا فرق ہے۔ میں ایسی بات کہنا تو نہیں چاہتا تھا لیکن تم نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں وہ بات کہہ ہی دوں۔ تمہارے خاوند نے پاکستان کے ساتھ جو سلوک کیا ہے وہ تمہارے سامنے ہے۔ تم اپنے ماضی کو دیکھو۔ تم میاں بیوی نے نہیں سوچا کہ یہ پاکستان ہم نے کتنی بڑی قیمت دے کر حاصل کیا تھا۔ اس پاکستان کے نام پر رِشی جیسی نوجوان بیٹیاں اور رابی جیسے نوجوان بیٹے قربان ہو گئے تھے.... ایک دو نہیں، لاکھوں.... مَیں اس پاکستان کے ساتھ کس طرح غداری کر سکتا ہوں جس کے خاندان کے گیارہ افراد انبالہ میں ہندوؤں کے ہاتھوں شہید ہو گئے تھے۔ ان میں میرا ایک سگا بھائی اور اُس کے دو معصوم بچے بھی شامل تھے۔ مَیں یہ پوچھنے آیا ہوں، کیا میرا بیٹا غدار ہے؟ اگر ہے تو میں بھول جاؤں گا کہ وہ میرا بیٹا ہے۔ میں اُسے ایک پاکستانی شہری سمجھوں گا جو انڈیا کا جاسوس ہے پھر میں اس کے خلاف وہی کارروائی کراؤں گا جو دشمن ملک کے جاسوس کے خلاف کی جاتی ہے۔"

سلیمہ اور رِشی کے چہروں کے تاثرات میں نمایاں تبدیلی آئی۔ رابی کا باپ چُپ ہو گیا اور دو چار سیکنڈ ان دونوں کو دیکھتا رہا۔ کمرے کی فضا پر چُپ سی طاری ہو گئی۔

"سلیمہ!" — رابی کے باپ نے کمرے کا سکوت توڑا — "مَیں نے تمہیں اپنی فطرت کے خلاف بڑی تلخ بات کہہ دی ہے.... مَیں ایسی گھٹیا باتیں کرنے والا آدمی نہیں۔ اگر تمہیں اور رِشی کو میری بات بُری لگی ہے تو مجھے معاف کر دینا۔ میرے جذبات ایسے ہیں جو آج پاکستان میں بہت کم رہ گئے ہیں۔ رِشی نے کہا ہے کہ مَیں خود بھی سرکاری رازوں کا سوداگر ہوں۔ میں یہی معلوم کرنے آیا ہوں کہ میرے گھر سے یہ راز کس طرح نکل رہے ہیں۔ میں سمجھ نہیں سکتا کہ مَیں تمہیں کس طرح یقین دلاؤں کہ مَیں یہ بات نیک نیتی سے پوچھ رہا ہوں اور اگر مجھے رِشی نے صحیح بات

بتا دی تو میرا ردِعمل تمہارے خلاف نہیں بلکہ اپنے بیٹے کے خلاف ہو گا۔ بہتر سمجھو تو قرآن پاک میرے ہاتھوں پر رکھ دو اور مَیں قرآنِ پاک کی قسم کھا کر تمہیں یقین دلاؤں گا .... رِشی! مجھے اپنا باپ سمجھ کر بتاؤ کہ تم اور رابی انڈیا گئے تو وہاں کیا ہُوا تھا؟"

❋

"انکل!" — رشی نے کہا — "اگر آپ میں ہمّت ہے تو سُن لیں۔ میں آپ سے ایک وعدہ اور لوں گی۔ وہ یہ کہ آئی ایس آئی کے کسی بھی آفسر کو آپ یہ نہیں بتائیں گے کہ میں نے آپ کے ساتھ ایسی کوئی بات کی ہے۔"

"آئی ایس آئی؟" — رابی کے باپ نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا — "کیا یہ بات آئی ایس آئی تک پہنچ چکی ہے؟"

"ہاں انکل!" — رِشی نے کہا — "اگر آپ مجھے گھر سے نکال نہ دیتے تو یہ بات آئی ایس آئی تک پہنچنے سے پہلے آپ تک پہنچتی۔"

"ہاں رشی!" — رابی کے باپ نے کہا — "میں وعدہ کرتا ہوں کہ یہ بات کسی کو نہیں بتاؤں گا کہ تم نے مجھے کچھ بتایا تھا۔"

رِشی نے آہ بھری اور بات وہاں سے شروع کی جہاں کراچی میں انہیں عزیزہ ایک لڑکی کے ساتھ ملا تھا اور عزیز نے رابی کے ساتھ دوستی گانٹھ لی تھی۔ کراچی سے لاہور آ کر عزیز نے دو اور لڑکیوں کے ساتھ رابی کا تعارف کس طرح کرایا۔ رِشی نے وہ بھی رابی کے باپ کو سُنایا۔

"رابی میرے بغیر کبھی گھر سے نہیں نکلا تھا" — رِشی نے کہا — "لیکن ان لڑکیوں سے تعارف ہُوا تو رابی نے یہ وطیرہ اختیار کر لیا کہ شام کے بعد مجھے بتائے بغیر اکیلا کہیں چلا جاتا تھا اور رات دیر سے واپس آتا تھا۔ مَیں نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ وہسکی وغیرہ پیئے ہُوئے ہوتا۔ ہماری سوسائٹی میں کیا کچھ نہیں ہوتا۔ شراب اور ہیروئن جائز نشے سمجھے جاتے

ہیں۔ مَیں نے کبھی رابی سے پوچھا بھی کہ وہ کہاں چلا گیا تھا تو اُس نے مجھے بڑے پیار سے کوئی ایسا جواب دے دیا جسے میں نے پیار کی وجہ سے سچ مان لیا۔ مَیں نے اس پر کبھی شک نہ کیا۔ اگر مجھے کوئی شک ہوتا بھی تو یہی ہوتا کہ رابی کسی اور لڑکی کے چکر میں پڑ گیا ہے۔ ہماری سوسائٹی میں یہ رومانس اور یہ ڈرامے تو چلتے ہی رہتے ہیں، اس لئے مَیں نے توجہ نہ دی۔"

یہاں سے رِشی بات کو نئی دِلی لے گئی۔ اُس نے بتایا کہ وہ بہت خوش تھی کہ انڈیا کی سیر کو جا رہی ہے۔

"وہاں ایئر پورٹ پر ہمارا استقبال کرنے کے لئے دو تین آدمی موجود تھے"۔۔۔ رِشی نے کہا۔۔۔ "عزیز ہمارے ساتھ ساتھ رہا۔ وہ ہمارا میزبان تھا۔ ایئر پورٹ سے ہمیں مرسڈیز گاڑی میں اشوکا ہوٹل لے جایا گیا اور ہمارے قیام کا انتظام اسی ہوٹل میں کیا گیا۔ ہمیں ایک دفتر میں لے جا کر ایک افسر سے ملوایا گیا جو رسمی سی ملاقات تھی۔ شام کو ہمیں ایک کلب میں لے جایا گیا جہاں ہم جیسے نوجوان موجود تھے۔ ان میں اینگلو انڈین بھی تھے۔ باقیوں میں سے یہ پہچاننا کہ کون ہندو اور کون مسلمان ہے بہت مشکل تھا۔"

"یہ زیادہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں"۔۔۔ رابی کے باپ نے کہا۔۔۔ "یہ ڈسکو اور پاپ سوسائٹی وہاں بھی موجود ہے جس طرح پاکستان میں ہے۔ تم آگے بات کرو۔"

"مَیں بھی اسی سوسائٹی کی لڑکی تھی"۔۔۔ رِشی نے کہا۔۔۔ "مَیں نے یہ سوچا ہی نہیں کہ مجھے اور رابی کو اتنی خصوصیت اور اہمیت کیوں دی جا رہی ہے۔ مَیں تو خوش تھی کہ یہ شاید آپ کی سرکاری حیثیت کی وجہ سے ہے۔ حقیقت یہ ہے انکل! ہم دونوں پر ایسا نشہ طاری تھا کہ مَیں نے کچھ بھی محسوس نہ کیا....

"پھر ایسے ہونے لگا کہ عزیز اور اُس کا ایک ساتھی جس کا تعارف

ہمارے ساتھ عبدالرحمٰن کے نام سے کرایا گیا تھا، رابی کو اکیلے کہیں لے جاتے۔ رابی جب واپس میرے پاس آتا تو مَیں اُس کے تیوروں اور طور طریقوں میں ایسی تبدیلی دیکھتی جسے وہ چھپا نہیں سکتا تھا۔ یہ تو مجھے بعد میں خیال آیا کہ رابی کی برین واشنگ ہو رہی ہے۔"

"کیا تمہارے ساتھ انڈیا کے ان آدمیوں نے کبھی کوئی بات نہیں کی تھی؟"۔۔۔ رابی کے باپ نے پوچھا۔

"نہیں انکل!"۔۔۔ رِشی نے جواب دیا۔۔۔ "مَیں نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ مجھے رابی سے الگ رکھا جا رہا ہے۔"

رِشی نے اپنے اغوا کی پوری تفصیل سنائی۔ اُس نے بتایا کہ اُس روز بھی اُسے کمرے میں اکیلا چھوڑ گئے تھے۔ اُس نے اپنے اُس وقت کے احساسات اور وہ خیالات بھی بتاتے جو اُس کے ذہن میں آتے تھے۔

"انکل!"۔۔۔ رِشی نے کہا۔۔۔ "مَیں نے ذہنی طور پر اپنے آپ کو بہت بُرے انجام کے لئے تیار کر لیا تھا۔ کبھی خیال آتا کہ مجھے رابی سے ہمیشہ کے لئے الگ کر دیا گیا ہے۔ کبھی خیال آتا کہ یہ اُن نوجوانوں میں سے ہیں جن کے کلبوں میں ہمیں لے جایا جاتا رہا ہے لیکن بعد میں مجھ پر یہ انکشاف ہُوا کہ میں کسی بُرے انجام کی طرف نہیں لے جائی گئی بلکہ ایک نہایت اعلیٰ اور مقدس آغاز میں داخل کر دی گئی ہوں۔ میں پاکستان کو عیش و عشرت کی سرزمین سمجھتی تھی۔ مجھے پاکستان کے متعلق یہی معلوم تھا کہ انگریز یہاں سے جاتے ہوتے ہندوستان کا یہ حصہ مسلمانوں کو اور باقی سارا ہندوستان ہندوؤں کو دے گئے ہیں۔ میرے دل میں پاکستان کی اگر محبت تھی تو وہ اسی وجہ سے تھی۔ اس کے لئے آپ نے اور آپ کی عمر کے لوگوں نے جو قربانیاں دی تھیں وہ میں نہیں جانتی تھی۔"

رِشی نے سُنایا کہ اُسے ایک مکان میں داخل کیا گیا اور ایک کمرے میں لے جایا گیا۔ کمرے کی دیواروں، چھت اور دروازے وغیرہ سے پتہ

چلتا تھا کہ یہ پرانے زمانے کا مکان ہے۔ وہاں پرانے نمونے کا ایک پلنگ تھا، جس پر صاف ستھرا بستر بچھا ہُوا تھا اور وہاں دو آدمی بیٹھے جن کی عمریں پچاس سال سے زیادہ معلوم ہوتی تھیں۔

"مَیں نے کبھی ڈاکو، راہزن اور لڑکیوں کو اس طرح اغوا کرنے والے نہیں دیکھے تھے" — رِشی نے کہا — "میرا خیال تھا کہ یہ جرائم کرنے والوں کی شکلیں بڑی خوفناک ہوتی ہوں گی لیکن ان دو آدمیوں کے چہرے آپ کی طرح معزز اور متین تھے۔ اُن کے لباس مڈل کلاس کے لوگوں جیسے تھے۔ مَیں روتی اور اُن کی منتیں کرتی تھی۔ مَیں کہتی تھی کہ میں پردیسی ہوں اور ان کے ملک میں سیر کے لئے آئی ہوں۔ ان میں سے ایک نے کہا — 'ڈرو مت لڑکی! یہاں تمہاری عزت محفوظ رہے گی' — اس سے مجھے کچھ تسلی ہو گئی، پھر جب ایک نے مجھے بیٹی کہا تو مَیں حیران ہوئی کہ یہ کون لوگ ہیں اور انہوں نے مجھے کیوں اغوا کیا ہے۔"

رِشی کے ساتھ اس کمرے میں جو اچھا سلوک ہُوا وہ اُس نے تفصیل سے سنایا۔ اُس نے سنایا کہ وہ رات اس طرح گزری کہ کمرے میں کوئی بھی نہ آیا۔ پھر اُس نے عبدالقدیر اور ہاشمی کی باتیں سنائیں جو اُنہوں نے اُس کے ساتھ کی تھیں۔ پھر اُس نے ہاشمی کی بیوی کی باتیں سنائیں جو اس معزز خاتون نے رِشی کے ساتھ کی تھیں۔

"انکل!" — رِشی نے کہا — "ان کی باتوں نے مجھ پر جو اثر کیا وہ شاید الفاظ میں بیان نہ کر سکوں۔ آپ یوں سمجھ لیں کہ میں نے یہ محسوس کیا جیسے رِشی مر گئی ہے اور راشدہ نے دوسرا جنم لیا ہے۔ یہ ان کی باتوں کا اثر تھا یا نہیں، ان کے سلوک نے مجھے اس قدر متاثر کیا کہ میں نے بڑی شدّت سے محسوس کیا جیسے میں اسی گھر میں پیدا ہوئی تھی اور پیدا ہوتے ہی مجھے کوئی اجنبی اٹھا لے گیا تھا اور اب میں واپس اپنے ماں باپ کے پاس آگئی ہوں... انکل! مجھ سے ان معزز آدمیوں کے نام نہ پوچھنا۔ یہ نام اس قابل ہیں کہ ہندوستان اور پاکستان کی تاریخ میں لائے جائیں لیکن

وہ اسلام، پاکستان اور مسلم انڈیا کے لئے جو جنگ لڑ رہے ہیں اس کی نوعیت ایسی ہے کہ ان کے نام ظاہر نہیں کئے جا سکتے۔ وہ جس انعام کے حقدار ہیں وہ انہیں اللہ سے ملے گا۔"

"تم نے آئی ایس آئی کا ذکر کیا تھا" — رابی کے باپ نے پوچھا — "کیا تم نے آئی ایس آئی کو صرف رابی کا نام بتایا ہے یا دِلّی کے ان آدمیوں کا بھی؟"

"آئی ایس آئی کو مَیں نے یہ ساری کہانی سنائی ہے جو مَیں آپ کو سنا رہی ہوں" — رِشی نے جواب دیا — "انہیں یہ نام بتا دیتے ہیں۔ آئی ایس آئی کے افسروں نے مجھے سختی سے کہا ہے کہ میں یہ نام بلکہ یہ ساری بات کسی اور کو نہ سناؤں... معلوم نہیں انکل! آپ نے میری ان باتوں کو سچ مانا ہے یا نہیں۔"

"رِشی بیٹی!" — رابی کے باپ نے کہا — "بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔ مَیں تمہارے ایک ایک لفظ کو سچ مان رہا ہوں۔"

"مجھے دِلّی کے ان حضرات نے بتایا کہ رابی کو دِلّی میں جاسوسی کی تربیت کے لئے لایا گیا ہے" — رِشی نے کہا — "یہ تو میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ ان لوگوں نے کیا محاذ بنا رکھا ہے۔ ایک روز اس گھر کی خاتون نے جس کی عمر ممّی سے کچھ زیادہ ہے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔ اُس نے میرے ساتھ جو باتیں کی تھیں وہ مَیں آپ کو سناتی ہوں۔"

رِشی نے رابی کے باپ کو ہاشمی کی بیوی کی باتیں سنائیں۔ اُس کے سنانے کا انداز ایسا تھا جیسے اپنے پیر و مُرشد کی کرامات اور کرشمے سُنا رہی ہو۔ اُس پر وجدانی سی کیفیت طاری ہوتی جا رہی تھی۔

"مَیں آپ کو اتنی لمبی لمبی باتیں سُنا کر شاید بور کر رہی ہوں" — رِشی نے کہا — "ہر بات پوری تفصیل سے سنانے کی وجہ یہ ہے کہ آپ کو یقین آجائے کہ مَیں اب وہ رِشی نہیں رہی اور میں اب راشدہ ہوں۔

ایک روز اس آدمی نے جس کے گھر مجھے رکھا گیا تھا، مجھ سے میرا نام پوچھا تو میں نے رِشی بتایا۔ اُس نے کہا کہ وہ نام بتاؤ جو ماں باپ نے رکھا تھا۔ مَیں نے اپنا نام راشدہ بتایا تو اُس نے کہا کہ یہاں تمہیں راشدہ کے نام سے بلایا جاتے گا کیونکہ یہ اسلامی نام ہے۔"

"مَیں تمہیں بتا چکا ہوں کہ مَیں تمہاری ہر بات کو سچ مان رہا ہوں"۔۔ رابی کے باپ نے کہا ۔۔۔"اب مَیں آگے سُننے کو بیتاب ہوں۔ تم اِن لوگوں کے پاس کب تک رہیں، کس طرح واپس آئیں؟"

❄

رِشی نے اس انوکھے تجربے کا اگلا مرحلہ سنایا۔ عزیز نے اپنی بہن کو جاسوسی کے لئے ہاشمی کے گھر بھیجا اور اتفاق سے رِشی نے اپنے کمرے کا دروازہ کھول دیا اور عزیز کی بہن نے اسے دیکھ لیا۔ اُسی رات رِشی کو رفیقی کے گھر منتقل کر دیا گیا۔ رِشی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اگلے روز عزیز کی بہن درما کو برقعے میں عورت کے بہروپ میں ہاشمی کے گھر لے گئی تھی اور کیا واقعہ پیش آیا تھا۔

"مَیں نے ان لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ میں انہی کے پاس رہوں گی"۔۔ رِشی نے کہا ۔۔۔"مَیں نے ضد شروع کر دی کہ میں پاکستان واپس نہیں جاؤں گی مگر وہ لوگ کسی ایسے خطرے میں آگئے تھے کہ مجھے اپنے پاس نہیں رکھ سکتے تھے۔ انہوں نے خطرہ بتایا۔ میں نے ان کے ساتھ وعدہ کیا کہ میں پاکستان جا کر ان جاسوسوں کو پکڑواؤں گی۔۔۔۔ انکل! کچھ اور باتیں بھی ہیں جنہوں نے میرے جذبات پر گہرا اثر چھوڑا تھا۔ ان کا تعلق ممی اور ڈیڈی کے ماضی کے ساتھ ہے۔ مجھے یہ باتیں رابی نے سناتی تھیں اور رابی کی ممی نے یہ باتیں میری ممی سے آپ کے گھر میں کہی تھیں۔ انہوں نے یہ باتیں کہہ کر مجھے اور ممی کو دھتکار دیا تھا۔ میں سوچتی تھی کہ میں کیا ہوں، میری شناخت کیا ہے؟ آنٹی نے مجھے کہا تھا کہ تم اپنے باپ کی

بیٹی نہیں ہو اور تمہاری ماں بھی نہیں بتا سکتی کہ تمہارا باپ کون ہے"۔

"رِشی بیٹی!"۔۔۔ رابی کے باپ نے کہا ۔۔۔"اگر یہ باتیں نہ دہراؤ تو اچھا ہے۔ میرے دل کو تکلیف ہو رہی ہے۔ اگر رابی کی ماں نے تمہیں یہ باتیں کہی ہیں تو بہت بُرا کیا ہے۔ مجھے وہ سناؤ جو میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔۔۔۔ خدا کی قسم رِشی! تم نے میرے دل میں پیار کے ساتھ اپنا احترام بھی پیدا کر لیا ہے۔۔۔۔ مجھے یہ سمجھاؤ کہ تمہیں اُن لوگوں نے کیوں اغوا کیا تھا؟"

"اُنہوں نے اپنا مقصد بتایا تھا"۔۔۔ رِشی نے جواب دیا ۔۔۔"انہیں معلوم تھا کہ انڈین انٹیلی جنس پاکستان سے رابی جیسے امیرزادوں کو انڈیا لے جاتی اور جاسوسی اور تخریب کاری کی ٹریننگ دے کر پاکستان واپس بھیج دیتی ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ انہیں کس طرح پتہ چلا تھا کہ پاکستان سے ایک نوجوان لڑکے اور لڑکی کو لایا گیا اور راشو کا ہوٹل میں ٹھہرایا گیا ہے۔ انہیں یقین تھا کہ میں جاسوسی کی ٹریننگ کے لئے لائی گئی ہوں۔ ایک تو وہ اس کی تصدیق کرنا چاہتے تھے۔ وہ دوسرا سراغ یہ لینا چاہتے تھے کہ عزیز انڈیا کا جاسوس ہے اور اس کی سرگرمیوں کا علاقہ پاکستان ہے۔ یہ لوگ عزیز کو بڑی اچھی طرح جانتے تھے کیوں کہ عزیز ان کے محلے کے قریب ہی کہیں رہتا ہے۔ میں نے انہیں یقین دلا دیا کہ مَیں تو یہ بھی نہیں جانتی کہ میرا خاوند انڈیا کا جاسوس بن چکا ہے یا بنایا جا رہا ہے۔ بہرحال انہیں پتہ چل گیا کہ رابی جاسوسی کی ٹریننگ کے لئے آیا ہے اور غالباً انہیں یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ رابی انڈین انٹیلی جنس تک کچھ راز پہنچا چکا ہے"۔

رِشی نے سنایا کہ اسے کس طرح رفیقی کے گھر سے عزیز کے گھر تک پہنچایا گیا۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ ادھر ان کی کار عزیز کے گھر کے قریب پہنچی تو اُدھر سے رابی اور عزیز کی کار آگئی۔ رِشی کو اُتار کر اُسے وہاں تک لے جانے والے کار لے گئے۔ عزیز اور رابی نے کار میں ان کا تعاقب کیا۔

"مجھے معلوم نہیں کہ اس تعاقب میں کیا ہُوا"۔۔۔ رِشی نے کہا ۔۔۔"جب

عزیز اور رابی واپس آتے تو دونوں کے چہروں پر گھونسوں کے نشان تھے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ جن کے تعاقب میں گئے تھے انہوں نے ان کی پٹائی کر دی ہے اور وہ ان کے ہاتھ نہیں آتے .... اب انکل! میں آپ کو ایک بڑی ضروری اور بہت ہی اہم بات بتانے لگی ہوں۔ وہ دونوں تو اُن کی کار کے تعاقب میں چلے گئے اور میں عزیز کی کوٹھی میں چلی گئی۔ وہاں ایک بڑی ہی خوبصورت نوجوان لڑکی سے میری ملاقات ہوئی۔ اُس نے اپنا نام زینی بتایا۔ اس کی باتوں سے معلوم ہُوا کہ اُس نے رابی کو اپنے جال میں پھانس لیا ہے اور اُس نے میرے خلاف رابی کے دل میں نفرت پیدا کر دی ہے۔"

رِشی نے سنایا کہ رابی اور عزیز واپس آتے تو رابی نے رِشی پر یہ الزام لگایا کہ وہ اپنی مرضی سے اینگلو انڈین لڑکوں کے ساتھ چلی گئی تھی۔ اُس نے یہ بھی سنایا کہ زینی رابی کی تائید کر رہی تھی۔ اس پر رِشی اور رابی کی آپس میں اچھی خاصی تُرش کلامی ہوئی۔

رِشی نے پھر سنایا کہ اسے انٹیلی جنس کے ہیڈ کوارٹر میں لے گئے تھے۔ اس سے بڑی باریک اور گہری تفتیش کی گئی۔

"انکل!" ــــ رِشی نے یہ ساری بات سُنا کر کہا ــــ "یہ تھا وہ موقع جب میں نے جوابی وار کیا اور میں جن لوگوں کے گھر میں رہی تھی ان کے ساتھ کیا ہُوا وعدہ پورا کیا۔ میں ابھی تک نہیں سمجھ سکی کہ مجھ میں اتنی عقل اور اتنی ہمت کیسے آگئی تھی۔ یہ شاید خدا کا ہاتھ تھا جس نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے صحیح راستے پر ڈال دیا تھا۔ میرا دماغ ایسا روشن ہُوا کہ افسروں کے درمیان بیٹھے بیٹھے ایک بات میری زبان پر آگئی۔ میں نے یہ بیان دیا کہ جن کلبوں میں مجھے اور رابی کو ڈانس وغیرہ کے لئے لے جایا گیا تھا ان کے چار نوجوانوں نے مجھے دھوکے سے ہوٹل کے کمرے سے بلایا اور اپنے ساتھ لے گئے اور اب مجھے چھوڑ گئے ہیں۔"

"یہ خدائی مدد تھی بیٹی!" ــــ رابی کے باپ نے کہا۔

"انٹیلی جنس والوں نے یہاں تک کیا کہ میں جن کے گھر میں رہی تھی انہیں میرے سامنے کھڑا کر دیا" ــــ رِشی نے کہا ــــ "میں نے انہیں پہچاننے سے صرف انکار ہی نہیں کیا بلکہ پریشانی کی ایکٹنگ شروع کر دی کہ مجھے بلاوجہ پریشان کیا جا رہا ہے۔ اس کے بعد عزیز کی بہن کو میرے سامنے لے آتے۔ اُس نے مجھے اس گھر میں دیکھا تھا۔ میں نے اُسے بھی پہچاننے سے انکار کر دیا۔ اس موقع پر میں بہت ڈری۔ ڈر یہ تھا کہ یہ عورت ابھی کہہ دے گی کہ اس نے اُس گھر میں مجھے ہی دیکھا تھا۔ معلوم نہیں کیا وجہ تھی کہ اُس نے مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ میں تو یہی کہوں گی کہ خدا نے اُسے اندھا کر دیا تھا۔"

اس کے بعد رِشی نے رابی کے باپ کو سنایا کہ اُس کی اور رابی کی واپسی کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ رابی نے رِشی کے ساتھ بول چال بند کر دی۔ وہ ایک دو روز عزیز کے گھر میں رہے۔ رابی اسے یہی کہتا رہا کہ وہ اپنی مرضی سے اینگلو انڈین لڑکوں کے ساتھ چلی گئی تھی اور عیش و عشرت کر کے واپس آگئی ہے۔

❄

یہ ساری روئیداد سُن کر رابی کے باپ کا سر جُھک گیا اور وہ کچھ دیر سر جھکائے بیٹھا رہا۔

"ایک ضروری بات اور بھی ہے انکل!" ــــ رِشی نے کہا ــــ "لیکن میں فیصلہ نہیں کر سکتی کہ آپ کو بتاؤں یا نہ بتاؤں۔ آئی ایس آئی کے افسروں نے مجھے سختی سے کہا تھا کہ اس بات کا ذکر کسی کے ساتھ نہ ہو، لیکن میں سوچتی ہوں کہ جہاں آپ کو سب کچھ بتا دیا ہے وہاں یہ بھی بتا دوں۔"

"رِشی" ــــ رابی کے باپ نے پُرجوش لہجے میں کہا ــــ "تم نے مجھے خرید لیا ہے۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ کسی کو پتہ نہیں چلے گا کہ تم نے مجھے یہ سارا واقعہ سنایا ہے۔ اگر کچھ باقی رہ گیا ہے تو وہ بھی سُنا دو۔"

"یہ ایسی بات ہے جو مَیں اپنے دل میں نہیں رکھ سکتی" — رِشی نے کہا — "وہ اس لئے کہ آپ دھوکے میں نہ آجائیں۔ بات یہ ہے کہ وہی لڑکی زَینی جس نے دِلی میں رابی کو اپنے جال میں پھانسا تھا، اُسے مَیں نے یہاں لاہور میں دیکھا ہے۔ اُس کے ساتھ اُس آدمی کو بھی دیکھا ہے جو دِلی ایئرپورٹ پر ہمارے استقبال کے لئے موجود تھا۔ اب کسی بھی روز رابی آپ سے کہے گا کہ وہ ایک اونچے خاندان کی بڑی اچھی لڑکی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ پہلے عزیز یہاں آیا تھا۔ اب اُس کی جگہ وہ آدمی آیا ہے جس کا دِلی میں ہمارے ساتھ عبدالرحمٰن کے نام سے تعارف کرایا گیا تھا۔ مَیں نے رابی کو ان لوگوں سے ملتے تو نہیں دیکھا، لیکن میں یقین سے کہتی ہوں کہ زینی اور عبدالرحمٰن اگر یہیں ہیں تو رابی اُن سے ضرور ملتا ہو گا۔ رابی سمجھتا ہے کہ یہ لڑکی اُس پر مرمٹی ہے۔"

"یہ مَیں بہتر جانتا ہوں" — رابی کے باپ نے کہا — "ہمارے نوجوانوں پر اور پاکستان کی حکومت کے اعلیٰ افسروں پر یہ جال پھینکے جاتے ہیں۔ میرے لئے اس سے بڑا حادثہ اور کیا ہو گا کہ میرا بیٹا بھی اپنے ملک کے دشمن کا جاسوس بن گیا ہے۔"

"کیا آپ کو یقین آگیا ہے؟" — رِشی کی ماں نے پوچھا۔

"ہاں سلیمہ!" — رابی کے باپ نے جواب دیا — "رِشی بعض باتیں اچھی طرح نہیں بتا سکی لیکن اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ یہ باتیں میں سمجھتا ہوں ....بہرحال میں تم دونوں کا بہت ہی شکر گزار ہوں کہ تم نے میری عزت افزائی کی۔ میری طرف سے تم بالکل مطمئن رہو۔"

"اب آپ کیا کریں گے انکل؟" — رِشی نے پوچھا۔

"کچھ نہ کچھ تو کروں گا ہی" — رابی کے باپ نے جواب دیا — "مطمئن رہنا۔ تمہارے خلاف کچھ نہیں کروں گا.... مجھے سمجھ نہیں آتی کہ مَیں تمہیں کس طرح خراجِ تحسین پیش کروں۔ انڈیا کے اُن مسلمانوں کو تو میں دل کی گہرائیوں سے خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں جن کے ہاں تم رہی تھیں اور جو پاکستان کی

سلامتی کی خاطر اپنے آپ کو بلکہ اپنے جان و مال کو خطرے میں ڈالے ہوتے ہیں۔"

وہ اُٹھا اور آہستہ آہستہ کمرے سے نکل گیا۔

❄

انڈیا کے وہ مسلمان بہت بڑے خطرے میں آچکے تھے۔ پولیس جب ہمایوں کے مقبرے میں عزیز کی لاش دیکھنے گئی تو اُس نے اُسی پاکستانی نوجوان کو اپنے ساتھ لے لیا جسے عزیز ہمایوں کا مقبرہ دکھانے کے لئے لے گیا تھا۔ اس پاکستانی سے پولیس کو پتہ چلا کہ وہ پاکستانی ہے اور عزیز دِلی کا رہنے والا تھا۔ پاکستانی نوجوان نے پولیس کو بتایا کہ اُسے کس ہوٹل میں ٹھہرایا گیا ہے۔ وہ اس سوال کا جواب نہ دے سکا کہ عزیز کا گھر گھاٹ کہاں ہے۔

پاکستانی نوجوان نے جواب دیا کہ عزیز کس طرح قتل ہوا ہے۔ چونکہ یہ نوجوان پاکستانی تھا اس لئے پولیس نے اسے پریشان کرنا شروع کر دیا یہاں تک کہ پولیس نے اس پر یہ الزام تھوپ دیا کہ عزیز کو اُسی نے قتل کیا ہے۔ اُس پاکستانی سے تھانیدار پوچھتا تھا کہ عزیز کے ساتھ اُس کا رشتہ یا تعلق کیا تھا تو پاکستانی کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیتا تھا۔ پولیس نے اُسے مزید تنگ کیا تو وہ بول پڑا۔

"عزیز انٹیلی جنس کا آدمی تھا" — پاکستانی نے بتایا — "اور مجھے یہاں جاسوسی کی ٹریننگ کے لئے لایا گیا ہے۔"

تھانیدار نے علاقہ ڈی ایس پی کو ٹیلیفون کیا۔ کوئی ایک گھنٹے بعد دو جیپیں آئیں جن میں سے انٹیلی جنس کے کچھ آفیسر اُترے۔ اُس وقت لاش پوسٹمارٹم کے لئے لے جائی جا چکی تھی۔ دونوں جیپیں اُس ہسپتال چلی گئیں جہاں لاش لے جائی گئی تھی۔ اس طرح لاش کی شناخت ہو گئی اور عزیز کے گھر اطلاع دی گئی۔ اُس کے گھر میں جب لاش پہنچی تو کہرام تو بپا ہونا ہی تھا۔ وہ اتنی ساری بہنوں میں ایک ہی بھائی تھا۔ ماں باپ کا اکلوتا تھا لیکن اُس کے باپ پر خاموشی طاری تھی۔ اُس کی آنکھوں میں دو چار آنسو آئے تھے جو اُس نے رومال سے پونچھ ڈالے تھے۔ اُسے تھانے بلایا گیا اور تھانیدار

نے اُس سے پوچھا تھا کہ اُس کا یا عزیز کا یا اُس کے خاندان کا کوئی دشمن تھا؟

"میرا بیٹا اپنا دشمن خود تھا" — عزیز کے باپ نے جواب دیا تھا — "وہ تو مجھے بھی اپنا دشمن سمجھتا تھا۔ آوارہ ہو گیا تھا۔ اپنے بہنوئیوں سے پیسے بٹورتا رہتا تھا۔ گھر سے تو وہ کبھی کا لاتعلق ہو گیا تھا۔ حال ہی میں مجھے پتہ چلا ہے کہ وہ انٹیلی جنس میں باقاعدہ ملازم ہے۔ ان دنوں ملا تھا۔ اس کے بعد پھر غائب ہو گیا تھا۔ میں اُس کی دوستیوں اور دشمنیوں کے متعلق کچھ بھی نہیں بتا سکتا۔"

اُس کی دوستیوں اور دشمنیوں کے متعلق تو انٹیلی جنس والے جانتے تھے۔ متعلقہ تھانہ تو اپنے طور پر تفتیش کر رہا تھا۔ تھانیدار کو جب پتہ چلا کہ مقتول کا تعلق انٹیلی جنس کے ساتھ تھا تو تھانیدار تفتیش میں تیز ہو گیا۔ اُسے احساس ہو گیا کہ یہ عام نوعیت کا قتل نہیں۔ تھانیدار کو پاکستانی نوجوان نے بتایا تھا کہ تین آدمیوں نے فلسطینی حریت پسندوں کی طرح سروں اور چہروں پر بڑے رومال لپیٹے ہوئے تھے تو اُس کو خیال آیا کہ یہ قتل انٹیلی جنس کے سلسلے میں ہوا ہو گا۔

انٹیلی جنس نے اپنی تفتیش شروع کر دی تھی۔ تفتیش کرنے والے دو افسروں نے پاکستانی نوجوان کا بیان لیا تھا۔ اس پاکستانی نے جب یہ کہا کہ قاتلوں نے اُسے کہا تھا کہ تم انڈیا کے جاسوس بننے آتے ہو۔ ویزا ختم ہونے سے پہلے انڈیا سے نکل جانا اور پاکستان میں اپنے ساتھیوں سے کہنا کہ کسی مشکوک آدمی کو دوست سمجھ کر اُس کے ساتھ انڈیا کی سیر کو نہ آئیں تو انٹیلی جنس والوں پر صورتِ حال واضح ہو گئی۔

اسی پاکستانی نے اپنے بیان میں یہ بھی کہا کہ ان میں سے ایک نے یہ بھی کہا تھا کہ تم پاکستانی ہو اور اشوکا ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہو۔

انٹیلی جنس کو اب قتل کا باعث معلوم کرنے کے لئے مزید کاوش کی ضرورت نہیں تھی۔ تفتیش کرنے والے افسروں نے اپنے بڑے افسروں

کو رپورٹ دے کر فیصلہ دے دیا کہ یہ پاکستان کی آئی ایس آئی کا کام ہے اور یہ کاؤنٹر انٹیلی جنس ہے۔ اس فیصلے کی روشنی میں انہیں یہ پاکستانی نوجوان بھی مُشتبہ نظر آنے لگا۔ افسر کہتے تھے کہ یہ ممکن ہے کہ یہ نوجوان انڈیا کا جاسوس بننے کا جھانسہ دے کر آیا ہو اور اس کا درپردہ مقصد یہی ہو کہ عزیز کو قتل کرنا ہے وہ اس نے کر دیا۔

اُنہوں نے اس پاکستانی کو تفتیش کی چکی میں ڈال دیا۔ یہ بڑی ظالم چکی تھی۔ پولیس جب جائے واردات پر پہنچی تھی تو بہت سے لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔ تھانیدار نے ان سے پوچھا تھا کہ کسی نے تین ایسے آدمی دیکھے تھے جن کے سروں اور چہروں پر رومال لپٹے ہوئے تھے؟

کسی ایک نے بھی نہیں کہا تھا کہ اُس نے اس جگہ ایسے تین آدمی دیکھے تھے۔ کوئی شہادت نہ ملنے کی وجہ سے پاکستانی نوجوان پر شُبہ ہوتا تھا کہ قاتل وہی ہے۔ اُسے ایذا رسانی کے عمل میں ڈال دیا گیا۔ انٹیلی جنس کی تفتیش کا طریقہ یہی ہوتا ہے۔

❄

انٹیلی جنس کے افسروں کو عزیز کے قتل سے یہ احساس بھی ہو گیا کہ پاکستان کی انٹیلی جنس (آئی ایس آئی) انڈیا کے اندر آ کر بھی وار کرنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ جب دھیان آئی ایس آئی کی طرف آیا تو میجر بھاٹیہ اور کرنل اوجھا کو عبدالقدیر، ہاشمی اور عزیز کے بہنوئی جمیل کا خیال آ گیا۔ حکم ہوا کہ تینوں کو شاملِ تفتیش کیا جائے۔ انہیں یاد آیا کہ ہاشمی اور عبدالقدیر نے رشی کے اغوا کی تفتیش میں کہا تھا کہ عزیز ہاشمی کی حویلی پر قبضہ کرنا چاہتا ہے یا اونے پونے داموں خریدنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ عزیز ان کے ساتھ عداوت رکھتا ہے۔

کرنل اوجھا اور میجر بھاٹیہ کے ذہنوں میں یہ بھی تھا کہ عزیز بار بار کہتا تھا کہ رشی ہاشمی کے گھر میں تھی اور ان لوگوں نے ہی اُسے اغوا کیا تھا۔ ان افسروں

کی سوچ یہ تھی کہ رشی کو ان لوگوں نے اغوا کیا تھا یا نہیں، اِن کے ساتھ عزیز کی کوئی نہ کوئی دشمنی ضرور تھی۔

قتل کے تیسرے روز عبدالقدیر، ہاشمی اور جمیل انٹیلی جنس ہیڈکوارٹر کے برآمدے میں کھڑے تھے۔ انہیں الگ الگ لے جایا گیا اور ہیڈکوارٹر میں الگ الگ کھڑا کیا گیا تھا۔ سب سے پہلے جمیل کو اندر بلایا گیا۔ اُس سے یہ تسلیم کروایا جارہا تھا کہ اُس کی عزیز کے ساتھ دشمنی تھی۔

"وہ میری بیوی کا بھائی تھا" —جمیل نے کہا— "اُس نے ہمیں پریشان تو بہت کیا تھا لیکن میں ایسی انتقامی کارروائی کی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اُسے قتل کر دیتا۔ میں فوڈ ڈیپارٹمنٹ میں گزیٹڈ پوسٹ پر ہوں ... میں اپنی راتے دے سکتا ہوں۔ عزیز رقم بٹورنے اور بلیک میل کرنے کا عادی تھا۔ اُس کی دوسری عادت یہ تھی کہ دوسروں پہ رُعب گانٹھنے کے لئے اپنا پستول ہاتھ میں لے کر اس کو اُچھالنے لگتا تھا۔ میں نے اُس کی بہن سے کئی بار کہا تھا کہ مجھے خطرہ لگا رہتا ہے کہ عزیز کسی کے ہاتھوں نقصان اُٹھا بیٹھے گا۔ جس شخص نے اپنی اُس بہن کو بھی ذلیل کرنے سے گریز نہیں کیا جو اُسے سب سے زیادہ چاہتی تھی، وہ کسی بھی شخص سے دشمنی مول لے سکتا تھا۔"

جمیل نے تفتیش کرنے والوں کو قائل کر لیا کہ وہ عزیز کا قاتل نہیں ہو سکتا۔

عبدالقدیر کی باری آئی تو اُس نے بھی یہی کہا کہ عزیز کسی نہ کسی سے کچھ رقم کا مطالبہ کرتا ہی رہتا تھا۔ ہاشمی نے بھی یہی کچھ کہا۔ دونوں نے تین آدمیوں کے نام بتلائے جن سے عزیز نے دو دو تین تین ہزار روپے مانگے تھے اور انہیں یہ دھونس دیتا رہا تھا کہ وہ خفیہ پولیس میں افسر لگا ہُوا ہے اور وہ انہیں بغیر مقدمے کے جیل بھجوا دے گا۔

انٹیلی جنس نے ان تینوں آدمیوں کو بلوا لیا۔ تینوں نے عبدالقدیر اور ہاشمی کے بیان کی تصدیق کر دی۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ اُس نے عزیز کو ایک رات اجمیری گیٹ میں طوائفوں کے بازار میں شراب کے نشے

میں بدمست دیکھا تھا اور اُس کی ایک آدمی کے ساتھ لڑائی ہو رہی تھی۔

"میں نے عزیز سے کہہ دیا تھا کہ تم کسی کے ہاتھوں مارے جاؤ گے" —اس آدمی نے اپنے بیان میں کہا— "لیکن عزیز کو ایک تو اپنے چھوٹے سے پستول پر ناز تھا اور دوسرا ناز یہ کہ وہ خفیہ پولیس کا افسر ہے۔ میرے ایک دوست سے اُس نے کہا تھا کہ وہ کسی مسلمان کو گولی مار دے تو اُسے کوئی نہیں پکڑے گا۔"

اس طرح ان تمام آدمیوں نے عزیز کے خلاف ایسی باتیں کیں جن سے انٹیلی جنس کے افسروں کو شک ہو گیا کہ عزیز نے نہ جانے کس کس کو اپنا دشمن بنا رکھا تھا اور ان میں سے کس نے اُسے قتل کر دیا ہے۔ اس دوران عزیز کے باپ کو بھی بلایا گیا اور اُس سے پوچھا گیا تھا کہ اُسے کچھ علم ہو گا کہ عزیز کی کسی کے ساتھ دشمنی ہو گی۔ باپ نے وہی جواب دیا تھا جو اُس نے تھانیدار کو دیا تھا۔

"میرا بیٹا زندہ تھا تو بھی میرے لئے مرا ہُوا تھا" —باپ نے کہا— "اب وہ دنیا سے اُٹھ گیا ہے تو مجھے اطمینان ہو گیا ہے۔ میں اس اذیت میں مبتلا رہتا تھا کہ میرا اکلوتا بیٹا اسی شہر میں موجود ہے اور بدمعاشیاں کرتا پھر رہا ہے اور میں اُس کی صورت تک نہیں دیکھ سکتا۔ کوئی مجھے کہتا تھا کہ آج عزیز کو فلاں جگہ دیکھا تھا تو میرے دل کو بہت تکلیف ہوتی تھی۔"

"آپ ہماری مدد کریں" —کرنل اوجھا نے اُسے کہا— "ہم اُس کے قاتل کو پکڑنا چاہتے ہیں ... کیا عبدالقدیر، فریدالدین ہاشمی اور اپنے داماد جمیل پر آپ کو شک نہیں؟"

"صاحب! کیا بات کر رہے ہیں!" —عزیز کے باپ نے کہا— "ایک تو میرا داماد ہے جو مجھے سگے بیٹوں سے زیادہ عزیز ہے۔ دوسرے دونوں حضرات کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ باعزت زندگی بسر کرنے والے لوگ ہیں۔ انتہائی شریف، وضعدار اور شائستہ۔ انہوں نے تو کبھی مکھی نہیں ماری ہو گی۔ یہ تو خود مرے رہتے ہیں ... میں ایک بات کہنا چاہتا

ہوں۔ میرے بیٹے نے اپنے کئے کی سزا پالی ہے۔ میں کسی کے خلاف مقدمہ نہیں چلانا چاہتا نہ میں شکایت کروں گا کہ میرے بیٹے کے قاتلوں کو پکڑا نہیں گیا یا پکڑنے کی کوشش نہیں کی گئی۔"

انٹیلی جنس کو عزیز کے ساتھ صرف یہ دلچسپی تھی کہ وہ اُن کا تجربہ کار آدمی تھا اور پاکستان کے خلاف اُس نے کامیاب تخریبی کارروائیاں کرائی تھیں۔ اُس نے پاکستان کے متعدد نوجوانوں کو پاکستان میں جاسوسی اور تخریب کاری کے لئے تیار کیا تھا۔ عزیز مر گیا تو اُس کی جگہ لینے کے لئے انٹیلی جنس کے پاس عزیز جیسے اُستادوں کی کمی نہیں تھی۔ انٹیلی جنس کو عزیز کے قتل سے یہ دلچسپی تھی کہ وہ پاکستانی ایجنٹوں کے ہاتھوں نہ مارا گیا ہو۔ ایسے ایجنٹوں کو پکڑنا ضروری تھا ورنہ یہ سلسلہ انڈین انٹیلی جنس کے لئے بہت خطرناک تھا۔

انٹیلی جنس نے عبدالقدیر، ہاشمی اور جمیل کو دو دو دن اپنے پاس رکھا تھا۔ انہیں راتوں کو بھی آرام نہیں کرنے دیا جاتا تھا۔ ہر لمحہ ان سے پوچھ گچھ جاری رہتی تھی۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کر دیا اور تفتیش کرنے والوں سے منوا لیا کہ عزیز اپنی بدمعاشیوں کا شکار ہو گیا ہے۔ ان سب کو تفتیش سے فارغ کر دیا گیا۔

یہ عبدالقدیر کی قیادت اور ماہرانہ ہدایت کاری کا کمال تھا۔ عزیز کو قتل کرنے والوں نے جب اُسے رپورٹ دی تھی کہ وہ اپنا کام کوئی سراغ چھوڑے بغیر کر آئے ہیں تو وہ ہاشمی کے گھر گیا۔ اُسے بتایا اور اُسے ساتھ لے کر جمیل کے گھر چلا گیا۔ جمیل کو بتایا کہ عزیز کو صاف کر دیا گیا ہے۔

"آپ نے بہت بڑا کام کیا ہے" ۔۔۔ جمیل نے کہا تھا ۔۔۔ "قتلِ مرتد جائز ہے۔"

"یہ کام تو ہو گیا ہے" ۔۔۔ عبدالقدیر نے کہا تھا ۔۔۔ "لیکن انتہائی خطرناک کام اب شروع ہو گا۔ اگر آپ سب نے میرے کہنے پر عمل کیا تو یہ مرحلہ بھی بخیر و خوبی طے ہو جائے گا۔ مُرتد اور غدار کو قتل کرنے والے سرخرُو

ہو گئے ہیں۔ اب ہمارے امتحان کا وقت آگیا ہے۔"

"کام بتائیے عبدالقدیر صاحب!" ۔۔۔ جمیل نے کہا ۔۔۔ "تمہید ہو چکی۔"

"عزیز کے قتل کی تفتیش متعلقہ تھانے میں اتنی نہیں ہو گی جتنی انٹیلی جنس والے کریں گے" ۔۔۔ عبدالقدیر نے کہا تھا ۔۔۔ "عزیز کے دشمنوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر شامل تفتیش کیا جاتے گا۔ اُس کے دشمنوں کی فہرست میں سب سے اوپر ہم تینوں کے نام ہوں گے۔ یاد کریں، یہ کل کی بات ہے کہ رشی کے اغوا کے سلسلے میں ہمیں انٹیلی جنس ہیڈ کوارٹر میں بلایا گیا تھا اور ہم نے ثابت کر دیا تھا کہ عزیز نے ہمیں دشمنی کی بنا پر اس واردات میں پکڑوانے کی کوشش کی ہے۔"

"وہ سب ہمیں یاد ہے" ۔۔۔ جمیل نے کہا ۔۔۔ "آگے چلئے۔"

"اگر ہمیں بلایا جاتا ہے تو میں آپ کو بتاتا ہوں کہ کیا بیان دینا ہے" ۔۔۔ عبدالقدیر نے کہا اور انہیں وہ بیان یاد کروا دیا جو ان سب نے دیا۔

"لیکن وہ تین آدمی کون ہوں گے جن کے ہم نام بتائیں گے کہ جمیل نے اُن سے رقم مانگی تھی؟" ۔۔۔ جمیل نے پوچھا۔

"یہ نام میں اور ہاشمی صاحب اپنے اپنے بیان میں شامل کریں گے" عبدالقدیر نے کہا ۔۔۔ "جمیل صاحب!" ۔۔۔ آپ اتنا ہی کہیں گے کہ وہ کسی نہ کسی سے رقم مانگنے اور بلیک میل کرنے کا عادی تھا۔ میں اور ہاشمی جن تین آدمیوں کے نام لیں گے، میں ان کے پاس جا رہا ہوں۔ وہ اپنے آدمی ہیں۔ میں انہیں پڑھا دوں گا کہ انہیں اگر بلایا جاتے تو وہ کیا بیان دیں۔"

اس کے بعد عبدالقدیر ان تینوں آدمیوں سے ملا اور انہیں اچھی طرح سمجھا دیا کہ وہ کیا بیان دیں۔ انہوں نے عبدالقدیر اور ہاشمی کے ان بیانات کی تصدیق کرنی تھی کہ عزیز دوسروں سے پیسے مانگتا، اُن پر رُعب جھاڑتا اور اُنہیں بلیک میل کرتا تھا۔ یہ تینوں آدمی عبدالقدیر اور ہاشمی کے محاذ کے

بڑے ذہین ممبر تھے۔ انہوں نے پوری خود اعتمادی سے بیان دیا اور اس طرح یہ سب لوگ انٹیلی جنس کے جال سے نکل آتے۔

❋

رابی کا باپ رشی کے گھر سے واپس آیا تو وہ اس قدر کھویا کھویا سا تھا کہ اُس کی بیوی نے اُس کی یہ حالت محسوس کی اور وجہ پوچھی۔ رابی کے باپ کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ وہ اس سلسلے میں اپنی بیوی کو اعتماد میں لے یا نہ لے۔ اُسے خیال آیا کہ ماں نے ہی رابی کو بگاڑا تھا۔ وہ تو مانے گی ہی نہیں کہ اُس کا بیٹا ذِلت کی کس حد تک پہنچا ہوا ہے۔

"کوئی خاص بات نہیں"—رابی کے باپ نے اپنی بیوی کے سوال کے جواب میں کہا—"کام کچھ زیادہ ہو گیا ہے اور ایک دو سرکاری مسئلے آپڑے ہیں۔"

رابی کو اُس نے گھر میں پابند کر دیا تھا۔ اُس نے رابی سے پوچھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی کہ اُس کے خلاف یہ شک یا الزام کہاں تک صحیح ہے کہ وہ انڈیا کے لئے جاسوسی کر رہا ہے۔ اُسے بیوی نے یاد دلایا کہ اُس نے کھانا نہیں کھایا۔ رابی اور اُس کی ماں کھانا کھا چکے تھے۔ رابی کے باپ نے کہہ دیا کہ وہ کھانا کھا کر آیا ہے حالانکہ اُس نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ رشی کے ہاں اُس نے چائے پی تھی اور ایک پیٹیز کھائی تھی۔ اُس کی طبیعت اس طرح بھری بھری تھی کہ وہ کھانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کر رہا تھا۔ وہ اپنے سٹڈی روم میں یہ کہہ کر چلا گیا کہ تم سو جاؤ، میرا کوئی پتہ نہیں کہ میں کس وقت فارغ ہوں گا۔

سٹڈی رُوم میں اُس کے کرنے کے بہت کام تھے لیکن ان فائلوں سے اُسے الرجی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک دفعہ تو اُس نے یُوں محسوس کیا جیسے اُس نے فائل کو ہاتھ لگایا تو اُس کا ہاتھ جل جائے گا۔

ان فائلوں کی طرف دیکھنے سے وہ کترانے لگا جیسے کمرے میں اُسے ایک آواز سنائی دی ہو کہ ہاتھ پیچھے رکھو۔ تم اس قابل نہیں کہ قوم کی اس امانت کو سنبھال سکو۔ تمہارے خون میں غداری کی ملاوٹ ہے۔ اُسے یُوں لگا جیسے اللہ کا ہاتھ اُسے پیچھے کو دھکیل رہا ہو۔

اُسے کمرے میں شور سا سنائی دینے لگا جو بڑھتا ہی گیا پھر وہ خود اس شور کی لپیٹ میں آگیا۔ اس شور سے صاف صاف آوازیں اُٹھنے لگیں۔ یہ عورتوں اور بچّوں کی چیخیں اور آہ و بکا تھی۔ دوڑتے بھاگتے قدموں کی آوازیں تھیں۔ ہندوؤں کے جے کارے تھے اور سکھوں کی للکار تھی۔ چیخ و پکار کا یہ ہنگامہ تیز و تند آندھی بن گیا اور رابی کا باپ کاغذ کے چھوٹے پُرزے کی طرح اس آندھی میں اُڑنے لگا۔

شور اچانک تھم گیا۔ رابی کے باپ کو لاشیں ہی لاشیں نظر آنے لگیں۔ اُس کا ذہن پیچھے کو بھاگنے لگا اور گزرے ہوئے لمحوں کی منزلیں طے کرتا ہوا ایک مقام پر رُک گیا جہاں اُسے ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں برصغیر کے مسلمان نظر آنے لگے۔ وہ اجتماع کی صورت میں اکٹھے کھڑے تھے۔ رابی کے باپ کو فلک شگاف نعرے سنائی دینے لگے—"لے کے رہیں گے پاکستان۔ بٹ کے رہے گا ہندوستان۔"

اُسے وہ وقت یاد آنے لگا جب وہ سرکاری ملازم ہوتے ہوئے تحریکِ پاکستان کا سرگرم رُکن تھا۔

ان یادوں سے خون ٹپک رہا تھا۔ اُسے خیال آیا کہ پاکستان کی تاریخ معصوم بچّوں کے خون سے لکھی گئی ہے۔

تحریکِ پاکستان کے شہیدوں کا خون یاد آیا تو اُس کا دھیان اُس خون کی طرف چلا گیا جو مشرقی پاکستان میں بھائیوں نے بھائیوں کا بہا دیا تھا پھر اُس کے ذہن میں وہ خون آگیا جو کراچی اور سندھ میں بہہ رہا ہے۔ اُسے دھماکے سنائی دینے لگے۔ یہ اُن پراسرار بموں کے دھماکے تھے جن کے متعلق آج تک سراغ نہیں مل سکا۔

رابی کے باپ کو معلوم تھا کہ وہ کون سے پُراسرار ہاتھ ہیں جو یہ بم رکھتے ہیں۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ مشرقی پاکستان میں بھائی کو بھائی کے ساتھ کس نے ٹکرایا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ خون جو کراچی میں بہہ رہا ہے اور خونچکاں

فسادوں کی جو کیفیت سارے پاکستان میں پائی جاتی ہے اس کے پیچھے
کس کا ہاتھ ہے۔

اُس کا خون کھولنے لگا۔ بے قراری اور بے چینی کی اس کیفیت
اُس کی نظریں اپنے بریف کیس پر پڑیں جس میں پاکستان کے انتہائی نازک
راز بند تھے۔ اُس کا بریف کیس سپیرے کی پٹاری بن گیا۔ وہ یوں پیچھے
ہٹ گیا جیسے اس پٹاری سے سیاہ کالا سانپ نکلے گا اور اُسے ڈس
لے گا۔

سانپ اُس کے گھر میں موجود تھا۔ یہ اُس کا اپنا بیٹا تھا۔ اس ذہنی
کیفیت میں جب اُسے اپنے اکلوتے بیٹے کا خیال آیا تو ایک تیر اُس
کے دل میں اُتر گیا — "کیا میرا بیٹا وہ خفیہ اور پُراسرار ہاتھ ہے جو پاکستان
میں تخریب کاری کر رہا ہے؟"

باپ کے بناتے ہوئے پاکستان کو بیٹا تباہ کر رہا تھا۔
باپ کو اپنا بیٹا ایسا دشمن نظر آنے لگا جیسے پاکستان کے مسلمانوں
کا خون وہی بہا رہا ہو۔

وہ اُٹھا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ ٹہلتے ٹہلتے اُس نے گھڑی دیکھی
رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ نیند اُس سے کوسوں دُور تھی۔ اُس کے جسم کا
رُواں رُواں بیدار تھا۔ وہ رُک گیا اور اُس نے ایک فیصلہ کر لیا۔ تب اُس
نے کپڑے اُتارے، سلیپنگ سوٹ پہنا اور لیٹ گیا۔

صبح سویرے وہ معمول سے بہت پہلے اُٹھا۔ ناشتہ کیا۔ ناشتے کے
دوران اُس نے اپنی بیوی سے کہا کہ وہ اسلام آباد جا رہا ہے۔ رات تک
واپس آجائے گا۔ اگر رات کو نہ آسکا تو اگلے روز آجائے گا۔

❋

دن کے گیارہ بج رہے تھے جب رابی کا باپ اسلام آباد میں
آئی ایس آئی کے چیف میجر جنرل کے دفتر میں داخل ہو رہا تھا۔ میجر جنرل
اُسے دیکھ کر اُٹھ کھڑا ہوا اور آگے آکر اُس سے ہاتھ ملایا۔ وہ ایک

دوسرے کو بڑی اچھی طرح جانتے تھے۔ میجر جنرل اُس وقت اپنی کرسی
پر بیٹھا جب رابی کا باپ بیٹھ گیا تھا۔

"کہیئے ملک صاحب!" — میجر جنرل نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے
پوچھا — "آج ہماری یاد کیسے آگئی؟ ہماری آخری ملاقات غالباً چیف آف
آرمی سٹاف کے ڈنر پر ہوئی تھی۔ ڈیفنس کمیٹی کے تمام ممبر موجود تھے۔"

"مجھے یاد ہے جنرل صاحب!" — رابی کے باپ نے کہا — "آپ
کی یاد تو ہر وقت میرے دل میں رہتی ہے۔ اپنے اس بریف کیس کو دیکھتا
ہوں تو آپ ضرور یاد آتے ہیں۔ وہ خفیہ خزانہ اسی میں بند ہے جو حاصل
کرنے کے لئے انڈیا کی سیکرٹ سروس کوششوں میں لگی رہتی ہے اور اس
کی حفاظت آپ کر رہے ہیں۔"

"نہیں ملک صاحب!" — میجر جنرل نے کہا — "اس کے محافظ
تو آپ خود ہیں... آپ کچھ تھکے تھکے سے لگ رہے ہیں۔"

"جنرل خان!" — رابی کے باپ نے کہا — "آپ نے ٹھیک
محسوس کیا ہے۔ میں رات بھر سو نہیں سکا۔"

"کام کی زیادتی کی وجہ سے؟"

"نہیں!" — ملک نے جواب دیا — "پریشان ہوں۔ پریشانی بھی
ایسی ہے جو بتاتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ یہی پریشانی مجھے آپ کے
پاس لے آئی ہے۔"

"ایسی کون سی پریشانی ہے ملک صاحب!" — آئی ایس آئی کے
چیف نے کہا — "میرے اختیار میں جو کچھ ہوا کروں گا۔"

"کیا آپ کے پاس میرے بیٹے کی کوئی رپورٹ آئی ہے؟" —
رابی کے باپ نے پوچھا — "اُس کا نام رب نواز ہے۔ وہ رابی کے
نام سے مشہور ہے۔"

"ملک صاحب!" — میجر جنرل نے کہا — "اگر یہ معاملہ آئی ایس آئی
سے تعلق رکھتا ہے تو میں کچھ بھی نہیں بتا سکوں گا۔ آپ میرے محکمے کو

اور میرے فرائض کی نزاکت کو تو سمجھتے ہیں۔"

"ہاں ہاں!" — ملک نے کہا — "اپنے فرائض کی نزاکت اور پابندیوں کا خیال رکھیں۔ میں جس رپورٹ کا ذکر کر رہا ہوں، وہ آپ تک پہنچی ہے یا نہیں، میں یہ رپورٹ خود آپ کو دینا چاہتا ہوں" — روکنے کے باوجود ملک کی آہ نکل گئی اور اُس نے بے چینی سے کرسی پر کروٹ بدلی پھر کہنے لگا — "میرا بیٹا انڈیا کی 'را' کے جال میں آگیا ہے اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ میری فائلوں میں سے کچھ انفارمیشن انڈیا کو دے چکا ہے۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ انڈیا کی سیر کو گیا تھا۔"

"پہلے یہ بتایئے" — میجر جنرل نے پوچھا — "کہ آپ کو کس طرح پتہ چلا ہے کہ آپ کا بیٹا انڈیا کے لئے کام کر رہا ہے؟"

"میں نے اُسے ایک بڑی ہی اہم فائل کے کچھ کاغذات کی فوٹوسٹیٹ کاپیاں کراتے پکڑا ہے" — رابی کے باپ نے جواب دیا — "ایک کیمسٹ کی دُکان میں اُسے پکڑا ہے۔ میں نے کیمسٹ کو الگ کر کے پوچھا کہ رابی پہلے بھی اس قسم کے کاغذات کے فوٹوسٹیٹ کراتا رہا ہے؟ کیمسٹ نے بتایا کہ وہ تین مرتبہ اس قسم کی فائل لایا اور چند ایک کاغذات کی فوٹوسٹیٹ کاپیاں کروائی تھیں۔"

"کیا آپ اپنی اہم اور سیکرٹ فائلیں گھر میں کھُلی رکھتے ہیں؟" — میجر جنرل نے پوچھا۔

"کھُلی تو نہیں رکھتا" — ملک نے جواب دیا — "میرے بیٹے نے دیکھ لیا تھا کہ میرے بریف کیس کا تالا کن نمبروں پر کھُلتا ہے.... میں نے پوری انکوائری کر لی ہے۔ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میرا بیٹا انڈیا کا باقاعدہ جاسوس بن چکا ہے۔"

"دِلی میں اُس کی برین واشنگ کی گئی ہوگی" — میجر جنرل نے کہا — "اور اُسے وہاں ٹریننگ بھی دی گئی ہوگی.... اس کی بیوی اُس

کے ساتھ تھی۔ اُسے بھی انڈیا میں ٹریننگ ملی ہوگی۔ میں نے آپ کی بہو کو دیکھا تو نہیں۔ وہ جوانی کی عمر میں ہوگی۔"

"نوجوانی کی عمر میں!" — ملک نے کہا — "اُسے کوئی ٹریننگ نہیں ملی۔ اُسے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ اُس کا خاوند کس خفیہ مقصد کے لئے دِلی لے جایا جا رہا ہے۔"

رابی کے باپ نے آئی ایس آئی کے چیف کو تفصیل سے بتایا کہ اُس نے کس طرح معلوم کیا ہے کہ اُس کا بیٹا جاسوس ہے۔ رشی نے اُسے جو روئیداد سنائی تھی وہ اُس نے میجر جنرل خان کو اس طرح بیچ بیچ کر سُنا دی کہ رشی کے خلاف یہ بات نہ پیدا ہو جائے کہ اُس نے آئی ایس آئی کی ہدایت کے باوجود رابی کے باپ کو ساری بات بتا دی ہے۔

"ملک صاحب!" — میجر جنرل نے پوچھا — "اگر آپ اپنے بیٹے کو گرفتاری یا سزا سے بچانا چاہتے ہیں تو میں آپ سے وعدہ نہیں کر سکتا کہ آئی ایس آئی اُس کی طرف دیکھے گی بھی نہیں۔ دو باتیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ دشمن کا جاسوس ہے اور دوسری بات یہ کہ وہ جاسوس نہیں۔ اگر نہیں تو سفارش کی ضرورت ہی نہیں۔ انویسٹیگیشن میں وہ بے گناہ ثابت ہو جائے گا تو اُسے باعزت طور پر چھوڑ دیا جائے گا۔ اگر ثبوت مل گیا کہ وہ جاسوس ہے تو پھر ملک صاحب! میں معذرت سے کہوں گا کہ میں اُس کی کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔"

"میں سفارشی بن کر نہیں آیا جنرل خان!" — رابی کے باپ نے کہا — "نہ مجھے کسی قسم کی مدد کی ضرورت ہے۔ میں جس مقصد کے لئے آیا ہوں وہ آپ کو حیران کر دے گا۔ اگر میرا بیٹا جاسوس ہے تو اُسے پوری سزا ملنی چاہیئے۔ اگر آپ اس نتیجے پر پہنچیں کہ انڈین سیکرٹ سروس تک جو انفارمیشن پہنچی ہے وہ میری کوتاہی کی وجہ سے پہنچی ہے تو مجھے بھی سزا دیں۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ آپ ضرور حیران ہوں گے کہ یہ کیسا باپ ہے

جو بیوروکریسی کے اتنے اعلیٰ عہدے پر ہوتے ہوئے اپنے بیٹے کو بچانے کی بجائے اُسے سزا دلانے کی باتیں کر رہا ہے۔ میرے جذبات کچھ ایسے ہیں کہ مَیں اپنے بیٹے کی بجائے پاکستان کو زیادہ عزیز سمجھتا ہوں۔ اِس پاکستان کے نام پر میرا ایک سگا بھائی اپنے چھوٹے چھوٹے دو بچوں اور اُن کی ماں کے ساتھ شہید ہو گیا تھا۔" اُس پر رقت طاری ہو گئی اور اُس کے آنسو نکل آئے۔

میجر جنرل اتنا متاثر ہُوا کہ کچھ دیر تک وہ کچھ کہہ ہی نہ سکا۔

"معافی چاہتا ہوں جنرل خان!" — ملک نے کہا — "مَیں پاکستان کے معاملے میں کچھ زیادہ ہی جذباتی ہوں۔"

"پاکستان کے معاملے میں تو ہر پاکستانی کو اسی طرح جذباتی ہونا چاہئے" — میجر جنرل نے کہا — "لیکن یہ پاکستان کی بدنصیبی ہے کہ یہ جذبات ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔"

"اگر میرا بیٹا جاسوس ثابت ہو گیا تو یہ میری زندگی کا سب سے بڑا حادثہ ہوگا" — رابی کے باپ نے کہا — "مَیں اس صورت میں سروس سے استعفیٰ دے دوں گا۔"

"کوئی ثبوت تو ملنے دیں" — میجر جنرل نے کہا۔

❋

آئی ایس آئی کا یہ میجر جنرل رابی کے باپ کو بتانا نہیں چاہتا تھا کہ رابی کی پوری رپورٹ اُس تک پہنچ چکی ہے اور اس پر وہ اپنے احکام جاری کر چکا ہے اور وہ تفتیش کی باقاعدہ رپورٹ لے رہا ہے۔ جاسوسی کے ملزموں میں سے کسی ایک کو نہیں پکڑا جاتا بلکہ ایک دو ملزموں کی حرکات و سکنات کو دیکھا جاتا ہے تاکہ ان کا سارا گروہ جسے رِنگ کہتے ہیں پکڑا جائے۔ ایک ملزم کے پکڑے جانے سے رِنگ کے باقی افراد روپوش ہو جاتے ہیں۔ رابی کو بھی آئی ایس آئی نے اپنی نظروں میں رکھ لیا تھا۔

آئی ایس آئی کے چیف کے ساتھ اس ملاقات کے چھ سات روز بعد رابی کا باپ لاہور میں تھا۔ اُس نے رابی کو گھر میں نظر بند کر دیا تھا لیکن اسلام آباد سے واپس آ کر اُس نے رابی کو اپنے کمرے میں بلایا اور اُسے گھر سے نکلنے اور گھومنے پھرنے کی اجازت دے دی۔

"دیکھو بیٹا!" — اُس نے رابی سے کہا — "اب کوئی کام کرو۔ فراغت بہت بُری چیز ہے۔ فارغ ذہن کو شیطان کا کارخانہ کہتے ہیں۔ اگر تم کنسٹرکشن کی ٹھیکیداری کرنا چاہو تو میں تمہاری بہت مدد کر سکتا ہوں۔ مَیں نے تمہیں اسی لئے ایک تجربہ کار بلڈنگ کنسٹرکٹر کے ساتھ لگایا تھا کہ کچھ سیکھ لو۔"

"ایک بات کہوں ڈیڈی!" — رابی نے بھولے بھالے سے بچوں کی طرح کہا — "آپ خفا تو نہیں ہوں گے؟"

"کہو بیٹا!" — باپ نے کہا — "خفا ہونے والی بات ہوئی تو بھی خفا نہیں ہوں گا۔"

"میری شادی کر دیں" — رابی نے کہا۔

"رشی کو نہ لے آئیں؟" — باپ نے پوچھا۔

"نہیں ڈیڈی!" — رابی نے جواب دیا — "اس نے مجھے دِلّی میں بہت شرمسار کیا ہے۔ سیر کا سارا مزہ کرکرا کر دیا تھا۔ یہ میری بھول تھی کہ ممی کے منع کرنے کے باوجود مَیں نے رشی کے ساتھ شادی کر لی تھی۔ اگر وہ اتنی بُری نہیں تو بھی ممی کو رشی ذرا سی بھی اچھی نہیں لگتی۔ میں اُسے طلاق دے دیتا ہوں۔"

"پھر کوئی ایک لڑکی ڈھونڈنی پڑے گی" — باپ نے کہا۔

"وہ مَیں نے ڈھونڈ لی ہے" — رابی نے جواب دیا — "اُس کا خاندان انڈیا کا رہنے والا ہے۔ لڑکی کے ساتھ دِلّی میں ملاقات ہوئی تھی۔ اُس کا نام زینی ہے۔ میرا خیال تھا کہ یہ بھی رشی جیسی فیملی کی لڑکی ہو گی لیکن معلوم ہُوا کہ یہ بڑی اچھی فیملی ہے اور سوسائٹی میں ان لوگوں کی عزت بھی ہے۔ یہ لڑکی اپنے بھائی کے ساتھ پاکستان کی سیر کے لئے آئی ہوئی ہے۔"

"کیا اس کی شادی کا فیصلہ اس کا بھائی کرے گا؟"

"نہیں ڈیڈی!"۔۔۔ رابی نے جواب دیا۔۔۔ "اُس کے دو چچے اور ایک تایا کراچی میں ہیں۔ میں نے لڑکی کے بھائی کے ساتھ بات کی ہے۔ اُس نے مجھے یہ خوشخبری سنائی ہے کہ وہ اپنے والدین سے شادی کی اجازت لے کر آئے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ ان کا تایا اور چچا ہم سے مل کر اور ہمارا گھر وغیرہ دیکھ کر اپنی تسلی کر لیں تو شادی کا فیصلہ کر دیں گے۔"

رابی کے باپ نے اُس کی ماں کو بلایا اور اُسے بتایا کہ رابی کیا کہہ رہا ہے۔

"یہ میرے ساتھ بات کر چکا ہے"۔۔۔ ماں نے کہا۔۔۔ "مَیں نے ہی اسے کہا تھا کہ ڈیڈی کے ساتھ بات کرو۔ میں تو کہتی ہوں کہ لڑکی اور اُس کے بھائی کو کھانے یا چائے پر بلا کر دیکھ لیتے ہیں۔ ان کے طور طریقوں سے ہی ان کے خاندان کی اونچ نیچ کا پتہ چل جائے گا۔"

"مَیں دلی میں لڑکی کے والدین سے ملا تھا"۔۔۔ رابی نے جھوٹ بولا ۔۔۔ "بہت اچھے لوگ ہیں۔"

"رِشی اور اُس کی ماں جیسے بدنام تو نہیں ہوں گے"۔۔۔ رابی کی ماں نے کہا۔

"بالکل نہیں"۔۔۔ رابی نے پُرجوش لہجے میں کہا۔۔۔ "وہ نیک نام لوگ ہیں۔"

رابی کے ماں باپ نے فیصلہ کیا کہ رابی زینی اور اُس کے "بھائی" کو کسی دن گھر مدعو کرے۔

اُسی شام کا واقعہ ہے، رابی کا باپ کہیں باہر نکل گیا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ رات گیارہ بجے تک واپس آئے گا۔ رابی باپ کی سٹڈی میں داخل ہُوا۔ اُس کا باپ بریف کیس اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ رابی نے میز کا دراز کھولا۔ اس میں ایک فائل پڑی ہوتی تھی۔ یہ ٹاپ سیکرٹ فائل تھی۔ رابی نے کھول کر دیکھی تو اُس کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ ورما اُسے کئی بار کہہ چکا تھا کہ اس سبجیکٹ کی فائل ہاتھ آ جائے تو اُسے وہ مُنہ مانگے پیسے دلا سکتا ہے۔

یہ فائل رابی کے ہاتھ آ گئی تھی۔ اس کا سبجیکٹ یہ تھا کہ پاکستان سے سکھوں کو کس قسم کی اور کتنی مدد مل رہی ہے اور اب تک پاکستان سکھوں کو کیا کچھ دے چکا ہے۔

رابی بہت خوش ہُوا۔ اُس کا باپ اتنی اہم فائل دراز میں بھُول گیا تھا۔ رابی نے جلدی جلدی سے کاغذات پڑھنے شروع کر دیئے۔ اُسے دو رپورٹیں نظر آئیں۔ یہ مجموعی رپورٹیں تھیں۔ ایک گذشتہ سال کی تھی جس میں اعداد و شمار دیئے گئے تھے کہ پاکستان اور چین کی طرف سے سکھوں کو کون کون سا اسلحہ، ایمونیشن اور دیگر سامان بھیجا گیا۔ دوسری رپورٹ رواں سال کی پہلی ششماہی کی تھی۔ اس میں چھ مہینوں کے اکٹھے اعداد و شمار دیئے گئے تھے۔

رابی نے یہ دونوں رپورٹیں فائل سے نکالیں۔ انہیں تہہ کرنے کی بجائے رول کیا اور باہر نکل گیا۔ اپنی گاڑی میں بیٹھا اور بڑی تیز رفتار سے گاڑی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

گاڑی اُسی کیمسٹ کی دکان کے سامنے جا رُکی جہاں سے وہ فوٹوسٹیٹ کاپیاں کرایا کرتا تھا۔ وہ گاڑی سے نکل کر دُکان میں داخل ہو گیا اور آگے جا کر فوٹوسٹیٹ مشین کے قریب جا رُکا۔ کیمسٹ اُس کے پاس آیا۔ رابی نے اُسے باپ کی فائل سے نکالے ہوتے کاغذ دیئے اور کہا کہ جلدی کرے۔

"مسٹر رابی!"۔۔۔ کیمسٹ نے اُسے کہا۔۔۔ "اُس روز آپ کے ڈیڈی کچھ ناراض سے لگتے تھے۔"

"بہت تھکے ہوتے تھے"۔۔۔ رابی نے کہا۔۔۔ "آئندہ نہ بتانا۔ یہ میری ایک ہابی ہے جو اُنہیں پسند نہیں۔"

"بہتر مسٹر رابی!"۔۔۔ کیمسٹ نے کہا۔۔۔ "آئندہ نہیں بتاؤں گا۔"

رابی فوٹوسٹیٹ کاپیاں لے کر اور پیسے دے کر دکان سے نکلا۔

گاڑی میں بیٹھا اور اپنے گھر جا پہنچا۔ باپ کی سٹڈی میں جا کر اصل کاغذات فائل میں وہیں لگا دیے جہاں سے نکالے تھے۔ فائل دراز میں رکھی اور کمرے سے نکل کر ماں کے پاس گیا۔

"ممی!"۔۔۔ اُس نے بچوں کی طرح کہا۔۔۔ "میں آج کھانا نہیں کھاؤں گا۔ ڈیڈی کو بتا دینا۔"

وہ گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی گلبرگ کی ایک کوٹھی کی اُس انیکسی کے سامنے جا رُکی جہاں زَینی اور ورما ٹھہرے ہُوئے تھے۔ وہ کھانے کے لئے بیٹھ ہی رہے تھے۔ رابی کو دیکھ کر سب نے نعرہ لگانے کے انداز سے رابی کا استقبال کیا اور اُسے کھانے پر بٹھا لیا۔

رابی نے فوٹوسٹیٹ کاپیاں جیب سے نکالیں اور ورما کے آگے رکھ دیں۔ ورما نے کاپیاں پڑھیں اور بڑی زور سے ڈائننگ ٹیبل پر ہاتھ مارا۔

"زندہ باد رابی!"۔۔۔ ورما نے کہا اور یہ کاپیاں ادھیڑ عمر آدمی کے آگے رکھ کر کہا۔۔۔ "دیکھئے خان صاحب! یہ ہوتی نا بات! کیا کوئی اور ایسی انفارمیشن دے سکتا ہے؟"

خان صاحب نے بھی رابی کو خراجِ تحسین پیش کیا اور اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ واپس آیا تو اُس کے ہاتھ میں سَو سَو کے نوٹوں کی ایک گڈی تھی۔

"یہ لے پاکستانی شیر!"۔۔۔ خان صاحب نے کہا۔۔۔ "تیری قیمت تو بہت ہی زیادہ ہے۔"

"مجھے اس قیمت کی تو ضرورت نہیں"۔۔۔ رابی نے نوٹوں کا بنڈل اپنی جیب میں ٹھونس لیا اور زَینی کی طرف دیکھا۔ مسکرا کر کہنے لگا۔۔۔ "مجھے صرف ایک قیمت چاہیئے، پھر مجھے ان کاغذوں کی ضرورت نہیں رہے گی۔"

"یہ قیمت بھی مل جائے گی"۔۔۔ ورما نے کہا۔۔۔ "یہ تمہارے لئے ہی تو آئی ہے۔"

"مَیں نے آج ممی اور ڈیڈی کے ساتھ بات کر لی ہے"۔۔۔ رابی نے کہا۔۔۔ "مَیں نے زَینی، ورما اور آپ سب کے متعلق وہی باتیں بتائی ہیں جو آپ لوگوں نے مجھے بتائی تھیں"۔۔۔ اُس نے ہنس کر کہا۔۔۔ "ورما کو زینی کا بھائی بتایا ہے .... ممی اور ڈیڈی نے کہا ہے کہ لڑکی اور اُس کے بھائی کو کسی دن کھانے یا چائے پر بلا لو۔ آپ بتائیں کہ زَینی اور ورما کس روز میرے گھر چلیں گے۔"

"پھنسا نہ دینا رابی!"۔۔۔ خان صاحب نے کہا۔

"نہ خان صاحب!"۔۔۔ رابی نے کہا۔۔۔ "کسی کو ذرا سا بھی شک نہیں۔"

"کھانے کے بعد بتائیں گے کہ یہ دونوں کس دن تمہارے گھر جا سکیں گے"۔۔۔ خان صاحب نے کہا۔

رابی نے انہیں یہ نہ بتایا کہ اُس کے باپ نے اُسے ایک فائل کے کاغذات کی فوٹوسٹیٹ کاپیاں کراتے ہُوئے پکڑ لیا تھا۔

کھانے کے بعد خان صاحب، ایک اور آدمی جو وہاں موجود تھا اور ورما ایک کمرے میں چلے گئے۔ زَینی رابی کو ایک اور کمرے میں لے گئی۔

"زَینی!"۔۔۔ رابی نے بیہودگی کی ایک حرکت کرتے ہُوئے کہا۔۔۔ "ہماری شادی سمجھو ہو گئی۔ ممی اور ڈیڈی مان گئے ہیں۔ وہ تمہیں دیکھنا چاہتے ہیں۔ مَیں تمہیں اپنے گھر لے جاؤں گا۔ شرافت اور شائستگی کی ایسی ایکٹنگ کرنا جیسے تم کسی مولوی کی بیٹی ہو۔ یہ بھی خیال رکھنا کہ وہ یہ سمجھ لیں کہ تم مڈل کلاس کی پردہ نشین لڑکی ہو۔"

"کیا تم مجھے اناڑی سمجھتے ہو؟"۔۔۔ زَینی نے کہا۔۔۔ "میں تمہارے ممی ڈیڈی کو ہپناٹائز کر لوں گی۔ مَیں تو آئی ہی تمہاری خاطر ہُوں۔"

"رابی کو تاثر تو یہی دینا ہے کہ زَینی اُس کے ساتھ شادی کرنے کے لئے ہی آئی ہے"۔۔۔ دوسرے کمرے میں خان صاحب اپنے ساتھیوں سے

کہہ رہا تھا — "لیکن اسے ٹالنا بڑی استادی سے ہو گا۔"

"میرے اپنے رابی!" — زینی نے کہا — "وہ زندگی کتنی حسین ہو گی جو ہماری شادی کے بعد شروع ہو گی۔"

"یہ بھی دھیان رکھنا!" — خان صاحب دوسرے کمرے میں کہہ رہا تھا — "کہ لڑکی رابی کی ہی ہو کے نہ رہ جائے۔ لڑکا خوبصورت ہے، تندرست ہے اور امیروں کا بیٹا ہے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ زینی اس زندگی سے اُکتا جائے اور سچ مچ کی شادی کر لے۔ زینی کی اصلیت سے تو تم واقف ہو۔"

"تم نے دلی میں مجھے اپنا گھر تو دکھایا نہیں تھا" — رابی زینی سے کہہ رہا تھا — "تمہاری کوٹھی کتنے کنال میں ہے؟"

"چھ کنال میں" — زینی نے جواب دیا۔

"معمولی سے خاندان کی لڑکی ہے" — ورما کہہ رہا تھا — "لیکن ایکٹنگ انگلینڈ کی شہزادیوں جیسی کر سکتی ہے.... میں نے آپ کو بتایا تھا کہ دلی سے حکم ملا تھا کہ لاہور جا کر زینی کی شادی رابی کے ساتھ کرا دینی ہے۔"

"وہ میں جانتا ہوں" — خان صاحب نے کہا — "لیکن زینی کی شادی ہو گئی تو رابی اسے ڈھیلا نہیں چھوڑے گا پھر یہ لڑکی ہمارے کام کی نہیں رہے گی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ لڑکا بھی ہمارے ہاتھ سے نکل جائے۔

لڑکا بڑا قیمتی ہے۔ یہ آج جو انفارمیشن لایا ہے، اسی سے اس کی قیمت کا اندازہ کر لو۔ یہ کریڈٹ ہمیں ملے گا کہ ہم نے اپنی حکومت کو کتنی زبردست انفارمیشن دی ہے۔ ہماری حکومت اسے چین، پاکستان اور امریکہ کے خلاف استعمال کرے گی۔"

"ہاں ہاں!" — خان صاحب کے دوسرے ساتھی نے کہا — "رپورٹ میں اعداد و شمار دے کر لکھا گیا ہے کہ افغان مجاہدین کو امریکہ جو اسلحہ اور ایمونیشن دے رہا ہے وہ پاکستان سے سکھوں کو مل رہا ہے۔"

"پاکستان تو چاہے گا کہ خالصتان بنے" — ورما نے کہا — "اس رپورٹ کو دیکھ کر ہماری حکومت پاکستان سے سکھوں کو ملنے والی امداد کے راستے بند کر دے گی.... چین کا اسلحہ بھی پاکستان کے راستے سکھوں تک پہنچ رہا ہے۔"

"یہ فوٹوسٹیٹ ایک دو دنوں میں دلی پہنچ جانے چاہئیں" — خان صاحب نے کہا۔

"کل دو آدمی جا رہے ہیں" — ورما نے کہا — "کل رات تک یہ رپورٹیں منزل پر پہنچ جائیں گی۔"

انہوں نے اس مسئلے پر بات کی کہ زینی اور ورما کس روز رابی کے گھر جائیں۔ انہوں نے طے کیا کہ رابی کے والدین سے کہا جائے کہ لڑکی کا ایک چچا اور تایا کراچی سے لڑکے کو دیکھنے آئیں گے۔ پھر میں اور یہ (تیسرا ساتھی) زینی کے چچا اور تایا بن کر چلیں گے۔

دو دنوں بعد ورما اور زینی رابی کے ساتھ اس کی کوٹھی میں داخل ہوئے۔ رابی کا باپ ان کے انتظار میں گھر پر موجود تھا۔ رابی کی ماں تو بہت خوش تھی۔ اس کی خوشی کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس کے بیٹے کی دوسری شادی ہو گی اور دوسری وجہ یہ کہ اس کا بیٹا رشی کو طلاق دے دے گا۔

زینی نے جس طرح رابی کی ماں اور اس کے باپ کو آداب و سلام کیا اور پھر جس طرح ان سے ملی اس سے پتہ چلتا تھا جیسے وہ لکھنؤ کے کسی بڑے ہی شائستہ خاندان کی لڑکی ہو۔ رابی کے باپ کے آگے اس نے سر جھکا دیا اور باپ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ یہ خالصتاً مہذب مسلمانوں کا انداز تھا جو رابی کے باپ کو اچھا لگا۔

ورما نے بھی ایسا ہی مہذب انداز اختیار کیا اور بڑی نفیس اردو میں بات کی۔ اس کی اور زینی کی ایکٹنگ قابلِ داد تھی۔ دونوں نے وہ تاثر پیدا کر دیا جس کی انہیں ضرورت تھی۔

"آپ لوگ دلی کے رہنے والے ہیں؟" — انہیں بٹھا کر رابی کے باپ نے پوچھا۔

"ہم دونوں دِلّی میں ہی پیدا ہُوئے تھے"۔۔۔ ورما نے جواب دیا ۔۔۔"آبائی طور پر ہم الٰہ آباد کے رہنے والے ہیں۔ ہمارے دادا پردادا کی نوابی تھی۔ بہت بڑی جاگیرداری تھی لیکن ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف لڑنے کی پاداش میں وہ زیرِ عتاب آ گئے اور اتنی بڑی جاگیر کا اچھا خاصہ حصہ انگریزوں کی نذر ہو گیا۔ ہمارے دادا الٰہ آباد سے دِلّی ہجرت کر آئے تھے۔ الٰہ آباد کی تمام جائیداد بیچ ڈالی اور دِلّی میں نئی زندگی کا آغاز کیا۔ اب اللہ کا کرم ہے۔ دِلّی میں اچھی خاصی جائیداد ہے۔ ہمارے خاندان کی سب سے بڑی دولت تو شرافت اور وقار ہے۔ تعلیم اور تہذیب بھی ہے۔"

ورما پُراثر لہجے میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہا تھا۔ رابی کی ماں خوشی سے پھُولی نہ سماتی تھی۔ زینی کی شکل و صورت اور اُس کے جسم کی جاذبیت اور ورما کی باتوں کا جادو چل گیا۔ رابی کا باپ چُپ چاپ ورما کی باتیں سُن رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر کوئی اور ہی تاثر تھا۔

زینی اور ورما کے لئے چائے کا پُرتکلف اہتمام کیا گیا تھا۔ چائے پر بھی ورما اپنے خاندان کی تاریخ سناتا رہا۔ زینی بہت کم بولی۔ وہ صرف اُس وقت بولتی تھی جب اُس سے کچھ پوچھا جاتا تھا۔

آخر یہ طے ہُوا کہ ان کا تایا اپنے دو بھائیوں کے ساتھ کراچی سے آئے گا۔ ورما نے کہا کہ آج ہی اُنہیں ٹیلیفون کر دیا جائے گا کہ وہ کل کی کسی فلائیٹ پر لاہور پہنچ جائیں۔

ورما اور زینی اپنے پیچھے بڑا اچھا تاثر چھوڑ کر چلے گئے۔

❄

دو روز بعد لاہور کے ایک بڑے ہوٹل میں ایک ٹی پارٹی کا اہتمام کیا گیا تھا۔ میزبان رابی کا باپ، اُس کی ماں اور رابی تھا۔ مہمانوں میں ورما، زینی، کراچی سے آیا ہُوا اُس کا تایا اور دو چچے تھے۔ ایک آدمی اور بھی تھا جس کا تعارف یہ کرایا گیا کہ یہ ان کا کوئی قریبی رشتے دار ہے اور لاہور میں کاروبار کے سلسلے میں مقیم ہے۔ یہ سب رابی کو دیکھنے اور اُس کے والدین سے ملنے کے لئے کراچی سے آئے تھے۔

اُن کی یہ دعوت دستور کے مطابق رابی کی کوٹھی میں ہونی چاہیئے تھی لیکن رابی کے باپ نے کہا تھا کہ دعوت ہوٹل میں ہو تا کہ ان لوگوں پر اچھا اثر پڑے۔ اس کے بعد انہیں گھر لایا جائے گا۔ رابی کی ماں نے اِس تجویز میں یہ اضافہ کیا تھا کہ انہیں رات کا کھانا گھر کھلایا جائے گا۔

ہوٹل کے بیرے چائے کا سامان رکھ رہے تھے۔ زینی اور ورما کا تایا اپنی فیملی بیک گراؤنڈ اُسی طرح سنا رہا تھا جس طرح ورما نے رابی کے گھر میں سنائی تھی۔ رابی کی ماں اُن پر فدا ہوتی جا رہی تھی۔ رشی اُس کے ذہن سے اُتر گئی تھی اور اس سے بھی اُسے بہت مسرّت حاصل ہو رہی تھی۔

چائے کا سامان لگ چکا تھا تو رابی کا باپ اِس طرح اِدھر اُدھر دیکھنے لگا جیسے وہ کسی اور کے انتظار میں ہو۔ اُس کی بے قراری اُس کے چہرے سے اور اُس کے ہاتھوں کی حرکتوں سے ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ مہمانوں کی باتیں اِس طرح سُن رہا تھا جیسے وہ جسمانی طور پر تو یہیں ہو اور اُس کا دماغ کہیں اور ہو۔ یکلخت وہ چونک اُٹھا اور اُس کی نظریں کسی پر جم گئیں۔۔۔ وہ رشی تھی جو ہوٹل میں داخل ہوئی تھی اور ایک جگہ رُک کر ڈائننگ ہال کا جائزہ لے رہی تھی جیسے اُس کی نظریں کسی کو تلاش کر رہی ہوں۔

اُسے جس کی تلاش تھی وہ اُسے نظر آ گیا۔ وہ اُدھر کو چل پڑی۔ چلتے چلتے اُس نے پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ چار آدمی اُس سے چند قدم پیچھے کھڑے تھے۔ رشی نے اُنہیں سر سے ہلکا سا اشارہ کیا اور اُس بڑی میز کی طرف چل پڑی جس کے اِرد گرد رابی کا باپ اور اُس کے مہمان بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ رشی جب اُن کی میز کے قریب پہنچی تو رابی کی ماں نے

پھر رابی نے اُسے دیکھا۔ دونوں کے رنگ اُڑ گئے۔ کچھ ایسا ہی ردِ عمل زینی اور ورما کا تھا۔

وہ چار آدمی بھی وہاں پہنچ گئے جنہیں رشی نے سر کے اشارے سے اپنے پیچھے آنے کو کہا تھا۔ رشی ورما اور زینی کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔

"یہ ہے وہ شخص"۔۔۔ رشی نے ورما کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا پھر دوسرا ہاتھ زینی کے کندھے پر رکھا اور بولی ۔۔۔ "اور یہ ہے وہ لڑکی"۔

ٹی پارٹی پر سناٹا طاری ہوگیا۔ رابی کا باپ اُٹھ کھڑا ہوا۔ چاروں آدمیوں نے ان سب کو گھیر رکھا تھا۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ کوئی فرد اُٹھنے یا بولنے کی کوشش نہ کرے۔ ان میں سے ایک آدمی دوڑتا ہُوا باہر نکل گیا۔ وہ جب واپس آیا تو اُس کے ساتھ ملٹری پولیس کے چار باوردی آدمی تھے۔

"ملک صاحب!"۔۔۔ ان چاروں میں سے ایک نے رابی کے باپ سے کہا ۔۔۔ "اپنی مسز کو الگ کرلیں"۔

رابی کے باپ نے اپنی بیوی کو بازو سے پکڑ کر اُٹھایا اور اپنے ساتھ کھڑا کرلیا۔ باقی سب کو ملٹری پولیس اُٹھا کر باہر لے گئی۔ رابی اپنے والدین کی طرف چلا لیکن اُسے بھی دھکیلتے ہُوئے باہر لے گئے۔

"ویلڈن ملک صاحب!"۔۔۔ ملٹری پولیس کو حکم دینے والے آدمی نے جو سویلین کپڑوں میں تھا، رابی کے باپ سے ہاتھ ملا کر کہا ۔۔۔ "ویلڈن ..... یہ آپ کا کمال ہے"۔

"وِش یُو گُڈ لک کرنل صاحب!"۔۔۔ رابی کے باپ نے کہا۔

کرنل کے جانے کے بعد رابی کی ماں نے بڑی پریشانی کی حالت میں رابی کے باپ سے پوچھا کہ یہ سب کیا ہُوا ہے اور رابی کو کہاں لے گئے ہیں؟

"یہ سب انڈیا کے جاسوس ہیں"۔۔۔ رابی کے باپ نے اپنی بیوی

کو بتایا ۔۔۔ "ہمارا بیٹا بھی جاسوس ہے۔ زینی اور عبدالرحمٰن بہن بھائی نہیں اور یہ جو اس کا تایا اور اس کے چچے بن کر آتے تھے زینی اور عبدالرحمٰن کے کچھ نہیں لگتے۔ ان کی نشاندہی رشی نے کی ہے"۔

رابی کی ماں رشی کے خلاف واہی تباہی بکنے لگی۔ رشی انٹیلی جنس کے کرنل کے ساتھ چلی گئی تھی۔ یہ ایک پھندہ تھا جو آئی ایس آئی کے میجر جنرل اور رابی کے باپ نے تیار کیا تھا۔ زینی کا تایا دراصل انیکسی میں رہنے والا خان صاحب تھا اور تین اُس کے ساتھی تھے۔ اس انیکسی اور اس پوری کی پوری کوٹھی کو ملٹری پولیس نے اپنے گھیرے میں رکھا ہُوا تھا۔ صرف حکم کا انتظار تھا۔ کوٹھی اور انیکسی پر چھاپے سے پہلے ملازموں کی گرفتاری ضروری تھی جو ہو گئی تھی۔

ان ملزموں کو ہوٹل سے باہر لے جا کر ایک فوجی گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ ملٹری پولیس کے آدمی بھی اسی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اس گاڑی کے آگے دو جیپیں تھیں۔ آئی ایس آئی کے افسر اور دیگر کارندے ان جیپوں میں بیٹھ گئے اور جیپیں چل پڑیں۔ ملزموں والی گاڑی ان کے پیچھے چلی گئی۔ دو کاریں ان گاڑیوں کے پیچھے گئیں۔ یہ ملزموں کی کاریں تھیں جن پر وہ کوٹھی سے ہوٹل میں آتے تھے۔ دونوں کاریں آئی ایس آئی کے کارندے چلا رہے تھے۔

رشی اپنی کار میں بیٹھی۔ اس کی ماں کار میں موجود تھی۔ وہ اس کے ساتھ آئی تھی لیکن ہوٹل کے اندر اُس کا کوئی کام نہیں تھا۔ اُسے کار میں ہی بیٹھے رہنے کو کہا گیا تھا۔ رشی نے کار سٹارٹ کی اور اپنے گھر کو چلی گئی۔ اُسے کہا گیا تھا کہ گھر میں موجود رہے اور جب اُس کی ضرورت پڑے گی تو اُسے بلا لیا جائے گا۔

رابی کے باپ نے ایک بیرے سے بل لانے کو کہا۔ ہال کے اندر منظر کچھ اس طرح تھا کہ جو لوگ وہاں چائے وغیرہ پی رہے تھے وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور وہ دیکھ رہے تھے کہ یہ تو ٹی پارٹی تھی اور ملٹری پولیس سب کو اٹھا کر لے گئی ہے۔ انہوں نے رابی کی ماں کی چیخ و پکار بھی سُنی تھی۔ وہ رشی کو کوس رہی تھی پھر وہ اپنے اکلوتے بیٹے کے لئے روتی تھی۔ لوگوں کے لئے بڑا اچھا تماشہ تھا لیکن وہ پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ انہیں پتہ نہیں چل رہا تھا کہ یہ تماشہ ہے کیا۔

ہوٹل کا منیجر خود ہی بل لے کر آگیا۔ بل لانا اُس کا کام نہیں تھا لیکن یہ معلوم کرنا اُس کے فرائض میں شامل تھا کہ ملٹری پولیس جن لوگوں کو دھکیلتی ہوئی لے گئی ہے یہ کون تھے اور واردات کیا تھی۔ اس کی زد ہوٹل پر بھی

پڑ سکتی تھی۔ منیجر یہی معلوم کرنے کے لئے بل خود لے کر آیا۔ رابی کے باپ نے بل دیکھا۔ خاصا زیادہ تھا۔ اُس نے بل ادا کرنے کے لئے جیب سے پرس نکالا۔

"معاف رکھنا سر!" — منیجر نے پوچھا — "یہ کون تھے جنہیں ملٹری پولیس اپنے ساتھ لے گئی ہے؟ ..... میں ہوٹل کا منیجر ہوں۔"

"جاسوس تھے" — رابی کے باپ نے یوں کہا جیسے بے خیالی میں کہہ دیا ہو۔

"انڈیا کے؟" — منیجر نے پوچھا۔

"ہاں!" — رابی کے باپ نے جواب دیا — "انہیں میں نے پکڑوایا ہے۔ پورا گروہ پکڑوا دیا ہے۔"

"کیا آپ انٹیلی جنس کے آفیسر ہیں؟"

رابی کے باپ نے بتایا کہ اُس کا تعلق کس محکمے کے ساتھ ہے اور اُس کا عہدہ کیا ہے۔

منیجر نے بل اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ جیب سے بال پوائنٹ نکالا اور بل کی رقم کاٹ کر آدھی کر دی۔

"میں بھی پاکستانی ہوں سر!" — اُس نے بل رابی کے باپ کو دیتے ہوئے کہا — "میں بس اتنی سی خدمت کر سکتا ہوں۔"

رابی کے باپ نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بل ادا کیا۔ منیجر کا شکریہ بھی ادا کیا اور اپنی بیوی کو ساتھ لے کر ہوٹل سے نکل گیا۔ اُس کی بیوی کی جذباتی کیفیت بہت بُری ہو رہی تھی۔ گاڑی میں بیٹھ کر اُس نے رابی کے باپ کو بھی کوسنا شروع کر دیا تھا۔ وہ کیسے مان لیتی کہ اُس کا بیٹا کسی اور ملک کا جاسوس ہے۔ وہ تو یہی رٹ لگاتے جا رہی تھی کہ رشی نے رابی سے انتقام لیا ہے۔

"میں نہ کہتی تھی کہ جیسی ماں ویسی بیٹی!" — رابی کی ماں کہہ رہی تھی — "یہ چال رشی کی ماں نے سوچی ہے۔ اُس نے رشی کو کسی بڑے افسر

کے حوالے کر دیا ہو گا۔ اس سے زیادہ خوبصورت رشوت اور کیا ہو گی۔
ماں نے بیٹی کو رشوت کے طور پر دے کر یہ کام کرایا ہے۔"

رابی کے باپ پر خاموشی طاری تھی۔ وہ خوش نہیں تھا۔ وہ اس صدمے
کو برداشت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس نے پاکستان کے نام پر جو
قربانی دی تھی وہ تو ایک وزنی سِل تھی جس کے نیچے آ کر اُس کے جذبات
کچلے اور مسلے گئے تھے۔ اُس کے صرف ضمیر کو اطمینان تھا۔ وہ دو حصّوں میں
کٹ گیا تھا۔ وہ سچا پاکستانی تھا اور وہ باپ بھی تھا۔ وہ جب باپ بن کر سوچتا
تھا تو اُسے اپنی آواز سنائی دیتی تھی ——"نہیں۔ یہ جھوٹ ہے۔ میرا بیٹا
بے گناہ ہے"—— مگر یہ روپ زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتا تھا۔ اس پر
پاکستان کا وہ اعلیٰ افسر غالب آجاتا تھا جسے پاکستان اور اپنے فرائض
زیادہ عزیز تھے۔ یہ افسر باپ کا گلا گھونٹ دیتا تھا۔

رابی کا باپ چکی کے دو پاٹوں کے درمیان آگیا اور پس رہا تھا۔ ایک
اُس کا بیٹا تھا جو اتنے بڑے گناہ کا مرتکب ہُوا تھا اور دوسرا صدمہ یہ کہ اس
کا بیٹا بڑے لمبے عرصے کے لئے جیل جا رہا تھا بلکہ اُس کا بیٹا ضائع
ہو گیا تھا۔

اُس کے لئے دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ اپنی بیوی کو وہ کس طرح یقین
دلاتے کہ ان کا بیٹا انڈیا کا جاسوس ہے۔ اُس نے ہوٹل کی کار پارک سے
گاڑی نکالی اور اپنی بیوی کو بتانا شروع کیا کہ اُسے رابی کی ان مجرمانہ
سرگرمیوں کا کس طرح پتہ چلا تھا اور اُس نے کس طرح ثبوت حاصل کیا اور
شہادت اکٹھی کی ہے۔

"کیا آپ رابی کے باپ نہیں؟"—— رابی کی ماں نے روتے ہُوئے
کہا ——"بیٹے نے آپ کا کیا بگاڑا ہے کہ آپ اس کے دشمن ہو گئے ہیں؟
دشمنی بھی ایسی کہ اس بے چارے کو گرفتار کرا دیا ہے۔"

رابی کے باپ نے اُسے یہ بتا کر کہ اُس نے ایک سنگدل باپ کی

طرح اپنے بیٹے کو کیوں گرفتار کرایا ہے، اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کی۔

"آپ کو حاصل کیا ہُوا؟"—— رابی کی ماں نے کہا ——"یہ انڈیا اور
پاکستان کا معاملہ ہے۔ آپ نے اپنے بیٹے کو سُولی چڑھا دیا ہے۔ ہونا تو
یہ چاہیئے تھا کہ وہ اس جُرم میں پکڑا بھی جاتا تو آپ اُسے اپنے اثر و رسوخ سے
چھڑوا لیتے۔ ہماری سوسائٹی کے لڑکے ڈاکے ڈالتے پھرتے ہیں موٹر سائیکلوں
اور کاروں پر راتوں کو گھومتے پھرتے اور کیسے کیسے جُرم نہیں کرتے؟ عورتوں
کے پرس چھینتے ہیں۔ لڑکیوں کو زبردستی اُٹھا کر گاڑیوں میں ڈالتے اور غائب
ہو جاتے ہیں۔ پولیس انہیں پکڑنے کی جرأت نہیں کرتی۔ پولیس جانتی ہے
یہ کن کے بیٹے ہیں۔ جی ایم واسطی آپ سے کم عہدے کا افسر ہے۔ اُس کا بیٹا
دو لڑکوں کے ساتھ ڈکیتی کی واردات کرتے ہوئے پکڑا گیا تھا واسطی کو پتہ
چلا تو تینوں کو پولیس سٹیشن سے لے آیا تھا۔"

"ہمارے بیٹے کی یہی بدنصیبی ہے کہ اُس نے تمہارا اثر قبول کیا ہے"
—— رابی کے باپ نے کہا ——"تم ڈاکہ زنی، رہزنی اور لڑکیوں کو زبردستی
بے آبرو کرنے کو جرائم نہیں، بچّوں کا کھیل سمجھتی ہو۔ تم اگر پاکستان کو بھی انڈیا
کی طرح غیر ملک سمجھتی ہو تو میں تمہارے ساتھ کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔"

رابی کی ماں کو اپنے خاوند کے چاہنے اور نہ چاہنے کے ساتھ کوئی دلچسپی
نہیں تھی۔ اُس کا بیٹا گرفتار ہو گیا تھا اور وہ رِشی کو گالیاں اور خاوند پر
زور دے رہی تھی کہ اس کا بیٹا مجرم ہے یا نہیں، باپ اُسے چھڑا لائے۔

رابی کے باپ کے لئے اپنی بیوی پر قابو پانا ناممکن ہو گیا۔ وہ ایسی
ذہنی کیفیت میں مبتلا ہو گیا جس کا اُسے پہلے کبھی تجربہ نہیں ہُوا تھا۔ اس
نے اپنی قربانی کے اس پہلو پر پہلے غور ہی نہیں کیا تھا کہ اُس کی بیوی کا ردِّعمل
اس قدر شدید ہو گا۔ اُس کے پاس خاموشی کے سوا کوئی علاج نہیں تھا۔ وہ
خاموشی سے بیوی کی آہ و بکا اور کوسنے سنتا رہا۔

دو جیپیں، بڑی گاڑی اور دو کاریں ہوٹل سے نکلیں اور گلبرگ کی اُس کوٹھی میں داخل ہوئیں جس کی انیکسی میں ملزم رہتے تھے اور جو اُن کا خفیہ اڈہ تھا۔ کوٹھی اور انیکسی آئی ایس آئی کے اُن آدمیوں کے گھیرے میں تھیں جنہیں دونوں پر بیک وقت چھاپہ مارنا تھا۔ جونہی گاڑیاں کوٹھی کے احاطے میں داخل ہوئیں چھاپہ مارنے والے دوڑتے ہوئے اندر آتے اور پہلے سے دیئے ہوئے احکام کے مطابق دو پارٹیوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک پارٹی کوٹھی میں اور دوسری انیکسی میں داخل ہو گئی۔ یہ سب ملٹری پولیس کے آدمی تھے۔

آئی ایس آئی کا کرنل ملزموں کو گاڑیوں سے اُتار کر برآمدے میں لے گیا۔

"اگر خود اپنے خلاف شہادت برآمد کرا دو تو ایسی اذیت سے بچ جاؤ گے جو تم میں سے کوئی بھی برداشت نہیں کر سکے گا" ___ کرنل نے انہیں کہا ___ "اس خوش فہمی میں مبتلا نہ رہنا کہ تم نہیں بولو گے تو ہم تمہیں چھوڑ دیں گے"۔

"ہم حیران ہیں صاحب!" ___ خان صاحب نے معصومیت اور سادگی سے کہا ___ "یہ سب کیا ڈرامہ ہے۔ آپ ہمیں کیوں پکڑ لاتے ہیں؟"

"میں حیران نہیں ہوں صاحب!" ___ کرنل نے کہا ___ "یہ ڈرامہ دلچسپ ہے، حیران کن نہیں ..... میں تم سب سے کہتا ہوں کہ تم میں سے کسی ایک کو وعدہ معاف گواہ بنانا میرے اختیار میں ہے۔ سوچ لو۔ میں تمہیں وقت دوں گا۔ جو کوئی وعدہ معاف گواہ بننا چاہتا ہے، وہ مجھے علیحدگی میں بتا دے اور موج کرے ورنہ باقی عمر جیل میں گزارنے کے لئے تیار ہو جاتے"۔

ان میں سے کسی نے بھی کرنل کی پیشکش قبول نہ کی۔

کوٹھی میں ایک بوڑھا جوڑا رہتا تھا۔ ان کی عمریں اسّی سال کے قریب تھیں۔ ایک ان کا نوکر تھا اور ایک نوکرانی تھی۔ نوکر کی عمر ستر سال سے کچھ کم یا زیادہ ہوگی۔ نوکرانی چالیس سال کے لگ بھگ عمر کی بیوہ عورت تھی۔

یہ نہری علاقے کے کسی چک کے رہنے والے امیر کبیر زمیندار تھے۔

پاکستان کے وجود میں آنے کے چند سال بعد لاہور میں کوٹھیوں کی یہ پہلی کالونی آباد ہوتی تھی۔ لوگوں نے دو دو، چار چار اور چھ چھ کنال کے پلاٹ خریدے اور بڑی عالیشان کوٹھیاں بنائی تھیں۔ ظاہر ہے کہ اتنی دولت افسرانِ بالا کے پاس تھی جسے افسر شاہی کہتے ہیں اور ایک کلاس اور بھی تھی جو چار چھ کنال میں کوٹھیاں بنا سکتی تھی۔ یہ جاگیرداروں اور بڑے بڑے زمینداروں کی کلاس تھی۔ انہوں نے گلبرگ میں محلات جیسی کوٹھیاں بنائی تھیں جن کا ایک مقصد دولت مندی اور بڑے پن کی نمائش تھا اور دوسرا مقصد صوبائی حکومت کے وزیروں کو شیشے میں اُتارنا اور فائدے حاصل کرنا تھا۔ یہ جاگیردار سال میں کچھ عرصہ لاہور میں گزارتے تھے اور جب وہ یہاں نہیں ہوتے تھے تو کوٹھیوں میں ان کے نوکر رہتے تھے۔

اس کوٹھی میں چھاپہ پڑا تو وہاں ایک ضعیف العمر بوڑھا اور اس کی عمر کی ایک بڑھیا رہتی تھی جو اس کی بیوی تھی۔ سورج کو غروب ہوتے ایک گھنٹہ گزر گیا تھا۔ کرنل نے اپنا تعارف کرایا اور ان سے پوچھا کہ وہ کون ہیں۔ بوڑھے نے پریشانی کے عالم میں اپنے چک کا نمبر، تحصیل اور ضلع بتایا۔

"ہم اب اپنے بیٹوں کے کام کے نہیں رہے" ___ بوڑھے نے کہا ___ "دو سال ہوئے، انہوں نے ہمیں یہاں بھیج دیا تھا۔ ہم یہاں زندگی کے آخری دن پورے کر رہے ہیں۔ میرے بیٹے گاؤں میں عیش موج کر رہے ہیں"۔

"کوٹھی کے پیچھے والا حصہ آپ نے کرائے پر دیا تھا؟" ___ کرنل نے پوچھا۔

"نہیں" ___ بوڑھے نے جواب دیا ___ "ہم سے پہلے کے یہ کرایہ دار یہاں رہتے ہیں۔ میرا خیال ہے چھ سات سال ہو گئے ہیں"۔

"کرایہ کون لیتا ہے؟"

"مَیں لیتا ہوں" — بوڑھے نے جواب دیا — "پہلی تاریخ کو خود آکر کرایہ دے جاتے ہیں۔"

"کیا آپ انہیں جانتے ہیں کہ یہ کون لوگ ہیں؟" — کرنل نے پوچھا — "کیا کام کرتے ہیں؟"

"نہیں" — بوڑھے نے جواب دیا — "کبھی پوچھا ہی نہیں .... اُدھر کبھی دیکھا ہی نہیں .... آپ یہ تو بتائیں کہ ہماری خانہ تلاشی کیوں ہو رہی ہے؟ کیا ہم چور ڈاکو ہیں یا چوری کا مال یہاں رکھتے ہیں؟ میرے علاقے میں جاکر پوچھیں میں کون ہوں۔ میں تو غریبوں اور ناداروں کو پالنے والا آدمی ہوں۔"

کرنل کو رپورٹ مل چکی تھی کہ اس کوٹھی سے کچھ بھی برآمد نہیں ہوا اور کوئی مشکوک چیز نظر نہیں آئی۔ اُس نے بوڑھے سے معذرت کی اور اُس سے اُس کے بیٹوں کے ایڈریس لے لئے۔ کوٹھی میں ٹیلیفون بھی تھا۔ کرنل نے سب کو کمرے سے نکال دیا اور اپنے کسی افسر کو فون پر یہ نام اور ایڈریس لکھوائے اور کہا کہ ان دو آدمیوں کو فوراً پکڑ کر لاہور بلایا جائے۔

نوکر اور نوکرانی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ انیکسی میں رہنے والے کیا کام کرتے ہیں۔ انہیں تمام ملزم دکھائے گئے۔ نوکرانی نے سب کو پہچان لیا۔ رابی کے متعلق اُس نے کہا کہ اسے اُس نے کئی بار انیکسی میں آتے دیکھا ہے۔

کرنل کوٹھی سے نکل کر انیکسی کی طرف جا رہا تھا تو اُس کا ایک افسر انیکسی سے نکل کر آ رہا تھا۔ وہ میجر تھا۔

"کچھ ملا؟" — کرنل نے اس سے پوچھا۔

"بہت کچھ!"

"کیا ہے؟" — کرنل نے پوچھا۔

"وائرلیس سیٹ!" — میجر نے جواب دیا — "بہت دلیر

لوگ ہیں سر! یہاں سے تو اچھی خاصی ٹرانسمشن ہوتی رہی ہے۔ آیئے آپ کو دکھاؤں۔"

انیکسی میں جاکر کرنل نے سب سے پہلے ٹرانسمشن سیٹ دیکھا۔ خان صاحب کو سیٹ دکھا کر پوچھا گیا کہ یہ کس کا ہے اور کس کام کے لئے یہاں رکھا ہے۔

"یہ آپ خود معلوم کریں" — خان صاحب نے جواب دیا — "میرا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ ہم سے پہلے کوئی کرایہ دار یہاں رہتے تھے...."

"استاد معلوم ہوتے ہو" — کرنل نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے اور مُسکراتے ہوئے کہا — "اور شاید تم پہلی بار اپنے دشمن ملک کی انٹیلی جنس کے جال میں آتے ہو۔"

انیکسی سے کچھ کاغذات بھی برآمد ہوتے تھے۔ کرنل نے کاغذات دیکھنے شروع کئے۔ بعض تحریریں ایسی تھیں جن کا بظاہر مطلب کچھ اور تھا لیکن ان کا اصل مطلب کچھ اور معلوم ہوتا تھا۔ آئی ایس آئی کا کرنل ایسی تحریروں سے اچھی طرح واقف تھا۔ ایک دو تحریریں صاف طور پر کوڈ الفاظ میں تھیں۔ یہ ان ملزموں سے معلوم کرنا تھا کہ ان تحریروں کا اصل مطلب کیا ہے۔ اگر کوئی بھی ملزم اقبال جرم نہیں کرتا تو ان تحریروں کو DECIPHER کرنا تھا۔

انیکسی سے چار ریوالور اور تین خنجر بھی برآمد ہوتے۔ چاروں ریوالور بلالائسنس تھے۔

انیکسی کو تالا لگا کر سِیل کر دیا گیا اور تمام ملزموں کو گاڑی میں بٹھا کر لے گئے۔ ایک سنتری کو وہاں چھوڑ دیا گیا۔

❄

جس شام اس گروہ کو پکڑا گیا تھا اُس صبح اخباروں میں انڈیا کے

وزیرِ خارجہ کا ایک بیان چھپا تھا جس میں پاکستان پر الزام لگایا گیا تھا کہ پاکستان انڈیا کے علیحدگی پسند سکھوں کو اسلحہ ایمونیشن اور دیگر مدد دے رہا ہے۔ بیان میں یہ بھی تھا کہ چین بھی سکھوں کی مدد کر رہا ہے اور چین کا جنگی سامان پاکستان کے راستے مشرقی پنجاب میں سکھوں تک پہنچ رہا ہے۔ انڈیا کے اس سرکاری بیان میں گزرے ہوئے چھ ماہ کے اعداد و شمار دیئے گئے کہ اتنا اسلحہ، ایمونیشن، دیگر جنگی سامان اور اتنا روپیہ پاکستان کی طرف سے سکھوں تک پہنچا ہے۔ بیان میں مصدقہ طور پر کہا گیا کہ امریکہ پاکستان کو افغان مجاہدین کے لئے جو جنگی سامان دے رہا ہے، اس میں سے زیادہ تر پاکستان کی طرف سے سکھوں کو مل رہا ہے۔

یہ وہی اعداد و شمار تھے جو رابی کے باپ کی ٹاپ سیکرٹ فائل میں ریکارڈ پر موجود تھے۔ یہ فائل رابی کے ہاتھ لگ گئی تھی اور اس نے یہ ریکارڈ فائل میں سے نکال لیا، اس کی فوٹوسٹیٹ کاپیاں کرائیں، ریکارڈ پھر فائل میں لگا دیا اور فوٹوسٹیٹ کاپیاں کوٹھی کی انیکسی میں رہنے والے خان صاحب کے حوالے کر دیں۔

انڈین انٹیلی جنس کے ایجنٹوں کے لئے یہ بڑی ہی قیمتی انفارمیشن تھی جو انہوں نے فوری طور پر انڈیا بھیج دی۔ اقوامِ عالم میں پاکستان کو رسوا کرنے کے لئے انڈین گورنمنٹ کو بڑا اچھا مواد مل گیا تھا۔ نئی دلی سے سرکاری بیان جاری کر دیا گیا اور یہ انفارمیشن نئی دلی میں مقیم روس کے سفیر کے حوالے کر دی گئی۔

اس بیان کا اخباروں میں چھپنا رابی کے خلاف بڑا پکا ثبوت تھا۔ رابی کا باپ اور انٹیلی جنس کا چیف میجر جنرل خان اور ایک بریگیڈیئر جانتے تھے کہ یہ انفارمیشن رابی نے انڈیا کو دی ہے۔ یہ بوگس انفارمیشن تھی جو یہ دیکھنے کے لئے استعمال کی گئی تھی کہ رابی انڈیا کا جاسوس ہے یا نہیں۔ یہ ایک پھندہ تھا جو رابی کو پھانسنے کے لئے رکھا گیا تھا۔ دراصل یہ پوری

کی پوری فائل ہی بوگس تھی۔

یہ پھندہ اس طرح تیار ہوا تھا کہ رابی کا باپ آئی ایس آئی کے چیف کے پاس گیا تھا اور اسے بتایا تھا کہ اسے اپنے بیٹے پر انڈیا کی جاسوسی کا شک ہے۔ رابی کے باپ اور میجر جنرل کے درمیان بہت باتیں ہوتی تھیں۔ پہلے تو میجر جنرل کے لئے صرف اس بات پر یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ کوئی باپ اپنے ہی بیٹے کو ایسے جرم میں پکڑوانے کی کوشش کرے جس کی سزا موت بھی ہو سکتی تھی۔ رابی کے باپ نے اسے یقین دلا دیا کہ ایسے باپ پاکستان میں موجود ہیں۔

ضرورت ثبوت اور شہادت کی تھی۔ رابی کو عین موقع پر پکڑنا تھا۔ میجر جنرل نے اس کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ ایک بوگس فائل تیار کی جس میں بوگس اعداد و شمار ڈال دیئے کہ پاکستان سکھوں کو کس طرح مدد دے رہا ہے اور گزرے ہوئے چھ مہینوں میں کتنی مدد دے چکا ہے۔ یہ فائل رابی کے باپ کو دی گئی۔ رابی کے باپ نے میجر جنرل کی ہدایت کے مطابق یہ فائل اپنے سٹڈی روم میں رکھ دی۔

میجر جنرل نے رابی کے باپ کو اور بھی ہدایات دی تھیں۔ پھر یہ تمام ہدایات آئی ایس آئی کے اس کرنل کو دی گئیں جس نے ملزموں کو پکڑنا تھا۔ رابی کو پکڑنے کے لئے یہ اہتمام کیا گیا تھا کہ جس کیمسٹ کی دکان سے وہ فوٹوسٹیٹ کرایا کرتا تھا اس دکان پر نظر رکھنے کے لئے ایک انفارمر مقرر کر دیا گیا تھا۔ یہ انفارمر رابی کے گھر گیا تھا۔ ظاہر یہ کیا گیا تھا کہ وہ رابی کے باپ سے ملنے آیا ہے لیکن اس کا اصل مقصد رابی کو دیکھنا تھا۔ رابی کے باپ نے موقع فراہم کر دیا کہ وہ انفارمر رابی کو دیکھ لے۔

ادھر یہ پتہ چل چکا تھا کہ گلبرگ کی اس کوٹھی کی انیکسی میں کچھ مشکوک لوگ رہتے ہیں۔ ایک انفارمر وہاں مقرر کر دیا گیا تھا۔ رابی کو باپ نے

گھر میں پابند کر دیا تھا لیکن اس سکیم کے تحت باپ نے اُسے یہ تاثر دے
کر آزاد کر دیا کہ اُسے رابی پر بلاوجہ شک ہو گیا تھا۔

آزاد ہوتے ہی رابی نے پہلا کام یہ کیا کہ باپ کی سٹڈی میں
چلا گیا اور وہاں اُسے ایک ٹاپ سیکرٹ فائل پڑی نظر آ گئی۔ وہ جان نہ
سکا کہ یہ پھندہ ہے۔ اُس لے اس میں سے کاغذات نکالے اور کیمسٹ
کی دکان پر جا پہنچا جہاں ایک انفارمر اُسے دیکھ رہا تھا۔ وہ جب کوٹھی
کی ایکسی میں فوٹو سٹیٹ کاپیاں دینے گیا اور دے کر نکلا تو بھی اُسے ایک
انفارمر دیکھ رہا تھا۔

پھر رابی نے اپنے لئے خود ہی پھندہ تیار کر لیا یا یوں کہئے کہ اُس
نے اس پھندے کو جو اُس کے لئے تیار ہو رہا تھا، مضبوط کر دیا۔ وہ اس
طرح کہ اُس نے اپنے ماں باپ سے زینی کے ساتھ شادی کرنے کی
خواہش ظاہر کی۔ اُس کے باپ نے یہ موقع غنیمت جانا اور اُسے کہا کہ
وہ زینی اور اُس کے "بھائی" کو گھر لے آئے۔ رابی کے باپ کو رشی، زینی
اور ورما کے متعلق پہلے ہی بتا چکی تھی۔ رابی بلا سوچے سمجھے زینی اور ورما
کو اپنے گھر لے آیا۔

رابی کی ماں تو زینی کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی لیکن جن نظروں
سے ان دونوں مہمانوں کو رابی کا باپ دیکھ رہا تھا، وہ اُسے شک میں
ڈال رہی تھیں کہ دونوں بہن بھائی نہیں اور یہ دونوں پاکستانی بھی نہیں۔

وہ دونوں جب چلے گئے تو رابی کا باپ بریف کیس اُٹھا کر اور یہ
کہہ کر کہ وہ اپنے کام سے جا رہا ہے، آئی ایس آئی کے کرنل کے پاس چلا
گیا اور زینی اور ورما کے متعلق اُس کا جو مشاہدہ اور اُس کی جو رائے تھی
وہ اُس نے کرنل کو بتائی۔ کرنل نے یہ سن کر کہ لڑکی کا تایا اور چچے لڑکے کو
دیکھنے آئیں گے، اُس نے رابی کے باپ سے کہا کہ ان سب کو مدعو کر لیا
جاتے۔ مدعو گھر بھی کیا جا سکتا تھا لیکن کرنل نے کسی مصلحت کے پیشِ نظر
بہتر سمجھا کہ یہ دعوت ہوٹل میں ہو۔

انڈین انٹیلی جنس کے اس رِنگ میں ایک سے ایک بڑھ کر ذہین
اور چالاک آدمی تھا، لیکن آئی ایس آئی نے ان کے لئے جو جال بچھایا تھا
وہ ہمہ رنگ زمیں دام تھا جسے منجھے ہوئے استادوں کی نظریں بھی نہ
دیکھ سکیں۔ پورے کا پورا رِنگ یا رِنگ کے انتہائی اہم افراد اس
جال میں آ گئے۔

صبح طلوع ہونے تک تمام ملزم آئی ایس آئی کے راولپنڈی
انٹیروگیشن سیل میں پہنچ چکے تھے۔

❄

اُسی دن نئی دلی کے انٹیلی جنس ہیڈ کوارٹر میں ایک کیپٹن پریشانی
کے عالم میں بڑی تیزی کے ساتھ کرنل اوجھا کے دفتر میں داخل ہوا۔

"ویری بیڈ نیوز سر!" ــــ اُس نے ایک کاغذ کرنل اوجھا کے ہاتھ
میں دیتے ہوتے کہا۔

کرنل اوجھا نے کاغذ دیکھا اور اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

"یہ تو پورا رِنگ ہی پکڑا گیا ہے" ــــ کرنل اوجھا نے کہا ــــ "میسیج
سیالکوٹ کا ہے.... بیڈ نیوز۔"

کرنل اوجھا اٹھا اور بریگیڈیئر کے پاس چلا گیا۔ بریگیڈیئر کا ردِ عمل بھی
اس کرنل جیسا ہی تھا۔ وہ کرنل اوجھا کو ساتھ لے کر چیف کے پاس چلا گیا۔

"خان صاحب کوئی اناڑی تو نہ تھا" ــــ چیف نے کہا ــــ "انہیں
راولپنڈی لے گئے ہیں.... ہمارا یہ رِنگ سمجھو ختم ہو گیا ہے۔"

"یس سر!" ــــ بریگیڈیئر نے کہا ــــ "اس رِنگ میں ہماری لڑکی
(زینی) اور رابی بڑی کمزور کڑیاں ہیں۔ زینی ٹارچر برداشت نہیں کر سکے
گی اور رابی سے یہ خطرہ ہے کہ وہ پاکستانی ہے اور پاکستان کے ایک
اعلیٰ افسر کا بیٹا ہے۔ وہ سلطانی گواہ بن جاتے گا۔"

"امید کی ایک کرن نظر آتی ہے" ــــ چیف نے میز پر ہاتھ مار کر کہا
ــــ "اتنے بڑے افسر کا بیٹا سلطانی گواہ نہیں بنے گا بلکہ اسے اس کیس

سے صاف نکال دیا جائے گا۔ ہم سب جانتے ہیں کہ پاکستان میں قانون
کا کتنا احترام رہ گیا ہے۔ وہاں بڑے بڑے افسروں کے بیٹے ڈکیتی،
رہزنی اور اغوا کی وارداتیں اس طرح کر رہے ہیں جیسے یہ کوئی باعزت
ہابی ہو۔ پولیس والوں کو یہ لوگ اپنے گھریلو چوکیدار سمجھتے ہیں۔ میں تو حیران
ہوں کہ اس لڑکے کو پکڑا ہی کس طرح گیا ہے۔ اگر پکڑا ہی گیا ہے تو مجھے
امید ہے کہ صرف اسے چھڑوانے کے لئے ہمارے پورے رِنگ کے
نکل آنے کا امکان ہے۔ پاکستان میں ایسے واقعات ہو چکے ہیں۔"

"پاکستان کی انٹیلی جنس اور اینٹی کرپشن پولیس کی یہی تو کمزوری ہے"
— بریگیڈیئر نے کہا — "اصل ملزموں کو پکڑنے سے پہلے ان دونوں محکموں
کو دیکھنا پڑتا ہے کہ انہیں گرفتار کیا جا سکتا ہے یا نہیں اور اگر گرفتار کر
لیا جائے تو کیس کا انجام کیا ہوگا۔"

"میں صاف الفاظ میں کہتا ہوں" — چیف نے کہا — "کہ پاکستان
میں ہماری کامیابی کی وجہ بھی یہی ہے.... سندھ اور خصوصاً کراچی میں ہماری
کامیابی کے ضامن پاکستان کے سیاسی لیڈر ہیں۔"

"سر!" — کرنل اوجھا نے کہا — "آپ کی وہ سکیم بھی کامیاب جا
رہی ہے کہ پاکستانیوں کے ایک مذہبی فرقے کے کسی عالمِ دین کو قتل کرا
کے یہ مشہور کرا دینا کہ یہ فلاں فرقے کا کام ہے۔"

"ہاں ہاں" — چیف نے کہا — "آگے آگے دیکھتے چلو۔ ہم نے
پاکستان کے مختلف فرقوں کو ایک دوسرے کے علماء کو قتل کرنے کے
راستے پر ڈال دیا ہے۔ دیکھ لو اب وہاں جلوس نکل رہے ہیں مظاہرے
ہو رہے ہیں اور قاتلوں کو پکڑنے کے مطالبے زور پکڑتے جا رہے ہیں
.... بہرحال اب اس رِنگ کا مسئلہ آ پڑا ہے۔ روز بروز رپورٹ لیتے رہو۔"

"سر!" — بریگیڈیئر نے چیف سے کہا — "عزیز کے قتل کا کیس
لٹک رہا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اس کے متعلق کچھ بات کروں۔"

"ہاں ہاں" — چیف نے کہا — "اگر کوئی نئی بات ہے تو ضرور کرو۔"

"ہم نے تین مشتبہوں کو رسمی سی تفتیش کے بعد فارغ کر دیا تھا" —
بریگیڈیئر نے کہا — "یہ ہیں فرید الدین ہاشمی، عبدالقدیر اور جمیل۔ اگر عزیز
عام سی قسم کا مسلمان ہوتا تو ہم نظر انداز کر دیتے۔ یہاں مسلمان تو قتل
ہوتے ہی رہتے ہیں۔ میں عزیز کی اہمیت کی بات کر رہا ہوں اور اصل
مسئلہ یہ ہے کہ یہ پاکستان کے ایجنٹوں کی واردات ہے اور انہیں پکڑنا
ضروری ہے۔"

"تم کیا کرنا چاہتے ہو؟" — چیف نے پوچھا۔

"میں ان تینوں کو ایک بار پھر یہاں بلانا چاہتا ہوں" — بریگیڈیئر
نے کہا — "اور اسی طرح انویسٹی گیشن کروں گا جس طرح ہم کیا کرتے ہیں۔
میں ان کی بیویوں کو بھی شاملِ تفتیش کروں گا۔ عبدالقدیر کی بیوی تو مر چکی
ہے۔ فرید الدین ہاشمی کی بیوی ہے اور جمیل کی بیوی ہے جو عزیز کی
بہن ہے۔"

"تمہیں یہ خیال کیوں آتا ہے کہ عزیز کے قتل میں ان کا ہاتھ ہے؟"
— چیف نے پوچھا۔

"سر!" — بریگیڈیئر نے کہا — "میجر بھاٹیہ مجھے چین سے بیٹھنے نہیں
دے رہا۔ آپ جانتے ہیں عزیز اس کے ساتھ کام کرتا تھا۔ عزیز مرتے دم
تک بھاٹیہ سے کہتا رہا کہ وہ پاکستانی لڑکی رشی ہاشمی کے گھر میں رہی
ہے اور عزیز کی بہن نے اسے ہاشمی کے گھر میں دیکھا تھا۔ اگر آپ اجازت
دیں تو میں میجر بھاٹیہ کو آپ کے سامنے لے آؤں اور آپ اس سے سنیں
کہ عزیز اسے کیا شہادت سنا رہا تھا۔ مجھے یہ بھی شک ہے کہ ہمارے
رِنگ کو لاہور میں اسی لڑکی نے پکڑوایا ہے۔ مجھے امید ہے کہ کل پرسوں
تک ہمیں پاکستان سے پتہ چل جائے گا کہ خان صاحب کا رِنگ کس طرح
پکڑا گیا ہے۔"

"اگر یہ پتہ چل جائے کہ ہمارا رِنگ اس لڑکی نے پکڑوایا ہے تو ہم

اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے" — چیف نے کہا۔

"آپ حکم دیں سر!" — کرنل اوجھا نے کہا — "ہم اس لڑکی کو لاہور سے یہاں لا سکتے ہیں"۔

"اور ہم اسے یہاں لائیں گے سر!" — بریگیڈیئر نے کہا — "میں انتقامی کارروائی بھی کرنا چاہتا ہوں۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے رنگ کے ساتھ راولپنڈی میں کیا سلوک ہوگا اور زینی جیسی دلکش لڑکی کا تو پاکستانی حلیہ ہی بگاڑ دیں گے۔ پھر ہم ان تین مشتبہوں ہاشمی، عبدالقدیر اور جمیل کو کیوں باعزت طریقے سے چھوڑ دیں!"

"ان تینوں کو تو میں بھی مشتبہ سمجھتا ہوں" — کرنل اوجھا نے کہا۔

"میجر بھاٹیہ کو میرے پاس لانے کی ضرورت نہیں" — چیف نے کہا — "اگر تم لوگ سمجھتے ہو کہ اس کے پاس کچھ شہادت ہے تو ان تینوں کو اور ان کی بیویوں کو بھی انویسٹی گیشن سیل میں لے آؤ . . . اس لڑکے رابی نے آخری انفارمیشن بڑی قیمتی بھیجی تھی۔ ہماری گورنمنٹ نے اسے استعمال بھی خوب کیا ہے۔ اب ہماری گورنمنٹ بارڈر سیکیورٹی کو اور زیادہ مستحکم کر دے گی"۔

❄

اگلے دن کا سورج لب بام تھا۔ لاہور سے پکڑے ہوئے ملزم راولپنڈی کے انٹیلی جنس ہیڈ کوارٹر کی کوٹھڑیوں میں الگ الگ بند تھے۔ دو کوٹھڑیاں خالی تھیں۔ ایک میں زینی کو اور دوسری میں رابی کو بند کیا گیا تھا۔ دونوں اپنی کوٹھڑیوں میں نہیں تھے۔ انہیں تفتیش کے کمروں میں لے گئے تھے۔ دونوں سے الگ الگ پوچھ گچھ ہو رہی تھی۔

"زینی!" — تفتیش کرنے والے میجر نے اُسے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا — "تم جوان لڑکی ہو۔ تمہارے لئے ایک ہی راستہ ہے کہ اقبال جرم کر لو۔ نہیں کرو گی تو تم اس بھیانک سلوک کو تصور میں بھی نہیں لا سکتیں جو یہاں تمہارے ساتھ ہوگا۔ اگر تم مر بھی جاؤ گی تو ہم سے باز پرس نہیں ہو گی۔

اس میں کسی شک اور شبہے کی ذرا سا بھی گنجائش نہیں رہی کہ تم انڈیا کی جاسوس ہو اور تمہارا ساتھی جسے تم اپنا بھائی کہتی ہو، مسلمان نہیں، ہندو یا عیسائی ہے۔ کیا یہ اچھا نہیں ہوگا کہ تم ہم سے عزت کرواؤ؟"

میجر نے زینی کو تفصیل سے بتایا کہ صحیح بات نہ کرنے کی صورت میں اس کے ساتھ کیسا کیسا سلوک کیا جائے گا۔ ایک تو یہ طریقے دہشت ناک تھے جو میجر نے اُسے سنائے دوسرے اُس کے سُنانے کا انداز بھی دہشت ناک تھا۔

لڑکی ہوشیار تھی۔ وہ تصور میں لا سکتی تھی کہ اُسے کس انجام تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ اُس نے فوراً کہہ دیا کہ وہ جاسوسی کے لئے پاکستان لائی گئی ہے۔

"تمہیں کہاں کہاں جانے کی اور کس کس سے ملنے کی ہدایات دی گئی تھیں؟" — میجر نے پوچھا۔

"صرف رابی کو ہاتھ میں رکھنا تھا" — زینی نے جواب دیا — "اس کے علاوہ ان لوگوں نے جہاں کہیں مجھے استعمال کرنا تھا میں نے اس کے مطابق کام کرنا تھا۔ اس کے سوا مجھے اور کوئی ہدایت نہیں دی گئی تھی"۔

میجر کے پوچھنے پر اُس نے تسلیم کر لیا کہ وہ ہندو ہے اور انٹیلی جنس نے اُسے زینی کا نام دیا تھا اور یہ کہ وہ اپنا پورا نام زینت بتاتی تھی۔

"کیا تم سنجیدگی سے رابی کے ساتھ شادی کرنے والی تھیں؟" — میجر نے پوچھا۔

"نہیں" — زینی نے جواب دیا — "کچھ عرصہ اسے ٹالنا تھا۔ پھر اس کے بعد ضرورت کے مطابق دیکھنا تھا کہ شادی کی جائے یا نہیں"۔

"دیکھو زینی!" — میجر نے کہا — "میں تمہیں ابھی زینی ہی کہوں گا... تم سے ابھی بہت کچھ پوچھا جائے گا۔ تم عقلمند لڑکی معلوم ہوتی ہو۔ تمہاری

"انہیں اطلاع دو کہ آپ کے والد صاحب آتے ہیں" —— ادریس احمد نے کہا۔

ملازم کچھ کہے بغیر بڑی جلدی چلا گیا۔ دو منٹ بھی نہیں گزرے ہوں گے کہ عزیز احمد بڑی تیز تیز چلتا ادریس احمد کی طرف آیا۔ باپ بیٹا ایک مدت بعد ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ عزیز کے چہرے پر مسرت کا ایسا تاثر تھا جیسے باپ کو دیکھ کر وہ بہت ہی خوش ہوا ہو لیکن ادریس احمد کے چہرے کے تاثرات ایسے تھے جیسے وہ اپنے بیٹے کو پہچاننے کی یا نہ پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کے چہرے پر اس باپ کے تاثرات بھی تھے جسے بڑی مدت بعد بچھڑا ہوا بیٹا نظر آیا ہو اور یہ جنگِ آزادی کے اس مجاہد کے تاثرات بھی تھے جس کا بیٹا اپنے دشمن کا جاسوس بن گیا ہو۔

"ہیلو ابا جان!" —— عزیز احمد اپنے دونوں بازو پھیلاتے ہوئے ادریس احمد کی طرف بیتابی سے بڑھتا آیا —— "آپ نے یہاں آنے کی زحمت کیوں کی؟ میں کل صبح خود ہی گھر آ رہا تھا" —— اور دوسرے لمحے وہ باپ کو اپنے بازوؤں میں لے کر اس کے سینے سے لگا ہوا تھا۔

باپ نے جذبات سے مغلوب ہو کر اپنے بیٹے کے گرد اپنے بازو لپیٹ دیئے اور اس کے آنسو بہہ نکلے پھر اس کی سسکیاں نکلنے لگیں۔

"اندر چلئے ابا جان!" —— عزیز احمد نے کہا اور باپ کے پہلو کے ساتھ ہو گیا۔ اس نے اپنا بازو باپ کی کمر کے گرد لپیٹے رکھا اور اسے دوسری طرف سے کوٹھی کے ایک اور کمرے میں لے گیا۔ اس نے دروازہ تو بند کر لیا لیکن انگلش آرکسٹرا کی ہنگامہ خیز آواز آتی رہی اور اس کے ساتھ دوسری آوازیں بتا رہی تھیں کہ کوٹھی کے کسی کمرے میں کچھ لوگ جمع ہیں اور وہ ناچ گانے میں لگے ہوئے ہیں۔

یہ آوازیں ادریس احمد کو پریشان کر رہی تھیں۔ وہ کبھی اپنے بیٹے

کو اور کبھی اس کمرے کو یوں دیکھتا جیسے وہ کسی اجنبی جگہ میں آ گیا ہو اور ایک اجنبی کے پاس اسے بٹھا دیا گیا ہو۔

"امی جان ٹھیک ہیں نا!" —— عزیز احمد نے بڑے شگفتہ اور جذباتی سے لہجے میں پوچھا۔ پھر اس نے اپنی ہر ایک بہن کا نام لے لے کر خیریت پوچھی۔ پھر ادریس احمد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بڑے پیار سے مسلنے لگا اور پوچھا —— "ابا جان، آپ کی صحت کیسی رہتی ہے .... میں کل گھر آؤں گا۔"

"سب خیریت سے ہیں" —— ادریس احمد نے کہا —— "صرف تمہارے لئے ہم سب پریشان رہتے ہیں۔ کیا تمہیں ہم لوگ کبھی بھی یاد نہیں آئے؟ حساب کرو، کتنے سال گزر گئے ہیں" —— اس پر رقت طاری ہو گئی اور وہ کچھ اور کہہ نہ سکا۔

"اب آ گیا ہوں ابا جان!" —— عزیز احمد باپ کی طرف لپکا اور بازو بچوں کی طرح اس کی گردن میں ڈال کر بولا —— "اب باقی عمر آپ کے اور امی جان کے قدموں میں گزرے گی .... ملازمت ایسی ملی ہے کہ زیادہ عرصہ دلی سے باہر اور ملک سے بھی باہر گزارنا پڑا!"

"ایسی کون سی ملازمت ہے؟" —— ادریس احمد نے پوچھا —— "کسی سفیر کے ساتھ ملک سے باہر چلے گئے تھے؟"

"ہے تو ٹورازم ڈیپارٹمنٹ" —— عزیز احمد نے جواب دیا —— "لیکن اس ڈیپارٹمنٹ کا سیکرٹری مجھ پر اتنا مہربان ہے کہ باہر بھی مجھے بھیج دیتا ہے بلکہ مجھے ہی باہر بھیجتا ہے .... اس کے علاوہ ابا جان، میں نے اپنا ایک بزنس بھی چلا رکھا ہے۔ یہ امپورٹ ایکسپورٹ جیسا بزنس ہے۔ اس کی مصروفیت الگ ہے۔"

باپ بیٹے کی ان باتوں پر اعتبار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ٹورازم ڈیپارٹمنٹ میں اتنا زیادہ باہر جانے کا امکان نہیں ہوتا جتنا عزیز بتا رہا تھا لیکن عزیز باپ کی محبت میں اس قدر جذباتی ہوا جا رہا تھا کہ ادریس احمد

ہیپناٹائز سا ہو گیا۔ ادریس احمد کی کمزوری یہ تھی کہ وہ باپ تھا۔ اُس کا دل کہتا تھا کہ اُس کے بیٹے کے خلاف جاسوسی کا الزام غلط ہے۔ اُسے ذرا سا بھی شک نہ ہُوا کہ اُس کا بیٹا چرب زبانی کی مہارت رکھتا ہے اور انڈین انٹیلی جنس کا تربیت یافتہ اور تجربہ کار ایجنٹ ہے۔ اپنے باپ پر جو اُس کی محبت میں دیوانہ ہُوا جا رہا تھا، اپنا جادو چلانا کوئی مشکل نہیں تھا۔

کوٹھی کے کسی کمرے میں آرکسٹرا اور کچھ آدمیوں کا اُودھم ادریس احمد کو پریشان کر رہا تھا لیکن اُس نے اپنی توجہ اپنے بیٹے پر مرکوز کر رکھی تھی۔

"عزیز بیٹا!" —— ادریس احمد نے اپنے دل کو مضبوط کر کے کہا —— "اپنے ماں باپ کی محبت کے صدقے میرا ایک وہم دُور کر دو۔ باپ خوش ہو جاتے گا کہ بیٹے نے ساری عمر کے گِلے شکوے دھو ڈالے ہیں .... اُڑتی اُڑتی سُنی ہے کہ تم انڈین جاسوس ہو۔"

عزیز احمد اُس گیند کی طرح کرسی سے اُچھلا جیسے فرش پر پٹخا گیا ہو۔

"وہ کون ہے جس نے آپ کے دل میں یہ وہم ڈالا ہے کہ مَیں ہندو جیسے مکار دشمن کا جاسوس ہوں؟" —— عزیز احمد نے سخت غصیلے لہجے میں پوچھا —— "کیا ادریس احمد کا بیٹا غدار اور ایمان فروش ہو سکتا ہے! .... مجھے اُس شخص کا نام بتائیں۔"

"مَیں نے سُنا ہے کہ تم اشوکا ہوٹل میں بھی قیام کرتے ہو" —— ادریس احمد نے کہا —— "اللہ کرے میرے بیٹے کے خلاف یہ الزام غلط ثابت ہو، لیکن تمہیں ان دنوں اشوکا ہوٹل سے نکلتے دیکھا گیا ہے۔"

"اشوکا ہوٹل میں آنا جانا تو لگا ہی رہتا ہے" —— عزیز احمد نے کہا —— "غیر ملکی ٹورسٹ اسی ہوٹل میں ٹھہرتے ہیں اور اُن کے ساتھ میرا تعلق ہوتا ہے .... لیکن اباجان! مجھے یہ ضرور بتائیے کہ وہ کون ہے جو آپ کو میرے خلاف بھڑکا رہا ہے۔"

ادریس احمد ہاشمی کا حوالہ نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ یہ مان سکتا تھا کہ اُس کے بیٹے پر ہاشمی کا جو شک ہے وہ غلط ہے لیکن وہ یہ نہیں مان سکتا

تھا کہ ہاشمی نے کسی عداوت یا بدنیتی کی بنا پر اُس کے بیٹے پر الزام عائد کیا ہے کیونکہ اُسے یقین تھا کہ ہاشمی دل میں عداوت اور بدنیتی رکھنے والا آدمی نہیں۔

"اباجان!" —— عزیز نے پوچھا —— "آپ کو میری کوٹھی کا ایڈریس کس نے بتایا تھا اور مجھے اشوکا ہوٹل سے نکلتے کس نے دیکھا تھا؟ ..... یہ کوئی میرا دشمن معلوم ہوتا ہے۔"

"یہ شک تو میرے دل میں بھی پیدا ہو سکتا ہے" —— ادریس احمد نے کہا —— "اس کا ثبوت تمہارا ماضی اور تمہارا کردار ہے۔ تم نے جس طرح زندگی گزاری ہے اور جس طرح تم نے روپے پیسے کو اپنا دین اور دھرم بنا لیا تھا، اس سے مَیں اب بھی اس شک میں مبتلا ہوں کہ تمہاری یہ آمدنی جائز ذرائع سے حاصل کی ہوئی نہیں۔ یہ حلال کی آمدنی نہیں۔"

"اباجان!" —— عزیز احمد نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا —— "مَیں آپ کو کس طرح یقین دلاؤں کہ میں شریفانہ زندگی بسر کر رہا ہوں۔"

ادریس احمد اُٹھ کھڑا ہُوا اور کسی اور کمرے میں کھلنے والے دروازے تک گیا۔ دروازہ کھول کر وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔ یہ چھوٹا سا کاریڈور تھا جہاں کسی کمرے میں ہنسنے اور اُودھم مچانے کی بلند آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ عزیز اُس کے پیچھے گیا۔ ادریس احمد کاریڈور میں چلتا ایک اور دروازے تک پہنچا اور یہ دروازہ کھولا۔ سگریٹوں کے دُھوئیں اور شراب کی بدبُو کے ایک زوردار تھپیڑے نے اُسے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔

کمرے میں دس بارہ نوجوان اور جوان سال لڑکے اور لڑکیاں تھیں۔ کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ کس کا کون سا مذہب ہے یا ان کا کوئی مذہب ہے بھی یا نہیں۔ یہ ڈسکو سوسائٹی کی نسل تھی۔ لڑکے لڑکیوں کے ساتھ بیہودہ اور حیا سوز حرکتیں اور باتیں کر رہے تھے۔ باہر کی شراب کی بوتلیں ایک طرف تپائی پر رکھی تھیں۔ کچھ کھانے کی چیزیں بھی رکھی تھیں۔ وہ کچھ دیر پہلے ناچ کر صوفوں وغیرہ پر گرے تھے۔ سب نشے کی حالت میں تھے۔ کیسٹ پلیئر ڈسکو

میوزک کا ایک انگریزی گانا بڑی بلند آواز سے الاپ رہا تھا۔

عزیز احمد اپنے باپ کے پہلو میں آن کھڑا ہُوا۔

"یہ سب ٹورسٹ ہیں اباجان!" — عزیز نے کہا — "میرا ان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں .... یہ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔"

"ہاں، ان کے ساتھ تمہارا کوئی تعلق نہیں" — ادریس احمد نے کہا — "لیکن شراب کے ساتھ تمہارا گہرا تعلق ہے۔ تمہارے مُنہ سے شراب کی بُو آرہی ہے .... یہ ہے تمہاری شریفانہ زندگی!"

ادریس احمد وہیں سے پلٹا، کاریڈور میں سے بڑا تیز تیز چلتا کوٹھی سے باہر نکل گیا۔

❦

ادریس احمد اپنے گھر پہنچا۔ اُس کی بیوی بے تابی سے اُس کی منتظر تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ اُس کا خاوند بیٹے سے ملنے گیا ہے۔ باپ پریشانی کے عالم میں گھر میں داخل ہُوا۔ بیوی بڑے اشتیاق سے اُس کے پاس آبیٹھی اور اُس سے پوچھا کہ بیٹا ملا یا نہیں!

ادریس نے بیٹے سے ملاقات کی ساری رُوداد سُنا دی۔

"تو اُسے بتا دینا تھا کہ یہ شک ہاشمی نے ڈالا ہے کہ ہمارا بیٹا پاکستان کے خلاف جاسُوسی کر رہا ہے" — ادریس احمد کی بیوی نے کہا۔

"چلو مان لیتے ہیں کہ وہ جاسوس نہیں" — ادریس احمد نے کہا — "لیکن جو منظر مَیں اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں اس سے تو میں انکار نہیں کر سکتا۔ وہاں شراب پارٹی ہو رہی تھی اور میں نے وہاں جو بیہودگی دیکھی ہے وہ میں بیان کر چکا ہوں۔ یہ سب ناجائز ذرائع کی آمدنی ہے۔"

عزیز احمد کی ماں چونکہ ماں تھی اس لئے اپنے بیٹے کے خلاف اتنی زیادہ باتیں گوارا نہیں کرتی تھی۔ وہ اپنے خاوند کی منّتیں کرنے لگی کہ وہ اُسے بیٹے سے ملوا دے۔ باپ غصّے میں بھی تھا اور پریشان بھی۔ وہ بار بار کہتا تھا کہ وہ آئندہ اپنے بیٹے کی صورت بھی نہیں دیکھے گا۔

ان دونوں نے اسی ذہنی کیفیّت میں رات گزار دی۔ اگلی صبح دس

بجے کے قریب ادریس احمد کہیں باہر چلا گیا اور اُس کے جانے کے کچھ دیر بعد عزیز احمد گھر آگیا۔ گھر میں ماں تھی اور اس کی ایک شادی شدہ بہن آئی ہوئی تھی۔ ماں جس دیوانگی سے اپنے بیٹے کو ملی وہ ایسے ہی تھا جیسے کسی ماں کا اپنا دُودھ پیتا بچہ کچھ دنوں کی گمشدگی کے بعد مل گیا ہو۔ عزیز کو ماں نے اپنے بازوؤں سے نکالا تو وہ بہن کے بازوؤں کی گرفت میں آگیا۔ ماں اور بہن نے اُس کا مُنہ اس طرح چُوما جیسے اُسے چاٹ رہی ہوں۔

"اتنا عرصہ کہاں رہے عزیز؟"

"شادی کر لی ہو گی۔"

"بیوی کہاں ہے؟ .... کیسی ہے؟ ایک دو بچے بھی ہوں گے۔"

"لاؤ نا اُنہیں بھی!"

"ہمیں وہاں لے چلو۔"

"تمہارے اباجان نے بتایا تھا کہ تمہاری کوٹھی بہت خوبصورت ہے۔"

ماں اور بہن اُس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر رہی تھیں اور کسی سوال کے جواب کا انتظار نہیں کرتی تھیں۔ یہ اُن کی بے تابی کا عالم تھا۔

"تم نہ آتے تو ہم اباجان کی طرح تمہاری کوٹھی میں پہنچ جاتیں" — عزیز کی بہن نے کہا۔

"اباجان کو دیکھ کر مجھے جو خوشی ہوتی وہ مَیں بیان نہیں کر سکتا" — عزیز نے کہا — "لیکن کسی کے کہنے میں آکر مجھ پر جو الزام لگایا ہے اُس کی پریشانی کو بھی مَیں بیان نہیں کر سکتا .... کچھ سرکاری مہمان گورنمنٹ نے میرے حوالے کر دیتے تھے۔ وہ مسلمان نہیں تھے۔ ہندو اور اینگلو انڈین تھے۔ انہوں نے شراب پارٹی رچا دی۔ اباجان اُس کمرے میں جا دھمکے اور مجھ پر ایک الزام یہ لگایا کہ میں انڈیا کا جاسوس ہوں اور دوسرا یہ کہ میں بھی شراب پیتا ہوں اور انہی لوگوں جیسی زندگی میری بھی ہے۔ میں تو گھر آ ہی رہا تھا۔ میں نے ارادہ یہ کیا تھا کہ آپ سب کو اپنی کوٹھی میں لے جاؤں گا۔ میں نے ابھی تک شادی نہیں کی۔ مَیں نے پکا فیصلہ کر رکھا ہے کہ میری شادی آپ اپنی پسند اور مرضی کے مطابق کرائیں گی .... گھر آکر اباجان نے کیا

بتایا تھا؟"

عزیز کی ماں کا دل اُس کی اتنی سی باتوں سے ہی شیشے کی طرح صاف ہو گیا۔ الفاظ نے اتنا اثر نہ کیا جتنا اثر عزیز کے بولنے کے انداز نے دکھایا۔

"امی جان!" — عزیز نے ماں سے کہا — "میں اس لئے پریشان نہیں کہ اباجان نے میرے خلاف ایک الزام کو صحیح مان لیا ہے۔ اصل پریشانی یہ ہے کہ اباجان نے یہ نہیں بتایا کہ وہ کون ہے جس نے میرے باپ کے دل میں میرے خلاف نفرت پیدا کر دی ہے۔ اگر میں نے آج اُس آدمی کو نہ پکڑا تو کل وہ میری کسی نہ کسی بہن پر کوئی غلط الزام تھوپ دے گا۔ وہ شخص آپ کے دامادوں کو آپ کے خلاف کر سکتا ہے۔ خدا کے لئے امی جان اباجان سے پوچھ کر مجھے بتائیں وہ کون ہے۔"

"میں بتاتی ہوں بیٹا!" — اُس کی ماں نے کہا — "اُس کا نام فرید الدین ہاشمی ہے۔ تمہارے اباجان مجھے بتا چکے ہیں۔"

"یہ برابر کے محلے والا ہاشمی؟" — عزیز احمد نے پوچھا — "وہ جن کی بہت بڑی حویلی ہے اور اس میں صرف میاں بیوی رہتے ہیں؟.... اُس شخص کو میرے ساتھ کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟"

"دشمنی نہیں بیٹے!" — ماں نے کہا — "وہ اچھے لوگ ہیں۔ تمہارے اباجان کے دوست بھی ہیں۔ اُن کی بیوی کے ساتھ میرے اچھے خاصے مراسم ہیں۔ یہ لوگ دراصل اُن جذباتی مسلمانوں میں سے ہیں جو امام مہدی کے آنے سے پہلے پہلے ساری دنیا میں اسلام پھیلا دینا چاہتے ہیں۔ جو مسلمان ان کی مخالفت کرتا ہے اُسے یہ ہندوستان کا جاسوس کہہ دیتے ہیں۔"

"کیا یہ ہاشمی یہاں کے مسلمانوں کا لیڈر تو نہیں بن بیٹھا؟" — عزیز نے پوچھا — "اس عمر میں آکر بعض آدمی محلے کی مسجد کمیٹی کے ممبر بن جاتے ہیں اور اپنے آپ کو لیڈر سمجھنے لگتے ہیں۔"

"میرا خیال ہے وہ اس قسم کے لیڈر تو نہیں ہیں" — ماں نے کہا — "میں یہ بتا سکتی ہوں کہ ہاشمی صاحب اُن ہندوستانی مسلمانوں میں سے ہیں جو پاکستان سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ پورے ہندوستان کو پاکستان بنانے

کے منصوبے بناتے رہتے ہیں۔"

"میں آؤں گا امی جان!" — عزیز نے اُٹھتے ہوئے کہا — "اباجان نے آپ کو بتایا ہو گا کہ میں ایک سرکاری محکمے میں بڑے اچھے عہدے کا افسر ہوں۔ میں رات کے سرکاری مہمانوں کو بھگتا کر آؤں گا۔"

عزیز احمد کے رات کے مہمانوں میں رابی بھی تھا۔ رشی کی گمشدگی کی سراغرسانی کے دوران عزیز کو کہا گیا تھا کہ وہ رابی کو اپنے گھر میں ٹھہرا لے۔ اس کا عزیز کو اچھا خاصا الاؤنس ملتا تھا۔ وہ رابی کو اپنی کوٹھی میں لے گیا تھا۔ گزشتہ رات اس کوٹھی میں انگریزی ناچ گانے کی اور شراب نوشی کی جو محفل منعقد کی گئی تھی وہ رابی کی مزید برین واشنگ کا ایک ذریعہ تھا اور اُس کے دل سے رشی کو اُتارنے کا ایک ذریعہ بھی۔

عزیز اپنے ساتھی ورما سے ملا اور اُسے ہاشمی کی اس الزام تراشی کے متعلق بتایا۔ رات ورما بھی جس کا رابی سے تعارف عبدالرحمٰن کے نام سے کرایا گیا تھا، عزیز کی کوٹھی میں موجود تھا۔ اُس نے عزیز کے باپ کے چلے جانے کے بعد پوچھا تھا کہ یہ کون تھا اور عزیز نے اُسے بتایا تھا کہ یہ اُس کا باپ تھا۔

"ورما بھائی!" — عزیز نے ماں سے ملنے کے بعد ورما سے کہا — "یہ پتہ چل گیا ہے کہ میرے ماں باپ کو کس نے بتایا ہے کہ میں انٹیلی جنس میں ہوں۔ اس کا نام فرید الدین ہاشمی ہے اور وہ ہمارے ساتھ والے محلے میں رہتا ہے۔ محلے میں کسی کو میری کوٹھی کا ایڈریس معلوم نہیں۔ یہ بھی ہاشمی نے میرے باپ کو بتایا ہے بلکہ وہ خود میرے باپ کے ساتھ میری کوٹھی تک آیا تھا۔ اس شخص نے مجھے اشوکا ہوٹل سے نکلتے بھی دیکھا تھا اور میرے باپ کو بتایا تھا.... میں سوچ رہا ہوں کہ اس شخص پر رشی کے اغوا کا شبہ کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔"

"کیا یہ ہاشمی بدمعاش لوگوں میں سے ہے؟" — ورما نے پوچھا — "کس ٹائپ کا آدمی ہے؟"

"جذباتی سا مسلمان ہے" — عزیز نے جواب دیا — "بدمعاش نہیں، نیک اور پارسا آدمی ہے۔ اتنی بڑی واردات کا اُس پر شبہ تو نہیں کیا جاسکتا، لیکن ان جذباتی مسلمانوں کا کچھ پتہ بھی نہیں۔ مجھے اپنی ماں نے اُس کے متعلق کچھ باتیں بتائی ہیں۔"

"ایسی بات ہے تو اس کا نام مشتبہوں میں لکھوا دیتے ہیں" — ورما نے کہا — "سی آئی اے یا اپنا انویسٹی گیشن سیل کھرا کھوٹا الگ الگ کر لے گا۔"

"نہیں" — عزیز نے کہا — "چونکہ وہ ہماری جان پہچان کے لوگ ہیں اس لئے مجھے ذرا اپنی مخبری کر لینے دیں۔ مَیں مان نہیں سکتا کہ اس معزز آدمی نے اتنی جرأت کی یا کروائی ہوگی۔ رشی کا اغوا باقاعدہ پلان کا نتیجہ ہے.... مَیں تم سے مشورہ لینا چاہتا ہوں۔ میں انہیں نظر انداز بھی نہیں کر سکتا۔ اگر میرا شک پکا ہوگیا تو چیف کو اس شخص کا اتا پتہ بتا دیں گے۔"

"عزیز بھائی!" — ورما نے کہا — "مَیں حیران ہوں کہ کس صفائی سے اس لڑکی کو اُڑایا گیا ہے۔ کبھی تو مجھے شک ہوتا ہے کہ لڑکی کو یہاں کا کوئی لڑکا پسند آیا ہے اور وہ اُس کے ساتھ چلی گئی ہے۔"

"یہ باتیں پہلے ہو چکی ہیں" — عزیز نے کہا — "ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ لڑکی کو کسی پاکستانی ایجنٹ نے نہ اُڑا لیا ہو۔ اگر وہ خود گئی ہے یا اُسے کسی نے عصمت فروشی کی خاطر اغوا کیا ہے تو ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

❦

شام کھانے کے بعد ہاشمی اور اُس کی بیوی رشی کے پاس اُس کمرے میں بیٹھے ہوتے تھے جو اُس کے لئے حوالات کا کمرہ بنا ہوا تھا۔ رشی ابھی تک اپنی اس بات پر قائم تھی کہ اُسے بالکل معلوم نہیں کہ رابی اور عزیز انڈیا کے جاسوس ہیں۔ اُس کے دل پر اب ایسا کوئی بوجھ نہیں تھا کہ اُسے کسی غلط مقصد کے لئے اغوا کیا گیا ہے۔ صرف یہی نہیں کہ اُس کا یہ شک رفع ہوگیا تھا بلکہ وہ ہاشمی اور اُس کی بیوی سے ایسی متاثر ہوتی

تھی کہ اُس نے اپنی ذات میں اور اپنے خیالات میں تبدیلی محسوس کرنی شروع کر دی تھی۔ اُس نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ ہاشمی کے سوا کوئی اور مرد اس کمرے میں نہیں آتا تھا اور ہاشمی آتا تھا تو اُس کا انداز بزرگوں جیسا ہوتا تھا۔

"کیا آپ آج مجھے کچھ کہنے کی اجازت دیں گے؟" — رشی نے ہاشمی اور اُس کی بیوی سے کہا۔

"کیوں نہیں!" — ہاشمی نے کہا — "ہم تو چاہتے ہیں کہ تم کچھ کہو۔ تم نے ہمارا مقصد جان لیا ہے.... کہو کیا کہنا ہے؟"

"مَیں سمجھتی تھی کہ جس انداز سے میں زندگی گزار رہی ہوں یہی جینے کا انداز ہے اور باقی سب لوگ جاہل اور گمراہ ہیں" — رشی نے اُداس سے لہجے میں کہا — "مَیں آپ کو تفصیل سے بتاتی ہوں کہ میری اور مجھ جیسی نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں کی زندگی کیسے گزر رہی ہے۔"

"تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں راشدہ!" — ہاشمی نے کہا — "مَیں تمہیں رشی نہیں کہوں گا۔ تم مسلمان ماں باپ کی بیٹی ہو۔ میں تمہیں اُسی نام سے پکاروں گا جو نام تمہیں ماں باپ نے دیا تھا.... تم جو مجھے بتانے لگی ہو وہ میں جانتا ہوں۔ تم ڈسکو سوسائٹی کی لڑکی ہو۔ یہ سوسائٹی ہندوستان میں بھی موجود ہے۔ اگر اس میں ہندو، سکھ اور عیسائی شامل ہوتے تو ہمیں کوئی افسوس نہ ہوتا۔ افسوس یہ ہے کہ مسلمانوں کے بچے بھی اس سوسائٹی میں شامل ہو گئے ہیں اور وہ اپنے مذہب سے بھی دستبردار ہو چکے ہیں۔ انگریزی گانے گانا، پاگلوں کی طرح انگریزی گانوں کے ساتھ ناچنا، بے حیائی کو جائز سمجھنا اور جنسی کھیل کھیلنا اس سوسائٹی میں جائز ہے۔ تم بچی ہو راشدہ! تم نہیں جانتیں کہ یہ اخلاق سوز کلچر کون پھیلا رہا ہے۔ ہماری دلچسپی صرف پاکستان اور ہندوستان کے مسلمان نوجوانوں کے ساتھ ہے۔ چونکہ یہ نوجوان اپنے مذہب اور اپنی وطنیت سے منحرف ہو جاتے ہیں اس لئے دشمن ملک انہیں اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتا ہے۔ اگر تم نہیں جانتیں کہ تمہارا خاوند ہندوستان کا

جاسُوس ہے یا نہیں تو مجھ سے سنو۔ تمہارے خاوند کو اسی جال میں پھانس کر یہاں لایا گیا ہے۔ ہوسکتا ہے تمہارے خاوند کو روپے پیسے اور تم جیسی نوجوان اور حسین لڑکیوں کے چکر میں بھی ڈالا گیا ہو۔"

"اب میرے دماغ میں ایک بات آتی ہے" ـــ رشی نے کہا ـــ "وہ مَیں آپ کو بتاتی ہوں۔ پاکستان میں عزیز کے ساتھ ایک لڑکی تھی جسے وہ اپنی بیوی بتاتا تھا۔ پھر لاہور میں اُس نے نبیلہ نام کی ایک لڑکی کے ساتھ ملوایا تھا۔ عزیز کی بیوی مریم کہتی تھی کہ نبیلہ اُس کی کزن ہے۔ یہ دونوں لڑکیاں ہم عمر ہیں اور خاصی خوبصورت ہیں۔ اب مجھے خیال آتا ہے کہ وہ بہت ہی تیز طرار، ہنستی مسکراتی اور چالاک لڑکیاں ہیں۔ اب مجھے یاد آتا ہے کہ یہ دونوں رابی کو اپنے ساتھ لگاتے رکھتی تھیں۔ رابی شام کے بعد گھر سے چلا جاتا اور رات دیر سے آیا کرتا تھا۔ وہ باہر جانے کا کوئی نہ کوئی بہانہ بنا لیتا تھا۔ پھر میں نے اُس کے پاس اتنے زیادہ پیسے دیکھے تھے جو مجھے یقین ہے کہ اُس کے ماں باپ نے اُسے نہیں دیتے تھے۔"

"کیا عزیز کی بیوی اُس کے ساتھ آتی ہے؟" ـــ ہاشمی نے پوچھا۔

"نہیں!" ـــ رشی نے جواب دیا ـــ "یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں کہ وہ اپنی بیوی کو اپنے ساتھ نہیں لایا۔"

"اب کہو" ـــ ہاشمی نے کہا ـــ "تم کچھ کہنا چاہتی تھیں .... میرا خیال ہے کہ تم جان گئی ہو کہ عزیز اور تمہارے خاوند پر ہمارا الزام یا شک غلط نہیں۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں" ـــ رشی نے کہا ـــ "مَیں آپ سے درخواست کروں گی کہ میں جو بات کہنے لگی ہوں اس پر ہمدردی سے غور کریں .... مَیں نے اسی سوسائٹی میں آنکھیں کھولی تھیں جس کا ابھی ابھی ہم نے ذکر کیا ہے۔ اپنا باپ مجھے اچھی طرح یاد نہیں، میرے بچپن میں ہی مر گیا تھا۔ مَیں اپنے باپ کا نام احترام سے نہیں لُوں گی۔ دِلّی آنے سے کچھ دن پہلے تک میں اپنے باپ کو یاد کرتی رہی ہوں کہ میرا باپ نہیں ہے لیکن یہاں آنے سے پہلے مجھے کچھ ایسی باتوں کا پتہ چلا جن سے

میرے دل سے اپنے باپ کا اور اپنی ماں کا بھی احترام نکل گیا۔ مجھے پتہ چلا کہ میرا باپ پاکستان گورنمنٹ میں اونچے درجے کا افسر تھا۔ وہ سرکاری روپے پیسے میں غبن کا ماہر تھا۔ رشوت خور بھی تھا اور جعل ساز بھی۔ وہ کئی بار پکڑا گیا اور میری ماں جو عمر کے لحاظ سے میرے باپ سے خاصی چھوٹی تھی، خوبصورت اور چالاک بھی تھی، میرے باپ کو پکڑنے والے افسروں سے مل کر کیس دبوا لیتی تھی۔"

رشی نے ہاشمی اور اُس کی بیوی کو تفصیل سے سنایا کہ اُس کی ساس نے کس طرح اُس کی ماں کی بے عزتی کی اور اُسے کہا تھا کہ میری ماں میرے سُسرال میں نہ آیا کرے۔ رشی نے یہ بھی سنایا کہ اُس نے اپنی ساس سے کہا کہ وہ اپنی ماں کی بے عزتی برداشت نہیں کر سکتی تو ساس رشی پر برس پڑی اور بولی کہ میں تمہیں بڑی مشکل سے اپنے گھر میں برداشت کر رہی ہوں۔

"میری ماں چلی گئی" ـــ رشی نے رابی اور اپنی ماں کی لڑائی کی تفصیل سُنا کر ہاشمی اور اُس کی بیوی کو بتایا ـــ "مَیں اپنے کمرے میں چلی گئی۔ جب میرا خاوند گھر آیا تو میں نے بڑے غصے سے اُسے بتایا کہ اُس کی ماں نے میری ماں کو کس قدر گھٹیا اور ناقابلِ برداشت باتیں کہی ہیں۔ میں نے اُسے وہ ساری باتیں سُنائیں۔ میرے خاوند نے کہا کہ اُس کی ماں نے جتنی بھی باتیں کہی ہیں وہ بالکل صحیح ہیں۔ مَیں نے خاوند سے کہا کہ وہ میرے باپ اور میری ماں کا ماضی مجھے کھُل کر سُناتے .... اُس نے مجھے وہ باتیں بھی سنا دیں جو اُس کی ماں نے میری ماں سے نہیں کہی تھیں۔ میرے خاوند نے مجھے یہ بھی کہا کہ اس سوال کا جواب تو تمہاری ماں بھی نہیں دے سکتی کہ تم کس کی بیٹی ہو ....

"خاوند نے مجھے جو کہانیاں سنائیں ان سے میں یہی سمجھی کہ میرے والدین بڑے اونچے درجے کی عصمت فروشی کرتے رہے ہیں۔ اُن کی جتنی بھی جائیداد ہے وہ سب رشوت، غبن اور بدعنوانی کے ذریعے بنائی گئی ہے۔ اپنے ماں باپ کے گناہوں کی یہ داستان سُن کر مجھے بہت

دُکھ ہُوا۔ آپ مجھے شریف لڑکی نہیں کہیں گے، لیکن میں جس سوسائٹی سے تعلق رکھتی ہوں اس میں بھی شرافت کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس سوسائٹی میں شرافت کا معیار کچھ اور ہے۔ اسے وقار کہہ لیں، پریسٹج کہہ لیں۔ میں اگر آپ کے اخلاقی پیمانوں کے مطابق شریف نہیں تو بھی یقین جانیں کہ مَیں نے اپنے آپ کو اتنی گھٹیا سطح تک نہیں گرایا تھا۔ مَیں نے اپنے خاوند کے مُنہ سے ماں باپ کی یہ باتیں سُن کر خاوند کا شکریہ ادا کیا کہ اُس کے دل میں میری محبت پیدا ہو گئی تھی اور اسی محبت کی خاطر اُس نے اپنی ماں کو ناراض کر کے میرے ساتھ شادی کر لی ہے ....

"میرے خاوند نے میرا شکریہ قبول نہ کیا۔ اس کی بجائے اُس نے بڑے صاف الفاظ میں مجھے کہا کہ مَیں نے تمہارے ساتھ اُس محبت کی خاطر شادی نہیں کی جو تم فلموں اور ناولوں کی کہانیوں میں پڑھتی رہی ہو۔ مجھے تو تمہارا جسم اتنا اچھا لگا تھا کہ میں نے اسے اپنی ملکیت میں رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔"

رِشی کے آنسو نکل آئے اور اُس کا سَر جُھک گیا۔ ہاشمی نے اُس کے سَر پر ہاتھ رکھا۔ اُس کی بیوی نے اُٹھ کر رِشی کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ اس اپنائیت اور ہمدردی نے رِشی کے جذبات کو ہلا کر رکھ دیا اور وہ پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی۔

"مَیں کون ہوں خالہ جان؟" ــــ رِشی نے ہاشمی کی بیوی سے لپٹ کر روتے ہوئے کہا ــــ "مَیں کیا ہُوں؟ مَیں کہاں سے آئی تھی، کہاں جا رہی ہوں؟ مجھے کوئی نہیں بتاتا۔ مجھے اپنے راستے کا علم نہیں، اپنی منزل کا علم نہیں۔ مَیں جسے اپنا باپ سمجھتی تھی وہ کچھ اور نکلا۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ میری رگوں میں کس کا خون ہے۔ اپنی ماں کو میں کیا سمجھتی تھی اور وہ کیا نکلی۔ میں خوش تھی کہ میرے ساتھ تعلقات پیدا کرنے والے سینکڑوں لڑکوں میں ایک راہی ہے جس کے دل میں میری محبت ہے، لیکن وہ بھی میرے جسم کا خریدار نکلا۔"

"تم ابھی بچی ہو" ــــ ہاشمی کی بیوی نے کہا ــــ "اس دنیا کو اور دنیا کے انسانوں کو اور ہر انسان کے دل میں چھُپے ہُوئے بھید کو جاننے کے لئے تم ابھی کمسن ہو۔ اپنے دل کو اتنا دکھی نہ کرو۔ ہم نے تمہیں سچ بولنے پر اُکسایا ہے۔ یہی وہ سیدھا راستہ ہے جو ہم تمہیں دکھا سکتے ہیں۔"

"اور ہم تمہیں تمہاری منزل بھی دکھا دیں گے" ــــ ہاشمی نے کہا ــــ "اور اُس منزل تک پہنچا بھی دیں گے۔"

رِشی اور زیادہ رونے لگی۔ اُس نے اپنا سر ہاشمی کی بیوی کی آغوش میں پھینک دیا۔ اس معزز خاتون نے اُسے بہلا لیا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں" ــــ رِشی نے بڑی لمبی آہ بھر کر کہا ــــ "مَیں کچھ نہیں سمجھتی، کچھ نہیں جانتی۔ مَیں آپ کو کچھ اور سمجھتی تھی اور آپ کچھ اور نکلے۔ مَیں نے اس پر بھی غور کیا ہے کہ جو آدمی مجھے ہوٹل سے دھوکے میں لے گیا تھا وہ جوان آدمی تھا۔ راستے میں گاڑی میں جو دو آدمی بیٹھے تھے وہ بھی جوان تھے۔ وہ مجھے کہیں اور لے جا سکتے تھے۔ اُنہیں بھی میرا جسم اچھا لگا ہوگا، لیکن وہ مجھے ایک امانت کے طور پر آپ کے حوالے کر کے چلے گئے .... انکل! آپ اتنے بوڑھے تو نہیں۔ آپ کی نیت بھی مجھ پر خراب ہو سکتی تھی، لیکن آپ نے مجھے اپنی بیٹی کہا اور خالہ نے مجھے اسلام کی بیٹی کہا۔ مَیں تو انکل سے اور اس گھر میں لانے والوں سے یہ کہنا چاہتی تھی کہ مَیں کوئی شریف اور کنواری لڑکی نہیں۔ میرے جسم کو نوچ لو اور جب طبیعت بھر جائے تو جہاں بیچنا چاہتے ہو بیچ ڈالو۔ میرے پاس اپنا جسم تھا۔ میں اپنی رہائی کے لئے یہی پیش کر سکتی تھی، لیکن ہُوا وہی کہ میں سمجھی کچھ اور، اور نکلا کچھ اور۔ مَیں آپ کو سچ بتاتی ہوں کہ میرا فیصلہ کیا ہے۔ فیصلہ یہ ہے کہ آپ مجھے اس گھر سے نکالیں گے تو بھی مَیں یہاں سے نہیں نکلوں گی۔"

"نہیں بیٹی!" ــــ ہاشمی نے کہا ــــ "تمہیں یہاں سے ایک نہ ایک دن جانا ہی ہوگا۔ ہم تمہیں رکھ نہیں سکیں گے۔ ہم نے تمہیں اغوا کیا ہے اور یہ جرم ہے۔ اگر تم یہاں کسی عدالت میں بیان بھی دے دو کہ تم اپنی

مرضی سے یہاں آئی ہو تو یہ تمہارا جرم ہو گا کہ تم اپنے خاوند کو چھوڑ کر بغیر طلاق کے بھاگی ہو۔ دوسری مشکل ہمارے لئے یہ پیدا ہو گئی ہے کہ تم یہاں کی حکومت کا قیمتی مال ہو۔ تمہارا تعلق انٹیلی جنس کے ساتھ ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ تمہیں اپنی یا اپنے خاوند کی اس حیثیت کا علم نہیں۔ اگر تم ہمارے قبضے سے برآمد ہوئیں تو ہندوؤں کی حکومت مجھے اور میری بیوی کو بغیر مقدمے کے یا ہم پر پاکستانی جاسوس کا لیبل لگا کر ساری عمر کے لئے جیل میں ڈال دے گی۔ ہمیں اُس وقت تک تشدد کا تختۂ مشق بنا کے رکھا جاتے گا جب تک ہم اُن سب کی نشاندہی نہیں کر دیتے جو تمہیں یہاں لاتے تھے۔"

"نہیں"۔۔۔ رِشی نے کہا ۔۔۔ "مَیں آپ کو ایسے جہنم میں نہیں ڈالوں گی .... لیکن یہ سوچ بھی آتی ہے کہ مَیں واپس جاؤں گی تو وہ مجھ سے پوچھیں گے کہ تم کہاں گئی تھیں"۔۔۔ وہ بولتے بولتے چُپ ہو گئی اور اُس نے یوں چونک کر ہاشمی کی طرف دیکھا جیسے اُسے اچانک کچھ یاد آ گیا ہو۔ کہنے لگی۔۔۔ "آپ مجھے یہاں آزاد کرنے کی بجائے کسی طرح پاکستان بھجوا دیں۔ اگر میرا خاوند جاسوس ہے تو ہو سکتا ہے اُس کا باپ بھی جاسوس ہو۔ میں انہیں پکڑوا دوں گی۔ مَیں آپ کی محبت کی خاطر اپنا مستقبل قربان کر دوں گی۔"

"ہماری محبت کی خاطر نہیں"۔۔۔ ہاشمی نے کہا۔۔۔ "پاکستان کی محبت کی خاطر اور ہندوستانی مسلمانوں کی محبت کی خاطر۔"

"مجھے کہنا تو یہی چاہیئے تھا"۔۔۔ رِشی نے کہا ۔۔۔ "مَیں نے شاید یہ اس لئے نہیں کہا کہ میرے دل میں پاکستان کی اور ہندوستانی مسلمانوں کی محبت یہاں آکر پیدا ہوتی ہے اور یہ آپ نے پیدا کی ہے۔"

"تم نے اپنے والدین کے متعلق تو بہت کچھ بتا دیا ہے"۔۔۔ ہاشمی نے کہا۔۔۔ "مجھے صرف اپنے سُسر کا ایڈریس بتا دو اور یہ بھی کہ وہ کون سے محکمے میں افسر ہیں۔"

رِشی نے رابی کی کوٹھی کا صحیح ایڈریس بتا دیا اور یہ بھی کہ رابی کا باپ ایسے نازک محکمے کا اعلیٰ افسر ہے جس کا تعلق پاکستان کے دفاع اور دفاعی پالیسیوں کے ساتھ ہے۔ رِشی نے پوچھے بغیر اپنی ماں کا ایڈریس بھی بتا دیا۔

اُس نے یہ سب کچھ بتا تو دیا، لیکن ہاشمی کے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہ تھا جس سے یہ تصدیق کی جاتی کہ رِشی نے جو بتایا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ اپنی رہائی کے لئے غلط ایڈریس دے رہی ہو۔

دروازے کی گھنٹی بجی۔ ہاشمی اور اُس کی بیوی کمرے سے نکل گئے اور اُنہوں نے باہر سے دروازہ بند کر دیا۔ ہاشمی باہر چلا گیا۔ باہر عبدالقدیر کھڑا تھا۔ ہاشمی اُسے اندر لے آیا اور وہ بیٹھنے والے کمرے میں جا بیٹھے۔

ہاشمی اور اُس کی بیوی کی رِشی کے ساتھ جو باتیں ہوئی تھیں وہ ہاشمی نے عبدالقدیر کو سنائیں۔ عبدالقدیر چونکہ انٹیلی جنس کا پرانا آدمی تھا اس لئے اُس کی سوچ اور نظر ہاشمی کی نسبت زیادہ گہری تھی۔ اُس کا خیال یہی تھا کہ لڑکی رہائی کی خاطر غلط ایڈریس دے رہی ہے اور اُس کا رونا اُس طرح کا جذباتی نہیں جس طرح وہ ظاہر کرتی ہے بلکہ اُس کا رونا دھوکہ ہے۔ عبدالقدیر نے کہا کہ آج وہ خود رِشی سے تفتیش کرے گا۔

ہاشمی اُسے رِشی کے کمرے میں لے گیا اور عبدالقدیر نے اُس سے انٹیلی جنس کے انداز سے تفتیش شروع کر دی۔ یہ ایک خاص انداز ہوتا ہے جس میں مشتبہ یا ملزم کے جوابوں سے سوال نکالے جاتے ہیں اور ایک ہی سوال گھُما پھرا کر بار بار پوچھا جاتا ہے۔ ملزم کی ذہنی حالت ایسی بگڑنے لگتی ہے کہ اُس پر تشدد کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ اکثر سخت جان ملزم سوال و جواب کے اِسی انداز سے بھی راز اُگل دیتے ہیں۔ رِشی تو کمزور سی لڑکی تھی۔ وہ ایک گھنٹے کی تفتیش سے ہی تنگ آکر رو پڑی۔

عبدالقدیر کو یقین ہو چلا تھا کہ اس لڑکی سے وہ جو راز لینا چاہتا ہے وہ اس کے سینے میں نہیں۔ اُس نے یہ سلسلہ کچھ دیر اور جاری رکھا اور اس کمرے سے نکل کر ہاشمی کے پاس بیٹھنے والے کمرے میں چلا گیا۔

دروازے کی گھنٹی ایک بار پھر بجی۔ ہاشمی باہر نکلا۔ وہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ باہر عزیز کھڑا تھا۔

"آؤ عزیز میاں!" —— ہاشمی نے پُرتپاک طریقے سے عزیز کا استقبال کیا اور بولا —— "اتنی مدت بعد تم کدھر آ نکلے؟"

ہاشمی نے اُس کا استقبال تو بڑی مسرت سے کیا لیکن اندر سے وہ ہل گیا کہ یہ یہاں آ نکلا ہے اور اس کا آنا بلا مقصد نہیں ہو سکتا۔ ہاشمی نے بڑی تیزی سے سوچ کر یہ فیصلہ کیا کہ اسے اندر بٹھایا جائے، شاید عبدالقدیر اس کے ارادے اور اس کی نیت کو بھانپ سکے۔

عزیز ہاشمی کے گلے لگ گیا جیسے وہ والہانہ انداز سے اپنے باپ سے ملا تھا۔

"اباجان نے بتایا تھا کہ آپ مجھے بہت یاد کرتے ہیں" —— عزیز احمد نے کہا —— "آپ تو میرے بزرگ ہیں۔ مَیں خاص طور پر آپ کی دعائیں لینے آیا ہوں۔"

"تو اندر آؤ نا عزیز میاں!" —— ہاشمی نے کہا اور اُسے اُس کمرے میں لے گیا جہاں عبدالقدیر بیٹھا ہُوا تھا۔

عزیز عبدالقدیر کو اچھی طرح جانتا تھا اور عبدالقدیر اُسے جانتا تھا۔

عزیز کو معلوم تھا کہ عبدالقدیر انڈین انٹیلی جنس میں رہ چکا ہے لیکن اُسے یہ بھی یقین تھا کہ عبدالقدیر کو معلوم نہیں کہ عزیز انٹیلی جنس کا ایجنٹ ہے۔ عبدالقدیر کے متعلق عزیز کو یہ بھی معلوم تھا کہ وہ اندرونِ ملک انٹیلی جنس کی ڈیوٹی دیتا تھا اور وہ اس محکمے کا باقاعدہ ملازم تھا اور اُسے پاکستان کا کبھی کوئی جاسوسی مشن نہیں دیا گیا تھا۔

عبدالقدیر عزیز سے بڑے پیار سے ملا اور اُس کے باپ کے حوالے سے اُس کی ذات میں دلچسپی کا اظہار کیا۔

"کہو عزیز بیٹے!" —— عبدالقدیر نے پوچھا —— "کیا ہو رہا ہے آج کل! کہیں نوکری کر رہے ہو یا کاروبار کا کوئی سلسلہ ہے؟"

عزیز نے وہی جواب دیا جو اپنے باپ کو دے چکا تھا کہ وہ ٹورازم کے محکمے میں اچھے عہدے پر لگا ہُوا ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ اپنا

ایک کاروبار بھی چلا رہا ہے۔ عزیز نے عبدالقدیر اور ہاشمی سے اُن کی اور ان کے گھر والوں کی خیر خیریت اس طرح پوچھی جیسے وہ اتنی لمبی مدت سے ان سب کے لئے فکرمند رہا ہو۔

"مَیں ساڑھے تین سال سے کچھ زیادہ عرصہ ملک سے باہر رہا ہوں" —— عزیز احمد نے کہا —— "واپس آ کر دیکھا ہے کہ مسلمانوں کی حالت ان ہندوؤں نے پہلے سے کچھ زیادہ ہی خراب کر دی ہے۔ یہ دیکھ کر بہت دُکھ ہُوا۔"

"ہونا چاہیئے" —— ہاشمی نے کہا۔

"کیا آپ یہ محسوس نہیں کرتے کہ مسلمانوں کو اپنے تحفظ کے لئے کچھ کرنا چاہیئے؟" —— عزیز نے کہا —— "اتحاد کی ضرورت ہے۔ یہاں کے مسلمان کمزور تو نہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ ہی بسم اللہ کریں۔ مَیں جس قدر تعاون کر سکتا ہوں کروں گا۔ مَیں نے اباجان سے بھی کہا ہے کہ وہ اس طرف توجہ دیں۔"

اس موضوع پر عزیز احمد نے پُرجوش باتیں کیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے عزیز پورے بھارت کو فتح کر لینے اور یہاں مسلمانوں کی حکومت قائم کر دینے کے لئے بے تاب ہو اور وہ صرف ذرائع پیدا کرنے کے لئے گلی گلی گھوم پھر رہا ہو۔

عبدالقدیر نے ہاشمی کی طرف دیکھا اور آنکھ کا ہلکا سا اشارہ کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ محتاط ہو کر بات کرنا۔

عزیز احمد بے شک انڈین انٹیلی جنس کا تربیت یافتہ جاسوس تھا۔ ہندوؤں کی طرح وہ طبعاً بھی فریب کار اور عیار تھا، لیکن اُس کا یہ سمجھنا کہ جن دو آدمیوں پر وہ اپنا جادو چلانے آیا ہے وہ اُس کی جادوگری کو قبول کر لیں گے، اُس کی خوش فہمی تھی۔ یہ جانتے ہوتے کہ عبدالقدیر بھی انٹیلی جنس میں رہ چکا ہے، عزیز خوش فہمی میں مبتلا رہا۔ اُس نے یہ بھی نہ سوچا کہ یہ دو بزرگ افراد یہ تو ضرور سوچیں گے کہ عزیز کے دل میں اچانک مسلمانوں کی ہمدردی اور ہندوؤں کے خلاف جذبہ کیسے پیدا ہو گیا ہے۔ عزیز نے یہ بھی نہ سوچا کہ لڑکپن سے اُس کی شہرت اچھی نہیں بلکہ وہ آوارہ اور بدنام نوجوان مشہور تھا اور دِلّی کی اس آبادی کے مسلمان اُس سے اچھی طرح واقف تھے۔

ہاشمی اور عبدالقدیر نے اُس کے متعلق یہ باتیں سوچی تھیں یا نہیں، عزیز نے بہرحال ان کے پاس آکر جرأت کا مظاہرہ کیا تھا۔

ہاشمی کچھ کہنے لگا تھا لیکن عبدالقدیر نے اُسے ہلکا سا اشارہ کیا کہ وہ چُپ رہے۔ عبدالقدیر نے یہ بہتر سمجھا تھا کہ عزیز کو بولنے کا موقع دیا جاتے۔

"ہاشمی صاحب!" — عزیز نے کہا — "مَیں آپ کا شکر گزار ہُوں۔ آپ نے میرے اباجان کو میری کوٹھی تک پہنچایا تھا.... آپ کو میرا ایڈریس کس طرح معلوم ہُوا تھا؟"

"یہ محض اتفاق کی بات ہے" — ہاشمی نے جواب دیا — "مَیں دو چار روز پہلے اُدھر سے گزر رہا تھا تو تمہیں وہاں دیکھا تھا۔"

"اباجان نے بتایا تھا کہ آپ نے مجھے اشوکا ہوٹل میں بھی دیکھا تھا"

— عزیز نے کہا۔

"یہ بھی اتفاق کی بات ہے" — ہاشمی نے کہا — "اُس روز مَیں وہاں سے گزر رہا تھا۔ اس کے بعد ادریس صاحب سے ملاقات ہوئی تو مَیں نے اُن سے خوشی کا اظہار کیا کہ عزیز بیٹا آگیا ہے۔"

"اسے کہتے ہیں، دل کو دل سے راہ ہوتی ہے" — عزیز نے ہنستے ہوتے کہا — "آپ کی محبت ہے جو مجھے یہاں کھینچ لاتی ہے .... لیکن ہاشمی صاحب! خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سُن لے .... آپ میرے بزرگ ہیں۔ بڑا بھائی کہوں تو بجا، باپ کہوں تو بھی بجا ہے۔"

"کہو عزیز میاں!" — ہاشمی نے کہا — "ایسی تمہید باندھنے کی کیا ضرورت ہے!"

"شکریہ ہاشمی صاحب!" — عزیز نے کہا اور بڑے خوشگوار سے لہجے میں پوچھا — "یہ کس دشمن نے اڑائی ہے کہ میں انڈیا کا جاسوس ہوں اور میں پاکستان میں جاسوسی کے لئے جاتا ہوں اور وہاں سے نوجوان پاکستانیوں کو ورغلا کر یہاں لاتا ہوں اور...."

"نہ عزیز بھائی!" — ہاشمی نے اُس کی بات کاٹ کر کہا — "میرے کانوں تک تمہارے خلاف اتنی لمبی چوڑی بات تو نہیں پہنچی۔"

"آپ کے کانوں تک شاید نہ پہنچی ہو" — عزیز نے کہا — "آپ کی زبان تک پہنچ کر باہر نکل چکی ہے۔"

"عزیز میاں!" — عبدالقدیر نے دخل اندازی کرتے ہوتے کہا — "یہ کیا فتنہ چھیڑ بیٹھے ہو! ذرا صاف بات کرو۔"

"مجھے تو بات کرتے بھی شرم آتی ہے محترم!" — عزیز نے کہا۔ "ہاشمی صاحب نے میرے اباجان سے کہا ہے کہ مَیں انڈیا کا جاسوس ہوں اور مَیں پاکستان کو نقصان پہنچا رہا ہوں۔"

"کیا ادریس صاحب نے تمہیں یوں کہا ہے؟" — عبدالقدیر نے پوچھا۔

"انہوں نے ان کا حوالہ نہیں دیا" — عزیز نے کہا — "انہوں

نے مجھ پر شک کیا ہے۔ میری امی جان نے مجھے بتایا ہے کہ جاسوسی کا الزام ہاشمی صاحب نے مجھ پر عائد کیا ہے۔ اس کی تصدیق اور تردید صرف ہاشمی صاحب ہی کر سکتے ہیں"۔

"اِس کی تصدیق یا تردید مَیں بھی کر سکتا ہُوں"۔۔۔ عبدالقدیر نے کہا ۔۔۔ "ہاشمی صاحب بھی اپنی پوزیشن واضح کر دیں گے۔ تمہارے خلاف یہ شک معلوم نہیں کہاں سے اُٹھا ہے۔ ہم نے بھی اُڑتے اُڑتے سُنی تھی۔ ہو سکتا ہے مسلمانوں میں نفاق پیدا کرنے کے لئے یہ بات کسی ہندو نے اُڑائی ہو"۔

"تمہارے اباجان سے مَیں نے اتنا ضرور پوچھا تھا کہ عزیز کہاں ہے"۔۔۔ ہاشمی نے کہا ۔۔۔ "وہ بیچارے تمہارے متعلق بہت پریشان تھے۔ ہو سکتا ہے مَیں نے انہیں یہ کہہ دیا ہو کہ تمہارے متعلق یہ افواہ سُنی ہے"۔

"وہ کوئی ہمارا دشمن ہوگا"۔۔۔ عزیز نے کہا ۔۔۔ "آپ نے جس سے یہ افواہ سُنی ہے اُس کا نام بتا دیں"۔

"کیا کرو گے نام پوچھ کر عزیز بیٹے!"۔۔۔ عبدالقدیر نے کہا ۔۔۔ "کیا ہمارے لئے یہ خوشی کا باعث نہیں کہ تمہارے خلاف یہ شک غلط ہے؟"

"یہ معلوم کرنا بہت ضروری ہے قبلہ!"۔۔۔ عزیز نے کہا ۔۔۔ "اگر ہم نے آج اُس کی زبان بند نہ کی تو کل وہ آپ پر ایسا ہی کوئی گھٹیا الزام لگا دے گا یا ہماری ماؤں بہنوں کو رُسوا کر دے گا۔ آپ مجھے اُس کا نام بتا دیں"۔

"میری بات کان کھول کر سُن لو عزیز میاں!"۔۔۔ ہاشمی نے ایسے سنجیدہ لہجے میں کہا جس میں طیش کی جھلک بھی تھی ۔۔۔ "تم نے مجھے اپنا بڑا بھائی بھی کہا ہے، باپ بھی کہا ہے، لیکن تمہارے دل میں ہم دونوں بزرگوں کی ذرا سی بھی عزت نہیں۔ ہماری عزت تمہارے دل میں پیدا ہو ہی نہیں سکتی"۔

"وہ کیوں ہاشمی صاحب!"۔۔۔ عزیز احمد نے شگفتہ سے لہجے

میں پوچھا۔

"وہ اس لئے"۔۔۔ ہاشمی نے جواب دیا ۔۔۔ "کہ جس کے دل سے اپنے اتنے معزز باپ کا احترام نکل گیا ہو اُس کی نظروں میں ہم کون ہیں ... مَیں تمہیں ایسی کھری کھری باتیں نہیں کہنا چاہتا تھا، لیکن تم تو ہمارے پیچھے ہی پڑ گئے ہو۔ مَیں کون ہوتا ہوں تمہیں انڈیا کا جاسوس کہنے والا، یہاں کے لوگ کہتے ہیں"۔

"آخر وہ لوگ کون ہیں؟"

"وہ ہندو ہیں"۔۔۔ ہاشمی نے کہا۔

"وہی ہندو جو تمہارے جگری یار تھے"۔۔۔ عبدالقدیر بول پڑا ۔۔۔ "تمہیں نہیں بھولنا چاہیئے کہ ان ہندوؤں کے ساتھ تم نے کیسی زندگی گزاری ہے۔ تم اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے کہ ہندو مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کر رہے ہیں۔ معلوم نہیں ہمارے متعلق انہوں نے کیا کچھ مشہور کر رکھا ہوگا۔ تمہاری عیش و عشرت کی اُس زندگی کو دیکھتے ہوئے جو تم نے اپنے والدین سے باغی ہو کر ہندوؤں کے ساتھ گزاری تھی تمہارے متعلق یہ افواہ کہ تم انڈیا کے جاسوس ہو اکثر لوگوں کی زبان سے سُنی گئی ہے"۔

"مجھے کوئی دو تین نام بتا دیں"۔۔۔ عزیز نے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے تم نے ہندوؤں کا اچھا خاصا اثر قبول کیا ہے"۔۔۔ ہاشمی نے کہا ۔۔۔ "تم تو ہم پر ہندوؤں کی طرح دھونس جمانے آ گئے ہو"۔

عزیز ہنس پڑا۔ عبدالقدیر اور ہاشمی نے اُسے کچھ اور سخت باتیں کہہ دیں، لیکن اس شخص کا ردِ عمل ایسا تھا جیسے اُس پر کچھ اثر ہُوا ہی نہ ہو۔

عزیز احمد کو ٹالنا خاصا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ یہی اصرار کئے جا رہا تھا کہ اُسے اُن اشخاص کے نام بتاتے جائیں جن سے ہاشمی نے یہ افواہ سُنی ہے کہ عزیز انڈیا کا جاسوس ہے .... عبدالقدیر انٹیلی جنس کا آدمی تھا۔ اُس نے بڑی استادی سے عزیز کو ٹالا۔

عزیز بھی پورا اُستاد تھا۔ وہ جب وہاں سے جانے لگا تو اُس نے

ناراضگی یا خفگی کا اظہار نہ کیا، بلکہ ہاشمی اور عبدالقدیر کے ساتھ بڑے ہی احترام اور پیار و محبت کا اظہار کیا اور چلا گیا۔

❦

"ہاشمی صاحب!" — عبدالقدیر نے عزیز احمد کے جانے کے بعد کہا — "اب تو ہمیں اور زیادہ محتاط ہونا پڑے گا۔ مجھے اندازہ ہی نہیں تھا کہ یہ شخص اس قدر ہوشیار اور ڈھیٹ ہو گیا ہے۔ آپ نے اس کی باتیں ایک عام انسان کی حیثیت سے سنی ہوں گی لیکن میں نے اس کے بولنے کے انداز کو انٹیلی جنس کی نظروں سے دیکھا اور اس کے ایک ایک لفظ کو انٹیلی جنس کے دماغ سے پرکھا ہے۔"

"مجھ سے غلطی ہوتی ہے کہ میں نے اس کے باپ سے کہہ دیا تھا کہ عزیز کے متعلق میں نے یہ بات سنی ہے" — ہاشمی نے کہا۔

"آپ نے غلطی کی ہے یا نہیں" — عبدالقدیر نے کہا — "اس شخص نے یہاں آنے میں کوئی غلطی نہیں کی۔ وہ صحیح جگہ آیا تھا۔ آپ نے نوٹ نہیں کیا کہ جب ہم اُسے خدا حافظ کہنے کے لئے ڈیوڑھی میں گئے تو اندر والا دروازہ ذرا سا کھلا ہوا تھا۔ عزیز نے ڈیوڑھی میں رُک کر ایک بات شروع کر دی تھی جو اُس نے صرف اس لئے شروع کی تھی کہ وہ تھوڑی دیر اور رُکا رہنا چاہتا تھا۔ میں نے نوٹ کیا کہ وہ بار بار ٹیڑھی آنکھوں سے دروازے کے کھلے ہوئے کواڑ کی طرف بار بار دیکھتا تھا۔ وہ یقیناً حویلی کا جائزہ لے رہا تھا۔"

"کیا آپ یہ محسوس کر رہے ہیں کہ عزیز کو یہ شک ہے کہ لڑکی اس گھر میں ہے؟" — ہاشمی نے پوچھا۔

"جی ہاں" — عبدالقدیر نے کہا — "اسے یہی شک ہے.... ہاشمی صاحب یہ ذہن میں رکھیں کہ ضروری نہیں ہوتا کہ شک سو فیصد پختہ ہو۔ شک اگر بال برابر ہو تو بھی محتاط ہو جانا چاہیئے۔ خیال رکھیں کہ یہ پولیس کا نہیں انٹیلی جنس کا معاملہ ہے۔ تھانیدار کو آپ سو دو سو روپیہ دے کر

دو چار دنوں کے لئے ٹال سکتے ہیں اور اس دوران اپنے بچاؤ کا کچھ بندوبست بھی کر سکتے ہیں لیکن انٹیلی جنس والے پوائنٹ زیرو زیرو ایک جتنے شک پر بھی پکڑ لیتے اور ایذا رسانی کی چکی میں پیس ڈالتے ہیں۔ یہ شخص یہاں سے کچھ زیادہ ہی شک لے کر گیا ہے۔ میری یہاں موجودگی نے شک میں اور اضافہ کر دیا ہو گا۔"

"وہ کیسے؟"

"عزیز کو یقیناً معلوم ہو گا کہ میں اسی انٹیلی جنس سے ریٹائر ہوا ہوں جس کے ساتھ اس کا تعلق ہے" — عبدالقدیر نے کہا — "اگر اسے پہلے معلوم نہیں تو اب یہ اپنے افسروں کو آپ کا اور میرا نام بتائے گا اور ایڈریس بھی بتائے گا تو یہ راز اس کے سامنے آجائے گا کہ میں انٹیلی جنس میں سروس کر چکا ہوں۔ میرے ملنے جُلنے والوں کو بھی معلوم نہیں کہ میں نے گورنمنٹ کے کون سے محکمے میں سروس کی ہے.... کیا آپ نے اس کا ڈھیٹ پن نہیں دیکھا؟ ہم نے اسے کتنی سخت باتیں کہی ہیں، لیکن اس کے ماتھے پر بل نہیں پڑا، یہاں سے ہنستا کھیلتا گیا ہے۔"

"تو کیا ہمیں یقین کر لینا چاہیئے کہ عزیز ہندوستان کا جاسوس ہے؟" — ہاشمی نے پوچھا۔

"سو فیصد یقین!" — عبدالقدیر نے کہا — "میں نے لڑکی کے سینے سے جو باتیں اگلوائی ہیں ان سے کوئی شک نہیں رہ گیا۔ اب صورت یہ پیدا ہو گئی ہے کہ لڑکی کو یہاں سے کہیں اور منتقل کرنا ہو گا۔"

"لیکن لڑکی کو ہم کریں گے کیا؟" — ہاشمی نے پوچھا — "وہ یہی کہے جا رہی ہے کہ اُسے عزیز اور اپنے خاوند کی خفیہ سرگرمیوں کا کچھ علم نہیں۔"

"میں اس پر بھی غور کر چکا ہوں" — عبدالقدیر نے کہا — "میرا خیال ہے کہ لڑکی کو رات کے وقت آنکھوں پر پٹی باندھ کر اشو کا ہوٹل سے کچھ دُور چھوڑ آئیں گے لیکن اس میں ایک خطرہ ہے۔ لڑکی سے پوچھا جاتے

گا کہ وہ کہاں رہی ہے۔ ظاہر ہے وہ آپ کے مکان کی نشاندہی نہیں کر سکے گی۔"

"وہ صرف یہ بتاتے گی کہ اُسے کس طرح اغوا کیا گیا تھا" — ہاشمی نے کہا — "اور اُس کے ساتھ ہم نے جو باتیں کی ہیں وہ انٹیلی جنس کے افسروں کو سُنا دے گی۔"

"خطرہ یہ ہے کہ عزیز کو ہم پر شک ہو گیا ہے" — عبدالقدیر نے کہا — "تفتیش شکوک پر ہی کی جاتی ہے۔ عزیز خود تو آگے نہیں آتے گا، وہ اپنے افسروں کو ہم دونوں کے نام دے دے گا۔ آپ جانتے ہیں کہ پولیس خصوصاً سی آئی اے اور انٹیلی جنس خصوصاً 'را' کو کتنے اختیارات حاصل ہیں۔ ہم دونوں کو بُلا لیا جاتے تو ہم انہیں کوئی بات نہیں بتائیں گے لیکن انہوں نے لڑکی کو ہمارے سامنے کھڑا کر دیا تو وہ کہہ دے گی کہ ان دو آدمیوں نے مجھے قید میں رکھا تھا۔ اسے ہم دونوں کے مکان دکھاتے جائیں گے اور وہ آپ کے مکان کے اُس کمرے کی شناخت کرے گی جس میں اسے رکھا ہُوا ہے .... اگر ایسا ہو گیا تو اپنا انجام سوچ لیں۔"

"مَیں نے آپ کو بتایا نہیں" — ہاشمی نے کہا — "میری بیوی نے لڑکی کو اس کمرے سے نکال کر اندر کے تین چار کمرے دکھاتے تھے اور اسے اُس کمرے میں لے گئی تھی جس میں بچوں اور بچیوں کو قرآن پاک پڑھایا کرتی ہے۔ وہاں میری بیوی نے اسے بتایا تھا کہ وہ بچیوں اور بچوں کو کیا تعلیم دے رہی ہے۔"

"اس لڑکی کو مکان کے اندر اتنی آزادی دینے کی کیا ضرورت تھی؟" — عبدالقدیر نے حیران سا ہو کے پوچھا۔

ہاشمی نے عبدالقدیر کو پوری تفصیل سے بتایا کہ لڑکی کس طرح اُس کی بیوی سے متاثر ہو گئی تھی۔ ہاشمی نے یہ بھی بتایا کہ اُس کی بیوی نے لڑکی کے ساتھ کیا باتیں کی تھیں اور لڑکی کا ردِ عمل کیا تھا۔ ہاشمی نے عبدالقدیر

کو وہ باتیں بھی سنائیں جو اُس نے رشی کے ساتھ کی تھیں اور رشی نے جس ردِ عمل کا اظہار کیا تھا اور جو کچھ کہا تھا وہ بھی عبدالقدیر کو سنایا۔

"لڑکی کا یہ ردِ عمل دھوکہ بھی ہو سکتا ہے" — ہاشمی نے کہا — "لیکن وہ اس قدر روتی کہ اسے بہلانا مشکل ہو گیا۔ وہ کہتی ہے کہ وہ یہاں سے جانا ہی نہیں چاہتی۔ اس نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر ہم اسے یہاں نہیں رکھنا چاہتے تو اسے عزیز احمد اور اس کے خاوند کے حوالے نہ کریں، اس کی بجائے اسے پاکستان پہنچا دیں جہاں وہ رابی کے باپ کو جاسوسی کے جرم میں پکڑوا دے گی۔"

"کسی بھی حال میں ہمیں اس لڑکی پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے" — عبدالقدیر نے کہا۔

"میرا خیال کچھ اور ہے" — ہاشمی نے کہا — "آپ بھی لڑکی کے دوسرے پہلو کو دیکھ لیں۔ اگر یہ قابلِ اعتبار ہے تو اسے ہم ہوٹل میں واپس بھیجنے کی بجائے پاکستان کی انٹیلی جنس کے حوالے کر سکتے ہیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں کہ ایسا کرنا چاہیے تو یہ کام آپ ہی کر سکتے ہیں۔"

"ہاں!" — عبدالقدیر نے کہا — "یہ کام مَیں ہی کر سکتا ہُوں۔ مَیں نے آپ کو ایک بار بتایا تھا کہ پاکستان کی انٹیلی جنس کے ایک آدمی کو جو یہاں ہندوستانی مسلمان کی حیثیت سے موجود ہے، مَیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ مَیں نے آپ کو یہ بھی بتایا تھا کہ کسی کو پتہ نہ چلے کہ مَیں نے آپ کو یہ بات بتائی تھی۔ آج بھی یہی کہوں گا۔ یہ ہے تو بہت بڑا خطرہ لیکن یہ ضروری ہے کہ مَیں لڑکی کو ایک بار پھر دیکھ لوں۔ ہونا تو یہی چاہیے کہ یہ لڑکی ہمارے کسی کام آتے، لیکن ہمیں اپنی اور اپنے محاذ کی حفاظت بھی کرنی ہے لیکن ایسا نہ ہو کہ ابتدا میں ہی ہم پکڑے جائیں اور سارا مشن دھرا دھرایا رہ جائے۔"

عبدالقدیر اس مسئلے پر اپنے خیال کا اظہار تو کر رہا تھا لیکن اُس کا لہجہ اور بولنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ کچھ پریشان ہے اور گہری سوچ

میں پڑا ہُوا ہے۔

"مجھے انہی لوگوں پر شک ہے" — عزیز ایک دو روز بعد اپنے ساتھی ورما سے کہہ رہا تھا — "ہاشمی تو شریف آدمی لگتا ہے۔ مَیں یقین نہیں کر سکتا کہ اُس نے لڑکی کو اغوا کیا ہوگا لیکن اُس کے گھر میں جس آدمی کو دیکھا ہے وہ مجھے مشکوک اور مشتبہ لگتا ہے۔ وہ انڈین انٹیلی جنس میں سروس کر کے ریٹائر ہو چکا ہے۔ ذہنی طور پر وہ خاصا تیز اور ہوشیار لگتا ہے۔ مَیں کوئی بات ہاشمی سے پوچھتا تھا تو اس کا جواب وہ شخص دیتا تھا۔"

"کون ہے وہ؟" — ورما نے پوچھا — "کیا میں اُسے جانتا ہوں؟"

"ہو سکتا ہے" — عزیز احمد نے کہا — "اُس کا نام عبدالقدیر ہے۔"

"ہاں!" — ورما نے کہا — "مَیں نے یہ نام پہلے بھی سُنا ہے۔"

"شہر کے اس علاقے میں جہاں یہ دونوں آدمی رہتے ہیں اور جہاں میرا گھر بھی ہے میرے پرانے دوست اور بچپن کے ساتھی موجود ہیں" — عزیز نے کہا — "مَیں نے ان ایک دو دنوں میں ہاشمی اور عبدالقدیر کے متعلق کچھ معلومات حاصل کی ہیں۔ پتہ چلا ہے کہ چند ایک مسلمان ہاشمی کے گھر میں اکٹھے ہوتے ہیں اور ہندوستانی مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کی اور کچھ اِسی قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ میں دو آدمیوں کو اس کام پر لگا چکا ہوں کہ وہ مجھے زیادہ سے زیادہ معلومات دیں۔ ضروری نہیں کہ رِشی کو انہوں نے ہی اغوا کیا یا کروایا ہو، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمیں یہاں سے کوئی اور شکار مل جاتے۔"

"میرا خیال ہے عزیز!" — ورما نے کہا — "تم نے اتنی لمبی چوڑی جو باتیں بتائی ہیں یہ سُن کر مَیں یہی مشورہ دوں گا کہ ہمیں ان لوگوں کے نام چیف کو دے دینے چاہئیں۔"

"لیکن ورما سیٹھ!" — عزیز احمد نے کہا — "مَیں پوری طرح یقین کر لینا چاہتا ہوں۔ آخر چیف کو ہی ان کے نام دینے ہوں گے۔ مجھے تم جانتے ہو کہ مَیں کمان سے تیر اُس وقت چھوڑا کرتا ہوں جب میرا نشانہ بالکل صحیح ہوتا ہے۔ مَیں ہوا میں تیر نہیں چلایا کرتا۔"

"پھر کیا کرو گے؟"

"ایک تو مَیں نے تمہیں بتایا ہے کہ دو آدمی اِن کے پیچھے ڈال دیتے ہیں" — عزیز نے جواب دیا — "ایک طریقہ لڑکی کا سراغ لینے کا اور ذہن میں آتا ہے۔ مَیں اپنی ایک بڑی بہن کو ایک بڑی حویلی کے اندر دیکھنے کے لئے استعمال کرنا چاہتا ہوں۔ یہ اُس شخص کی حویلی ہے جس کا نام میں نے تمہیں فریدالدین ہاشمی بتایا تھا۔"

"تم مجھ سے یقیناً زیادہ عقلمند اور تجربہ کار ہو" — ورما نے کہا — "لیکن مَیں صرف ایک بات سوچ رہا ہوں کہ تمہارے پاس کوئی حقیقی یا واقعاتی شہادت موجود نہیں جس سے اس شک کو تقویت ملے کہ رِشی کو اِن لوگوں نے اغوا کیا ہے اور اُسے ہاشمی کے گھر میں رکھا ہُوا ہے۔ تم نے شاید یہ بھی نہیں سوچا کہ اگر تمہارا تیر خطا گیا تو اصلی ملزم زمین کے نیچے چلے جائیں گے اور اگر یہ کوئی گروہ ہے تو وہ چوکنا ہو جاتے گا۔"

"مَیں اس بات پر غور کر چکا ہوں" — عزیز نے کہا — "تم نے چھٹی حِس تو سُنی ہو گی۔ وہ مجھ میں ہے۔ مَیں بیان نہیں کر سکتا کہ میں کیوں محسوس کر رہا ہوں کہ لڑکی مسلمانوں کی اسی آبادی میں ہے۔ ہاشمی اور قدیر کے ساتھ میری بہت باتیں ہوتی ہیں۔ اُن کی باتوں سے کم اور بولنے کے انداز سے زیادہ میرا شک کچھ پختہ ہُوا۔ تمہیں یاد ہو گا کہ ٹریننگ کے دوران ہمیں انڈیا اور پاکستان کی مختلف قوموں کی اجتماعی نفسیات پر لیکچر دیتے گئے تھے۔ تم خود ہندو ہو۔ ہندوؤں کا یہ وصف اچھا ہے یا بُرا، یہ الگ بات ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہندو امیر ہو یا غریب، مشتعل نہیں ہوتا۔ گالی گلوچ اور ہر طرح کی بے عزّتی برداشت کر لیتا ہے اور جوابی کارروائی سوچ

سمجھ کر کرتا ہے۔ مسلمانوں کے متعلق یہ بتایا گیا تھا اور یہ ہے بھی بالکل صحیح کہ مسلمان کو مشتعل کرنا کوئی مشکل نہیں۔ مذہب کے معاملے میں تو تم مسلمان کو کوئی جھوٹی خبر سُنا کر بھی ایسا بھڑکا سکتے ہو کہ وہ بم کی طرح پھٹتا ہے۔ کسی مسلمان کو ویسے ہی کہہ دیں کہ فلاں جگہ ہندوؤں نے ایک مسجد کی بے حُرمتی کی ہے تو مسلمان وہی حرکت کریں گے کہ اپنا کان دیکھے بغیر کُتے کے پیچھے دوڑ پڑیں گے۔"

"یہ تو مَیں مانتا ہوں" —— ورما نے کہا۔

"یہ دونوں مسلمان ہاشمی اور قدیر اسی ذہن کے مسلمان ہیں" —— عزیز نے کہا —— "مجھے ان پر شک اس وجہ سے بھی ہُوا ہے کہ مَیں نے ان کے مذہبی جذبات کو مشتعل کرنے کے لئے بڑی اشتعال انگیز باتیں کیں، لیکن وہ جذباتی طور پر بالکل ٹھنڈے رہے۔ مجھے یہ بھی شک ہے کہ انہیں میری نیت پر شُبہ ہو گیا ہے۔ مجھے ان پر اس لئے زیادہ شُبہ ہوتا ہے کہ اُنہیں کس نے بتایا ہے کہ مَیں انڈین انٹیلی جنس میں ہُوں۔"

"یہ باتیں تو پہلے بھی ہو چکی ہیں میرے بھائی!" —— ورما نے کہا —— "اب یہ بتاؤ کہ تم اپنی بہن کو کس طرح استعمال کرو گے؟"

"میری سب سے بڑی بہن جس کی عمر اس وقت چالیس سال سے کچھ زیادہ ہے، مجھے ماں سے زیادہ چاہتی ہے" —— عزیز نے کہا —— "دوسری بہنوں کے دلوں میں بھی میرا اتنا ہی پیار ہے جتنا بہنوں کو اکلوتے بھائی کے ساتھ ہونا چاہیئے، لیکن یہ بہن تو مجھے دیوانگی کی حد تک چاہتی ہے۔ پاکستان سے آکر مَیں دو بار اُس کے ہاں جا چکا ہُوں۔ وہ اصرار کرتی ہے کہ مَیں اُس کے پاس رہوں۔ یہ تو مَیں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ میرے ماں باپ، بہنوئی اور دوسری بہنیں مجھ سے نالاں ہیں۔ مجھے یہ سب لوگ آوارہ اور بدمعاش سمجھتے ہیں۔ دوسری بہنیں مجھ سے محبت تو کرتی ہیں، لیکن نہیں چاہتیں کہ مَیں اُن کے ہاں رہوں کیونکہ اُن کے خاوند مجھے اچھا آدمی نہیں سمجھتے۔ بڑی بہن کا معاملہ مختلف ہے۔ اُس کا خاوند

اُس کی خوشی کی خاطر مجھے قبول کر لیتا ہے۔۔۔

"اب میری بات ذرا غور سے سُنو اور مجھے مشورہ دو۔ میری یہ بہن بھی مجھے کہہ چکی ہے کہ یہاں کے مسلمانوں نے جن کے لیڈر ہاشمی اور عبدالقدیر بنے ہوتے ہیں، میرے متعلق یہی مشہور کر رکھا ہے کہ مَیں بہت ہی بُرا آدمی ہوں اور میں انڈیا کا جاسوس بھی ہوں۔ مَیں نے بہن کو بتایا کہ یہ لوگ صرف اس لئے مجھ پر جاسوسی کا الزام عائد کر رہے ہیں کہ میرے دوستوں میں زیادہ تر ہندو ہیں اور میری گزشتہ زندگی آوارگی اور عیش و عشرت میں گزری ہے۔ مَیں نے کچھ ایسی ہی باتیں کہہ سُن کر بہن کو قائل کر لیا ہے کہ میرے خلاف یہ الزام بالکل غلط ہے۔۔۔۔ اب مَیں اپنی بہن سے کہوں گا کہ مَیں اپنی نوکری کی ایک ڈیوٹی کے سلسلے میں پاکستان گیا تھا اور وہاں رابی اور رشی میرے دوست بن گئے تھے اور دوستی کی وجہ یہ تھی کہ مَیں ہندوستانی مسلمان ہوں۔ وہ میرے ساتھ یہاں آ گئے۔ یہاں آکر میرے دوست کی نوجوان بیوی دھوکے میں آکر کسی کے ساتھ چل پڑی اور لاپتہ ہو گئی ہے۔ مَیں بہن کو یہ بھی بتاؤں گا کہ مجھے ہاشمی پر شک ہے۔ بہن سے کہوں گا کہ ہاشمی کی بیوی کے ساتھ اُس کا میل جول تو ہے ہی، کسی روز وہ ہاشمی کے گھر اُس کی بیوی سے ملنے کے بہانے جائے اور دیکھے کہ لڑکی وہاں ہے یا نہیں۔"

"نہیں عزیز!" —— ورما نے کہا —— "بات بنی نہیں۔ اگر لڑکی اُسی گھر میں ہوتی تو کیا اُنہوں نے اُسے گھر کے اندر کھلا چھوڑ رکھا ہو گا؟"

"مَیں اپنی بہن کے ساتھ اتنی سی ہی بات تو نہیں کروں گا جتنی تمہیں بتائی ہے" —— عزیز نے کہا —— "اُسے قائل کر لے اور اپنی سکیم پر لانے کے لئے بہت سی باتیں کرنی پڑیں گی۔ مجھے امید ہے کہ وہ میری باتوں میں آجائے گی۔ مَیں اُسے مکمل طور پر سمجھا کر بھیجوں گا۔"

"یہ بھی کر کے دیکھ لو" —— ورما نے کہا۔

اگلے ہی روز عزیز کی بڑی بہن ہاشمی کے گھر میں داخل ہوئی۔ ہاشمی کی بیوی نے اُسے دیکھا تو اُٹھ کر اور کچھ آگے جا کر اُس کا استقبال کیا، لیکن وہ حیران بھی ہوئی کہ یہ کیسے آئی ہے۔

"آؤ زبیدہ!" ــــ ہاشمی کی بیوی نے اُسے گلے لگاتے ہوئے کہا ــــ "عید کا چاند تو ہر سال نظر آجاتا ہے، لیکن تم نہ جانے کتنے سالوں بعد نظر آئی ہو.... آج ہماری یاد کیسے آگئی؟"

"یاد تو دل سے کبھی بھی نہیں اُتری" ــــ زبیدہ نے بڑے پیارے انداز میں کہا ــــ "لیکن گھر گرہستی میں اور بچوں میں ایسی پھنسی رہتی ہوں کہ گھر سے چند منٹ کے لئے بھی نکلنا محال ہو جاتا ہے۔ آج اِدھر سے گزرنے کا اتفاق ہوا تو اندر چلی آئی۔"

"بسم اللہ بسم اللہ" ــــ ہاشمی کی بیوی نے وضعداری سے کہا ــــ "سر آنکھوں پر۔ کہو بچے کیسے ہیں؛ میاں تو ٹھیک ہیں؟"

دونوں عورتیں ایک دوسری کے گھر کی خیر خیریت پوچھنے لگیں پھر اپنی اپنی سنانے لگیں۔ ہاشمی کی بیوی نے محسوس کیا کہ زبیدہ باتیں تو اُس کے ساتھ کرتی تھی، لیکن اُس کی نظریں حویلی میں گھوم رہی تھیں۔

"ماشاء اللہ" ــــ زبیدہ نے کہا ــــ "حویلی پہلے سے زیادہ خوبصورت لگتی ہے۔ کمرے اور برآمدے وغیرہ کچھ بدلے بدلے سے لگتے ہیں۔"

"دو مہینے ہوئے کچھ ردو بدل کیا ہے" ــــ بیگم ہاشمی نے کہا ــــ "مرمت بھی کرائی ہے۔ پلستر اور سفیدی بھی ہوئی ہے۔"

"اگر مجھے اچھی طرح یاد ہے" ــــ اُس نے کہا ــــ "تو یہاں آئے مجھے کم و بیش پانچ سال گزر گئے ہیں۔ جی چاہتا ہے کمرے اندر سے جا کر دیکھوں۔"

بیگم ہاشمی ابھی سوچ بھی نہ پائی تھی کہ اس عورت کو کمرے دکھاؤں یا کسی بہانے ٹال دوں کہ اُس کمرے کا دروازہ کُھلا جس میں رشی کو رکھا گیا تھا۔ عزیز کو توقع نہیں تھی کہ اُس کی بہن رشی کا سراغ پا سکے گی۔ اُس کے پیشِ نظر دو وجوہات تھیں۔ ایک یہ کہ اُسے صرف شک تھا کہ رشی

یہاں ہے اور دوسری وجہ یہ کہ رشی یہاں ہوتی بھی تو اُسے ان لوگوں نے کسی کمرے میں بند کر کے رکھا ہوگا۔ اپنی بہن کو عزیز نے گزشتہ رات بہت ہی ہدایات دی تھیں اور اُسے بریفنگ بھی دی تھی۔ اُس نے زبیدہ سے یہ بھی کہا تھا کہ لڑکی یہاں سے یا کہیں سے بھی برآمد ہو جائے تو عزیز کے چہرے سے یہ الزام دُھل سکتا ہے کہ وہ انڈیا کا جاسوس ہے۔

ہاشمی کے ہاں معاملہ کچھ اور تھا۔ رشی کی ذات میں، اُس کی شخصیت اور کردار میں جو انقلاب آیا تھا وہ تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔ رشی نے جب اپنے کردار کے اس انقلاب کا اظہار ہاشمی سے کیا تھا تو ہاشمی نے اسے مکاری اور فریب کاری سمجھا تھا حالانکہ رشی بچوں کی طرح بلک بلک کر روئی تھی۔ عبدالقدیر نے ہاشمی سے اُس کا یہ ردِعمل سُن کر اس سے تحقیقات کی تھی تو عبدالقدیر کو بھی یہی شک ہوا تھا کہ لڑکی مکاری کر رہی ہے، لیکن وہ مان گیا تھا کہ لڑکی کا ردِعمل قدرتی ہے اور لڑکی واقعی یہاں سے نہیں نکلنا چاہتی۔

ہاشمی اور اس کی بیوی کا یہ فیصلہ صحیح تھا یا غلط کہ رشی کے کمرے کا دروازہ آئندہ باہر سے بند نہ کیا جاتے، ایک الگ بات ہے، اُس روز ہوا یہ کہ رشی نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا تو بیگم ہاشمی کے پاس ایک عورت کو بیٹھا دیکھ کر دروازہ بند کر لیا۔ اسی سے اُس کی نیک نیتی کا پتہ چلتا تھا۔ یہ تو اُسے معلوم ہی نہیں تھا کہ جس اجنبی عورت کو اُس نے دیکھا ہے وہ عزیز کی بہن ہے اور وہ اُسی کا سراغ لگانے آئی ہے۔ رشی کو ہاشمی اور اُس کی بیوی نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ اُن کے نوکر اور نوکرانی کے سامنے بھی نہ آئے۔

رشی نے دیانتداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے زبیدہ کو دیکھ کر کواڑ تو بند کر لیا لیکن وہ محسوس نہ کر سکی کہ اُس کا اس عورت کے سامنے ہونا کس قدر خطرناک ہے۔

"یہ لڑکی کون ہے؟" ــــ زبیدہ نے بیگم ہاشمی سے پوچھا۔

"ہاشمی صاحب کے ایک عزیز کی بیٹی ہے"— بیگم ہاشمی نے جواب دیا— "آگرہ سے آئی ہے۔"

"یہ باہر کیوں نہ آئی؟"— زبیدہ نے پوچھا اور مسکرا کر کہنے لگی— "ایسی بچی تو نہیں لگتی کہ مجھ سے شرما گئی ہو۔ اس نے تو مجھے دیکھتے ہی دروازہ بند کر لیا ہے۔"

بیگم ہاشمی چکرا سی گئی۔ یہ صورتِ حال اُس کے بس سے باہر ہو گئی تھی لیکن نیک نیت عورت تھی، عزم اس کا نیک تھا اس لئے اللہ نے اُس کی مدد کی اور اُس کے ذہن میں ایک جواز ڈال دیا۔

"بے چاری ذہنی مریض ہے"— بیگم ہاشمی نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا— "اس کے والد صاحب اسے علاج کے لئے لائے ہیں۔"

"ذہنی امراض کا علاج آگرہ میں زیادہ بہتر نہیں ہوتا؟"— زبیدہ نے کہا— "وہاں تو سُنا ہے ایک سے ایک بڑھ کر قابل ڈاکٹر اور ذہنی امراض کا ماہر موجود ہے۔"

"نہیں زبیدہ!"— بیگم ہاشمی نے کہا— "آگرہ ذہنی امراض کے علاج کے لئے اس لئے مشہور ہے کہ وہاں ملک کا ایک بہت بڑا پاگل خانہ ہے۔ لڑکی کو اگر پاگل خانے میں داخل کرانا ہوتا تو وہیں کرا دیتے۔"

"کرتی کیا ہے؟"

"کسی غیر مرد یا عورت کو دیکھ کر ڈر جاتی ہے"— بیگم ہاشمی نے جواب دیا— "بلاوجہ رونے اور چیخنے لگتی ہے۔ اس کی اسی تکلیف کی وجہ سے اس کا کوئی رشتہ مانگنے بھی نہیں آتا۔"

زبیدہ اپنے بھائی جیسی چالاک عورت تھی۔ وہ کچھ اور ہی ہدایات لے کر آئی تھی۔ وہ اُٹھی اور یہ کہتی ہوئی رشی والے کمرے کی طرف چل پڑی کہ میں اسے ذرا اچھی طرح دیکھتی ہوں۔

"نہیں زبیدہ!"— بیگم ہاشمی اُٹھ کر اس کی طرف لپکی اور بولی— "نہ میری بہن! اُس کے کمرے میں نہ جانا ورنہ وہ چیخ چیخ کر محلہ اکٹھا کر لے گی۔"

"مجھے شک ہے آپا!"— زبیدہ نے ذرا رُک کر کہا— "یہ کوئی ذہنی مرض نہیں۔ میں نے بالکل ایسی ہی تکلیف والی ایک لڑکی دیکھی ہے۔ اُس پر کسی نے تعویذ کروا دیئے تھے۔ میں ایک عامل کو جانتی ہوں۔ اُس لے اُس بیچاری کو اس روگ سے نجات دلائی تھی۔"

رشی والا کمرہ اتنا دُور تو نہیں تھا کہ وہاں تک پہنچتے کچھ وقت لگتا۔ زبیدہ نے جا دروازہ کھولا۔ رشی پلنگ پر بیٹھی تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑے زبیدہ کو دیکھنے لگی۔ ہاشمی کی بیوی کمرے میں داخل ہوئی۔ زبیدہ کی اُس کی طرف پیٹھ تھی۔ ہاشمی کی بیوی نے رشی کو سر کا ہلکا سا اشارہ کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ اس عورت کی طرف وہ کوئی توجہ نہ دے۔

"لیٹ جا بیٹی!"— بیگم ہاشمی نے رشی سے کہا— "لیٹ جا۔ یہ کوئی غیر نہیں۔ تم انہیں نہیں جانتیں۔ یہ تمہاری دُور پار کی خالہ ہے۔"

"کیوں بیٹی!"— زبیدہ نے رشی سے پوچھا— "کیا ہوتا ہے تمہیں؟"

ہاشمی کی بیوی ابھی تک زبیدہ کی پیٹھ پیچھے کھڑی تھی۔ اُس کے اشارے پر رشی لیٹ گئی۔

"ہاں بیٹی!"— زبیدہ نے اُس پر جُھک کر اور اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر ایک بار پھر پوچھا— "کیا محسوس کرتی ہو؟"

"کچھ نہیں"— رشی نے بے رُخی سے جواب دیا— "میں کچھ بھی محسوس نہیں کرتی۔ آپ کو میرے متعلق کیا بتا دیا گیا ہے؟"

ہاشمی کی بیوی نے زبیدہ کا بازو پکڑا اور اُسے باہر گھسیٹ لائی۔

"ادھر آجاؤ زبیدہ!"— ہاشمی کی بیوی نے زبیدہ کو باہر لا کر دروازہ بند کر کے سرگوشی میں کہا— "کیوں میرے لئے مصیبت کھڑی کر رہی ہو؟ میں تو ہاشمی صاحب سے بھی کہہ چکی ہوں کہ اس پاگل کو یہاں کیوں بلوا لیا ہے۔"

"صاف پتہ چل رہا ہے کہ اس لڑکی پر تعویذوں کا اثر ہے"— زبیدہ نے کہا —"مَیں آؤں گی۔ اس کے والد صاحب سے مجھے ملوا دینا۔ انہیں کہنا کہ دوائیاں دے دے کر اس کا دماغ اور خراب نہ کرو۔ مَیں انہیں اُس عامل کے پاس لے جاؤں گی.... اچھا آپا! اب مجھے اجازت دو۔"

"ہائے خالہ زبیدہ!"— بیگم ہاشمی نے کہا —"پانی کا گھونٹ بھی نہیں پیا اور چل پڑیں .... ذرا دیر اور بیٹھو۔ چائے کی پیالی بنا لیتی ہوں۔"

زبیدہ شکریہ ادا کر کے معذرت خواہی کے انداز سے چل پڑی۔ جاتے جاتے کہہ گئی کہ وہ دوبارہ آئے گی۔

ہاشمی کی بیوی دروازے تک زبیدہ کے ساتھ گئی۔ اُسے رخصت کر کے دروازہ اندر سے بند کیا اور تقریباً دوڑتی ہوئی رشی کے پاس گئی۔

"مجھ سے غلطی ہوئی خالہ جان!"— رشی نے بیگم ہاشمی سے کہا —"مَیں نے اس خیال سے دروازہ کھولا تھا کہ نوکر اور نوکرانی پچھلے کمرے میں چلے گئے ہوں گے۔"

"جانتی ہو یہ عورت کون ہے؟"— بیگم ہاشمی نے کہا —"یہ عزیز کی بڑی بہن تھی۔"

"سچی خالہ؟"— رشی نے حیرت اور گھبراہٹ کے ملے جُلے لہجے میں پوچھا —"یہ کدھر آ دھمکی تھی۔ کہیں یہ میری ٹوہ لگانے نہ آئی ہو۔"

"نہیں"— بیگم ہاشمی نے کہا —"یہ سی آئی ڈی میں تھوڑا ہی ہے۔ مجھے یہ خطرہ اس لئے بھی محسوس نہیں ہوتا کہ ان لوگوں کے ساتھ عزیز کا میل جول ہے ہی نہیں۔ اگر ہے بھی تو عزیز نے اسے یہ تو نہیں بتایا ہو گا کہ وہ ہندوستان کا جاسوس ہے اور ایک پاکستانی لڑکی کو یہاں لایا تھا اور اُسے اغوا کر لیا گیا ہے۔ بہرحال تم نے اچھا کیا کہ میرا اشارہ سمجھ گئیں اور زیادہ نہ بولیں۔"

"آپ نے اُسے میرے متعلق کیا بتایا تھا؟"

بیگم ہاشمی نے اُسے سُنا دیا کہ اُس کے متعلق زبیدہ کو اُس نے کیا بتایا تھا۔

"خالہ جان!"— رشی نے سنجیدگی سے پوچھا —"میرا کیا بنے گا؟"

"پریشان نہ ہو بیٹی!"— بیگم ہاشمی نے جواب دیا —"اگر تم نے اسی طرح وفا کی جس طرح آج کی ہے تو ہاشمی صاحب اور قدیر صاحب تمہارے لئے کوئی بہتر فیصلہ کریں گے۔"

اتنے میں ہاشمی گھر آ گیا۔ اُس کی بیوی اُسے الگ لے گئی اور بتایا کہ عزیز کی بڑی بہن آئی تھی اور جو ڈرامہ ہُوا وہ ہاشمی کو سُنا دیا۔

"کون سی بہن؟"— ہاشمی نے پوچھا —"زبیدہ تو نہیں تھی؟"

"وہی تھی"— بیگم ہاشمی نے جواب دیا۔

"اللہ محفوظ رکھے"— ہاشمی نے کہا —"تم شاید نہیں جانتیں کہ وہ کس قدر چالاک اور مکار عورت ہے۔"

"کچھ کچھ تو جانتی ہوں۔"

"نہیں"— ہاشمی نے کہا —"جو ہم باہر گھومنے پھرنے والے مرد جانتے ہیں وہ گھروں میں بیٹھی عورتیں نہیں جان سکتیں۔ زبیدہ اگر عزیز سے بڑھ کر شیطان نہیں تو اس سے کم بھی نہیں۔ اس کا خاوند شریف، وضعدار اور ہم جیسا جذبہ رکھنے والا آدمی ہے۔ کوئی اور ہوتا تو کبھی کا اسے طلاق دے چکا ہوتا۔ ویسے وہ بڑا دلیر اور جرأت مند آدمی ہے۔ اب تو بیچارہ بچوں کو دیکھ کر بیوی کی سرکشی کو برداشت کر رہا ہے۔"

"اس کا یہاں آنا خطرناک تو نہیں؟"

"مَیں کچھ کہہ نہیں سکتا"— ہاشمی نے جواب دیا —"دونوں صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ ویسے ہی آ ٹپکی ہو۔ یہ خیال بھی آتا ہے کہ اُسے عزیز نے بھیجا ہو گا، لیکن عزیز کا ان کے ہاں آنا جانا ہے ہی نہیں۔ بہرحال مَیں قدیر صاحب سے بھی بات کر لوں گا۔ ڈرو نہیں۔ ہم نے کون سا جرم کیا ہے۔"

اگلے دن کا پچھلا پہر تھا۔ عزیز کی بہن زبیدہ ایک بار پھر ہاشمی کے
گھر میں داخل ہوئی۔ اُس کے ساتھ ایک اور عورت تھی جس نے کالا بُرقعہ لے
رکھا تھا۔ وہ پردے کی اتنی زیادہ پابند معلوم ہوتی تھی کہ اندر آ کر اُس نے
ایک نقاب تو اُوپر کر لیا لیکن دوسرا نقاب مُنہ اور ناک پر لپیٹے رکھا۔ اِس
سے اُس کی سادگی اور شرافت کا اظہار ہوتا تھا۔ اُس نے تو پیشانی کو بھی
ڈھانپ رکھا تھا، صرف آنکھیں نظر آتی تھیں۔ ہاشمی کی بیوی نے اُن کا
استقبال بڑے پیار سے کیا اور کمرے میں بٹھایا۔

"یہ ہمارے محلے میں رہتی ہیں" ۔۔۔ زبیدہ نے اس عورت کا تعارف
بیگم ہاشمی سے کراتے ہوئے کہا ۔۔۔ "مَیں نے کل جس لڑکی کا ذکر کیا تھا، وہ
اس کی چھوٹی بہن ہے۔ تعویذ بھی کسی نے ایسا کیا کہ دونوں بہنوں پر اثر
ہو گیا۔ چھوٹی کے تو دماغ پر اثر ہُوا اور اُس کے جسم پر۔ اس کا تو بولنا ہی
بند ہو گیا تھا۔ اب یہ کچھ بول تو سکتی ہے لیکن ڈاکٹر نے اسے بولنے
سے منع کر رکھا ہے۔ اس کی زبان سُوج گئی تھی۔ مُنہ کے اندر پھنسیاں نکل
آئی تھیں۔ اُس عامل نے کوئی ایسا عمل کیا کہ دونوں بہنیں ٹھیک ہو گئیں۔
اس کا اب ڈاکٹری علاج ہو رہا ہے اور یہ پہلے سے بہت بہتر ہے۔ اس
کی جگہ مَیں ہی باتیں کروں گی۔ مَیں نے اسے آپ کی اس رشتہ دار لڑکی
کا حال سنایا تو یہ کہنے لگی کہ مَیں بھی ساتھ چلتی ہوں۔ یہ لڑکی کو دیکھنا چاہتی
تھی۔ پھر بھی لڑکی کو عامل کے پاس لے جاتے گی۔ اگر آپ چاہیں تو عامل یہاں
بھی آسکتا ہے ..... کیوں فردوس؟"

"آسکتا ہے" ۔ اُس عورت نے سر ہلا کر اس طرح کہا جیسے اس
کا گلا بیٹھا ہُوا ہو اور اُس نے بڑی ہی مشکل سے یہ الفاظ زبان سے نکالے ہوں۔

"بولو نہیں، بولو نہیں" ۔۔۔ زبیدہ نے اس عورت سے کہا ۔۔۔ "پھر
مُنہ سے خون جاری ہو جائے گا" ۔۔۔ اُس نے بیگم ہاشمی سے کہا ۔۔۔ "اس
لڑکی کو یہیں بلا لیں یا وہ جس کمرے میں ہے وہاں لے چلیں۔ منٹ کے
منٹ تو اُسے دیکھیں گے۔"

زبیدہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس کے ساتھ آئی ہوئی عورت بھی اٹھی۔ بیگم
ہاشمی کا دم خشک ہو گیا۔ وہ انہیں روک نہیں سکتی تھی۔ دونوں کمرے سے
نکلیں۔ زبیدہ کا رُخ اُسی کمرے کی طرف تھا جس کمرے میں ایک روز پہلے
اُس نے رشی کو دیکھا تھا۔ ہاشمی کی بیوی حیران و پریشان اُن کے پیچھے
جا رہی تھی۔

"ذرا ٹھہرو زبیدہ!" ۔۔۔ یہ ہاشمی کی آواز تھی جو ساتھ والے کمرے
سے باہر نکل آیا تھا۔

زبیدہ برقعے کے بغیر تھی۔ وہ ہاشمی کی آواز پر رُک گئی۔ اُس نے
بڑے پُر تکلف انداز سے ہاشمی کو آداب کیا۔ بھائی جان کہہ کر خیر خیریت
پوچھی، لیکن ہاشمی کے تیور کچھ اور تھے۔ اُس نے زبیدہ کے ساتھ آئی ہوئی
عورت کے اس نقاب پر ہاتھ رکھا جو اُس نے مُنہ اور ناک پر لپیٹ رکھا
تھا۔ ہلکا سا جھٹکا دے کر ہاشمی نے نقاب اُس کے چہرے سے ہٹا دیا۔
اس نقاب سے جو چہرہ سامنے آیا وہ کسی عورت کا نہیں بلکہ ایک آدمی کا چہرہ
تھا جس کی چھوٹی چھوٹی مونچھیں بھی تھیں۔ اس آدمی کی آنکھیں ٹھہر گئیں۔

"باہر والا دروازہ اندر سے بند کر دو" ۔۔۔ ہاشمی نے اس آدمی کے
سر پر ہاتھ رکھ کر برقعہ بڑی زور سے کھینچتے ہوئے اپنی بیوی سے کہا۔

ہاشمی کی بیوی دوڑی اور ڈیوڑھی کے اندر والا دروازہ بند کر کے
زنجیر چڑھا دی۔ گھبراہٹ سے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ زبیدہ گم صم
صحن میں کھڑی تھی۔ ہاشمی نے اُس آدمی کا برقعہ اتنی زور سے کھینچا تھا کہ سر
سے برقعہ اُتر گیا اور وہ آدمی پیچھے برآمدے کے ستون کے ساتھ جا لگا۔

یہ آدمی عزیز کا ہندو ساتھی ورما تھا جس کا عزیز نے رابی کے ساتھ
عبدالرحمٰن کے نام سے تعارف کرایا تھا۔ ورما نے بڑی تیزی سے برقعے
کے سامنے والے دو بٹن کھولے اور ہاتھ بُرقعہ کے اندر لے گیا۔ اُس کا ہاتھ
باہر آیا تو ہاشمی نے دیکھ لیا کہ اُس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ یہ اعشاریہ ۳۲ بور
کا پستول تھا جس میں میگزین لگتی ہے۔ یہ اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ ہاتھ میں چھپایا

بھی جاسکتا ہے۔ ورما کا ہاتھ برقعے سے باہر آ ہی رہا تھا کہ ہاشمی نے پستول دیکھ لیا۔ اس نے اُچھل کر ورما کے پستول والے ہاتھ پر کِک ماری۔ کِک پستول والے ہاتھ کو لگنے کی بجائے ورما کی ناف کے نیچے لگی۔ پیٹ کے اس مقام پر لگا ہُوا ٹھڈ کوئی پہلوان بھی برداشت نہیں کرسکتا۔ ورما تو دُبلا پتلا آدمی تھا۔

اُس کی عمر تیس بتیس سال ہوگی۔ وہ درد سے دُہرا ہوگیا۔ ہاشمی نے نیچے سے اُس کے مُنہ پر مُکّہ مارا اور اس کے ساتھ ہی اُس نے ورما کی کلائی پکڑ لی۔ پستول اسی ہاتھ میں تھا۔ کِک اور مُکّے کی دَرد کی شدّت نے ورما کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی کردی۔ ہاشمی نے بڑے آرام سے پستول اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

"اب بتاؤ"— ہاشمی نے پستول کی نالی ورما کے سینے پر رکھ کر پوچھا —"کیا لینے آتے تھے یہاں؟"— اُس نے زبیدہ کی طرف دیکھا اور بولا— "اِدھر آ تُو بھی بدمعاش عورت! اب تم دونوں یہاں سے زندہ نہیں نکل سکو گے اور تمہیں جاننے والوں کو تمہاری لاشیں بھی نہیں ملیں گی۔۔۔ سچ سچ بتاؤ یہ ڈھونگ اس گھر میں کیوں آرچایا ہے؟"— ہاشمی نے ورما کا جواب سُننے بغیر زبیدہ سے پوچھا —"تُو بتا بدکار عورت! اس خصم کو یہاں کیوں لاتی ہے؟"

زبیدہ کا تو خون ہی خشک ہوگیا تھا۔ ورما ڈرا ہُوا تو تھا لیکن اُس کے انداز سے پتہ چلتا تھا جیسے وہ ذرا سا بھی خوفزدہ نہیں۔ وہ کچھ بھی نہیں بولتا تھا۔ اُس نے نظریں گھما کر حویلی کا جائزہ لے لیا تھا اور اُسے احساس ہوگیا تھا کہ اس حویلی میں اُسے یا اس کی لاش کو غائب کیا جاسکتا ہے۔

ہاشمی کے کہنے پر اُس کی بیوی نوکر کو بلا لائی۔ ہاشمی نے نوکر سے کہا کہ وہ عبدالقدیر کو بلا لائے۔ اُس نے نوکر کو تین چار نام بتا کر کہا کہ وہ عبدالقدیر سے کہے کہ ان سب کو ساتھ لیتا آئے۔

بوڑھے نوکر نے جو منظر دیکھا وہ اُس کے لئے بڑا ہی عجیب تھا۔ ہاشمی کے ہاتھ میں پستول تھا اور اس کے سامنے ایک آدمی کھڑا تھا جو کندھوں

سے ٹخنوں تک کالے بُرقعے میں لپٹا ہُوا تھا اور اُس کے ساتھ ایک عورت بھی کھڑی تھی۔ نوکر باہر کو دوڑ پڑا۔ عبدالقدیر کا گھر زیادہ دُور نہیں تھا۔ اتفاق سے عبدالقدیر اُسے گھر پر ہی مل گیا۔ نوکر نے اُسے وہ منظر سنایا جو وہ دیکھ آیا تھا۔

❦

نصف گھنٹے کے اندر اندر عبدالقدیر چار آدمیوں کے ساتھ آن پہنچا۔ ان میں ایک تو ادھیڑ عمر تھا اور تین جوان سال آدمی تھے۔ اس آدھے گھنٹے کے دوران ہاشمی نے ورما اور زبیدہ کے ساتھ کوئی بات نہیں کی سوائے اس کے کہ اس نے دونوں سے کہا تھا کہ وہ دیوار کی طرف مُنہ کرکے فرش پر بیٹھ جائیں۔ وہ دونوں اُس کے کہنے کے مطابق بیٹھ گئے تھے۔

"مسٹر ہاشمی!"— ورما نے ہاشمی سے کہا تھا —"جو کچھ کرنا ہے سوچ سمجھ کر کرنا۔ میں ویسے ہی یہاں بھیس بدل کر نہیں آگیا تھا۔ میرے پیچھے طاقت ہے جسے معلوم ہے کہ میں اس وقت کہاں ہوں۔ تم مجھے زندہ یا مُردہ غائب کرسکتے ہو لیکن تمہیں اور تمہاری بیوی کو ایسی چکی میں ڈال دیا جائے گا کہ باقی عمر پستے رہو گے، مرو گے نہیں۔"

ہاشمی نے اُس کی پیٹھ پر اتنی زور سے لات ماری کہ اُس کا مُنہ دیوار سے جا لگا۔

"زبان بند رکھو"— ہاشمی نے کہا۔

اس کے بعد ان کے درمیان کوئی بات نہ ہوئی اور عبدالقدیر چار آدمیوں کے ساتھ پہنچ گیا۔ عبدالقدیر نے ہاشمی کو اپنی طرف بلایا اور اسے اور اپنے ساتھ لاتے ہوئے آدمیوں سے سرگوشی میں کہا کہ ان کے سامنے باتیں کرتے وقت ایک دوسرے کا نام نہ لینا۔ میرا نام تو بالکل ہی نہ لینا بلکہ مجھے قریشی صاحب کہنا۔۔۔ اُس نے ہاشمی سے پوچھا کہ کیا اور کیسے ہُوا ہے۔

"یہ تو میں کل شام آپ کو بتا چکا ہوں"— ہاشمی نے کہا —"کہ عزیز کی بہن کس طرح میری غیر حاضری میں میری بیوی کے پاس آئی تھی اور اس نے کیا باتیں کی تھیں۔"

"راز کی بات چھوڑیں ہاشمی صاحب!" — عبدالقدیر نے کہا —
"وہ تو آپ نے سب کچھ بتا دیا تھا اور ہم نے جو کچھ کرنا تھا وہ کر دیا تھا۔ ان
چاروں ساتھیوں کو بھی علم ہے۔ آج بتائیں کہ یہ دونوں کس طرح آتے تھے"
"بڑا اچھا اتفاق ہے کہ میں گھر میں موجود تھا" — ہاشمی نے کہا —
"دو عورتیں آئیں تو میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے انہیں دیکھا۔ زبیدہ
کو تو مَیں جانتا ہوں۔ اسے کون نہیں جانتا۔ اس کے ساتھ برقعے میں جو
عورت تھی اسے غور سے دیکھا۔ میری بیوی ابھی کسی کمرے میں تھی۔ ان
دونوں عورتوں کو معلوم نہیں تھا کہ انہیں کوئی دیکھ رہا ہے۔ زبیدہ نے
اس برقعہ پوش عورت کے کان میں کچھ کہا۔ اس عورت نے زبیدہ کا ہاتھ پکڑ
کر دبایا پھر زبیدہ نے اس عورت کا نقاب جو اس کی ناک تک لپٹا ہُوا تھا،
ذرا اُوپر کر دیا.... مَیں بتا نہیں سکتا قدیر صاحب کہ مجھے کیوں محسوس ہُوا
کہ بُرقعے میں لپٹا ہُوا یہ جسم عورت کا نہیں، کسی آدمی کا ہے۔"
"ذرا آہستہ بولیں" — عبدالقدیر نے سرگوشی میں ہاشمی سے کہا
"وہ دُور ہیں" — ہاشمی نے ورما اور زبیدہ کی طرف دیکھ کر کہا —
"اُن تک آواز نہیں پہنچے گی .... میری بیوی باہر آئی ان دونوں سے ملی
اور انہیں ساتھ والے کمرے میں لے جا کر بٹھایا۔ دونوں کمروں کے درمیان
والا دروازہ بڑا پرانا ہے۔ اس میں ایک درز ذرا کھلی ہوتی ہے۔ مَیں نے
اس میں سے اُدھر جھانکا۔ زبیدہ کی باتیں بھی میرے کانوں تک پہنچتی رہیں
یہ تو میرے ذہن میں کل سے ہی کانٹا اٹکا ہُوا تھا کہ اتنی مدت بعد زبیدہ
میری بیوی کے پاس کیوں آئی تھی اور جس طرح وہ راشدہ کے کمرے میں
چلی گئی تھی اس سے بھی ایک شک میرے دل پر بیٹھ گیا تھا۔"
ہاشمی نے عبدالقدیر اور چاروں ساتھیوں کو وہ باتیں سنائیں
جو زبیدہ نے اُس کی بیوی کے ساتھ کی تھیں۔ ہاشمی نے انہیں بتایا کہ دروازے
میں سے وہ بُرقعہ پوش عورت کو دیکھتا رہا۔ اسے شک اس لئے ہُوا
کہ زبیدہ نے کہا تھا کہ یہ عورت بول نہیں سکتی کیونکہ اس کی زبان اور مُنہ

پر ورم یا سوزش ہے۔ اس عورت نے دو تین لفظ ہی بولے۔ پتہ تو
یہ چلتا تھا کہ اس کا گلا خراب ہے لیکن عورت کا گلا کتنا ہی خراب کیوں
نہ ہو اور وہ اپنی آواز کتنا ہی کیوں نہ بدل لے اُس کی آواز مردوں جیسی
نہیں ہو سکتی۔ اس عورت کی آواز مردوں جیسی لگ رہی تھی۔
"میں سی آئی ڈی اور انٹیلی جنس میں کبھی بھی نہیں رہا" — ہاشمی نے
کہا — "یہ اللہ کی قدرت ہے یا اسے ایمان کا کرشمہ کہئے کہ دماغ میں
ایک چمک سی پیدا ہوتی جس نے مجھے اس برقعہ پوش کا اصل روپ دکھا
دیا۔ زبیدہ میری بیوی کی اجازت کے بغیر راشدہ کے کمرے کی طرف چل
پڑی۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ یہ آدمی جو برقعہ پوش ہے زبیدہ کے ساتھ لگ
کر بیٹھا ہُوا تھا اور اس نے کئی بار زبیدہ کو ٹھوکا دیا۔ اس سے میرے لئے
یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ زبیدہ اُس کی ہدایت کاری پر بول رہی تھی۔"
اس کے بعد ہاشمی نے بتایا کہ کس طرح اُس نے اس شخص کو بے نقاب
کیا، اس نے پستول نکالا اور ہاشمی نے کس طرح پستول چھینا۔

"اب بتائیں ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتے" — ہاشمی نے کہا۔
"عزیز کی اس بہن کے خاوند کو یہاں بلواتے ہیں" — عبدالقدیر
نے کہا — "لیکن اُسے ابھی یہ نہیں بتانا کہ یہاں کیا دیکھنے آئی تھی۔ یہ
آدمی جو زبیدہ کے ساتھ آیا بیٹھا ہے، یقیناً عزیز کا ساتھی ہے اور یہ
انٹیلی جنس کا یا سی آئی اے کا آدمی ہے۔ اس کی ہم مار پٹائی کر سکتے ہیں۔
اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اگر ہم نے اسے قتل کر کے غائب کر دیا تو
سی آئی اے یا انٹیلی جنس آپ کو اور آپ کی بیوی کو بخشے گی نہیں۔ انہیں
معلوم ہے کہ ان کا یہ آدمی اس وقت کہاں ہے اور کس مشن پر ہے۔
ہمارے لئے دوسرا خطرہ یہ ہے کہ یہ کم بخت اگر ہندو ہُوا تو یہ جس محکمے
کا بھی ہے وہ ہندوؤں کو یہ کہہ کر مسلمانوں کے خلاف بھڑکا دے گا کہ
مسلمانوں نے ایک بے گناہ ہندو کو اغوا کر کے غائب کر دیا ہے ....

پہلے تو ہم اس سے یہ اگلوائیں گے کہ اس کا تعلق کون سے محکمے کے ساتھ
ہے۔ اس کا مشن تو ہمیں معلوم ہے۔ زبیدہ نے کل عزیز کو بتایا ہوگا کہ اُس
نے اس گھر میں ایک لڑکی دیکھی ہے جو ان کی کچھ نہیں لگتی۔ عزیز نے یہ
دیکھنے کے لئے کہ یہ رشی ہی تو نہیں، اپنے اس ساتھی کو بھیجا ہوگا۔"

ہُوا بھی ایسے ہی تھا کہ زبیدہ نے پہلی بار اس گھر میں رشی کو دیکھ
کر اور واپس جا کر عزیز کو بذریعہ ٹیلی فون بلایا اور بتایا تھا کہ اُس نے اس
حلیے اور اس شکل کی ایک لڑکی کو جس نے فلاں رنگ اور فلاں قسم کے
کپڑے پہن رکھے ہیں، ہاشمی صاحب کے گھر دیکھا ہے۔ عزیز نے پہلے
یہ سوچا تھا کہ وہ مصنوعی داڑھی لگا کر عامل کے بھیس میں وہاں خود جاتے
گا، لیکن ورما نے اُسے روک دیا تھا پھر دونوں نے یہ بہروپ دھارنے
کا فیصلہ کیا تھا۔ عزیز نے ورما سے یہ بھی کہا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہو جاتے تو
بلا خوف و خطر گولی چلا دینا۔

"اس کا مجھے کوئی ڈر نہیں"۔۔۔ ورما نے کہا تھا ۔۔۔"اگر کوئی ایسی
ویسی ہوگئی تو ہم شہر کے ہندوؤں کو اس محلے کے مسلمانوں پر چڑھا دیں
گے۔ ہندوؤں کو تو بہانہ چاہیئے۔"

اب ایسی ویسی ہو گئی تھی اور ورما ان چھ مسلمانوں کے ہاتھوں
میں بے بس تھا۔

عبدالقدیر ورما کے پاس پہنچا۔ اُس کے سر کے بال مٹھی میں لے کے
اور جھٹکا دے کر اُوپر کو کھینچے۔ ورما اُٹھ کھڑا ہُوا۔ عبدالقدیر نے ہاشمی سے
اتنا ہی پوچھا کہ کون سا کمرہ بہتر رہے گا۔ ہاشمی آگے آگے چل پڑا۔ عبدالقدیر
ورما کے بالوں کو پکڑے ہوتے اور جھٹکے دیتا ہُوا ہاشمی کے پیچھے پیچھے
ایک کمرے میں چلا گیا جس میں پرانی چارپائیاں اور کچھ اور پرانی چیزیں
پڑی ہوتی تھیں۔ زیادہ تر کمرہ خالی تھا۔ اس کے چاروں ساتھی بھی کمرے
میں چلے گئے اور دروازہ اندر سے بند کر دیا۔

"سچ سچ بتا جوان!"۔۔۔ عبدالقدیر نے ورما سے پوچھا ۔۔۔"کون
ہو اور یہاں کیا لینے آتے تھے؟"

"احمق نہ بنو"۔۔۔ ورما نے بڑی دلیری سے کہا ۔۔۔"مجھے جانے
دو..... پچھتاؤ گے۔"

"ہندو ہو یا مسلمان؟"

"ہندو ہوں"۔۔۔ ورما نے جواب دیا ۔۔۔"اور تم جانتے ہو کہ
میرے ساتھ تم نے کوئی زیادتی کی تو یہاں کے ہندو صرف تم سے نہیں
بلکہ اس آبادی کے تمام مسلمانوں سے....."

عبدالقدیر کے ایک زوردار تھپڑ نے اُسے اس سے آگے کچھ
کہنے نہ دیا۔ اس کے ساتھ ہی ورما پر عبدالقدیر، ہاشمی اور ان کے چار
ساتھیوں کے تھپڑوں اور گھونسوں کا مینہ برس پڑا۔

ہاشمی نے اپنے ساتھیوں کو روک دیا۔ ورما کی حالت خاصی بُری
ہو گئی تھی۔

"ہندو کے بچے!"۔۔۔ عبدالقدیر نے ورما سے کہا ۔۔۔"سچ بول"۔

ورما میں ابھی کچھ دم باقی تھا۔ اُس نے ایک بار پھر انہیں دھمکی دی۔
عبدالقدیر جانتا تھا کہ انٹیلی جنس کے انویسٹی گیشن سنٹر میں کیسے کیسے
طریقوں سے ملزموں کے سینوں سے راز نکالے جاتے ہیں۔ اُس نے
ایسا ہی ایک طریقہ آزمایا۔ ورما نے خود بھی ملزموں کو اس قسم کی اذیتیں
دی تھیں لیکن خود پہلی بار اس ایذا رسانی میں ڈالا گیا تھا۔ اس کی چیخیں
اس کمرے سے باہر تو سُنی جا رہی تھیں لیکن اس حویلی سے باہر نہیں
جا سکتی تھیں۔ اتنے میں کمرے کے دروازے پر دستک ہوتی۔ ہاشمی
نے دروازہ کھولا۔ باہر اس کی بیوی کھڑی تھی۔

"ذرا اُسے آکر دیکھیں"۔۔۔ ہاشمی کی بیوی نے زبیدہ کے متعلق ہاشمی
کو بتایا ۔۔۔"وہ میرے پاؤں پر بار بار سر رکھتی اور کہتی ہے کہ مجھے جانے
دو، اگر بات باہر نکل گئی تو میری بڑی بے عزتی ہوگی..... وہ رو رو کر
بُرا حال کر رہی ہے۔"

ہاشمی نے عبدالقدیر کو بتایا۔ عبدالقدیر نے اسے کچھ کہا اور ہاشمی

کمرے سے نکل گیا۔ اُس نے زبیدہ کو ساتھ لیا اور ایک کمرے میں لے جا کر اس سے پوچھا کہ وہ اس آدمی کو اپنے ساتھ کیوں لائی تھی۔

"اگر سچ نہیں بولو گی تو تمہاری بے عزتی اُس سے کہیں زیادہ ہو گی جتنی تم سمجھ رہی ہو"۔۔۔ ہاشمی نے کہا ۔۔۔ "تم ایک غیر مرد کو بہروپیا بنا کر بُری نیت سے یہاں آئی تھیں۔ ابھی تمہارے خاوند کو اطلاع دیں گے۔ وہ آتے چاہے نہ آتے، ہم تمہیں تھانے لے جائیں گے ...."

زبیدہ ہاشمی کے پاؤں میں بیٹھ گئی اور اس کے قدموں میں سر رکھنے کے لئے جھکی، لیکن ہاشمی نے اُس کا سر اُوپر کر دیا۔

"اب تھانیدار اور اپنے خاوند کے قدموں میں ماتھا رگڑنا" ۔۔۔ ہاشمی نے کہا۔

زبیدہ مکّار اور عیّار ہو سکتی تھی، وہ جرائم پیشہ نہیں تھی کہ ذہنی یا جسمانی ایذا رسانی کو کچھ دیر کے لئے برداشت کر سکتی۔ وہ بہرحال ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اس لئے اپنی عزت کو بچانے کے لئے وہ ہر قیمت دینے کو تیار تھی۔ ہاشمی نے اُس کے ساتھ جھوٹا وعدہ کیا کہ وہ اس پر پردہ ڈال لے گا بشرطیکہ وہ صحیح بات بتا دے۔

زبیدہ نے صحیح بات بتا دی۔

"ہاشمی بھائی جان!" ۔۔۔ زبیدہ نے پوچھا ۔۔۔ "یہ قصہ کیا ہے؟ مَیں نے تو اپنے بھائی کی بات مانی تھی۔ اُس کے ساتھ مجھے پیار ہے۔ اُس نے میرے ساتھ اِس آدمی کو بھیجا تھا"۔

"کیا اِس آدمی کو تم پہلے سے جانتی تھیں؟" ۔۔۔ ہاشمی نے پوچھا ۔۔۔ "یہ کون ہے؟ کہاں رہتا ہے؟"

"نہیں!" ۔۔۔ زبیدہ نے جواب دیا ۔۔۔ "عزیز نے مجھے اتنا ہی بتایا تھا کہ یہ اُس کا دوست ہے"۔

"یہ ہندو ہے" ۔۔۔ ہاشمی نے کہا ۔۔۔ "خود کہتا ہے کہ مَیں ہندو ہوں"۔

"عزیز نے مجھے اس کا نام عبدالرحمٰن بتایا ہے" ۔۔۔ زبیدہ نے کہا

اور بھکاریوں کی طرح بولی ۔۔۔ "یہ میرے بھائی اور اس کے دوست کا دین ایمان ہے کہ انہوں نے مجھے کیا بتایا اور حقیقت کیا ہے۔ میں جو کچھ جانتی تھی وہ آپ کو بتا دیا ہے۔ اب آپ اپنا وعدہ پورا کریں اور مجھے جانے دیں۔ میرے خاوند کو پتہ چل گیا تو...."

"خاموشی سے یہاں بیٹھی رہو" ۔۔۔ ہاشمی نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

ہاشمی اُس کمرے میں گیا جہاں اُس کے محاذ کے آدمیوں نے ورما کو گھیر رکھا تھا۔ اُس وقت تک عبدالقدیر فیصلہ کر چکا تھا کہ ورما کے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے۔

"اُس نے ساری بات بتا دی ہے" ۔۔۔ ہاشمی نے زبیدہ کے متعلق اپنے ساتھیوں کو بتایا ۔۔۔ "یہ ڈرامہ عزیز کھیل رہا ہے"۔

"اب تم بھی بول پڑو میرے دوست!" ۔۔۔ عبدالقدیر نے ورما سے کہا۔

اُس وقت تک یہ لوگ ورما کی حالت خاصی بُری کر چکے تھے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ وہ مزید تشدد برداشت نہیں کر سکتا تھا اور دوسرے اس وجہ سے بھی کہ اُسے معلوم تھا کہ عزیز کو پتہ ہے کہ وہ کہاں ہے۔ عزیز اُسے اور اپنی بہن کو کسی خطرے میں نہیں ڈال سکتا تھا۔ اُس نے اپنے ایک دو آدمیوں کو ہاشمی کے گھر پر نظر رکھنے کے لئے بھیج رکھا تھا۔ یہ انتظام بھی عزیز کا ذاتی تھا۔ اُس نے اور ورما نے ابھی اپنے محکمے کو نہیں بتایا تھا۔ عزیز اپنے چیف کو بتانے سے پہلے یقین کر لینا چاہتا تھا کہ رشی ہاشمی کے گھر میں ہی ہے یا ہاشمی کو معلوم ہے کہ لڑکی کہاں ہے۔ عزیز اور ورما کے ان دو آدمیوں کو معلوم ہی نہ ہو سکا کہ ہاشمی کے گھر کے اندر کیا ہو رہا ہے۔

"مَیں تمہیں یہ بتانے سے نہیں ڈرتا کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں" ۔۔۔ ورما نے کہا ۔۔۔ "میں انٹیلی جنس کا آدمی ہوں"۔

"تم جو کوئی بھی ہو" ___ عبدالقدیر نے کہا ___ "یہ بتاؤ کہ یہاں کیا لینے آئے ہو.... ہم کس طرح مان لیں کہ تم انٹیلی جنس کے یا سی آئی ڈی کے آدمی ہو؟ کیا یہ عورت بھی انٹیلی جنس میں ہے اور کیا اس عورت کا بھائی عزیز احمد بھی انٹیلی جنس کا آدمی ہے؟"

"نہ یہ عورت انٹیلی جنس میں ہے نہ اس کا بھائی" ___ ورما نے جواب دیا ___ "میں ایک لڑکی کی تلاش میں یہاں آیا ہوں۔ عزیز احمد میرا دوست ہے۔"

"کون ہے وہ لڑکی؟" ___ عبدالقدیر نے پوچھا ___ "اُس کا اس گھر والوں کے ساتھ کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ کیا تمہیں کسی نے یہ بتایا ہے کہ یہ بدمعاشوں اور بردہ فروشوں کا گھر ہے؟"

"میں آپ کے ساتھ زیادہ باتیں نہیں کر سکتا" ___ ورما نے کہا ___ "ہمارے محکمے کو اطلاع ملی ہے کہ وہ لڑکی اس گھر میں ہے۔"

"اور تمہیں یہ اطلاع عزیز کی بہن نے دی ہے" ___ عبدالقدیر نے کہا۔

ورما ابھی کچھ کہنے نہ پایا تھا کہ عبدالقدیر نے اُس کا بازو پکڑا اور اُسے کمرے سے باہر لے گیا۔

"یہ سارا مکان تمہارے سامنے ہے" ___ عبدالقدیر نے کہا ___ "تم اگر انٹیلی جنس میں ہو تو تم جانتے ہو گے کہ کسی مشتبہ کے گھر کی تلاشی کس طرح لی جاتی ہے۔ تم آگے آگے چلو، ہم تمہارے پیچھے پیچھے چلیں گے۔ ہر کمرے میں جاؤ۔ پلنگوں کے نیچے اور الماریوں کے اندر بھی دیکھو۔ کسی کمرے میں فرشی دری بچھی ہو تو وہ اُٹھا کر دیکھو کہ اس کے نیچے کہیں کسی تہہ خانے کا دروازہ نہ ہو۔ پھر ہم تمہیں اُوپر لے چلیں گے اور تمہیں اُس وقت یہاں سے نکلنے دیں گے جب تمہاری تسلی ہو جائے گی۔ اب ہم میں سے کوئی بھی تم پر ہاتھ نہیں اُٹھائے گا۔ تمہیں خانہ تلاشی کی کھُلی اجازت ہے۔"

ورما ساتھ والے کمرے میں گیا اور اس کمرے کو اُسی طرح دیکھا

جس طرح پولیس کسی گھر کی تلاشی لیتے وقت دیکھا کرتی ہے۔ اس حویلی کے بہت سے کمرے تھے۔ ورما کمروں کے اندر جا کر دیکھتا جا رہا تھا اور وہ اُس کمرے میں داخل ہُوا جس میں رشی کو رکھا گیا تھا۔ وہاں بھی رشی نہیں تھی۔

اُس نے تمام کمرے دیکھ لیے۔ پھر اُسے اُوپر والی منزل میں لے گئے۔ وہاں بھی کسی کمرے میں اُسے رشی نظر نہ آئی۔ اُسے نوکر اور نوکرانی کا کمرہ بھی دکھایا گیا پھر اُسے نیچے لے آئے۔ زبیدہ برآمدے میں کھڑی تھی۔ اُس کے چہرے پر پریشانی کا گہرا تاثر تھا۔ عبدالقدیر نے اُسے اپنی طرف بلایا۔

"اپنے اس دوست کو بتاؤ کہ تم نے کسی لڑکی کو کون سے کمرے میں دیکھا تھا" ___ عبدالقدیر نے زبیدہ سے کہا۔

زبیدہ نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

"وہ کمرہ ایک بار پھر دیکھ آؤ" ___ عبدالقدیر نے ورما سے کہا۔

ورما نے آہستہ سے سر ہلایا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اُس کمرے میں دوبارہ جانے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔

"میری بات غور سے سن میرے دوست!" ___ عبدالقدیر نے زبیدہ کی طرف اشارہ کر کے ورما سے کہا ___ "اس عورت کو اور اس کے بھائی کو ہم بڑی اچھی طرح جانتے ہیں۔ یہ ہاشمی صاحب کو بلیک میل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بہن بھائی بڑے شریف باپ کی اولاد ہیں لیکن یہ اتنے ہی شیطان ہیں جتنا ان کا باپ شریف اور وضعدار آدمی ہے۔ اس اتنے بڑے گھر میں یہ ہاشمی صاحب اور ان کی بیگم اکیلے رہتے ہیں۔ جناب عزیز صاحب اس مکان پر یا کم از کم آدھے مکان پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے لئے انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ انہیں ایسے چکر میں پھنساؤ کہ یہ ہتھیار ڈال دیں۔"

"کیا آپ ان کے وکیل ہیں؟" ___ ورما نے قدرے مسکراتے ہوئے

کہا ـــ "گھر ان کا ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ باتیں صرف آپ کر رہے ہیں۔"

"اس ملک میں مسلمانوں کا وکیل صرف خدا ہے" ـــ عبدالقدیر نے کہا ـــ "میں اس لئے ان کی جگہ بول رہا ہوں کہ یہ انتہائی شریف انسان ہیں اور ان کے لئے ایسی شرمناک اور پیچیدہ صورتِ حال پیدا کر دی گئی ہے کہ یہ بات کرنے کے بھی قابل نہیں رہے۔ انہوں نے گھبرا کر ہم سب کو بلا لیا۔ ہم سب ایک ہی محلے کے رہنے والے ہیں۔ یہ اس قدر سیدھے آدمی ہیں کہ ہم اگر انہیں اس صورتِ حال میں اکیلا چھوڑ دیں تو یہ بلیک میلنگ کے چکر میں آکر اتنا بڑا مکان چھوڑ کر بھاگ جائیں اور عزیز کا مقصد پورا ہو جاتے۔"

"کیا اب مجھے جانے کی اجازت ہے؟" ـــ ورما نے پوچھا ـــ "میں نے اپنی تسلی کر لی ہے" ـــ اُس نے ہاشمی کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا ـــ "ہاشمی صاحب! میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ آپ کو کوئی بلیک میل نہیں کرے گا۔ میں آپ کی شرافت کا قائل ہو گیا ہوں۔ کسی سے ڈرنے کی یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

ورما انٹیلی جنس کا تربیت یافتہ آدمی تھا۔ اتنی زیادہ پٹائی کروا کے بھی وہ بڑے شگفتہ انداز میں ہاشمی سے معافی مانگ رہا تھا جیسے اس پر کوئی زیادتی نہ ہوئی ہو بلکہ اس نے ہاشمی کے ساتھ زیادتی کی ہو۔

"نہیں مہاراج!" ـــ عبدالقدیر نے کہا ـــ "آپ کی تسلی تو ہو گئی ہے، ہماری نہیں ہوئی .... تمہارا یہ کہنا کہ تم انٹیلی جنس کے آدمی ہو، ہمارے لئے قابلِ قبول نہیں۔ تمہارے پاس انٹیلی جنس کے محکمے کا کوئی شناختی کارڈ نہیں۔ ہم تمہیں اور اس خاتون کو تھانے لے چلیں گے تاکہ تمہاری شناخت بھی ہو جائے اور یہ جو ڈرامہ کھیلا گیا ہے، یہ پولیس کے نوٹس میں آجائے۔"

زبیدہ پاس ہی کھڑی تھی۔ اُس نے جب تھانے کا نام سُنا تو وہ بالکل اُسی طرح تڑپنے لگی جس طرح پانی سے باہر پھینکی ہوئی مچھلی تڑپا

کرتی ہے۔ کبھی وہ ہاشمی کے آگے ہاتھ جوڑتی تھی، کبھی ہاشمی کی بیوی کی ٹھوڑی کو ہاتھ لگاتی، کبھی عبدالقدیر کی منت سماجت کرتی تھی۔

عبدالقدیر نے اپنے ایک جواں سال ساتھی کو پرے لے جا کر کہا کہ وہ زبیدہ کے خاوند کو ساتھ لے کر تھانے پہنچ جائے۔

ورما نے تھانے کا نام سُنا تو اُس کا چہرہ چمک اُٹھا۔ اُس کی خیریت اسی میں تھی کہ اسے تھانے پہنچا دیا جاتا لیکن زبیدہ پر تو جیسے غشی طاری ہونے لگی تھی۔ جب یہ سب آدمی گھر سے نکلنے لگے تو زبیدہ نے جانے سے انکار کر دیا۔

"زبیدہ!" ـــ عبدالقدیر نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اور آہستہ سے جھنجھوڑتے ہوئے کہا ـــ "تمہیں تھانے جانا پڑے گا۔ نہیں جاؤ گی تو پولیس تمہیں لینے یہاں آجائے گی اور تم نہیں جانتیں کہ پولیس کس بدتمیزی سے تمہیں تھانے لے جائے گی۔"

زبیدہ نے رونا شروع کر دیا۔ آخر ورما کے کہنے پر وہ ساتھ چل پڑی۔

❦

اس علاقے کا تھانہ انچارج ایک سکھ پولیس انسپکٹر تھا۔ یہ لوگ اُس کے پاس گئے۔ عبدالقدیر نے بیان کیا کہ ہاشمی کے گھر میں کیا ہوا ہے۔ ہاشمی نے اس سکھ تھانیدار کو بتایا کہ یہ شخص کالا برقعہ اوڑھ کر آیا تھا۔ زبیدہ کے متعلق تھانیدار کو بتایا کہ یہ ایک روز پہلے ہاشمی کے گھر میں گئی تھی۔ تھانیدار کو پوری واردات سنائی گئی۔

تھانیدار نے سب کو باہر نکال دیا۔ صرف زبیدہ کو اپنے پاس رہنے دیا۔ اُس سے بیان لینا تھا۔ ورما کو اُس نے الگ بٹھا دیا تھا۔ ورما کا پستول اور برقعہ بھی تھانیدار کو دیا گیا تھا۔ ورما کی حیثیت ملزم کی تھی۔ زبیدہ بھی ملزم تھی لیکن تھانیدار نے ورما سے پہلے زبیدہ کا بیان لینا بہتر سمجھا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ عورت جرم کا اقبال نہ کرے تو اُسے جلدی توڑا جا سکتا تھا کیونکہ عورت مرد جتنا تشدد برداشت نہیں کر سکتی۔

تھانیدار زبیدہ کا بیان لے رہا تھا کہ اُس کا خاوند آ گیا۔ ہاشمی اور عبدالقدیر اُسے جانتے تھے۔ اتنا زیادہ میل ملاپ نہیں تھا اس لئے آپس میں بے تکلفی نہیں تھی۔ اُس کا رنگ اُڑا ہوا تھا۔ وہ ہاشمی اور عبدالقدیر سے پوچھنے سے گھبرا رہا تھا کہ اُس کی بیوی کو تھانے کیوں لایا گیا ہے۔

ہاشمی اور عبدالقدیر اُسے الگ لے گئے اور اُسے پوری بات سنا دی لیکن یہ نہ بتایا گیا کہ گمشدہ لڑکی واقعی ہاشمی کے گھر تھی اور اُنہوں نے اُسے اغوا کیا تھا۔ عزیز کے متعلق انہوں نے بتایا کہ وہ انٹیلی جنس کا جاسوس ہے۔

"میرے بھائی!" — ہاشمی نے زبیدہ کے خاوند سے کہا — "یہ شخص جسے آپ کی بیگم برقعے میں لپیٹ کر میرے گھر لاتی تھی، ہندو ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ یہ عورت آپ کی بیوی ہے۔ مَیں آپ کو جانتا ہوں۔ آپ صاحب کردار ہیں لیکن اس وقت ہم اس عورت کو عزیز احمد کی بہن کی حیثیت سے دیکھ رہے ہیں۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ عورت کا اور عزیز کا باپ بھی آپ کی طرح صاحب کردار اور باوقار آدمی ہے لیکن اس عورت کی واردات دیکھیں۔"

زبیدہ کے خاوند کے آنسو نکل آئے۔

"ہمیں بہت افسوس ہے جمیل صاحب!" — عبدالقدیر نے کہا — "آپ کے ساتھ ہماری کوئی عداوت نہیں۔ اگر بات معمولی سی ہوتی تو ہم تھانے تک نوبت نہ پہنچنے دیتے۔ شاید آپ سے گلہ بھی نہ کرتے لیکن آپ خود سوچیں کہ یہ معاملہ کس قدر سنگین ہے۔"

"میں تو کچھ کہنے کے قابل نہیں رہا" — زبیدہ کے خاوند نے کہا — "میں اس عورت کو صرف اس لئے برداشت کرتا رہا ہوں کہ یہ ادریس احمد کی بیٹی ہے۔ ادریس صاحب کو شاید آپ بھی جانتے ہوں گے۔"

"ہاں ہاں!" — ہاشمی نے کہا — "اُن جیسا نیک سیرت اور نیک فطرت کون ہو گا۔"

"اگر عزیز اس عورت تک ہی محدود ہوتا تو میں کبھی کا اس عورت

کو طلاق دے چکا ہوتا" — زبیدہ کے خاوند نے کہا — "اِس عورت کے اخلاق اور کردار سے میں بڑی اچھی طرح واقف ہوں۔ اب میں دیکھوں گا کہ یہ معاملہ کیا ہے پھر آپ دیکھیں گے کہ میں کیا کارروائی کرتا ہوں۔"

ایک گھنٹے سے کچھ زیادہ وقت تھانیدار نے زبیدہ کو تفتیش کے لئے اپنے کمرے میں بٹھائے رکھا۔ اُسے باہر لا کر ایک طرف بٹھا دیا اور ورما کو اندر بلایا۔

زبیدہ نے اپنے خاوند کی طرف دیکھا۔ خاوند نے منہ پھیر لیا۔

ورما تقریباً ایک گھنٹے بعد تھانیدار کے کمرے سے نکلا۔ اس کے بعد تھانیدار باہر آیا اور اُس نے ہاشمی، عبدالقدیر اور اُس کے ساتھیوں کو بلایا۔ زبیدہ کا خاوند بھی اُن کے ساتھ چلا گیا۔ تھانیدار نے ان سب کو عزت واحترام سے بٹھایا۔ جمیل کو دیکھ کر تھانیدار نے پوچھا کہ یہ کون ہے۔ اُسے بتایا گیا کہ یہ اس عورت کا خاوند ہے۔

"آپ سب معزز لوگ ہیں" — اس سکھ تھانیدار نے کہا — "مَیں آپ سے امید رکھوں گا کہ جو بات مَیں آپ کو بتانے لگا ہوں اسے آپ سچ مانیں گے۔۔۔۔ مَیں خود حیران تھا کہ یہ واردات ایک شریف آدمی کے گھر میں کیوں ہوتی اور کس طرح ہوتی لیکن یہ کچھ اور ہی معاملہ نکلا ہے ۔۔۔۔ یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ مَیں سکھ ہوں اور آپ مسلمان ہیں۔ ہندوؤں سے جتنے نالاں آپ ہیں اُتنے ہی ہم ہیں۔ مَیں جو بھی بات کروں گا وہ آپ کی حمایت میں ہو گی اور اس میں آپ کا ہی فائدہ ہو گا۔ یہ شخص جو آپ کے گھر میں اس عورت کے ساتھ برقعے میں گیا تھا، انٹیلی جنس کا آدمی ہے اور یہ ہندو ہے۔"

"کیا آپ نے اس کی باقاعدہ شناخت کی ہے؟" — عبدالقدیر نے پوچھا — "اس کی تصدیق کراتی ہے؟"

"اپنی تسلی کر کے ہی آپ کے ساتھ بات کر رہا ہوں" — تھانیدار نے جواب دیا — "مَیں آپ کو اس کا نام نہیں بتا سکتا۔ میں یہ بھی نہیں بتا

سکتا کہ میں نے کہاں سے تصدیق کرائی ہے۔ صرف یہ بتاتا ہوں کہ میں نے ڈی ایس پی کو فون کیا تھا اور اُس نے انٹیلی جنس کے متعلقہ شعبے کو فون کر کے مجھے بتایا ہے کہ اس شخص کا تعلق انٹیلی جنس کے ساتھ ہے۔"

"لیکن سردار جی!" — ہاشمی نے پوچھا — "اس نے یہ چکر میرے گھر میں کیوں چلایا ہے؟ اس نے ہمیں بتایا تھا کہ ان کی کوئی لڑکی لاپتہ ہو گئی ہے اور انہیں شک ہے کہ وہ میرے گھر میں ہے۔ میں آپ کو پہلے بتا چکا ہوں کہ ہم نے اسے مکان کے تمام کمرے دکھاتے اور اسے اجازت دی کہ پولیس کی طرح خانہ تلاشی لے لے۔ اس نے ہمیں بھی بتایا تھا کہ یہ انٹیلی جنس کا آدمی ہے لیکن ہم یہ معاملہ آپ کے نوٹس میں لانا چاہتے تھے۔"

"جو ہو گیا ہے اُسے برداشت کریں اور بھول جائیں" — سکھ تھانیدار نے کہا — "اس شخص نے کوئی قابلِ گرفت واردات نہیں کی۔ میں نے اُوپر بات کر لی ہے۔ اوپر سے مجھے جو بتایا گیا ہے وہ میں آپ کو نہیں بتا سکتا۔ آپ خوش قسمت ہیں کہ میں اس تھانے کا انچارج ہوں اور میں سکھ ہوں۔ میری جگہ کوئی ہندو انسپکٹر ہوتا تو وہ آپ کی شکایت سُننے کی بجائے آپ کو ملزم بنا دیتا اور انٹیلی جنس والوں سے کہہ سُن کر آپ کو وہاں کے انویسٹی گیشن سنٹر میں پہنچا دیتا۔ آپ نے انٹیلی جنس کے ایک آدمی کو مارا پیٹا ہے۔ ہندوؤں کی ذہنیت کو آپ جانتے ہیں۔ یہ مسلمانوں کے بھی اتنے ہی دشمن ہیں جتنے سکھوں کے ہیں۔ ہمارے دربار صاحب امرتسر پر حملہ کرنے اور آپ کے کعبہ جیسے ہمارے دربار صاحب کو تباہ کر لے والوں نے آپ کی مسجدیں اُجاڑ دی ہیں۔ پہلے یہ مسلمانوں کا خون بہاتے رہتے تھے پھر انہوں نے سکھوں کے خون کی ندیاں بہا دیں۔ ۱۹۴۷ء میں ہندو لیڈروں نے سکھ لیڈروں کو سبز باغ دکھا کر اور روپیہ دے کر سکھ قوم کو مسلمانوں کا دشمن بنایا۔ جب ہندوؤں کا مطلب پورا ہو گیا تو انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ سکھوں کو بھی اپنا دشمن سمجھنا شروع کر دیا۔"

سکھ تھانیدار آہستہ آہستہ بول رہا تھا کہ اس کی آواز دروازے سے باہر نہ جاتے۔ اُس کی باتوں کی گہرائی کو عبدالقدیر زیادہ اچھی طرح سمجھتا تھا کیونکہ وہ انٹیلی جنس میں رہ چکا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ ہندو حکومت ہاتھ دھو کر سکھوں کے پیچھے پڑی ہوتی ہے۔

"ہم آپ کے بہت ہی مشکور ہیں سردار جی!" — عبدالقدیر نے کہا — "ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ یہ واردات یا یہ واقعہ تھانے کے ریکارڈ پر آجاتے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ہم نے اس شخص کو زدوکوب نہیں کیا۔ ہم تو اس کی پٹائی کرتے کرتے تھانے لانا چاہتے تھے۔"

"ریکارڈ پر آگیا ہے" — تھانیدار نے کہا — "اور آپ نے اچھا کیا ہے کہ اس کی پٹائی کرتے کرتے تھانے نہیں لاتے۔ ہندو لُومڑی اور بھیڑیتے کی نسل ہے۔ یہ اس معاملے کو فرقہ وارانہ فساد بنا سکتا ہے۔ میں نے اس شخص کو بڑی مشکل سے ٹھنڈا کیا ہے۔ یہ ہندوؤں کو مسلمانوں کی آبادی پر چڑھا سکتا ہے۔"

"حکومت اِن کی ہے صاحب!" — ہاشمی نے کہا — "شیطان کی یہ اولاد جو چاہے کر سکتی ہے۔"

"میں آپ سے ایک ضروری بات کہنا چاہوں گا" — تھانیدار نے کہا — "کبھی کسی محفل اور مجلس میں، دفتر یا کنٹین میں یا کہیں بھی، پاکستان کی حمایت میں کوئی بات نہ کرنا۔ آپ کو میری یہ بات شاید اچھی نہ لگے کہ پاکستان کے لیڈروں نے پاکستان کو ایک کمزور ملک بنا دیا ہے۔ ہم تو کہتے تھے کہ جس طرح ہندوؤں نے ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان میں بنگالیوں کی مدد کی تھی اس طرح پاکستان مشرقی پنجاب میں سکھوں کی مدد کرے گا لیکن پاکستان تو بھارت کے مسلمانوں کی بھی مدد کرنے سے گھبراتا ہے۔"

"مدد تو دُور کی بات ہے سردار صاحب!" — ہاشمی نے کہا — "پاکستان کی حکومت سرکاری طور پہ بھارت میں مُسلم کُشی پر احتجاج بھی نہیں کرتی۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ پاکستان کے لوگ ہمارے ہمدرد ہیں۔"

"لوگوں کی کون سُنتا ہے" ـــ تھانیدار نے کہا اور وہ اچانک بول پڑا جیسے اُسے کچھ یاد آگیا ہو۔ ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بولا ـــ "یہ ملکوں کی سیاست کی باتیں ہیں میرے بھائیو! اب جاؤ .... میری نوکری کا خیال رکھنا۔ میں نے کچھ فالتو باتیں کہہ دی ہیں" ـــ وہ سب اُٹھ رہے تھے تو تھانیدار نے کہا ـــ "ایک اور فالتو بات کہہ دیتا ہوں۔ انٹیلی جنس کے ساتھ ٹکر لینے کی حماقت کبھی نہ کرنا۔"

"میری بیوی کو انٹیلی جنس کے ساتھ کیوں وابستہ کیا گیا ہے؟" ـــ زبیدہ کے خاوند جمیل نے پوچھا۔

"یہ آپ کے گھر کا معاملہ ہے" ـــ تھانیدار نے کہا ـــ "آپ کو خوش ہونا چاہیئے کہ آپ کی بیوی جیل سے بچ گئی ہے۔ کچھ اور پوچھنا ہے تو وہ اپنی بیوی سے پوچھیں .... اور اسے اپنے ساتھ لے جائیں۔"

❦

سب باہر نکل آئے۔ ورما جاچکا تھا۔ زبیدہ وہیں تھی۔ اُس کے خاوند پر یہ بڑا ہی تلخ، شرمناک اور ناقابلِ برداشت انکشاف ہو چکا تھا کہ اُس کی بیوی کا تعلق انڈین انٹیلی جنس کے ساتھ ہے۔ اُس نے باہر آکر اپنی بیوی کی طرف دیکھا ہی نہیں اور دوسروں کے ساتھ تھانے سے نکل آیا۔

ان میں سے کسی نے پیچھے دیکھا تو جمیل کو بتایا کہ اُس کی بیوی آرہی ہے۔ زبیدہ کو تھانیدار نے باہر نکل کر کہا تھا کہ وہ گھر چلی جائے۔

جمیل بیوی کے لئے رُکنا نہیں چاہتا تھا۔ عبدالقدیر، ہاشمی اور دوسرے ساتھیوں نے اُسے کہا کہ بیوی کو ساتھ لے لے، گھر جا کر اس کے ساتھ جیسا سلوک چاہے کرے، یہاں غیروں کے سامنے تماشہ نہ بنائے۔

"آپ سب رُک جائیں" ـــ جمیل نے کہا ـــ "میں اپنا فیصلہ آپ سب کے سامنے سناؤں گا۔"

سب رُک گئے۔ زبیدہ ان کے پاس آئی اور سر جھکا کر رُک گئی۔

"تم یہاں سے سیدھی اپنے ماں باپ کے گھر چلی جاؤ" ـــ جمیل

نے اُسے کہا ـــ "بچے میرے پاس رہیں گے، تم اپنے ماں باپ کے پاس رہو گی۔ تحریری طلاق نامہ تمہیں مل جائے گا۔"

زبیدہ نے چونک کر سر اُٹھایا اور نظریں اپنے خاوند کے چہرے پر گاڑ دیں۔ اُس کی آنکھوں میں رُکے ہوئے آنسو بہہ نکلے۔

"اپنے گریبان میں مُنہ ڈالو" ـــ جمیل نے کہا ـــ "تمہیں اپنا اخلاق اور کردار نظر آئے گا اور تمہیں میری شرافت اور برداشت بھی نظر آئے گی" ـــ جمیل نے ہاشمی اور عبدالقدیر کی طرف دیکھا اور کہنے لگا ـــ "اگر میرے بچے نہ ہوتے تو میں اسے کبھی کا طلاق دے چکا ہوتا۔ اس کے باپ کی شرافت کا بھی مجھے خیال رہا۔"

"میں عزیز کی باتوں میں آگئی تھی" ـــ زبیدہ نے کہا ـــ "اُس نے کہا تھا کہ میرے ایک پاکستانی دوست کی بیوی لاپتہ ہو گئی ہے اور شک ہے کہ وہ ہاشمی صاحب کے گھر میں ہے ...."

"یہ سب بکواس ہے" ـــ جمیل نے بارُعب آواز میں کہا ـــ "میں اب تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گا۔ صرف یہ سُن لو کہ تمہارا پیارا بھائی عزیز احمد انڈیا کا جاسوس ہے اور وہ پاکستان کی جڑیں کاٹ رہا ہے اور وہ ہندوستان کے مسلمانوں کا اتنا ہی دشمن ہے جتنے ہندو ہیں .... اور یہ بھی سُن لو کہ تم جس آدمی کو برقعے میں لپیٹ کر ایک معزز اور پردہ دار گھر میں لے گئی تھیں وہ ہندو ہے۔ تم بھی انڈیا کی جاسوس ہو اور اس ہندو کے ساتھ تمہارا ناجائز یارانہ ہے۔"

"نہیں .... نہیں!" ـــ زبیدہ نے تڑپ کر کہا ـــ "مجھ پر اتنا ذلیل الزام نہ لگائیں .... میرا بھائی جاسوس نہیں ہو سکتا۔"

"تمہارے اس ایمان فروش بھائی کو تمہاری عزت اور عصمت کا ذرا سا بھی پاس نہیں" ـــ جمیل نے کہا ـــ "اُسے معلوم تھا کہ اُس کی یہ سکیم اُلٹ گئی تو تمہاری کتنی بے عزتی ہو گی۔"

"جمیل صاحب!" ـــ ہاشمی نے کہا ـــ "لوگ رُک رُک کر سُن رہے

ہیں۔ اس کے ساتھ اس کے والدین کے گھر چلے جائیں یا اسے اپنے گھر لے جائیں اور وہاں بات کریں۔"

"مجھے اس کے ساتھ کوئی بات نہیں کرنی ہاشمی صاحب!" — جمیل نے کہا — "میں اپنا فیصلہ سُنا چکا ہوں۔ یہ اپنے ماں باپ کے گھر جاتے گی۔ آپ کو معلوم نہیں کہ میں نے اس عورت کے ساتھ اکیس سال کس طرح گزارے ہیں۔ میں نے تو اللہ کا شکر ادا کیا تھا کہ عزیز کہیں غائب ہو گیا ہے۔ اس بہن بھائی نے مل کر میرا گھر خالی کر دیا تھا۔"

اتنے سارے آدمیوں میں زبیدہ کی حالت ایسی تھی جیسے اُس پر سکتہ طاری ہو گیا ہو۔ وہ سڑک کے کنارے کھڑے تھے۔ لوگ اُن کے قریب سے گزرتے تو قدم ذرا روک کر دیکھتے اور سُنتے تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

"تم اپنے والدین کے گھر چلی جاؤ" — جمیل نے زبیدہ سے کہا — "میں ان کے ساتھ جا رہا ہوں۔"

وہ سب چل پڑے اور زبیدہ وہیں کھڑی رہی۔ اُس نے جان لیا تھا کہ اُس کے خاوند کا فیصلہ اٹل ہے۔ اُس کا اپنا ضمیر بھی اُس پر لعنت بھیج رہا تھا۔ اس انکشاف نے تو اُس کا دم خم ہی توڑ دیا تھا کہ عزیز انڈیا کا جاسوس ہے۔ تھانے کی دہشت اور شرمساری بھی اُس کے اعصاب پر سوار تھی۔ وہ اُس سپاہی کی طرح جو زخمی اور شکست خوردہ ہو اور جس سے ہتھیار چھین لئے گئے ہوں، اپنے وجود کو گھسیٹنے لگی۔

❦

وہ سب ہاشمی کے گھر جا بیٹھے۔ موضوعِ سخن عزیز، زبیدہ اور اُن کی یہ واردات تھی۔ جمیل غصے سے بھرا ہُوا تھا۔ اُس نے یہاں تک کہا کہ اپنا بھائی، بیٹا یا باپ بھی بھارت کا جاسوس ہو تو اُسے قتل کر دو۔ اس کے باوجود اُسے نہ بتایا گیا کہ ایسا ہی ایک محاذ بنایا جا چکا ہے۔ اُسے یہ راز بھی نہ دیا گیا کہ رشی کو ہوٹل سے دھوکے میں لانے والوں میں سے دو اُس کے سامنے بیٹھے ہیں۔

عبدالقدیر کے تجربے اور دُور اندیشی نے ہاشمی کو بچا لیا تھا۔ اُس نے گزشتہ رات رشی کو ہاشمی کے گھر سے نکلوا دیا تھا۔ ہاشمی نے جب عبدالقدیر کو بتایا تھا کہ زبیدہ اُس کے گھر آئی تھی اور اتفاق سے رشی نے کمرے کا دروازہ کھول دیا تھا پھر جس طرح زبیدہ اُس کمرے میں گئی، وہ ہاشمی نے عبدالقدیر کو سنایا تو عبدالقدیر کو یقین ہو گیا کہ عزیز کی یہ بہن رشی کو ہی دیکھنے یا رشی کی ٹوہ لگانے کے لئے آئی تھی اور اس صورتِ حال میں ضروری ہو گیا ہے کہ رشی کو وہاں سے نکال دیا جاتے۔

ان لوگوں کے لئے صورتِ حال بہت ہی پُرخطر ہو گئی تھی۔ صرف ہاشمی کا مکان ایسا تھا جس میں لڑکی کو چھپایا جا سکتا تھا۔ ایک تو اس مکان کے کمرے بے شمار تھے دوسرے یہ کہ اتنے بڑے مکان میں صرف میاں بیوی رہتے تھے، پھر بھی لڑکی کو وہاں دیکھ لیا گیا۔ عبدالقدیر کا اپنا مکان رشی کو چھپانے کے قابل نہیں تھا کیونکہ اس گھر میں بہت سے افراد رہتے تھے۔ انہوں نے جو زمین دوز محاذ بنایا تھا اس کے کسی بھی ممبر کا گھر اغوا کی ہوئی ایک لڑکی کو چھپانے کے لئے موزوں نہیں تھا، لیکن لڑکی کو ہر قیمت پر کوئی خطرہ مول لے کر بھی ہاشمی کے گھر سے نکالنا تھا۔

ہاشمی اور عبدالقدیر کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ اُنہوں نے جذبے کے جوش میں آکر ایک لڑکی کو اغوا تو کر لیا تھا لیکن اب اُن کے لئے یہ لڑکی ایک ٹیڑھا مسئلہ بن گئی تھی۔ رشی کو صرف یہ معلوم کرنے کے لئے اغوا کیا گیا تھا کہ وہ عزیز کے ساتھ کیوں آئی ہے۔ یہ بھی معلوم کرنا تھا کہ عزیز واقعی ہی "را" کا کارندہ ہے اور وہ پاکستان سے نوجوانوں کو ورغلا کر یہاں لے آتا ہے۔

لڑکی کو اس معاملے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ جب اُنہیں یقین ہو گیا تھا کہ اس لڑکی کو واقعی کچھ بھی معلوم نہیں تو اُس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اشوکا ہوٹل کے قریب چھوڑ آتے لیکن لڑکی کو جب عزیز اور اپنے خاوند کے متعلق پتہ چلا کہ وہ بھارت کے جاسوس ہیں تو اُس کے جذبات بیدار

ہوگئے۔ ہاشمی اور اُس کی بیوی کے معاملے میں وہ جذباتی ہوگئی اور یہ میاں بیوی اُس کے جذباتی انقلاب سے متاثر ہوگئے۔ رشی نے اپنے خاوند کے پاس جانے یا پاکستان کو واپس چلے جانے سے انکار کر دیا تھا۔

عبدالقدیر اور ہاشمی نے اُس شام اپنے محاذ کے چیدہ چیدہ ممبروں کا اجلاس بلایا جس میں ان دونوں کے علاوہ تین اور آدمی شامل تھے۔ عبدالقدیر نے انہیں نئی صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ احتیاط کے طور پر یہ سب ایک اور آدمی کے گھر اکٹھے ہوتے تھے۔

"ہم بہت بڑی غلطی کر چکے ہیں"— ایک ممبر نے کہا — "لڑکی کے معاملے میں ہاشمی صاحب کو جذباتی نہیں ہونا چاہیئے تھا۔"

"غلطی تو ہو چکی ہے"— عبدالقدیر نے کہا — "ابھی ہم سے مزید غلطیاں سرزد ہوں گی۔ تجربہ غلطیوں سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ ہمیں خطرے مول لینے پڑیں گے۔ کبھی ہمیں اپنے جذبات دھوکا دیں گے، کبھی ہم دشمن کی کسی چال سے دھوکا کھائیں گے۔ جب دو ملکوں کی فوجیں آپس میں لڑتی ہیں تو دونوں فوجوں کے جرنیلوں کے پاس لڑائی کے باقاعدہ پلان موجود ہوتے ہیں لیکن اپنے ہی بناتے ہوئے پلان شکست کا باعث بھی بن جاتے ہیں۔ میدانِ جنگ میں انسان اپنی لغزشوں اور دشمن کے رحم و کرم پر ہوتا ہے.... اس لڑکی کا اغوا ہمارے محاذ کا پہلا مشن ہے۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ لڑکی کو اغوا کرنا ہی غلط تھا، کوئی اور طریقہ اختیار کیا جا سکتا تھا۔ نہیں میرے رفیقو! ہمیں آگ میں کُودنا ہی پڑے گا۔ اسلام کو دنیا میں پھیلانے کے لئے ہمارے اُس وقت کے مجاہدین نے جانیں قربان کی تھیں۔ آج اسلام کے تحفظ اور فروغ کے لئے اور پاک و ہند کے مسلمانوں کے وقار کے لئے ہمیں جان و مال کی قربانیاں دینی ہوں گی.... اس وقت مسئلہ یہ ہے کہ اس لڑکی کو ہاشمی کے گھر سے نکال کر کسی اور گھر میں رکھنا ہے لیکن کوئی اور گھر موزوں اور محفوظ نظر نہیں آتا۔"

"لڑکی کو کتنے دن اور رکھنا ہے؟"— ایک ممبر نے پوچھا۔

"ایک یا دو دن!"— عبدالقدیر نے جواب دیا۔

"پھر اُسے میرے گھر میں رکھ لیں"— دوسرا ممبر بولا — "خدا یقیناً ہماری مدد کر رہا ہے۔ آج صبح میری بیوی تین چار دنوں کے لئے اپنے والدین کے ہاں فیض آباد چلی گئی ہے۔ مَیں لڑکی کو بیوی کی واپسی تک اپنے گھر میں رکھ سکتا ہوں۔"

"آپ نے لڑکی کے متعلق سوچا کیا ہے؟"— ایک ممبر نے پوچھا۔

"لڑکی میں ایسا جذباتی انقلاب آیا ہے کہ وہ پاکستان کو واپس جانا ہی نہیں چاہتی"— عبدالقدیر نے کہا — "لیکن ہمیں اُس کی ضرورت نہیں رہی۔ ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ لڑکی کو اشوکا ہوٹل کے قریب چھوڑ آئیں گے۔"

"اس میں بھی ایک خطرہ ہے"— ہاشمی نے کہا — "لڑکی کو یہ تو معلوم ہی نہیں کہ وہ دِلّی کے کون سے علاقے یا محلّے میں ہے۔ اُسے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ نئی دِلّی میں ہے یا پرانی دِلّی میں لیکن وہ میری، میری بیوی کی، قدیر صاحب اور آپ کی شناخت آسانی سے کر سکتی ہے۔ آپ اُسے ہوٹل سے لاتے تھے۔ یہ تو آپ نے دیکھ لیا ہے کہ عزیز کے ذریعے ہمیں کتنا پختہ شک ہو گیا ہے کہ انٹیلی جنس کے آدمی کو میرے گھر میں بہروپ میں بھیجا گیا ہے۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ ہمیں تھانے میں یا انٹیلی جنس کے ہیڈ کوارٹر میں بلایا جائے اور لڑکی سے ہماری شناخت کرائی جائے۔ وہ واپس جا کر یہ تو ضرور بیان دے گی کہ اُسے ہوٹل سے دھوکے میں لے جایا گیا تھا۔"

"ہوگا ہی"— عبدالقدیر نے کہا — "لڑکی کو ہاشمی صاحب کے گھر لایا جائے گا۔ مَیں چونکہ لڑکی کے پاس بہت دیر تک رہا تھا اس لئے ہاشمی صاحب کے ساتھ مجھے بھی لڑکی کے سامنے کھڑا کیا جائے گا۔ مجھے یہ بھی شک ہے کہ عزیز کی بہن کے ساتھ انٹیلی جنس کا جو ہندو برقعے میں آیا تھا وہ مجھے جانتا ہے۔ کچھ غلطی مجھ سے بھی ہوئی کہ اُس کے ساتھ زیادہ باتیں

میں نے ہی کی تھیں۔"

"اب بتائیے کرنا کیا ہے"۔۔۔ اُس ممبر نے پوچھا جس نے کہا تھا کہ اُس کی بیوی فیض آباد چلی گئی ہے اور وہ لڑکی کو اپنے گھر رکھ لے گا۔

"تم نے خود ہی کہا ہے کہ خدا ہماری مدد کر رہا ہے"۔۔۔ عبدالقدیر نے کہا ۔۔۔ "خدا کی ذات سے تو ہم کبھی مایوس نہیں ہوتے۔ خدا نے تمہارا گھر خالی کر دیا ہے۔ یہی تو مسئلہ تھا جو حل ہو گیا ہے۔"

"اگر لڑکی کو ہوٹل میں ہی چھوڑنا ہے تو کیا آج رات ہی یہ کام نہیں کیا جا سکتا؟"۔۔۔ ایک ممبر نے پوچھا۔

"نہیں!"۔۔۔ عبدالقدیر نے جواب دیا ۔۔۔ "ہر قدم پھونک کر اُٹھانا ہے۔ لڑکی کو جس گاڑی میں ہوٹل سے لایا گیا تھا وہ گاڑی آج رات نہیں مل سکتی۔ شاید کل بھی نہ ملے۔ آپ جانتے ہیں کہ وہ میرے ایک دوست کی گاڑی ہے۔"

سکیم کے باقی پہلوؤں پر غور کر کے فیصلہ کر لیا گیا کہ کیا کرنا ہے۔

ہاشمی اپنے گھر آیا اور اپنی بیوی کو اجلاس کی کارروائی سنائی پھر دونوں رشی کے کمرے میں چلے گئے۔

"راشدہ بیٹی!"۔۔۔ ہاشمی نے کہا ۔۔۔ "تم نے ہم پر اعتماد کیا ہے۔ ہمیں تم پر اعتبار ہے۔ ہمارے درمیان یہ اعتماد اور اعتبار قائم رہے گا۔ آج رات ہم تمہیں ایک اور جگہ منتقل کر رہے ہیں۔"

"کیوں؟"۔۔۔ رشی نے قدرے گھبراہٹ کے لہجے میں پوچھا ۔۔۔ "کہاں؟ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں؟"

"وہ ہمارے گھر جیسا ایک گھر ہے"۔۔۔ ہاشمی نے کہا ۔۔۔ "تمہیں وہاں لے جانے کی ضرورت اس لئے پیش آئی ہے کہ آج عزیز کی بہن یہاں آئی تھی اور اُس کا یہاں آنا بلاوجہ نہیں تھا، پھر جس طرح وہ تمہارے کمرے میں آئی اس سے ہمارا شک پکا ہو گیا ہے کہ وہ تمہیں ہی دیکھنے آئی تھی۔"

"وہ تو مجھے جانتی ہی نہیں"۔۔۔ رشی نے کہا ۔۔۔ "وہ ایسی لگتی بھی نہیں تھی۔ اُس نے مجھے کب دیکھا تھا کہ وہ عزیز کو بتائے گی کہ یہ وہی لڑکی ہے ...."

"احتیاط لازمی ہے راشدہ بیٹی"۔۔۔ ہاشمی نے کہا ۔۔۔ "ہو سکتا ہے کل یا کسی بھی وقت یہاں چھاپہ پڑ جائے۔ ہم تو خطرے میں ہیں ہی، تم بھی خطرے میں ہو۔ جیسا کہ تم بتاتی ہو کہ تم نہیں جانتیں کہ عزیز انڈین انٹیلی جنس کا آدمی ہے اور وہ تمہارے خاوند کو بھی اپنا ایجنٹ بنا چکا ہے۔ اگر تم یہاں پکڑی گئیں تو یہاں کی انٹیلی جنس تمہارے ساتھ بہت بُرا سلوک کرے گی۔ تمہارا مسلمانوں کے ساتھ رہنا تمہارے خلاف شبہ پیدا کرے گا۔ یہاں کا ہر مسلمان یہاں کی پولیس اور انٹیلی جنس کی نظروں میں مشتبہ ہے .... میں تمہیں زیادہ کیا بتاؤں۔ اتنا ہی کہنا کافی سمجھو کہ تمہیں یہاں سے منتقل کر دینا ضروری ہو گیا ہے۔ ڈرنا بالکل نہیں۔ تم جہاں بھی رہو گی، ہماری نظر میں رہو گی۔ آج آدھی رات کے بعد میں خود تمہیں نئی جگہ لے جاؤں گا۔"

رات بارہ بجے کے لگ بھگ عبدالقدیر، ہاشمی کے گھر آیا۔ دروازے پر رُک کر اُس نے گلی میں نظریں دوڑائیں۔ دو بلبوں کی روشنی میں اُسے کوئی مشکوک آدمی نظر نہ آیا بلکہ گلی میں کوئی اور تھا ہی نہیں۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق ہاشمی کے گھر کا دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ عبدالقدیر نے کواڑ کھولا اور ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔ اُس نے اندر والے دروازے پر دستک دی۔ ہاشمی اسی دستک کے انتظار میں تھا۔ اُس نے دروازہ کھولا اور عبدالقدیر کو رشی کے کمرے میں لے گیا۔

فوراً بعد وہ آدمی آ گیا جس کے گھر میں رشی کو لے جانا تھا۔

تقریباً نصف گھنٹہ بعد اس گھر سے تین آدمی نکلے۔ ایک عبدالقدیر دوسرا اُس کا ساتھی اور تیسرا آدمی پاجامے اور سیاہ اچکن میں ملبوس تھا۔ اُس کے سر پر ٹوپی تھی اور ٹوپی کے اوپر بڑا رومال اس طرح ڈالا ہوا تھا کہ یہ کندھوں پر بھی پھیل گیا تھا۔ اس آدمی نے باہر نکل کر رومال ایک طرف

سے اس طرح دوسرے کندھے پر ڈال لیا کہ اس کا منہ رومال میں چھپ گیا۔

تینوں آدمی چلے گئے۔ وہ پرانی دلی کی کئی گلیوں کے موڑ مڑے اور ایک گھر میں داخل ہو گئے۔ عبدالقدیر نے دروازے کی چٹخنی چڑھا دی۔

یہ پرانے زمانے کا ایک مکان تھا جس کے چار ہی کمرے تھے۔

وہ ایک کمرے میں داخل ہوئے۔

"اب ٹوپی، اچکن اور پاجامہ اُتار دو" — عبدالقدیر نے کہا۔

جب ٹوپی، رومال، اچکن اور پاجامہ اُترے تو اُن میں سے ایک لڑکی برآمد ہوئی جس نے زنانہ کپڑے پہن رکھے تھے۔ اُس کے بال کٹے ہوئے تھے اور وہ تھی ہی عورت — اور یہ عورت رشی تھی۔

"لو راشدہ بیٹی!" — عبدالقدیر نے رشی سے کہا — "اب تم ایک دو راتیں یہاں رہو گی۔ یہ ہیں ہمارے اپنے ہی عزیز، رفیقی صاحب۔ انہیں تم ہاشمی صاحب جیسا ہی پاؤ گی۔"

"ان کی بیگم تو ہوں گی؟" — رشی نے پوچھا۔

"نہیں" — عبدالقدیر نے جواب دیا — "وہ تین چار دنوں کے لئے باہر گئی ہوئی ہیں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا سوائے اس کے کہ تم تنہائی محسوس کرو گی۔"

رشی نے رفیقی کی طرف دیکھا۔ وہ ایک جواں سال اور خوبرو آدمی تھا۔ عمر تیس سال سے ڈیڑھ دو سال زیادہ ہو گی۔ رشی کے ذہن میں کچھ وسوسے آئے۔ اُس کے چہرے کا تاثر عبدالقدیر نے پڑھ لیا۔

"نہیں نہیں راشدہ!" — عبدالقدیر نے کہا — "چہرے پر اتنی گہری سنجیدگی طاری نہ کرو۔"

"آرام سے سو جاؤ" — رفیقی نے رشی سے کہا — "اور دروازہ اندر سے بند کر لو۔ میں ساتھ والے کمرے میں ہوں گا۔"

عبدالقدیر اور رفیقی کمرے سے نکل آئے۔ رشی پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اُس نے دروازے کے کواڑ بند ہوتے دیکھے۔ پھر اُس نے باہر سے کُنڈی

لگنے کی آواز سُنی۔ یہ اندرونی کمرہ تھا جس کی کوئی کھڑکی باہر کی طرف نہیں کھلتی تھی۔

عبدالقدیر، رفیقی کو ایک دو ضروری باتیں سمجھا کر چلا گیا۔ وہ جلدی میں تھا کیونکہ اُسے ہاشمی کے ہاں پہنچنا اور یہ بتانا تھا کہ لڑکی ٹھکانے پر پہنچ گئی ہے۔ خطرہ تھا کہ لڑکی کو جب باہر نکالا جائے گا تو وہ شور مچا دے گی کہ اُسے اغوا کر کے محبوس رکھا گیا ہے۔

عبدالقدیر نے ہاشمی کو یہ اطلاع دی تو ہاشمی نے سکون کا لمبا سانس لیا جیسے وہ بھی اس خطرے کو بُری طرح محسوس کر رہا تھا۔

❦

یہ احتیاطی تدبیر بروقت اور نہایت کارآمد ثابت ہوئی۔ اگر رشی کو وہاں سے منتقل نہ کیا جاتا تو بھانڈہ پھوٹ گیا تھا۔ ہاشمی اور اُس کے ساتھیوں کا گرفتار ہونا لازمی تھا۔ انتہائی تکلیف دہ صورت یہ پیدا ہوتی کہ ہاشمی کی بیوی بھی گرفتار ہو جاتی۔

زبیدہ نے اتفاق سے رشی کو ہاشمی کے گھر میں دیکھ لیا تھا۔ یہ بڑا ہی خطرناک اتفاق تھا۔ زبیدہ یہی تو دیکھنے آئی تھی کہ اس گھر میں باہر کی کوئی لڑکی موجود ہے یا نہیں۔ عزیز نے اُسے رشی کی کچھ نشانیاں بتائی تھیں۔ وہ زبیدہ نے دیکھیں اور عزیز کو جا کر بتائی تھیں۔ عزیز نے ورما کو بتایا۔

ان دونوں نے مل کر یہ سوچنا شروع کیا کہ اس لڑکی کو کس طرح دیکھا جائے۔ پہلے انہوں نے یہ ترکیب سوچی کہ عزیز کسی درویش فقیر یا عامل کا بہروپ دھار کر جائے، لیکن پکڑے جانے کا ڈر تھا اس لئے یہ بہروپ زیادہ موزوں اور محفوظ لگا کہ ورما برقعہ اوڑھ کر جائے۔ اُس کا جسم دُبلا پتلا تھا اور قد بھی زیادہ اونچا نہیں تھا۔ اُس نے برقعہ اوڑھ کر دیکھا تو وہ لڑکیوں جیسا ہی لگتا تھا۔

زبیدہ نے ورما کو ساتھ لے جا کر اس کے متعلق جو باتیں ہاشمی کی بیوی کو سنائیں وہ عزیز اور ورما کے فن کا کمال تھا، لیکن خداوند تعالیٰ دوسری طرف تھا۔

ورما پکڑا گیا اور معاملہ پولیس سٹیشن تک جا پہنچا اور نوبت زبیدہ

کی طلاق تک پہنچ گئی۔ ورما پولیس سٹیشن سے بھاگم بھاگ عزیز کے ہاں پہنچا اور اُسے یہ سارا واقعہ سنایا۔ ورما کو یہ معلوم نہیں تھا کہ عزیز کا بہنوئی بھی تھانے پہنچ گیا تھا۔ ورما کی جو پٹائی ہوئی تھی وہ بھی اُس نے سنائی۔

"اس کا انتقام ہم لے لیں گے"۔۔۔ عزیز نے ورما سے کہا ۔۔۔

"افسوس یہ ہے کہ ہماری ساری سکیم غارت گئی۔"

"مجھے دو خیال پریشان کر رہے ہیں"۔۔۔ عزیز نے کہا ۔۔۔ "ایک یہ کہ لڑکی کہاں گئی۔ تم کہتے ہو کہ تم نے اُس مکان کا کوئی کونہ کھدرا نہیں چھوڑا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ ان کی کوئی رشتہ دار رہی ہو۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے"۔۔۔ ورما نے کہا ۔۔۔ "کہ تمہاری بہن نے جس طرح لڑکی کو دیکھا تھا اس سے اُن لوگوں کو شک ہو گیا۔ وہ کوئی احمق لوگ تو نہیں۔ گھاگھ معلوم ہوتے ہیں۔ انہوں نے لڑکی کو اُسی روز کہیں اور غائب کر دیا ہو.... دوسرا کیا خیال تمہیں آتا ہے؟"

"دوسرا خیال یہ ہے"۔۔۔ عزیز نے کہا ۔۔۔ "کہ پولیس ڈیپارٹمنٹ نے ہمارے ہیڈ کوارٹر سے تمہارے اور میرے متعلق تصدیق کرائی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ہمارے باس میجر بھاٹیہ سے پوچھا گیا ہو گا۔ اب سمجھو کہ اُس کا بلاوا آنے والا ہے۔"

"تو اس میں پریشانی کی کون سی بات ہے؟"۔۔۔ ورما نے کہا ۔۔۔

"ہم اُسے صاف بتا دیں گے کہ ہمیں شک تھا کہ لڑکی اس گھر میں ہے۔ تم اُسے بتاؤ گے کہ تمہیں شک کیوں ہوا۔ پھر ہم دونوں اُسے بتائیں گے کہ ہم اپنے انتظامات کے تحت شک رفع کرنا چاہتے تھے۔ اگر ہمارا شک صحیح نکلتا تو ہم میجر بھاٹیہ کو اطلاع دیتے .... یہ کوئی فکر والی بات نہیں۔ مجھے افسوس یہ ہو رہا ہے کہ تمہاری بہن ہمارے کام میں آ کر بدنام ہو گئی ہے۔ ہاشمی وغیرہ تو اُسے ذلیل کر کے رکھ دیں گے۔"

"کیا کریں بھائی!"۔۔۔ عزیز نے کہا ۔۔۔ "بہن کی عزت کو دیکھیں یا اپنے کام کو؟"

اتنے میں فون کی گھنٹی بجی۔ ورما نے ریسیور اُٹھایا۔ میجر بھاٹیہ بول رہا تھا۔

"ورما بول رہا ہوں سر!"

"اچھا ہوا تم بھی یہیں مل گئے"۔۔۔ بھاٹیہ نے کہا ۔۔۔ "عزیز کو ساتھ لے کر فوراً میرے دفتر میں آ جاؤ۔"

"ابھی آتے سر!"۔۔۔ ورما نے کہا اور ریسیور رکھ کر عزیز کو بتایا ۔۔۔ "چل بھائی، باس کا بلاوا آ گیا ہے۔"

دونوں بھاگم بھاگ انٹیلی جنس کے اُس شعبے میں پہنچے جس کے ساتھ عزیز اور ورما کا تعلق تھا اور ایک گھاگھ فوجی افسر میجر بھاٹیہ اس کا انچارج تھا۔ پاکستان میں "را" کے لئے پاکستانی ایجنٹ تیار کرنا اور پاکستان میں انہیں استعمال کرنا اسی شعبے کا کام تھا۔ رابی کا انٹرویو بھاٹیہ نے ہی لیا اور اس کی برین واشنگ مکمل کر دی تھی۔

"یہ کیا ڈرامہ کھیلا گیا ہے؟"۔۔۔ بھاٹیہ نے پوچھا اور کہنے لگا ۔۔۔ "چیف کا فون آیا اور اُس نے پوچھا کہ ورما پولیس سٹیشن کیوں پہنچا ہوا ہے تو میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اُس نے پوچھا کہ عزیز اور ورما کس مشن پر کام کر رہے ہیں تو بھی میں کوئی جواب نہ دے سکا۔ جب چیف نے کہا کہ عزیز کی بہن بھی پولیس سٹیشن میں ہے اور چند ایک مسلمان بھی وہاں کوئی رپورٹ لے کر پہنچے ہوتے ہیں تو میں پریشان ہو گیا۔"

"معافی چاہتے ہیں سر!"۔۔۔ عزیز نے کہا ۔۔۔ "یہ رابی کی بیوی رشی کے اغوا کے سلسلے میں تھا۔"

"یہ میں سنوں گا"۔۔۔ بھاٹیہ نے کہا ۔۔۔ "میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ پولیس ہیڈ کوارٹر نے چیف کو فون پر پوچھا تھا کہ ورما اور عزیز انٹیلی جنس کے آدمی ہیں یا نہیں۔ چیف نے مجھ سے پوچھ کر پولیس کو مطمئن

کر دیا لیکن اُس نے مجھے کہا ہے کہ مَیں اُسے پوری رپورٹ دُوں ....
اب بتاؤ یہ کیا معاملہ ہے اور مجھے اِس سے کیوں بے خبر رکھا گیا ہے۔"

"ہم دونوں ہاشمی کو ڈھونڈ رہے ہیں" ـــــ عزیز نے جواب دیا اور نہایت باریک تفصیلات سے بھاٹیہ کو سنایا کہ اُسے اپنی آبادی کے ایک شخص فریدالدین ہاشمی پر شک تھا کہ اس لڑکی کے اغوا میں اُس کا ہاتھ ہے۔ اگر اُس کا ہاتھ نہیں تو اُسے یہ ضرور معلوم ہوگا کہ لڑکی کہاں ہے۔

عزیز نے یہ بھی بتایا کہ اُسے ہاشمی پر کیوں شک پیدا ہُوا۔ اُس نے اپنے باپ اور اپنی ماں کی باتوں کا حوالہ دیا۔ اُس نے بھاٹیہ کو یہ بھی بتایا کہ اُس نے اپنے دو قابلِ اعتماد دوستوں کو جو اُسی آبادی میں رہتے ہیں، مُخبری کے لئے ہاشمی، عبدالقدیر اور اُن سے مِلنے جُلنے والے مسلمانوں کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے پر لگا دیا تھا۔ اُن سے اُسے جو باتیں معلوم ہوتی تھیں وہ بھاٹیہ کو سُنا کر کہا کہ اِس سے اُس کا شک مزید پختہ ہو گیا تھا۔ وہ زیادہ زور اس پر دے رہا تھا کہ ہاشمی کو کیسے پتہ چلا کہ وہ انٹیلی جنس میں ہے اور اُس کی کوٹھی کہاں ہے اور ہاشمی کو یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ وہ (عزیز) اشوکا ہوٹل میں ٹھہرا ہُوا تھا۔

عزیز نے بھاٹیہ کو اتنی زیادہ باتیں سنائیں جن سے بھاٹیہ بھی قائل ہو گیا کہ ہاشمی وغیرہ اُن کے ملزم ہیں یا نہیں، لیکن اُن کے خلاف شک پیدا کرنے کے لئے اچھی خاصی واقعاتی شہادت موجود ہے۔ بھاٹیہ نے عبدالقدیر کا نام سُنا تو وہ چونکا اور اُس نے پوچھا کہ یہ وہ عبدالقدیر تو نہیں جو کچھ عرصہ پہلے ہمارے محکمے سے ریٹائر ہُوا تھا؟ بھاٹیہ کو معلوم تھا کہ عبدالقدیر کہاں رہتا ہے۔

"یس سر!" ـــــ عزیز نے کہا ـــــ "یہ وہی عبدالقدیر ہے۔ ورما بھی اُسے جانتا ہے۔ غالباً قدیر کو معلوم نہیں کہ ہم اُسے جانتے ہیں ..... سر! ہم نے اگر غلطی کی ہے تو ہم معافی چاہتے ہیں۔ مَیں نے جو باتیں آپ کو بتاتی ہیں یہ ورما کی تھیں۔ ہم دونوں نے بہت غور کیا کہ آپ کو فوراً اطلاع دی جاتے

یا پہلے کچھ دیکھ لیا جاتے۔ ہم نے سوچا کہ اگر آپ کو بتایا تو آپ فوراً چیف کو اطلاع دیں گے اور چیف کے حکم پر کارروائی ہو گی اور شک غلط نکلا تو ہمارے ساتھ آپ بھی چیف کے سامنے شرمسار ہوں گے۔ ہم اس فیصلے پر پہنچے کہ پہلے اپنے طور پر کچھ دیکھ سُن لیا جاتے۔"

"یہ تو تم نے اچھا ہی کیا ہے" ـــــ میجر بھاٹیہ نے کہا ـــــ "اب مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے کیا کیا تھا اور نوبت تھانے تک کس طرح پہنچی۔"

عزیز نے اُسے تفصیل سے بتایا کہ اُس نے اپنی بڑی بہن کو کس طرح استعمال کیا تھا۔ یہ بھی سنایا کہ اُس کی بہن نے ہاشمی کے گھر کے ایک کمرے میں ایک لڑکی دیکھی جس نے دروازہ کھولا اور بند کر لیا۔ پھر یہ سنایا کہ اُس کی بہن کس اُستادی سے لڑکی کے کمرے میں گئی اور اُس نے لڑکی کے متعلق کیا باتیں کیں۔

"عزیز یار!" ـــــ بھاٹیہ نے ہنستے ہوئے کہا ـــــ "تم اپنی اس بہن کو بھی انٹیلی جنس میں کیوں نہیں لے آتے۔ مَیں اُس کے دماغ کی تعریف کرتا ہوں۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں سر!" ـــــ عزیز نے کہا ـــــ "اگر وہ میری بیوی ہوتی تو میں اُسے انٹیلی جنس میں لے آتا، لیکن وہ بہن ہے۔ خاوند اور بچوں والی ہے اور اُس کا خاوند روایتی قسم کا مسلمان ہے۔ وہ اسے عام سی نوکری بھی نہ کرنے دے، انٹیلی جنس میں وہ کیسے آسکتی ہے؟"

"اس کے بعد کیا ہُوا؟" ـــــ بھاٹیہ نے پوچھا۔

عزیز نے اُسے بتایا کہ ورما کے ساتھ سوچ بچار کر کے انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ورما برقعے میں وہاں جاتے اور بات نہ کرے۔ عزیز کی بہن کو یہ بتایا گیا تھا کہ وہ ہاشمی کی بیوی سے کہے کہ اس لڑکی (ورما) کے مُنہ کے اندر اتنے زخم ہیں کہ یہ بول نہیں سکتی۔ ورما کو یہ بتایا گیا تھا کہ وہ دو چار لفظ اس طرح بولے جیسے اُس کے حلق سے آواز بڑی مشکل سے نکل رہی ہو۔

عزیز نے ورما سے کہا کہ میجر بھاٹیہ کو وہ خود سناتے جو ہاشمی کے گھر کے اندر اُس پر بیتی تھی۔ ورما نے سب سُنا ڈالا۔ اُس کی جو پٹائی ہوتی تھی وہ بھی سناتی۔ یہ بھی سنایا کہ اس حویلی کی اُس نے خانہ تلاشی لی۔ بظاہر اُس نے کوئی کونا کھدرا دیکھے بغیر نہیں چھوڑا۔ پھر اُسے اور عزیز کی بہن کو تھانے لے گئے۔ ورما نے بھاٹیہ کو بتایا کہ اُس نے تھانیدار کو بتا دیا کہ وہ انٹیلی جنس سے تعلق رکھتا ہے اور یہ بھی بتایا کہ جس عورت کو تھانے لایا گیا ہے یہ عزیز احمد نام کے ایک آدمی کی بہن ہے اور عزیز احمد بھی انٹیلی جنس کا آدمی ہے۔

"سر!" — ورما نے سارا واقعہ سُنا کر کہا — "اس طرح یہ معاملہ چیف تک اور چیف سے آپ تک پہنچ گیا۔ میں ابھی عزیز کے گھر میں سُنا ہی رہا تھا کہ ہماری یہ چال کس طرح ناکام ہوگئی ہے کہ آپ کا بلاوا آگیا۔ ہم ابھی یہ سوچ ہی نہیں سکے تھے کہ آپ کو کس طرح یا کس وقت یہ ساری بات سناتی جاتے۔"

"اب تمہاری راتے کیا ہے؟" — میجر بھاٹیہ نے ورما سے پوچھا — "کیا لڑکی وہاں ہے یا نہیں یا وہاں تھی اور غائب کر دی گئی یا وہ کوئی اور لڑکی تھی جو اُن لوگوں کی رشتہ دار ہو سکتی ہے؟"

"سر!" — عزیز نے جواب دیا — "میری بہن نے جو نشانیاں بتاتی تھیں وہ ہماری ہی لڑکی کی معلوم ہوتی ہیں۔ تین نشانیاں تو بالکل نمایاں تھیں" — عزیز نے اِن نشانیوں کو واضح کیا۔

"میرا خیال ہے تم دونوں کو مزید ٹریننگ کی ضرورت ہے" — بھاٹیہ نے کہا — "لڑکی کو اغوا کیا گیا ہے۔ کیسے کیا گیا ہے، یہ ہم نہیں جانتے اگر لڑکی اسی گھر میں تھی یا ہے تو اُسے باقاعدہ قید میں رکھا گیا ہوگا۔ تمہاری بہن نے تمہیں بتایا تھا کہ لڑکی نے خود دروازہ کھولا اور ہاشمی کی بیوی کے ساتھ تمہاری بہن کے ساتھ بیٹھا دیکھ کر اُس نے دروازہ بند کر لیا۔ پھر تمہاری بہن نے یہ بتایا کہ لڑکی کچھ بولی ہی نہیں۔"

"سر! لڑکی کے نہ بولنے کی ایک اور وجہ بھی ہو سکتی ہے" — ورما نے کہا — "ہو سکتا ہے لڑکی کو کسی انجکشن یا ویسے ہی دواتی سے خاموش اور گم صُم رکھا گیا ہو۔"

"کیا ہاشمی پیشہ ور غنڈہ ہے؟" — بھاٹیہ نے پوچھا — "ہسٹری شیٹر ہے؟ جرائم پیشہ ہے؟"

"نہیں سر!" — عزیز نے جواب دیا — "وہ معزز آدمی ہے۔ معزز تو عبدالقدیر بھی ہے، لیکن اُس نے انٹیلی جنس میں بڑی لمبی سروس کی ہے اور مجھے یہ بھی بتایا گیا تھا کہ اس سے پہلے وہ پولیس میں ہیڈ کانسٹیبل رہ چکا ہے اور اس لائن میں اُس کا دماغ بہت ہی تیز ہے۔ آپ اس شخص کی سروس کا ریکارڈ دیکھ سکتے ہیں۔ وہ ہر ڈھنگ کھیل سکتا ہے۔"

"لڑکی کو اگر دواتیوں کے ذریعے خاموش رکھا گیا ہے تو بھی اُس کے کمرے کو کُھلا رکھنا میرے ذہن کے لئے قابلِ قبول نہیں" — میجر بھاٹیہ نے کہا۔

"یہ معلوم کیا جاتے کہ وہ لڑکی جو کوئی بھی تھی، گئی کہاں" — ورما نے کہا — "کسی طرح یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ کیا واقعی آگرہ سے ہاشمی کے ہاں ان کا کوئی عزیز اپنی بیٹی کو لے کر آیا تھا.... سر! میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ پولیس سٹیشن میں ہاشمی نے یہ بیان دیا تھا کہ اُس کے گھر میں کوئی جوان لڑکی نہیں آتی۔ اُس نے مجھے بھی یہی بتایا تھا۔"

"یہ معاملہ بڑا نازک سا ہے" — بھاٹیہ نے کہا — "ان لوگوں پہ مخبر چھوڑے جا سکتے ہیں، لیکن کمزور سے شک پر سوسائٹی کے کسی معزز آدمی کو مشتبہ قرار دے کر شاملِ تفتیش کرنا ٹھیک معلوم نہیں ہوتا۔ یہ بھی سوچو کہ یہ لوگ مسلمان ہیں۔ حکومت کی در پردہ پالیسی مسلمانوں کے متعلق جو کچھ بھی ہو، بظاہر پالیسی یہ ہے کہ مسلمانوں کو خوش رکھا جاتے۔ تم خود جانتے کہ الیکشن آ رہے ہیں اور کانگریس (آئی) مسلمانوں کے ووٹ ضائع نہیں کرنا چاہتی۔ اگر شک پختہ ہے تو پھر کوئی کارروائی کی جا سکتی ہے.... میں یہ

بھی کہوں گا کہ تم دونوں نے جلدی بازی سے کام لیا ہے۔ اگر لڑکی وہاں
تھی بھی تو اب وہاں نہیں ہوگی۔ ہمیں اتنا اختیار حاصل ہے کہ آدھی رات
کے وقت اُس مکان پر چھاپہ مار سکتے ہیں، لیکن حاصل کچھ نہ ہُوا تو مسلمان
اسے فرقہ وارانہ مسئلہ بنالیں گے اور اگر انہوں نے کوئی احتجاجی مظاہرہ
کیا تو ہندو مشتعل ہو کر اِس مسئلے کو اور زیادہ پیچیدہ بنا ڈالیں گے۔
پھر ہم سے باز پُرس ہوگی کہ ایسی کارروائی کیوں کی گئی جس کے لئے
زمین مضبوط نہیں تھی.... بہرحال مَیں چیف کو فون کرلوں تو ساری
صورتِ حال اُسے بتائیں گے۔"

میجر بھاٹیہ نے اپنے محکمے کے چیف کو فون کیا۔ چیف نے ان
تینوں کو اُسی وقت بلالیا۔ یہ ساری رُوداد اُسے سنائی گئی۔ بھاٹیہ نے
اپنی رائے دے کر چیف کو اپنا فیصلہ سُنایا۔

"ہاں بھاٹیہ!" ـــــ چیف جو ایک ہندو میجر جنرل تھا، کہنے لگا ـــــ
"میں تمہارے ساتھ اتفاق کرتا ہوں.... اور تم دونوں...." اُس نے
عزیز اور ورما سے کہا ـــــ "آئندہ ایسی کوئی کارروائی بھاٹیہ کی منظوری
کے بغیر نہ کرنا۔ مَیں تمہاری حوصلہ شکنی نہیں کر رہا۔ تم نے جس لگن سے اپنا
فرض ادا کیا ہے وہ یقیناً قابلِ تعریف ہے، لیکن اب خود سوچو کہ جن پر تمہیں
شک تھا وہ ہوشیار ہوگئے ہیں اور اگر لڑکی اُن کے پاس تھی تو اب تک
معلوم نہیں اُسے کہاں غائب کر دیا گیا ہوگا.... میجر بھاٹیہ! اُس آبادی
میں مخبروں کا انتظام کر دو۔ زیادہ تر نظر عبدالقدیر پر رکھی جاتے.... اور
اُس لڑکے کی کیا رپورٹ ہے؟.... کیا نام ہے اُس کا؟.... رابی؟....
پاکستانی ہتی.... والدین نے رب نواز نام رکھا تھا" ـــــ اُس نے طنزیہ مسکراہٹ
سے کہا ـــــ "پاکستان کے مولوی کہتے ہیں یہ اسلامی ملک ہے۔"

"وہ خوش ہے سر!" ـــــ بھاٹیہ نے کہا ـــــ "اُس کی کھوپڑی ہمارے
قبضے میں ہے۔ اُس کا ویزا ختم ہوگیا تھا۔ ہم نے مزید دنوں کا بندوبست کر
لیا ہے۔ وہ خوش ہے۔ اُسے صرف یہ پریشانی ہے کہ اپنی بیوی کے بغیر

واپس گیا تو اپنے والدین اور اپنی سوسائٹی کو کیا جواب دے گا۔ دو مرتبہ
خود ہی کہہ چکا ہے کہ لڑکی بدمعاش نکلی، انڈیا میں ایک اینگلو انڈین کے
ساتھ دوستی لگا کر انگلینڈ بھاگ گئی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سب اسے سچ
مان لیں گے کہ جیسی ماں پتن پتن کی پاپی تھی ویسی بیٹی نکلی۔"

"تم صرف یہ دیکھو کہ لڑکی مخالف کیمپ میں نہ پہنچ گئی ہو" ـــــ چیف
نے کہا ـــــ "اب تم جا سکتے ہو۔"

❁

اُس وقت جب عزیز اور ورما میجر بھاٹیہ کو اپنی کارگزاری سُنا رہے
تھے، زبیدہ خاوند کی دھتکاری ہوئی اپنے ماں باپ کے گھر پہنچی۔ اُس کی
آنکھیں اور ناک کی سُرخی بتا رہی تھی کہ وہ روتی رہی ہے۔ اُس کا رنگ اُڑا
ہُوا تھا۔ اُس کا باپ ادریس احمد کسی کمرے میں تھا۔ زبیدہ اپنی ماں کے
پاس جا بیٹھی۔ ماں نے اُس کا چہرہ دیکھتے ہی پوچھا کہ اُسے کیا
ہُوا ہے۔

جو ہُوا تھا وہ زبیدہ نے من و عن سُنا دیا۔

"تُو نے اِس بھاتی پر اعتبار کیوں کیا؟" ـــــ ماں نے زبیدہ سے پوچھا
ـــــ "یہ تو وہ موا ہاشمی پہلے ہی تیرے ابا کو بتا چکا ہے کہ عزیز ہندوستان
کا جاسوس ہے۔ مَیں نے یہ بات عزیز کو بتا دی۔ اب عزیز ہاشمی کے پیچھے
پڑ گیا ہے۔"

"یہ تب مجھے ہاشمی کے گھر میں پتہ چلا کہ عزیز ہندوؤں کا جاسوس ہے"
ـــــ زبیدہ نے کہا ـــــ "سکھ تھانیدار نے مجھ سے پوچھا تھا کہ تم بھی انڈیا
کی جاسوس ہو؟.... عزیز نے مجھے کہا تھا کہ اُس کے ایک پاکستانی دوست
کی بیوی لاپتہ ہوگئی ہے اور اُس کا سراغ لگانا ہے۔ مَیں تو بھاتی کے پیار
کی خاطر ذلیل ہوئی۔"

"اگر یہ ذلت اندر خانے رہتی تو کڑوا گھونٹ سمجھ کر حلق سے اُتاری
جا سکتی تھی" ـــــ ماں نے کہا ـــــ "لیکن یہ بات تو کوٹھوں چڑھی اور تھانے
بھی چڑھی۔ ہاشمی کے سارے محلے کو یہ واردات معلوم ہوتی اور اب

سارے شہر میں پھیلے گی۔ اللہ ہی جانے کہ ہاشمی اور عزیز کی آپس میں کیا دشمنی ہے۔"

"مجھے بتاؤ امّی!"——زبیدہ نے کہا——"مَیں کیا کروں؟ ابّاجان کو پتہ چلا تو...."

"وہ کمرے میں لیٹے ہُوتے ہیں"——زبیدہ کی ماں نے کہا——"آہستہ سے نکل جا اور عزیز کو بتا کہ تُو اُس بہن کو بھی دھوکہ دینے سے نہیں ٹلا جو تجھے ماں سے زیادہ پیار کرتی ہے اور یہ بھی اُسے کہہ کہ مَیں اس عمر میں طلاق لے کر کہاں جاؤں؛ تیرے باپ کو پتہ چلے گا تو کیا وہ مر نہیں جاتے گا؟ اس بیٹے نے تو ہمیں جیتے جی مار ڈالا ہے۔"

"وہ رہتا کہاں ہے؟"——زبیدہ نے پوچھا——"اُس نے مجھے اتنا ہی بتایا ہے کہ وہ مکان بنا رہا ہے۔ اُس کا ٹیلی فون نمبر میرے پاس ہے۔ کل پرسوں اُس نے مجھے ایک اور نمبر دیا تھا۔ کہتا تھا کہ دونوں میں سے کسی نمبر پر فون کر لینا۔"

ماں کو ایسے غم میں چھوڑ کر جیسے گھر کا کوئی فرد مر گیا ہو، زبیدہ دبے پاؤں گھر سے نکل گئی۔ اُس کے باپ کو پتہ ہی نہ چلا کہ زبیدہ آئی تھی۔ وہ اپنی ایک ملنے والی کے ہاں گئی۔ وہاں ٹیلی فون موجود تھا۔ اُس نے عزیز کے پہلے دیتے ہوئے نمبر پر فون کیا تو جواب ملا کہ عزیز گھر نہیں ہیں۔ زبیدہ نے پوچھا کہ یہ کونسی جگہ ہے تو اُدھر سے جواب ملا کہ یہ صرف عزیز صاحب بتا سکتے ہیں۔ فون بند ہو گیا۔

زبیدہ کو معلوم نہیں تھا کہ یہ عزیز کی کوٹھی کا نمبر ہے اور جس نے فون اٹھایا تھا وہ رابی تھا۔ عزیز نے رابی کو سختی سے کہہ رکھا تھا کہ اُس کی غیر حاضری میں باہر سے کسی کا بھی فون آتے تو صرف اتنی سی بات کرے کہ عزیز صاحب نہیں ہیں اور فون بند کر دے اور وہ کوٹھی کا ایڈریس کسی کو بھی نہ بتاتے۔

زبیدہ نے دوسرے نمبر پر فون کیا۔ یہ میجر بھاٹیہ کا نمبر تھا۔ کہیں سے

فون آتا تو بھاٹیہ کا پی اے سُنتا اور بھاٹیہ سے بات کرواتا تھا۔ زبیدہ نے جب اس نمبر پر فون کیا اُس وقت عزیز اور درما چیف سے فارغ ہو کر بھاٹیہ کے دفتر میں آ چکے تھے۔ بھاٹیہ کے پی اے نے اُسے بتایا کہ ایک عورت کا فون ہے جس نے اپنا نام زبیدہ بتایا ہے۔ عزیز نے لپک کر ریسیور لے لیا۔

زبیدہ نے عزیز کی آواز سُنتے ہی بولنا شروع کر دیا۔

"مجھے پتہ چل چکا ہے آپا!"——عزیز نے اُس کی بات کاٹتے ہوتے کہا——"مجھے عبدالرحمٰن سارا واقعہ سُنا چکا ہے۔"

"وہ عبدالرحمٰن نہیں"——زبیدہ نے بھڑک کر کہا——"وہ کافر ہندو ہے۔ وہ جاسوس ہے اور تم بھی ہندوؤں کے جاسوس ہو۔"

"میری بات سُن لو آپا!"——عزیز نے کہا——"تمہیں ہو کیا گیا ہے۔ میری تو...."

"تمہاری بلا سے مجھے کیا ہو گیا ہے"——زبیدہ نے روتے ہوتے کہا——"مجھے طلاق ہو گئی ہے۔ تمہارے بہنوئی (جمیل) کو بھی تھانے میں بلایا گیا تھا۔ سینکڑوں لوگوں نے تماشہ دیکھا۔ میرے خاوند نے سڑک پر کھڑے ہو کے مجھے کہا کہ یہیں سے اپنے ماں باپ کے ہاں چلی جاؤ، طلاق تحریری تمہیں مل جاتے گی۔ خاوند نے مجھے اور جو کچھ کہا، وہ کوئی غیرت والا بھائی سُنے تو ڈوب مرے۔"

"پھر تم نے کیا کیا اب؟"

"کرنا کیا تھا!"——زبیدہ نے جواب دیا——"مَیں گھر گئی۔ ابّاجان اپنے کمرے میں تھے۔ امّی جان کو یہ ساری خرافات سنائی۔ انہوں نے کہا کہ عزیز کو جا کر بتاؤ اور ابّاجان کو ابھی پتہ نہ چلنے دینا۔ مَیں وہاں سے آ گئی اور تمہیں فون کیا.... تم نے مجھے کس گناہ کی سزا دی ہے عزیز! تم جانتے ہو کہ اس گھر کے تم دھتکارے ہوتے آدمی ہو۔ صرف مَیں ہوں جس نے تمہیں گلے لگا رکھا ہے۔ جمیل صاحب کہہ کر چُپ ہو گئے تھے کہ اپنے اس

بھائی کو اس گھر میں نہ آنے دیا کرو، یہ لڑکا بہت بدنام ہوگیا ہے۔"

"میں سب ٹھیک کردوں گا آپا!" ـــــ عزیز نے کہا۔

"تم خاک ٹھیک کردو گے" ـــــ زبیدہ نے کہا ـــــ "تمہارا تو کوئی دین اور مذہب رہا ہی نہیں بعزت بے عزتی کا تمہیں کوئی احساس نہیں، مجھے بھی تم نے ذلیل کرڈالا ہے۔"

"آپا زبیدہ!" ـــــ عزیز نے کہا ـــــ "تمہیں طلاق نہیں ہوگی۔ تم نہیں سمجھ رہیں کہ یہ معاملہ کیا ہے ... تم کہاں سے فون کررہی ہو؟"

"نوشابہ کے گھر سے!" ـــــ زبیدہ نے جواب دیا ـــــ "تم اسے جانتے ہو۔"

"اس کا فون نمبر مجھے دے دو" ـــــ عزیز نے کہا ـــــ "اور میرے فون کا انتظار کرو۔"

زبیدہ نے فون نمبر دے دیا۔

عزیز نے ورما کو بتایا کہ اس کی بہن کو تو طلاق مل رہی ہے۔

"چلو باس سے بات کرتے ہیں" ـــــ ورما نے عزیز سے ساری بات سن کر کہا ـــــ "کوئی راستہ نکل آئے گا۔"

دونوں میجر بھاٹیہ کے دفتر میں چلے گئے اور عزیز نے اسے بتایا کہ اس کی بہن کو کیا سزا مل رہی ہے۔

"مشکل یہ پیش آگئی ہے سر!" ـــــ عزیز نے کہا ـــــ "ابھی میرے والد صاحب کو پتہ نہیں چلا۔ انہیں پتہ چلا تو ان کا ہارٹ بھی فیل ہو سکتا ہے۔"

"یہ تمہاری غلطی ہے" ـــــ بھاٹیہ نے کہا ـــــ "تمہیں اپنی بہن کو استعمال ہی نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"غلطی تو ہو چکی ہے سر!" ـــــ ورما نے کہا ـــــ "عزیز نے اور میں نے اپنے ذاتی مفاد کے لئے یہ خطرہ مول نہیں لیا تھا۔"

"میں نے تو اپنی بڑی بہن کی عزت داؤ پر لگا دی تھی سر!" ـــــ

عزیز نے کہا ـــــ "اب آپ کوئی مشورہ دیں، کوئی مدد کریں۔"

"تمہارا بہنوئی کیسا آدمی ہے؟" ـــــ بھاٹیہ نے پوچھا ـــــ "شریف ہے؟ بدمعاش ہے؟ امیر ہے؟ غریب ہے؟"

"فوڈ ڈیپارٹمنٹ میں بڑی اچھی پوسٹ پر ہے" ـــــ عزیز نے جواب دیا ـــــ "اپر مڈل کلاس کا شریف اور وضع دار آدمی ہے۔"

"بچے ہیں؟"

"ہیں سر!" ـــــ عزیز نے جواب دیا ـــــ "چار ہیں۔ سب سے بڑا لڑکا ہے۔ عمر پندرہ سولہ سال ہے۔ اس کے بعد دو لڑکیاں ہیں اور ان کے بعد دو اڑھائی سال عمر کا ایک لڑکا ہے۔"

"کیا اس آدمی کے آگے ہتھیار ڈالنے کی بجائے تم اس سے ہتھیار ڈلوا نہیں سکتے؟" ـــــ بھاٹیہ نے کہا ـــــ "کیا تم اس کا طریقہ نہیں جانتے؟"

"جانتا ہوں سر!" ـــــ عزیز نے کہا ـــــ "کوئی اور ہوتا تو میں آپ سے مشورہ نہ لیتا۔ وہ میرا بہنوئی ہے۔ اس پر یہ نسخہ آزمانا اچھا نہیں لگتا۔ کام کوئی مشکل تو نہیں۔"

"یہ نسخہ اچھا نہیں لگتا تو بہن کو طلاق دلوا لو" ـــــ بھاٹیہ نے کہا ـــــ "اس کے گھر نہیں جانا چاہتے تو یہیں سے فون پر بات کرلو۔"

"اس کے گھر فون نہیں ہے" ـــــ عزیز نے کہا ـــــ "میں اس کے گھر چلا جاتا ہوں۔"

"عزیز بھائی!" ـــــ ورما نے کہا ـــــ "میں تمہارے حالات جانتا ہوں۔ اپنے خاندان سے تمہارے تعلقات کبھی کے ختم ہوچکے ہیں۔ تم کوئی نیک نام آدمی بھی نہیں ہو۔ تمہارا باپ تمہاری کوٹھی میں آیا تھا۔ اس نے وہاں جو کچھ دیکھا اور جس ردعمل کا اظہار کیا اور جس طرح چلا گیا تھا وہ مجھے معلوم ہے۔ صرف یہ بہن ہے جو اب بھی تم سے محبت کرتی ہے اور اس نے تمہارے کہنے پر اپنی عزت اور اپنی ازدواجی زندگی بھی قربان کردی ہے۔ تم تو جرأت والے ہو۔ عقل والے ہو۔ چلو میں تمہارے

ساتھ چلتا ہوں۔"

"تم نہیں!" — بھاٹیہ نے کہا — "تم ہی تو اس کی بہن کے ساتھ تھے اور تمہیں عزیز کے بہنوئی نے پولیس سٹیشن میں دیکھا تھا.... میرا خیال ہے بلراج کو ساتھ لے جاؤ۔ وہ شکل وصورت اور ڈیل ڈول سے بھی غنڈہ لگتا ہے اور باتیں بھی غنڈوں جیسی کرتا ہے۔"

"معافی چاہتا ہوں سر!" — ورما نے کہا — "صرف غنڈہ گردی نہ کی جاتے۔"

"وہ مَیں جانتا ہوں" — عزیز نے کہا — "دوسرا کام میں خود کرلوں گا۔"

"اگر وہ کسی طرح بھی نہ مانے تو مجھے بتانا" — میجر بھاٹیہ نے کہا — "مَیں اُس کے ڈیپارٹمنٹ سے کہہ کر یہ کام کرا دوں گا.... جاؤ بلراج کو ساتھ لے جاؤ۔"

میجر بھاٹیہ کے دفتر سے نکل کر عزیز نے ورما سے کہا کہ وہ بلراج کو بلا لاتے اور خود اُس نے فون کا وہ نمبر ملایا جو اُسے زبیدہ نے دیا تھا۔

زبیدہ اپنی ملنے والی عورت نوشابہ کے گھر عزیز کے فون کے انتظار میں بے تاب ہو رہی تھی۔ آخر فون کی گھنٹی بجی۔ زبیدہ ریسیور پر لوٹ پڑی۔

"تم ایسے کرو آپا!" — عزیز بول رہا تھا — "فوراً اجمیری گیٹ کے باہر پہنچ جاؤ۔ مَیں آرہا ہوں۔ ڈرو گھبراؤ نہیں آپا! مَیں سب ٹھیک کرلوں گا اور تمہاری غلط فہمیاں بھی دُور کردوں گا۔"

سورج غروب ہو چکا تھا۔ زبیدہ اجمیری گیٹ کے باہر کھڑی عزیز کا انتظار کر رہی تھی۔ اُس کی تو جان پہ بنی ہوتی تھی۔ دماغ چکی کی طرح چل رہا تھا۔ ایک دوسری کے پیچھے کتنی سوچیں آئیں، بہت خیال آتے۔ یہ سب سوچیں اور خیال دماغ کی چکی میں پستے گئے۔ زبیدہ کسی بھی فیصلے پر نہ پہنچ سکی۔ اُسے اپنے بچے یاد آرہے تھے۔ ساتھ یہ خیال پریشان کر رہا تھا کہ گھر میں ہانڈی روٹی کس نے کی ہوگی۔ بڑی لڑکی کی عمر ابھی تیرہ

سال نہیں ہوتی تھی۔ وہ ابھی کھانا پکانا نہیں جانتی تھی۔

یہ سوچ کر اُسے کچھ اطمینان ہُوا کہ اُس کا خاوند ہوٹل سے کھانا لے آتے گا مگر چھوٹا بچہ یاد آیا تو ذرا سا جو اطمینان آیا تھا وہ غائب ہوگیا اور زبیدہ کا دل تڑپنے لگا۔ بچّہ رو رہا ہوگا۔ رات سوتے گا نہیں۔

زبیدہ ایک فیصلے پر پہنچ گئی — "عزیز کچھ دیر اور نہ آیا تو اپنے بچوں کے پاس چلی جاؤں گی۔ خاوند کے قدموں میں سر رکھ دوں گی۔"

اِس فیصلے نے اُسے کچھ سکون دیا مگر یہ سکون بھی قائم نہ رہا۔ اُسے ایک قہقہہ سا سنائی دیا۔ یہ اُس کے ضمیر کا قہقہہ تھا۔ زبیدہ اجمیری گیٹ کے اندر جانے والی سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر کھڑی تھی۔ شام گہری ہو چکی تھی۔ لوگوں کا ریلا اُس کے آگے اور پیچھے سے گزر رہا تھا۔ زبیدہ کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے یہ لوگ جو اُس کے قریب سے گزر رہے تھے اُسے جانتے ہوں اور ایک دوسرے کو بتاتے جارہے ہوں کہ یہ عورت ایک شریف خاوند کی بے وفا بیوی ہے۔ خاوند سے جھوٹ بول کر پیسے لیتی اور اپنے آوارہ اور بدمعاش بھائی کو دیتی رہی ہے۔

یہ زبیدہ کا ضمیر تھا جو بول رہا تھا۔ جوانی میں زبیدہ نے بدچلنی سے بھی گریز نہیں کیا تھا۔ اُس کے خاوند نے اُسے تھانے کے باہر کہا تھا کہ وہ اُسے بڑی مشکل سے برداشت کرتا رہا ہے۔

زبیدہ ڈوب ڈوب کر اُبھر رہی تھی۔ اُسے ٹھنڈے پسینے آنے لگے تھے اور غشی کی سی کیفیت طاری ہو رہی تھی کہ ایک ٹیکسی اُس کے سامنے رُکی۔ اس میں سے عزیز نکلا۔

"آؤ آپا!" — عزیز نے کہا — "گاڑی میں بیٹھو۔"

زبیدہ ٹیکسی کی طرف دوڑ پڑی۔ عزیز نے اُسے اگلی سیٹ پر بٹھا کر دروازہ بند کیا اور ٹیکسی ڈرائیور کو بتایا کہ کہاں چلنا ہے۔ وہ خود پچھلی سیٹ پر بیٹھا۔ اُس کے ساتھ ایک اور آدمی تھا۔

جمیل اپنے لئے اور بچّوں کے لئے بازار سے کھانا لے آیا تھا۔ بچّے کئی بار پوچھ چکے تھے کہ امّی جان کہاں ہیں اور جمیل انہیں بتاتا کہ ان کی امّی اپنی امّی کے پاس چلی گئی ہے، کل آجائے گی۔ سب سے چھوٹا بچّہ دو اڑھائی کا تھا اور اس سے بڑی بچی چھ سال کی تھی۔ ان دونوں بچّوں نے رو رو کر اپنا بُرا حال اور باپ کو پاگل کر دیا تھا۔ سب سے بڑا لڑکا جو پندرہ سولہ سال کا تھا، باپ سے کہہ چکا تھا کہ وہ نانا ابا کے گھر جا کر امّی کو بلا لاتا ہے لیکن جمیل نے اُسے بڑے پیار سے کہا تھا کہ تمہاری امّی آجائے گی۔

جب عزیز نے جمیل کے دروازے پر دستک دی اُس وقت تک بچّوں نے جمیل کو ادھ مؤا کر دیا تھا۔ جمیل نے بچّوں کی ماں کو طلاق دینے کا اور بچّوں کو اپنے پاس رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا، لیکن شام تک وہ صرف اس فیصلے پر قائم تھا کہ زبیدہ کو طلاق دے گا۔ بچّوں کے متعلق وہ سوچ میں پڑ گیا تھا۔ اُس نے ایک صورت یہ سوچی تھی کہ انہیں بھی زبیدہ کے ساتھ بھیج دے اور ماہوار خرچ دے۔ وہ بڑے لڑکے کو اور اس سے چھوٹی لڑکی کو جو بارہ تیرہ سال کی تھی، اپنے پاس رکھ سکتا تھا۔ دوسری صورت دوسری شادی تھی اور ایک صورت اُس کے ذہن میں یہ بھی آتی تھی کہ ایسی نوکرانی رکھ لے جو بچّوں کو بھی اور باورچی خانہ بھی گھر کی عورت کی طرح سلیقے سے سنبھال لے۔

اُسے زبیدہ کے باپ کا انتظار تھا۔ ادریس احمد شریف آدمی تھا۔ جمیل کو توقع تھی کہ زبیدہ اُسے بتائے گی کہ خاوند نے اُسے طلاق دے دی ہے تو وہ دوڑا آئے گا لیکن رات ہو گئی تھی، وہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ادریس احمد نے اپنی بیٹی کو مطلقہ کے طور پر قبول کر لیا تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی تو جمیل سمجھا کہ زبیدہ کا باپ آیا ہے۔ زبیدہ کی ماں کا ساتھ ہونا بھی متوقع تھا۔

"امّی جان آگئیں"۔۔۔ دو تین بچّوں نے مل کر نعرہ لگایا۔

جمیل دروازہ کھولنے گیا تو دو بچے بھی باپ کے پیچھے چلے گئے۔ دروازہ کھلا تو ایک بار پھر بچّوں نے ۔۔۔ "امّی جان!" ۔۔۔ کا نعرہ لگایا۔ باقی بچے بھی

دوڑے گئے۔ انہوں نے پُرمسرّت ہنگامہ بپا کر دیا لیکن جمیل کا مزاج برہم ہو گیا۔ وہ زبیدہ کو دیکھ کر خوش نہ ہُوا۔ اگر زبیدہ اکیلی آتی تو جمیل کا ردِعمل کچھ اور ہوتا۔ وہ برہم ہی ہوتا لیکن زبیدہ کے ساتھ عزیز اور ایک اجنبی کو دیکھ کر جمیل آگ بگولہ ہو گیا۔ اُس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ عزیز اور اُس کے ساتھی کو خوش آمدید کہنے پر آمادہ نہیں ہو سکے گا۔

چند سیکنڈ اِن کے درمیان خاموشی طاری رہی۔ عزیز جمیل کا ردِعمل دیکھنا چاہتا تھا۔ اُس نے جمیل کا چہرہ پڑھ لیا۔ چہرے کے تاثرات ٹھیک نہیں تھے۔ عزیز نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھ کر جمیل سے بغلگیر ہو گیا۔

"میرے بھائی جان!"۔۔۔ عزیز نے جمیل کو اپنے بازوؤں میں بھینچ کر جذباتی لہجے میں کہا۔۔۔ "آپ کی تو صورت کو ترس گیا ہوں۔ واللہ مُدّت گزر گئی ہے۔"

اتنی دیر میں زبیدہ اپنے بچّوں کے ساتھ اندر چلی گئی تھی۔ یہی عزیز کا مقصد تھا۔ اُسے ڈر تھا کہ جمیل زبیدہ کو اپنے گھر میں داخل نہیں ہونے دے گا۔

عزیز نے جمیل کو چھوڑا۔ اُس کے ساتھ جو آدمی تھا۔ وہ ہندو تھا اور اُس کا نام بلراج تھا۔

"بھائی جان!"۔۔۔ عزیز نے بلراج کی طرف اشارہ کر کے کہا۔۔۔ "اِن سے ملیے۔ یہ ہیں میرے دوست، میرے محسن، تابش اجمیری۔ باغ و بہار شخصیت ہیں۔"

بلراج نے اپنا دایاں ہاتھ اس طرح جمیل کی طرف کیا کہ جمیل کے نہ چاہتے ہوئے بھی اُس نے جمیل کا ہاتھ پکڑ لیا اور بڑے جوش و خروش سے مصافحہ کیا۔ جمیل نے ابھی انہیں نہیں کہا تھا کہ آئیے، اندر تشریف رکھئے۔ عزیز کو غالباً احساس تھا کہ جمیل اُنہیں اندر آنے کے لئے نہیں کہے گا۔ اُس نے جمیل کو ایک بار پھر اپنے ایک بازو کے گھیرے میں لے لیا اور پیار و محبت کا اظہار کرتے ہوئے اُسے آہستہ آہستہ دھکیلتا دروازے کے اندر لے گیا۔ بلراج اِن دونوں کو دھکیلتا اُن کے پیچھے مکان میں

داخل ہُوا۔ جمیل آخر شریف آدمی تھا، اُس نے دونوں کو بیٹھنے والے کمرے کی طرف لے جاکر اندر چلنے کو کہا۔

"عزیز میاں!"— جمیل نے کہا — "میں تمہارے ساتھ الگ بات کرنا چاہتا ہوں۔ تابش اجمیری صاحب سے معذرت چاہوں گا۔"

"تابش صاحب میرے لئے ایسے ہی ہیں جیسے آپ ہیں بھائی جان!" — عزیز نے کہا — "آپ ان کی موجودگی میں بات کریں۔ مجھے معلوم ہے آپ کیا بات کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں بھی معلوم ہے۔ آپا زبیدہ نے مجھے ساری بات بتادی ہے اور زبیدہ نے جو کچھ کیا ہے وہ میرے کہنے پر کیا ہے اور صرف میں جانتا ہوں کہ یہ سب کیا تھا۔ آپ کا ردِ عمل یہی ہونا چاہئے تھا جس کا اظہار آپ نے کیا ہے۔"

"دیکھو میاں!"— جمیل نے کہا — "تم بھول گئے ہو کہ زبیدہ تمہاری بہن ہے، لیکن میں نہیں بھول سکتا کہ یہ میری بیوی ہے، میرے بچوں کی ماں ہے۔ تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ زبیدہ نے جو ناٹک کھیلا ہے یا تم نے اسے استعمال کیا ہے، اگر جائز ہے تو بھی اسے چاہئے تھا کہ مجھے پہلے بتادیتی۔ میرا خیال ہے کہ تم مجھے یہ یقین دلانے آئے ہو کہ زبیدہ نے جو کیا ٹھیک کیا ہے لیکن اس واقعہ سے جو انکشاف ہوتے ہیں اور پولیس سٹیشن میں پولیس انسپکٹر نے جو باتیں بتائی ہیں وہ کوئی عزت مند مسلمان برداشت نہیں کرسکتا۔"

"یہی تو میں آپ کو بتانے آیا ہوں بھائی جان!"

"تابش صاحب!"— جمیل نے عزیز کی بات سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے بلراج سے کہا — "معلوم نہیں آپ کو یہ واقعہ پوری طرح معلوم ہے یا نہیں۔ اس شخص نے میری بیوی کو ایک ہندو کے ساتھ ایک باوقار آدمی کے گھر برقعے میں لپیٹ کر بھیج دیا۔"

"جمیل صاحب!"— بلراج نے کہا — "میں یہ سارا واقعہ جانتا ہوں۔ مَیں عزیز صاحب کے ساتھ اسی لئے آیا ہوں کہ آپ کی غلط فہمی

رفع کی جائے۔ مَیں آپ کو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جسے آپ نے باوقار اور نہ جانے کیا کچھ سمجھ رکھا ہے، وہ اصل میں یعنی اندر سے کچھ اور ہے۔ میں بھی مسلمان ہوں اور الحمدللہ صرف نام کا مسلمان نہیں ہوں بلکہ صحیح معنوں میں مسلمان ہوں۔ آپ کے باوقار دوست جناب فرید الدین ہاشمی صاحب مسلمانوں کی جڑیں کاٹ رہے ہیں۔ یہ ہم آپ کو دو چار روز بعد بتائیں گے۔ آپ اپنا گھر نہ اُجاڑیں۔"

جمیل عزیز کو اچھی طرح جانتا تھا اور اپنی بیوی کے اخلاق سے بھی اچھی طرح واقف تھا۔ ہاشمی کو تو وہ بہت ہی اچھی طرح جانتا تھا۔ پھر اُس نے تھانے میں سکھ تھانیدار کی باتیں سُنی تھیں اور پھر اتنی بڑی واردات کو تھانے میں ہی رفع دفع ہوتے دیکھا تھا۔ وہ تسلیم نہیں کرسکتا تھا کہ عزیز اور اُس کا ساتھی تابش اجمیری جو دراصل بلراج نام کا ہندو تھا، سچ کہہ رہے ہیں۔

"کیوں عزیز!"— جمیل نے پوچھا — "تم مجھے کس طرح یقین دلا سکتے ہو کہ جو کچھ ہُوا ہے یہ جائز تھا اور یہ یہاں کے مسلمانوں کے حق میں ہُوا ہے۔ میں شاید تمہاری کسی بھی بات پر اعتبار نہیں کرسکوں گا۔"

"آپ کچھ روز انتظار کریں بھائی جان!"— عزیز نے کہا۔

"پھر یوں کرو"— جمیل نے کہا — "کچھ دنوں کے لئے اپنی بہن کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ جب مجھے یقین دلا دو گے کہ یہ واردات کسی بڑے اچھے مقصد کے لئے کی گئی تھی تو....."

یہاں سے عزیز اور جمیل کے درمیان تلخ کلامی شروع ہوگئی۔ عزیز نے زبان کا جادو چلانے کی بہت کوشش کی لیکن جمیل پر اس کا کچھ اثر نہ ہُوا۔ جمیل جانتا تھا کہ چرب زبانی ہی عزیز کا اصل کمال ہے جس سے وہ پتھر سے بھی دُودھ نکال سکتا ہے۔ جمیل نے اپنا آخری فیصلہ سنا دیا۔

"اپنی بہن کو یہاں سے لے جاؤ"— جمیل نے عزیز سے کہا — "جس روز مجھے یقین دلا دو گے کہ تم انڈیا کے جاسوس نہیں ہو اُس روز میں خود جاکر والد صاحب سے معافی مانگوں گا اور تمہاری بہن کو لے آؤں گا اور

تم سے بھی معافی مانگوں گا۔"

"جمیل صاحب!" — بلراج نے کہا — "آپ عزیز کو قابلِ اعتماد آدمی نہیں سمجھتے تو مجھے بھی شریف آدمی نہ سمجھیں۔ مَیں آپ سے سیدھی بات کروں گا۔ عزیز کی بہن کو اپنے گھر میں رہنے دیں۔ اگر آپ نے ہماری بات نہ مانی تو آپ کو ایسا نقصان پہنچے گا جس کی تلافی نہیں ہو سکے گی۔"

"بھائی جان!" — عزیز نے کہا — "یہ میری شرافت ہے کہ میں آپ کو ابھی تک بھائی جان کہہ رہا ہوں۔ آپ مجھے انڈیا کا جاسوس کہہ رہے ہیں۔ اس کو سچ سمجھیں اور سوچیں کہ جو شخص انڈین انٹیلی جنس میں ہے وہ کیا کچھ کر سکتا ہے۔"

"یہ مت بھولو جمیل بھائی!" — بلراج نے کہا — "کہ تم مسلمان ہو اور یہاں کی حکومت کو مسلمان کے خلاف براتے نام بہانہ چاہیئے۔ آپ جس محکمے میں ہیں اُس محکمے سے آپ کو بڑی آسانی سے نکلوایا جا سکتا ہے۔ اگر آپ پھر بھی اپنے فیصلے سے باز نہیں آئیں گے تو آپ کا چھوٹا یا بڑا بیٹا اغوا ہو سکتا ہے۔"

"یہ کیا بکواس ہے عزیز!" — جمیل نے سخت غصیلی آواز میں کہا — "تم دونوں مجھے ڈرانے دھمکانے کے لئے آئے ہو؟"

"ہاں بھائی جان!" — عزیز نے مسکراتے ہوئے کہا اور اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اُس نے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا — "لاتوں کے بھُوت باتوں سے نہیں مانا کرتے۔"

عزیز کا ہاتھ جب اُس کی پتلون کی جیب سے نکلا تو اُس کے ہاتھ میں ویسا ہی پستول تھا جو ورما سے ہاشمی کے گھر میں چھینا گیا تھا۔ بلراج بھی اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اُس کے ہاتھ میں خنجر تھا۔

جمیل نے اتنی قریب سے نہ کبھی پستول دیکھا تھا نہ خنجر اور کبھی اس صورتِ حال سے بھی دوچار نہیں ہُوا تھا جو عزیز اور بلراج نے اس کے لئے پیدا کر دی تھی۔ ایک طرف سے میگزین والا پستول اور دوسری طرف سے خنجر اُس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جمیل پر سکتے کی سی کیفیت طاری

ہو گئی۔ اُس میں اتنی ہمت بھی نہ رہی کہ اُٹھ کھڑا ہوتا۔

"آپا زبیدہ یہیں رہے گی" — عزیز نے آنکھیں اُس کی آنکھوں میں ڈال کر اور پستول کی نالی اُس کے مُنہ کے قریب کر کے کہا — "اور آپ اُس سے کچھ نہیں پوچھیں گے ورنہ آپ کا انجام بڑا ہی بھیانک ہو گا۔"

"وعدہ کریں کہ ہماری بات پر عمل ہو گا" — بلراج نے خنجر کی نوک جمیل کی گردن کے ساتھ لگا کر کہا۔

جمیل نے وعدہ کیا کہ ایسے ہی ہو گا جیسے اُنہوں نے کہا ہے۔ عزیز اور بلراج کمرے سے نکل گئے۔

عزیز اور بلراج کمرے سے نکل گئے۔ جمیل کی ذہنی حالت ایسی
ہوگئی جیسے اُن دونوں کے ساتھ جمیل کی رُوح بھی نکل گئی ہو۔ اُس پر سکتے
کی سی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ آنکھیں ٹھہر گئی تھیں۔ اُس میں صرف اتنی
سی ہمت رہ گئی تھی کہ اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس سے آگے وہ کوئی حرکت نہ کر سکا تھا۔
ساتھ والے کمرے میں بچوں نے ہنگامہ بپا کر رکھا تھا۔ اُن کی ماں سارا
دن گھر سے غیر حاضر رہی تھی۔ وہ ماں کے آنے کی خوشی میں اودھم مچا رہے
تھے۔ باپ کو وہ بھول گئے۔

بچوں کا شور و غل جمیل کے کانوں سے ٹکرا رہا تھا، لیکن ایسے جیسے
طوفانی ہوائیں کسی چٹان سے ٹکرا رہی ہوں۔ جمیل بے حس و حرکت کھڑا تھا۔
اُس کے ساتھ جو سلوک ہُوا وہ غیر متوقع تھا۔ اس نے تو بڑی جرأت سے
فیصلہ کیا تھا کہ زبیدہ کو طلاق دے دے گا اور کسی قیمت پر اُسے واپس
نہیں لائے گا۔ اُسے عزیز احمد کے متعلق کوئی خوش فہمی نہیں تھی لیکن اُسے
یہ توقع بھی نہیں تھی کہ عزیز اُس کے ساتھ ایسی غنڈہ گردی کرے گا جو وہ
کر گیا تھا۔

جمیل کو وقت کا احساس نہ تھا۔ اُس کے لئے وقت پر بھی سکتہ طاری
ہوگیا تھا۔ ایک دوسرے کے پیچھے گزرتے لمحے اُسی مقام پر رُک گئے
تھے جہاں جمیل کھڑا تھا۔

کم و بیش ایک گھنٹہ گزر گیا۔

ساتھ والے کمرے میں بچوں کا ہنگامہ ختم گیا تھا۔ وہ باپ کو تو جیسے
بھول ہی گئے تھے لیکن زبیدہ ان کے باپ کو نہیں بھولی تھی۔ اُس کا
دھیان اُس کمرے کی طرف تھا جس میں جمیل کھڑا تھا۔ زبیدہ کو معلوم نہ تھا کہ
جمیل کھڑا ہے، بیٹھا ہے یا کس حالت میں ہے۔ وہ فوراً معلوم کرنے کو بے تاب

ہو رہی تھی کہ اُس کے بھائی عزیز نے اُس کے خاوند جمیل کو راضی کر لیا ہے
یا جمیل ابھی تک طلاق کے فیصلے پر ڈٹا ہُوا ہے۔ زبیدہ یہ سوچ سوچ کر
بھی پریشان ہو رہی تھی کہ اُس کے بھائی اور خاوند کی لڑائی نہ ہو جائے۔
اُسے جب خیال آتا تھا کہ اُس کا خاوند شریف آدمی ہے اور عزیز کا شرافت
کے ساتھ دُور پار کا بھی تعلق نہیں تو وہ اور زیادہ پریشان ہو جاتی تھی۔ وہ
جانتی تھی کہ عزیز اکھڑ طبیعت کا آدمی ہے، اگر جمیل نے اُس کی بات کو
رَد کر دیا تو عزیز بدتمیزی پر اُتر آئے گا۔

زبیدہ بچوں سے پریشانی اور اضطراب چھپا رہی تھی اور بچوں کو
سُلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

اُسے جب خیال آتا تھا کہ عزیز نے اُسے دھوکہ دے کر کتنا ذلیل کیا
ہے کہ اُسے تھانے تک پہنچا دیا ہے تو اُس کا جی چاہتا تھا کہ چیخ چیخ کر
روتے اور عزیز کو چوک میں کھڑا کر کے جُوتے مارے۔ عزیز نے یہ بھی نہ
سوچا تھا کہ اُس کی بہن کو دو چار دنوں کے لئے حوالات میں بند کیا جا سکتا تھا۔
اُسے جیل کی حوالات میں بھی بھیجا جا سکتا تھا۔

زبیدہ پر سب سے بڑی چوٹ تو یہ پڑی تھی کہ اُس کے خاوند نے
اُسے دھتکار دیا تھا اور معلوم نہ تھا کہ اُسے قبول کرے گا یا نہیں۔ وہ بظاہر
بچوں میں دلچسپی لے رہی تھی لیکن اندر سے وہ بڑی بُری کشمکش میں مبتلا تھی۔

ایک گھنٹہ گزر گیا تو وہ اُس دروازے کے ساتھ جا کھڑی ہوئی جو
ساتھ والے کمرے میں کُھلتا تھا۔ چھوٹے بچے سو گئے تھے۔ ساتھ والے
کمرے میں خاموشی تھی۔ ایک آدھ منٹ بعد زبیدہ نے نہایت آہستہ سے
ایک کواڑ کھولا اور کمرے میں جھانکا۔ اُسے جمیل اکیلا کھڑا نظر آیا۔ اُس کے
کھڑا ہونے کا انداز اور چہرے کا تاثر زبیدہ کے لئے نیا اور عجیب تھا۔ زبیدہ
نے جمیل کے ساتھ بائیس تیئیس سال گزارے تھے۔ اُس نے جمیل کو اس طرح
کھڑے اور چہرے پر یہ تاثر لئے ہوتے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

زبیدہ کو ایک خیال یہ آیا کہ عزیز اُسے ملے بغیر چلا گیا ہے۔

وہ کواڑ کو ذرا سا اور کھول کر اس کمرے میں آگئی اور آہستہ آہستہ جمیل تک پہنچی۔ جمیل یوں کھڑا رہا جیسے پتھر کا بُت ہو۔

زبیدہ نے اُس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

جمیل نے کوئی حرکت نہ کی۔

زبیدہ نے اُسے آہستہ سے جھنجھوڑا۔ جمیل نے بڑی آہستہ آہستہ گردن گھمائی اور زبیدہ کو دیکھا۔ اُس کے چہرے کے تاثر میں کچھ ایسی تبدیلی آئی جیسے وہ زبیدہ کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ زبیدہ اُسے دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ پریشان تو وہ پہلے ہی تھی لیکن جمیل کو اس کیفیت میں دیکھ کر اُس کی پریشانی میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔ اگر حالات نارمل ہوتے، زبیدہ سے یہ حرکت سرزد نہ ہوئی ہوتی جو وہ عزیز کے کہنے پر کر بیٹھی تھی تو جمیل کو وہ اپنے بازوؤں میں لے کر بٹھا دیتی یا اُسے پلنگ پر لٹا دیتی اور اُس سے پوچھتی کہ اُسے کیا ہوا ہے لیکن زبیدہ کے ضمیر پر ایک بڑے ہی گھناؤنے جُرم کا بوجھ تھا۔ وہ جمیل کا سامنا کرنے سے ڈر رہی تھی۔ اگر عزیز اُس کے ساتھ نہ آتا تو بھی وہ اس گھر میں داخل ہونے کی جرأت نہ کرتی حالانکہ یہ اُس کا اپنا گھر تھا، پھر بھی جمیل کی یہ حالت اُس سے دیکھی نہ گئی۔ وہ اتنا ہی سمجھ سکی کہ عزیز اس کے ساتھ بہت بُرا سلوک کر گیا ہے۔

جمیل کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں سرخی تھی اور آنکھوں میں خمار سا بھی تھا۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ وہاں نہیں جہاں کھڑا ہے۔ یہ خود فراموشی کی کیفیت تھی۔

زبیدہ نے اُس کے دونوں کندھوں پر اپنے ہاتھ رکھ کر آہستہ سے اُسے اُس صوفے پر بٹھا دیا جس کے ساتھ وہ کھڑا تھا۔

"کیا ہوا؟" — زبیدہ نے اُس پر جھک کر سرگوشی میں پوچھا۔

جمیل نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ زبیدہ کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے اُسے دیکھتا رہا۔

"کیا عزیز کوئی بدتمیزی کر گیا ہے؟" — زبیدہ نے پوچھا۔

"عزیز؟ ..... وہ ..... تمہارا بھائی!" — جمیل اس طرح بول رہا تھا جیسے زبان اُس کا ساتھ نہ دے رہی ہو۔ اُس نے کچھ اور کہنے کی کوشش کی لیکن اتنا ہی کہہ سکا — "وہ تمہارا بھائی نہیں ہو سکتا۔"

"یہ میری غلطی تھی کہ میں اُسے اپنا بھائی سمجھتی رہی" — زبیدہ نے کہا اور اس کے ساتھ ہی اُس کے آنسو نکل آئے۔ اُس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا — "مجھے اتنی سی اجازت دے دیں کہ میں آپ سے معافی مانگ لوں۔ میں نے آپ کو ہمیشہ پریشان رکھا ہے" — زبیدہ جمیل کے پاؤں میں بیٹھ گئی اور اپنے دونوں ہاتھ اُس کے پاؤں پر رکھ کر کہا — "میں نے آج سے عزیز کو اپنا بھائی سمجھنا چھوڑ دیا ہے۔ مجھے بات کرنے کی مہلت دیں۔ میں آپ کے تمام گلے شکوے دھو ڈالوں گی۔"

جمیل پر جو کیفیت طاری تھی، اُس میں ذرا سی بھی تبدیلی نہ آئی۔ وہ کبھی زبیدہ کو دیکھتا اور کبھی خلا میں گھورنے لگتا تھا۔

"بچے کہاں ہیں؟" — جمیل نے سرگوشی میں پوچھا۔ اُس کا انداز ایسا تھا جیسے خواب میں بڑبڑا رہا ہو۔ کہنے لگا — "میرے بچے کہاں ہیں؟"

"یہیں ہیں" — زبیدہ نے ذرا جاندار آواز میں کہا — "چھوٹے بچے سو گئے ہیں۔ بڑے بھی سونے والے ہیں۔"

جمیل یکلخت بیدار ہو گیا جیسے اُسے کوئی خطرہ نظر آ رہا ہو۔ اُس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ ایک کواڑ ذرا سا کھلا ہوا تھا۔ عزیز اور بلراج اسی دروازے سے نکل کر گئے تھے۔ اچانک جمیل اُٹھا اور دوڑ کر دروازہ بند کیا اور دونوں کواڑوں کی چٹخنیاں چڑھا دیں۔ پھر دروازے کے ساتھ پیٹھ لگا کر وہیں کھڑا رہا۔ زبیدہ نے جمیل کی یہ حرکت دیکھی تو اُس پر خوف وہراس جیسی کیفیت طاری ہو گئی۔ اُسے اب پتہ چلا کہ اُس کے خاوند کی ذہنی حالت صحیح نہیں۔ حقیقت بھی یہی تھی۔ عزیز اور بلراج اُسے جو دھمکی پستول اور خنجر دکھا کر دے گئے تھے وہ اس کے اعصاب برداشت نہیں کر سکے تھے۔

زبیدہ اُٹھی اور آہستہ آہستہ چلتی جمیل تک پہنچی۔

"کیا ہو گیا ہے آپ کو؟" ــــ زبیدہ نے اُس سے پوچھا ــــ "کیا آپ میری کوئی بات نہیں سُن رہے؟"

حقیقت یہی تھی کہ جمیل پر ایسی کیفیت طاری تھی کہ زبیدہ کی باتیں اُس کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں مگر وہ سُن نہیں رہا تھا۔ یہ غصّے، دہشت زدگی اور بے لبسی کی انتہا تھی جس نے جمیل کے دماغ کو ماؤف کر دیا تھا۔ ایک تو وہ پستول اور خنجر کے درمیان بے بس ہو گیا تھا اور دوسری وہ بے لبسی تھی جو بھارت کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھ دی گئی تھی۔ جمیل کو معلوم نہیں تھا کہ عزیز کے ساتھ جو آدمی تھا وہ ہندو تھا یا مسلمان۔ عزیز نے اُس کا تعارف تابش اجمیری کے نام سے کرایا تھا لیکن یہ نام غلط بھی ہو سکتا تھا۔

جمیل نے جب عزیز کے پستول اور بلراج کے خنجر کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا تھا تو اُسے پہلا خیال یہ آیا تھا کہ اِس ملک میں مسلمان کتنا بے بس ہے۔ عزیز اور بلراج اس لئے شیر ہو گئے تھے کہ وہ انڈین انٹیلی جنس میں تھے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر اور سوچ کر اُس کے ذہن میں ایک دھماکہ سا ہُوا تھا پھر اُس نے یوں محسوس کیا تھا جیسے وہ ریزہ ریزہ ہو گیا ہو اور پھر اُس پر یہ کیفیّت طاری ہو گئی جو زبیدہ کے لئے ناقابلِ فہم اور پریشان کُن تھی۔

زبیدہ جمیل کو بازو سے پکڑ کر صوفے کی طرف چلی تو جمیل ہپنا ٹائز کئے ہوتے آدمی کی طرح اُس کے ساتھ چل پڑا۔ زبیدہ نے اُسے لمبے صوفے پر بٹھایا اور اُس کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔

"مجھے کچھ بتائیں" ــــ زبیدہ نے اُس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا ــــ "خدا کے لئے کچھ بتائیں"۔

"وہ.... وہ کہتے ہیں...."

"کیا کہتے ہیں وہ؟" ــــ زبیدہ نے جمیل کو اُسی کیفیّت میں دیکھا تو جھنجھلا کر پوچھا ــــ "وہ کیا کہہ گئے ہیں؟" ــــ زبیدہ کی اپنی جذباتی حالت بگڑ گئی۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے سر پر مارے اور روتے ہُوتے بولی ــــ "اوہ میرے خدا! میرے گناہ معاف کرنا۔ یہ سزا مجھ سے برداشت نہیں ہو گی"۔

اس دوہتّڑ کے دھماکے سے جو زبیدہ نے اپنے سر پہ مارا تھا، جمیل بیدار ہو گیا۔ وہ چونک پڑا۔ اُس نے زبیدہ کی طرف دیکھا اور اُسے دیکھتے ہوتے آہستہ آہستہ اُٹھا۔

"میری آستین میں پلنے والی ناگن!" ــــ اُس نے زبیدہ سے کہا ــــ "اپنے بچوّں کو کھانے والی...."

"مجھے کوئی اور سزا دے لیں" ــــ زبیدہ نے روتے ہُوتے کہا ــــ "مَیں آپ کے ہاتھ سے زہر پی لوُں گی۔ اپنی زبان پر ایسی باتیں نہ لائیں۔ مَیں اپنے بچوّں کو اپنی جان دے دوں گی"۔

"اگر تم انہیں اپنے بچے سمجھتی ہو تو سنو" ــــ جمیل نے کہا ــــ "تمہارا بھائی مجھے دھمکی دے گیا ہے کہ مَیں نے تمہیں طلاق دی تو وہ میرے چھوٹے یا بڑے بچے کو اغوا کر لے گا.... کیا یہ تمہارے بچےّ نہیں ہیں؟ کیا یہ تمہارا بھائی ہے؟"

"کیا اُس نے آپ کو یہ دھمکی دی ہے؟" ــــ زبیدہ نے غم و غصّے کے لہجے میں پوچھا۔

"اُس نے یہ دھمکی مجھے پستول دکھا کر دی تھی" ــــ جمیل نے کہا ــــ "اُس کے ساتھ جو آدمی آیا تھا اُس نے خنجر نکال لیا تھا" ــــ اُس نے آہ بھری اور بولا ــــ "مَیں کتنا مجبور ہوں" ــــ اُس نے ہاتھ زبیدہ کے مُنہ کی طرف کر کے گرج کر کہا ــــ "مجھے مجبور تم نے بنایا ہے۔ میری عزّت اور شرافت کو تھانے میں جا کر خراب کیا ہے"۔

"آپ نے شاید میری بات نہیں سُنی" ــــ زبیدہ نے کہا ــــ "آپ نے دھیان نہیں دیا۔ میں نے کہا تھا کہ آج سے مَیں نے عزیز کو بھائی سمجھنا چھوڑ دیا ہے"۔

"فتح تمہاری ہے" ــــ جمیل نے کہا ــــ "یہ کلجگ ہے۔ یہ بدی کی فتح کا زمانہ ہے۔ یہ اپنا دین اور ایمان بیچنے والوں اور ہندوں کی عزّت

کے ساتھ کھیلنے والوں کا زمانہ ہے.... مَیں تمہیں طلاق نہیں دے سکتا۔ دُوں گا تو تمہارا بھائی مجھے بہت بُرے انجام تک پہنچاتے گا، لیکن زبیدہ! مجھے کوئی مجبور نہیں کر سکتا کہ اپنے دل میں تمہاری محبت پیدا کروں۔"

"وہ میں خود پیدا کر لوں گی" — زبیدہ نے کہا — "اب اپنے بھائی کے ساتھ مَیں جو سلوک کروں گی وہ آپ خود دیکھیں گے۔ مَیں آپ سے صرف یہ عرض کرتی ہوں کہ ایک بار سُن لیں کہ مجھ سے اتنا بڑا جرم میرے اپنے بھائی نے کس طرح کروایا ہے۔"

جمیل خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا۔

"آپ مجھ پر اعتبار کریں نہ کریں، مَیں آپ کو مجبور نہیں کر سکتی" — زبیدہ نے جمیل کے جواب کا انتظار کئے بغیر کہا — "عزیز نے مجھے بتایا تھا کہ اُس کا ایک دوست اپنی بیوی کے ساتھ آیا ہُوا ہے اور یہ نوجوان جوڑا ہے۔ لڑکی لاپتہ ہو گئی ہے اور سراغ ملا ہے کہ وہ ہاشمی کے گھر میں ہے۔ عزیز نے مجھے کہا کہ وہ اپنے ایک دوست کو جس کا نام عبدالرحمٰن ہے، میرے ساتھ ہاشمی کے گھر بھیجے گا۔ وہ لڑکی کو پہچانتا تھا لیکن پہلے ہاشمی کے گھر مجھے اکیلے جانا تھا۔"

"یہ روئیداد میں پہلے سُن چکا ہوں" — جمیل نے کہا — "میں حیران ہوں کہ تم نے یہ بھی نہ سوچا کہ فریدالدین ہاشمی شریف اور صاحبِ حیثیت ہیں، بزرگ ہیں اور وہ اس قماش کے آدمی نہیں کہ اغوا کی ہوئی کسی لڑکی کو اپنے گھر میں رکھیں۔ میں جانتا ہوں کہ تم نے اپنے بھائی کی محبت میں اندھی ہو کر یہ حرکت کی ہے لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ تم ذلت کی حدیں پھلانگ بھی سکتی ہو۔"

"مَیں آپ کو کیسے یقین دلاؤں کہ مجھے دو باتوں کا ذرا سا بھی علم نہیں تھا" — زبیدہ نے کہا — "ایک یہ کہ عزیز ہندوستان کا جاسوس ہے اور دوسری بات یہ کہ اُس نے میرے ساتھ ہاشمی کے گھر جس آدمی کو بھیجا تھا وہ ہندو ہے۔"

جمیل زبیدہ کی کوئی بات سننے کے لئے تیار نہ تھا لیکن بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔ زبیدہ اب اپنی پوزیشن جن الفاظ میں واضح کر رہی تھی وہ اُس کے دل کی گہرائیوں سے نکل رہے تھے۔ اُس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو گواہی دے رہے تھے کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے خلوصِ نیت سے کہہ رہی ہے۔

"تم اپنے بھائی سے قطع تعلق تو نہیں کر سکتیں" — جمیل نے کہا — "تم اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔"

"میرا کوئی بھائی نہیں" — زبیدہ نے کہا — "مَیں نے دل کو سمجھا لیا ہے کہ میرا بھائی مر گیا ہے.... مَیں صرف ایک بار اُسے ملوں گی۔ آپ ساتھ ہوں گے۔ اگر وہ یہاں آگیا تو آپ کے سامنے بات کروں گی پھر اُس کی کبھی صورت بھی نہیں دیکھوں گی۔"

جمیل پر زبیدہ کی باتوں نے اثر کیا اور اُس نے زبیدہ سے علیحدگی کا فیصلہ منسوخ کر دیا لیکن اُس پر عزیز اور بلراج جو اثرات مرتب کر گئے تھے، انہوں نے بھی بہت کام کیا تھا۔ وہ اپنے فیصلے میں آزاد نہیں رہا تھا۔

❦

اُسی رات اور اُسی وقت ہاشمی اور عبدالقدیر اُس گھر میں بیٹھے تھے جس گھر میں رشی کو رکھا گیا تھا۔ یہ حسن طارق رفیقی کا گھر تھا۔ وہ محاذ کا ممبر تھا۔

"راشدہ!" — ہاشمی نے رشی سے کہا — "تمہیں یہاں سے جانا پڑے گا۔"

"کہاں؟"

"اشوکا ہوٹل!" — ہاشمی نے کہا — "حالات ایسے ہو گئے ہیں کہ ہم تمہاری یہ خواہش پوری نہیں کر سکتے کہ تمہیں یہیں رکھا جاتا۔"

"کیا آپ مجھے سیدھا پاکستان نہیں پہنچا سکتے؟"

"چوری چھپے اور خفیہ طریقے سے پہنچا سکتے ہیں" — عبدالقدیر نے

جواب دیا — "لیکن اس میں خطرہ ہے۔ اگر تم پکڑی گئیں تو تمہیں گرفتار کر کے جیل بھجوا دیا جائے گا۔ دو خطرے تمہارے ساتھ چپکے ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ تم خوبصورت اور نوجوان ہو اور دوسرا خطرہ یہ کہ تم مسلمان ہو۔ تمہیں یہاں کی انٹیلی جنس کے حوالے کر دیا جائے گا۔ تم پر پہلا الزام یہ ہوگا کہ تم پاکستان کی جاسوس ہو۔ تمہارے ساتھ بہت بُرا سلوک ہوگا۔ بہتر ہے کہ اپنے خاوند کے پاس چلی جاؤ۔ پاکستان کو جانے کا یہی ایک ذریعہ ہے۔"

"میں اُسے کیا بتاؤں گی میں کہاں رہی ہوں؟"

"کیا تم ہماری نشاندہی نہیں کرنا چاہو گی؟" — عبدالقدیر نے پوچھا — "کیا اپنے خاوند اور پولیس کو نہیں بتاؤ گی کہ تمہیں کس طرح اغوا کیا گیا تھا؟"

"نہیں!" — رشی نے بغیر سوچے جواب دیا۔

"کیوں؟"

"میں آپ کے احسان کا بدلہ اسی طرح چکا سکتی ہوں" — رشی نے کہا — "مجھے تو کسی اور ہی سلوک کی توقع تھی لیکن آپ سب نے ....."

عبدالقدیر ایسا کچا آدمی نہیں تھا کہ رشی کی باتوں میں آجاتا۔ اُسے، ہاشمی اور رفیقی کو رشی کے خراجِ تحسین کی ضرورت نہیں تھی۔ رشی نے رہائی کے لئے ان لوگوں کی خوشامد ہی کرنی تھی۔ انہیں فرشتہ ثابت کرنا تھا۔ اُس کی یہ باتیں خلوص کی حامل بھی ہو سکتی تھیں لیکن اب مسئلہ اور معاملہ ہی کچھ اور ہو گیا تھا۔ اِس لڑکی کو اب وہاں نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ اُسے رہا کرنے کا خطرہ مول لینا ہی تھا۔

ہاشمی اور عبدالقدیر کا ایک دوست ایڈووکیٹ تھا۔ وہ اِن کا ہم خیال ہی نہیں بلکہ ان کے محاذ سے بھی واقف تھا۔ محاذ کا وہ باقاعدہ ممبر تو نہیں بنا تھا، لیکن محاذ کو اس کا ہر طرح کا تعاون حاصل تھا۔ اُسے بتا دیا گیا کہ ایک پاکستانی لڑکی کو اغوا کیا گیا ہے۔ اُس نے اِس خطرناک اقدام کو پسند نہیں کیا تھا۔ وہ احتیاط اور دور اندیشی کا قائل تھا۔ بہرحال اُس نے انہیں کچھ ہدایات

دی تھیں۔

اب رشی کو رہا کرنے کا وقت آیا تو ہاشمی اور عبدالقدیر اس ایڈووکیٹ کے ہاں گئے اور اُسے بتایا کہ لڑکی کو رہا کیا جا رہا ہے۔

"ہمیں یہ بتائیں" — عبدالقدیر نے اُس سے پوچھا — "اگر لڑکی ہماری نشاندہی کر دے تو کیا ہم قانون کی گرفت میں آ سکتے ہیں؟"

ایڈووکیٹ نے ان سے اس طرح سوال پوچھنے شروع کر دیئے جس طرح کسی مشتبہ یا ملزم سے تفتیش کی جاتی ہے۔ انہوں نے ہر سوال کا جواب تفصیل اور وضاحت سے دیا اور اُسے وہ باتیں بھی بتائیں جو اُس نے نہیں پوچھی تھیں۔ اُسے کچھ واقعات کا علم ہی نہیں تھا۔ مثلاً عبدالقدیر نے اُسے سنایا کہ کس طرح عزیز کی بہن ہاشمی کے گھر گئی اور رشی اُس کے سامنے ہو گئی پھر دوسرے روز عزیز کی بہن انٹیلی جنس کے ایک ہندو کو برقعے میں ہاشمی کے گھر لے گئی۔ عبدالقدیر نے یہ سارا واقعہ سنایا۔ ورما کی پٹائی سنائی اور تھانے میں جو کچھ ہُوا وہ سنایا۔

"پھر آپ محفوظ ہیں" — ایڈووکیٹ نے کہا — "ہندو نے حویلی کی خانہ تلاشی لی تھی۔ لڑکی برآمد نہیں ہوئی۔ اُس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ یہ بات تھانے کے ریکارڈ پر آگئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ انٹیلی جنس کے اِس آدمی نے اپنے محکمے کو بتایا ہوگا کہ لڑکی اِس گھر میں نہیں ہے۔"

"میں خود انٹیلی جنس میں رہا ہوں" — عبدالقدیر نے کہا — "عزیز اور اس ہندو جیسے انٹیلی جنس کے کارندے ذرا ذرا سی بات اپنے افسروں کو بتاتے ہیں۔ یہ رپورٹ اُوپر تک پہنچ چکی ہو گی کہ لڑکی اُس گھر میں نہیں ہے۔"

"یہ چیز آپ کے حق میں جاتی ہے" — ایڈووکیٹ نے کہا — "اگر آپ لڑکی کو گھر سے نکال دیں گے تو وہ بتا بھی دے گی کہ اُسے ہاشمی صاحب کے گھر میں رکھا گیا تھا تو بھی آپ قانون کی گرفت میں نہیں آتے کیونکہ لڑکی کو آپ کے گھر سے برآمد نہیں کیا گیا ..... یہ بتائیں کہ لڑکی کو معلوم ہے یا نہیں کہ

آپ کا گھر کون سے علاقے یا محلے میں ہے اور کیا لڑکی کو آپ کے گھر کا راستہ معلوم ہے؟"

"نہیں!" —— ہاشمی نے جواب دیا —— "اُسے میرے گھر پر رات کو لایا گیا تھا اور اُس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوتی تھی۔"

"زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ آپ کو انٹیلی جنس ہیڈ کوارٹر میں طلب کیا جائے گا" —— ایڈووکیٹ نے کہا —— "لڑکی سے آپ کی شناخت کرائی جائے گی۔ لڑکی آپ کو دیکھتے ہی کہہ دے گی کہ مجھے ان دونوں نے حبس بیجا میں رکھا تھا، پھر لڑکی کو ہاشمی صاحب کے گھر میں لے جایا جائے گا اور اُس سے پوچھا جائے گا کہ اُسے کون سے کمرے میں رکھا گیا تھا۔ وہ اُس کمرے کی نشاندہی کر دے گی۔ وہ ہاشمی صاحب کی بیوی کو بھی شناخت کر لے گی۔ آپ کو ذہنی طور پر تیار ہونا چاہیئے کہ آپ کو مشتبہ قرار دے کر آپ سے اقبالِ جرم کروانے کی کوشش کی جائے گی۔ آپ جانتے ہی ہوں گے کہ اقبالِ جرم کرانے کے لئے اذیت ناک طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔ تشویشناک بات یہ ہے کہ بیگم ہاشمی بھی اس کارروائی میں ملوث ہیں۔ ایک پردہ نشین اور معزز عورت انٹیلی جنس انویسٹی گیشن سنٹر میں جاتے ہی ہاتھ پاؤں چھوڑ بیٹھے گی۔ اگر آپ کی بیگم کے ساتھ ذرا سی بھی بدتمیزی کی گئی تو وہ حوصلہ ہار کر یہ راز فاش کر دیں گی۔"

"ہم اپنی جانیں قربان کرنے کے لئے تیار ہیں" —— ہاشمی نے کہا —— "ہم نے کوئی جرم نہیں کیا۔ ہمارے مقصد سے آپ واقف ہیں۔ اس قسم کے مقصد پر ہم ہر طرح کی قربانی دینے کے لئے تیار ہیں۔ اگر ہم اذیتیں برداشت کرنے اور مرنے سے ڈرنے لگیں تو وہ وقت جلدی آجائے گا جب ہندوستان میں اسلام کی شمع ٹمٹما کر بجھنے لگے گی۔"

"مجھے آپ کے خیالات اور جذبات سے پورا پورا اتفاق ہے" —— ایڈووکیٹ نے کہا —— "لیکن میں اس وقت آپ کو بتا رہا ہوں کہ کیا ہو گا یا کیا ہونے کا امکان ہے۔ مجھے آپ کی بیگم کا خیال آتا ہے۔"

"کوئی اور صورت آپ کے ذہن میں آتی ہے؟" —— عبدالقدیر نے پوچھا۔

"صورت یہی بہتر ہے کہ آپ لڑکی کو اپنے گھر سے نکال دیں" —— ایڈووکیٹ نے جواب دیا —— "نکالتے وقت اُس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہونی چاہیئے۔ دوسری صورت زیادہ خطرناک ثابت ہو گی۔ وہ یہ ہے کہ لڑکی آپ کے قبضے میں ہی رہے۔ آپ کے گھر پر اچانک چھاپہ پڑے گا۔ لڑکی آپ کے قبضے سے برآمد ہو گی پھر ہاشمی صاحب! آپ کی اور آپ کی بیگم کی باقی عمر جیل میں گزرے گی۔ آپ کے بچنے کا کوئی امکان نہیں رہے گا۔ بچنے کا امکان اس صورت میں موجود ہے کہ لڑکی کو وہاں سے ہٹا دیا جائے اور اُس کی کوئی نشانی وہاں نہ رہنے دی جائے۔ اب لڑکی رفیقی صاحب کے گھر میں ہے جہاں اُسے زیادہ دن رکھا بھی نہیں جا سکتا۔ باقی اللہ پر چھوڑیں۔"

ایڈووکیٹ نے انہیں کچھ اور ہدایات بھی دیں اور متفقہ طور پر یہی فیصلہ کیا گیا کہ لڑکی کو وہاں سے نکال دیا جائے۔

عبدالقدیر اور ہاشمی کے لئے مشکل یہ تھی کہ اُن کے پاس گاڑی نہیں تھی۔ گاڑی کا انتظام اگلے دن ہو سکتا تھا۔ اب تو ایک ایک منٹ قیمتی تھا۔ اگر چھاپہ پڑنا ہی تھا تو کسی بھی وقت پڑ سکتا تھا۔

اگلے روز عبدالقدیر نے کھٹاراسی ایک گاڑی کا انتظام کر لیا۔

رات بارہ بجے سے کچھ دیر بعد گاڑی اُس گلی کے سامنے لے جائی گئی جس گلی میں رفیقی کا گھر تھا۔ گاڑی میں عبدالقدیر نہیں تھا اور ہاشمی بھی نہیں تھا۔ محاذ کے تین آدمی گاڑی لے کر گئے تھے۔ ہاشمی اور عبدالقدیر پہلے ہی رفیقی کے گھر موجود تھے۔ انہوں نے رشی کو بتا دیا تھا کہ اُسے اُس کے خاوند اور عزیز کے پاس بھیجا جا رہا ہے۔ اُنہوں نے رشی سے ایسی درخواست نہیں کی تھی کہ وہ اُن کی نشاندہی نہ کرے۔ رشی خاموش رہی تھی۔ اُس کے چہرے کے تاثرات سے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ کیا محسوس کر رہی ہے اور

یہاں سے جاکر اُس کا ردِعمل کیا ہوگا اور وہ کیا کرے گی۔

جو تین آدمی گاڑی لے کر گئے تھے اُن میں سے دو آدمی گلی میں داخل ہو گئے اور ایک گاڑی میں ہی بیٹھا رہا۔ وہ رفیقی کے دروازے پر پہنچے۔ اُن کی مخصوص دستک پر رفیقی نے دروازہ کھولا اور یہ دونوں اندر چلے گئے۔ ان دونوں آدمیوں نے سروں پر صافے اس طرح باندھ رکھے تھے کہ اُن کے چہرے بھی ڈھانپے ہوتے تھے۔ صرف آنکھیں نظر آتی تھیں۔ رشی کو چلنے کے لئے کہا گیا۔ رشی اُٹھی۔

"میں آپ لوگوں کو ساری عمر نہیں بھولوں گی" ـــ رشی نے کہا ـــ "آپ کے ہاں میری عزت محفوظ رہی ہے۔"

عبدالقدیر کے ہاتھ میں ایک سیاہ کپڑا تھا اور وہ رشی کے پیچھے کھڑا تھا۔ اُس نے پیچھے سے یہ کپڑا رشی کے چہرے کے آگے کیا اور اُس کی آنکھوں پر رکھ کر اُس کے سر کے پیچھے باندھ دیا۔ ان سب پر ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ رشی کو گھر سے نکال کر وہ اپنی قسمت کا فیصلہ کر رہے تھے۔ دراصل یہ فیصلہ اُن کے اختیار میں نہیں تھا۔ یہ تو رشی کے جانے کے بعد معلوم ہونا تھا کہ فیصلہ کیا ہوگا۔ یہ اچھا بھی ہو سکتا تھا بُرا بھی اور یہ بہت بُرا بھی ہو سکتا تھا۔ توقع یہی تھی کہ یہ بہت بُرا ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ سب پر ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ انہیں احساس تھا کہ محاذ اور محاذ کا مقصد اُن سے پہلی قربانی مانگ رہا ہے۔ انہوں نے آپس میں کوئی بات نہ کی۔ کسی کے ذہن میں کوئی بات آتی تھی تو یہ بات زبان پر آکر بھاپ کی طرح اُڑ جاتی تھی۔

رشی کی آنکھوں پر کپڑا باندھ کر عبدالقدیر نے نقاب پوشوں کو سر سے اشارہ کیا۔ ایک نے رشی کا دایاں اور دوسرے نے اُس کا بایاں ہاتھ پکڑ لیا اور وہ باہر کی طرف چل پڑے۔ ہاشمی نے اُنہیں روک لیا۔ اُس نے ایک چادر اُٹھائی اور رشی کے سر پر ڈال دی۔ رشی نے خود ہی یہ چادر اوڑھ لی۔ ہاشمی نے اُس کے ماتھے سے چادر نیچے کو کھینچ کر گھونگھٹ نکال دیا۔ ہیجانی کیفیت میں وہ نہایت اہم احتیاطی تدبیر بھول چکے تھے۔ گھر سے گاڑی تک جاتے

کوئی آدمی رشی کو چادر کے بغیر دیکھ لیتا تو اُسے فوراً پتہ چل جاتا کہ یہ جوان لڑکی ہے اور اس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوتی ہے۔ وہ رشی کو باہر لے گئے۔

"راستہ بالکل سیدھا ہے" ـــ ایک نقاب پوش نے رشی سے کہا ـــ "اور راستہ بالکل صاف ہے۔ تیز چلی چلو۔"

رشی اُن کے ساتھ اُن کی رفتار سے چلتی گئی۔ دونوں آدمیوں نے اُس کے ہاتھ تھامے ہوتے تھے۔ گلی میں صرف ایک آدمی اور عورت سامنے سے آکے اُن کے قریب سے گزرے۔ اُنہیں دیکھ کر ان دونوں نے رشی کے ہاتھ چھوڑ دیتے تھے۔

وہ گاڑی تک پہنچے۔ اُن کے ساتھی نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا۔ ایک آدمی پہلے پچھلی سیٹ پر بیٹھا پھر رشی کو بٹھایا گیا پھر ان کا دوسرا ساتھی گاڑی میں بیٹھا۔ ان کے تیسرے ساتھی نے گاڑی سٹارٹ کی اور گاڑی چلی گئی۔

❦

پرانی دلی سے نکل کر گاڑی نئی دلی میں داخل ہو گئی۔ جُوں جُوں گاڑی آگے بڑھتی جا رہی تھی سڑکوں پر ٹریفک زیادہ ہوتی جا رہی تھی۔ نئی دلی آدھی رات کے بعد زندہ و بیدار تھی۔ پیچھے سے ایک کار گاڑی کے قریب سے گزری۔ اُس میں سے نسوانی قہقہے بلند ہوتے۔ یہ ہندوستان کی ڈسکو سوسائٹی کی نوجوان لڑکیاں اور لڑکے تھے جو رات کو جاگتے اور دن کو سوتے ہیں۔ ایسی دو تین اور کاریں اس گاڑی کے قریب سے گزریں۔ ان کاروں میں بیٹھے نوجوانوں کو معلوم نہ ہو سکا کہ اُن کی قبیل کی ایک لڑکی آنکھوں پر پٹی بندھے لے جائی جا رہی ہے۔ آگے وہ دوراہا آگیا جہاں سے ایک سڑک اشوکا ہوٹل کی طرف جاتی تھی۔ گاڑی اس سڑک کو چھوڑ کر دوسری سڑک پر چلی گئی۔ یہ سڑک شہر سے باہر جا رہی تھی۔

آگے کوٹھیوں کی ایک نئی کالونی تھی جس میں داخل ہو کر گاڑی کی رفتار کم ہو گئی۔

رِشی کو اشوکا ہوٹل تک پہنچانا تھا لیکن عبدالقدیر کو کچھ خطرہ سا محسوس ہُوا۔ اشوکا ہوٹل ایسی جگہ پر تھا جہاں دُور دُور تک ساری رات ٹریفک چلتی اور گہماگہمی رہتی تھی۔ لڑکی کو وہاں اُتارنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ یہ ہوسکتا تھا کہ لڑکی گاڑی سے اُترتے ہی شور مچادے۔ وہاں پولیس موجود ہوتی تھی اِس کے علاوہ وہاں بے انداز کاریں موجود تھیں۔ لڑکی کو لے جانے والی کار کا تعاقب ہوسکتا تھا۔ احتیاطی تدابیر کو صرف عبدالقدیر سمجھ سکتا تھا۔

اس محاذ کا جو آدمی اشوکا ہوٹل میں بیرا تھا، اُس نے خبر دی تھی کہ رابی اس ہوٹل سے چلا گیا ہے۔ اس بیرے نے رابی کو دو مرتبہ عزیز کے ساتھ دیکھا تھا۔ عبدالقدیر نے یہ بہتر سمجھا تھا کہ رِشی کو عزیز کی کوٹھی میں پہنچا دیا جائے۔

"مَیں چاہتا ہوں کہ لڑکی عزیز کے گھر سے برآمد ہو" — عبدالقدیر نے ہاشمی اور اپنے دیگر ساتھیوں سے کہا تھا — "لڑکی کو عزیز کے ہاں بھیجنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہی لڑکی کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے اور وہ ہم تک آ پہنچا تھا۔ لڑکی اُسی کے پاس چلی جاتے تو اچھا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس لڑکی کا خاوند عزیز کے پاس ہی ٹھہرا ہُوا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ واپس پاکستان چلا گیا ہو۔"

سب نے عبدالقدیر کی اس بات کو مان لیا تھا۔ اُسے سب اپنا اُستاد اور لیڈر سمجھتے تھے۔

"لڑکی کو جہاں بھی چھوڑا گیا، ہمارے لئے خطرہ موجود ہے" — عبدالقدیر نے کہا تھا — "مَیں عزیز کے ساتھ ایک گیم کھیلنا چاہتا ہوں۔ دیکھتے ہیں کہ بازی کون جیتے گا۔"

ہاشمی اور عبدالقدیر نے عزیز کی کوٹھی دیکھ رکھی تھی۔ ہاشمی نے اپنے ان ساتھیوں کو جو رِشی کو لے جارہے تھے، یہ کوٹھی دکھا دی تھی۔ رِشی کو لے جانے والی گاڑی اس کوٹھی سے پچیس تیس قدم دُور رُکی۔ وہاں سڑک پر ٹیوب لائٹیں روشن تھیں۔ ایک آدمی نے رِشی کی آنکھوں

سے کپڑا کھول دیا۔ رِشی نے اپنی آنکھیں ہاتھوں سے مَلیں اور چند سیکنڈ بعد اُس کی آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوگئیں۔

"وہ سبز گیٹ والی کوٹھی نظر آرہی ہے" — ایک آدمی نے رِشی سے کہا — "اس سے آگے سفید گیٹ والی کوٹھی ہے۔ گیٹ کی لائٹیں روشن ہیں۔ ایک لائٹ کے نیچے 'کاشانۂ عزیز' لکھا ہے۔ گاڑی سے اُترو اور اس کوٹھی میں چلی جاؤ۔"

"یہ کس کی کوٹھی ہے؟" — رِشی نے ایسے لہجے میں پوچھا جس میں گھبراہٹ تھی — "آپ لوگ مجھے کس کے حوالے کرکے جارہے ہیں؟"

"یہ آدمی تمہارے لئے کوئی اجنبی نہیں" — سٹیرنگ پر بیٹھے ہوئے آدمی نے جواب دیا — "یہ کوٹھی اُس عزیز کی ہے جو تمہیں یہاں لایا تھا۔ ہوسکتا ہے تمہارا خاوند بھی تمہیں یہیں مل جائے۔"

"میں آپ کے قبضے میں ہوں" — رِشی نے مغموم سی آواز میں کہا — "مَیں آپ کے رحم وکرم پر ہوں۔ مَیں آپ کے ہاتھوں میں مجبور ہوں۔ آپ مجھے دریا میں پھینک دیں گے تو میں آپ کو نہیں روک سکتی۔ میں صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ میرے ساتھ کوئی دھوکہ تو نہیں ہو رہا .... اگر آپ کو بُرا نہ لگے تو میں آپ سے پوچھوں کہ آپ مجھے کسی کے ہاتھ بیچ تو نہیں رہے؟"

"اگر ہم یا وہ جن کے ہاں رہ آئی ہو، بردہ فروش ہوتے تو کیا تمہاری عصمت ہمارے ہاتھوں محفوظ رہتی؟" — ایک آدمی نے کہا — "ہم جلدی میں ہیں۔ گاڑی سے اُترو۔ ہمیں جانا ہے۔"

"کیا آپ مجھے اکیلی چھوڑ کر چلے جائیں گے؟" — رِشی نے خوفزدہ آواز میں پوچھا — "اگر کوٹھی بند ہوتی، یہاں کوئی نہ ہُوا ...."

"ہم یہاں سے اُس وقت جائیں گے جب تم کوٹھی میں داخل ہو جاؤ گی" — اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے نقاب پوش نے اُسے کہا۔

رشی اس طرح گاڑی سے اُتری جیسے اُترنا نہ چاہتی ہو۔ وہ آہستہ آہستہ سفید گیٹ والی کوٹھی کی طرف چل پڑی۔ اُسے وہاں تک لانے والے گاڑی میں بیٹھے اُسے دیکھتے رہے۔ وہ گیٹ تک پہنچ کر رُکی اور دیکھنے لگی۔ اُس نے "کاشانۂ عزیز" پڑھا۔ اس کے ساتھ ہی گھنٹی کا بٹن تھا۔ اُس نے بٹن دبایا اور ایڑیاں اُٹھا کر اُوپر سے اندر دیکھنے لگی۔

ذرا دیر بعد گیٹ کھلا۔ یہ نوکر تھا۔

"مسٹر عزیز ہیں؟" رشی نے پوچھا۔

"نہیں!" — نوکر نے جواب دیا — "آنے ہی والے ہیں۔"

"مسٹر رب نواز ان کے ساتھ رہتے ہیں" — رشی نے کہا — "رابی .... انہیں رابی کے نام سے پکارتے ہیں۔"

"محترمہ!" — نوکر نے کہا — "آپ انتظار کریں .... آپ کا نام کیا ہے؟"

"راشدہ!" — رشی نے جواب دیا — "رشی۔"

"نہیں محترمہ!" — نوکر نے کہا — "میں نے یہ نام پہلے کبھی نہیں سُنا۔"

"کیا تم مجھے اندر نہیں آنے دو گے؟" — رشی نے پوچھا۔

"آجائیں" — نوکر نے کہا — "لیکن آپ کو برآمدے میں بیٹھنا پڑے گا۔"

"کیوں؟" — رشی نے پوچھا — "برآمدے میں کیوں؟"

"میرے لئے یہی حکم ہے مس صاحبہ!" — نوکر نے جواب دیا۔

عین اُس وقت ایک کار اس طرف مُڑی۔

"ذرا ٹھہریں" — نوکر نے کہا — "یہ عزیز صاحب کی گاڑی لگتی ہے۔"

رشی کو ساتھ لانے والے اپنی گاڑی میں بیٹھے رہے۔ کار سامنے

سے آ رہی تھی۔ گاڑی کے سٹیئرنگ پر بیٹھے آدمی نے گاڑی سٹارٹ کی تاکہ خطرے کی صورت میں وہاں سے گاڑی فوراً نکال لی جاتے۔

سامنے سے آنے والی کار رشی اور نوکر کے پاس رُک گئی۔ نوکر نے دوڑ کر گیٹ کھولا۔ وہاں ٹیوب لائٹوں کی روشنی خاصی زیادہ تھی۔ کار گیٹ کے اندر جانے کی بجائے باہر ہی کھڑی رہی۔ اس میں سے عزیز اور رابی نکلے پھر اس میں سے ایک لڑکی نکلی جو رشی کی ہم عمر تھی لیکن رشی سے زیادہ حسین اور پُرکشش تھی۔

عزیز اور رابی رشی کے قریب گئے اور اُسے غور سے دیکھا۔

"رشی؟" — رابی نے حیرت سے کہا۔

"کہاں سے آئی ہو؟" — عزیز نے پوچھا۔

رشی نے اُس گاڑی کی طرف دیکھا جس میں اُسے لایا گیا تھا۔ عزیز اور رابی نے اُس طرف دیکھا۔ اس گاڑی میں بیٹھے ہوئے تین آدمیوں میں سے ایک عزیز کو پہچانتا تھا۔

"یہ عزیز ہے" — اُس نے اپنے ساتھیوں سے کہا — "چلو نکلو یہاں سے .... لڑکی ٹھکانے پر پہنچ گئی ہے۔"

عزیز اور رابی اُس گاڑی کی طرف چلے۔ پچیس تیس قدم کا فاصلہ تھا۔ ڈرائیور نے گاڑی چلا دی۔ پیچھے کو موڑنے کی بجائے وہ گاڑی کو سیدھا لے گیا۔

"کم آن رابی!" — عزیز نے اپنی کار کی طرف دوڑتے ہوئے کہا — "انہیں پکڑیں گے" — کار میں بیٹھ کر اُس نے نوکر سے کہا — "ان لڑکیوں کو اندر لے جاؤ۔"

عزیز صرف جاسوس اور مخبر ہی نہیں تھا، اُسے تقریباً اُس قسم کی ٹریننگ دی گئی تھی جو کمانڈو کو دی جاتی ہے۔ اس میں بغیر ہتھیار کے لڑائی خاص طور پر شامل تھی۔ خنجر، چاقو اور ریوالور سے مسلح آدمی کو بغیر ہتھیار

کے یعنی نہتہ حالت میں بے بس کر دینا اور اس سے ہتھیار چھین لینا بھی شامل تھا۔ کار یا کوئی بھی گاڑی انتہائی رفتار سے چلانے اور گاڑی کو بے قابو نہ ہونے دینے کی ٹریننگ بھی شامل تھی۔

یہ کوٹھیوں کا علاقہ تھا۔ سڑکوں کا جال سا بچھا ہُوا تھا۔ عزیز اس علاقے سے واقف تھا۔ محاذ کے آدمیوں کو ان سڑکوں سے واقفیت نہیں تھی۔ ان کی دوسری کمزوری یہ تھی کہ ان کی گاڑی بڑی پرانی اور گھسی پٹی تھی۔ عزیز کی گاڑی نئے ماڈل کی تھی۔

عزیز نے اپنی گاڑی اس قدر تیزی سے ریورس اور سیدھی کی کہ پہیوں کی چیخیں نکل گئیں۔ اُس نے ایکسیلیٹر پر پاؤں دبایا۔ رات کا وقت تھا۔ محاذ کی گاڑی جاتی نظر آ رہی تھی۔ اُس نے دو موڑ کاٹے تھے۔ اُن تینوں کا خیال تھا کہ وہ دُور نکل آئے ہیں اور عزیز کی گاڑی اُن تک نہیں پہنچ سکے گی لیکن یہ ان کا خیال ہی تھا۔ عزیز ایک چھوٹے راستے سے اُن تک پہنچ گیا۔ اُنہوں نے بر وقت دیکھ لیا اور قریبی موڑ سے مُڑ گئے۔

عزیز کی رفتار اتنی تیز تھی کہ وہ یہ موڑ مُڑ نہ سکا۔ کار کے اُلٹنے کا خطرہ تھا۔ بریک لگاتے لگاتے کار آگے نکل گئی۔ عزیز نے کار کو پیچھے موڑا اور اس موڑ سے مُڑ کر رفتار تیز کر دی۔

"رابی!" ـــــ عزیز نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے رابی سے کہا ـــــ "تین چار دنوں سے میں ریوالور لے کر نہیں نکل رہا۔ آج بھی وہی غلطی کی ہے۔ ڈیش بورڈ کھولو۔ اس میں خنجر پڑا ہے۔ نکال کر ہاتھ میں رکھ لو۔"

"معلوم نہیں اس گاڑی میں کتنے آدمی ہیں" ـــــ رابی نے کہا ـــــ "اُن کے پاس ریوالور ہوں گے۔"

"ہونے دو" ـــــ عزیز نے کہا ـــــ "مَیں گاڑی کا نمبر دیکھ لوں اور صرف ایک چہرہ پہچان لوں ....ہو سکتا ہے ان کے پاس کوئی ہتھیار نہ ہو۔ ڈرو نہیں رابی! تمہیں بھی یہ ٹریننگ دیں گے۔"

"مَیں نے فلموں میں اس طرح کے بہت سے تعاقب دیکھے ہیں" ـــــ

رابی نے کہا۔

"فلموں میں دیکھنے سے تو بہت مزہ آتا ہے" ـــــ عزیز نے گاڑی کی رفتار اور تیز کرتے ہوئے کہا ـــــ "لیکن حقیقی تعاقب میں دل اوپر حلق تک پہنچ جاتا ہے .... کیا تمہیں مزہ آ رہا ہے؟"

"نہیں" ـــــ رابی نے جواب دیا۔

"گئے کہاں؟" ـــــ عزیز نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا ـــــ "وہ رہے .... وہی گاڑی لگتی ہے۔ معلوم نہیں یہ کون لوگ ہیں۔"

وہ وہی گاڑی تھی۔ اُس نے ایسے موڑ کاٹے تھے کہ گھوم پھر کر گاڑی واپس آ رہی تھی۔ دو متوازی سڑکیں تھیں۔ ان کے درمیان کُھلا میدان تھا جو گہرائی میں تھا۔ سٹیڈیم بنانے کے لئے یہ میدان خالی رکھا گیا تھا۔ عزیز کی گاڑی اس سڑک پر اور محاذ کی گاڑی اس کے متوازی سڑک پر جا رہی تھی۔ دونوں کی سمت ایک دوسرے کے خلاف تھی۔

عزیز نے اپنی گاڑی روکی اور پیچھے موڑ لی۔ اُسے معلوم تھا کہ جس گاڑی کا وہ تعاقب کر رہا ہے وہ ادھر ہی آئے گی کیونکہ آگے کوئی اور سڑک نہیں تھی۔ جس سڑک پر وہ جا رہی تھی وہ مُڑ کر اِدھر ہی آتی تھی۔ وقت آدھی رات کے بعد کا تھا اس لئے اس علاقے میں ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔

عزیز نے آگے جا کر گاڑی ایک بلڈنگ کی اوٹ میں روک لی اور گاڑی کی بتیاں بجھا دیں۔ تھوڑی دیر بعد دوسری گاڑی کی روشنی سامنے سے گزرتی سڑک پر دکھائی دینے لگی۔ وہ سڑک اس سڑک کو کاٹ کر گزرتی تھی جس پر عزیز کی گاڑی کھڑی تھی۔ جونہی عزیز کو اس گاڑی کی روشنی نظر آئی اُس نے اپنی گاڑی چلا کر اُس گاڑی کے راستے میں کھڑی کر دی۔

اس جگہ کوٹھیاں نہیں تھیں۔ فوجی بارکوں کی طرح گودام کھڑے تھے۔ ورکشاپیں اور دو تین فیکٹریاں تھیں۔ محاذ والے دیکھ نہ سکے تھے کہ عزیز کی گاڑی گھات میں ہے۔ سڑک اتنی چوڑی نہیں تھی کہ محاذ کی گاڑی اس کے

آگے یا پیچھے سے گزر جاتی۔ عزیز نے گاڑی اس طرح کھڑی کی تھی کہ سڑک کی پوری چوڑائی رُک گئی تھی۔

محاذی گاڑی کے ڈرائیور نے گاڑی اس طرح گھما کر روکی کہ عزیز اور رابی اس کا نمبر نہیں پڑھ سکتے تھے۔

"لائٹیں آف نہ کرنا" ــــ اس گاڑی کے ایک آدمی نے ڈرائیور سے کہا ــــ "چاروں لائٹیں آن کر دو۔ فل لائٹیں دو"۔

گاڑی کی چاروں لائٹیں آن ہو گئیں۔ عزیز ہاتھ میں خنجر لئے گاڑی کی طرف آیا۔ رابی اُس کے ساتھ تھا۔ اِدھر سے دونوں نقاب پوش گاڑی سے اُترے اور اُن دونوں کی طرف بڑھے۔

"میں سی آئی ڈی کا ایس پی ہوں" ــــ عزیز نے کہا ــــ "چہروں سے کپڑے ہٹا دو"۔

دونوں نقاب پوش بڑھتے گئے اور اُن دونوں کے قریب چلے گئے۔ عزیز کا خیال تھا کہ اُس کا رُعب کام کر گیا ہے لیکن اچانک وزنی ہتھوڑے جیسا ایک گھونسہ اُس کے مُنہ پر پڑا۔ ایسا ہی ایک گھونسہ رابی کی پسلیوں کے نیچے پیٹ میں لگا۔ عزیز چند قدم پیچھے گرا اور رابی دُہرا ہو گیا۔ عزیز کے ہاتھ سے خنجر گر پڑا۔ ایک نقاب پوش نے دوڑ کر خنجر اُٹھا لیا۔

عزیز اُٹھ ہی رہا تھا کہ اُس کے پہلو میں پہلے جیسا گھونسہ پڑا۔ اُدھر رابی کے مُنہ پر گھونسہ لگا۔ اُس کے پاؤں سڑک سے اُٹھ گئے اور وہ پیٹھ کے بل اس طرح گرا کہ اُس کی ٹانگیں اُوپر کو اُٹھ گئیں۔ ڈسکو میوزک اور سیکس لبرٹی کا مارا ہُوا نوجوان اپنے ملک کے خلاف جاسوسی اور غداری کر سکتا تھا، ایک تنومند مجاہد کا گھونسہ برداشت کرنا اُس کے بس سے باہر تھا۔

عزیز صرف دو اور گھونسے برداشت کر سکا اور سڑک پر بیٹھ گیا۔ رابی اُٹھ ہی نہیں سکا تھا۔

"گاڑی کی چابی نکالو" ــــ ایک نقاب پوش نے خنجر کی نوک اُس کی گردن کے ساتھ لگا کر کہا ــــ "ہم خون نہیں بہائیں گے اور تمہاری گاڑی

بھی نہیں لے جائیں گے"۔

عزیز نے جیب سے اپنی گاڑی کی چابی نکال کر دے دی۔

"لو بھائی!" ــــ چابی لینے والے نقاب پوش نے اپنے ڈرائیور کو بلایا اور کہا ــــ "یہ لو چابی اور ایس پی صاحب کی گاڑی سڑک سے ہٹا دو"۔

ڈرائیور آیا اور چابی لے کر وہ عزیز کی گاڑی میں بیٹھا۔ گاڑی سڑک سے ہٹ گئی۔

"چابی اپنے ساتھ لے آؤ" ــــ ایک نقاب پوش نے ڈرائیور سے کہا۔

عزیز اور رابی آہستہ آہستہ اُٹھ رہے تھے۔ نقاب پوشوں کی گاڑی چل پڑی اور وہاں سے غائب ہو گئی۔ عزیز اُس کا نمبر نہ پڑھ سکا۔ اُس کی گاڑی کی چابی محاذی گاڑی کے ساتھ ہی چلی گئی اور عزیز کا خنجر بھی چلا گیا۔ یہ ساری کارروائی چند سیکنڈ میں ہو گئی۔

"یہ کوئی پیشہ ور معلوم ہوتے ہیں" ــــ عزیز نے رابی سے کہا ــــ "کوئی بات نہیں، پکڑ لیں گے"۔

❀

عزیز کی کوٹھی کے سامنے جب عزیز اور رابی گاڑی سے اُترے تھے تو اُن کے ساتھ ایک لڑکی بھی اُتری تھی۔ اسے انہوں نے وہیں چھوڑ دیا تھا اور وہ رشی کے پاس کھڑی ہو گئی تھی۔

"میرا نام زینی ہے" ــــ اُس لڑکی نے کہا ــــ "پورا نام زینت آفتاب ہے..... اور تم؟"

"رشی!" ــــ رشی نے جواب دیا ــــ "پورا نام راشدہ ہے۔ میں رابی کی بیوی ہوں۔ رابی کو جانتی ہو نا! عزیز کے دوست ہیں"۔

"ہاں ہاں!" ــــ زینی نے جواب دیا ــــ "رابی میرا بھی دوست ہے..... تم اسے چھوڑ کر کہاں چلی گئی تھیں؟"

"میں خود تو نہیں گئی تھی" ــــ رشی نے جواب دیا ــــ "میں ایک دھوکے کا شکار ہو گئی تھی"۔

"یہ کون لوگ ہیں جن کے ساتھ تم واپس آتی ہو؟" —— زینی نے پوچھا۔

"مَیں ان کے ساتھ نہیں آئی" —— رشی نے جھنجھلا کر جواب دیا —— "یہ مجھے یہاں ڈراپ کرنے کے لئے لائے تھے۔"

زینی رشی کو کوٹھی کے اندر لے گئی اور اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ نوکر کو کہا کہ کافی لائے۔ پھر اُس نے رشی سے اس طرح سوال پوچھنے شروع کر دیئے جیسے رشی مشتبہ یا ملزم ہو اور زینی اُس سے اقبالِ جرم کروانے کی کوشش کر رہی ہو۔ رشی صاف طور پر محسوس کرنے لگی کہ اُس پر یہ شُبہ کیا جا رہا ہے کہ وہ اغوا نہیں ہوئی تھی بلکہ وہ اپنی مرضی سے گئی تھی۔ اُس نے زینی کو کسی ایک سوال کا بھی سیدھا اور صحیح جواب نہ دیا۔

"کیا رابی کو بھی یہی شک ہے کہ مَیں خود کسی کے ساتھ گئی تھی؟" —— رشی نے پوچھا۔

"وہ بیچارہ تو بہت ہی اپ سیٹ ہے" —— زینی نے جواب دیا —— "اُسے یہی شُبہ ہے کہ تم خود کسی کے ساتھ چلی گئی تھیں .... انڈیا میں آتے ہی تم نے اتنی جلدی کس سے دوستی لگالی تھی؟ پھر تم واپس کیوں آ گئی ہو؟"

"میں تمہیں کسی ایک بھی سوال کا جواب نہیں دینا چاہتی" —— رشی نے غصیلی آواز میں کہا —— "معلوم ہوتا ہے یہاں میرے لئے کوئی اور ہی جال بچھا ہُوا ہے۔"

رشی اُٹھ کر ڈرائنگ روم میں تیز تیز قدم ٹہلنے لگی۔ زینی اُس سے کچھ نہ کچھ پوچھتی رہی لیکن اُس نے زینی کی کسی بات کا جواب نہ دیا۔ وہ اتنی زیادہ بے قرار اور مضطرب ہو گئی کہ باہر نکل کر اور گیٹ میں کھڑے ہو کر اُس طرف دیکھنے لگی جس طرف دونوں گاڑیاں چلی گئی تھیں۔

چند منٹ بعد زینی بھی باہر آکر اُس کے قریب آکھڑی ہُوئی۔

"باہر کھڑی کیا کر رہی ہو!" —— زینی نے کہا —— "اندر آجاؤ۔"

"تم کہتی ہو کہ رابی تمہارا دوست ہے" —— رشی نے کہا —— "لیکن تم

ذرا سی بھی پریشان نہیں لگتیں کہ وہ اُن آدمیوں کے پیچھے چلا گیا ہے جو مجھے اغوا کر کے لے گئے تھے۔ وہ پکے مجرم ہیں۔ اگر عزیز اور رابی ان تک پہنچ گئے تو وہ مجرم ان دونوں کو گولی مار سکتے ہیں یا انہیں اُٹھا کر اپنے ساتھ بھی لے جا سکتے ہیں۔"

"فکر مت کرو رشی!" —— زینی نے لاپرواہی سے کہا —— "عزیز ہر وقت اپنے ساتھ ریوالور رکھتا ہے۔ وہ بزدل نہیں اور رابی بھی دلیر آدمی ہے۔"

کچھ دیر اور انتظار کے بعد رشی اندر آنے لگی۔ گیٹ میں داخل ہو رہی تھی کہ ایک کار کی روشنی نظر آئی۔ کار ادھر ہی آ رہی تھی۔ رشی پھر باہر آ گئی۔ یہ عزیز کی ہی کار تھی جو کوٹھی کے سامنے آکر مُڑی اور اندر چلی گئی۔ رشی دوڑ کر اُن تک پہنچی۔ عزیز اور رابی کار سے نکلے اور رشی اور زینی کو اندر لے گئے۔

ڈرائنگ روم میں جا کر رشی نے عزیز اور رابی کے چہرے دیکھے۔ دونوں کے چہروں پر گھونسوں کے اُبھرے ہُوئے نشان تھے جن کا رنگ نیلا ہو گیا تھا۔ رابی کا ایک ہونٹ بھی ایک طرف سے سُوجھا ہُوا اور کچھ پھٹا ہُوا تھا۔ وہاں خون جم گیا تھا۔ دونوں کے کپڑوں کے ساتھ مٹی لگی ہوئی تھی اور دونوں کے مزاج اکھڑے اکھڑے سے تھے۔ ان کی جو پٹائی ہوئی تھی اسے وہ چھپا نہیں سکتے تھے۔ دونوں اس طرح صوفوں پر بیٹھے جیسے گر پڑے ہوں۔

رشی نے آگے بڑھ کر رابی کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اُس کے آنسو نکل آئے۔

"یہ کون تھے؟" —— رابی نے سخت غصّے کی کیفیت میں گرج کر رشی سے پوچھا —— "کیا ان میں وہ آدمی بھی تھا جس کے ساتھ تم گئی تھیں؟"

"رابی!" —— رشی نے پیچھے ہٹتے ہوئے چلّا کر کہا —— "ہوش میں آؤ۔ کیا تم یہاں مجھے اس طرح ذلیل و رسوا کرنے کے لئے لائے تھے؟" ——

رشی نے زینی کی طرف اشارہ کر کے کہا — "یہ لڑکی معلوم نہیں کون ہے۔ یہ بھی مجھ پر یہی شک کر رہی ہے کہ میں خود کسی کے ساتھ چلی گئی تھی۔"

رشی کو معلوم نہیں تھا کہ رابی کی ذہنی حالت بہت بُری ہو رہی ہے۔ اُس نے اتنی مار کبھی نہیں کھائی تھی۔ اس کا ذمہ دار وہ رشی کو ٹھہرا رہا تھا۔ اُس کے مُنہ میں جو آیا اُس نے کہہ ڈالا۔

رشی کی ذہنی اور جذباتی حالت بھی قائم نہیں تھی۔ وہ بھی بھڑک اُٹھی۔ رابی آخر مرد تھا، وہ رشی کو مارنے کے لئے اُٹھ کھڑا ہُوا۔ عزیز تیزی سے اُٹھا اور اُس نے رابی کو پکڑ لیا۔

"یہ خود کسی کے ساتھ چلی گئی تھی" — رابی نے سخت غصے کے عالم میں کہا۔

"میں تمہیں بتاؤں گی کہ میں کہاں گئی تھی" — رشی نے رابی سے زیادہ چلّاتے ہوئے کہا — "میں تم پر ثابت کردوں گی کہ مجھے دھوکے میں لے جایا گیا تھا۔"

عزیز رابی کو دوسرے کمرے میں لے گیا۔

"زبان بند رکھو رابی!" — عزیز نے کہا — "یہ معلوم کرنا تمہارا کام نہیں کہ یہ کہاں گئی تھی اور کس طرح گئی تھی۔ ایسی باتیں معلوم کرنے کے لئے خاص طریقہ اور انداز ہوتا ہے جو تم نہیں جانتے" — عزیز نے اپنی گھڑی دیکھی اور بولا — "دو بج چکے ہیں .... کوئی بات نہیں۔ میں باس کو ابھی فون کرتا ہوں اور اس کا حکم لے لیتا ہوں۔ اس مسئلے کو معمولی نہ سمجھو۔ ابھی اسے کچھ نہ کہو۔"

عزیز نے میجر بھاٹیہ کو فون کیا۔ یہ انٹیلی جنس کے کل پُرزے تھے جو فوج کی طرح ہر وقت چوکس رہتے تھے۔ رات سوا دو بجے میجر بھاٹیہ کے فون کی گھنٹی بجی تو اُس نے ناک بھوں چڑھاتے بغیر ریسیور اُٹھایا۔ وہ بڑی گہری نیند سویا ہُوا تھا۔ اُس نے غنودگی کی کیفیت میں ہیلو کہا۔ اُدھر سے عزیز بول رہا تھا۔

"اس وقت کیا مصیبت آپڑی ہے عزیز!" — میجر بھاٹیہ نے پوچھا۔

"سر!" — عزیز نے کہا — "وہ آگئی ہے .... رشی۔"

"کس حالت میں؟" — میجر بھاٹیہ نے پوچھا۔

"حالت تو اس کی نارمل لگتی ہے سر!" — عزیز نے جواب دیا — "میں نے اس کے چہرے پر کوئی ابنارمل تاثر نہیں دیکھا۔"

"اسے ابھی میرے آفس میں لے آؤ" — میجر بھاٹیہ نے کہا — "میں وہاں سنوں گا کہ وہ کس طرح آئی ہے" — اُس نے فون بند کر دیا۔

عزیز ڈرائنگ روم میں گیا۔ رابی کو بتایا کہ باس نے ابھی بلایا ہے۔ وہ رابی اور رشی کو ساتھ لے کر باہر نکل گیا۔ دونوں کو گاڑی میں بٹھایا۔ سیلف سٹارٹر کی تاریں جوڑ کر کار سٹارٹ کی۔ کار کی چابی وہ نقاب پوش لے گئے تھے جو رشی کو ساتھ لاتے تھے۔ وہاں سے وہ سیلف کی تاریں نکال کر جوڑ کر کار لایا تھا۔

❦

یہ تینوں جب میجر بھاٹیہ کے دفتر کی طرف جا رہے تھے اُس وقت محاذ کے آدمی رفیقی کے گھر پہنچ گئے تھے۔ عبدالقدیر، ہاشمی اور رفیقی بڑی بے تابی سے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ان کے پکڑے جانے میں کوئی کسر رہ نہیں گئی تھی۔ یہ تو محض اتفاق تھا کہ عزیز کے ساتھ اُس کا کوئی ساتھی یا دوست الگ گاڑی میں نہیں تھا اور دوسرا اتفاق یہ کہ عزیز کے پاس ریوالور یا میگزین والا پستول نہیں تھا جو وہ اپنے پاس رکھا کرتا تھا۔

خدا خدا کر کے یہ تینوں واپس آتے۔ انہوں نے عبدالقدیر، ہاشمی اور رفیقی کو سنایا کہ وہ کس طرح عزیز کی کوٹھی تک پہنچے اور کس طرح وہاں سے نکلے۔

"زندہ باد" — عبدالقدیر نے کہا — "تمہیں اس کا حوصلہ

اللہ دے گا۔"

"اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ ہمارے ساتھ ہے" — ہاشمی نے کہا۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ گاڑی کا نمبر کسی نے نہیں دیکھا؟" — عبدالقدیر نے ان سے پوچھا۔

"میں نے اُس کی گاڑی دیکھتے ہی اپنی گاڑی کی چاروں بتیاں آن کرادی تھیں" ان تینوں کے لیڈر نے کہا — "پھر گاڑی موڑ کر رکوا دی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ گاڑی کا نمبر نہیں دیکھ سکے۔"

"وہ چادر کہاں ہے جو لڑکی پر ڈال کر لے گئے تھے؟" — عبدالقدیر نے پوچھا۔

تینوں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

"گاڑی میں نہ ہو" — ایک نے کہا — "معلوم ہوتا ہے چادر لڑکی کے ساتھ ہی چلی گئی ہے۔"

ایک آدمی باہر کو دوڑا۔ اُس نے واپس آکر بتایا کہ چادر گاڑی میں نہیں ہے۔

"رفیقی!" — عبدالقدیر نے رفیقی سے پوچھا — "چادر تمہارے گھر کی تھی۔ اس پر دھوبی کا نشان ہوگا۔ کپڑے گھر تو نہیں دُھلتے تھے؟"

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا چچا جان!" — رفیقی نے کہا — "چادریں دھوبی کے پاس بھی جاتی ہیں اور کبھی گھر میں دُھلتی ہیں۔"

"اگر چادر پر دھوبی کا نشان ہے تو ہمارا سراغ مل سکتا ہے" — عبدالقدیر نے کہا — "ہاشمی صاحب پر شک تو ہے ہی۔ عزیز اور ورما موجود ہیں۔ وہ ہمارے محلے کے دھوبیوں کو یہ نشان دکھا کر معلوم کر لیں گے کہ یہ کون سے گھر کے کپڑوں کا نشان ہے۔"

"اللہ کرے یہ چادر دھوبی کے پاس کبھی نہ گئی ہو" — رفیقی نے کہا — "یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ چادر کی طرف کوئی توجہ ہی نہ کرے۔ دھوبی کا نشان شاید کسی کو نظر ہی نہ آتے۔"

"یہ انٹیلی جنس کا معاملہ ہے رفیقی!" — عبدالقدیر نے کہا — "وہ اس چادر کو غور سے دیکھیں گے۔ اگر لڑکی نے ہمیں شناخت کر لیا تو ہم صاف انکار کریں گے کہ لڑکی کبھی یہاں رہی ہے لیکن دھوبی کا نشان ہمارے خلاف شک کو یقین میں بدل دے گا۔ بہرحال دُعا کرو۔ تم سب کی ٹریننگ بہت ضروری ہے۔ میدان میں لڑنا آسان ہے۔ دل مضبوط ہو تو ایک آدمی دو تین آدمیوں کا مقابلہ کر سکتا ہے لیکن چھوٹی چھوٹی چیزوں کا خیال رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ہمارے یہ تین شیر بڑی دلیری سے وہاں سے گاڑی نکال کر لے آتے ہیں لیکن دھوبی کے نشان کی چھوٹی چھوٹی دو تین لکیریں ان کے گلے کا پھندہ بن جائیں گی۔ اللہ نہ کرے ایسا ہو۔"

عبدالقدیر اُسی وقت گاڑی لے گیا اور اپنے دوست کے گھر پہنچا۔ اُسے جگایا اور گاڑی اُس کے حوالے کر دی۔

گاڑی تو چلی گئی۔ ہاشمی اور دیگر تمام آدمی اپنے گھروں کو چلے گئے لیکن آنے والے وقت کے متعلق سب مضطرب اور پریشان تھے۔ اُن کے سروں پر ایک سوالیہ نشان پھانسی کے پھندے کی طرح لٹک رہا تھا۔ فضا میں خطرے کی بُو صاف محسوس ہو رہی تھی۔ ہاشمی اپنے گھر گیا تو بیوی نے اُس سے پوچھا کہ اب کیا ہوگا تو ہاشمی اس کے سوا کوئی جواب نہ دے سکا تھا کہ دعا کرو، اللہ کوئی بہتر صورت پیدا کر دے۔

اس پُراسرار رات کے بطن سے جس صبح نے جنم لیا وہ ہر روز کی صبح جیسی تھی۔ اس کے اُجالے میں کوئی انوکھا پن نہیں تھا، کوئی ندرت اور کوئی حیرت انگیز تبدیلی نہیں تھی لیکن عبدالقدیر، ہاشمی، رفیقی اور اُن تین آدمیوں کے لئے جو گزشتہ رات رشی کو عزیز کی کوٹھی تک لے گئے تھے، یہ صبح بدلی بدلی سی تھی۔ اس صبح کا اُجالا انہیں پھیکا پھیکا سا لگ رہا تھا۔

ان سب کے دلوں پر بوجھ سا تھا۔ سب وقت سے پہلے جاگ اُٹھے اور فجر کی نماز کے لئے مسجد میں چلے گئے تھے۔ نماز تو وہ ہر روز پڑھتے تھے لیکن اُس صبح وہ مکمل یکسوئی سے اس طرح نماز پڑھ رہے تھے جیسے اللہ

سے ہمکلام ہوں۔ نماز کے فوراً بعد وہ ایک دوسرے سے ملنے چل پڑے تھے۔ دو ہاشمی کے گھر جا پہنچے اور تین عبدالقدیر کے ہاں چلے گئے۔ ہر کسی کے ذہن میں یہی ایک سوال تھا — "اب کیا ہوگا؟"

صرف عبدالقدیر تھا جو انہیں تسلی دلاسہ دے سکتا تھا۔ انٹیلی جنس کے طریقۂ کار کو وہی سمجھتا تھا۔ اُس نے محسوس کر لیا کہ اُس کے ساتھی ڈرے ہوتے ہیں اور ڈر کو چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ سب کو اکٹھا کر کے اُن کے حوصلے بلند کرنا چاہتا تھا لیکن سب کو اکٹھا کرنے میں خطرہ تھا۔ اُس کے ہاں جو دو آدمی گئے تھے انہیں حوصلہ دیا پھر ہر ایک کے ہاں جا کر سب کی حوصلہ افزائی کی۔

"مجاہد کا جذبہ کتنا ہی مضبوط اور حوصلہ کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو" — اُس نے سب سے کہا — "وہ جب دشمن کے سامنے میدان میں آتا ہے تو اُس پر ہیجانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جس میں خوف بھی شامل ہوتا ہے۔ لڑائی شروع ہوتے ہی نہ ہیجان رہتا ہے نہ خوف۔ تم اِس میدان میں پہلی بار اُترے ہو اس لئے تمہاری ذہنی کیفیت یہی ہونی چاہیئے۔ اپنے مقصد اور نصب العین کو سامنے رکھو اور دیکھو کہ یہ مقصد اللہ کو کس قدر عزیز ہے۔ تم کوئی جرم نہیں کر رہے۔ مقصد کے حصول کے لئے ہم میں سے کسی کو تو خون اور جان کا نذرانہ دینا پڑے گا ... خیال رکھو کہ ہم میں سے کوئی بھی پکڑا جاتے تو چاہے اُس کی جان چلی جاتے وہ اپنے کسی ساتھی کی نشاندہی نہ کرے۔ اپنے محاذ سے غداری نہ کرنا۔ محاذ سے غداری اللہ اور رسولؐ سے غداری ہے۔ سب سے زیادہ خطرہ میرے اور ہاشمی صاحب کے لئے ہے۔ لڑکی ہم دونوں کو شناخت کرے گی۔ ہم دونوں کی عمر دیکھو۔ کیا ہم اذیتیں سہنے کے قابل ہیں؟ ... نہیں ... ہم بوڑھے ہیں لیکن تم دیکھ لینا کہ ہم تم میں سے کسی کی بھی نشاندہی نہیں کریں گے۔ تم اپنا کام جاری رکھنا۔"

وہ دن گزرنے میں ہی نہیں آتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے سورج ایک مقام پر آکر رُک گیا ہو۔ ہاشمی اور عبدالقدیر ریٹائرڈ زندگی گزار رہے تھے، دوسرے اپنے اپنے کام کاج پر چلے گئے۔ ہاشمی اور عبدالقدیر کے

دروازے پر دستک ہوتی تو وہ سمجھتے کہ انٹیلی جنس کا بلاوا آیا ہے۔

آخر عبدالقدیر کے دروازے پر وہ دستک ہوتی جس کا وہ بے تابی سے انتظار کر رہا تھا۔ وہ باہر نکلا۔ دو اجنبی کھڑے تھے۔ وہ سویلین لباس میں تھے۔ انہوں نے عبدالقدیر کو اپنے کارڈ دکھاتے۔ وہ انٹیلی جنس کے آدمی تھے۔

"مسٹر عبدالقدیر؟"

"جی ہاں!" — عبدالقدیر نے جواب دیا — "میں عبدالقدیر ہوں۔"

"آپ انٹیلی جنس سروس سے ریٹائر ہوتے ہیں" — ایک نے اُس سے ہاتھ ملاتے ہوتے مُسکرا کر کہا — "آپ کا ایڈریس آفس سے لیا ہے۔"

"حکم!"

"حکم نہ کہیں" — انڈین انٹیلی جنس کے اِس افسر نے کہا — "درخواست ہے، ہمارے ساتھ چلیں۔ کپڑے بدلنے کی ضرورت نہیں۔"

"میں گھر والوں کو بتا آؤں؟"

"نہیں مسٹر عبدالقدیر!" — افسر نے کہا — "آپ خود انٹیلی جنس میں رہ چکے ہیں۔ دستور آپ کو معلوم ہے۔"

یہ دونوں آگے بڑھے۔ ایک عبدالقدیر کے دائیں اور دوسرا بائیں ہو گیا۔ دونوں نے اُس کے بازوؤں پر ہاتھ رکھ دیتے اور اُسے اپنے ساتھ لے کر چل پڑے۔ وہ بڑے پیار سے باتیں کرتے جا رہے تھے جیسے ایک دوست کو پکنک پر لے جا رہے ہوں۔

گلی سے نکلے تو باہر ایک فوجی ڈاج گاڑی کھڑی تھی۔ عبدالقدیر کو اس گاڑی میں داخل کر دیا گیا۔ اس میں ہاشمی پہلے سے موجود تھا۔ عبدالقدیر یہ دیکھ کر پریشان ہو گیا کہ ہاشمی کے ساتھ اُس کی بیوی بھی برقعے میں لپٹی بیٹھی تھی۔ گاڑی میں دو آدمی اور تھے جو انٹیلی جنس کے کارندے معلوم ہوتے تھے۔ عبدالقدیر کو لانے والے ان کے ساتھ بیٹھ گئے اور گاڑی چل پڑی۔

ہاشمی کے گھر کا پتہ عزیز نے دیا تھا اور اُس نے انٹیلی جنس کے ایک آدمی کو دُور سے یہ گھر دکھا یا بھی تھا۔

راستے میں کسی نے کسی کے ساتھ کوئی بات نہ کی اور گاڑی ایسی جگہ پہنچ گئی جس سے عبدالقدیر اچھی طرح واقف تھا۔ چھوٹی سی ایک عمارت تھی جس کے اردگرد دیوار تھی۔ اس کا گیٹ لوہے کا تھا۔ باہر سے دیکھنے سے پتہ چلتا تھا کہ یہ کوئی خاص جگہ ہے۔ اس کے باہر کوئی بورڈ نہیں تھا۔

گاڑی اس گیٹ میں داخل ہو گئی۔ عبدالقدیر کو معلوم تھا کہ اندر کیا ہے۔ اس عمارت کو اندر سے وہ اس طرح جانتا تھا جس طرح وہ اپنے جسم سے واقف تھا۔ جس طرح آج وہ یہاں لایا جا رہا تھا اس طرح وہ کئی آدمیوں کو یہاں لایا تھا۔ ان میں زیادہ تر وہ آدمی تھے جن پر پاکستانی جاسوس ہونے کا شبہ ہوتا تھا۔ ان میں بھارتی مسلمان بھی ہوتے تھے، پاکستانی بھی۔ عبدالقدیر نے ان کے ٹارچر میں بھی حصہ لیا تھا۔

اُس وقت عبدالقدیر کچھ اور قسم کا انسان ہُوا کرتا تھا بلکہ وہ عبدالقدیر کوئی اور تھا۔ وہ بھارتی انٹیلی جنس کا ایک اہم کل پُرزہ تھا۔ اُس کی نگاہ میں ہندو، مُسلم، سِکھ، عیسائی، ملکی اور غیر ملکی برابر تھے۔ وہ اپنا مذہب بھُول گیا تھا۔ اُس کا دین اور اُس کا دھرم اُس کا وہ فرض تھا جو انٹیلی جنس نے اُسے سونپا تھا۔

ہندو افسروں کی خوشنودی اُس کی زندگی کا مشن تھا۔ پاکستان کے نام نے اُس کے خیالوں میں کبھی ہلچل پیدا نہیں کی تھی۔ اسلام کے ساتھ اُس نے تعلق توڑ لیا تھا۔ دِلی کی جامع مسجد کے امام عبداللہ بخاری کا سُن کر اُسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی مشتبہ کا اور بھارت کے کسی دشمن کا نام لیا گیا ہو۔

وہ کبھی پولیس میں ہیڈ کانسٹیبل ہُوا کرتا تھا۔ سراغرسانی اُس کی فطرتِ ثانی تھی۔ اُس کی ذہانت کو دیکھ کر اُسے سی آئی اے میں بھیج دیا گیا تھا۔ وہاں انٹیلی جنس کے کسی بڑے افسر نے اُسے دیکھا تھا۔ وہ کوئی ایسا کیس تھا جس کی تفتیش سی آئی اے بھی کر رہی تھی اور انٹیلی جنس بھی۔ عبدالقدیر نے عہدہ اتنا چھوٹا ہونے کے باوجود سراغرسانی میں اتنا نمایاں رول ادا کیا تھا کہ

انٹیلی جنس کا ایک افسر اُس سے بہت متاثر ہُوا اور اُسے پولیس سے نکلوا کر انٹیلی جنس میں لے لیا تھا۔ اس محکمے میں آتے ہی اُس کی مُسلم دشمنی مشہور ہو گئی تھی۔ یہاں اُسے کسی پاکستانی ایجنٹ کی بُو مل جاتی وہ اُس کے ساتھ سائے کی طرح لگ جاتا تھا۔

اُس کی عمر پچپن سال ہو گئی۔ کہتے ہیں اِس عمر میں انسان اپنی فطرت نہیں بدل سکتا لیکن عبدالقدیر کی فطرت میں ایسا انقلاب آیا جیسے کاغذ کا ایک پُرزہ بگولے کی لپیٹ میں آگیا ہو۔ اُس کی فطرت میں یہ بگولہ اس طرح اُٹھا کہ وہ ایک پاکستانی جاسوس کا پیچھا کر رہا تھا۔ اُسے وہ فوراً پکڑ سکتا تھا لیکن وہ اُس کے پورے رِنگ (گروہ) کو پکڑنے کی کوشش میں تھا۔ اُس کے پیچھے وہ انبالہ، امرتسر اور جالندھر تک گیا اور اُس کے چار ٹھکانے دیکھ لیے۔

یہ جاسوس جن لوگوں سے ملا ان سب کے ایڈریس معلوم کر لیے، اور ایک روز عبدالقدیر اِس پاکستانی جاسوس کے ساتھ تین آدمیوں کو گاڑی میں بٹھا کر اِس عمارت کے آہنی گیٹ میں داخل ہُوا تھا جس میں آج اُسے ملزم کی حیثیت سے داخل کیا گیا تھا۔

اگلے ہی روز اِس رِنگ کے دو اور آدمی جو بھارتی مسلمان تھے، گرفتار کر کے لائے گئے۔ پاکستان کی انٹیلی جنس کا ایک پورا رِنگ نہ صرف ٹوٹ گیا بلکہ انڈین انٹیلی جنس کے قبضے میں آگیا۔

یہ مارچ اپریل ۱۹۷۲ء کا واقعہ تھا۔ بھارت کی کوششوں سے مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن چکا تھا۔

"عبدالقدیر!" — اُس کے شعبے کے چیف نے اُسے مبارکباد اور خراجِ تحسین کے بعد کہا تھا — "تمہارا کام ختم ہو چکا ہے لیکن مَیں چاہتا ہوں کہ اِس رِنگ سے مزید راز تم ہی اُگلواؤ اور ان سے اقبالِ جُرم کراؤ۔ پاکستانی ایجنٹ سے جو انفارمیشن لینی ہے اس کی بریفنگ میں تمہیں دوں گا۔ یہ کام تم ہی کر سکتے ہو۔ تمام کریڈٹ تم ہی لو۔"

عبدالقدیر کو بہت خوشی ہوئی تھی جیسے اُسے روح کی غذا مل

گئی ہو۔

وہ پاکستانی ایجنٹ کو ٹارچر سیل میں لے گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس تاریک کوٹھڑی میں جانور ذبح کئے جاتے ہوں۔ خون اور غلاظت کی اتنی بدبو کہ دماغ چکراتا تھا۔ عبدالقدیر نے اپنی ناک پر کپڑا باندھ لیا تھا۔

"یہاں تم مر بھی جاؤ گے تو تمہیں کوئی نہیں پوچھے گا" — عبدالقدیر نے پاکستانی سے کہا — "لیکن میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھ سے یہ گناہ نہ کراؤ۔ مسلمان کے ہاتھوں مسلمان کا خون گناہِ کبیرہ ہے۔"

"تم اگر واقعی مسلمان ہو تو اپنے آپ کو میرے ساتھ نہ ملاؤ" — پاکستانی نے کہا — "میں سچا مسلمان ہوں اور تم نام کے مسلمان ہو۔ میں اس کوشش میں ہوں کہ میری روح بھوکی نہ رہے اور تم اس فکر میں ہو کہ تمہارا پیٹ خالی نہ رہے۔ میں اللہ اور رسول اللہ کی خوشنودی کا طلبگار ہوں اور تمہیں کافر کی خوشنودی درکار ہے۔ تم بے ضمیر ہو اور میں سرتاپا ضمیر ہوں۔ تم وہ مسلمان نہیں ہو جس کے لئے کسی مسلمان کا خون گناہِ کبیرہ ہے۔ تم میرا خون کر دو۔ میں تمہارا مشکور ہوں گا۔"

"بیوقوف!" — عبدالقدیر نے ہنستے ہوئے کہا — "یہاں صرف پاکستانی جاسوسوں کو لایا جاتا ہے۔ جو بھی آتا ہے وہ تمہاری طرح پہلے تقریر کرتا ہے.... یوں کرو" — عبدالقدیر نے اُس کے آگے ایک کاغذ رکھ کر کہا — "یہ پڑھ لو اور ان سوالوں کے جواب دے دو" — وہ اُٹھا اور بولا — "اچھی طرح سوچ لو۔ میں تمہیں دو گھنٹے، تین گھنٹے مہلت دوں گا۔ صحیح جواب دے دو گے تو تمہاری بہتری کے لئے تمہارے سامنے ایسی تجویز رکھوں گا کہ عش عش کر اُٹھو گے۔ خدا کی قسم، تمہیں انڈیا اور پاکستان کا شہزادہ بنا دوں گا۔"

"ہندو کا دیا کھانے والا کسی کو کیا شہزادہ بنائے گا" — پاکستانی نے کہا — "بیٹھے رہو۔ مجھے مہلت نہیں چاہیئے۔ میں ان میں سے کسی ایک بھی سوال کا جواب نہیں دوں گا.... میں تمہیں صرف ایک چیز دے سکتا ہوں۔"

"کیا؟"

"اپنی جان" — پاکستانی نے جواب دیا۔

"تمہاری جان محفوظ رہے گی" — عبدالقدیر نے کہا — "اور تم ہر سوال کا جواب دے دو گے۔ میرے پاکستانی دوست! تم سمجھ نہیں رہے کہ میں تم پر کتنی بڑی نیکی کر رہا ہوں.... یہ بھی سن لو۔ تمہارا مغربی پاکستان بھی چند دنوں کا مہمان ہے۔ اُس ملک کے لئے کام کرو جو ہمیشہ رہنے والا ہو۔ انڈیا کے لئے کام کرو۔"

پاکستانی کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ آگئی۔

سات آٹھ دنوں بعد اس پاکستانی کی حالت یہ ہو گئی تھی کہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ اُس کی گردن اُس کے سر کا بوجھ نہیں سہار سکتی تھی۔ اُس کی ہڈیاں چیخ رہی تھیں۔ وہ خون تھوکتا تھا۔ اُس پر غنودگی طاری تھی۔ آنکھیں نہیں کھلتی تھیں۔ مُنہ سے اونچی آواز نہیں نکلتی تھی۔

"تم پاکستان کے جاسوس ہو" — اُسے ہر روز بارہا کہا جاتا تھا۔

"ہاں!" — وہ ہر بار یہی جواب دیتا — "میں پاکستان کا جاسوس ہوں۔"

"اب ان سوالوں کے جواب دو۔"

"نہیں!" — وہ ہر بار کہتا — "کسی اور سوال کا جواب نہیں دوں گا۔ کسی کے خلاف بیان نہیں دوں گا۔"

ہر بار اُس پہ ایذا رسانی کا کوئی نیا طریقہ آزمایا جاتا۔

"سر!" — ایک روز عبدالقدیر نے اپنے چیف سے کہا — "یہ پتھر نہیں فولاد ہے۔ پتھر ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ نہیں ٹوٹتا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کو جو انفارمیشن چاہیئے وہ اس کے سینے میں ہے۔ اس کے سینے میں ذرا سی جان رہ گئی ہے لیکن وہ راز نہیں دے رہا۔"

"دے گا" — چیف نے کہا — "اسے کچھ کھلاؤ پلاؤ۔ ایک دو دن آرام دو، پھر اس سے پوچھو۔"

عبدالقدیر اپنے کمرے میں بیٹھ گیا۔ اُس نے میز کا دراز کھولا۔
اس میں چاندی کا ایک تعویذ پڑا تھا۔ اس پر کور (تعویذ) کے ساتھ ایلاسٹک
تھا۔ یہ عبدالقدیر نے اس پاکستانی کے بازو سے اُتارا تھا۔ یہ اُس نے
زبردستی اُتارا تھا۔ پاکستانی کہتا تھا کہ یہ اُس کے ساتھ قبر میں جائے گا۔
عبدالقدیر نے یہ اُس کے بازو سے اُتار کر اپنے دراز میں رکھ لیا تھا۔

چیف سے بات کر کے وہ اپنے کمرے میں آیا اور تعویذ نکالا۔
چاندی کے خول کو دیکھا۔ اس پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کُھدا ہُوا تھا۔ عبدالقدیر
نے پہلے نہیں سوچا تھا۔ اُسے اب خیال آیا کہ اس میں کوڈ (خفیہ) الفاظ
میں کوئی پیغام نہ ہو۔ اُس نے چاقو کی نوک سے خول کھولا۔ اس میں سے
ایک کاغذ نکلا۔ اس پر لکھا تھا — لاالٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ ——
کاغذ کے دوسری طرف لکھا تھا — کیونکر خس و خاشاک سے دب
جاتے مسلمان!

عبدالقدیر یوں چونک پڑا جیسے اُس کے کمرے میں بڑا ہی زوردار
دھماکہ ہُوا ہو جس نے اُسے ہوا میں اچھال کر زمین پر پٹخ دیا ہو۔ اُسے اس
پاکستانی جاسوس کی کچھ باتیں یاد آنے لگیں۔ یہ کوئی لمبی چوڑی باتیں نہیں
تھیں۔ صرف یہ کہ اُسے ٹارچر سے ادھ موا کر کے عبدالقدیر کہتا تھا کہ وہ
ان سوالوں کے جواب دے دے تو وہ غنودگی یا نیم غشی کی حالت میں
کہتا تھا — "مَیں نے اپنے اللہ کے پاس لَوٹ کر جانا ہے" — کبھی
کہتا — "مسلمان ہو تو اللہ سے پوچھو" — یہ الفاظ تو وہ بار بار کہتا تھا —
"تم ہندو کی اولاد ہو"

"کیا تمہیں معلوم ہے حضرت بلالؓ نے اسلام قبول کیا تو کفارِ مکہ
انہیں کس طرح اذیتیں دیتے تھے؟" — پاکستانی نے ایک روز
پہلے عبدالقدیر سے کہا اور اس کا جواب سنے بغیر کہا تھا — "حضرت بلالؓ
ہوش میں آتے تو اُن کے مُنہ سے احد کے کلمے نکلتے تھے ..... میں
بھی رسولؐ کے انہی عاشقوں میں سے ہوں۔ میرے مُنہ سے تم بھی

کچھ سُنو گے"

عبدالقدیر چاندی کے خول سے نکالے ہوئے کاغذ کے پُرزے
کو دیکھ رہا تھا اور پاکستانی جاسوس کی باتیں اُس کے ذہن میں گونج رہی
تھیں۔ وہ اپنے خون میں حرارت سی محسوس کر رہا تھا جو بڑھتی جا رہی تھی۔

"کیونکر خس و خاشاک سے دب جاتے مسلمان!"

اُسے اپنی آواز سنائی دی۔ اُس نے کاغذ کے پُرزے کو اور زیادہ
غور سے دیکھا۔

"لاالٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ"

اُس کے جسم نے جھرجھری لی۔ اُسے سات آٹھ روز پہلے کی بات
یاد آئی۔ وہ شام کو گھر گیا تو بیوی نے اُسے بتایا کہ صبیحہ کو ایک ہندو لڑکا
روزانہ تنگ کرتا ہے۔ صبیحہ عبدالقدیر کی بڑی بیٹی تھی۔ وہ بی اے کے
آخری سال میں تھی۔ کالج سے چھٹی کے وقت ایک ہندو لڑکا اس کے
پیچھے لگ جاتا اور محبت کا اظہار کرتا تھا۔

دوسرے دن عبدالقدیر بیٹی کے کالج چلا گیا اور ایک طرف کھڑا
ہو گیا۔ اُس کی بیٹی دوسری لڑکیوں کے ساتھ باہر آئی تو وہ لڑکا اُس کے
ساتھ چل پڑا۔ عبدالقدیر نے اُسے پکڑ لیا۔

"کیوں؟" — اس ہندو لڑکے نے بڑی دلیری سے عبدالقدیر
سے کہا — "کیا کیا ہے مَیں نے؟ اس سے پوچھو۔ مَیں اسے چھیڑتا تو
نہیں۔ میں کوئی فضول بکواس نہیں کرتا۔ مَیں تو اس کے ساتھ شادی
کرنا چاہتا ہوں"

"کیا تم نہیں جانتے کہ یہ مسلمان ہے اور تم ہندو ہو؟" — عبدالقدیر
نے پوچھا۔

"تو کیا ہُوا؟" — ہندو لڑکے نے جواب دیا — "یہاں کتنی
ہندوؤں نے مسلمان لڑکیوں کے شادیاں کی ہیں۔ اگر آپ اس کے باپ
ہیں تو میری بات مان لیں۔ مَیں بڑے امیر باپ کا بیٹا ہوں" — اس

نے اپنے باپ کا نام اور پتہ بتا کر کہا — "اگر آپ کی بیٹی نے میرے ساتھ شادی کر لی تو ہماری حکومت کی طرف سے آپ کو بہت فائدہ ملے گا۔"
عبدالقدیر ایک ہندو لڑکے کی اس دلیری کو دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ اس نے غصہ دباتے ہوئے اس لڑکے سے کہا کہ وہ اس کی بیٹی کا پیچھا چھوڑ دے۔

"تم مسلمانوں کا دماغ پھر گیا ہے" — ہندو لڑکے نے کہا — "ہمارے ملک میں رہ کر تم اپنے مذہب کی پابندی کرتے ہو۔ تم پاکستان کیوں نہیں چلے جاتے؟"

"ہندو کی اولاد!" — عبدالقدیر نے اس کے کان میں کہا — "میں کل تمہیں یہاں نہ دیکھوں۔"

وہ اپنی بیٹی کو ساتھ لے کر گھر آ گیا۔

دوسرے دن لڑکی نے بتایا کہ لڑکا پھر اس کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اپنے باپ کو سمجھا لو ورنہ وہ بہت خراب ہو گا۔

اس سے اگلے روز عبدالقدیر نے اپنے چیف کو بتایا کہ اس طرح ایک لڑکا اس کی بیٹی کو تنگ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ اس کی بیٹی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔

"یہ تو بہت اچھا ہے" — چیف نے کہا۔ چیف بھی ہندو تھا — "اگر آپ اپنی بیٹی اس ہندو لڑکے کو دے دیں تو آپ کو فوری ترقی مل سکتی ہے۔ حکومت ایسی شادیوں کی حوصلہ افزائی کر رہی ہے۔ آپ کے خیالات تو پہلے ہی عام مسلمانوں سے مختلف ہیں۔"

"لیکن میں اپنی بیٹی کسی ہندو کو نہیں دے سکتا" — عبدالقدیر نے کہا۔

"کیوں؟" — چیف نے کہا — "ہندو اچھوت ہوتے ہیں؟ میں حیران ہوں کہ مسلمان ہندو کی برتری کو قبول کیوں نہیں کرتے؟ تم تو اچھے خاصے فرمانبردار آدمی ہو۔ اپنا بھلا برا سوچ لو۔"

عبدالقدیر نے دو تین غنڈوں کے ساتھ بات کی۔ یہ اس کے اپنے آدمی تھے۔ انہوں نے کالج جا کر اس ہندو لڑکے سے اس کی بیٹی کو نجات دلائی اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ بی اے کا امتحان ختم ہوتے اپنی بیٹی کی شادی کر دے گا۔

یہ سات آٹھ روز پہلے کا واقعہ تھا۔ اس کے دل پر، ذہن اور خیالات پر اس کا بہت برا اثر تھا۔ پاکستانی جاسوس کے تعویذ نے اس اثر کو اور زیادہ گہرا کر دیا اور اس کے سینے میں سویا ہوا مسلمان بیدار ہو گیا۔ اسے خیال آیا کہ یہ پاکستانی اللہ کا پیارا بندہ ہے اور وہ خود اللہ کے دھتکارے ہوئے بندوں میں سے ہے۔

پاکستانی جاسوس اس کے ذہن پر غالب آ گیا۔

اس کے چیف نے کہا تھا کہ اسے کھلاؤ پلاؤ اور ایک دو دن آرام دے کر اس سے پوچھو۔ عبدالقدیر نے کاغذ کا پرزہ چاندی کے خول میں ڈالا اور خول بند کر کے جیب میں ڈال لیا۔ وہ اٹھا اور ٹارچر سیل میں چلا گیا۔ پاکستانی جاسوس سویا ہوا یا بیہوش پڑا تھا۔ وہ تو لاش بن چکا تھا۔ اس کی ناک اور منہ سے خون نکلا اور وہیں جم گیا تھا۔ وہ پیٹھ کے بل پڑا تھا۔

عبدالقدیر کچھ دیر اسے دیکھتا رہا اور اس کے ذہن میں طوفان اٹھتا رہا۔ اسے اس پاکستانی کی آواز سنائی دی — "مسلمان ہو تو اللہ سے پوچھو.... تم ہندو کی اولاد ہو.... لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ" — یہ آواز اس کمرے کی ہیبت ناک اور متعفن فضا میں لرزتی ہوئی گونج کی طرح سنائی دے رہی تھی۔

عبدالقدیر کے ذہن میں ایسے خیال آنے لگے جو پہلے کبھی نہیں آتے تھے۔ کسی بھی مشتبہ اور ملزم کے لئے اس نے ایسے کبھی نہیں سوچا تھا۔ اسے خیال آیا کہ یہ پاکستانی زندہ نہیں رہ سکے گا۔ زندہ رہا بھی تو بہت بری اذیت میں زندہ رہے گا۔ ایک ہی روز پہلے اس کا ڈاکٹری معائنہ

کرایا گیا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اس کا جگر مجروح معلوم ہوتا ہے۔ ٹارچر سیل کی چکی میں پسنے والے ملزموں کا ڈاکٹری معائنہ اس لئے نہیں کرایا جاتا تھا کہ ان کا علاج کیا جاتے بلکہ یہ معلوم کرنا مقصود ہوتا تھا کہ یہ کتنا اور ٹارچر برداشت کرنے کے قابل ہے اور کیا یہ مطلوبہ راز اُگلنے سے پہلے ہی تو نہیں مر جاتے گا؟

پاکستانی جاسوس کی ڈاکٹری رپورٹ مخدوش اور تشویشناک تھی عبدالقدیر کا چیف کہتا تھا کہ اسے آرام اور خوراک دے کر مزید ایذا رسانی میں ڈالو۔ عبدالقدیر دیکھ چکا تھا کہ یہ شخص کچھ نہیں بتاتے گا۔ اس نے ہتھیار ڈالنے ہوتے تو ایک دو روز بعد ہی ڈال دیتا۔ اس کی نجات کا کوئی راستہ، کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ اسے نہ جانے کب تک نہ زندہ رہنا تھا نہ مُردہ۔ انٹیلی جنس کے اِس جہنم سے نکل کر اس نے بھارت کی کسی جیل میں باقی عمر گزارنی تھی جہاں پاکستانی قیدیوں کو مسلسل اذیت اور ذِلت میں رکھا جاتا تھا۔

"مَیں اسے نجات دلاؤں گا" ___ عبدالقدیر نے اپنے آپ سے کہا۔

اُس نے کمرے میں ادھر اُدھر دیکھا۔ ایک کونے میں پھٹا پرانا، میلا کچیلا تولیہ پڑا تھا۔ عبدالقدیر نے دروازے کی سلاخوں سے جھانکا۔ سنتری پرے چلا گیا تھا۔ وہاں سنتری کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ رسمی طور پر برآمدے میں ملٹری پولیس کا ایک سنتری گھومتا پھرتا رہتا تھا۔

عبدالقدیر نے تولیہ اُٹھایا۔ اسے تہہ در تہہ کر کے پیڈ سا بنایا اور یہ پیڈ پاکستانی جاسوس کے مُنہ پر رکھ دیا۔ اُس کا مُنہ اور ناک پیڈ کے نیچے آگئے۔ عبدالقدیر نے پیڈ پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر دباؤ ڈالا۔ پاکستانی نہ مُنہ کے راستے سانس لے سکتا تھا نہ ناک کے راستے۔ وہ بیہوش پڑا تھا۔ عبدالقدیر نے اور زیادہ دباؤ ڈالا۔ دم گھٹنے سے پاکستانی کا جسم تڑپا اور ذرا سی دیر تڑپ کر بے جان ہو گیا۔

عبدالقدیر نے اُس کی نبض دیکھی۔ نبض خاموش ہو چکی تھی عبدالقدیر

نے سکون اور اطمینان کی آہ بھری۔ اُس نے پاکستانی کے لئے بہت بڑی نیکی کی تھی کہ اسے اس جہنم سے نجات دلا دی تھی۔ اس کے سوا نجات کا کوئی اور ذریعہ نہیں تھا۔ اُس نے تولیہ پرے پھینک دیا اور جیب سے تعویذ نکال کر اسے دیکھا پھر اسے چُوما، آنکھوں سے لگایا اور پاکستانی کا بازو اُٹھا کر اس کا دھاگہ بازو میں آگے کہنی سے اُوپر تک کر دیا اور آستین اُوپر کر دی۔

اس لاش کا کون سا پوسٹ مارٹم ہونا تھا کہ پتہ چل جاتا کہ اِس ملزم کو قتل کیا گیا ہے۔ اس کال کوٹھڑی میں آتے دن قتل ہوتے تھے۔

عبدالقدیر اپنے چیف کے پاس گیا اور اُسے بتایا کہ پاکستانی ملزم مر گیا ہے۔

"اوہ بیوقوف!" ___ چیف نے کہا ___ "تم نے ایک ذریعہ ضائع کر دیا ہے۔"

"یہ اکیلا ہی تو نہیں تھا سر!" ___ عبدالقدیر نے کہا ___ "اس کے ساتھی موجود ہیں۔ صرف ایک ذریعہ ضائع ہوا ہے۔"

"لاش ہسپتال کو دے دو" ___ چیف نے کہا۔

ایسی لاشیں سرکاری ہسپتال کو بھیج دی جاتی تھیں جہاں انہیں لاوارث قرار دے کر میڈیکل کالجوں کو دے دیا جاتا تھا۔

"سر!" ___ عبدالقدیر نے کہا ___ "ایک عرض ہے۔"

"ہاں ہاں!" ___ چیف نے کہا۔

"مَیں اس لاش کو باقاعدہ دفن کرنا چاہتا ہوں" ___ عبدالقدیر نے کہا۔

"کیا لگتا تھا یہ تمہارا؟" ___ چیف نے پوچھا۔

"معلوم نہیں سر!" ___ عبدالقدیر نے مغموم سے لہجے میں کہا ___ "یہ مسلمان تھا۔ میں نے آپ کی، آپ کے ملک کی اور انٹیلی جنس کی بہت خدمت کی ہے سر! میں نے اپنے مذہب کا کبھی خیال نہیں کیا تھا۔"

"کیا یہ ملک تمہارا نہیں؟" ___ چیف نے پوچھا اور جواب سُنے بغیر

کہنے لگا — "تم اپنے ملک کے دشمن کا باقاعدہ جنازہ بھی پڑھ گئے؟..... نہیں کیا ہو گیا ہے عبدالقدیر؛ تم ایسے جذباتی تو نہیں ہوا کرتے تھے۔"

"میں بوڑھا ہو گیا ہوں سر!" — عبدالقدیر نے کہا — "شاید میری یہ جذباتی حالت بڑھاپے کی وجہ سے ہو گئی ہے۔ سر! پولیس کی سروس ملا کر تیس سال سروس ہو گئی ہے۔ دن رات بھاگتا دوڑتا رہا ہوں۔ اب مجھے ریٹائر ہو جانا چاہیئے۔"

عبدالقدیر جانتا تھا کہ اُسے اس پاکستانی جاسوس کی لاش نہیں ملے گی اور اگر وہ لاش کے لئے ضد کرے گا تو اُسے پاکستان کا جاسوس سمجھ لیا جائے گا۔ اُس نے سوچا کہ وہ دو بیٹیوں اور تین بیٹوں کا باپ ہے۔ ان کا مستقبل تباہ ہو جائے گا۔ پنشن نہیں ملے گی بلکہ پنشن کی بجائے سزا ملے گی۔ اُس نے جب اپنے اور اپنی اولاد کے مستقبل کے متعلق سوچا تو اُس نے محسوس کیا کہ ہندو اُس کا ہمدرد اور بہی خواہ نہیں ہو سکتا چاہے اُس نے ساری عمر ہندوؤں کی خدمت میں گزار دی ہو۔ اُس کا دل تو ایک ہفتہ پہلے ہی اُکھڑ گیا تھا جب اُس کے چیف نے اُسے کہا تھا کہ اپنی بیٹی اُس ہندو نوجوان کو دے دو جو اُس کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔

"سر!" — عبدالقدیر نے اپنے چیف کو خوش کرنے کے لئے ہنس کر کہا — "میں معافی چاہتا ہوں۔ معلوم نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔ مجھے غلط نہ سمجھنا سر! میری اس درخواست پر ضرور غور کرنا کہ مجھے ریٹائر ہو جانا چاہیئے۔ میرے اعصاب بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھ سے کوئی کام بگڑ جائے۔ یہ محکمہ بہت نازک ہے سر!"

عبدالقدیر ذہانت اور فہم و فراست کے لحاظ سے بہت ہوشیار اور گہرا آدمی تھا۔ اُس نے باتوں میں اپنے چیف کو جو کٹر برہمن تھا، رام کر لیا اور اپنے خلاف کوئی شک پیدا نہ ہونے دیا، لیکن اُس نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ مزید سروس نہیں کرے گا اور ریٹائر ہو جائے گا۔ ایک مہینے بعد اُسے پنشن پر بھیج دیا گیا۔ دو مرتبہ اُسے سروس میں ایک ایک سال

کی توسیع دی گئی تھی۔

یہ چار ساڑھے چار سال پہلے کا واقعہ ہے جب عبدالقدیر نے چیف کو بتایا تھا کہ پاکستانی جاسوس مر گیا ہے اور یہ بھی کہا تھا کہ وہ اُسے باقاعدہ دفن کرنا چاہتا ہے تو چیف کا ردِّعمل دیکھ کر اُس نے پاکستانی کی لاش حاصل کرنے کا خیال ذہن سے نکال دیا تھا۔ اُس نے صرف یہ کیا تھا کہ ٹارچر سیل میں جا کر لاش کے بازو سے تعویذ اُتار لیا تھا اور اسے بڑے احترام سے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ اس تعویذ نے اُس کے خیالات کو اس راستے پر ڈال دیا تھا جس پر وہ اب نہ صرف خود چلا جا رہا تھا بلکہ پورے ایک گروہ کو اپنی رہنمائی میں اس راستے پر لے جا رہا تھا۔ اس کا دین و ایمان بھارت کے مسلمانوں اور پاکستان کا اتحاد اور وقار تھا۔

چار ساڑھے چار سال بعد وہ خود اس عمارت میں ملزم کی حیثیت سے لایا گیا تھا اور پاکستانی جاسوس کا تعویذ اُس کے بازو کے ساتھ بندھا ہوا تھا جس کے خول پر لکھا تھا، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور اس کے اندر کاغذ کے ایک پُرزے پر ایک طرف کلمۂ طیبہ اور دوسری طرف لکھا تھا — کیونکر خس و خاشاک سے دب جائے مسلمان!

عبدالقدیر، ہاشمی اور اُس کی بیوی کو گاڑی سے اتار کر ایک کمرے میں لے جایا گیا۔ میجر بھاٹیہ کا دفتر تھا۔ وہ خود دفتر میں موجود تھا۔ ان تینوں کو دیکھ کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور پُرتپاک طریقے سے اُن کا استقبال کیا اور انہیں احترام سے بٹھایا۔ صرف عبدالقدیر کو معلوم تھا کہ ایسے پُرتپاک استقبال اور احترام کے پیچھے کتنی بڑی خباثت اور انٹیلی جنس کی نیت کام کر رہی ہے۔

"آپ شاید انٹیلی جنس میں رہ چکے ہیں" — میجر بھاٹیہ نے عبدالقدیر سے کہا — "ہم تو آپ کے بچے ہیں۔ آج بھی کسی نہ کسی کیس میں آپ کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ ہم تو آپ کو اپنا اُستاد مانتے ہیں۔"

"لیکن مائی ڈیئر!" — عبدالقدیر نے کہا — "آج تو میری اُستادی جواب دے گئی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے میں نے انٹیلی میں سروس نہیں کی بلکہ تیس سال جھک ماری ہے یا بھاڑ جھونکتا رہا ہوں۔"

"کیوں جناب!"

"دو آدمی گئے" — عبدالقدیر نے کہا — "مجھے اپنے کارڈ دکھاتے اور ملزموں کی طرح پکڑ کر یہاں لے آتے۔ اب اپنے خلاف الزام سننے کو بےتاب ہوں۔"

"میرا خیال ہے ہمارے چیف کو آپ سے کچھ زیادہ ہی محبت ہے" — بھاٹیہ نے ایسے منافقانہ لہجے میں کہا جسے عبدالقدیر بڑی اچھی طرح سمجھتا تھا۔

میجر بھاٹیہ ہنستا مسکراتا اُٹھا اور باہر نکل گیا۔ دس پندرہ منٹ بعد وہ دو آدمی کمرے میں داخل ہوئے جو عبدالقدیر، ہاشمی اور اس کی بیوی کو یہاں لاتے تھے۔ اُن کے ساتھ رشی تھی۔ وہ دروازے کے قریب ہی رُک گئے۔

"کیا آپ صاحبان ذرا اُس دیوار کے ساتھ کھڑے ہو جائیں گے؟" — ان میں سے ایک آدمی نے انہیں کہا — "میں گستاخی کی معافی چاہتا ہوں۔"

عبدالقدیر، ہاشمی اور اس کی بیوی کرسیوں سے اُٹھ کر دیوار کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ اتنے میں میجر بھاٹیہ بھی کمرے میں آ گیا اور انٹیلی جنس کے ان دو افسروں کے پاس کھڑا ہو گیا۔

"مسز رب نواز!" — انٹیلی جنس کے ایک افسر نے رشی سے کہا — "ان تین چہروں کو تم پہچانتی ہو گی!.... اچھی طرح دیکھ کر بتاؤ کہ انہیں تم نے کہاں دیکھا تھا۔"

رشی نے ان تینوں کو دیکھنا شروع کر دیا۔

عبدالقدیر، ہاشمی اور اس کی بیوی کی یہ کیفیت تھی جیسے اُن پر سکتہ طاری ہو گیا ہو۔ اندر سے وہ کانپ رہے تھے۔ عبدالقدیر بھی جسے تیس سال

کا تجربہ تھا، یوں محسوس کرنے لگا جیسے اندر سے کھوکھلا ہو گیا ہو۔ اُس نے آنکھیں رشی کی آنکھوں میں ڈال دیں اور کلمہ طیبہ کا وِرد دل ہی دل میں شروع کر دیا۔ یوں لگتا تھا جیسے وقت اس لمحے پر آ کر رُک گیا ہو، زمین نے اپنی گردش اور سورج نے اپنا سفر روک لیا ہو۔ عبدالقدیر کو ٹارچر سیل نظر آنے لگا، لیکن اُس نے دل ہی دل میں کلمہ طیبہ کا وِرد جاری رکھا۔

رشی ان تینوں کو باری باری سر سے پاؤں تک اور پاؤں سے سر تک دیکھ رہی تھی۔ اُس کے چہرے کے تاثر میں کوئی تبدیلی نہیں آ رہی تھی۔

بمشکل آدھا منٹ گزرا تھا، لیکن لگتا تھا آدھا گھنٹہ گزر گیا ہے۔ اس کمرے میں کوئی بھی کوئی حرکت نہیں کر رہا تھا۔ لگتا تھا سب پتھر کے بُت بن گئے ہیں۔ آخر رشی نے اپنے سر کو جنبش دی۔ اس نے انٹیلی جنس کے ایک افسر کی طرف دیکھا۔

"یہ کون لوگ ہیں؟" — رشی نے پوچھا — "آپ کہتے ہیں کہ میں ان چہروں کو پہچانتی ہوں، لیکن میں انہیں پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔"

"اچھی طرح دیکھ لو مسز رب نواز!" — میجر بھاٹیہ نے کہا۔

"کیا دیکھ لوں!" — رشی نے جھنجھلا کر کہا — "آپ کیوں میرا تماشا بنا رہے ہیں؟ معلوم ہوتا ہے آپ مجھے اپنے کسی مقصد کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔ خدا کے لئے مجھے پاکستان واپس بھیج دیں۔ میں آپ کے کسی کام نہیں آ سکتی۔"

رشی کو جس طرح اس کمرے میں لایا گیا تھا اسی طرح باہر لے گئے۔

میجر بھاٹیہ بھی اُن کے پیچھے نکل گیا۔ نکلتے نکلتے اُس نے عبدالقدیر وغیرہ سے کہا کہ کرسیوں پر بیٹھ جائیں۔ اُس کے جانے کے بعد عبدالقدیر نے اپنی ایک آستین اُوپر کر کے پاکستانی جاسوس کے تعویذ کو چوما، پھر دونوں ہاتھ اُٹھا کر اُوپر دیکھا اور بولا — "یا اللہ! تیرا شکر کس طرح ادا کروں!"

ہاشمی اور اُس کی بیوی کے چہروں پر رنگت لوٹ آئی۔

"گستاخی معاف!" — پندرہ بیس منٹ بعد میجر بھاٹیہ کمرے

میں یہ کہتے ہوئے داخل ہُوا ——— "میں آپ سے معافی مانگنے کے سوا اور کوئی بات نہیں کروں گا۔ اب فرمائیے، چائے چلے گی یا پانی؟"

"کچھ بھی نہ چلے مائی ڈیئر!" ——— عبدالقدیر نے کہا ——— "اجازت ہو تو ہم ہی چل پڑیں۔"

"ہاں ہاں" ——— میجر بھاٹیہ نے بڑے خوشگوار لہجے میں کہا ——— "آپ فارغ ہیں۔ چلئے گاڑی باہر کھڑی ہے۔"

میجر بھاٹیہ تینوں کو باہر لے گیا۔ جس ڈاج پر وہ آئے تھے، وہ باہر کھڑی تھی۔ میجر بھاٹیہ نے ڈرائیور سے کہا کہ ان تینوں کو وہیں چھوڑ آئے جہاں سے لایا تھا۔ اُس نے بڑے تپاک سے عبدالقدیر اور ہاشمی سے ہاتھ ملایا اور ہاشمی کی بیوی کے آگے جُھک کر الوداع کہا۔

ان کے جانے کے بعد میجر بھاٹیہ عزیز کو چیف کے دفتر میں لے گیا۔ یہ عبدالقدیر والا چیف نہیں تھا بلکہ انڈین انٹیلی جنس کا ڈائریکٹر ایک ہندو میجر جنرل تھا۔ عزیز پہلے سے وہاں موجود تھا، لیکن اُس نے اپنے آپ کو عبدالقدیر وغیرہ سے چھپا کر رکھا ہُوا تھا۔ ان تینوں کی نشاندہی عزیز نے ہی کی تھی، لیکن رشی نے ان تینوں کی شناخت سے انکار کر دیا تھا۔

"اب بتاؤ عزیز!" ——— چیف نے عزیز سے پوچھا ——— "معلوم ہوتا ہے تمہارے دل میں عبدالقدیر اور ہاشمی کے خلاف کوئی ذاتی دشمنی ہے۔ لڑکی نے اپنے بیان میں ان تینوں کا ذکر تک نہیں کیا تھا۔ اُس نے تو یہ بیان دیا تھا کہ اُسے اُسی کی سوسائٹی کے لڑکوں جیسے لڑکے دھوکے سے لے گئے تھے اور اُسے دو تین کوٹھیوں میں رکھا تھا، لیکن تم نے زور دے کر کہا کہ لڑکی غلط بیان دے رہی ہے اور یہ ہاشمی کے گھر رہی ہے۔"

"تم نے مجھے ان تینوں کے سامنے ذلیل کر دیا ہے" ——— میجر بھاٹیہ نے کہا۔

"تمہیں ہی نہیں" ——— میجر جنرل نے کہا ——— "سارے محکمے کو ذلیل کر دیا ہے۔"

"میں ابھی ہارا نہیں سَر!" ——— عزیز نے کہا ——— "میری بہن نے ایک لڑکی کو ہاشمی کے گھر میں دیکھا تھا۔ میں اپنی یہ کارگزاری آپ کو سُنا چکا ہوں۔ میں اپنی بہن کو کل بلکہ آج ہی یہاں لاؤں گا اور لڑکی کو اُس کے سامنے کھڑا کر کے آپ کی موجودگی میں پوچھوں گا کہ اُس نے اس لڑکی کو ہاشمی کے گھر دیکھا تھا یا وہ کوئی اور تھی۔"

"یہ بھی کر کے دیکھ لینا" ——— بھاٹیہ نے کہا ——— "میں خود چاہتا ہوں کہ شک پوری طرح رفع کر لیا جائے، لیکن لڑکی پہلے جو بیان دے چکی ہے، وہ پُرانی دلی کے کسی بھی محلے کی طرف نہیں جاتا۔"

عزیز میں یہی ایک خوبی تھی کہ وہ انتہا درجے کا ڈھیٹ اور ضدی تھا۔ انٹیلی جنس میں اُس کی کامیابی کی وجہ ہی یہی تھی۔۔۔ لڑکی ہاشمی کے گھر رہی تھی، لیکن اس کی کوئی شہادت عزیز کے ہاتھ میں نہیں تھی نہ کوئی ثبوت تھا۔ شہادت ایک ہی رہ گئی تھی۔ یہ اُس کی بہن تھی۔

"مسٹر عزیز!" ——— چیف نے کہا ——— "معلوم ہوتا ہے تمہارا دماغ پہلے جیسا کام نہیں کر رہا۔ تمہارے بیان کو میں نے غور سے سُنا ہے۔ لڑکی کو واپس لانے والی گاڑی تمہارے سامنے کھڑی تھی۔ لڑکی نے اس گاڑی کی طرف اشارہ کر کے تمہیں کہا کہ وہ اس گاڑی میں لائی گئی ہے۔ تم سے اتنا بھی نہ ہُوا کہ سب سے پہلے اُس گاڑی کا نمبر، میک اور ماڈل دیکھتے۔ انگریزی فلموں کی طرح تم نے اپنی گاڑی اُس گاڑی کے پیچھے دوڑا دی۔ نمبر پھر بھی نہ دیکھا اور مار کھا کر آ گئے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں، عبدالقدیر اور فریدالدین ہاشمی اس ٹائپ کے لوگ نہیں کہ وہ یوں تم پر حملہ کرتے جس طرح تم سناتے ہو۔ یہ کوئی پیشہ ور غنڈے تھے یا یہ آج کل کے بگڑے ہوئے نوجوان تھے۔ یہ سب کچھ سوچ کر لڑکی کا بیان صحیح معلوم ہوتا ہے۔"

"ایک منٹ کے لئے اجازت چاہتا ہوں سَر!" ——— عزیز نے اُٹھ کر کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

دو تین منٹ بعد وہ واپس آیا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک سفید چادر تھی۔ اُس

نے چادر کا ایک کونہ چیف کی میز پر اُس کے سامنے رکھا۔ اُس کونے پر دھوبی کا نشان تھا۔

"یہ دیکھیں سَر!" — عزیز نے اُنگلی دھوبی کے نشان پر رکھ کر کہا — "یہ دھوبی کا نشان ہے۔ آپ حکم دیں کہ عبدالقدیر اور ہاشمی وغیرہ جس علاقے میں رہتے ہیں وہاں کے دھوبیوں کو یہ نشان دکھا کر پوچھا جاتے کہ یہ کس کے گھر کا نشان ہے۔"

چیف نے آگے ہو کر اور میجر بھاٹیہ نے جُھک کر دھوبی مارک کو دیکھا۔

"یہ ایک سراغ ہے" — چیف نے کہا — "بھاٹیہ! یہ نشان معلوم کرنے کا انتظام کرو..... ہاں عزیز! یہ سراغ سامنے لانے پر میں تمہاری تعریف کرتا ہوں۔ ایک دن میں ملزم سامنے آجائیں گے۔"

عبدالقدیر، ہاشمی اور اُس کی بیوی کو فوجی گاڑی وہیں گلی کے باہر اُتار گئی جہاں سے لے گئی تھی۔ عبدالقدیر، ہاشمی کے گھر چلا گیا۔ واپس آتے ہوتے اُنہوں نے آپس میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ اپنے گھر آ کر بیٹھ گئے تو بھی ان پر خاموشی طاری تھی۔

"عبدالقدیر صاحب!" — آخر ہاشمی نے سکوت توڑا — "یقین نہیں آتا۔ یہ کوئی دھوکہ ہی تو نہیں؟ آپ کو انٹیلی جنس کا تجربہ ہے۔"

"میں تو اسے معجزہ کہوں گا" — عبدالقدیر نے کہا — "بیشک ہم نے لڑکی کے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا جس کی اسے توقع تھی۔ ہم نے اُس کی عزت کا پورا خیال رکھا تھا لیکن ہم نے اُسے اغوا کیا تھا، اُسے قید میں رکھا تھا۔ اُس کا ردِّعمل یہی ہونا چاہیئے تھا کہ ہمیں پکڑوا دیتی۔ یہ اُس کلاس کی لڑکی ہے جس کے لئے وطن اور مذہب کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ یہ لوگ عزت اور آبرو کو کچھ نہیں سمجھتے۔ اُن کے ہاں شخصی وقار کا تصور کچھ اور ہوتا ہے..... ہاشمی صاحب! یہ اللہ کا خاص کرم ہے..... میرا خیال ہے کہ یہ کوئی چال نہیں۔ ہم جیسے مشتبہوں کو دھوکے دیئے جاتے ہیں۔ اُنہیں یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ ان کے خلاف شبہ صاف ہو گیا ہے لیکن مخبروں کو اُن کے ساتھ ساتھ سائے کی طرح لگا دیا جاتا ہے۔"

"بھائی جان!" — ہاشمی کی بیوی نے عبدالقدیر سے کہا — "اس لڑکی نے میرے ساتھ جو باتیں کی تھیں وہ یاد کرتی ہوں تو خیال آتا ہے کہ اس کی فطرت میں انقلاب آگیا تھا اور وہ ہمیں پہچاننے سے انکار کر دے گی۔"

"میرے ساتھ بھی اُس نے ایسی ہی باتیں کی تھیں" — ہاشمی نے کہا — "لیکن آج جب انٹیلی جنس کا بلاوا آیا تو میں نے اپنے آپ کو

ذہنی طور پر تیار کر لیا تھا کہ ہم پکڑے گئے ہیں اور باقی عمر جیل میں گلتے سڑتے رہیں گے۔"

"مجھے صرف بھابی کا غم تھا" — عبدالقدیر نے کہا۔

"وہ ہمارے پاس رہنا چاہتی تھی" — ہاشمی کی بیوی نے کہا — "کہتی تھی پاکستان نہیں جاؤں گی۔ میرا تو جی چاہتا ہے کہ اسے ایک بار پھر اغوا کر کے لے آئیں۔"

"نہیں بھائی!" — عبدالقدیر نے کہا — "یہ جذباتی باتیں ہیں۔ معاملہ بڑا ہی سنگین ہے۔ ہمیں ابھی کچھ عرصہ بہت ہی محتاط ہونا پڑے گا۔"

"ہمارے دوست پریشان ہوں گے" — ہاشمی نے کہا — "آج شام انہیں یہاں بلا کر بتا دیا جائے گا کہ کیا ہوا ہے۔"

"نہیں ہاشمی صاحب!" — عبدالقدیر نے کہا — "یہ نہ سمجھیں کہ انٹیلی جنس نے ہم سے توجہ ہٹا لی ہوگی۔ مجھے ابھی ایک اور خطرہ نظر آرہا ہے۔ ہوسکتا ہے اور شاید ایسا ہی ہو کہ لڑکی کو ڈرا دھمکا کر اُس سے کہلوا لیں کہ وہ ہمارے پاس ہی رہی ہے۔ یہ تو عین ممکن ہے کہ ہمیں چھوڑ کر ایک دو مخبر ہم پر نظر رکھنے کے لئے مقرر کر دیتے گئے ہوں۔ اگر ہم یہاں اکٹھے ہوتے تو ہمارے خلاف شک پیدا ہوسکتا ہے۔ دوستوں کو بتانے کا انتظام میں یہ کروں گا کہ فرداً فرداً سب کو بتا دوں گا.... معلوم نہیں لڑکی نے کیا بیان دیا ہوگا۔"

"اُس نے کچھ تو بتایا ہوگا" — ہاشمی نے کہا — "ہمارے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔"

"یہ تو جو ہُوا سو ہُوا" — ہاشمی کی بیوی نے کہا — "اور جو ہوگا وہی ہوگا جو منظورِ خدا ہوگا۔ اب یہ سوچیں کہ ہم نے اتنا بڑا خطرہ کیوں مول لیا تھا اور اب ہمیں اس سلسلے میں کیا کرنا چاہئے۔"

"میں اس سوال کا جواب دیتا ہوں" — عبدالقدیر نے کہا — "ہم یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ ہندوستان کی انٹیلی جنس پاکستان سے

ایسے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو جو یورپی اور امریکی بے حیائی کو اپنا کلچر بنا بیٹھے ہیں، ورغلا کر اور سبز باغ دکھا کر یہاں لے آتی ہے۔ اتفاق سے انڈین انٹیلی جنس کا ایک ایجنٹ ہمارے سامنے آگیا جسے ہم بڑی اچھی طرح جانتے اور پہچانتے تھے۔ یہ عزیز ہے۔"

"یہ تو پتہ چل گیا ہے" — ہاشمی نے کہا — "اس میں کوئی شک نہیں رہا کہ انڈین انٹیلی جنس کا یہ کام عزیز بھی کرتا ہے اور اس لڑکی اور اس کے خاوند کو وہ اسی مقصد کے لئے یہاں لایا تھا۔ اب ہمیں یہ یقین ہوگیا ہے کہ یہ لڑکی نہیں جانتی کہ اُس کا خاوند انٹیلی جنس کا ایجنٹ بن چکا ہے۔ ہم یہی معلوم کرنا چاہتے تھے اور ہمارا شک یقین میں بدل چکا ہے۔ اب بتائیے کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے۔"

"میں بتاتا ہوں" — عبدالقدیر نے مسکراتے ہوئے کہا — "یہ تو میں پہلے ہی سوچ چکا ہوں۔ یہاں یعنی انڈیا میں ہم اس رنگ کو نہیں توڑ سکتے۔ یہ پاکستان میں توڑا جائے گا۔ میں نے لڑکی سے اُس کے ماں باپ اور اُس کے خاوند کے باپ کے متعلق پوری تفصیلات اسی لئے لی تھیں کہ مجھے اصل کارروائی پاکستان میں کرنی تھی۔ میں آپ کو پہلے بتا چکا ہوں کہ پاکستان کی انٹیلی جنس کا ایک آدمی جو یہاں مقیم ہے میری نظر میں ہے۔ وہ مجھے جانتا ہے اور میں اُسے جانتا ہوں۔"

"میرے ساتھ آپ نے اُس کا تعارف کبھی نہیں کرایا" — ہاشمی نے کہا۔

"اور کراؤں گا بھی نہیں" — عبدالقدیر نے کہا — "ہوسکتا ہے آپ اُسے ملے بھی ہوں لیکن میں اپنی زبان سے کبھی نہیں کہوں گا کہ یہ ہے وہ آدمی۔"

"نہیں نہیں!" — ہاشمی نے کہا — "میں آپ کا مطلب سمجھتا ہوں۔ مجھے نہ بتائیں۔ کبھی نادانستہ طور پر بات مُنہ سے نکل جاتی ہے۔"

"ہاشمی صاحب!" — عبدالقدیر نے ذرا آگے ہو کر رازداری

کے لہجے میں کہا — "ہمارا محاذ پھیلتا جا رہا ہے اور اس میں مجاہدین کا اضافہ ہو رہا ہے۔ اس خطرے کو ہر وقت ذہن میں رکھیں کہ انڈین انٹیلی جنس کا کوئی مخبر بھی مجاہد کے بہروپ میں ہمارے محاذ میں شامل ہو سکتا ہے۔"

"میں تو اور زیادہ شکّی مزاج ہوں" — ہاشمی نے کہا — "جُوں جُوں محاذ کی نفری بڑھتی جا رہی ہے مجھے یہ خدشہ نظر آنے لگا ہے کہ انہی میں سے کوئی غدار نہ نکل آئے۔ آپ جانتے ہیں کہ جہاں ولولہ اور شجاعت تاریخِ اسلام کا طرۂ امتیاز ہے وہاں غدّاری اور ایمان فروشی بھی ہماری تاریخ کا ایک لازمی حصّہ ہے۔"

"ہمیں محتاط ہونا پڑے گا" — عبدالقدیر نے کہا — "اور اس کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ خطرے قبول کرنے پڑیں گے ... مَیں آپ کو بتا رہا تھا کہ ایک پاکستانی ایجنٹ کے ساتھ میرا رابطہ ہے۔ میں اُسے اس لڑکی کا اور اس کے سُسر کا پاکستان کا ایڈریس دوں گا اور اُسے بتاؤں گا کہ اس لڑکی کا خاوند رب نواز جو اپنی سوسائٹی میں رابی کہلاتا ہے، انڈین انٹیلی جنس کا کل پُرزہ بن چکا ہے اور پاکستان کا یہ نوجوان پاکستان کے لئے اس لئے خطرناک ہے کہ اس کا باپ وہاں کی ڈیفینس سروسز میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہے اور انتہائی قیمتی اور خطرناک راز اس کی فائلوں میں موجود ہوں گے۔"

ان کے درمیان پھر خاموشی طاری ہو گئی۔ وہ فضا میں ایک خطرے کی بُو سونگھ رہے تھے۔ اُن کے دلوں سے گھبراہٹ کم ہو گئی تھی لیکن ختم نہیں ہوئی تھی۔ تینوں کے ذہنوں میں یہی ایک سوال کلبلا رہا تھا کہ رِشی نے انٹیلی جنس کے افسروں کو کیا بتایا ہو گا کہ وہ کہاں چلی گئی تھی۔

❦

رِشی نے انڈین انٹیلی جنس کے میجر بھاٹیہ کو پھر میجر جنرل کو جو بیان دیا تھا وہ انڈین انٹیلی جنس کو بڑی حد تک قابلِ قبول تھا۔

"اُس روز عزیز اور رابی مجھے ہوٹل میں چھوڑ کر چلے گئے تھے" —

رِشی نے بیان میں کہا تھا — "شام کے وقت ایک نوجوان جو زبان سے اینگلو انڈین معلوم ہوتا تھا، میرے کمرے میں آیا۔ مجھے اس طرح شک ہوتا ہے کہ اسے مَیں نے اُن دو کلبوں میں سے ایک میں دیکھا تھا جن میں مجھے اور رابی کو لے جایا گیا تھا۔ اگر وہ میرے سامنے آئے تو میں اُسے پہچان سکتی ہوں ....

"اُس نے مجھے کہا کہ عزیز اور رابی مجھے بلا رہے ہیں۔ وہ ایک انگریزی پکچر دیکھیں گے۔ اس اینگلو انڈین نے مجھے کہا تھا کہ وہ ہمیں پکچر دکھا رہا ہے۔ میں اُس کے ساتھ چل پڑی۔"

"تم نے کمرہ لاک کر کے چابی کاؤنٹر پر نہیں دی تھی؟" — میجر بھاٹیہ نے اُس سے پوچھا۔

"خیال ہی نہیں رہا تھا" — رِشی نے جواب دیا — "یہ پہلا موقع تھا کہ میں اتنے بڑے ہوٹل میں ٹھہری تھی۔ مجھے اس ہوٹل کا دستور معلوم نہ تھا .... میں کمرہ لاک کئے بغیر اس اینگلو انڈین نوجوان کے ساتھ چل پڑی۔ وہ مجھے ہوٹل کے گیٹ سے باہر لے گیا۔ کچھ دُور ایک کار کھڑی تھی۔ اس کے سٹیئرنگ پر اسی کی عمر کا ایک نوجوان بیٹھا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا اور ہیلو بھی کہا۔ مجھے پچھلی سیٹ پر بٹھایا گیا۔ مجھے ہوٹل سے لانے والا میرے ساتھ بیٹھ گیا اور گاڑی چل پڑی۔"

"تمہیں ہوٹل سے لانے والا تمہارے ساتھ باتیں کرتا رہا تھا؟" — میجر بھاٹیہ نے پوچھا — "اگر کرتا رہا تھا تو اُس کا مُوڈ کیسا تھا؟"

"اُس کا مُوڈ سنجیدہ نہیں تھا" — رِشی نے جواب دیا — "وہ بڑی بے تکلفی سے باتیں کر رہا تھا جیسے میرا دوست ہو۔ مَیں بھی اُس کے ساتھ بے تکلف رہی۔ اُس نے ذرا سا بھی شک نہ ہونے دیا کہ مجھے اغوا کیا جا رہا ہے۔ گاڑی چل پڑی۔ مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ یہ دونوں مجھے کہاں لے جا رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد گاڑی ایک ایسی سڑک پر چلی گئی جہاں روشنی بھی کم تھی۔ گاڑی ایک موڑ مُڑ کر رُک گئی۔ فٹ پاتھ پر دو آدمی کھڑے تھے۔ دونوں گاڑی کی طرف آئے۔ ایک میرے ساتھ پچھلی سیٹ پر اور دوسرا

اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔"

"اُنہوں نے کچھ کہا تھا؟"

"نہیں!" —— رِشی نے جواب دیا —— "وہ خاموشی سے بیٹھ گئے تھے اور خاموش ہی رہے تھے۔ گاڑی چل پڑی اور پھر اچانک میرے دائیں اور بائیں بیٹھے ہوئے دونوں آدمیوں نے مجھے جکڑ لیا پھر ایک نے ایک کپڑا میری آنکھوں پر رکھ کر میرے سَر کے پیچھے باندھ دیا۔ میرا دوپٹہ میرے سر پر ڈال دیا گیا۔ وہ جو مجھے ہوٹل سے لایا تھا اُس نے مجھے کہا کہ مُنہ سے آواز نہ نکالنا ورنہ ماری جاؤ گی۔ ہم تمہیں ہمیشہ کے لئے اغوا نہیں کر رہے۔ دو تین دن تمہیں ساتھ رکھیں گے۔ تم ہماری کمپنی کو انجوائے کرو گی۔ ہم تمہیں یہیں چھوڑ جائیں گے۔ میں نے انہیں کہا کہ جس طرح تم مجھے لے جا رہے ہو اس طرح میں خاک انجوائے کروں گی؟ کیا تم مجھے میرے خاوند کے ساتھ انوائیٹ نہیں کر سکتے تھے؟ ....

"اُس نے کہا کہ خاوند ساتھ ہو تو سارا مزہ بگڑ جاتا ہے۔ پھر بھی گھبراؤ نہیں۔ تم واپس آ رہی ہو۔ ہم تمہاری ہی سوسائٹی کے لڑکے ہیں۔ فرق صرف انڈین اور پاکستانی کا ہے۔ ہم نے سُنا ہے کہ اس سوسائٹی کی پاکستانی لڑکیاں بہت سوِیٹ اور فری ہوتی ہیں .... یہ کہہ کر اُس نے ایک بازو میرے گلے میں ڈال دیا اور میرا سَر اپنے کندھے پر رکھ کر اپنا ایک گال میرے سر پر رکھ دیا۔ دوسرے نے میرا ایک ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ میں انہیں روک نہ سکی۔ میں ان کے قبضے میں تھی۔ گاڑی بڑی تیز رفتار سے جا رہی تھی۔ میں نے انہیں کہا کہ میں ان کی مہمان ہوں اور کیا وہ مہمانوں کے ساتھ یہ سلوک کیا کرتے ہیں؟ میرے دوسرے پہلو میں بیٹھے ہوئے نوجوان نے انڈیا اور پاکستان کو گالی دے کر کہا کہ ہمارا کوئی ملک نہیں۔ ہر وہ ملک ہمارا ہے جس میں عیش و عشرت اور پیار و محبت کی آزادی ہے۔ تم نہ پاکستانی ہو نہ انڈین ہو۔"

"بولنے کے انداز اور لہجے سے وہ چاروں اینگلو انڈین لگتے تھے؟"

"دو تو یقیناً اینگلو انڈین تھے" —— رِشی نے جواب دیا —— "دوسرے دو صرف انڈین لگتے تھے۔ معلوم نہیں مسلمان تھے یا ہندو۔ وہ ہمارے لہجے میں انگریزی بولتے تھے۔"

رِشی نے بڑی ہوشیاری اور چالاکی سے جھوٹ بولا۔ اُس نے باقی جو بیان دیا تھا وہ کچھ اس طرح تھا کہ یہ نوجوان ٹولہ اُسے سیڑھیاں چڑھا کر اُوپر ایک جگہ لے گیا۔ اُس کی آنکھوں سے پٹی ہٹائی گئی تو اُس نے دیکھا کہ کسی کوٹھی کا ایک کمرہ ہے۔ وہاں یہ چاروں نوجوان موجود تھے۔ انہوں نے اُسے یقین دلایا کہ وہ اُن کی مہمان ہے اور سوائے عیش موج کرنے کے اور کچھ بھی نہیں ہوگا۔ رِشی نے کہا کہ اتنے دن اُسے اسی کمرے میں رکھا گیا۔

"تم اتنے دن اُن کے ساتھ رہیں" —— اُس سے پوچھا گیا —— "اور اسی کمرے میں رہیں۔ کیا تم نے کھڑکیوں میں سے باہر دیکھنے کی کبھی کوشش کی تھی؟"

"کی تھی" —— اُس نے جواب دیا —— "یہ فلیٹ کا کمرہ تھا اور شاید یہ تیسری منزل تھی۔"

اُس نے ویسے ہی کچھ بتا دیا کہ کھڑکی میں سے اُسے کیا نظر آیا۔ اُس نے کہا کہ اُسے کچھ فلیٹ اور باقی سب کوٹھیاں دکھائی دیں۔ اُس سے کچھ نشانیاں پوچھی گئیں لیکن وہ دِلّی کی نشانیوں کو نہیں سمجھتی تھی۔ اُس نے کہا کہ وہ انڈیا پہلی بار آئی ہے۔

اُس نے خود اعتمادی سے جھوٹ بولا۔ کہا کہ ان لڑکوں میں سے دو نے صرف ایک ایک بار اُس پر مجرمانہ حملہ کیا لیکن اسے وہ زبردستی نہیں کہہ سکتی کیونکہ وہ اُسے شراب پلاتے تھے۔ وہ نشے میں لڑکوں کے کیسٹ پلیئر پر انگریزی گانوں پر ناچتی تھی اور نشے میں ہی سب کچھ ہوتا تھا۔

واپسی کے متعلق اُس نے یہ کہانی گھڑ کر سنائی کہ جو اینگلو انڈین

نوجوان اُسے ہوٹل کے کمرے سے دھوکے میں لے گیا تھا، اُس نے
اُس کے ساتھ کوئی نازیبا حرکت نہیں کی تھی۔ کچھ روز بعد وہ دن کے وقت
اکیلا اُس کے پاس آیا اور جذباتی انداز میں والہانہ محبت کا اظہار کیا اور
کہنے لگا کہ وہ اُس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔ اُس نے رِشی کی منت سماجت
کی کہ وہ اُس کی محبت کو قبول کرلے۔ اس اینگلو انڈین نے کہا کہ اُس نے
اُسے تفریح طبع کے لئے اغوا کیا تھا لیکن وہ اُس کی محبت میں گرفتار
ہو گیا ہے۔

"مَیں ان سے آزاد ہونا چاہتی تھی" — رِشی نے بیان دیتے ہوتے
کہا — "اس کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ میں نے اس نوجوان سے جھوٹ مُوٹ
کہہ دیا کہ میں اس کے ساتھ شادی کرلوں گی۔ اُسی رات اُس نے اپنے
ساتھیوں سے کہہ دیا کہ یہ لڑکی میری ہے اور اب کوئی اسے بُری نظر
سے نہ دیکھے۔ اُس کے دوستوں نے اُس کی بات نہ مانی۔ اس پر ان
کا آپس میں زبانی جھگڑا ہوا پھر رات کو ان کی آپس میں ہاتھا پائی ہوتی۔
نوبت خون خرابے تک پہنچ گئی تھی۔ اینگلو انڈین یہ دھمکی دے کر چلا گیا
کہ وہ ریوالور لے کر آتا ہے ....

"اُس کے جانے کے بعد باقی تین لڑکوں نے میری موجودگی میں
آپس میں صلاح مشورہ کیا اور اس فیصلے پر پہنچے کہ مجھے واپس چھوڑ آئیں
ورنہ وہ دوست ایک دوسرے کا خون بہادیں گے۔ انہوں نے اُسی
وقت مجھے کمرے سے نکالا اور میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر کمرے
سے لے گئے۔ دو لڑکوں نے مجھے سہارا دے کر سیڑھیوں سے اُتارا
پھر گاڑی میں بٹھایا۔"

"وہ تمہیں عزیز کے گھر کیوں لے گئے تھے؟" — میجر بھاٹیہ نے
رِشی سے پوچھا — "کیا اُنہوں نے تمہارے سامنے کوئی بات کی تھی؟"

"یہ بات گاڑی میں ہوتی تھی" — رِشی نے جواب دیا — "وہ مجھے
ہوٹل میں لے جا رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ ہوٹل کے علاقے
میں پکڑے جانے کا خطرہ ہے۔ اسے عزیز کے گھر چھوڑ آتے ہیں۔ اس

کا خاوند ہوٹل سے عزیز کے گھر شفٹ ہو گیا ہے۔ ایک نے پوچھا
تم کیسے جانتے ہو؟ اُس لڑکے نے جواب دیا کہ میں اس کے خاوند
رابی کی دعوت پر جو عزیز نے دی تھی وہاں جا چکا ہوں۔ عزیز تو اپنا
یار ہے۔ گریٹ آدمی ہے۔"

میجر بھاٹیہ اور انٹیلی جنس کے چیف ہندو میجر جنرل نے رِشی
پر اس طرح جرح کی تھی جس طرح عدالت میں وکیل کیا کرتے ہیں اور پوچھ گچھ
اس طرح کی تھی جس طرح جاسوسی کے مشتبہ سے کی جاتی ہے لیکن رِشی
اپنے بیان پر قائم رہی۔ اُس نے شک نہ ہونے دیا کہ اُس نے سارا بیان
جھوٹا دیا ہے۔

جس وقت عبدالقدیر، ہاشمی کے گھر بیٹھا ہوا تھا اور وہ، ہاشمی اور
اُس کی بیوی آنے والے خطروں کے متعلق باتیں کر رہے تھے، اُس وقت
میجر بھاٹیہ، ایک کرنل اور ایک سکھ میجر انٹیلی جنس کے چیف میجر جنرل کے
کمرے میں بیٹھے ہوتے تھے۔ وہ اس مسئلے پر غور کر رہے تھے کہ رِشی کا
کیا کیا جاتے۔ چیف اور بھاٹیہ نے کرنل اور سکھ میجر کو تفصیلاً بتایا تھا کہ رِشی
اپنے خاوند کے ساتھ کیوں یہاں آئی تھی۔ رِشی کے اغوا کی تفصیل بھی
انہیں سنائی گئی اور اُس کا بیان بھی سنایا گیا اور یہ بھی بتایا گیا کہ رِشی
کو معلوم نہیں کہ اُس کا خاوند ہماری انٹیلی جنس میں نہ صرف شامل ہو چکا ہے
بلکہ اُس نے دِلی طور پر اس کام کو قبول کیا ہے۔

"ہمیں یہ خطرہ محسوس ہو رہا تھا" — میجر جنرل نے کہا — "کہ اس
لڑکی کا اغوا پاکستان کی کاؤنٹر انٹیلی جنس کی کارروائی ہے۔ اس سے ہم
انکار نہیں کر سکتے کہ پاکستان کی انٹیلی جنس جو ساری دنیا میں آئی ایس آئی
کے نام سے مشہور ہو گئی ہے، انڈیا میں موجود ہے۔ اس کے ایجنٹ
پاکستانی بھی ہیں اور انڈین مسلمان بھی۔ پاکستانی اور انڈین مسلمان کے درمیان
فرق معلوم کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔"

"سر! اتنا مشکل بھی نہیں" ـــ ہندو کرنل نے کہا ـــ "اگر ہمارے سے انڈین مسلم انہیں پناہ نہ دیں...."

"کرنل اوجھا!" ـــ میجر جنرل نے کہا ـــ "تم نے کتنی کمزور بات کہی ہے۔ یہی تو اصل مسئلہ ہے کہ انڈین مسلم پاکستانی ایجنٹوں کو پناہ میں لے لیتے ہیں اور انہیں اپنے رشتہ دار ظاہر کرتے ہیں۔ مسجدوں اور مدرسوں میں انہیں مولوی بنا دیتے ہیں۔ بعض کو دکانیں کھول دیتے ہیں۔ انہیں داماد تک بنا لیتے ہیں۔ اسی لئے تو ہماری حکومت انڈیا اور پاکستان کے درمیان اسلام کا رشتہ توڑنے کی کوشش کر رہی ہے۔ مسلمانوں کو انعام اور مراعات کے ذریعے اُکسایا جا رہا ہے کہ وہ ہندو لڑکیوں کے ساتھ شادی کریں۔ یہ تو تم سب جانتے ہو کہ مسلمانوں کو کیسے کیسے زمین دوز طریقوں سے اسلام سے دُور کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ایسی ہندو لڑکیاں سامنے آگئی ہیں جو مسلمانوں کے ساتھ شادیاں کر رہی ہیں۔"

"سر!" ـــ سکھ میجر نے کہا ـــ "ضرورت یہ ہے کہ پاکستان اور بھارت کے مسلمانوں کے درمیان نفرت پیدا کی جائے۔ یہ میں جانتا ہوں کہ ہماری 'را' یہ کام کر رہی ہے لیکن اس کام کو اور تیز کرنا چاہیئے۔"

"میجر سجن سنگھ!" ـــ چیف نے طنزیہ مسکراہٹ سے کہا ـــ

"یہ کام پاکستان کی حکومت خود ہی کر رہی ہے۔ وہاں حکومت ایوب کی ہو، بھٹو یا ضیاء کی ہو، وہ اپنی حکومت کو مضبوط اور اپنے دورِ حکومت کو لمبا کرنے میں مگن ہو جاتے ہیں۔ کھاتے پیتے اور عیش موج کرتے ہیں۔ پیسوں، اناج اور اسلحہ کے لئے امریکہ کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ امریکہ نے پاکستان کو خرید لیا ہے۔ انڈیا میں مسلمان ہندوؤں کے ہاتھوں قتل ہو رہے ہیں۔ پاکستان کی کسی حکومت کو آج تک جرأت نہیں ہوتی کہ ہماری حکومت سے احتجاج کرے۔ پاکستان کے اس رویّے سے انڈیا کے مسلمانوں کے دلوں سے پاکستانیوں کی محبت نکلتی جا رہی ہے۔ 'را'

اس مہم کو تیزی سے سر کر رہی ہے۔ یہ تمہیں معلوم ہوگا کہ ہم بھی اس سلسلے میں بہت کچھ کر رہے ہیں۔ علی گڑھ میں ہندوؤں نے مسلمانوں کے خلاف جو فساد شروع کیا تھا اور جو ختم ہونے میں ہی نہیں آتا تھا، وہ ہم نے ہی یعنی انٹیلی جنس نے شروع کرایا تھا۔ وہاں مسلمانوں نے اسلحہ اکٹھا کرنا شروع کر دیا تھا اور وہاں پاکستانی کچھ زیادہ ہی تعداد میں اکٹھے ہو گئے تھے۔ اُن کے پاس باقاعدہ پاسپورٹ اور ویزے تھے لیکن انہیں وہاں سے نکالنا ضروری تھا۔ مسلمانوں کے گھروں سے اسلحہ بھی نکالنا تھا اور مسلمانوں کے اس تعلیمی اور ثقافتی مرکز علی گڑھ کی اہمیت کو بھی ختم کرنا تھا۔ حکومت نے یہ کام ہمارے سپرد کیا اور ہم نے یہ کام کر دیا۔"

"سر!" ـــ کرنل اوجھا نے چیف سے کہا ـــ "آپ ہمیں ایک لڑکی کے متعلق بریفنگ دے رہے تھے۔"

"ہاں!" ـــ چیف نے کہا ـــ "میں کہہ رہا تھا کہ اس لڑکی کا اغوا آئی ایس آئی کی کارروائی ہو سکتی تھی لیکن لڑکی کے بیان اور ہماری تفتیش سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ اسے پاکستانی جاسوسوں نے اغوا نہیں کیا تھا۔ ہم اگر مزید غور کریں تو خیال آتا ہے کہ پاکستانی ایجنٹوں نے اسے اغوا کر کے اس سے کیا حاصل کیا؟ وہ اس لڑکی کے خاوند کو اغوا کرتے.... پیشتر اس کے کہ میں اپنی رائے دوں، میں تمہاری رائے معلوم کرنا چاہتا ہوں.... کرنل اوجھا!"

"میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں سر!" ـــ کرنل اوجھا نے کہا۔

"مجھ سے صرف اس لئے اتفاق نہ کرو کہ میں میجر جنرل اور تمہارے محکمے کا چیف ہوں" ـــ میجر جنرل نے کرنل کی بات سُنے بغیر کہا ـــ "آزادانہ رائے دو۔"

"لڑکی کو ان آوارہ اور مغرب زدہ لڑکوں نے ہی اغوا کیا تھا" ـــ کرنل اوجھا نے کہا ـــ "میں نے انہیں آوارہ کہا ہے لیکن یہ لوگ اس آوارگی کو کلچر کہتے ہیں۔ یہ پاپ سوسائٹی ہے جو ترقی یافتہ ملکوں سے شروع ہوئی اور ساری دنیا میں پھیل گئی ہے۔ ہم جیسے تیسری دنیا کے

ملکوں نے اس کا زیادہ اثر قبول کیا ہے۔ یہ امیر کبیر خاندانوں کے لڑکوں
اور لڑکیوں کی سوسائٹی ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں کے نوجوانوں نے شاید
کوئی اخلاقی حد مقرر کی ہوگی لیکن ہم لوگ انتہا پسند ہیں۔ ہمارے
نوجوانوں نے باقاعدہ غنڈہ گردی شروع کر رکھی ہے۔ ان کے ذہنوں
پر جنس، سیکس سوار ہے۔ ان میں ہم جنسی کا رجحان بھی پیدا ہو گیا ہے۔
ایسے کیس تو ہوتے ہی رہتے ہیں کہ دو تین لڑکے کسی لڑکی کو اٹھا کر لے
گئے اور رات اپنے پاس رکھ کر صبح اُسے چھوڑ دیا.... سر! یہ میرا مشاہدہ
ہے کہ ایک رات کے لئے اغوا ہونے والی لڑکی اگر اسی سوسائٹی کی
ہے تو وہ اس سے لطف اُٹھاتی ہے، شکایت نہیں کرتی۔ مجھے معلوم
نہیں کہ اس لڑکی کا ردِ عمل کیا ہے۔ اگر میں اس کا ری ایکشن دیکھ لوں تو ہی
بتا سکتا ہوں کہ اسے واقعی اس کے اپنے جیسے نوجوانوں نے اغوا کیا تھا۔"

"گڈ!" — چیف نے داد دیتے ہوئے کہا — "لڑکی بہت خوش
نہیں لیکن پریشان اور خفا بھی نہیں۔"

"میں کہہ سکتا ہوں کہ اس نے انجوائے کیا ہے" — میجر بھاٹیہ
نے کہا — "اس نے ایک بار بھی نہیں کہا کہ اس کے ساتھ زیادتی ہوئی
ہے اور انڈیا میں آکر وہ ذلیل ہوئی ہے، یا یہ کہ پولیس ان لڑکوں کو گرفتار
کرے.... ہم اس لڑکی اور اس کے خاوند کو ان نوجوانوں کے دو کلبوں
میں لے گئے تھے۔ یہ اس کے خاوند کی برین واشنگ کے سلسلے میں ایک
اقدام تھا۔ ہمارا ایک ایجنٹ عزیز ان کلبوں اور چند ایک ڈسکو ٹائپ
نوجوانوں کا دوست ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ جن پاکستانی نوجوانوں کو انڈیا
میں ہم اپنے مقصد کے لئے لاتے ہیں انہیں ان کلبوں میں لے جایا جاتا
ہے۔ وہاں جو کچھ ہوتا ہے یہ ان نوجوانوں کی روحانی غذا ہے۔ ہمارے
اینگلو انڈین لڑکوں کو یہ لڑکی اچھی لگی تو اسے اپنے ساتھ لے گئے۔"

"یہ تو اس لڑکی کا اپنا بیان ہے" — میجر جنرل نے کہا — "اس
شام لڑکی ہوٹل میں اکیلی تھی۔ عزیز اس کے خاوند کو کہیں لے گیا ہوگا۔ اتفاق

سے یہ لڑکے ہوٹل میں چلے گئے ہوں گے اور لڑکی ان کے ساتھ اپنی
شام منانے نکل گئی ہوگی۔ لڑکوں نے یہ دیکھ کر کہ لڑکی ان کے ساتھ خوش
ہے تو اسے اتنے دن اپنے پاس رکھا۔"

"سر!" — سکھ میجر نے کہا — "اگر یہ پاکستانی ایجنٹوں کے ہاتھ
نہیں چڑھ گئی تھی تو اسے چلتا کریں۔ اس کے خاوند کو توجہ میں رکھیں....
اُس کا ردِ عمل کیا ہے؟"

"وہ اس لڑکی پر شک کرتا ہے کہ یہ خود گئی تھی" — چیف نے
کہا — "یہ اس مسئلے کا دوسرا پہلو ہے جو میں تمہیں بتانا چاہتا ہے۔ چونکہ
تم اسی شعبے سے تعلق رکھتے ہو اس لئے تمہارا اس پہلو سے باخبر ہونا
ضروری ہے.... لڑکی کا خود ان لڑکوں کے ساتھ چلے جانا یا اغوا ہونا
ہمارے کام آ رہا ہے۔ ہم نے اس کے خاوند کو جو رابی کہلاتا ہے اور
پورا نام رب نواز ہے، اپنی ایک لڑکی کے ساتھ اٹیچ کر دیا ہے۔ یہ لڑکی
ہندو ہے، لیکن اس کا تعارف زینت آفتاب کے نام سے کرایا گیا ہے
اور اس کا نک نام زینی رکھا ہے۔ یہ ایک نوجوان بیوہ ہے۔ اسے ہم نے
دو سال پہلے ایک آشرم سے لیا اور اسے ٹریننگ دی تھی۔ ہم چاہتے
ہیں کہ رابی اس لڑکی کے جال میں آجائے اور اس کے ساتھ شادی کرلے۔
ہم اس لڑکی کو پاکستان میں داخل کرنا چاہتے ہیں۔ میجر بھاٹیہ بتاتا ہے کہ رابی
زینی کے جال میں آگیا ہے" — چیف نے میجر بھاٹیہ کی طرف دیکھا اور
چُپ ہو گیا۔

"ہمارے ایجنٹ عزیز نے یہ رپورٹ دی ہے" — میجر بھاٹیہ
نے کہا — "کہ رابی نے اپنی بیوی کا یہ بیان تسلیم نہیں کیا کہ اُسے اغوا
کیا گیا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ وہ خود گئی تھی۔ وہ دراصل اپنی بیوی کے حق میں
کوئی بات سُننا ہی نہیں چاہتا کیونکہ اُس پر زینی کا جادو چل گیا ہے۔ عزیز نے
بتایا ہے کہ زینی رشی کے پاؤں اکھاڑ رہی ہے اور رابی کے دل میں
رشی کے خلاف زہر بھر رہی ہے۔ وہ کامیاب جا رہی ہے۔"

"کیا اِن کی شادی یہاں کرائی جاتے گی؟" — کرنل ادجھا نے پوچھا۔

"نہیں!" — چیف نے جواب دیا — "یہ ایک ڈرامہ کھیلا جاتے گا .... میرا خیال ہے کہ اِس میٹنگ کو ہم وائنڈ اَپ کریں۔ رابی اور اُس کی بیوی رِشی کو ہم واپس پاکستان بھیج رہے ہیں۔ رابی کی برین واشنگ ہو چکی ہے۔ یہ سونے کے انڈے دینے والی مُرغی ہے۔"

"سر!" — کرنل ادجھا نے پوچھا — "مَیں نے تو سُنا تھا کہ عزیز اور اُس کے ساتھی ورما نے بڑی پکّی رپورٹ دی تھی کہ لڑکی کو یہاں کے...."

"مسلمانوں نے اغوا کیا تھا" — میجر جنرل نے اُس کی بات پوری کرتے ہُوتے کہا — "اور اسے پُرانی دِلّی کے ایک محلّے میں رکھا تھا .... لڑکی کے بیان نے اس کی تردید کر دی ہے۔ ہمارے لئے لڑکی کا بیان زیادہ قابلِ قبول ہے۔ تم نے آج دیکھا ہے کہ عزیز اور ورما کی نشاندہی پر دو آدمیوں اور ایک عورت کو یہاں بلایا گیا تھا اور لڑکی کو اِن کے سامنے کیا گیا تھا لیکن لڑکی نے ان کی شناخت نہیں کی۔ عزیز کے پاس ایک چادر ہے جو لڑکی پر ڈال کر اغوا کرنے والے اُسے واپس لاتے تھے۔ چادر پر دھوبی کا نشان ہے۔ میجر بھاٹیہ پولیس سے معلوم کراتے گا کہ یہ نشان اُس محلے کے دھوبی کا ہے یا نہیں جس کی نشاندہی عزیز کرتا ہے۔"

❦

عزیز کی تو یہ بہت بڑی شکست تھی۔ اُس کا ساتھی ورما بھی پریشان تھا۔ اُس کی جو پٹائی عبدالقدیر، ہاشمی اور ان کے دوستوں نے کی تھی، وہ اس کا بھی انتقام لینا چاہتا تھا۔

عزیز نے میجر بھاٹیہ سے کہا تھا کہ وہ اپنی بہن کو ساتھ لاتے گا اور رِشی کو اُس کے سامنے کر کے پوچھے گا، کیا وہ لڑکی یہی نہیں تھی جسے اُس نے ہاشمی کے گھر دیکھا تھا؟ میجر بھاٹیہ نے اُسے کہا تھا کہ وہ بہن کو ضرور لاتے اور رِشی کی شناخت کراتے۔

رات نو بجے کے کچھ بعد عزیز کی گاڑی اپنی بہن کے گھر کے سامنے رُکی۔ اُس نے گاڑی سے نکل کر دروازے پر دستک دی۔ اس کے بہنوئی جمیل نے دروازہ کھولا۔ عزیز بازو پھیلا کر اُس کے ساتھ لپٹ گیا جیسے اُن کی ملاقات بڑے لمبے عرصے کے بعد ہوتی ہو۔ جمیل نے اپنے بازو نیچے ہی رکھے۔ وہ عزیز کا والہانہ استقبال کرنے کے مُوڈ میں نہیں تھا۔ جمیل نے اُسے اتنا بھی نہ کہا کہ اندر چلو۔

"آپا ہیں نا!" — عزیز نے کہا اور جمیل کو دروازے میں ہی کھڑا چھوڑ کر اندر چلا گیا۔

عزیز کی بہن زبیدہ نے شاید عزیز کی آواز سن لی تھی۔ وہ بچّوں کے کمرے سے نکل کر دیوان خانے کے دروازے تک آگئی۔ عزیز کو دیکھ کر اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور اُس کی سانسیں تیز ہو گئیں۔

"میری آپا!" — عزیز بازو پھیلا کر نعرہ سا لگاتے ہوتے اُس کی طرف بڑھا۔

زبیدہ کا ردِعمل اپنے خاوند جمیل سے زیادہ سرد تھا، لیکن عزیز کے ڈھیٹ پن کی انتہا یہ تھی کہ بہن کی سرد مہری بھانپنے کے باوجود بھی اُس نے بہن کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ بہن کے کہے بغیر وہ دیوان خانے میں چلا گیا جہاں بتیاں بجھی ہوتی تھیں۔ عزیز نے خود ہی سوئچ آن کئے اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ جمیل اور زبیدہ بھی اندر آگئے، لیکن وہ بیٹھے نہیں۔

"کیا لینے آتے ہو یہاں؟" — زبیدہ نے عزیز سے پوچھا تو دھیمی آواز میں لیکن اس آواز میں قہر و غضب بھرا ہُوا تھا۔

"آپا!" — عزیز نے بڑے شگفتہ لہجے میں کہا — "وہ جس لڑکی کو تم نے ہاشمی کے گھر میں ...."

"میں کسی لڑکی اور کسی ہاشمی کو نہیں جانتی" — زبیدہ نے کھڑے کھڑے کہا۔

جمیل بازو اپنے سینے پر لپیٹے ٹیڑھی آنکھوں سے عزیز کو دیکھ

رہا تھا۔

"آپا!" ——— عزیز نے حیرت زدگی کے لہجے میں پوچھا ——— "کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ .... مَیں اُس لڑکی کی بات کر رہا ہُوں"۔

"دیکھ عزیز!" ——— زبیدہ نے ذرا تحمّل سے کہا ——— "چلا جا یہاں سے۔ بہت ہو چکی"۔

"کیا ہو چکی آپا؟" ——— عزیز نے بدستور شگفتہ لہجے میں کہا۔ پھر ہنس کر بولا ——— "معلوم ہوتا ہے جمیل بھائی جان نے تمہارے دماغ میں کوئی اُلٹی بات ڈال دی ہے"۔

جمیل اُسے پہلے کی طرح ٹیڑھی نظروں سے دیکھتا رہا۔

"میرا دماغ خود ہی جاگ اُٹھا ہے" ——— زبیدہ نے غصّے پر قابو پاتے ہوئے کہا ——— "میرے بے غیرت بھائی! تُو نے مجھے کچھ اور بتایا اور راز یہ کُھلا کہ تُو ہندوؤں کا جاسوس ہے"۔

"اوہ میری کم فہم آپا!" ——— عزیز نے اپنے ماتھے پہ ہاتھ مار کر عام سے لہجے میں کہا ——— "کیسا بے ہُودہ خیال کسی نے تمہارے ذہن میں ٹھونس دیا ہے"۔

"اپنی بڑی بہن کو تھانے چڑھا کر بھی تجھے شرم نہ آئی" ——— زبیدہ نے دانت پیستے ہوئے کہا ——— "تُو اپنی بڑی بہن کو بھی ہندوؤں کی جاسوسی میں استعمال کرنے پر اُتر آیا۔ تُو نے یہ بھی نہ سوچا کہ یہ بہن خاندان کی واحد فرد ہے جس کے دل میں تمہارا پیار ابھی تک موجود ہے۔ تمہاری کوئی بہن اور کوئی بہنوئی برداشت نہیں کرتا کہ تم اُن کے گھر میں قدم بھی رکھو۔ تُو نے ماں کا دماغ خراب کر رکھا ہے اور تُو نے باپ کے وقار کو دِلّی کی گلیوں میں مسل ڈالا ہے اور باپ کو تُو نے دل کا مریض بنا دیا ہے"۔

"میری بات تو سُنو آپا!" ——— عزیز نے ذرا دبی ہوئی آواز میں کہا ——— "میں تمہاری سب غلط فہمیاں دُور کر دوں گا۔ اس لڑکی کا اغوا میری عزّت کا سوال ہے۔ وہ اپنے خاوند کے ساتھ میرے پاس آئی تھی"۔

"نکل جا یہاں سے" ——— زبیدہ نے ایک بازو پھیلا کر انگلی دروازے کی طرف کرتے ہوئے کہا ——— "تُو نے مجھے ہاشمی صاحب جیسے شریف لوگوں میں ذلیل کر دیا ہے۔ تُو نے ایک ہندو کے ساتھ مجھے وہاں بھیجا اور یہ جھوٹ بولا کہ یہ مسلمان ہے اور اس کا نام عبدالرحمٰن ہے"۔

عزیز کچھ کہنے لگا تھا کہ زبیدہ نے جمیل کی طرف دیکھا۔

"عزیز!" ——— جمیل نے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ——— "گیٹ آؤٹ"۔

عزیز کے چہرے سے شگفتگی دُھل گئی اور اس کی جگہ سنجیدگی آگئی۔

جمیل کی گرجدار آواز نے کمرے کو ہلا ڈالا ——— "گیٹ آؤٹ"۔

عزیز اُٹھا۔

"نکل جا اس گھر سے" ——— زبیدہ نے غصیلی اور رندھی ہوئی آواز میں کہا ——— "ہندو کے جاسوس! پھر کبھی تیری صورت نہ دیکھوں"۔

"جمیل صاحب!" ——— عزیز نے جاتے جاتے دروازے میں رُک کر کہا ——— "مجھ سے بچ کے رہنا"۔

"نکل جا مردُود!" ——— زبیدہ نے چِلّا کر کہا اور بچّوں کی طرح پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی۔

عزیز اس قدر غصّے میں نکلا کہ بڑے دروازے تک اُس کے قدموں کی آواز سنائی دیتی رہی۔

جمیل نے زبیدہ کی پیٹھ پر تھپکی دی اور اُسے چُپ کرانے لگا۔

"کیا مَیں نے آپ کے دل سے وہ کدورت نکال دی ہے جو میری ہی غلطیوں نے پیدا کی تھی؟" ——— زبیدہ نے جمیل سے پوچھا۔

"ہاں زبیدہ!" ——— جمیل نے آہ بھر کر کہا ——— "دل صاف ہوں تو بچھڑے ہوئے بھی مل جاتے ہیں"۔

گلی میں عزیز کی گاڑی سٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی اور

رات خاموش ہوگئی۔

عبدالقدیر اور ہاشمی، رفیقی کے گھر بیٹھے ہوتے تھے۔ اُن کے سامنے حسن طارق رفیقی کے گھر کی تمام چادریں، پلنگ پوش اور تکیوں کے غلاف بکھرے ہوتے تھے۔ عبدالقدیر نے اُسے بتایا تھا کہ جو چادر رِشی پر ڈالی گئی تھی وہ واپس نہیں آئی تھی۔

"کیا اُس چابی پر دھوبی مارک تھا؟" — عبدالقدیر نے اُس سے پوچھا تھا۔

ان کے سامنے جو کپڑے بکھرے ہوتے تھے، وہ اُن تینوں نے دیکھ لئے تھے۔ دو پلنگ پوشوں پر دھوبی کے نشان تھے۔

"پریشان نہ ہوں" — رفیقی نے کہا — "یہ نشان یہاں کے کسی دھوبی کے نہیں۔ یہاں میری بیوی کپڑے واشنگ مشین میں دھوتی ہے۔ یہ دھوبی مارک جو آپ نے ان کپڑوں پر دیکھے ہیں، دِلّی کے کسی دھوبی کے نہیں۔ یہ کپڑے میری بیوی کے ساتھ کبھی اُس کے میکے گئے ہوں گے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہاں کپڑے دھوبی کے پاس جاتے تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ میری بیوی کا میکہ شہر دِلّی سے کتنا دُور ہے .... یہ نشان اُس صورت میں پکڑا جا سکتا ہے کہ میرے گھر کی نشاندہی ہو جاتے اور خانہ تلاشی ہو۔"

"یہاں تک نوبت نہیں پہنچے گی" — عبدالقدیر نے کہا۔

دوسرے دن اِس علاقے کے تھانے کا سکھ تھانیدار ایک حوالدار اور دو کانسٹیبلوں کے ساتھ ایک دھوبی کی دکان میں داخل ہُوا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک چادر تھی جس کا ایک کونہ دھوبی کے آگے رکھ کر اُس نے پوچھا کہ یہ کونسے گھر کا نشان ہے۔

دھوبی نے نشان کو غور سے دیکھا اور سر ہلا کر کہا کہ یہ کسی اور دھوبی کا نشان ہے۔

تھانیدار چونکہ سکھ تھا اور تھانیدار بھی تھا اور دھوبی غریب آدمی تھا اس لئے تھانیدار نے دھوبی کو گالیوں کی زبان میں کہا کہ بعد میں پتہ چلا کہ یہ تمہارا نشان ہے تو کم از کم پانچ سال کے لئے اندر کرا دوں گا۔

"دکان آپ کے سامنے ہے سردار صاحب!" — دھوبی نے ہاتھ جوڑ کر کہا — "آپ خود دیکھ لیں۔ میں اور میرے یہ دونوں بیٹے آپ کو کپڑے نکال نکال کر دیتے رہیں گے۔ میں غریب آدمی پولیس سے کچھ چھپانے کی جرأت نہیں کرسکتا۔"

تھانیدار نے دو اور دھوبیوں کی دکانوں پر جا کر یہ نشان دیکھنے کے لئے ایسی کارروائی کی جیسے پولیس چھاپہ مارا کرتی ہے لیکن یہ نشان نہ ملا۔

عزیز نے اپنے ذاتی مخبروں کو اس کام پر لگا دیا کہ وہ کسی طرح معلوم کریں کہ ہاشمی اور عبدالقدیر کے کپڑے کس دھوبی کے پاس جاتے ہیں۔ یہ دونوں آدمی جب پہلے ہی دھوبی کے پاس گئے تو دھوبی نے انہیں بتایا کہ تھانیدار صاحب معلوم کر گئے ہیں۔

"مَیں جانتا ہوں کہ آپ لوگ پولیس کی طرف سے آتے ہیں" — دھوبی نے اُنہیں کہا — "مَیں نے تھانیدار صاحب سے بھی کہا تھا کہ تمام کپڑے خود دیکھ لیں لیکن اُنہوں نے نہیں دیکھے۔ آپ کو بھی مَیں یہی کہوں گا کہ دکان آپ کے سامنے ہے۔ خود دیکھ لیں۔ مَیں آپ کو بھٹی پر لے چلوں گا اور تمام کپڑے آپ کے سامنے رکھ دوں گا۔ خود دیکھ لیں۔"

"صرف ایک بات بتا دو" — عزیز کے ایک مخبر نے دھوبی سے کہا — "تم فریدالدین ہاشمی اور عبدالقدیر کو جانتے ہو؟ کیا اُن کے کپڑے تمہارے پاس آتے ہیں؟"

"نہیں صاحب!" — دھوبی نے جواب دیا — "مَیں نے یہ دونوں نام پہلی بار سُنے ہیں .... مَیں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ دھوبیوں کے پاس زیادہ تر کپڑے ہندوؤں کے آتے ہیں۔ مسلمان کپڑے خود دھوتے ہیں

یا اُنہوں نے واشنگ مشینیں رکھی ہوتی ہیں۔ معلوم نہیں کہ آپ جو نشان تلاش کر رہے ہیں یہ کسی ہندو کا ہے یا مسلمان کا۔"

"یہ کسی مسلمان کے کپڑوں کا نشان ہے" — ایک مخبر نے کہا۔

❦

شام کے بعد کا وقت تھا، عزیز اُسی وقت اپنے گھر پہنچا تھا۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ عزیز نے ریسیور اُٹھایا۔ سکھ تھانیدار بول رہا تھا۔

"عزیز صاحب!" — تھانیدار نے کہا — "دھوبی مارک مل گیا ہے .... یہ کوئی جمیل احمد ہے۔"

عزیز نے ایڈریس پوچھا تو یہ جمیل احمد اس کا اپنا بہنوئی نکلا۔ عزیز کا ردِّعمل ایسا تھا جیسے اُس کے وجود میں بڑی زور کا دھماکہ ہُوا ہو اور اُس کے جسم کے ٹکڑے بکھر گئے ہوں۔ کچھ دیر تک تو وہ سوچ بھی نہ سکا کہ اُسے کیا کرنا چاہیئے۔ اُس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ تھانیدار سے کہا کہ وہ اُسے ابھی فون کرتا ہے۔ فون بند کر کے وہ سوچ میں پڑ گیا۔

اُسے بہن کی لعن طعن یاد آئی اور اس کے ساتھ ہی اُسے خیال آیا کہ اپنے افسروں کے سامنے اُس کی بے عزتی ہوتی ہے۔ اگر اُس کی بہن اُس کے ساتھ انٹیلی جنس ہیڈ کوارٹر میں چلی جاتی اور رِشی کو دیکھ کر کہہ دیتی کہ اُس نے اسی لڑکی کو ہاشمی کے گھر دیکھا تھا اور اس کے ساتھ یہ بھی کہہ دیتی کہ صاف پتہ چلتا تھا کہ اس لڑکی پر کسی نشہ آور دوائی کا اثر تھا تو عزیز کو اس سے بہت فائدہ مل سکتا تھا۔ یہ اُس کی بہت بڑی کامیابی ہوتی۔ اُس کی تنخواہ اور اُس کے گریڈ میں اضافہ ہو جاتا لیکن بہن نے اُس کے لئے ایسی صورتِ حال پیدا کر دی تھی کہ ترقی ملنے کی بجائے افسروں نے اُس پر اس شک کا اظہار کیا تھا کہ وہ کسی ذاتی دشمنی کی وجہ سے ہاشمی وغیرہ کے پیچھے پڑا ہُوا ہے۔

اُسے یاد آیا کہ اُس کے بہنوئی جمیل نے اُسے بہت ہی بے آبرو کر کے اپنے گھر سے نکالا تھا۔ عزیز کے لئے یہ بات بھی ناقابلِ برداشت

تھی کہ یہی ایک بہن تھی جس کے دل میں اُس کی محبت تھی۔ وہ بھی ہاتھ سے گئی۔

عزیز کا دماغ پھر گیا۔ اُس نے ریسیور اُٹھایا اور سکھ تھانیدار کے تھانے کا نمبر ملایا۔ اُدھر تھانیدار ہی بول رہا تھا۔ عزیز کی ذہنی کیفیت ایسی تھی جیسے وہ انسانیت سے اور انسانی جذبات سے دستبردار ہو گیا ہو۔

"سردار صاحب!" — عزیز نے سکھ تھانیدار سے کہا — "اس شخص جمیل احمد کو ابھی تھانے میں بلا کر حوالات میں بند کر دیں۔"

"نہیں عزیز صاحب!" — تھانیدار نے کہا — "مَیں آپ کے کہنے پر یا کسی کے بھی کہنے پر کسی کو حوالات میں بند نہیں کر سکتا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ انٹیلی جنس کے کارکن ہیں لیکن یہ سوچ لیں کہ انٹیلی جنس کا سب سے بڑا افسر بھی اگر مجھے زبانی کہے گا کہ میں فلاں آدمی کو گرفتار کر کے حوالات میں بند کر دوں تو بھی میں ایسا نہیں کروں گا۔ آپ اپنے محکمے کا ایک لیٹر میری طرف بھجوا دیں جس پر کسی بڑے افسر کے دستخط ہوں۔ لیٹر میں لکھوائیں کہ یہ آدمی ہمارا مشتبہ ہے اور اسے حوالات میں بند کر لیا جائے اور ہم اُسے حوالات میں لے آئیں گے۔"

"صبح آپ کو بتاؤں گا کہ لیٹر بھیجا جائے گا یا اُس شخص کو میرا محکمہ خود ہی گرفتار کرے گا" — عزیز نے کہا — "آپ کل اُس دھوبی کو ساتھ لے کر صبح دس بجے انٹیلی جنس ہیڈ کوارٹر میں پہنچ جائیں۔ میرا خیال ہے کہ اس کے لئے آپ کو کسی لیٹر کی ضرورت نہیں ہو گی۔"

عزیز نے اُسے اپنے ہیڈ کوارٹر کا ایڈریس بتایا اور یہ بھی کہا کہ وہ اگر رِکشے یا ٹیکسی پر آئے گا تو اُسے کرایہ مل جائے گا۔

"مَیں وقت پر پہنچ جاؤں گا" — سکھ تھانیدار نے کہا۔

❦

عزیز نے صبح دفتر پہنچتے ہی میجر بھاٹیہ کو بتایا کہ دھوبی کا نشان

مل گیا ہے اور تھانیدار نے اُسے اس شخص کے گھر کا یہ ایڈریس بتایا ہے۔

"مجھے اسی شخص پر شک تھا" — عزیز نے میجر بھاٹیہ سے کہا — "اس شخص نے میرا بلکہ انٹیلی جنس کا بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا ہے۔"

"وہ کیسے؟" — میجر بھاٹیہ نے پوچھا اور کہنے لگا — "بات صاف کرو عزیز!"

"صاف بات یہ ہے صاحب!" — عزیز نے کہا — "یہ جمیل احمد میرا بہنوئی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ میری بہن نے رشی کو ہاشمی کے گھر میں دیکھا تھا۔"

"ہاں ہاں!" — میجر بھاٹیہ نے کہا — "یہ سارا قصہ مجھے معلوم ہے۔ یہ معاملہ تھانے تک پہنچ گیا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ رشی ہاشمی کے گھر سے برآمد نہیں ہوئی تھی۔"

"میں اپنی بہن کے گھر گیا تھا" — عزیز نے کہا — "میں اپنی بہن کو یہاں لا کر رشی کو اُس کے سامنے کھڑا کر کے پوچھنا چاہتا تھا کہ اُس نے اس لڑکی کو ہاشمی کے گھر میں دیکھا تھا یا وہ کوئی اور تھی؟ میری یہ بہن مجھ سے اتنی زیادہ محبت کرتی ہے کہ مجھے پوری اُمید تھی کہ وہ میرے ساتھ آجائے گی لیکن خلافِ توقع اُس نے میری اتنی بے عزتی کی جیسے وہ بھول ہی گئی ہو کہ میں اُس کا بھائی ہوں۔ میرا بہنوئی خاموش کھڑا رہا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ اُس نے میری بہن کی برین واشنگ کی ہوئی ہے۔ اُس نے میری بہن کو یہی ایک دھمکی دی ہوگی کہ وہ اُسے طلاق دے دے گا۔ سر! یہ ایک ایسی دھمکی ہے جسے میری بہن برداشت نہیں کر سکتی۔ میری بہنیں ہی بہنیں ہیں۔ میری اس بہن کے تو بچے بھی جوان ہو چکے ہیں۔ میرے ماں باپ کیسے برداشت کر سکتے ہیں کہ میری یہ بہن یا کوئی بھی بہن طلاق لے کر گھر آ بیٹھے۔"

"عزیز بھائی!" — میجر بھاٹیہ نے کہا — "تمہاری ان باتوں سے ذاتی یا گھریلو دشمنی ظاہر ہوتی ہے۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تمہیں اپنے بہنوئی پر انٹیلی جنس کے سلسلے میں یعنی رشی کے اغوا کے سلسلے میں کیا شک ہے اور ایسا شک کیوں ہے؟"

"آپ کو وہ سارا واقعہ معلوم ہے جب یہ معاملہ تھانے تک پہنچ گیا تھا" — عزیز نے کہا — "میرا یہ بہنوئی بھی تھانے پہنچ گیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ وہ تھانے اس لئے گیا تھا کہ ہاشمی وغیرہ میری بہن کو بھی تھانے لے گئے تھے۔ اس کے بعد جو کچھ ہُوا وہ تو آپ جانتے ہی ہیں۔ میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تھانے سے نکل کر میرا بہنوئی میری بہن کے ساتھ جانے کی بجائے ہاشمی اور عبدالقدیر کے ساتھ چلا گیا تھا۔ مجھے شک ہے کہ رشی کو ہاشمی کے گھر سے میرے بہنوئی جمیل احمد کے گھر شفٹ کر دیا گیا تھا اور اُسے وہاں سے میرے گھر پہنچایا گیا.... میں نے متعلقہ پولیس انسپکٹر کو کہہ دیا ہے کہ وہ جمیل احمد کو آج دس بجے یہاں لے آئے۔ وہ اُسے لا رہا ہے۔ میں آپ سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ میری بہن کو بھی یہاں لایا جائے اور رشی کو بھی۔"

"میں سمجھتا ہوں تم کیا چاہتے ہو" — میجر بھاٹیہ نے کہا — "تم اپنی بہن سے رشی کی شناخت کرانا چاہتے ہو۔ میں اس سلسلے کو اب بیکار سمجھتا ہوں کیونکہ چیف نے اس معاملے کو ٹھپ کر دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُس نے رشی کے بیان کو سچ مان لیا ہے۔ ہمارا تعلق رابی کے ساتھ ہے اور رابی بالکل ٹھیک ہے۔ اُسے رشی کے ساتھ واپس پاکستان بھیجا جا رہا ہے.... کیا نینی ٹھیک چل رہی ہے؟"

"سو فیصد ٹھیک سر!" — عزیز نے جواب دیا — "اس لڑکی نے رابی پر اپنا جادو چلا لیا ہے۔ میں آپ کو ساتھ ساتھ رپورٹ دے رہا ہوں.... رشی کو تو رابی نے دھتکار دیا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ خود کسی کے ساتھ چلی گئی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ رشی کو جاتے ہی طلاق دے دے گا...."

یہ کام تو بالکل اُسی طرح ہو رہا ہے جس طرح آپ نے اور چیف نے سکیم بنائی ہے، لیکن سر! اس لڑکی کے اغوا کے سلسلے میں جو میری بے عزتی ہو رہی ہے اُس کا بھی خیال رکھیں۔ میری پوزیشن صرف اس طرح صاف ہو سکتی ہے کہ میری بہن کو یہاں بلائیں اور اُس سے رِشی کی شناخت کروائیں۔ ہو سکتا ہے رِشی میری بہن کو دیکھ کر یہ بھی کہہ دے کہ اُسے اس عورت کے گھر میں رکھا گیا تھا۔ میرے بہنوئی کو دیکھ کر شاید رِشی کے ذہن میں انتقام کی تلخی پیدا ہو جائے اور وہ کہہ دے کہ اس آدمی نے اُسے قید میں رکھا تھا۔"

"میں تمہاری بہن کو بلوا لیتا ہوں"—— میجر بھاٹیہ نے کہا —— "لیکن تمہاری اور کوئی توقع پوری نہیں ہوگی۔ تمہیں معلوم نہیں کہ رِشی کس قدر خود اعتمادی اور ذہنی پختگی سے بیان دے چکی ہے۔ اُس پر جو جرح کی گئی تھی، وہ ویسی ہی تھی جیسی کسی بھی مشتبہ پر کی جاتی ہے۔ اگر اُس کا بیان سچا نہ ہوتا تو وہ کہیں نہ کہیں ایسا جواب دے دیتی جس سے اُس کے بیان کی سچائی پر شک ہوتا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ چیف نے کرنل اوجھا اور میجر سجن سنگھ اور مجھے بلا کر باقاعدہ میٹنگ کی تھی جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ رِشی کو پاکستانی ایجنٹوں نے اغوا نہیں کیا تھا اور اگر انہی ایجنٹوں نے ہی کیا تھا تو یہ لڑکی اُن کے کسی کام نہیں آسکتی تھی کیونکہ اسے معلوم ہی نہیں کہ اُس کا خاوند انٹیلی جنس کا رُکن بن چکا ہے۔"

"سر!"—— عزیز نے کہا —— "مجھے اپنے بہنوئی کے سامنے نہیں ہونا چاہیئے۔"

"تمہاری ضرورت ہی نہیں"—— میجر بھاٹیہ نے کہا۔

دس بجے کے لگ بھگ تھانیدار جمیل اور دھوبی کو ساتھ لے کر پہنچ گیا۔ عزیز نے اُنہیں کھڑکی میں سے دیکھا اور چپڑاسی کو بلا کر کہا کہ تھانیدار کو میرے پاس لے آؤ، لیکن یہ نہ بتانا کہ کس نے بلایا ہے۔

تھانیدار عزیز کے پاس آیا تو عزیز نے اُسے بتایا کہ وہ خود سامنے

نہیں ہوگا اور وہ یعنی تھانیدار میجر بھاٹیہ کے پاس جائے گا۔ عزیز نے تھانیدار کو یہ بھی بتایا کہ وہ کسی خاص مقصد کے تحت سامنے نہیں آنا چاہتا۔

"یہ مقصد میں جانتا ہوں"—— تھانیدار نے کہا —— "یہ شخص جمیل احمد تمہارا بہنوئی ہے۔ اگر ایسی بات تھی تو مجھے پہلے بتاتے۔ میں تو اُسے بتا چکا ہوں کہ عزیز احمد نام کا ایک آدمی اس تفتیش کی پیروی کر رہا ہے۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ یہ تمہارا بہنوئی ہے۔ اس نے مجھے ساری بیک گراؤنڈ بتائی ہے۔"

یہ سُن کر عزیز پریشان ہو گیا۔ اُس نے تھانیدار کو میجر بھاٹیہ کے کمرے میں بھجوا دیا۔ دھوبی مارک والی چادر تھانیدار کے ہاتھ میں تھی۔

میجر بھاٹیہ نے دھوبی کو باہر کھڑا رہنے دیا۔ تھانیدار اور جمیل کو اندر بُلا کر بڑے اچھے طریقے سے اُن کا استقبال کیا۔ انہیں بٹھایا۔ اُس کے کہنے پر تھانیدار نے چادر میجر بھاٹیہ کے آگے میز پر رکھ دی اور کہنے پر جو دھوبی مارک تھا وہ اُسے دکھایا۔

"کیوں صاحب!"—— میجر بھاٹیہ نے جمیل سے پوچھا —— "کیا یہ دھوبی مارک آپ کے کپڑوں کا ہے؟"

"نہیں صاحب!"—— جمیل نے جواب دیا —— "یہ چادر ہماری نہیں ہے اور میرے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ یہ چادر میرے گھر کی نہیں۔ اس چادر کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں۔ البتہ اُس شخص کے ساتھ بدقسمتی سے میرا تعلق بڑا گہرا ہے جس نے پولیس کو میرے پیچھے ڈالا ہے۔"

"جمیل صاحب!"—— میجر بھاٹیہ نے کہا —— "میں نے آپ سے صرف یہ پوچھا ہے کہ یہ دھوبی مارک آپ کے کپڑوں کا ہے یا نہیں۔"

"میں پھر کہتا ہوں"—— جمیل نے جواب دیا —— "کہ یہ چادر میرے گھر کی نہیں۔ میرے کپڑوں کا دھوبی مارک ایسا ہی ہے۔ دھوبی ساتھ آیا ہے۔ آپ اُسے بلا کر پوچھیں۔"

دھوبی کو اندر بلایا گیا اور اُسے یہ نشان دکھا کر پوچھا گیا۔

"حضور!" — دھوبی نے جواب دیا — "یہ نشان جمیل صاحب کے کپڑوں جیسا ہی لگتا ہے، لیکن کچھ فرق معلوم ہوتا ہے۔"

"انسپکٹر صاحب!" — میجر بھاٹیہ نے سکھ تھانیدار سے پوچھا — "کیا آپ نے جمیل صاحب کے گھر کے کچھ اور کپڑے دیکھے تھے؟"

"نہیں صاحب!" — تھانیدار نے جواب دیا۔

"اتنی سی تو بات آپ خود بھی سوچ سکتے تھے" — میجر بھاٹیہ نے کہا — "اِن کے گھر کا کوئی ایک آدھ کپڑا تو لے آتے۔"

"مَیں نے تو کبھی غور بھی نہیں کیا کہ دھوبی نشان کس جگہ لگاتا ہے" — جمیل نے کہا۔

"آپ کی اس قمیض پر نشان ہوگا" — دھوبی نے کہا۔

جمیل فوراً اُٹھا، کوٹ اُتارا، ٹائی کھولی اور دھوبی سے پوچھا کہ نشان کہاں ہوگا۔ دھوبی نے آگے بڑھ کر اُس کی قمیض کے بٹن کھولے اور وہاں سے قمیض کو ذرا سا اُٹھایا۔ نیچے والے کاج کے ساتھ دھوبی مارک تھا۔ میجر بھاٹیہ نے اُٹھ کر یہ نشان دیکھا، پھر چادر کا کونہ قریب کر کے اُس نشان سے ملایا۔ چادر کے نشان کی تین عمودی لکیریں تھیں جن کی لمبائی ایک ہی جیسی تھی، لیکن قمیض کا جو دھوبی مارک تھا اُس کی تین لکیروں میں سے درمیان والی لکیر ذرا لمبی تھی۔

"کیا یہ لکیر تم نے خود لمبی رکھی ہے؟" — میجر بھاٹیہ نے دھوبی سے پوچھا اور اُسے نشان دکھایا۔

"ہاں حضور!" — دھوبی نے جواب دیا — "تین برابر لکیروں والے نشان کے کپڑے لالہ چرن داس کے ہیں۔"

"کیا تم نے تھانیدار صاحب کو یہ فرق بتایا نہیں تھا؟" — میجر بھاٹیہ نے پوچھا۔

"انہوں نے مجھ سے اور کچھ پوچھا ہی نہیں" — دھوبی نے جواب

دیا — "ہم غریب آدمی ہیں حضور! تھانیدار صاحب نے میری لانڈری میں آکر ایسا غصّہ جھاڑا کہ مَیں کچھ سوچ ہی نہ سکا۔ یہ نشان اچھی طرح دیکھ بھی نہ سکا۔ مَیں نے ان کے ڈر سے کانپتے ہوئے کہہ دیا کہ یہ جمیل صاحب کا دھوبی مارک ہے۔"

میجر بھاٹیہ نے دھوبی کو باہر نکال دیا اور تھانیدار سے کہنے لگا کہ اُس نے تفتیشی کارروائی صحیح طریقے سے کئے بغیر اپنا بھی اور دوسروں کا بھی وقت ضائع کیا ہے۔

انٹیلی جنس والے کسی کو اتنی جلدی نہیں چھوڑا کرتے۔ وہ بال کی کھال اُتارا کرتے ہیں، لیکن میجر بھاٹیہ اس معاملے میں سنجیدہ نہیں تھا کیونکہ اُس کا چیف رِشی کے اغوا کو نظر انداز کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اُس نے دھوبی کے اس جواب کو بھی قبول کر لیا تھا کہ یہ دو نشان جو اُس کے سامنے رکھے گئے ہیں دو مختلف لوگوں کے ہیں۔

میجر بھاٹیہ نے تھانیدار کو بھی باہر بھیج دیا۔

"جمیل صاحب!" — اُس نے پوچھا — "اپنے متعلق آپ کچھ بتانا چاہیں گے؟"

جمیل نے اپنے متعلق بتایا کہ وہ گریجویٹ ہے اور فوڈ ڈیپارٹمنٹ میں ملازم ہے۔ اپنے متعلق تو اُس نے زیادہ نہ بتایا البتہ عزیز کے متعلق اُس نے اُس کی پوری ہسٹری سنانی شروع کر دی۔

"یہ سب بلیک میلنگ ہے صاحب!" — جمیل نے کہا — "عزیز کا کوئی بھی بہنوئی اسے اپنے گھر میں داخل نہیں ہونے دیتا۔ میری بیوی جو اس کی بڑی بہن ہے اسے بہت چاہتی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک عزیز مجھ سے کسی نہ کسی بہانے پیسے لیتا رہا ہے۔ پھر اس نے مجھ سے اُدھار پیسے مانگنے شروع کر دیئے۔ مَیں اسے دیتا رہا۔ کرتے کرتے یہ میرا پانچ ہزار روپے کا مقروض ہو گیا۔ مَیں نے اسے مزید رقم دینی چھوڑ دی اور یہ بھی طے کیا کہ یہ میرے گھر نہ آیا کرے۔ ہمیں تو معلوم

ہی نہیں تھا کہ یہ انٹیلی جنس میں ہے۔ اس نے اپنی بہن تک کو اپنے
اس خفیہ کام میں استعمال کیا۔"

جمیل نے میجر بھاٹیہ کو وہ سارا واقعہ سنایا جو بھاٹیہ کو پہلے ہی
معلوم تھا۔ بھاٹیہ نے اُس سے کچھ باتیں پوچھیں۔ اسی دوران اُسے
اطلاع ملی کہ زبیدہ نام کی ایک خاتون کو لایا گیا ہے۔ اس کے فوراً بعد
بھاٹیہ کو یہ اطلاع ملی کہ رشی اور رابی بھی آگئے ہیں۔

جمیل کو دوسرے کمرے میں بھیج دیا گیا۔ میجر بھاٹیہ نے زبیدہ
کو اندر بلایا اور کرسی پر بٹھایا پھر وہ باہر نکل گیا۔ واپس آیا تو اُس کے
ساتھ رشی تھی۔ بھاٹیہ نے اُسے کھڑا رہنے دیا۔

"محترمہ!" — بھاٹیہ نے زبیدہ سے کہا — "آپ ذرا اُٹھ کر اس
لڑکی کے سامنے کھڑی ہو جائیں۔"

زبیدہ اُٹھی اور رشی کے سامنے ہو گئی۔

"آپ دونوں ایک دوسری کو دیکھیں" — میجر بھاٹیہ نے ان سے
کہا — "اور بتائیں کہ آپ نے ایک دوسری کو پہلے کبھی دیکھا ہے؟"

دونوں کے دل بڑی تیزی سے دھڑکنے لگے۔ رشی پر خوف
طاری ہو گیا۔ اُس نے جھوٹا بیان دیا تھا۔ اُسے ڈر تھا کہ زبیدہ نے کہہ
دیا کہ اُس نے اس لڑکی کو ہاشمی کے گھر دیکھا تھا تو اُسے نہ جانے کیسی
سزا دی جائے گی۔ زبیدہ کی سوچ بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ اُس نے تھانے
میں کہا تھا کہ اُس نے ہاشمی کے گھر کسی لڑکی کو نہیں دیکھا تھا۔ رشی تو
اُس سوسائٹی کی لڑکی تھی جس میں عزت اور بے عزتی کا، حیا اور بے حیائی
کا تصور کچھ اور تھا لیکن زبیدہ چار دیواری کی دُنیا کی عورت تھی جو برقع
تو نہیں لیتی تھی، لیکن اپنے آپ کو پردہ نشین کہہ سکتی تھی۔ وہ عزت اور
عصمت کی قدر وقیمت کو سمجھتی تھی۔ اُس کے چہرے پر ایسا پھیکا سا رنگ
آگیا جو غشی سے پہلے آیا کرتا ہے۔

میجر بھاٹیہ باری باری دونوں چہروں کے بدلتے رنگ دیکھ
رہا تھا۔

زبیدہ کی ذات میں شکست وریخت شروع ہو گئی۔ اُس کی
حالت اُس ریتلے ٹیلے کی سی ہو گئی جسے تیز وتند آندھی ریزہ ریزہ
کر کے اُڑا رہی ہو۔

"مجھے کس گناہ کی سزا دی جا رہی ہے!" — زبیدہ نے روتی ہوئی
سی آواز میں کہا اور اُس کے آنسو بہنے لگے۔

"آپ کو ہم پریشان نہیں کر رہے مسز جمیل!" — میجر بھاٹیہ
نے کہا — "آپ صرف یہ بتا دیں کہ اس لڑکی کو آپ نے پہلے کبھی
دیکھا ہے؟"

"نہیں دیکھا" — اُس نے روتے ہوئے احتجاج کے لہجے میں
کہا — "نہیں دیکھا۔ اسے میں نے پہلے کہیں بھی نہیں دیکھا۔"

رشی کے چہرے کا اُڑا ہوا رنگ واپس آگیا۔

"میں آپ کو یاد دلاتا ہوں" — میجر بھاٹیہ نے زبیدہ سے کہا —
"آپ نے اسے فریدالدین ہاشمی کے گھر ایک کمرے میں دیکھا ہوگا۔"

"میں نے اسے کہیں نہیں دیکھا" — زبیدہ کرسی پر اس طرح بیٹھ
گئی جیسے گر پڑی ہو۔ روتے ہوتے کہہ رہی تھی — "اگر یہ کہتی ہے کہ
اس نے مجھے کہیں دیکھا ہے تو یہ جھوٹ بولتی ہے۔"

"مسٹر بھاٹیہ!" — رشی بولی — "میں آپ کو بتا چکی ہوں مجھے
کہاں لے گئے تھے اور کون لے گئے تھے۔ کیا آپ اس عورت سے
کہلوانا چاہتے ہیں کہ اس نے مجھے کہیں اور دیکھا تھا؟ یہ عورت میرے
لئے اجنبی ہے۔ آج پہلی بار اسے دیکھ رہی ہوں۔"

"آپ مجھ پر ایک کرم کریں" — زبیدہ نے منت سماجت کے لہجے
میں کہا — "میرے خاوند کو بلا دیں۔ اُن کا نام جمیل احمد ہے محکمہ خوراک
میں ہیں۔ میں اُن کا فون نمبر بتاتی ہوں۔ وہ آفس چلے گئے تو آپ کے آدمی

مجھے گاڑی میں زبردستی بٹھا کر لے آئے تے۔"

"جمیل صاحب نہیں ہیں" — میجر بھاٹیہ نے کہا۔

"وہ یہاں کیا کر رہے ہیں؟" — زبیدہ نے گھبراتے ہوئے لہجے میں پوچھا — "کہیں ایسا تو نہیں کہ انہوں نے مجھے بلوایا ہو؟"

"میں آپ کے ایسے سوالوں کے جواب نہیں دے سکوں گا" — بھاٹیہ نے کہا — "کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ نے اس لڑکی کو پہلے کہیں نہیں دیکھا؟"

"میں آپ کو کس طرح یقین دلاؤں؟" — زبیدہ نے جواب دیا۔ وہ رشی کی اس بات سے دلیر ہو گئی تھی کہ اس نے زبیدہ کی شناخت سے انکار کر دیا تھا۔ کہنے لگی — "آپ ایک ہزار بار پوچھیں تو بھی میں یہی کہوں گی کہ میں نے اس لڑکی کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

"مسٹر بھاٹیہ!" — رشی نے کہا — "آپ مجھے پاکستان واپس کیوں نہیں بھیج دیتے؟"

"میرے ساتھ آئیں مسز رابی!" — میجر بھاٹیہ اسے ایک اور کمرے میں لے گیا۔

وہاں جمیل بیٹھا ہوا تھا۔ میجر بھاٹیہ کے کہنے پر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"انہیں دیکھیں" — بھاٹیہ نے رشی سے کہا — "انہیں تو آپ نے کہیں دیکھا ہو گا!"

"او ماتی گاڈ!" — رشی نے دونوں ہاتھ اپنے ماتھے پر مار کر کہا — "آپ کیوں میرا ٹارچر کر رہے ہیں! کبھی کسی کو کبھی کسی کو میرے سامنے لے آتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ اسے میں نے کہاں دیکھا تھا۔"

میجر بھاٹیہ خود بھی پریشان ہو گیا اور رشی کو یہ کہہ کر باہر بھیج دیا کہ رابی کے پاس چلی جائے۔ جمیل کو وہ اپنے کمرے میں لے گیا جہاں زبیدہ بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر زبیدہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں" — زبیدہ نے جمیل سے کہا

— "میرا خیال ہے کہ عزیز ہم سے انتقام لے رہا ہے" — اس نے کمرے میں ادھر ادھر دیکھ کر پوچھا — "یہ کیا جگہ ہے؟ پولیس سٹیشن تو نہیں لگتا۔"

"یہ یہاں کی انٹیلی جنس کا ہیڈ کوارٹر ہے" — جمیل نے کہا — "تمہارا بھائی عزیز اسی محکمے میں ملازم ہے۔"

"نہیں جمیل صاحب!" — میجر بھاٹیہ نے پردہ پوشی کے لئے کہا — "عزیز اس محکمے میں باقاعدہ ملازم نہیں۔ آپ ہر کسی کو یہ نہ بتاتے پھرنا جو آپ اپنی مسز کو بتا رہے ہیں ورنہ آپ افواہیں پھیلانے کے جرم میں پکڑے جائیں گے۔"

زبیدہ نے میجر بھاٹیہ کو بتایا کہ اس نے عزیز کو کس طرح بے عزت کر کے اپنے گھر سے نکالا تھا۔ زبیدہ نے بھاٹیہ کو یہ بھی بتایا کہ عزیز اس کے گھر کیوں آیا تھا اور عزیز نے اسے کس طرح اپنے کام میں استعمال کرنے کی کوشش کی تھی۔

"اس بے غیرت کو اپنی بہن کی عزت بے عزتی کا بھی خیال نہیں" — زبیدہ نے کہا — "میں نے جب اسے کہا کہ میرے گھر سے نکل جاؤ تو یہ نہیں اٹھ رہا تھا۔ جمیل صاحب نے اسے دو بار کہا گیٹ آؤٹ۔ تب عزیز اٹھا اور کمرے سے نکلا۔ دروازے میں رک کر اس نے جمیل صاحب کو دھمکی دی کہ اب مجھ سے ہوشیار رہنا۔"

"فوراً ہی اسے انتقام لینے کا بہانہ مل گیا" — جمیل نے کہا — "صاحب! آپ بھی اسی ملک کے شہری ہیں۔ آپ کے کپڑے دھوبی ہی دھوتے ہوں گے۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ ایک ہی شہر کے مختلف مختلف علاقوں کے دھوبی مارک آپس میں ملتے ہیں۔ یہاں لاتے ہوتے راستے میں اس سکھ پولیس انسپکٹر نے مجھ سے پوچھا تھا کہ عزیز کے ساتھ تمہاری کوئی دشمنی تو نہیں؟"

میجر بھاٹیہ پر خاموشی طاری تھی۔ وہ ان دونوں کو اپنے دفتر میں

چھوڑ کر کرنل اوجھا کے دفتر میں چلا گیا اور اُسے بتایا کہ آج اُس کے سامنے کیا مسئلہ آیا ہے۔ اُس نے دھوبی مارک کی ساری روئیداد سنائی، جمیل اور زبیدہ نے عزیز کے متعلق جو باتیں کی تھیں وہ سنائیں اور دھوبی مارک کے متعلق اپنی یہ رائے دی کہ یہ جمیل احمد کا معلوم نہیں ہوتا۔

"سر! میں عزیز کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں"۔۔۔ بھاٹیہ نے کہا ۔۔۔"یہ شخص ہمیں گمراہ کر رہا ہے۔ اس نے بہت کام کئے ہیں لیکن اس مشن میں اس نے میری نظروں میں اپنے اعتماد کو مجروح کر دیا ہے۔ اسے اپنی بڑی بہن کی عزت اور آبرو کا بھی خیال نہیں۔ اپنے بہنوئی سے پیسے بٹورتا ہے، اُس کا مقروض بھی ہے اور اسی کو آنکھیں دکھاتا ہے۔"

"او احمق!"۔۔۔ کرنل اوجھا نے میجر بھاٹیہ سے کہا ۔۔۔"تم ابھی بچے ہو۔ تہہ تک پہنچنا سیکھو۔ تم عزیز کے کردار کی جو رپورٹ دے رہے ہو یہ دوسرے سرکاری محکموں کے ملازموں کے متعلق دی جاتی ہے۔ انٹیلی جنس کے کارکنوں کے کردار میں کچھ اور دیکھا جاتا ہے۔ تم عزیز کی جو خامیاں بیان کر رہے ہو یہ دراصل خوبیاں ہیں۔ اس شخص کا جو شعبہ ہے، اس میں ہمیں ایسے ہی آدمیوں کی ضرورت ہے جو اپنی بہنوں کی عزت کا بھی خیال نہ کریں اور جو بہنوئیوں کو کھاتے رہیں اور اُن کے مقروض ہو کر بھی اُنہیں ذلیل کرنے سے باز نہ آئیں۔ عزیز میں یہ خوبیاں موجود ہیں۔ یہ ہمارے کام کا آدمی ہے ۔۔۔۔ میجر بھاٹیہ! اس حقیقت کو ہمیشہ ذہن میں رکھو کہ ہندو لڑکی اپنی عصمت سے اور مسلمان مرد اپنے ایمان سے بڑی جلدی دستبردار ہو جاتا ہے۔ ہم دونوں ہندو ہیں۔ عصمت سے دستبردار ہونے والی ہندو لڑکیوں سے ہمیں شرمسار نہیں ہونا چاہیئے۔ اپنے ملک کی خاطر اور مسلمانوں کو کمزور کرنے کے لئے ہمیں اپنی عصمتوں کی قربانی دینے سے شرمسار نہیں ہونا چاہیئے۔ مسلمان جو اپنے ملک اور اپنی قوم کے غدار بن جاتے ہیں وہ بھی تو شرمسار نہیں ہوتے۔"

"پھر میں اس دھوبی مارک والے معاملے کا کیا کروں سر؟"۔۔۔ میجر بھاٹیہ نے پوچھا۔

"یہیں ختم کر دو"۔۔۔ کرنل اوجھا نے کہا ۔۔۔"چیف فیصلہ کر چکا ہے کہ رشی کے اغوا پر مزید کوئی بات نہ ہو۔ تم خود اس میٹنگ میں موجود تھے ۔۔۔۔ عزیز کو تھوڑی سی تنبیہہ کر دو کہ وہ ذاتی دشمنی کو درمیان میں نہ لائے اور پوری توجہ اپنے کام کو دے، لیکن بھاٹیہ! اُسے بیک اپ کرنا کہ اُس نے اپنی ڈیوٹی میں اپنی بہن اور اپنے بہنوئی کی بھی پرواہ نہیں کی ۔۔۔۔ ان سب کو فارغ کر دو۔"

میجر بھاٹیہ نے سب کو فارغ کر دیا۔

رشی کے لئے یہ صورتِ حال بڑی ہی تکلیف دہ تھی۔ یہ صورتِ حال تو اُس کے لئے پیدا ہو گئی کہ اُسے اغوا کر لیا گیا، اسے اپنے لئے تکلیف دہ اُس نے خود بنایا تھا۔ اگر وہ ہاشمی، عبدالقدیر اور بیگم ہاشمی کو دیکھ کر کہہ دیتی کہ وہ انہی کی قید میں رہی ہے تو ہاشمی کے مکان کی اور اُس کمرے کی بھی نشاندہی ہو جاتی جس میں وہ قید رہی تھی پھر انٹیلی جنس والے رفیقی کے مکان کی بھی نشاندہی کرا لیتے لیکن رشی کو اس قید میں ایسی روشنی نظر آ گئی تھی جس سے اُس کی فطرت پر چھائی ہوئی تاریکی چھٹ گئی تھی۔ اُس کی ذات میں ایسا انقلاب آ گیا تھا جس نے اسے باطل کی گود سے نوچ کر حق کی گود میں پھینک دیا تھا۔

وہ اُس دنیا میں واپس آ گئی جہاں سے اُسے اغوا کیا گیا تھا تو اُس کی حالت اُس مچھلی کی سی ہو گئی جسے پانی سے نکال کر ریت پر پھینک دیا گیا ہو۔ وہ تڑپ تڑپ کر پانی کی طرف جانے کی کوشش کرتی تھی ۔۔۔ اُسے پانی اور ریت کا فرق معلوم ہو گیا تھا۔

اُس کے دل میں رابی کی، عزیز کی اور اُس سوسائٹی کی جس کی وہ پروردہ تھی، نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ اسی نفرت کے اثرات تھے کہ اُس

نے بڑی دلیری سے جھوٹ بولے تھے۔ اُس نے اُن سب کو پہچاننے سے انکار کر دیا تھا جنہیں وہ جانتی اور پہچانتی تھی۔ اُس کے لئے اس کے نتائج خطرناک بھی ہو سکتے تھے لیکن اُس نے نتائج کی پرواہ نہیں کی تھی۔

اُس کے دل میں یہ احساس پیدا ہو گیا تھا کہ ہاشمی، اُس کی بیوی، عبدالقدیر، زبیدہ، رشی اور اُن آدمیوں کے ساتھ جو اُسے اشوکا ہوٹل سے دھوکے میں اپنے ساتھ لے گئے تھے، کوئی رشتہ ہے اور یہ رشتہ روحانی ہے۔ وہ تو ان کی قید سے آزاد ہونا ہی نہیں چاہتی تھی۔

رابی نے رشی کے دل میں اپنے خلاف نفرت میں اضافہ کر دیا۔

"تم خود ان کے ساتھ گئی تھیں" — رابی نے اُسے اُس کا یہ بیان سن کر کہ اُسے چار نوجوان دھوکے میں لے گئے تھے، کہا تھا — "اتنی جرأت کوئی نہیں کر سکتا کہ اتنے بڑے ہوٹل سے کوئی کسی ایسی لڑکی کو اغوا کر کے لے جائے جو سرکاری مہمان ہو اور وہ یہ جرأت بھی کریں کہ لڑکی کو واپس بھی چھوڑ جائیں۔"

رشی نے تڑپ تڑپ کر انکار کیا اور رابی کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ لے جائی گئی تھی خود نہیں گئی تھی۔

"تم مان کیوں نہیں لیتیں رشی کہ تم خود گئی تھیں!" — زینی نے کہا تھا جو اُس وقت وہاں موجود تھی۔ اُس نے کہا تھا — "رابی اتنا سویٹ ہے کہ میں اس کی بیوی ہوتی تو اس سے کبھی بیوفائی نہ کرتی۔"

"تم نہیں جانتیں زینی!" — رابی نے کہا — "یہ بیچاری بے قصور ہے۔ اس کی ماں نے اس کی فطرت کو جس سانچے میں ڈھالا تھا اس سے یہ تو باہر نہیں جا سکتی۔ اُس کی جوانی دوسرے مردوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے گزری تھی۔ قصور اُس کا بھی نہیں تھا۔ اُس کا باپ سرکاری رقمیں اور غیر ملکی قرضے غبن کرتا رہتا اور رشوت خور بھی تھا۔ پردہ پوشی کا اور پکڑے جانے کی صورت میں بچ نکلنے کا ذریعہ اس کی

ماں کو بنایا ہوا تھا۔ وہ خوبصورت اور جوان عورت تھی۔ پتھر جیسے مردوں کو موم کرنے کا ڈھنگ جانتی تھی۔ درندوں کو بھی رام کر لیتی تھی۔ اس کا باپ مر گیا تو ماں نے اپنا یہ کام جاری رکھا۔ میں پہلے ایسی بات نہیں کرتا تھا۔ اب کہتا ہوں کہ یہ (رشی) جوان ہوئی تو ماں نے اسے بھی اپنی لائن پر چلا لیا۔"

"تم بکواس کرتے ہو" — رشی نے غصے سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا — "تم کتے ہو رابی! تم بھونک رہے ہو۔"

"کیا تم نے مجھے نہیں پھانسا تھا؟" — رابی نے کہا — "تم نے مجھے محبت نہیں جسم پیش کیا تھا اور میں تمہارے جسم کی کشش میں پھنس گیا تھا۔"

"تم یہ بکواس اس لئے کر رہے ہو کہ اس وقت تم پر ایک اور جسم غالب آیا ہوا ہے" — رشی نے کہا اور زینی کی طرف اشارہ کر کے بولی — "یہ بھی مجھ جیسی ماں کی بیٹی ہے جو راتیں تمہارے ساتھ اور عزیز کے ساتھ گزار رہی ہے۔"

"منہ بند رکھ لڑکی!" — زینی نے اُسے انگریزی میں ڈانٹ کر کہا — "میں چار چار لڑکوں کے ساتھ خاوند کو دھوکہ دے کر غائب ہو جانے والی لڑکی نہیں۔"

"تم لڑکی ہو ہی نہیں" — رشی نے کہا — "تم کتیا ہو۔"

"رشی!" — رابی غصے سے بھرا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا جیسے رشی کو جان سے مار ڈالے گا، کہنے لگا — "اگر تم نے ایسی بکواس پھر منہ سے نکالی تو...."

"جہاں ہو وہیں رہو رابی!" — رشی نے ایسے تحمل سے کہا جس میں قہر بھرا ہوا تھا — "اگر تم نے میرے جسم کو ہاتھ بھی لگایا تو بہت برا انتقام لوں گی۔"

زینی نے یہ ڈھونگ رچایا کہ رونی سی صورت بنا کر اس گھر سے

نکل گئی۔ رابی ایک بار پھر رِشی پر حملہ آور ہونے لگا لیکن عزیز کمرے میں آگیا۔ اُس نے رابی کو روک دیا اور اسے دوسرے کمرے میں لے گیا۔

❦

رابی پر صرف زَینی ہی سوار نہیں تھی بلکہ رِشی کو واپس لانے والے آدمیوں نے عزیز کے ساتھ اُس کی پٹائی کی تھی۔ اُس کے مُنہ پر دو جگہوں پر ابھار آگیا تھا جس نے اُس کے چہرے کو بھدّا بنا دیا تھا۔ اس کا غصّہ بھی وہ رِشی پر جھاڑ رہا تھا۔ کہتا تھا کہ رِشی کے خفیہ دوستوں نے اُس کا یہ حُلیہ بنا دیا ہے۔

"بیوقوف نہ بنو رابی!" — عزیز نے اُسے کہا — "رِشی کے ساتھ یہاں ایسا سلوک نہ کرو جو تم نے شروع کر دیا ہے۔ اس لڑکی پر کوئی بڑا ہی خطرناک اثر کام کر رہا ہے۔ یہ جو بیان دے رہی ہے کہ اسے ایک اینگلو انڈین نوجوان ہوٹل سے دھوکے میں لے گیا تھا جھوٹا بیان ہے۔ یہ پرانی دِلّی کے اُن ہی مسلمانوں کے پاس رہی ہے جن کی مَیں نے نشاندہی کی تھی۔ میری بہن نے اسے وہاں دیکھا تھا۔"

"میں انٹیلی جنس کے افسروں پر حیران ہوں کہ انہوں نے تمہاری بات مانی ہی نہیں" — رابی نے کہا — "اور انہوں نے اس فلرٹ لڑکی کے جھوٹے بیان کو سچ تسلیم کر لیا۔"

"اِن افسروں کی بات چھوڑو" — عزیز نے کہا — "بعض غلطیاں دانستہ کی جاتی ہیں۔ ان میں کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ میں تمہیں کچھ اور سمجھا رہا ہوں۔ رِشی کو پیار اور محبت سے اپنے قابو میں رکھو۔ اس کے خیالات بدلے ہُوتے معلوم ہوتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اس ناقابلِ برداشت سلوک سے رِشی یہاں سے بھاگ جائے اور ہمارے لیے کوئی مشکل پیدا کر دے۔"

"ہمارے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟" — رابی نے پوچھا —

"انٹیلی جنس کے لیے؟"

"ہم دونوں کے لیے!" — عزیز نے جواب دیا — "جو لوگ اسے لے گئے تھے وہ تمہیں بھی لے جا سکتے ہیں۔ یہ تو واپس آگئی ہے، تم واپس نہیں آسکو گے۔"

"اگر یہ ان لوگوں کے زیرِ اثر آگئی تھی تو واپس کیوں آگئی ہے؟" — رابی نے پوچھا۔

"یہ کوئی سازش معلوم ہوتی ہے" — عزیز نے جواب دیا — "اسے پاکستان لے جاؤ۔ وہاں جا کر اسے طلاق دے دینا۔ میں پاکستان جاتا ہی رہتا ہوں۔ وہاں ہمارے دوسرے ایجنٹ بھی موجود ہیں۔ وہ اس پر نظر رکھیں گے۔ اگر اس نے ہمارے خلاف کوئی کارروائی کرنے کی کوشش کی تو اسے غائب کر دیا جائے گا۔ زَینی تمہارے عشق میں تڑپ رہی ہے۔ مَیں اسے پاکستان بھجوانے کا انتظام کر دوں گا اور تم اس کے ساتھ شادی کر لینا۔"

"یہ بات تو پہلے ہی طے ہو چکی ہے" — رابی نے کہا — "میرا خیال ہے کہ رِشی کو معلوم نہیں کہ میں انڈین انٹیلی جنس میں شامل ہو گیا ہوں۔"

"میں یقین کے ساتھ کچھ بھی نہیں کہہ سکتا" — عزیز نے کہا۔

"اگر اسے معلوم ہوتا تو یہ بول پڑتی" — رابی نے کہا — "مَیں نے اسے جو ذلیل کیا ہے اور جو بہتان اس پر لگا دیئے ہیں، ان کے جواب میں یہ مجھے ضرور کہتی کہ تم انڈیا کے جاسوس بن گئے ہو۔"

"اس نے کہا ہے یا نہیں" — عزیز نے کہا — "ہمیں بہت ہی محتاط ہونا پڑے گا۔"

رِشی کو معلوم تھا کہ رابی انڈین انٹیلی جنس میں شامل ہو چکا ہے۔ اگر پہلے اسے شک تھا تو یہ دیکھ کر اس کا شک یقین میں بدل گیا تھا کہ اس کے اغوا کی تفتیش پولیس سٹیشن کی بجائے انٹیلی جنس ہیڈ کوارٹر میں

ہو رہی تھی۔ رابی جب رشی پر الزام تھوپ رہا تھا کہ وہ خود کسی کے ساتھ
گئی تھی، رشی کے ہونٹوں تک یہ بات آ گئی تھی کہ میں بدکار ہی سہی لیکن
میں پاکستان کے دشمن ملک کی جاسوسی نہیں۔ وہ کہنے ہی والی تھی کہ
تم ہندوؤں کے جاسوس ہو لیکن اُس نے یہ سچا الزام نگل لیا تھا۔

اُس نے ہاشی کے گھر میں جو روشنی پائی تھی اور ہاشی کی بیوی نے
اس کے ذہن کو جس نور سے منور کیا تھا، یہ اُسے راستے دکھا رہا تھا
اور خطرے اس کی روح کی آنکھ کو اپنے آپ ہی دکھائی دیتے تھے۔
اس کے ذہن میں یہ سوچ آ گئی تھی کہ وہ انڈیا میں ہے اور انڈیا کے
جاسوسوں کے قبضے میں ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ اُسے ایسا لاپتہ
کریں کہ اُس کی لاش بھی نہ ملے۔

وہ مرنے سے نہیں ڈرتی تھی۔ اُسے اپنی ماں سے محبت تھی
اور وہ ماں کو دنیا کی عظیم ترین عورت سمجھتی تھی لیکن رابی اور اُس کی ماں
نے اُسے بتایا تھا کہ اُس کی ماں آبرو باختہ عورت ہے اور اُس کی
جو جائداد ہے اور بنک میں اُس کا جو بیلنس ہے یہ سب باپ کی حرام
کی اور ماں کی عصمت کی کمائی ہے۔

رشی نے رابی سے محبت کی تھی لیکن رابی نے شادی کے بعد اُسے
کہہ دیا تھا کہ اُسے رشی کا جسم اچھا لگا تھا۔

رابی کی ماں نے اُسے اور اُس کی ماں کو دھتکار دیا تھا۔

پھر اس انکشاف نے اُس کے دل پر کاری ضرب لگائی تھی کہ رابی
انڈیا کا جاسوس ہے۔ اب رابی اُس سے چھن گیا تھا لیکن رابی اُسے بیوفا
کہہ رہا تھا۔

رشی کو مر جانے میں ہی نجات نظر آتی تھی لیکن ہاشی، اُس کی
بیوی اور عبدالقدیر کی باتیں اُسے زندہ رہنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ اُسے
یہ سوچ بھی آ گئی کہ اب اگر اُس نے یہ تیر رابی پر چلا دیا تو یہ نہ صرف خطا
جائے گا بلکہ واپس آ کر اُسی کے سینے میں پیوست ہو جائے گا، پھر کیوں نہ

یہ تیر اُس وقت چلائے جب یہ نشانے پر بیٹھے۔

اُس کے سینے میں انتقام کی آگ بھڑک اُٹھی۔ اُس نے ہونٹ
سی لیے۔

"یہاں نہیں!" — اُس کے ذہن سے ایک آواز اُٹھی —
"پاکستان پہنچ کر۔"

پاکستان تک یہ آواز پہنچانے کا انتظام عبدالقدیر کے پاس بھی
تھا۔ جس روز وہ رفیقی کے پاس یہ معلوم کرنے گیا تھا کہ چادر پر دھوبی
کا نشان تو نہیں تھا، اُس شام وہ اذان سے ذرا پہلے چاندنی چوک چلا
گیا۔ بازار میں آہستہ آہستہ چلتے چلتے ایک جنرل سٹور میں چلا گیا۔ یہ ایک مسلمان
کا خاصا بڑا جنرل سٹور تھا جس میں مالک کے علاوہ دو سیلزمین تھے۔ ان
میں سے ایک نے عبدالقدیر کو دیکھا تو وہ مُسکرایا۔ عبدالقدیر اُس کے
سامنے کاؤنٹر پر جا کھڑا ہوا۔

"اچھی قسم کی بنیانیں دکھا دیں" — عبدالقدیر نے اس سیلزمین سے
کہا — "اچھی قسم کا مطلب ہے بہت ہی اچھی۔"

سیلزمین نے تین چار ڈبے اُس کے آگے رکھ کر کھول دیئے۔ عبدالقدیر
ان ڈبوں پر اس طرح جھک گیا جیسے بنیانیں بڑی غور سے دیکھ رہا ہو۔
دکان میں چند اور گاہک تھے۔ سیلزمین کاؤنٹر کی دوسری طرف سے ذرا
سا جھکا۔ اُس کے اور عبدالقدیر کے سروں میں بمشکل چھ انچ فاصلہ رہ گیا۔

"کوئی خاص بات؟" — سیلزمین نے سرگوشی میں پوچھا۔

"ہاں!" — عبدالقدیر نے جواب دیا اور ایک ڈبے میں سے
ایک بنیان نکال کر سیدھا ہو گیا۔ اسے کھولا اور دھیمی آواز میں بولا
— "عشاء کی نماز کے بعد۔"

"اُسی مسجد میں؟" — سیلزمین نے سرگوشی کی۔

"ہاں!" — عبدالقدیر نے بنیان رکھ دی اور آہستہ آہستہ چلتا

جنرل سٹور سے نکل گیا۔

وہ اپنے گھر کی طرف جانے والی بس پر سوار ہُوا اور بس اُسے چاندنی چوک سے نکال لے گئی۔

عشاء کی نماز کے وقت وہ حوض قاضی کے قریب ایک مسجد میں تھا۔ وہ گھر بتا آیا تھا کہ ایک دوست کے ہاں جا رہا ہے، ذرا دیر سے لوٹے گا۔ وہ سیلز مین بھی مسجد میں آ گیا۔ انہوں نے باجماعت نماز پڑھی پھر سُنّت اور نوافل پڑھ کر الگ بیٹھ گئے۔ سیلز مین نے قرآن مجید کھول کر اپنے سامنے رکھ لیا۔ عبدالقدیر یوں اُس کے قریب بیٹھ گیا جیسے اُسے قرآن پڑھا رہا ہو۔ نمازی مسجد سے ایک ایک کر کے جا رہے تھے۔

"کیا خبر ہے؟" ـــ سیلز مین نے پوچھا۔

"محمود بھائی!" ـــ عبدالقدیر نے کہا ـــ "ایک شکار ہے۔ مَیں تمہیں پاکستان کے دو ایڈریس دیتا ہوں" ـــ اُس نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر اس کی تہیں کھولیں اور کُھلے ہوئے قرآن پہ رکھ دیا۔ سیلز مین جس کا نام محمود تھا، کاغذ پر لکھے ہُوئے ایڈریس پڑھنے لگا۔

"یہ ایڈریس ایم اے ملک کا ہے" ـــ عبدالقدیر نے کہا ـــ "ڈیفینس ڈیپارٹمنٹ میں ہے۔ ذرا دیکھو اس کی پوسٹ کتنی اہم ہے۔ یہ اس کے گھر کا ایڈریس ہے .... اور یہ اس کا بیٹا ہے۔ اس کا نام رب نواز ہے اور رابی کہلاتا ہے بلکہ رابی کے نام سے ہی جانا اور پہچانا جاتا ہے۔ یہ یہاں اپنی بیوی کے ساتھ آیا ہُوا ہے۔"

"خود آیا ہے؟" ـــ محمود نے پوچھا ـــ "یا لایا گیا ہے؟"

"لایا گیا ہے" ـــ عبدالقدیر نے جواب دیا ـــ "نوجوان ہے۔ اس کی بیوی بھی نوجوان ہے۔ تم تو جانتے ہو کہ 'را' کے مشن کے تحت لاتے گئے ہیں۔ کوئی شک نہیں رہا کہ یہ لڑکا یہاں کی انٹیلی جنس کا باقاعدہ آلۂ کار بن چکا ہے۔"

"یہ لڑکا زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے" ـــ محمود نے کہا ـــ "چونکہ اس کے ساتھ اس کی نوجوان بیوی ہے .... کیسی ہے؟ خوبصورت

ہو گی اور چالاک بھی!"

"خوبصورت بھی ایسی ہے کہ تم دیکھتے ہی رہ جاؤ" ـــ عبدالقدیر نے جواب دیا ـــ "بڑی سمارٹ لڑکی ہے۔ عقل اور ذہانت والی ہے۔ اگر انٹیلی جنس کی نظر سے دیکھیں تو اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ لڑکی بے حد خطرناک ثابت ہو سکتی ہے لیکن یہاں معاملہ اُلٹ ہو گیا ہے۔ رابی کو تو انڈین انٹیلی جنس نے پوری طرح اپنے جال میں لے لیا ہے لیکن اس لڑکی کو معلوم ہی نہیں کہ اس کا خاوند انڈین انٹیلی جنس کا ایجنٹ بن چکا ہے اور اسی سلسلے میں دِلّی لایا گیا ہے .... اب یہ سُنو کہ مَیں نے اِس لڑکی کے متعلق یہ معلومات کہاں سے اور کس طرح حاصل کی ہیں۔"

عبدالقدیر نے اُسے پوری تفصیل سے سنایا کہ اُسے کس طرح پتہ چلا تھا کہ یہ میاں بیوی دِلّی میں لاتے گئے ہیں۔ اُس نے عزیز کا نام لیا۔ عزیز کے متعلق محمود کو بتایا کہ اُس کا ذاتی کردار کیا اور فیملی بیک گراؤنڈ کیا ہے۔ عبدالقدیر نے محمود کو بتایا کہ رشی کو کس طرح اغوا کر کے لایا گیا اور اپنے دوست ہاشمی کے گھر میں رکھا گیا تھا۔ لڑکی کی قید کے دوران کی تمام باتیں عبدالقدیر نے محمود کو سنائیں۔ پھر یہ سنایا کہ کس طرح عزیز نے اپنی بہن کو ہاشمی کے گھر اس شبہے میں بھیجا تھا کہ لڑکی اس گھر میں ہے۔ پھر اُس نے محمود کو سنایا کہ دوسرے روز کس طرح عزیز کی بہن ایک ہندو ایجنٹ کو بُرقعے میں لپیٹ کر ہاشمی کے گھر لے گئی لیکن لڑکی کو وہاں سے شفٹ کر دیا گیا تھا۔ عبدالقدیر نے محمود کو یہ بھی بتایا کہ معاملہ تھانے تک پہنچ گیا تھا لیکن اللہ نے بڑی مدد کی اور معاملہ تھانے میں ہی ختم ہو گیا۔

اس کے بعد جو کچھ ہُوا وہ عبدالقدیر نے محمود کو بتایا۔

"مَیں آپ کی یہ روئیداد سُن کر محسوس کرتا ہوں کہ میں اسے سچ نہ مانوں" ـــ محمود نے کہا ـــ "آپ تربیت یافتہ انٹیلی جنس کا کام کر رہے ہیں۔ آپ کی باتیں سن کر میرا خون کھولنے لگا ہے۔ مجھے ایسے

محسوس ہوتا ہے جیسے میں آپ کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں کر رہا ....
اگر ہندوستان میں آپ جیسے کچھ اور مسلمان میدانِ عمل میں آجائیں تو
ہم انڈین انٹیلی جنس، ان کی 'را' اور دوسری تخریب کار ایجنسیوں کو بیکار
اور مفلوج کر سکتے ہیں۔"

"یہاں بیٹھے ہمیں بہت دیر ہو گئی ہے" ــــ عبدالقدیر نے کہا
ــــ "کوئی شک نہ کرے۔ باہر چلتے ہیں۔ پارک میں ٹہلتے ٹہلتے باقی بات
کر لیں گے۔ اپنے متعلق مجھے یہ خطرہ محسوس ہو رہا ہے کہ انٹیلی جنس نے
مجھے نگرانی میں رکھ لیا ہو گا۔ تم تو اس چکر سے واقف ہی ہو۔"

محمود نے قرآن بند کر کے الماری میں رکھا اور عبدالقدیر کے ساتھ
مسجد سے نکل آیا۔ کچھ دُور بچوں کا ایک وسیع اور سرسبز پارک تھا۔ دونوں
اس پارک میں سیمنٹ کے ایک بنچ پر جا کر بیٹھ گئے۔

"میں تمہیں اس لڑکی کے متعلق کچھ بتانے لگا تھا" ــــ عبدالقدیر
نے کہا ــــ "ظاہر ہے کہ اس لڑکی کو جب ہم نے قید میں رکھا تو پہلے
روز بہت پریشان ہوئی۔ ہم نے اسے بتایا کہ اسے کیوں اغوا کیا گیا
ہے۔ ایک دو دن اور راتیں گزر گئیں تو لڑکی کو یقین ہو گیا کہ اس کے
ساتھ ہمارا اور کوئی مطلب نہیں اور ہم غنڈے بدمعاش اور بردہ فروش
نہیں۔ پتہ چلا کہ اسے معلوم ہی نہیں کہ اس کا خاوند کس چکر میں پڑا ہُوا
ہے۔ مَیں نے اور ہاشمی صاحب اور ان کی بیوی نے اس لڑکی کے ساتھ
اسلام، اسلامی جذبے، ذاتی اور قومی وقار کی باتیں کیں تو لڑکی کا ردِ عمل
ایسا تھا جیسے اُس نے یہ باتیں پہلے کبھی نہ سُنی ہوں اور یہ باتیں اُس
کے دل میں اترتی ہوئی صاف نظر آ رہی ہوں۔ تم یہ سمجھ لو کہ اُس کے
خاوند کی برین واشنگ 'را' نے کی ہے اور اُس کی بیوی کی برین واشنگ
ہم نے اپنے رنگ میں کر دی ہے۔"

"لیکن یہ تو یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ آپ کی کی ہوئی برین واشنگ

ہمیشہ قائم رہے گی" ــــ محمود نے کہا ــــ "وہ اپنے خاوند کے رنگ میں
کسی وقت بھی رنگی جا سکتی ہے۔"

"یہ خطرہ تو ہے" ــــ عبدالقدیر نے کہا ــــ "لیکن اس پر غور کرو
کہ ہمیں انٹیلی جنس ہیڈ کوارٹر میں بلایا گیا اور اس لڑکی سے شناخت پریڈ
کرائی گئی اور لڑکی نے ہماری شناخت سے انکار کر دیا.... پھر ہمارے
آدمی جو رشی کو واپس عزیز کے گھر لے گئے تھے، عزیز اور اس لڑکی کے
خاوند رابی کی پٹائی کر کے آ گئے تھے۔ اس لڑکی نے اپنے خاوند
کی اور اپنے میزبان عزیز کی پٹائی بھی برداشت کر لی۔
اس سے ہمیں اُمید ملتی ہے کہ یہ لڑکی ہمیں دھوکا نہیں دے گی۔ پھر
بھی خطرہ تو ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہمارا تمہارا انحصار اس لڑکی پر ہو گا۔
میں تمہیں اس لڑکی کے گھر کا ایڈریس بھی دے رہا ہوں۔ تم نے پڑھ لیا
ہے یہ بھی لاہور کا ایڈریس ہے۔ لڑکی کے بیان کے مطابق اس گھر میں
اُس کی صرف ماں رہتی ہے۔"

"مجھے تو پاکستان کے ایڈریس چاہئیں" ــــ محمود نے کہا ــــ
"مَیں یہ ایڈریس اور دوسری تمام معلومات جو آپ نے مجھے دی ہیں پاکستان
آئی ایس آئی تک پہنچا دوں گا۔ آئی ایس آئی خود سنبھال لے گی۔ لڑکی
خواہ کسی بھی رنگ میں رنگی جاتے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لڑکی کی ماں کا کردار صحیح نہیں" ــــ
عبدالقدیر نے کہا ــــ "اُس کا خاوند غبی اور رشوت خور افسر تھا اور یہ
عورت اپنی عصمت کی قربانی دے کر اُسے بچاتی رہی ہے۔ ایسی عورت
دشمن کی انٹیلی جنس کا بڑی آسانی سے شکار ہو سکتی ہے۔"

"یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں" ــــ محمود نے کہا ــــ "یہ میرا اور آئی ایس آئی
کا کام ہے۔ پاکستان میں کون کیا ہے، اسے سنبھالنا ہمارا کام ہے۔"

"مَیں نے لڑکی کا نام بھی لکھ دیا ہے" ــــ عبدالقدیر نے کہا ــــ
"اصل نام راشدہ ہے اور رشی کہلاتی ہے۔"

"اگر یہ معلوم ہو جاتے کہ یہ میاں بیوی کب واپس جا رہے ہیں تو بہتر ہوگا" — محمود نے کہا — "میں بہر حال تین چار دنوں کے اندر اندر یہ تمام معلومات پاکستان بھجوا دوں گا۔ آئی ایس آئی والے وہاں سے معلوم کر لیں گے کہ ان کا ویزہ کب تک ہے .... اس لڑکے کا باپ ڈیفینس میں ہے۔ وہ تو بڑے خطرناک راز انڈیا کو دے سکتا ہے۔"

"ہو سکتا ہے دے بھی چکا ہو" — عبدالقدیر نے کہا — "اگر تم نے کچھ اور پوچھنا ہو تو پوچھ لو۔"

"یہ انفارمیشن کافی ہے" — محمود نے کہا — "اور یہ بڑی قیمتی انفارمیشن ہے .... اب چلنا چاہیئے۔ اللہ پر بھروسہ رکھیں۔"

"اللہ پر ہی بھروسہ ہے" — عبدالقدیر نے کہا — "یہ میرا ایمان ہے کہ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ اس سلسلے میں ہم جن خطروں سے صاف بچ کر نکلے ہیں، اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہمیں اپنے اللہ کی خاص کرم نوازی حاصل ہے۔ لڑکی کا ہماری شناخت سے انکار معجزے سے کم نہیں۔"

"عبدالقدیر صاحب!" — محمود نے کہا — "ہماری سب سے بڑی کمزوری ہمارے حکمران ہیں۔ اب تک ہم نے یہ دیکھا ہے کہ پاکستان کے حکمران سیاسی لیڈر ہوں یا جرنیل، سب انڈیا کے آگے جھکے جھکے سے رہتے ہیں۔ پاکستان میں تو ایسا بھی ہوا ہے اور ہوتا رہتا ہے کہ آئی ایس آئی نے کسی بڑے افسر کی نشاندہی کی کہ وہ انڈیا کا جاسوس ہے تو معاملہ اوپر ہی اوپر رفع دفع کر دیا گیا۔ جس ملک کی انٹیلی جنس کو حکمران اپنے اقتدار کے تحفظ کے لئے اور سیاسی مخالفین کو دباتے رکھنے کے لئے استعمال کرتے رہیں وہ ملک اپنے دشمن سے کس طرح بچ سکتا ہے۔ خود ہی غور فرمائیں کہ ہمارا یہ دشمن ملک کس طرح ہمارے گمراہ نوجوانوں کو اپنے کام میں استعمال کر رہا ہے۔ کیا پاکستان نے کبھی ہندو، سکھ یا بھارت کے عیسائی نوجوانوں کو اس طرح برین واشنگ کر کے اپنے

کام میں لانے کی کوشش کی ہے؛ ہم یہ کام کر سکتے ہیں بشرطیکہ اس کے لئے موزوں آدمی یہاں بھیجے جائیں اور مطلوبہ سہولتیں فراہم کی جائیں۔ ادھر ہم دشمن کے ملک میں اپنی جانوں کو خطرے میں ڈال کر کام کر رہے ہیں، اُدھر ہمارے بادشاہ اپنے مفادات اور اپنی سوچوں میں مگن ہیں۔ بہر حال ہم اپنے فرائض جان کی بازی لگا کر بھی پورے کر رہے ہیں۔"

"پاکستان اللہ کی اور شہیدوں کی سرزمین ہے" — عبدالقدیر نے کہا — "اللہ ہی پاکستان کے حکمرانوں اور حکمرانی کے خواہش مند لیڈروں کو ہدایت دے گا۔"

عبدالقدیر اور محمود پارک سے اُٹھے، باہر نکلے اور ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ کر اپنی اپنی راہ لگ گئے — خدا ہی ان کا حافظ اور نگہبان تھا۔

محمود پاکستان کی انٹیلی جنس آئی ایس آئی کا کارندہ تھا۔ وہ پاکستانی تھا اور گزشتہ دو سال سے دلی میں بھارتی شہری کی حیثیت سے رہ رہا تھا۔ یہ سب جعل سازی اور بہروپ تھا۔ ان دو سالوں میں وہ آئی ایس آئی کو بڑی قیمتی انفارمیشن دے چکا تھا۔ کوئی ایک سال پہلے عبدالقدیر نے اپنے طور پر محمود کو دریافت کیا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو اعتماد میں لے لیا تھا۔ گزشتہ ایک سال سے ان کی ملاقاتیں اسی مسجد میں ہو رہی تھیں جہاں اُس رات انہوں نے عشاء کی نماز پڑھی تھی۔

چار پانچ دنوں بعد رابی اور رِشی طیارے میں بیٹھے ہوتے تھے اور طیارے کے انجن سٹارٹ ہو چکے تھے۔ مسافروں نے سیفٹی بیلٹیں باندھ لی تھیں۔ یہ بیلٹیں تو ایک ہی قسم کی تھیں لیکن رابی بھارت کی ایک بڑی ہی حسین بیلٹ سے بندھ چکا تھا۔ وہ اس بندھن کے حسن میں کھویا ہوا تھا۔ وہ ان خطروں سے بے نیاز تھا جو اس حسن میں پوشیدہ تھے۔ اُس کے ذہن میں رِینی سمائی ہوئی تھی۔ اُس کی سوچوں اور خیالوں پر بھارت کی اسی ہندو لڑکی کا غلبہ تھا جو اُس کے دل کی دنیا میں

زینت آفتاب عرف زینی کے بہروپ میں داخل ہوتی تھی۔ اس بہروپ میں رابی کے لئے طلسماتی کشش تھی۔

طیارہ رَن وے کے سرے پر پہنچ چکا تھا۔ رِشی باہر دیکھ رہی تھی۔ رابی زینی کے تصوّر میں ایسا گم تھا کہ اُسے معلوم ہی نہ تھا کہ طیارہ اُڑنے کے لئے رَن وے پر دوڑ پڑا ہے۔ رابی گزشتہ رات کے لمحوں میں کھویا ہُوا تھا۔ اُس کے نتھنوں میں زینی کے جسم کی بُوباس ابھی تک موجود تھی جس میں سینٹ بھی شامل تھی۔ یہ مسحور کُن تحفہ تھا جو وہ دِلی سے لے جا رہا تھا۔ زینی آدھی رات تک اُس کے بیڈروم میں رہی تھی۔ گناہ کی بدبو بھی اُس کے لئے عطر بیز تھی۔

رِشی اُس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ اتنی قریب کہ دونوں ایک دوسرے کو چھُو رہے تھے لیکن رابی اور رِشی کے درمیان بڑا لمبا فاصلہ حائل ہو گیا تھا۔ یہ میاں بیوی ندی کے دو کنارے بن گئے تھے جو کبھی بھی اور کہیں بھی نہیں مل سکتے۔ ان کے درمیان محبت اور نفرت کی ندی بہہ رہی تھی —— رابی کے دل میں زینی کی محبّت اور رِشی کے دل میں رابی کی نفرت تھی۔

طیّارہ فضا میں بلند ہو چکا تھا اور دِلی پر چکر کاٹ کر پاکستان کی طرف محوِ پرواز تھا۔

جب طیّارہ پاکستان کی سرحد میں داخل ہُوا، اُس وقت بھارت کی ایک ریل گاڑی پاکستان کی سرحد میں داخل ہوتی جس میں بھارتی اور پاکستانی مسافر سوار تھے۔ ان میں اشتیاق علی نام کا ایک بھارتی مسلمان بھی تھا جو پاکستان میں اپنے عزیزوں سے ملنے آ رہا تھا۔ اُس کے پاس رابی اور رِشی کے گھروں کے ایڈریس تھے۔ محمود نے اُسے وہ تمام روئیداد سُنا دی تھی جو عبدالقدیر نے اُسے سنائی تھی۔ اشتیاق کو معلوم تھا کہ یہ قصّہ پاکستان میں جا کر کہاں اور کیسے سنانا ہے —— وہ آئی ایس آئی کا ایجنٹ تھا۔

نجات اسی میں ہے کہ جس طرح تم نے یہ چند ایک باتیں تسلیم کر لی ہیں اسی طرح تم سے جو کچھ بھی پوچھا جائے وہ سچ سچ بتا دینا۔ ہو سکتا ہے ہم تمہیں سلطانی گواہ بنا کر تفتیش ختم ہوتے ہی واپس انڈیا بھیج دیں .... اب ایک انتہائی اہم سوال کا جواب دے دو۔ ان آدمیوں کے علاوہ جو ہم نے پکڑے ہیں، تم پاکستان میں کتنے آدمیوں اور عورتوں کو جانتی ہو؟"

"میں سچ کہتی ہوں" — زینی نے جواب دیا — "میں ان آدمیوں کے سوا اور کسی کو نہیں جانتی۔"

"نہیں زینی!" — میجر نے کہا — "تم اپنے آپ کو اسی جگہ لا رہی ہو جہاں سے میں تمہیں ہٹانا چاہتا ہوں۔"

زینی اسی پر اڑی رہی کہ وہ اور کسی کو نہیں جانتی۔ میجر اس پر دباؤ ڈالتا رہا۔ زینی رونے پر آ گئی لیکن میجر پر اس کے رونے کا کچھ اثر نہیں ہو رہا تھا۔

"میں آپ کو ایک اور بات بتاتی ہوں" — زینی نے اٹھ کر اپنی قمیص کو ایک پہلو سے اُلٹا کیا اور بولی — "یہاں قمیص کی سلائی پر ہاتھ لگائیں۔ آپ کو چھوٹی سی ایک گولی ملے گی۔ یہ مجھے دی گئی تھی اور کہا گیا تھا کہ پکڑے جانے کی صورت میں یہ گولی نگل لینا۔ زیادہ سے زیادہ دس منٹ میں تم آزاد ہو جاؤ گی .... آپ یہ گولی نکال کر پھینک دیں۔ میں مرنا نہیں چاہتی۔ اگر میں اپنے ملک کی اتنی وفادار ہوتی تو لاہور میں گرفتاری کے فوراً بعد یہ گولی نگل کر مر چکی ہوتی۔"

میجر نے اسے واپس سیل میں بھیج دیا۔ وہ زینی کے اس جواب سے مطمئن نہیں تھا کہ وہ رِنگ کے کسی اور فرد کو نہیں جانتی۔ میجر نے اس کی قمیص کے اندر سلی ہوئی گولی نکال لی تھی۔ اُس نے یہ گولی اپنے کرنل کو دکھائی۔ کرنل نے میجر سے کہا کہ وہ ہر ملزم کے سیل میں جا کر اُس کے کپڑوں کی سلائیاں چیک کرے۔

"سر!" — میجر نے کہا — "اگر آپ میری تجویز پسند کریں تو ان کے کپڑے اُتروا کر انہیں یہاں سے پاجامے اور کُرتے دے دیئے جائیں۔"

کرنل نے اس تجویز کو پسند کیا۔ اُسی وقت تمام ملزموں کے کپڑے اُتروا کر انہیں کُرتے اور پاجامے دے دیئے گئے۔ ان کے کوٹوں، پتلونوں اور قمیصوں کی اندرونی سلائیاں دیکھی گئیں۔ صرف ورما کی پتلون کی بیلٹ والی جگہ سے اسی قسم کی گولی نکلی۔ وہ بھی شاید خودکشی سے گھبرا گیا تھا۔ اُسے یہ توقع تو نہیں ہونی چاہیئے تھی کہ عدمِ ثبوت کی بنا پر اُسے چھوڑ دیا جائے گا۔

❄

نئی دلی میں انڈین انٹیلی جنس کے انٹیروگیشن سنٹر کی ایک کوٹھڑی میں عبدالقدیر اور دوسری میں عزیز کا بہنوئی بند تھا۔ تیسری کوٹھڑی میں ہاشمی کو بند کیا گیا تھا۔ اُس وقت اُس کی کوٹھڑی خالی تھی۔ اُسے اُس کمرے میں لے گئے تھے جہاں تفتیش ہوا کرتی تھی۔ میجر بھاٹیہ اُس سے پوچھ گچھ کر رہا تھا۔

"جناب فریدالدین ہاشمی صاحب!" — میجر بھاٹیہ نے کہا — "ہم آپ کی جتنی عزت کر سکتے تھے کر چکے ہیں۔ آپ شرافت کا جھانسہ دے کر نکل گئے تھے۔ آپ سمجھے کہ ہم بیوقوف بن گئے ہیں .... اب ہم شرافت کو نہیں مانیں گے۔"

"میں اگر پہلے شریف تھا تو اب بھی آپ وہی شرافت دیکھیں گے" — ہاشمی نے کہا۔

"شٹ اپ" — میجر بھاٹیہ نے کہا — "مان لو کہ رشی تمہارے گھر میں رہی تھی اور اُسے تم لوگوں نے اغوا کیا تھا۔"

"یہ غلط ہے" — ہاشمی نے کہا۔

"اور مان لو کہ عزیز کو تم لوگوں نے قتل کیا ہے" — میجر بھاٹیہ نے اُس کے جواب کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا — "تم پاکستان کے ایجنٹ ہو۔"

"عزیز کی ہمارے ساتھ کیا دشمنی تھی کہ ہم اسے قتل کرتے؟" — ہاشمی نے کہا — "وہ اپنی بدمعاشیوں کی وجہ سے اپنے جیسے کسی بدمعاش کے ہاتھوں قتل ہُوا ہے"۔

"YOU DIRTY MUSLIM" — میجر بھاٹیہ نے ہاشمی کے مُنہ پر بڑی زور سے تھپڑ مارتے ہُوئے کہا — "عزیز کے ساتھ ایک نوجوان آدمی تھا۔ عزیز کے قاتلوں نے اس آدمی سے کہا تھا کہ واپس پاکستان چلے جاؤ اور ..."

ہاشمی نے اُسی قسم کا تھپڑ میجر بھاٹیہ کے مُنہ پر مار کر کہا —

"YOU FILTHY KAFIR".

میجر بھاٹیہ چکرایا پھر سنبھل کر کمرے سے نکل گیا۔ دو تین منٹ بعد تین ہٹے کٹے آدمی اندر آئے اور انہوں نے ہاشمی پر گھونسوں اور تھپڑوں کا مینہ برسا دیا۔ ہاشمی گر پڑا تو اُسے ٹھُڈ مارے جانے لگے اور وہ ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ ہوش میں آیا تو اُس کے پاؤں فرش سے چھ سات انچ اوپر تھے اور کلائیوں سے بندھا ہُوا وہ چھت سے لٹک رہا تھا۔ اُسے کچھ احساس نہیں تھا کہ کتنا وقت گزر گیا ہے۔ اُس کے جسم سے درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں

"رشی کو تم لوگوں نے اغوا کیا تھا" — ہاشمی کو آواز سنائی دی — "بولو ہاں!"

ہاشمی کے مُنہ سے کوئی آواز نہ نکلی۔

"آخری بار!" — اُسے میجر بھاٹیہ کی مانوس آواز سنائی دی — "کہو، رشی کو تمہارے گھر میں رکھا گیا تھا یا نہیں؟"

ہاشمی نے سر کو دائیں بائیں کی جنبش دی۔ مطلب یہ تھا کہ نہیں۔

"عزیز کے قاتلوں کے نام بتاؤ۔"

ہاشمی نے پھر سر ہلا کر نفی میں جواب دیا۔

"تمہاری بیوی بتا دے گی" — میجر بھاٹیہ نے کہا — "وہ نہیں بتائے گی تو جمیل کی بیوی بتا دے گی۔ ان دونوں عورتوں کو تمہارے

سامنے ننگا کیا جائے گا"۔

ہاشمی کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ آگئی جس میں کرب بھی تھا طنز بھی۔

میجر بھاٹیہ نے ہاشمی کو کھول کر اُتروا دیا۔ ہاشمی پاؤں پر کھڑا نہ رہ سکا۔ فرش پر پاؤں لگتے ہی وہ گر پڑا اور بیہوش ہوگیا۔ اُسے ہوش آئی تو وہ کوٹھڑی کے فرش پر پڑا ہُوا تھا۔ اُس کے قریب ایک پلیٹ میں دال اور دو روٹیاں رکھی ہوئی تھیں اور ایلومینیم کے ٹیڑھے میڑھے گلاس میں پانی پڑا ہُوا تھا۔ ہاشمی نے پانی کا گلاس اُٹھایا۔ اُس کا ہاتھ اتنا زیادہ کانپ رہا تھا کہ پانی چھلکنے لگا۔ اُس نے گلاس کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر مُنہ سے لگایا اور ایک ہی بار گلاس خالی کر دیا۔ اُس کے ہاتھ سے گلاس گر پڑا اور وہ خود ایک پہلو پر لڑھک گیا۔

اس جہنم میں ہاشمی کے لئے اور کسی بھی مسلمان کے لئے ذرا سا بھی رحم نہیں تھا۔

❄

راولپنڈی انٹیلی جنس سنٹر میں ایسے ہی ایک کمرے میں جو انڈین انٹیلی جنس کے تفتیش والے کمرے جیسا تھا، رابی ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ اُس کے سامنے انٹیلی جنس کا میجر عباس بیٹھا تھا۔ دونوں کے درمیان ایک میز حائل تھی۔ رابی کے چہرے پر گھبراہٹ اور اُداسی کا ملا جلا تاثر تھا لیکن اس کے چہرے پر وہ رونق ابھی قائم تھی جو جوانی کا پتہ دیتی ہے اور جس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ نوجوان کسی بڑے افسر کا یا اثر و رسوخ والے کسی بڑے آدمی کا بیٹا ہے۔

"مسٹر رب نواز!" — میجر عباس نے پوچھا — "میں تمہیں رب نواز کہوں یا رابی؟"

"رابی!" — رابی نے خود اعتمادی سے جواب دیا۔

"گڈ!" — میجر عباس نے کہا — "رابی اچھا نام ہے .... ہاں مسٹر

رابی! تم جانتے ہو تمہیں یہاں کیوں لایا گیا ہے؟"

"یہ کسی کو غلط فہمی ہوئی ہے" — رابی نے کہا — "آپ میرے ڈیڈی کو جانتے ہوں گے۔ اتنے بڑے آفیسر کا بیٹا جاسوس نہیں ہو سکتا۔"

"تمہیں کس نے کہا ہے کہ تم جاسوسی کے الزام میں پکڑے گئے ہو؟" — میجر عباس نے پوچھا۔

رابی سوچ میں پڑ گیا۔

"ہاں رابی! بولو" — میجر عباس نے پوچھا — "کیا تمہیں کسی نے بتایا ہے کہ تم پر جاسوسی کا الزام ہے؟"

"کہا تو کسی نے نہیں" — رابی نے دبے دبے الفاظ میں کہا — "اگر مجھ پر جاسوسی کا الزام نہیں تو مجھے سیل میں کیوں بند کیا گیا ہے؟"

"ہم اہم گواہوں کو بھی سیل میں بند کر دیا کرتے ہیں تاکہ کوئی ملزم ان پر قاتلانہ حملہ نہ کر دے۔ تم اگر اپنے آپ کو ملزم سمجھتے ہو تو میں تمہیں روک تو نہیں سکتا لیکن میں تمہیں گواہ بنانا چاہتا ہوں۔ تم نے الزام سنے بغیر یہ جو کہہ دیا ہے کہ تم پر جاسوسی کا الزام ہے، اس سے تم نے میرے دل میں شک پیدا کر دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے تمہارے ضمیر پر کسی ایسے ہی جرم کا بوجھ ہے۔"

رابی خالی خالی نظروں سے میجر عباس کو دیکھتا رہا۔ اس کے ضمیر پر جس جرم کا بوجھ تھا وہ اسے بولنے نہیں دے رہا تھا۔ میجر عباس کو تو اچھی طرح معلوم تھا کہ رابی پر انڈیا کے لیے جاسوسی کرنے کا الزام ہے۔

"بھائی رابی!" — میجر عباس نے دوستانہ لہجے میں کہا — "میں تم پر کوئی الزام عائد نہیں کرتا۔ تم صرف یہ بتا دو کہ یہ کون لوگ ہیں جن کے ساتھ تم پکڑے گئے ہو؟"

"یہ جو لڑکی زینی ہے اس آدمی کی بہن ہے جس کا نام عبدالرحمٰن ہے" — رابی نے ایسے انداز سے کہا جیسے وہ سو فی صد سچ بول رہا ہو — "یہ لوگ انڈیا سے آتے ہیں۔ میں انڈیا گیا تھا تو ان لوگوں کے ہاں ٹھہرا تھا۔

سچی بات یہ ہے کہ زینی میرے ساتھ شادی کرنے کے لیے آئی ہے۔ ان آدمیوں میں جنہیں یہاں لایا گیا ہے ایک عبدالرحمٰن ہے اور زینی کا تایا ہے، دو چچے ہیں اور ایک ان کا کوئی قریبی رشتہ دار ہے۔"

"تم انہیں کس طرح جانتے تھے؟" — میجر عباس نے پوچھا اور کہا — "ظاہر ہے کہ تم انہیں پہلے سے جانتے تھے اور ان کے ساتھ تمہارے تعلقات خاصے گہرے تھے ورنہ کون کسی کو اتنے دن اپنے ہاں ٹھہراتا ہے اور سیر سپاٹے کراتا ہے .... میری ایک بات اچھی طرح ذہن میں بٹھا لو۔ تم جو جواب بھی دو گے اس کی تصدیق کرائی جائے گی۔ یہ بھی سوچ لو کہ یہ پانچ آدمی ہیں۔ چھٹی زینی ہے۔ ان سب سے تفتیش ہو گی اور تمہارے بیان کی سچائی اور جھوٹ کا پتہ چل جائے گا۔ میں تمہیں یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ زینی بیان دے چکی ہے۔ تم اتنی آسانی سے یہاں سے نہیں نکل سکو گے۔"

رابی نے ایک بار پھر اپنے اسی بیان کو دہرایا جو وہ پہلے دے چکا تھا۔

"مسٹر رابی!" — میجر عباس نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا — "مجھے پٹڑی سے اتارنے کی کوشش نہ کرو۔ جب تک سچ نہیں بولو گے یہاں سے نکل نہیں سکو گے .... میرے اس سوال کا جواب سوچ کر دو۔ کیا تمہیں پہلے معلوم نہیں تھا کہ زینی اور عبدالرحمٰن مسلمان نہیں ہیں؟"

"میں اب بھی کہتا ہوں کہ وہ مسلمان ہیں" — رابی نے جواب دیا — "اسی لیے تو میں زینی کے ساتھ شادی کر رہا ہوں۔"

"کیا زینی کی خاطر بیوی کو طلاق دے رہے ہو؟" — میجر عباس نے پوچھا۔

"نہیں!" — رابی نے جواب دیا — "طلاق دینے کی وجہ یہ ہے کہ وہ بدچلن ماں کی بدچلن بیٹی ہے۔"

"مسٹر رابی!" — میجر عباس کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا — "تم

"اتنے چالاک اور ہوشیار نہیں ہو سکتے جتنا اپنے آپ کو سمجھتے ہو"—— میجر عباس نے میز کی دراز سے ایک اخبار نکالا، اخبار رابی کے آگے رکھا اور ایک خبر پر انگلی رکھ کر اس سے پوچھا —— "یہی ہے نا وہ انفارمیشن جو تم نے اپنے ڈیڈی کی فائل سے نکال کر اور فوٹو سٹیٹ کرا کے ان لوگوں کے حوالے کی تھی اور انہوں نے یہ انفارمیشن نئی دِلی کو بھیجی تھی؟"

رابی خبر پڑھنے لگا۔ یہ وہی بیان تھا جو انڈین گورنمنٹ کی طرف سے جاری ہُوا تھا کہ پاکستان سکھوں کو کس طرح جنگی مدد دے رہا ہے۔ رابی خبر پڑھ چکا تو اُس نے میجر عباس کی طرف دیکھا جو اُس کے ساتھ کھڑا تھا۔

"مَیں نے ایسی کوئی انفارمیشن کسی کو نہیں دی"—— رابی نے کہا —— "آپ مجھ پر ایسا جھوٹا اور بیہودہ الزام نہ لگائیں۔ آپ میرے ڈیڈی کو شاید نہیں جانتے۔ وہ ڈیفنس منسٹری میں ...."

وہ اس سے آگے بول نہ سکا کیونکہ میجر عباس نے بڑی زور سے اُس کے سر پر ہاتھ مارا اور اُس کے لڑکیوں جیسے لمبے لمبے بال اپنی مُٹھی میں لے کر زور سے اُوپر کو جھٹکا دیا تھا۔ رابی کی زبان بند ہوگئی اور مُنہ کھُل گیا۔ میجر عباس نے اُس کے بال اور زور سے کھینچے۔ رابی اُٹھ کھڑا ہُوا۔ باکسروں جیسے جسم والے میجر عباس نے رابی کے بال اپنی مُٹھی میں رکھے اور اُسے زور سے گھما کر چھوڑ دیا۔ رابی گھومتا ہُوا دیوار سے ٹکرایا۔ اُس کا سر اتنی زور سے دیوار سے لگا کہ اُسے چکر آگیا پھر اُس کی ٹانگیں دوہری ہوئیں اور وہ گھٹنوں کے بل گر کر ایک پہلو کو لڑھک گیا۔

میجر عباس نے کمرے سے نکل کر ایک آدمی کو بلایا اور اُسے کہا کہ رابی کے مُنہ پر پانی پھینکے اور اسے پانی پلائے۔

پانی آنے تک رابی ہوش میں آگیا اور آہستہ آہستہ اُٹھ کھڑا ہُوا۔ میجر عباس نے پیچھے سے اُسے لات ماری۔ وہ کُرسی کے ساتھ جا لگا۔ میجر عباس نے اسے بیٹھنے کو کہا۔

"یہ ابتدائے عشق ہے"—— میجر عباس نے اس کے قریب آکر کہا —— "آگے آگے دیکھتے ہوتا ہے۔ جس ماں نے تمہیں جنم دیا ہے کل تک وہ بھی تمہیں پہچاننے سے انکار کر دے گی"—— میجر عباس نے اُس کے بال ایک بار پھر پکڑ کر پیچھے کو جھٹکا دیا۔ رابی کا مُنہ اُوپر کو ہوگیا۔ میجر عباس نے کہا —— "ایک مجھ جیسے ماؤں کے بیٹے ہیں جو بارڈر پر جا کر اس ملک کی خاطر شہید ہوتے ہیں۔ اگر مَیں تمہیں وہ فوجی دکھاؤں جو ٹانگوں، بازوؤں یا آنکھوں سے محروم ہو کر گھروں میں اپاہجوں جیسی زندگی گزار رہے ہیں تو تم سجدے میں گر پڑو۔ ایک تم جیسی حرام کی اولاد ہے جسے ڈسکو کلچر نے گھر کا رہنے دیا ہے نہ گھاٹ کا.... اور ایک دِلی کے وہ مسلمان ہیں جو وہاں بیٹھے ہُوئے پاکستان کی سلامتی کی خاطر اپنے جان و مال کو خطرے میں ڈال کر انڈیا کے جاسوسوں کے خلاف زمین دوز جنگ لڑ رہے ہیں.... اب جھوٹ بول کے دیکھو۔"

رابی اُن نوجوانوں میں سے تھا جن کی روح کی غذا جنسی بے راہروی تھی اور جنہوں نے ہنگامے، شور شرابے اور بے ہنگم اُچھل کُود کو کلچر کا نام دے رکھا تھا۔ اِن کے جسموں میں اتنی جان نہیں تھی کہ ذرا سی بھی سختی برداشت کر سکتے۔ رابی نے میجر عباس کو صرف دیکھا۔ اُس کی نظروں میں ایسا تاثر تھا جیسے وہ گُم ہوگیا ہو، بھٹک گیا ہو اور وہ میجر عباس سے پوچھنا چاہتا ہو کہ وہ کہاں ہے اور اُس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے، لیکن اُس کا دماغ اس کا ساتھ چھوڑ گیا تھا اور اُس کی زبان جیسے اکڑ سی گئی تھی۔

"مجھے اپنے ڈیڈی کا رُعب دیتے ہو؟"—— میجر عباس نے اُس کے بال چھوڑتے ہُوئے کہا —— "اب میرے اس سوال کا جواب دو۔ کیا تم جانتے تھے کہ عبدالرحمٰن اور زینی ہندو ہیں؟"

"خدا کی قسم، مَیں نہیں جانتا تھا"—— رابی نے روتی ہوئی سی آواز میں کہا —— "اگر آپ کہتے ہیں کہ یہ ہندو ہیں تو پھر یہ سمجھ لیں کہ میرے ساتھ دھوکہ ہو رہا تھا"

"اور تم خدا کو دھوکا دے رہے تھے"—— میجر عباس نے کہا اور اخبار

پر ہاتھ مار کر پوچھا ——"کیا یہ انفارمیشن تم نے پاس کی ہے؟"

"نہیں"—— رابی نے بڑے پختہ لہجے میں جواب دیا ——"مَیں نے ایسا کام کبھی نہیں کیا۔"

میجر عباس باہر جاکر دو آدمیوں کو بلا لایا اور رابی کی طرف اشارہ کیا۔ دونوں نے رابی کو چت لٹا دیا۔ پھر اس کے بازو دائیں بائیں پھیلا دیئے ہتھیلیاں اُوپر کو رکھیں۔ دونوں نے میز اُٹھا کر اس طرح رکھی کہ میز کا ایک پایہ رابی کی ایک ہتھیلی پر اور دوسرا دوسری ہتھیلی پہ آگیا۔ ایک آدمی میز پر اس طرح بیٹھ گیا کہ اُس کا وزن رابی کی ہتھیلیوں پر پڑنے لگا۔ رابی تڑپنے لگا۔ وہ دُودھ پیتے بچے کی طرح زور زور سے ٹانگیں مارتا تھا۔ ایک آدمی اُس کے دونوں پاؤں مروڑ کر اس کے ٹخنوں پر کھڑا ہو گیا۔ رابی نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔

میجر عباس کمرے سے نکل گیا۔

اُس وقت لاہور کی ایک کوٹھی میں ایک عورت اسی طرح تڑپ رہی تھی۔ وہ بڑی سخت اذیت میں مبتلا تھی۔

وہ رابی کی ماں تھی۔ اُس نے رابی کے باپ کو بھی اذیت میں مبتلا کر رکھا تھا۔ کبھی وہ رابی کے باپ کو کوسنے لگتی۔ اُسے ظالم، سفاک اور پتھر دل کہتی اور کبھی اُس کے آگے ہاتھ جوڑتی، اُس کے پاؤں پکڑتی اور رو رو کر یہی الفاظ کہتی ——"مجھے میرا بچہ دے دو۔"

رابی کا باپ زیادہ تر چُپ رہتا یا اُسے جھوٹی تسلی دے دیتا۔ رابی کی بہنیں بھی تھیں۔ وہ بھی باپ کے ساتھ اپنی ماں جیسا سلوک کر رہی تھیں۔

اُس وقت جب راولپنڈی میں رابی کے ہاتھ میز کے پایوں کے نیچے آتے ہوئے تھے، اُس کے ہاتھ ٹوٹ رہے تھے، اُس وقت لاہور میں رابی کی ماں اس قدر تیزی سے اور اتنے غصے میں رابی کے باپ کے کمرے میں گئی جیسے اُسے قتل کر کے آئے گی۔ رابی کا باپ چُپ چاپ کمرے میں بیٹھا تھا۔

"او ظالم باپ!"—— رابی کی ماں نے چلّا کر کہا ——"کیا وہ تمہارا بیٹا

نہیں ہے؟"

"نہیں"—— رابی کا باپ گرج کر بولا ——"وہ میرا بیٹا نہیں۔ اگر اُس کی رگوں میں میرا خون ہوتا تو وہ اپنے ملک پر مر مٹتا۔ اپنے ملک کے دشمن کا جاسوس نہ بنتا۔"

رابی کی ماں پر ایسی چُپ طاری ہو گئی جیسے وہ کھڑے کھڑے بُت بن گئی ہو۔

"یہ آپ نے کیا کہہ دیا ہے؟"—— رابی کی ماں نے مغموم سی آواز میں کہا۔

"اس کے سوا مَیں اور کچھ بھی نہیں کہہ سکتا"—— رابی کے باپ نے مشفقانہ سے لہجے میں کہا ——"بیٹھ جاؤ اور ۴۷ء کا وہ وقت یاد کرو جب تم انڈیا سے آتی تھیں۔ جس طرح آج تم اپنے بچے کے لئے تڑپ رہی ہو، اسی طرح اُس وقت ہزاروں مائیں اپنے بچوں کے لئے تڑپی تھیں لیکن ان ہندوؤں اور ان سکھوں نے اُن پر رحم نہیں کیا تھا۔ اُنہوں نے اُن ماؤں کی گودیوں سے معصوم بچے نوچ کر اُن کے سامنے کاٹ ڈالے تھے۔ برچھیوں کی اَنیوں میں مسلمانوں کے نوزائیدہ بچے اُڑس کر ہندوؤں اور سکھوں نے بھنگڑا ڈالا تھا۔ رابی جیسے ہزاروں بیٹے شہید کر دیئے گئے تھے۔ اِدھر ہمارا بیٹا جوان ہُوا تو اُس ناپاک اور سفاک دھرتی پر جاکر اپنا ایمان بیچ آیا۔ اپنے خاندان کے، میرے خاندان کے اُن افراد کو یاد کرو جن کی لاشیں وہیں رہ گئی تھیں۔ انہیں کفن کون پہناتا۔ انہیں تو قبریں بھی نصیب نہیں ہوئیں"—— رابی کا باپ یکلخت اُٹھ کھڑا ہُوا اور گرجتی ہوئی آواز میں بولا ——"نہیں، نہیں، نہیں۔ یہ لڑکا میرا بیٹا نہیں ہو سکتا۔ یہ تمہارا بیٹا نہیں ہو سکتا جس کا ہم نے نام رب نواز رکھا تھا۔ اس کا نام رابی ہی ٹھیک ہے۔ خدا کی قسم! مَیں ایسے کئی بیٹے پاکستان پر قربان کر سکتا ہوں۔"

"یہ تو ہمیں بہت پہلے سوچنا چاہیئے تھا کہ لڑکا کس راستے پر جا رہا ہے"—— رابی کی ماں نے کہا ——"اُس وقت تو ہم دونوں خوش ہوتے تھے کہ ہمارا

بیٹا سوسائٹی میں گھومتا پھرتا ہے۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو" ــــ رابی کے باپ نے کہا ــــ "یہ ہم دونوں کی غلطی ہے۔ تو پھر آؤ ہم دونوں اس غلطی کی سزا بھگتیں۔"

رابی کی ماں آخر ماں تھی۔ کوئی بھی دلیل اور کوئی سا بھی فلسفہ اُس کی مجروح مامتا کو تسکین نہیں دے سکتا تھا۔ خود رابی کا باپ بھی روحانی اذیت میں مبتلا تھا۔ اُس میں اور اُس کی بیوی میں یہ فرق تھا کہ باپ نے یہ قبول کر لیا تھا کہ اُس کا بیٹا اس قابل نہیں کہ اُسے بیٹا سمجھا جائے۔ اُس کے لئے پریشانی یہ بھی کہ وہ اپنی بیوی کو قائل نہیں کر سکتا تھا کہ وہ بھی اُس کی ہم خیال ہو جائے۔ رابی کا باپ تو یہ بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ آئی ایس آئی کے میجر جنرل سے کہے کہ اس کے بیٹے کو وعدہ معاف گواہ بنا لے۔ میجر جنرل یقیناً مان لیتا اور وہ اتنے مخلص باپ کو یہ انعام ضرور دیتا کہ اس کے بیٹے کو لمبی قید سے بچا لیتا پھر باپ اسے راہِ راست پر لے آتا۔

❋

نئی دِلّی میں انڈین انٹیلی جنس کے انٹیروگیشن سنٹر کے سیل میں ہاشمی لاش کی طرح پڑا تھا۔ وہ ہوش و حواس میں نہیں تھا۔ ایک اور سیل میں جمیل اسی حالت میں پڑا تھا۔ اُس کے ساتھ بھی وہی کچھ ہُوا تھا جو ہاشمی کے ساتھ ہُوا تھا۔ جمیل کئی مرتبہ بیہوش ہُوا۔ جب بھی ہوش میں آیا اُس نے یہی کہا کہ وہ کچھ نہیں جانتا۔

اب عبدالقدیر کی باری تھی۔ میجر بھاٹیہ نے اُسے شیشے میں اُتارنے کی قابلِ احترام کوشش کی تھی۔ عبدالقدیر انٹیلی جنس میں رہ چکا تھا اس لئے کرنل اوجھا نے بھی اس کے ساتھ بات کی تھی، پھر بریگیڈیئر نے اُسے کہا تھا کہ وہ انٹیلی جنس میں واپس آجائے اور اسے اچھا خاصا عہدہ دیا جائے گا۔ وہ صرف اتنا سا کام کر دے کہ یہ بتا دے کہ ہاشمی کو کس طرح اغوا کیا گیا تھا اور یہ کیا سلسلہ تھا اور عزیز کو کس نے قتل کیا ہے لیکن عبدالقدیر نے کوئی لالچ قبول نہیں کیا۔ اُسے صرف سلطانی گواہ بنانے کا وعدہ ہی نہیں دیا جارہا

تھا بلکہ اُسے عہدہ پیش کیا جارہا تھا۔ آخر اُسے میجر بھاٹیہ کے حوالے کر دیا گیا۔

میجر بھاٹیہ نے اُسے بڑے احترام سے اقبالِ جُرم پر آمادہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ پھر اسے کہا تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں کا حال دیکھ آئے۔

"میجر بھاٹیہ!" ــــ عبدالقدیر نے اُسے کہا ــــ "مَیں جب انٹیلی جنس میں آیا تھا اُس وقت تم گلیوں میں کھیلتے پھر رہے تھے۔ تم اپنا کام کرو بیٹے! مجھ سے تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔"

"عبدالقدیر صاحب!" ــــ میجر بھاٹیہ نے کہا ــــ "بیشک آپ میرے اُستاد اور میرے باپ ہیں۔ مَیں آپ کو صرف یہ یاد دلانا چاہتا ہوں کہ آپ کا ملک انڈیا ہے، پاکستان نہیں۔ آپ کی وفاداریاں اپنے ملک کے ساتھ ہونی چاہئیں۔"

"اور مَیں تمہیں یہ یاد دلانا چاہتا ہوں میجر بھاٹیہ!" ــــ عبدالقدیر نے کہا ــــ "کہ مَیں مسلمان ہوں اور اسلام کے رشتے سے میری وفاداریاں ہر مسلمان کے ساتھ ہیں۔ میں تمہیں آخری بار کہتا ہوں کہ مجھ سے تمہیں کسی بھی سوال کا وہ جواب نہیں ملے گا جو تم چاہتے ہو۔ مجھے ہاشمی صاحب اور جمیل صاحب کا حال دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ مَیں تصور کر سکتا ہوں کہ وہ کس حال میں ہوں گے۔ مَیں نے خود برسوں ملزموں کا یہ حال اپنے ہاتھوں کیا ہے ..... بڑھاپے نے میرا جسم کمزور کر دیا ہے لیکن ایمان پہلے سے زیادہ مضبوط ہو گیا ہے۔"

تین چار گھنٹوں کے بعد عبدالقدیر کو بیہوشی کی حالت میں اُس کے سیل میں پھینکا گیا۔

ان تینوں ملزموں سے انڈین انٹیلی جنس کو کچھ بھی نہ ملا۔ میجر جنرل کو رپورٹ ملی کہ یہ تینوں ملزم فولاد جیسے مضبوط ہیں تو اُس نے کہا کہ اگر انہیں چھوڑنا ہی ہے تو اس حالت میں چھوڑنا کہ یہ صرف زندہ رہیں لیکن ان میں زندگی کی رمق باقی نہ رہے۔

"ان کی عورتوں کو بلاؤ" ــــ میجر جنرل نے کہا ــــ "یہ مسلمان

ایک اور پاکستان بنانا چاہتے ہیں۔ اگر میرا بس چلے تو میں انڈیا کو اسلام کا قبرستان بنا دوں۔"

❋

راولپنڈی انٹیلی جنس ہیڈ کوارٹر میں رابی اپنے سیل کے فرش پر لیٹا ہُوا اپنے ہاتھوں کو دبا رہا تھا۔ رات کو اُسے پھر تفتیشی کمرے میں لے جایا گیا۔ وہ ابھی تک انکار پر ہی قائم تھا۔ اُس کے سیل کا دروازہ کھُلا۔ دروازہ کھولنے والے نے رابی کو اُٹھنے کا اشارہ کیا اور یہ آدمی اُسے تفتیش کے کمرے میں لے گیا۔ وہاں دو آدمی کھڑے تھے۔ انہوں نے رابی کو ایک بار پھر فرش پر پیٹھ کے بل لٹا دیا اور اُس کے بازو پھیلا کر اُس کے ہاتھ پہلے کی طرح میز کے پایوں کے نیچے رکھ دیے اور ان پایوں کے دونوں کونوں پر ایک ایک آدمی بیٹھ گیا۔ رابی کے ہاتھ پہلے ہی درد کر رہے تھے۔ پہلے اُس پر صرف ایک آدمی کا بوجھ ڈالا گیا تھا۔ اب دونوں ہاتھوں پر ایک ایک آدمی کا بوجھ اور میز کا بوجھ بھی تھا۔ رابی ذبح ہوتے ہُوئے بکرے کی طرح تڑپنے لگا۔ اُس کی چیخوں سے کمرے کے در و دیوار لرزتے محسوس ہوتے تھے۔

پندرہ بیس منٹ بعد میجر عباس اِس کمرے میں داخل ہُوا۔ اُس کے ساتھ زینی تھی۔ زینی نے جب رابی کو دیکھا تو اُس کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ خوف سے اُس کی آنکھوں کے ڈھیلے باہر آنے لگے۔

"اسے اچھی طرح دیکھ لو" —— میجر عباس نے زینی سے کہا —— "مَیں تم سے وہ باتیں پوچھوں گا جو پہلے نہیں پوچھیں۔ اگر تم سچ نہیں بولو گی تو تمہارے تمام کپڑے اُتار دیئے جائیں گے اور جس حالت میں یہ شخص پڑا تڑپ رہا ہے اسی حالت میں میز کے دوسرے دو پائے تمہارے ہاتھوں پر ہوں گے اور دو آدمی ان کے اُوپر بیٹھے ہوں گے۔ پھر ان تینوں آدمیوں کو دیکھ لو۔ تم عقل والی لڑکی ہو۔ میرا خیال ہے تم میرا اشارہ سمجھتی ہو گی.... بتاؤ، تم سچ بولنے کے لئے تیار ہو یا یہ صورت پسند کرو گی جو مَیں نے تمہیں بتائی ہے؟ یہاں رحم کی توقع نہ رکھنا۔"

"مَیں نے سب کچھ بتا تو دیا تھا" —— زینی نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا —— "آپ مجھ سے پوچھتے تھے کہ ان لوگوں کے علاوہ مَیں اور کسے جانتی ہوں۔ مَیں اب بھی اپنے اِس جواب پر قائم ہوں کہ مَیں کسی اور کو نہیں جانتی۔ اِس کے علاوہ آپ جو پوچھنا چاہتے ہیں پوچھیں۔ مَیں اس قسم کی تکلیف برداشت نہیں کر سکتی.... مَیں نے تو سُنا تھا کہ مسلمان بڑے ہی رحمدل ہوتے ہیں۔"

"تم نے ٹھیک سُنا ہے" —— میجر عباس نے کہا —— "لیکن ہم اُن کے لئے رحم دل ہوتے ہیں جو ہمارے ساتھ وفا کرتا ہے۔ سچ بولو پھر ہمارا رحم دیکھو۔"

رابی تڑپ رہا تھا، چیخ رہا تھا اور چلّا چلّا کر میجر عباس سے کہہ رہا تھا کہ تھوڑی سی دیر کے لئے اُس کے ہاتھ میز کے نیچے سے نکال دیئے جائیں۔ وہ روتا تھا۔ رحم کی التجا کرتا تھا۔

"مجھے کسی اور کمرے میں لے چلو" —— زینی نے خوفزدہ آواز میں کہا —— "مَیں اس طرح کسی کو تڑپتا نہیں دیکھ سکتی۔"

"کیا تمہیں اس کے ساتھ بہت محبت ہے؟" —— میجر عباس نے پوچھا۔

"نہیں" —— زینی نے جواب دیا —— "اس کے ساتھ مجھے ذرا سی بھی محبت نہیں۔ اِس کے ساتھ میری جو دلچسپی ہے وہ آپ کو بتا دی تھی۔"

"اُتر آؤ" —— میجر عباس نے میز پر بیٹھے ہُوئے آدمیوں سے کہا —— "میز ہٹا دو۔"

دونوں آدمی میز سے کُود کر اُترے اور اُنہوں نے میز اُٹھا کر پرے کر دی۔ میجر عباس کے اشارے پر دونوں آدمی باہر نکل گئے۔ رابی اُٹھ بیٹھا۔ اُس نے فرش پر بیٹھے بیٹھے ہاتھ اپنی بغلوں میں دبا لئے اور وہ آگے کو جُھک گیا۔

"اُٹھو اور کُرسی پر بیٹھو" —— میجر عباس نے اُسے کہا۔

رابی بڑی مشکل سے اُٹھا اور کُرسی پر بیٹھ گیا۔ اُس نے پانی مانگا۔

میجر عباس نے اُسے پانی پلا دیا اور زینی کو بھی میز کے قریب ایک کُرسی پر بٹھا دیا۔

"زینی!" — میجر عباس نے رابی کی طرف اشارہ کر کے پوچھا — "کیا یہ انڈیا کے لئے جاسوسی کرتا رہا ہے؟"

"ہاں جی!" — زینی نے جواب دیا۔

"تم کیسے جانتی ہو؟"

"گرفتاری سے پہلے اس نے کچھ کاغذات لاہور والی کوٹھی میں خانصاحب کو دیئے تھے" — زینی نے جواب دیا — "یہ کاغذات دوسرے ہی دن ایک آدمی انڈیا لے گیا تھا۔"

"وہ کون تھا؟"

"مَیں نے اُسے پہلی بار دیکھا تھا" — زینی نے جواب دیا — "میرے سامنے آئے تو بتا سکتی ہوں کہ یہ تھا وہ آدمی ... پھر میں اس طرح جانتی ہوں کہ یہ (رابی) انڈیا کا جاسوس ہے کہ دِلّی میں مجھے یہی بتا کر اس کے ساتھ لگایا گیا تھا کہ یہ پاکستانی ہے اور انڈین انٹیلی جنس کے لئے کام کر رہا ہے۔ اِسے ایک مسلمان کے گھر میں رکھا گیا تھا جس کا نام عزیز ہے۔"

"عزیز وہاں کیا کام کرتا ہے؟" — میجر عباس نے پوچھا۔

"وہ انٹیلی جنس کا آدمی ہے" — زینی نے جواب دیا — "مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ عزیز کے پاس پاکستان ریجن ہے .... اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ عزیز رابی کو جاسوسی کی ٹریننگ دیتا تھا۔ ورما عزیز کا ساتھی ہے۔"

"ورما کون؟"

"یہ آدمی جسے میرا بھائی ظاہر کیا جا رہا ہے" — زینی نے جواب دیا — "اس کا اصل نام ورما ہے .... گنیش ورما .... اس کا نام عبدالرحمٰن نہیں نہ یہ مسلمان ہے۔ یہ اب عزیز کی جگہ پاکستان میں آیا ہے۔"

"ان لوگوں نے مجھے دھوکہ دیا ہے" — رابی نے اُچھل کر کہا —

"انہوں نے مجھے نہیں بتایا کہ یہ ہندو ہیں۔"

"تم منہ بند کر کے بیٹھے رہو" — میجر عباس نے رابی سے کہا — "اگر یہ ہندو ہیں تو مسلمان تم بھی نہیں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تمہارا اور ان کا مذہب کیا ہے۔ مَیں صرف یہ سُننا چاہتا ہوں کہ تم انڈین انٹیلی جنس کے لئے کام کر رہے ہو یا نہیں۔"

زینی نے تمام پردے اُٹھا دیئے تھے۔ میجر عباس نے اُس سے جو کچھ بھی پوچھا وہ اُس نے صحیح بتا دیا۔ میجر عباس نے رابی کو سیل میں بھیج دیا اور زینی کو اپنے ساتھ رہنے دیا۔ اُس کے کہنے پر زینی نے بتایا کہ اس وقت تک وہ اپنی انٹیلی جنس کے لئے کیا کیا کام کر چکی ہے۔ اُس نے بتایا کہ رابی پانچواں پاکستانی نوجوان ہے جس کے ساتھ وہ یہی کھیل کھیل چکی ہے لیکن یہ پہلی بار ہے کہ اُسے پاکستان لایا گیا ہے۔

"میں اکیلی نہیں" — زینی نے کہا — "مجھ جیسی کئی لڑکیاں یہ کام کرتی ہیں۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ ایک دو پاکستانی لڑکے آتے ہیں۔ پھر ہم میں سے اُتنی ہی لڑکیاں اُن کے ساتھ لگا دی جاتی ہیں۔ آگے آپ جانتے ہیں کہ مجھ جیسی نوجوان اور خوبصورت لڑکیاں کیا کرتی ہوں گی۔ ہمیں اس کام کی باقاعدہ ٹریننگ دی گئی تھی۔ مَیں رابی سمیت پانچ پاکستانی نوجوانوں کو پاکستان کا دشمن بنا چکی ہوں۔"

زینی نے تفصیل سے بتایا کہ جن پاکستانی نوجوانوں کو ٹورسٹ کے طور پر دِلّی لے جایا جاتا ہے اُن کو کیسے طلسماتی عمل سے گزارا جاتا ہے۔ یہ نوجوان ہپناٹائز ہو کر واپس آتے ہیں۔ مختصر یہ کہ زینی نے تصدیق کر دی کہ انڈیا کی سیکرٹ سروس "را" پاکستان کے نوجوانوں کو استعمال کر رہی ہے۔

"کیا تم جانتی ہو کہ ان پاکستانی نوجوانوں کو پاکستان کے خلاف کس طرح استعمال کیا جاتا ہے؟" — میجر عباس نے کہا۔

"اس سوال کا پورا جواب تو آپ کو خان صاحب سے یا ورما سے ملے گا" — زینی نے جواب دیا — "میں آپ کو وہ باتیں بتا سکتی ہوں جو میں

نے اپنی انٹیلی جنس کے آدمیوں سے سُنی ہیں.... ان نوجوانوں کو پاکستان میں تخریب کاری کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ پاکستان میں یہ جو دھماکے ہوتے رہتے ہیں یہ ان ہی نوجوانوں سے کراتے جاتے ہیں۔ ان میں سے کچھ راہی جیسے بھی ہوتے ہیں جن کے باپ بڑے افسر ہیں۔ ان سے جاسوسی کا کام لیا جاتا ہے۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں میں بدامنی پھیلانے کے لئے بھی ان لڑکوں کو ٹریننگ دی جاتی ہے، پھر ان لڑکوں کو پاکستانیوں میں انڈیا کی محبت پیدا کرنے کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ میں آپ کو یہ نہیں بتا سکتی کہ آپ کے ان نوجوانوں کو ٹریننگ کس طرح دی جاتی ہے اور انہیں اُجرت کتنی اور کس طرح ملتی ہے۔"

❄

نئی دِلّی کے انٹروگیشن سنٹر کے ایک کمرے میں میجر بھاٹیہ کے سامنے ہاشمی کی بیوی بیٹھی ہوئی تھی۔ اُسے اور جمیل کی بیوی کو دن کے پچھلے پہر یہاں بُلا لیا گیا تھا اور تفتیش کے لئے اُنہیں رات گیارہ بجے تفتیشی کمرے میں لے جایا گیا تھا۔ جمیل کی بیوی سے کرنل اوجھا تفتیش کر رہا تھا اور دوسرے کمرے میں میجر بھاٹیہ ہاشمی کی بیوی سے پوچھ گچھ کر رہا تھا۔

"محترمہ!"— میجر بھاٹیہ نے ہاشمی کی بیوی سے کہا —"آپ معزز خاتون ہیں اور میری ماں کے برابر ہیں۔ میں گستاخی کی کوئی بات مُنہ سے نکالتے ڈرتا ہوں۔ یہ پاپ مجھ سے نہ کروائیں۔ میں آپ سے جو کچھ پوچھوں وہ بالکل صحیح اور سچ بتا دیں۔ اگر آپ نہیں بتائیں گی تو میں آپ کو آپ کے خاوند کے پاس لے چلوں گا۔ وہ ایسی حالت میں کوٹھڑی میں پڑے ہُوتے ہیں کہ وہ آپ کو اور آپ اُنہیں پہچان نہیں سکیں گی۔ اُنہیں دیکھ کر بھی آپ نے سچ نہ بولا تو آپ کی بھی وہی حالت کر دی جائے گی۔"

"یہ تو بتائیں کہ آپ کو پوچھنا کیا ہے"— ہاشمی کی بیوی نے کہا۔

"رشی نام کی ایک لڑکی آپ کے گھر میں رہی ہے"— میجر بھاٹیہ نے کہا —"وہ آپ کے پاس کتنے دن رہی تھی؟"

"میرے گھر میں کوئی لڑکی نہیں رہی"— ہاشمی کی بیوی نے کہا — "میں نے یہ نام پہلی بار سُنا ہے۔"

"آپ نے پہلے ہی سوال کا جواب غلط دیا ہے"— میجر بھاٹیہ نے کہا اور جھوٹ بولا —"آپ کے خاوند نے بتایا ہے کہ اس نام کی لڑکی آپ کے گھر میں کئی دن رہی ہے اور آپ کہتی ہیں کہ نہیں رہی۔"

"میرا خاوند اس قماش کا آدمی تو نہیں"— ہاشمی کی بیوی نے کہا —"لیکن میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ ہماری حویلی کے چودہ کمرے نیچے اور پانچ اُوپر ہیں۔ دو ڈیوڑھیاں ہیں۔ اتنی بڑی حویلی میں صرف دو افراد، میاں بیوی رہتے ہیں۔ اگر کسی لڑکی کو کسی کمرے کے نیچے یا اُوپر رکھا گیا تھا تو میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ میں ہر روز تمام کمروں میں تو نہیں جاتی۔ اُوپر جا کر تو میں نے کبھی دیکھا ہی نہیں۔ آپ ہماری حویلی دیکھیں تو ہی آپ کو یقین آئے گا کہ میں جو کچھ بھی کہہ رہی ہوں یہ ٹھیک ہے یا نہیں۔"

ہاشمی کی بیوی جہاندیدہ اور عقلمند عورت تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ کیا سلسلہ ہے اس لئے وہ ہر سوال کا جواب ایسے طریقے سے دیتی تھی کہ اُس کی بات صحیح معلوم ہوتی تھی۔

"کیا آپ عزیز احمد کو جانتی تھیں؟"— میجر بھاٹیہ نے پوچھا۔

"عزیز احمد؟.... میں ایک عزیز احمد کو جانتی ہوں"— ہاشمی کی بیوی نے جواب دیا —"اگر آپ ادریس صاحب کے بیٹے کا پُوچھ رہے ہیں تو اُسے میں جانتی تھی۔ وہ بیچارہ قتل ہو گیا ہے.... کیا آپ اُسی کا پوچھ رہے ہیں؟"

"ہاں، میں اُسی کا پُوچھ رہا ہوں"— میجر بھاٹیہ نے کہا — "معلوم نہیں وہ قتل کس طرح ہُوا تھا۔"

"میں اُس کے گھر گئی تھی"— ہاشمی کی بیوی نے کہا —"یہ تو کسی کو بھی معلوم نہیں کہ وہ قتل کس طرح ہُوا ہے۔ میں اتنا ہی جانتی ہوں کہ وہ چار بہنوں میں ایک ہی لڑکا تھا اس لئے ماں باپ نے ضرورت سے

زیادہ لاڈ اور پیار دے دے کر بگاڑ دیا تھا۔ وہ ایسا آوارہ ہُوا کہ ماں
باپ کے ہاتھ سے بھی گیا۔ مَیں نے سُنا تھا کہ وہ غنڈوں بدمعاشوں اور
جُوئے بازوں کی سوسائٹی کا آدمی تھا۔ میرا خیال ہے کہ انہی لوگوں کے
ہاتھوں مارا گیا ہے۔"

❋

دوسرے تفتیشی کمرے میں کرنل اوجھا نے جمیل کی بیوی زبیدہ
کو اپنے سامنے بٹھا لیا تھا۔

"دیکھ بی بی!" — کرنل اوجھا نے زبیدہ سے کہا — "اگر سچ بولو
گی تو ہم سے عزت کرواؤ گی اور اگر جھوٹ بولنا ہے تو پھر مَیں بتا نہیں
سکتا کہ تمہارا حشر کیا ہوگا۔ تم عورت ذات ہو۔ تمہاری ایسی بے عزتی ہو گی
جو تم تصور میں بھی نہیں لاسکتیں۔ اگر چاہو تو مَیں تمہیں اُس کال کوٹھڑی میں
لے جاؤں گا جہاں تمہارا خاوند گندے فرش پر پڑا ہُوا ہے۔ وہ مرا ہُوا
نہیں لیکن وہ زندہ بھی نہیں۔ وہ خدا سے موت مانگ رہا ہے۔"

"اُنہوں نے کیا جُرم کیا ہے؟" — زبیدہ نے گھبراہٹ اور خوفزدگی
کے عالم میں پوچھا — "کیا اُنہیں کسی جُرم کی سزا دی جا رہی ہے؟"

"مَیں کہتا ہوں کہ وہی جُرم تم نہ کر بیٹھنا" — کرنل اوجھا نے کہا —
"جُرم یہ ہے کہ وہ جھوٹ بولتا ہے۔"

میجر بھاٹیہ نے ہاشمی کی بیوی کے ساتھ ابھی رویّہ نرم رکھا ہُوا تھا
لیکن زبیدہ کے ساتھ کرنل اُوجھا کا رویّہ دشمنوں جیسا اور لب و لہجہ خاصا
درشت تھا۔ تفتیش کا انداز یہی ہوتا ہے۔ ہر مشتبہ کو مجرم سمجھا جاتا ہے۔
تفتیش کرنے والے ان دونوں افسروں کے لئے سختی لازمی تھی جس
کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ہاشمی، عبدالقدیر اور جمیل اپنی حالت اس قدر بُری
کروا کے بھی کچھ نہیں بتاتے تھے اور دوسری وجہ یہ کہ ان لوگوں کے خلاف
ذرا سی بھی شہادت نہیں تھی۔ انہیں کوئی اشارہ بھی نہیں ملا تھا جسے وہ
قابلِ اعتبار سراغ کہہ سکتے۔ صرف عزیز تھا جس کی باتوں بلکہ جس کے واویلے

کو سامنے رکھ کر یہ لوگ تفتیش کر رہے تھے۔

ان میں عبدالقدیر انٹیلی جنس کا اور انٹیروگیشن کا تجربہ کار تھا۔
اُس نے اپنے اِن ساتھیوں سے کہہ دیا تھا کہ اقبالِ جُرم نہیں کرنا کیونکہ
ان کے خلاف کوئی شہادت نہیں۔ اُس نے انہیں یہ بھی بتا دیا تھا کہ تفتیش
کا انداز کیا ہوتا ہے اور جسمانی طور پر انہیں ناقابلِ برداشت بُری حالت تک
پہنچا دیا جائے گا۔ عبدالقدیر نے ہاشمی کی بیوی کو بھی بتا دیا تھا کہ اُسے
بھی شاملِ تفتیش کیا جائے گا اور اُسے ایذارسانی کی اُس حد تک پہنچایا
جائے گا جہاں انسان کی جان بھی جا سکتی ہے اور جو زندہ رہتا ہے وہ باقی
عمر کے لئے ذہنی یا جسمانی یا دونوں لحاظ سے معذور ہو جاتا ہے۔

عبدالقدیر نے خود اور اُس کے ساتھیوں نے تو قوتِ برداشت
کا اور قوتِ ایمانی کا بے مثال مظاہرہ کیا تھا، لیکن عورتوں کا معاملہ مخدوش
تھا جہاں تک زبانی تفتیش کا تعلق تھا، ہاشمی کی بیوی اپنے خلاف
شکوک رفع کرتی جا رہی تھی۔ اُس نے کوئی ایسی جذباتی بات بھی نہ کی جس
سے یہ ظاہر ہوتا کہ ان لوگوں نے اسلامی جذبے کے تحت یہ کارنامہ کر
دکھایا ہے جو انڈین انٹیلی جنس کی نظر میں بہت بڑا جُرم تھا۔ ہاشمی کی بیوی
پُروقار طریقے سے بڑے تحمّل سے بول رہی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میجر
بھاٹیہ نے اُس کے ساتھ اپنا رویّہ ابھی نرم رکھا ہُوا تھا لیکن زبیدہ پر خوفزدگی
طاری ہوتی جا رہی تھی۔

"اب میری بات سُنو بی بی!" — کرنل اوجھا نے زبیدہ سے کہا —
"عزیز نے تمہیں فریدالدین ہاشمی کے گھر یہ دیکھنے کے لئے بھیجا تھا کہ وہاں
ایک لڑکی ہے۔ پہلے روز تم وہاں اکیلی گئی تھیں۔ کہو گئی تھیں یا نہیں؟"

"گئی تھی" — زبیدہ نے جواب دیا۔

"تم نے وہاں کوئی لڑکی دیکھی تھی؟"

"دیکھی تھی۔"

"کیا یہ وہی لڑکی تھی جو تمہیں بعد میں اس جگہ دکھائی گئی تھی؟" ——

کرنل اوجھا نے اُسے وہ وقت یاد دلاتے ہُوئے پوچھا جب اُسے انٹیلی جنس ہیڈ کوارٹر میں لاکر رشی کو اُس کے سامنے کھڑا کیا گیا تھا۔

"نہیں"۔۔۔ زبیدہ نے جواب دیا ۔۔۔ "یہ لڑکی جو مجھے یہاں دکھائی گئی تھی، کوئی اور تھی"۔

"بیگم ہاشمی!"۔۔۔ اُدھر میجر بھاٹیہ ہاشمی کی بیوی سے پوچھ رہا تھا ۔۔۔ "کیا عزیز کی بہن آپ کے گھر آئی تھی اور اُس نے وہاں کوئی لڑکی دیکھی تھی؟"

"آئی تھی"۔۔۔ بیگم ہاشمی نے جواب دیا ۔۔۔ "اُس نے میرے گھر میں ایک مہمان لڑکی کو دیکھا تھا"۔

"کیا اُس کا نام اور پتہ بتا سکتی ہیں؟"

"مَیں نام بتا سکتی ہوں"۔۔۔ ہاشمی کی بیوی نے جواب دیا ۔۔۔ "ایڈریس ہاشمی صاحب جانتے ہیں"۔

"مسز جمیل!"۔۔۔ کرنل اوجھا زبیدہ سے کہہ رہا تھا ۔۔۔ "یہ مت بھُولو کہ تمہارا اکلوتا بھائی قتل ہو گیا ہے۔ کیا تم اپنے بھائی کے قاتلوں کا ساتھ دو گی یا اُن کے ساتھ چلو گی جو ان قاتلوں کو پکڑنا چاہتے ہیں؟ اور آج انہی لوگوں کے ساتھ تمہاری یہ بے عزتی ہو رہی ہے اور ہم تمہیں ملزم سمجھ رہے ہیں"۔

"کون ہیں میرے بھائی کے قاتل؟"۔۔۔ زبیدہ نے چونک کر پوچھا۔

"فرید الدین ہاشمی اور عبدالقدیر"۔۔۔ کرنل اوجھا نے جواب دیا ۔۔۔ "ان لوگوں نے تمہارے خاوند کو بھی بیوقوف بنا لیا ہے"۔

"کیا میرا خاوند بھی میرے بھائی کے قاتلوں میں شامل ہے؟"

"نہیں زبیدہ بی بی!"۔۔۔ کرنل اوجھا نے مزید جھُوٹ بولا ۔۔۔ "اُس بیچارے کو تو ان لوگوں نے شاملِ تفتیش کرایا ہے تاکہ وہ ان دونوں کے خلاف کوئی شک نہ کرے"۔

زبیدہ نے رونا اور عبدالقدیر، ہاشمی اور اُس کی بیوی کو کوسنا شروع کر دیا۔ کرنل اوجھا اُسے جذبات کے بھنور میں لانے میں کامیاب ہو گیا۔

"ان تینوں کو میرے سامنے گولی ماریں"۔۔۔ زبیدہ نے روتے ہُوئے کہا ۔۔۔ "جس طرح انہوں نے میرے بھائی کو قتل کر کے میرا سینہ چھلنی کیا ہے اسی طرح ان کے سینے گولیوں سے چھلنی کر دیں"۔

"ایسا ہی ہو گا"۔۔۔ کرنل اوجھا نے کہا ۔۔۔ "لیکن ہمیں تھوڑی سی شہادت چاہیئے۔ یہ شہادت تم دے سکتی ہو"۔

"آپ کیسی شہادت چاہتے ہیں؟"

"تمہارے بھائی کو اُس لڑکی کی وجہ سے قتل کیا گیا ہے جسے تم نے ہاشمی کے گھر دیکھا تھا"۔۔۔ کرنل اوجھا نے کہا ۔۔۔ "لیکن تم کہتی ہو کہ وہ لڑکی کوئی اور تھی اور یہ کوئی اور تھی جو تمہیں یہاں دکھائی گئی تھی"۔

"اگر بات اس لڑکی کی ہے تو اب میں آپ کو سچ بتاتی ہُوں"۔۔۔ زبیدہ نے جذبات سے مغلوب ہو کر کہا ۔۔۔ "جو لڑکی مجھے یہاں دکھائی گئی تھی وہ وہی لڑکی تھی جسے میں نے ہاشمی کے گھر دیکھا تھا۔ مَیں نے اس لڑکی کی صرف جھلک نہیں دیکھی تھی بلکہ مَیں اُس کمرے میں گئی تھی جس کے دروازے میں لڑکی کو کھڑے دیکھا تھا اور اُس نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ لڑکی پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی۔ مَیں کچھ دیر وہاں کھڑی اُسے دیکھتی رہی اور ہاشمی کی بیوی نے یہ بتایا تھا کہ یہ لڑکی آسیب زدہ ہے"۔

زبیدہ نے پوری تفصیل سے صحیح واقعہ سُنا دیا۔ پھر اُس نے یہ بھی سنایا کہ وہ ورما کو عزیز کے کہنے کے مطابق برقعے میں ہاشمی کے گھر لے گئی تھی۔

"یہ لڑکی کون تھی؟"۔۔۔ زبیدہ نے پوچھا۔

"بیچاری شریف لوگوں کی بیٹی ہے"۔۔۔ کرنل اوجھا نے جواب دیا ۔۔۔ "ان لوگوں نے اسے اغوا کر کے گھر میں رکھا۔ عزیز کو پتہ چل گیا۔ اُس

نے یہ دیکھنے کے لئے کہ لڑکی ہاشمی کے گھر ہی ہے، تمہیں بھیجا۔ تم نے لڑکی
کو دیکھ کر عزیز کو اس کا حلیہ بتایا۔ پھر سی آئی ڈی کے ایک آدمی کو برقعے
میں تمہارے ساتھ بھیجا گیا، لیکن لڑکی کو ان لوگوں نے وہاں سے غائب
کر دیا تھا۔ ان کی بدمعاشی دیکھو کہ انہوں نے سی آئی ڈی کے آدمی کو
مارا پیٹا اور تھانے تک پہنچ گئے۔ تمہیں بھی ذلیل کروایا۔ پھر تمہارے
خاوند کے ساتھ چکنی چپڑی باتیں کر کے اُسے اپنے ساتھ ملا لیا۔ پھر انہوں
نے عزیز سے یوں انتقام لیا کہ اُسے خود قتل کیا یا اپنے آدمیوں سے قتل
کروا دیا۔ تمہارا بھائی تو غیرت والا آدمی تھا۔ کسی کی بیٹی کی عزت پر اُس
نے اپنی جان قربان کر دی۔"

زبیدہ کرنل اوجھا جیسے منجھے ہوئے آدمی کے جھوٹ اور فریب کاری
اور اپنے مجروح جذبات کے بھنور میں ایسی آئی کہ اُسے زمین و آسمان اپنے
گرد گھومتے ہوئے نظر آنے لگے۔ وہ رِشی کے متعلق جو کچھ جانتی تھی وہ
اُس نے اُگل دیا۔ اُس نے اپنے خاوند کی اُن باتوں میں آکر جو بالکل صحیح
اور سچی تھیں، عزیز کو اپنے گھر سے دھتکار کر نکال دیا تھا اور اپنے خاوند
کے قدموں میں بیٹھ گئی تھی۔ خاوند نے اُسے بتایا تھا کہ عزیز انڈین انٹیلی
جنس کا کارندہ ہے اور عبدالقدیر اور ہاشمی نے انڈین انٹیلی جنس کے
خلاف زیرِ زمین محاذ بنا رکھا ہے۔

زبیدہ نے یہ ساری باتیں کرنل اوجھا کو سُنا ڈالیں۔ عبدالقدیر
اور ہاشمی نے جمیل کو اپنے محاذ کے متعلق بتا تو دیا تھا لیکن اُسے یہ
نہیں بتایا تھا کہ عزیز کے قتل کے پیچھے انہی کا ہاتھ ہے۔

اس کے بعد ہاشمی، اُس کی بیوی اور عبدالقدیر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔

راولپنڈی میں رابی ایک بار پھر تفتیش والے کمرے میں میجر عباس
کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ ابھی تک خان صاحب، ورما اور اُس کے دیگر
ساتھیوں سے پوچھ گچھ کی ہی نہیں گئی تھی۔ آئی ایس آئی والے جانتے تھے

کہ یہ سب تجربہ کار افراد ہیں۔ اُس رِنگ میں یا ان ملزموں میں جو پکڑے گئے
تھے، رابی اور زینی دو کمزور کڑیاں جیسے تھے۔ زینی کی کمزوری یہ تھی کہ
وہ جوان اور خوبصورت لڑکی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اُس کے ساتھ کیا سلوک
ہوگا۔ اسی لئے اُسے زہر کی ایک گولی دے دی گئی تھی کہ اس بھیانک
انجام سے پہلے ہی اپنا خاتمہ کر لے، لیکن وہ موت سے بھی ڈر گئی۔ رابی کی
کمزوری یہ تھی کہ وہ نوآموز تھا اور ابھی کچا تھا۔ وہ تو ایذا رسانی کے پہلے
مرحلے میں ہی ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ اب تو زینی نے اُس کے سامنے اُس
کا پردہ چاک کر دیا تھا۔

وقت آدھی رات کے بعد کا تھا جب اُسے تفتیشی کمرے میں
لے جایا گیا۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جس کے متعلق محاورہ ہے کہ نیند سُولی
پر بھی آجاتی ہے۔ رابی تو جوان سال آدمی تھا۔ اُس پر نیند کا غلبہ طاری
تھا۔ اس کے علاوہ وہ تکلیف میں بھی تھا۔ اُس کے دونوں ہاتھوں پر سوجن
تھی۔ اُس کے جذبات پر بھی بہت بڑی چوٹ پڑی تھی۔ وہ تو سمجھتا تھا
کہ زینی جیسی دلکش لڑکی اُس پر اس قدر مرمٹی ہے کہ اُس کے ساتھ شادی
کرانے کے لئے اپنے ملک اور اپنے ماں باپ کو بھی چھوڑ آئی ہے، مگر زینی
نے اُس کے سامنے اُس کی اصلیت اور اپنی نیت بے نقاب کر کے
اُسے پھانسی کے تختے پر کھڑا کر دیا۔

"مسٹر رابی!" —— میجر عباس نے کہا —— "دیکھ لیا ہندوؤں کو؟ جو
دولت تم نے کمائی ہے وہ تمہارے کس کام آئی؟ انڈین انٹیلی جنس تو تمہاری
مدد کو نہیں آئے گی۔ اگر انڈیا کی پوری فوج پاکستان پر حملہ کر دے تو بھی
تمہیں یہاں سے آزاد نہیں کرا سکے گی۔ تمہارا جرم ثابت ہو چکا ہے۔
اب اپنے جرم کی پوری کہانی سُنا دو" —— میجر عباس نے جھوٹ بولا ——
"تم جن لوگوں کے ساتھ جا ملے تھے، خان صاحب ورما اور اُن کے دوسرے
ساتھی ان سب نے جاسوسی کے جرم کا سارا بوجھ تم پر ڈال دیا ہے۔ انہوں
نے کہا ہے کہ تمہارا باپ تمہاری معرفت اپنی سیکرٹ فائلوں سے انفارمیشن

انڈیا کے ایجنٹوں کو دیتا تھا۔"

"نہیں" ـــ رابی جو نیند کے خمار میں تھا، یکلخت بیدار ہو کر بولا ـــ "یہ غلط ہے۔ میرے ڈیڈی ایسے نہیں.... مجھے تو یہ شک ہے کہ ڈیڈی نے ہی ہمیں پکڑوایا ہے۔"

"تمہارا یہ شک غلط ہے رابی!" ـــ میجر عباس نے کہا ـــ "کوئی باپ اپنے بیٹے کو گرفتار نہیں کرا سکتا۔ تمہارا باپ خود مجرم ہے.... جاسوسی کا مجرم.... اگر تم اُسے مجرم نہیں سمجھتے تو اصل بات بتا دو ورنہ رابی! تمہاری ماں اور بہنوں کو بھی یہاں بلایا جائے گا۔"

میجر عباس نے دیکھ لیا تھا کہ اپنے باپ کے متعلق رابی کتنا حساس ہے۔ اس سے اُسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ لڑکا اپنے باپ کی بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا حالانکہ اُسے شک تھا کہ اسے اپنے باپ نے پکڑوایا ہے۔ اسی لئے میجر عباس نے اُس کی ماں اور بہنوں کی بھی دھمکی دے دی۔ اس کا وہی اثر ہُوا جو میجر عباس پیدا کرنا چاہتا تھا۔ اس اثر کے علاوہ رابی پر دوسرے اثرات بھی تھے۔ وہ تو ڈُوب رہا تھا اور تنکوں کے سہارے ڈھونڈ رہا تھا۔ جس صورتِ حال میں وہ پھنس گیا تھا وہ پیدائشی مجرموں کو بھی توڑ دیا کرتی ہے۔

رابی نے اپنے جُرم کی داستان اُگلنی شروع کر دی۔ میجر عباس تفتیش کا ماہر تھا۔ اُس نے جب دیکھا کہ رابی نے بولنا شروع کر دیا ہے تو اُسے لقمے دینے شروع کر دیئے اور اُس کا حوصلہ بھی بڑھاتا چلا گیا۔ وہ تھوڑی دیر بعد کہتا تھا کہ تمہیں وعدہ معاف گواہ بنا لیا جائے گا۔

رابی نے بات وہاں سے شروع کی جہاں عزیز اسے ایک لڑکی کے ساتھ کراچی میں ملا تھا اور اپنا تعارف نوبیاہتا جوڑے کی حیثیت سے کرایا تھا۔ پھر لاہور میں عزیز کی ملاقاتوں کی رُوداد سنائی اور عزیز نے جس طرح اُسے اپنے شیشے میں اُتارا تھا، وہ تمام عمل تفصیل سے سنایا۔ رابی نے جس طرح پہلی بار اپنے باپ کی ایک ٹاپ سیکرٹ فائل کے کچھ

کاغذات کی فوٹوسٹیٹ کرا کے عزیز کے حوالے کی وہ سنائی اور یہ بھی بتایا کہ وہ اس کام کو بہت ہی مشکل اور خطرناک سمجھتا تھا، لیکن یہ تو بڑا آسان کام تھا۔ ان کاغذات کی اُس کی نظر میں کوئی قیمت نہیں تھی لیکن اُسے پہلی بار پانچ ہزار روپیہ نقد ملا اور ایک انتہائی خوبصورت لڑکی کے ساتھ ہوٹل میں شامیں گزارنے کا بھی موقع ملا۔ اتنی زیادہ رقم اور اتنی خوبصورت لڑکی نے اُس کے عقل و ہوش کو مفلوج کر دیا۔ اُس کے دل میں پاکستان کی سلامتی اور وفا کا اگر کچھ احساس تھا تو وہ بھی نکل گیا اور وہ انڈیا کو اپنے خوابوں کا جزیرہ سمجھنے لگا۔

پھر وہ یوں محسوس کرنے لگا جیسے اُس کے پیدا ہونے کا مقصد ہی یہی ہے کہ باپ کی فائلوں میں جو انفارمیشن انڈیا کے کام کی دیکھے وہ انڈیا کے ان ایجنٹوں کے حوالے کر دے۔ اُس نے بتایا کہ اُس کا بنک بیلنس پچاس ہزار تک پہنچ گیا۔

رِشی کے ساتھ وہ انڈیا گیا تب اُسے ایسا احساس ہُوا جیسے وہ اپنے باپ کے رُتبے سے بھی بڑے رُتبے کا آدمی ہو۔ انڈیا میں جس طرح اُسے رکھا گیا اور اُسے جو بریفنگ اور ٹریننگ دی گئی وہ اُس نے پوری کی پوری سُنائی۔ پھر زینی اُس کی اس مجرمانہ زندگی میں داخل ہوتی۔ اُس نے رِشی کے اغوا کی کہانی بھی سنائی اور یہ بھی بتایا کہ رِشی کو طلاق دینے کا اُسے معقول بہانہ مل گیا۔

آخر اُس نے یہ بھی تسلیم کیا کہ اُس نے آخری انفارمیشن یہ انڈیا کو پاس کی تھی جس میں پاکستان کی طرف سے سکھوں کو ملنے والی مدد کے اعداد و شمار تھے۔

"آپ یقین کریں کہ میرے ڈیڈی کو میرے اس جُرم کا علم نہیں" ـــ رابی نے کہا ـــ "میں نے جو کچھ کیا ہے وہ بتا دیا ہے۔ چھپایا کچھ بھی نہیں۔ میرے ڈیڈی کا ہارٹ فیل کرنے کے لئے یہی صدمہ کافی ہوگا کہ میں جاسوسی

کا مجرم ہوں اور پکڑا بھی گیا ہوں۔ اگر آپ نے انہیں تفتیش کے لئے بلایا تو وہ اس صدمے سے جانبر نہیں ہو سکیں گے۔"

میجر عباس کو معلوم تھا کہ رابی کو باپ نے پکڑوایا ہے۔

رابی نے اقبالِ جرم مکمل کر دیا۔ آئی ایس آئی کا دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ اس پورے رنگ کو زمین کے نیچے سے نکال کر اوپر لایا جاتے۔ زینی اس معاملے میں کوری تھی۔ رابی سے پوچھا تو اس نے بھی یہی جواب دیا کہ وہ انہی آدمیوں کو جانتا ہے۔ اس پر جھوٹ کا شک کیا جاتا تھا کہ وہ اپنے رنگ کے باقی افراد کی نشاندہی نہیں کر رہا لیکن جس انداز سے اس نے اقبالی بیان دیا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا۔

میجر عباس کے اس سوال کے جواب میں کہ دِلّی میں کیا ٹریننگ دی جاتی ہے، رابی نے وہی تفصیل سنائی جو زینی سنا چکی تھی۔ رابی نے بتایا کہ اُسے صرف یہ کام سونپا گیا تھا کہ باپ کی فائلوں میں سے انفارمیشن لے کر دیتا رہے اس لئے اس کی ٹریننگ اسی تک محدود تھی۔

"مجھے اب پتہ چلا ہے کہ لڑکیوں، روپے پیسے اور دِلّی میں وی آئی پی ٹریٹمنٹ کے ذریعے میری برین واشنگ ہوتی رہی ہے"— رابی نے آخر میں کہا — "زینی اور اس جیسی دو اور بڑی ہی خوبصورت لڑکیاں جو مجھے لاہور میں ملوائی گئی تھیں، بہت بڑا فراڈ تھا۔ مجھے اب خیال آتا ہے کہ زینی صحیح راستے پر جا رہی تھی۔ مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ میں نے اُس کے ساتھ زیادتی کی ہے لیکن میں نہیں سمجھ سکا کہ دِلّی میں وہ کہاں غائب ہو گئی تھی۔ شاید انڈین انٹیلی جنس نے ہی اُسے کسی اور مقصد کے لئے اِدھر اُدھر کر دیا ہو گا اور وہ ان کی باتوں میں نہیں آتی ہو گی۔ اُس نے مجھے دِلّی میں ہی کہہ دیا تھا کہ تم جاسوس ہو۔"

"اب پچھتانا بیکار ہے رابی!"— میجر عباس نے کہا — "جو ہو چکا وہ ہو چکا ..... تم بتا رہے تھے کہ انہیں کیا ٹریننگ دی جاتی ہے"

"مجھے جو ٹریننگ دی گئی تھی وہ بتا دی ہے"— رابی نے کہا

— "اس کے علاوہ جو باتیں معلوم ہوتی تھیں، ان سے پتہ چلا کہ متعدد شعبے ہیں اور ان کے کام الگ الگ ہیں۔ میرا خیال ہے کہ پاکستان کے جو نوجوان اور جوان آدمی انڈیا کی سیکرٹ سروس کے جال میں آ جاتے ہیں، ان کا کسی طرح نفسیاتی تجزیہ کر کے دیکھ لیا جاتا ہے کہ کون ذہنی لحاظ سے کون سے کام کے لئے فٹ ہے۔"

"وہاں کے افسروں نے تمہارا انٹرویو لیا ہو گا!"

"جی ہاں!"— رابی نے جواب دیا — "یہ دراصل انٹرویو تھے جنہیں میں اپنے آپ کو وی آئی پی سمجھ کر ملاقاتیں سمجھتا رہا۔"

"تم مختلف شعبوں کی بات کر رہے تھے"— میجر عباس نے کہا۔

"بعض پاکستانیوں کو بڑے ہی خطرناک کام دیئے جاتے ہیں"— رابی نے کہا — "انہیں ٹریننگ بھی خاص قسم کی دی جاتی ہے۔ آپ انٹیلی جنس کے آفیسر ہیں۔ آپ کو تو معلوم ہو گا کہ وہ کون پُراسرار نقاب پوش ہیں جو حیدر آباد اور کراچی میں گاڑی میں بیٹھے ہوئے کہیں سے آتے ہیں اور فائرنگ کرتے ہوئے غائب ہو جاتے ہیں۔ مجھے دِلّی میں بتایا گیا تھا کہ یہ انڈیا کے ایجنٹ ہیں جو انڈین نہیں بلکہ پاکستانی ہیں۔ دوسرا شعبہ اسی کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ اس کے کارندوں کا کام یہ ہے کہ جب ایک گروہ فائرنگ کرتا ہوا اور اپنے پیچھے کئی زخمی تڑپتے ہوئے چھوڑ کر غائب ہو جاتا ہے تو دوسرا گروہ کسی ایک سیاسی پارٹی کا نام لے کر مشہور کرتا ہے کہ یہ فائرنگ اس پارٹی کے آدمیوں نے کی ہے۔ اس طرح سیاسی پارٹیاں یا ایسے ہی دو گروہ ایک دوسرے کا خون بہانے لگتے ہیں۔ چند دن خیریت اور سکون سے گزر جاتے ہیں تو پھر نامعلوم افراد فائرنگ کر کے دو چار آدمیوں کو مار ڈالتے ہیں اور یہی خونی عمل ایک بار پھر شروع ہو جاتا ہے۔ مجھے دِلّی میں بتایا گیا تھا کہ انڈیا کی سیکرٹ سروس جسے 'را' کہتے ہیں، تخریب کاری کا یہ طریقہ پاکستان کے دوسرے شہروں میں بھی پھیلا رہی ہے۔"

میجر عباس کے لئے یہ خبریں نئی نہیں تھیں۔ زینی بھی اُسے بتا چکی تھی کہ پاکستان میں انڈیا کس طرح نظریاتی، اخلاقی اور معاشرتی تخریب کاری پھیلا رہا ہے۔ میجر عباس کو بلکہ آئی ایس آئی کو تو یہ بھی معلوم تھا کہ پاکستان کی بعض سیاسی پارٹیوں پر بھی انڈیا کے اثرات غالب ہیں۔ اُس نے رابی سے کہا کہ اُسے جب بتایا گیا تھا کہ پاکستان میں انڈیا کس طرح بھائی کو بھائی کا دشمن بنا رہا ہے تو کیا رابی کو یہ خیال نہ آیا کہ پاکستان اُس کا اپنا ملک ہے اور اُسے اپنے ملک کے خون خرابے اور تباہی سے بچانا چاہئے۔

"نہیں" ــــ رابی نے کہا ــــ "مَیں اعتراف کرتا ہوں کہ پاکستان کا خیال مجھے کبھی نہیں آیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہم نے پاکستان کے کلچر کو قبول ہی نہیں کیا تھا۔ ہماری سوسائٹی کو آپ جانتے ہیں جن گھروں میں انگریزی بولی جاتی ہو وہاں پاکستان کو کون پوچھتا ہے۔ سرا قصور تو سارا میرا ہے، لیکن یہ قصور کسی اور کا ہے کہ ہمیں سکولوں اور کالجوں میں بتایا ہی نہیں گیا کہ پاکستان کیوں اور کس طرح وجود میں لایا گیا تھا۔ میرے طبقے کے لڑکے جن سکولوں میں پڑھے ہیں اور پڑھ رہے ہیں، وہ امریکہ اور یورپ کے کلچر اور مذہب کی بنیادوں پر چل رہے ہیں۔ وہاں ہمارے کردار اسی سانچے میں ڈھل سکتے تھے۔"

❋

نئی دلی میں انڈین انٹیلی جنس کے چیف کو عبدالقدیر، ہاشمی، اُس کی بیوی، جمیل اور اُس کی بیوی کی تفتیش کی پوری رپورٹ دی گئی اور اُسے جمیل کی بیوی زبیدہ کا بیان بتایا گیا۔ تفتیش کرنے والے دونوں افسروں کرنل اوجھا اور میجر بھاٹیہ نے اپنی یہ رائے دی کہ عزیز کے قتل میں جمیل شامل نہیں تھا۔ انہوں نے یہ رائے بھی دی کہ جمیل کا قصور صرف یہ ہے کہ عبدالقدیر اور ہاشمی کی مجرمانہ سرگرمیوں کو جانتے ہوتے بھی اُس نے ان کی پردہ پوشی کی۔

"لیکن جمیل کی بیوی نے جو نشاندہی کی ہے ہمیں اس کی قدر کرنی ہے" ــــ چیف نے کہا ــــ "ہمیں یہ خیال بھی کرنا چاہئے کہ یہ عورت عزیز کی بہن ہے اور عزیز ہماری سروس میں ڈیوٹی کے دوران ہلاک ہوا ہے۔ اُس کی بہن کو ہم یہ انعام دے دیں کہ اسے تفتیش سے خارج کر کے گواہ بنا لیں اور اس کے خاوند کو بھی چھوڑ دیں، لیکن یہ خیال رکھیں کہ جمیل کے دماغ میں یہ نقش کر دیں کہ عبدالقدیر اور ہاشمی اُس پر عزیز کے قتل کا الزام لگا رہے ہیں.... عبدالقدیر، ہاشمی اور اُس کی بیوی کو یہیں رکھو اور انہیں تفتیش کی چکی میں پیستے رہو۔ جب تک عزیز کے قتل کا سراغ نہیں ملتا انہیں یہیں رکھیں چاہے برسوں گزر جائیں۔"

یہ تو انٹیلی جنس والوں کا معمول ہوتا ہے کہ وہ جاسوسی کے ملزموں اور مشتبہوں کو بڑی بڑی لمبی مدت تک اپنی کوٹھڑیوں میں بند رکھتے ہیں۔ انٹیلی جنس والوں سے باز پُرس نہیں کی جا سکتی۔ انڈین انٹیلی جنس کے اس میجر جنرل کے حکم نے عبدالقدیر، ہاشمی اور اُس کی بیوی کی قسمت کو ہمیشہ کے لئے سر بمہر کر دیا۔

عبدالقدیر اور ہاشمی نے جو زیر زمین محاذ بنایا تھا وہ ان کی قیادت کے بغیر بے عمل سا ہو کے رہ گیا تھا، لیکن اس کے ممبروں نے اسے زندہ رکھنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اس کے دس گیارہ ممبروں نے ایک ممبر کے گھر میں میٹنگ بلائی۔ اُن میں وہ تین مجاہدین بھی شامل تھے جنہوں نے عزیز کو قتل کیا تھا۔ یہ وہ خاص ممبر تھے جنہیں محاذ کی ہر بات اور انتہائی خفیہ سرگرمیوں کا بھی علم ہوتا تھا۔ یہ جانباز گروہ تھا۔ باقی ممبروں کو گہرے راز کی باتیں نہیں بتائی جاتی تھیں۔ یہ جو جانباز اکٹھے ہوتے تھے انہیں معلوم تھا کہ عزیز کے قاتل کون ہیں۔

عزیز کے تینوں قاتلوں نے اس میٹنگ میں یہ تجویز پیش کی کہ محاذ کے قائد اور ہاشمی کی بیوی پکڑے گئے ہیں۔ انہیں وہاں سے فرار تو نہیں کرایا جا سکتا، لیکن انہیں بچایا جا سکتا ہے۔ انہوں نے بچانے کا

طریقہ یہ بتایا کہ یہ تینوں جا کر پیش ہو جاتے ہیں اور پورا بیان دیتے ہیں کہ عزیز کے قاتل ہم ہیں اور عبدالقدیر اور ہاشمی بے گناہ ہیں۔

ایک ادھیڑ عمر ممبر نے اس تجویز کو قبول نہ کیا۔ اُسے تمام تر بیک گراؤنڈ کا علم تھا۔

"تم انہیں صرف قتل کے الزام سے بچا وَ گے" — اُس نے کہا — "لیکن اُن پر دوسرا الزام یہ ہے کہ اُس پاکستانی لڑکی کو انہوں نے ہی اغوا کرایا تھا اور اُس لڑکی کو ہاشمی صاحب کے گھر میں رکھا گیا تھا۔ مجھے جمیل صاحب کی بیوی کی طرف سے خطرہ محسوس ہو رہا ہے کہ عزیز اُس کا بھائی تھا۔ اُس نے رِشی کو ہاشمی صاحب کے گھر میں دیکھا تھا۔ وہ انٹیلی جنس کے تفتیشی افسروں کے پھندے میں آگئی تو وہ صحیح بات اُگل دے گی۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ ہمارے دونوں لیڈر اور بیگم ہاشمی رہا نہیں ہو سکیں گے ..... میرے دوستو! یہ قربانیاں تو دینی ہی پڑیں گی۔ اگر تم تینوں اقبالِ جرم کے لئے پیش ہو گئے تو ہو گا یہ کہ وہ تین رہا نہیں ہو سکیں گے اور مزید تین جانباز پھنس جائیں گے۔ ہمارے کرنے کا کام یہ ہے کہ محاذ کو زندہ رکھیں اور اسے اور زیادہ پھیلائیں ..... کیا تم سب مجھے اپنا لیڈر تسلیم کرتے ہو؟"

اُن سب نے اُسے لیڈر تسلیم کر لیا اور اُس کے فیصلے کو آخری فیصلہ سمجھ کر مان لیا۔

❄

راولپنڈی کے انٹیلی جنس ہیڈ کوارٹر میں چیف کو تفتیش کی رپورٹ دی گئی۔ چیف نے اطمینان کا اظہار کیا کہ رابی اور زینی نے اقبالِ جرم کر کے باقی ملزموں کی اصلیت بھی بے نقاب کر دی ہے۔ اُسے بتایا گیا کہ ابھی باقی ملزموں سے تفتیش شروع نہیں ہوئی۔

"تفتیش شروع کر دو" — چیف نے کہا — "ان سے پورا رِنگ بے نقاب کرانا ہے ..... وہ لڑکی کہاں ہے؟ ..... رِشی یارا شدہ۔"

"وہ تو لاہور میں ہے سر!" — بریگیڈیئر نے جواب دیا۔

"اُس کی حفاظت کا بھی تو کچھ بندوبست کرنا ہے" — چیف نے کہا — "وہ اغوا ہو سکتی ہے، قتل بھی ہو سکتی ہے۔ وہی ہماری اہم ترین گواہ ہے۔"

"کر دیں گے سر!" — بریگیڈیئر نے کہا — "سر! ایک بات اور ہے ..... کیا آپ اُس لڑکے رابی کو سلطانی گواہ بنانا پسند کریں گے؟"

"کیا آپ اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں؟" — چیف نے پوچھا۔

"ابھی نہیں سر!" — بریگیڈیئر نے جواب دیا — "یہ میں اس کے باپ کی وجہ سے کہہ رہا ہوں۔ ایسے ایثار اور قومی جذبے کا مظاہرہ اور کون باپ کر سکتا ہے کہ اپنے بیٹے اور وہ بھی اکلوتے بیٹے کو گرفتار کرا دے۔"

"اس کا فیصلہ بعد میں کریں گے" — چیف نے کہا — "ابھی تو تفتیش ابتدائی مرحلے میں ہے۔"

نئی دلی میں انڈین انٹیلی جنس کا بریگیڈیئر اور کرنل اوجھا ایک بار پھر اپنے چیف کے آفس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ کسی اور کیس کے سلسلے میں اکٹھے ہوئے تھے۔

"پاکستان سے کوئی اور خبر آئی ہے؟" — چیف نے پوچھا۔

"نہیں سر!" — بریگیڈیئر نے جواب دیا — "خبر وہی ہے کہ انٹیروگیشن ہو رہی ہے۔"

"وہ تو ہوتی ہی رہے گی" — چیف نے کہا — "میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس لڑکی رِشی کو جتنی جلدی ہو سکے غائب کر دیا جائے۔ اگر اُسے انڈیا لایا جا سکے تو بہتر ہے ورنہ پاکستان میں ہی اُسے گم کر دیا جائے۔ یہ انتظام جلدی ہونا چاہئے۔"

"جلدی ہو گا سر!" — کرنل اوجھا نے جواب دیا — "جلدی ہو جاتے

گا سَر! آپ کو ایک ہفتے کے اندر اندر رپورٹ مِل جائے گی۔"

نئی دِلی میں انڈین انٹیلی جنس کے اور اسلام آباد میں پاکستانی انٹیلی جنس کے انٹیروگیشن سنٹر میں ملزموں سے تفتیش زور و شور سے جاری تھی۔ اب دونوں طرف تفتیش اس مرحلے میں پہنچ چکی تھی جس میں تفتیش کرنے والوں کا زور چلتا ہے اور ملزموں کا شور اُٹھتا ہے جو کمرے سے باہر کسی کو سنائی نہیں دیتا۔ دونوں طرف جُرم کا اقبال ہو چکا تھا۔ جو مشتبہ تھے وہ ملزم قرار دیئے جا چکے تھے لیکن دونوں طرف یہ مسئلہ ابھی باقی تھا کہ پورے کے پورے رِنگ کی نشاندہی ہو جاتے اس کے لئے ایک ہی طریقہ آزمایا جا رہا تھا جسے تھرڈ ڈگری یا ایذا رسانی کہا جاتا ہے۔

راولپنڈی میں رابی اور زینی اقبالِ جُرم کر چکے تھے اور انہوں نے وہ سب کچھ بے نقاب کر دیا تھا جو وہ جانتے تھے، اور جو اُنھوں نے ادھر اُدھر سے سُنا تھا وہ بھی بتا دیا تھا لیکن دونوں یہ بتانے سے قاصر تھے کہ ان کے رِنگ کے باقی افراد کون کون ہیں۔ آئی ایس آئی کے تفتیشی افسروں نے تسلیم کر لیا تھا کہ یہ دونوں جھوٹ نہیں بول رہے۔ اُس وقت تک ورما، خان صاحب اور ان کے ساتھیوں سے جو ان کے ساتھ ہوٹل سے پکڑے گئے تھے، کچھ بھی نہیں پوچھا گیا تھا۔ انہیں ابھی چھیڑا ہی نہیں گیا تھا۔ رابی اور زینی نے ان کی اصلیت بے نقاب کر دی تو ان کی انٹیروگیشن شروع کر دی گئی۔

"میرا اصل نام گنیش ورما ہے" ——— ورما نے تفتیشی افسر میجر عباس کو بلا حیل و حجت بتایا ——— "پاکستان اور پاکستانیوں کے لئے میں عبدالرحمٰن ہوں۔ میں انڈین انٹیلی جنس کا ایک اہم رکن ہوں۔ اس سے زیادہ میں اور کچھ بھی نہیں بتاؤں گا۔"

"جنہوں نے اقبالِ جرم کر لیا ہے وہ بھی پہلے روز یہی کہتے تھے" — میجر عباس نے ہنستے ہوئے کہا — "کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ انہوں نے جس جسمانی اور ذہنی حالت کو پہنچ کر اقبالِ جرم کیا ہے، تم اپنی یہ حالت کرانے سے پہلے ہی اپنا سینہ میرے آگے کھول دو؟"

"میرے سینے میں کچھ نہیں ہے سر!" — ورما نے کہا — "اس سینے سے آپ کو کچھ نہیں ملے گا۔ مَیں جانتا ہوں آپ مجھ سے یہ پوچھنا چاہیں گے کہ مَیں جس رِنگ میں ہوں اس میں اور کون کون ہے۔ آپ ان کے نام اور پتے معلوم کرنا چاہتے ہیں..... مَیں انہی افراد کو جانتا ہوں جو میرے ساتھ پکڑے گئے ہیں۔"

یہ تفتیش کا بڑا لمبا سفر تھا جس پر میجر عباس چل پڑا۔ وہ ورما پر سوال پہ سوال کرنے لگا۔ ورما چھوٹے چھوٹے جواب دیتا چلا گیا۔ یہ دو دماغوں کی لڑائی تھی۔ دونوں انٹیلی جنس کے تجربہ کار آدمی تھے لیکن ورما کی کمزوری یہ تھی کہ وہ ملزم تھا اور میجر عباس کا قیدی تھا۔ پاکستان کا یہ میجر اُس کی ہڈیاں توڑ سکتا تھا۔

دوسرے کمرے میں خان صاحب سے ایک لیفٹیننٹ کرنل تفتیش کر رہا تھا۔ وہ خان صاحب کو راہی اور زینی کے بیان سُنا چکا تھا۔

"..... اور یہ بھی سوچ لو کہ تمہارے گھر سے کیا کچھ برآمد ہُوا ہے" — کرنل نے خان صاحب سے کہا — "ایسا تو ہو نہیں سکتا کہ تم جھوٹ بولتے چلے جاؤ گے اور میں مانتا چلا جاؤں گا اور آخر میں یہ فیصلہ دے دوں گا کہ تم تو بے گناہ ہو، جاؤ چھٹی کرو۔"

"مجھے ایسی کوئی توقع نہیں کرنل صاحب!" — خان صاحب نے کہا۔

"تمہیں کس نے بتایا ہے کہ مَیں کرنل ہوں؟"

"مَیں تو آپ کا نام بھی جانتا ہوں کرنل صاحب!" — خان صاحب نے جواب دیا — "کیا آپ کا نام کرنل ممتاز احمد نہیں؟ مَیں آپ کا گاؤں بھی بتا سکتا ہوں۔ اسلام آباد میں آپ کی کوٹھی بھی دیکھی ہے جو آپ نے

مارشل لاء کے دَور میں بنائی تھی اور اب ایک سرکاری محکمے کو کرائے پر دے رکھی ہے۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہُوا کہ ....."

"کہ مَیں انڈین انٹیلی جنس کا ایجنٹ ہوں" — خان صاحب نے کرنل ممتاز کا جملہ پورا کر کے کہا — "ہاں کرنل صاحب! مَیں انڈین انٹیلی جنس کے لئے کام کرتا ہوں اور مَیں پاکستانی ہوں۔"

"لعنت ہے تم جیسے پاکستانیوں پر" — کرنل ممتاز نے کہا۔

"کس کس پر لعنت بھیجو گے کرنل صاحب؟" — خان صاحب نے مُسکراتے ہُوئے کہا — "مَیں پیدائشی جاسوس تو نہیں ہوں۔ اگر میری نوجوانی میں میرے پاس سفارش ہوتی تو آج میں بھی لیفٹیننٹ کرنل ہوتا۔ سلیکشن بورڈ میں جا کر صرف اس لئے مجھے ریجیکٹ نہ کر دیا جاتا کہ تین چار سفارشی لڑکوں کو سلیکٹ کرنا تھا۔ میں تو ملک کے معاملے میں بڑا ہی جذباتی ہُوا کرتا تھا کرنل صاحب!"

"خان صاحب!" — کرنل ممتاز نے کہا — "فوج میں جذباتی آدمیوں کو نہیں لیا جاتا۔ افسر اگر جذباتی ہو جائے تو ....."

"کرنل صاحب!" — خان صاحب نے کرنل ممتاز کی پوری بات سُنے بغیر کہا — "جذباتی سے میرا مطلب کچھ اور ہے۔ میں جذبے کی بات کر رہا ہوں۔ مَیں جانتا ہوں کہ فوج میں جذباتی آدمی نقصان دہ ثابت ہوتا ہے لیکن فوج میں اوچھے آدمی کو بھی نہیں لیا جانا چاہیئے کہ وہ ملک کو دُشمن سے بچانے کی بجائے اپنے ملک کو فتح کر کے اس کا بادشاہ بن جائے۔"

"آدمی دانشمند معلوم ہوتے ہو" — کرنل ممتاز نے کہا۔

"آپ آئی ایس آئی کے آفیسر ہیں کرنل صاحب!" — خان صاحب نے کہا — "کیا آپ نہیں جانتے کہ انٹیلی جنس میں کام کرنے والے آدمی کتنے دانشمند ہُوا کرتے ہیں؟ میں تو ان چھوکروں کی حماقتوں سے

پکڑا گیا ہوں۔"

"پھو کرے کون؟"

"یہی رابی اور زینی وغیرہ"۔۔۔ خان صاحب نے کہا ۔۔۔ "میں انہیں کہہ رہا تھا کہ ذرا سنبھل کے چلو لیکن یہ سمجھ بیٹھے کہ پاکستان کی انٹیلی جنس جیسے اندھی اور بہری ہو..... آپ نے مجھے دانشمند کہا ہے۔ آپ کو شاید افسوس نہ ہو مگر مجھے کبھی کبھی ملال ہوتا ہے کہ میری دانشمندی میرے ملک کے کام آنے کی بجائے ملک کے دشمن کے کام آ رہی ہے۔ مجھے انٹر سروسز سلیکشن بورڈ نے آرمی کمیشن سے ریجیکٹ کر کے دانشمندی کا ثبوت نہیں دیا تھا۔ اپنے متعلق میں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں میری عمر سترہ سال اور کچھ مہینے تھے۔ میں فسٹ ایئر کا سٹوڈنٹ تھا۔ اگر میں بتانا شروع کر دوں کہ میں نے سترہ روزہ جنگ میں اپنے ملک کے لئے، ملک کی فوج کے لئے اور اپنی پبلک کی سلامتی کے لئے کیسے کیسے کام کئے تھے تو آپ نہیں مانیں گے۔ آپ شبہ کریں گے کہ میں اپنی چمڑی بچانے کے لئے محبِ وطن بننے کی ایکٹنگ کر رہا ہوں۔"

"میں کچھ بھی نہیں کہوں گا خان صاحب!"۔۔۔ کرنل ممتاز نے کہا ۔۔۔ "میں سمجھتا ہوں تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ میں جانتا ہوں تم پیدائشی مجرم نہیں ہو۔ تم بتا رہے ہو کہ تم غدار کیوں بنے لیکن خان صاحب! سزا اُسے ملتی ہے جو جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔"

"یہ میں بھی جانتا ہوں"۔۔۔ خان صاحب نے کہا ۔۔۔ "میں اپنے آپ کو بے گناہ ثابت نہیں کر رہا، میں بتا رہا ہوں کہ میرے جذبوں کو کس طرح کچلا گیا۔ انہیں بددیانتی، خویش پروری اور رشوت خوری کی بھٹی میں ڈال کر اس طرح پگھلا دیا گیا جس طرح فولاد سیال بن جاتا ہے۔ میرے جذبوں کو سیال بنا کر ایسے سانچے میں ڈال دیا گیا کہ یہ ایک جذبے کی شکل اختیار کر گئے۔ یہ تھا انتقام کا جذبہ۔ میں انٹر سروسز سلیکشن بورڈ سے ریجیکٹ ہوا تو نوکری کی تلاش میں مارا مارا پھرنے لگا۔ میں عہدے والی نوکری چاہتا تھا۔

میرے پاس بی۔ اے کی ڈگری تھی لیکن جہاں بھی گیا وہاں مجھے رشوت کے ریٹ بتائے گئے۔ اگر بات چند سو روپوں کی ہوتی تو میں دے دیتا لیکن بیس ہزار، پچیس ہزار اور تیس ہزار میں کہاں سے دیتا؟ مجھے ہر جگہ ریٹ بتا کر کہا گیا کہ یہ تو تم تین مہینوں میں کما لو گے۔ آخر ایک وزیر تک رسائی ہو گئی۔ اُس نے پکا وعدہ کیا کہ میں جو نوکری چاہتا ہوں وہی ملے گی۔ دوسرے دن اُس کے پی اے نے مجھے بلایا اور کہا کہ دس ہزار روپے کا بندوبست کر لو، بخدا یہ نوکری کسی کو یوں ڈائریکٹ نہیں ملا کرتی۔ اس کے بعد مجھے اُس وزیر تک رسائی کا موقع ہی نہ ملا۔"

کرنل ممتاز کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ اُس کا مقصد صرف یہ تھا کہ یہ شخص جو انڈیا کی جاسوسی کے سلسلے میں خان صاحب کہلاتا ہے، اپنے رنگ کے سارے نہیں تو دو چار افراد بے نقاب کر دے لیکن خان صاحب نے وہ قصہ چھیڑ دیا تھا جس کے ساتھ کرنل ممتاز کو دلچسپی نہیں تھی، پھر بھی وہ اس کی باتیں دلچسپی سے سُن رہا تھا۔ آئی ایس آئی کے اس کرنل کے لئے خان صاحب کی کوئی ایک بھی بات نئی نہیں تھی۔ یہ تو ایک سو ایک بار سُنی اور سُنائی ہوئی کہانی تھی، تاہم وہ سُن رہا تھا۔ اُس نے اس ملزم سے یہ کہنے کی سوچی ہی نہیں کہ وہ فلاسفر بننے کی کوشش نہ کرے اور کام کی بات کرے۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ خان صاحب کی باتیں اس کے دل میں اُتر رہی ہیں اور وہ ایسا سچ بول رہا ہے جو دل میں چھید کر رہا ہے۔

"کرنل صاحب!"۔۔۔ خان صاحب کہہ رہا تھا ۔۔۔ "میں نے آپ کو شاید ناراض کر دیا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ فوج میں اچھے آدمی کو نہیں لیا جانا چاہیئے۔ اس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ پاکستان کی فوج اچھے افسروں سے بھری پڑی ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ ملک اچھے سیاسی لیڈروں، سیاسی نسل کے جرنیلوں اور ان اچھے افسروں کے ہاتھ آگیا ہے جو حکومت کی مشینری کو چلاتے ہیں۔ ان کی وجہ سے مسلح افواج میں بھی اچھے آدمی آنے لگے۔"

"میرا خیال ہے تم آرمی کمیشن کے قابل نہیں تھے" — کرنل ممتاز نے کہا۔

"وقت گزر گیا ہے کرنل صاحب!" — خان صاحب نے طنزیہ مسکراہٹ سے کہا — "اگر آپ اُس وقت مجھے دیکھتے اور میرا امتحان لیتے تو آپ کو پتہ چلتا کہ میرے آئی کیو کا معیار کیا ہے۔ افسوس کہ اتنے اونچے معیار کے آئی کیو سے پاکستان نے نہیں بلکہ پاکستان کے دشمن نے فائدہ اُٹھایا۔۔۔ کرنل ممتاز! کامیاب جاسوس بہترین فوجی افسر بنتا ہے۔ میں صرف جاسوس نہیں ایک رِنگ کا لیڈر ہوں اور مجھ میں اتنی عقل ہے کہ نئی دِلی کے کسی نہ کسی حکم کو بھی میں پاکستان کے حالات کے مطابق تبدیل کر دیا کرتا ہوں۔"

"خان صاحب!" — کرنل ممتاز نے کہا — "مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ میں اس کے سوا کیا کر سکتا ہوں۔ بخدا میں نہیں چاہتا کہ تم جیسے ذہین اور مظلوم آدمی کو تھرڈ ڈگری کی چکی میں ڈالوں۔ اگر اپنے رِنگ کے ہر ایک فرد کی نشاندہی کر دو تو بڑی ظالم اذیت سے بچ جاؤ گے اور تمہیں وعدہ معاف گواہ بنانے پر بھی غور کیا جا سکتا ہے ۔۔۔۔ ہو سکتا ہے ہم تمہارے لئے کوئی راستہ بھی نکال لیں۔"

"یعنی آپ مجھے آئی ایس آئی میں لے لیں" — خان صاحب نے کہا۔

"میرا مطلب یہی ہے" — کرنل ممتاز نے کہا۔

خان صاحب ہلکی سی ہنسی ہنس پڑا۔

"میرے عزیز کرنل ممتاز!" — اُس نے کہا — "کس ملک کی بات کرتے ہو۔ جس ملک کے لیڈر ہی غدار ہوں اُس ملک کی انٹیلی جنس کیا کرے گی۔ دشمن کے آگے جُھک جانا اپنے عوام کو دھوکے میں رکھنا، آپس میں اقتدار کی خاطر لڑتے رہنا غداری نہیں تو اور کیا ہے؟ میں جب ہر طرف سے مایوس ہو گیا تھا تو سب سے پہلے میرا قومی جذبہ مرا پھر میری

غیرت بھی میرا ساتھ چھوڑ گئی۔ کرنل صاحب! میرا باپ مر گیا تو دو جوان بہنوں اور ان سے چھوٹے ایک بھائی اور ماں کا بوجھ مجھ پہ آ پڑا۔ میں کیا تھا؟۔۔۔۔ کلرک" — خان صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ہاتھوں سے آنسو پونچھ کر بولا — "یاد رکھیں کرنل صاحب! بھوکے، غیر مطمئن اور فریب خوردہ عوام اپنے ملک کے سب سے بڑے دشمن ہوتے ہیں۔ پاکستان کے حکمرانوں اور لیڈروں نے یہاں کے عوام کو اپنے ملک کا دشمن بنا دیا ہے۔ انڈیا کو پاکستان میں اپنے ایجنٹ پیدا کرنے میں ذرا سی بھی دشواری نہیں ہوتی۔ یہاں روپے پیسے کی جو دوڑ لگی ہوتی ہے اس میں ہر کوئی راتوں رات دولت مند بننے کے جتن کرتا ہے۔ لوگ دین و ایمان نیلام کر رہے ہیں۔ آپ میرا رِنگ توڑ دیں گے تو چند دنوں میں ایک رِنگ اور بن جاتے گا۔"

❄

خان صاحب دھیمی دھیمی آواز میں بولتا جا رہا تھا۔ وہ اُن عناصر کو اور اُن احوال و کوائف کو بے نقاب کر رہا تھا جو عوام میں مجرمانہ رجحانات پیدا کرتے ہیں اور کس طرح ایک قوم کے کچھ افراد اپنے ہی ملک اور اپنی ہی قوم کے غدار بن جاتے ہیں۔ خان صاحب نے اُن عناصر کو بھی بیان کیا جو پاکستان کے نوجوانوں کی اخلاقی تباہی کا باعث بن رہے ہیں۔

کرنل ممتاز کمرے میں ٹہلتے ٹہلتے رُک گیا۔ اُس نے لمبا سانس لیا اور خان صاحب کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

"ہاں خانصاحب!" — اُس نے جاسوسی کے اس ملزم سے کہا — "تم بہت بول چکے، اب میری باری ہے۔ یہ ساری باتیں جو تم نے کی ہیں، ان میں میرے لئے کوئی ایک بھی بات نئی نہیں لیکن میری مجبوری سے تم واقف ہو۔ میں اپنے حکمرانوں اور سیاسی لیڈروں کو تو محبِ وطن نہیں بنا سکتا۔ وہ تو محبِ اقتدار ہیں۔ میری ڈیوٹی محدود ہے، ملزموں کو پکڑنا اور ان کے خلاف جُرم ثابت کر کے انہیں قانون کے حوالے کرنا ۔۔۔۔ اور

تمہاری مجبوری یہ ہے کہ تم جاسوسی کے ملزم ہو جس کا تم اعتراف بھی کر چکے ہو۔ کیوں نہ ہم اپنے اپنے دائرے میں رہیں۔ مَیں تمہیں اپنے دائرے میں لاسکتا ہوں اور باعزت طریقے سے اپنے دائرے میں رکھ سکتا ہوں۔"

"آپ نے مجھے دو لالچ دیئے ہیں" — خان صاحب نے کہا — "ایک یہ کہ آپ مجھے وعدہ معاف گواہ بنالیں گے اور دوسرا اشارہ آپ نے یہ دیا ہے کہ میں آئی ایس آئی کے لئے انڈیا کے خلاف کام کروں۔ شرط یہ ہے کہ مَیں اپنا پورا رِنگ بے نقاب کر دوں.... کرنل ممتاز! مَیں آپ کو ایک مشورہ دوں گا۔ یہ مشورہ آپ اپنے چیف تک بھی پہنچا دیں۔ کبھی انڈیا کے کسی پاکستانی ایجنٹ کو یہ پیش کش نہ کرنا کہ وہ اُدھر سے ہٹ کر اِدھر کے لئے کام کرے ورنہ وہ ڈبل ایجنٹ بن جائے گا۔ میں نے ایسے ڈبل ایجنٹ دیکھے ہیں۔ جہاں تک وعدہ معاف گواہ بننے کا تعلق ہے، یہ معاملہ کچھ مشکوک ہے۔"

"مشکوک کیوں؟"

"مشکوک اس لئے کہ میں رِنگ لیڈر ہوں" — خان صاحب نے کہا — "مجھے یقین ہے کہ آپ کا چیف کم از کم مجھے وعدہ معاف گواہ نہیں بنائے گا اور جس عدالت میں ہمارا مقدمہ جائے گا، اس کا جج اگر دانشمند ہُوا تو وہ ایک رِنگ لیڈر کو وعدہ معاف گواہ نہیں بنائے گا کیونکہ مجرم نمبر ایک کو اتنی رعایت شاید ہی کوئی جج دے گا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میرے رِنگ میں یہ جو لڑکا رابی آیا ہے، وعدہ معاف گواہ بنے گا۔"

"مجھے اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی" — کرنل ممتاز نے کہا۔

"آپ بھی سیدھے سادے فوجی ہیں کرنل صاحب!" — خان صاحب نے مُسکراتے ہُوئے کہا — "کیا آپ نہیں جانتے کہ اس لڑکے کا باپ کتنے بڑے عہدے کا سرکاری افسر ہے؟ آپ نے بتایا ہے کہ اس لڑکے نے اقبالِ جُرم کر لیا ہے۔"

"تم یہ معاملات مجھ پر کیوں نہیں چھوڑتے؟" — کرنل ممتاز نے

کہا — "اگر تم نے پورا رِنگ توڑ کر آئی ایس آئی کے آگے رکھ دیا اور کچھ معلومات دے دیں تو جج بھی یہ کہہ اُٹھے گا کہ اس شخص کو وعدہ معاف گواہ بنانا چاہیئے.... خان صاحب! چھوڑو ان لمبی باتوں کو۔ تم جانتے ہو ہم آخر تم سے اقبالِ جرم کروا ہی لیں گے۔ تم یہ بھی جانتے ہو گے کہ اقبالِ جُرم کروانے کا صرف ایک ہی طریقہ ایذا رسانی نہیں۔"

"مَیں جانتا ہوں کرنل صاحب!" — خان صاحب نے کہا — "آج کل ایسی دوائیاں بھی آگئی ہیں جو ملزم کو دھوکے میں دے دی جاتی ہیں اور ان کے اثرات سے برین واشنگ آسان ہو جاتی ہے۔"

"مجھے صاف الفاظ میں بتاؤ کہ تم پورا رِنگ بے نقاب کرو گے یا نہیں" — کرنل ممتاز نے پوچھا۔

"کرنل صاحب!" — خان صاحب نے کہا — "اگر آپ اس سوال کا جواب ہاں یا نہیں میں چاہتے ہیں تو صحیح جواب دینا میرے لئے مشکل ہے۔ مشکل اس لئے ہے کہ جس ملک کا مَیں نے نمک کھایا ہے اور جس ملک نے میرے مسئلے حل کئے ہیں اور مجھے آسودہ حال بنایا ہے، میں اُس کے ساتھ غداری نہیں کروں گا۔ میں تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا۔ مختصر بات یہ ہے کہ میں گداگر بن گیا تھا اور یہ مجھے اپنے ملک نے بنایا تھا، لیکن انڈیا نے مجھے مالی لحاظ سے ایسی پوزیشن دی کہ جہاں کہیں بھی اپنی گاڑی روکتا ہوں وہاں پانچ سات گداگر دوڑے آتے اور میرے آگے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔"

"کیا تم بھول گئے ہو خان صاحب کہ تمہیں کس ملک کی مٹی نے جنم دیا ہے؟" — کرنل ممتاز نے پوچھا۔

"نہیں بھولا کرنل صاحب!" — خان صاحب نے جواب دیا — "یہ تو میں کبھی بھی نہیں بھولوں گا، لیکن بات یہ ہے...."

"نہیں خان صاحب!" — کرنل ممتاز نے اُس کی بات کاٹتے ہُوئے کہا — "اب لمبی باتوں کو الگ رکھ دو۔ مَیں جانتا ہوں تم اپنے

جرم کا جواز پیش کر رہے ہو۔ میں تمہارے اس جذبے کو بیدار کرنا چاہتا ہوں جو تم میں موجود ہے اور جس کا ذکر تم نے ابتدا میں کیا ہے ..... کیا تم نے تاریخِ اسلام کا مطالعہ کیا ہے؟"

"ہاں کرنل صاحب!" — خان صاحب نے جواب دیا — "میں نے آپ کو بتایا ہے کہ میں گریجوایٹ ہوں۔"

"پھر تم نے خالدؓ بن ولید کی معزولی کا واقعہ بھی پڑھا ہو گا" — کرنل ممتاز نے کہا۔

"پڑھا ہے" — خان صاحب نے جواب دیا — "خلیفہ دوم حضرت عمرؓ نے خالدؓ بن ولید جیسے عظیم جرنیل کو معمولی سی بات پہ معزول کر دیا تھا۔"

"تو پھر کیا خالدؓ بن ولید ایرانیوں یا رومیوں کے جاسوس بن گئے تھے؟" — کرنل ممتاز نے پوچھا۔

"کرنل ممتاز!" — خان صاحب نے ہونٹوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا — "آپ اُس مقدس دَور کی مثال آج کے دَور پر چسپاں کر رہے ہیں۔ اُن جیسے لوگ تو آسمان نے صرف ایک بار ہی دیکھے ہیں۔ آج تک پاکستان نے کوئی عمر فاروقؓ پیدا کیا ہے نہ خالدؓ بن ولید۔ آج کی بات کریں۔ ہم مسلمانوں کو چودہ سو سال پہلے کی شخصیتوں کو اور کچھ عرصہ بعد کے سپہ سالاروں مثلاً محمد بن قاسم، صلاح الدین ایوبی، محمود غزنوی وغیرہ کو یاد کرتے شرم آنی چاہیئے۔"

"میں آج کی بھی بیشمار مثالیں دے سکتا ہوں" — کرنل ممتاز نے کہا — "ہزارہا سول اور فوج کے افسر بے انصافی کا شکار ہو کر گھروں میں بیٹھے ہیں۔ وہ انہیں بُرا بھلا کہتے ہیں جنہوں نے ان کے ساتھ بے انصافی کی لیکن پاکستان کے خلاف وہ بات سُننے کو بھی تیار نہیں ہوتے۔"

کرنل ممتاز نے یہ تسلیم کر لیا تھا کہ خان صاحب کسی وقت بڑا

ہی جذباتی محبِ وطن ہُوا کرتا تھا۔ کرنل ممتاز کو یہ بھی معلوم تھا کہ جذبے دب جایا کرتے ہیں، مرا نہیں کرتے۔ اُس نے خان صاحب کو یاد دلانا شروع کر دیا کہ پاکستان کس طرح حاصل کیا گیا تھا۔ اُس کا انداز جذباتی تھا۔ اُس نے مسلمانوں کے اُس قتلِ عام کا بھی ذکر کیا جو ۱۹۴۷ء میں ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں ہُوا تھا۔ پھر اُن کم و بیش ایک لاکھ مسلمان لڑکیوں کا ذکر کیا جو اُس دَور میں اور اس کے بعد اغوا کر لی گئی تھیں۔ پھر اُس نے کشمیری مسلمانوں کے قتلِ عام کا ذکر کیا اور آخر میں کہا کہ کوئی ملک اپنی قوم کو بھوکا اور پیاسا نہیں رکھتا بلکہ یہ غیر انسانی فعل ملک کے حکمرانوں کا ہوتا ہے۔ ملک قوم کا اور قوم ملک کی ہوتی ہے۔

"خان صاحب!" — کرنل ممتاز نے کہا — "اگر تم دل میں پاکستان کی محبت رکھتے ہو تو اس کے لیے اتنا سا کام کر دو کہ اس کے جو دشمن زمین کے نیچے سے اس کی جڑیں کاٹ رہے ہیں انہیں زمین کے اُوپر لے آؤ۔ یہ بھی سوچ لو کہ تم جس پھندے میں آ گئے ہو اس سے نکل نہیں سکو گے۔

میں تمہیں زیادہ سے زیادہ یہ انعام دوں گا کہ وعدہ معاف گواہ بنا کر سزا سے بچا لوں گا لیکن جس انعام کے تم حقدار ہو وہ تمہیں اپنے اللہ سے ملے گا۔"

کرنل ممتاز کے بولنے کا انداز ایسا اثر انگیز تھا کہ خان صاحب پر خاموشی طاری ہو گئی۔ دل سے نکلی ہوئی بات اثر دکھا رہی تھی۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ یہ شخص اُس مقام کے قریب پہنچ چکا ہے جہاں کرنل ممتاز اسے لانا چاہتا تھا۔ ان اثرات کے علاوہ خان صاحب اپنے میدان کا استاد تھا۔ اُس نے دیکھ لیا تھا کہ اب فائدہ اسی میں ہے کہ وہ اس کرنل کے آگے ہتھیار ڈال دے۔

اور اُس نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اُس نے بڑا لمبا بیان دیا جس میں بارہ چودہ آدمیوں کی نشاندہی کی گئی تھی۔ اُس نے ان سب کے ایڈریس بھی بتائے تھے۔

اس کے بعد ورما اور اُن کے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ بیان
لینے کے لئے محنت نہ کرنی پڑی۔ کرنل ممتاز نے یہ بیان اپنے چیف کو
پیش کر دیئے۔ ان کی گرفتاری کے لئے آئی ایس آئی اُسی وقت حرکت
میں آگئی۔

❄

سب سے بڑی قربانی تو رابی کے باپ نے دی تھی۔ اُس نے
پاکستان کی سلامتی پر اپنا اکلوتا بیٹا قربان کر دیا تھا۔ اگر بات بیٹے پر ہی
ختم ہو جاتی تو شاید وہ برداشت کر لیتا۔ اُس نے اپنے آپ کو یہ فریب
دے لیا تھا کہ اُس کا کوئی بیٹا تھا ہی نہیں لیکن بیٹے کی ماں موجود تھی
اور بیٹے کی دو بہنیں موجود تھیں۔ یہ تینوں عورتیں رابی کے باپ کے لئے
قیامت بپا کئے رکھتی تھیں۔ رابی کے باپ کو صبح و شام، دن اور رات
یہ الفاظ کئی کئی بار سُننے پڑتے تھے کہ اگر آپ نے اسے گرفتار کروا
ہی دیا ہے تو اسے وعدہ معاف گواہ بھی بنوا سکتے ہیں۔ ماں تو بعض
اوقات اس طرح روتی تھی جیسے اُس کا بیٹا مر گیا ہو۔

رابی کا باپ اب اپنے بیڈ روم میں راتوں کو تنہا ہوتا تھا۔ اُس کی
بیوی اور بیٹیاں اس کی دشمن ہو گئی تھیں۔ کبھی تو وہ یوں محسوس کرنے
لگتا تھا جیسے وہ خود بھی اپنا دشمن ہو گیا ہو، ورنہ کون ایسا باپ ہے جو
اپنے اکلوتے بیٹے کو سولی چڑھا سکتا ہے۔ یہ اذیت ناک کیفیت اس پر
اُس وقت طاری ہوتی تھی جب وہ ایک محبِ وطن پاکستانی نہیں بلکہ
ایک باپ ہوتا تھا۔ اس کیفیت میں اس کی شخصیت دو حصّوں میں کٹ
جاتی تھی —— ایک باپ اور دوسرا محبِ وطن پاکستانی —— یہ دونوں
ایک دوسرے کا منہ نوچنے لگتے تھے۔ ایک کہتا تھا کہ میرا بیٹا مجھے لوٹا
دو اور دوسرا اس غدار بیٹے کو قانون کی بھٹی میں جھونکتا تھا۔

اُس کی عمر ساٹھ برس کے قریب ہونے کو تھی۔ کام کا بوجھ الگ تھا۔

ایک رات اُسے سینے میں بائیں طرف درد اُٹھا جسے وہ برداشت کرنے
کی کوشش کرتا رہا لیکن درد بائیں کندھے اور بازو تک چلا گیا۔ اس کے
ساتھ دل کی گھبراہٹ اسے پریشان کرنے لگی۔ وہ اُٹھا۔ وہ اپنی بیوی
اور بیٹیوں کو جگانے کو چلا تو اپنے کمرے کے دروازے تک پہنچتے
چکرا کر گر پڑا۔ اس نے ہمت کی اور اُٹھا۔ دروازہ کھولا اور دیوار کا سہارا
لیتے ہوئے بیوی اور بیٹیوں کے کمرے میں پہنچا۔ ان دنوں اتفاق
سے اس کی دونوں بیٹیاں سُسرال سے گھر آئی ہوئی تھیں۔

وہ اپنے جسم کو قوّتِ ارادی کے زور پر گھسیٹتا ہُوا اُس کمرے
تک پہنچ گیا اور دروازے پر زور زور سے ہاتھ مارے۔ دروازہ کھلا
تو اس کی بیوی نے دیکھا کہ وہ باہر فرش پر بیٹھا ہے۔ بیٹیاں بھی جاگ
اُٹھیں۔ انہوں نے سہارا دے کر اسے کمرے میں پلنگ پر لٹایا۔ اس
نے دل کے مقام پر ہاتھ رکھا ہُوا تھا۔ ڈرائیور کو جگا کر رابی کے باپ کو
فوراً ہی ہسپتال لے گئے۔

یہ دل کے دَرد کا پہلا اور شدید دورہ تھا۔ ای سی جی نے بڑی
تشویشناک رپورٹ اُگلی۔ اسے انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں رکھا گیا
اور ڈاکٹروں نے پابندی عائد کر دی کہ مریض سے کوئی بھی نہیں مل سکتا۔

رابی کا باپ اس دورے سے سنبھل گیا۔ سات آٹھ روز بعد اسے
ہسپتال سے فارغ کر دیا گیا اور اُسے خبردار کیا گیا کہ اپنے آپ کو جذباتی
جھٹکوں سے بچائے رکھے اور ذرا سی بھی بے احتیاطی نہ کرے۔

"یہ تو ہونا ہی تھا" —— رابی کی ماں نے یہ الفاظ اُٹھتے بیٹھتے کہنے
شروع کر دیئے —— "اب بھی وقت ہے۔ اپنے بیٹے کو نکلوا لیں۔"

یہ الفاظ رابی کے باپ کے دل میں تیر کی طرح اُترتے رہتے تھے۔
رابی کی ماں اتنا بھی نہیں سوچتی تھی کہ اُس کا خاوند دل کے عارضے میں
مبتلا ہو چکا ہے اور اس طرح کے جلے کٹے الفاظ اس کے دل پر اتنا بُرا
اثر کر سکتے ہیں کہ حرکتِ قلب بند ہو سکتی ہے۔

ڈاکٹر نے رابی کے باپ کو لکھ دیا کہ وہ کم از کم دو مہینے آرام کرے۔
ڈاکٹر کی اس تحریر سے اُسے ڈیڑھ ماہ کی چھٹی مل گئی مگر گھر میں لیٹے یا بیٹھے رہنا اس کے لئے بڑا ہی اذیت ناک تھا کیونکہ چوبیس گھنٹے اسے اپنی بیوی اور بیٹیوں کا سامنا رہتا۔ اس کا اُس نے یہ حل نکالا کہ ایک نوکر کے ساتھ مری چلا گیا۔ رابی کی ماں اُس کے ساتھ جانا چاہتی تھی لیکن اُس کے خاوند نے اپنی بیوی کو ڈاکٹر سے کہلوا دیا کہ انہیں اکیلے جانے دیں۔

❄

نئی دلی میں انڈین انٹیلی جنس کے انٹیروگیشن سنٹر میں اس کیس کے اب تین ملزم رہ گئے تھے — عبدالقدیر، فریدالدین، ہاشمی اور اس کی بیوی — جمیل اور اس کی بیوی زبیدہ کو رہا کر دیا گیا تھا۔
"مسٹر جمیل!" — انڈین انٹیلی جنس کے ایک بریگیڈیئر نے اُسے رہا کرنے سے پہلے اپنے دفتر میں بٹھا کر کہا تھا — "آپ کو شاید اندازہ نہ ہو کہ ہم نے آپ پر کتنی بڑی نوازش کی ہے۔ اپنی بیوی کو دعائیں دیں جس نے یہ بات بتا کر آپ کو اس جہنم سے نکال لیا ہے۔ آپ کو شاید پہلے معلوم نہیں ہو گا کہ عزیز ہمارے محکمے کا آدمی تھا۔ آپ کی رہائی میں اُس کی خدمات بھی کارفرما ہیں۔ اگر آپ کی بیوی عزیز کی بہن نہ ہوتی تو آپ کی رہائی بھی ممکن نہ ہوتی۔ غور کریں کہ بھارت ماتا کی خدمت کرنے والوں کو ہم کتنا اعزاز دیتے ہیں۔ بھارت صرف ہندوؤں کا ملک نہیں، یہ مسلمانوں کا بھی وطن ہے۔ عزیز نے بھارت کی آن پر جان دی ہے۔ ہم اس کا صلہ دیں گے۔ آپ کے دماغ میں اگر ابھی تک پاکستان موجود ہے تو اسے نکال پھینکیں۔"
جمیل خاموشی سے سُن رہا تھا۔
"اب آپ پر ایک فرض عائد ہوتا ہے" — بریگیڈیئر کہہ رہا تھا — "عزیز کے قاتلوں کا ابھی تک سراغ نہیں ملا۔ اگر آپ کوشش کریں تو کچھ نہ کچھ سراغ مل سکتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ قاتل عبدالقدیر اور ہاشمی

کے ملنے جلنے والے آدمیوں میں ہیں۔ آپ ان لوگوں میں گھل مل جائیں۔"
"میں کوشش کروں گا جناب!" — جمیل نے کہا — "میں ضرور کوشش کروں گا۔"
جمیل اور زبیدہ اپنے گھر آ گئے۔
اُسی روز ایک ہندو میجر عزیز کے باپ کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ عزیز کے باپ نے دروازہ کھولا۔
"میں میجر شیام ہوں" — میجر نے کہا — "مجھے عزیز کے والد ادریس صاحب سے ملنا ہے۔"
"میں ہی ادریس ہوں" — عزیز کے باپ نے میجر سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا — "آئیے، بیٹھئے۔"
ادریس میجر شیام کو بیٹھنے والے کمرے میں لے گیا اور احترام سے بٹھایا۔
"میں آپ کا شناختی کارڈ دیکھنا چاہوں گا" — میجر شیام نے کہا — "کیونکہ میں نے آپ سے رسید لینی ہے" — اُس نے ایک لفافہ ادریس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا — "یہ کھول کر پڑھ لیں۔"
ادریس احمد نے لفافہ کھول کر اس میں سے کاغذ نکالا اور پڑھنے لگا۔ یہ انڈین گورنمنٹ کی ڈیفینس منسٹری کی طرف سے چٹھی تھی جس میں عزیز کی خدمات کو سراہا گیا تھا لیکن یہ نہیں لکھا گیا تھا کہ خدمات کیا تھیں۔ آخر میں لکھا تھا کہ عزیز کی خدمات کے صلے میں آپ کو ایک لاکھ روپیہ پیش کیا جا رہا ہے۔ ایک لاکھ روپے کا چیک چٹھی کے ساتھ نتھی تھا۔
ادریس احمد نے چٹھی پڑھ کر چیک دیکھا جو اُس کے نام کا تھا، پھر اُس نے میجر شیام کی طرف دیکھا۔
میجر شیام نے جیب سے ایک کاغذ نکالا اور ادریس کو دیا۔ یہ ٹائپ کی ہوئی رسید تھی۔ نیچے رسیدی ٹکٹ لگے ہوئے تھے۔
"یہاں دستخط کر دیں" — میجر شیام نے رسیدی ٹکٹوں پر انگلی رکھتے

ہُوئے کہا — "اور نیچے اپنے شناختی کارڈ کا نمبر لکھ دیں۔"

ادریس اُٹھ کر چلا گیا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں شناختی کارڈ تھا جو اُس نے میجر کو دکھایا۔ میجر نے کارڈ دیکھ کر لوٹا دیا۔ ادریس نے رسیدی ٹکٹوں پر دستخط کر دیئے اور نیچے اپنے شناختی کارڈ کا نمبر لکھ دیا۔ رسید میجر کو دے کر اُس نے چٹھی سے چیک الگ کیا اور اسے پھاڑ کر دو ٹکڑے کر دیا پھر دو کو چار ٹکڑوں میں پھاڑا پھر اسے پُرزے پُرزے کر دیا۔

"یہ کیا؟" — میجر شیام نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا — "رسید دے کر آپ نے چیک پھاڑ ڈالا!"

"مَیں بھارت کی اس سے زیادہ اور کوئی خدمت نہیں کر سکتا" — ادریس احمد نے کہا — "میں نے بھارت سرکار کا ایک لاکھ روپیہ بچا دیا ہے۔"

"پھر رسید پر دستخط کیوں کئے ہیں؟"

"بھارت سرکار کا شکریہ ادا کرنے کے لئے رسید پر دستخط کر دیئے ہیں" — ادریس احمد نے جواب دیا — "میجر شیام جی! میں نے عزیز کو اپنی جائیداد سے عاق کر دیا تھا اس لئے مجھ پر اُس کے نام پر آیا ہُوا ایک پیسہ بھی حرام ہے .... بہر حال میں نے چیک وصول کر کے یہ اظہار کیا ہے کہ مَیں نے اپنی حکومت کا صلہ قبول کر لیا ہے۔"

میجر شیام حیرت زدگی کے عالم میں اُٹھا اور ادریس احمد کے ساتھ ہاتھ ملا کر چلا گیا۔

"میں جانتا ہوں" — میجر کے جانے کے بعد ادریس احمد نے اپنے آپ سے کہا — "میں جانتا ہوں یہ کون سی خدمات کا صلہ ہے۔ میں ایمان فروش نہیں" — اُس نے چٹھی بھی پھاڑ ڈالی۔

❄

انٹیروگیشن سنٹر کی کال کوٹھڑیوں میں عبدالقدیر اور ہاشمی زندہ لاشوں کی طرح پڑے ہُوئے تھے۔ انہوں نے ابھی تک کوئی بات نہیں بتائی تھی۔ دونوں کو یہ خطرہ نظر آ رہا تھا کہ ہاشمی کی بیوی راز اُگل دے گی۔ ایک تو وہ عورت تھی اور اُس کی دوسری کمزوری یہ کہ اُس کی عمر پینتالیس سال تھی۔ وہ معمولی سی اذیت بھی برداشت کرنے کے قابل نہیں تھی۔

رات کے دس بج رہے تھے۔ فریدالدین ہاشمی کے سیل کا دروازہ کھُلا۔ وہ دیوار کے ساتھ پیٹھ لگائے اور ٹانگیں آگے کو لمبی کئے فرش پر بیٹھا تھا۔ اُس میں اب اتنی سی بھی ہمت نہیں رہی تھی کہ اُس کے ننگے پاؤں پر جو کاکروچ چڑھ آیا تھا اسے ہٹا دیتا۔ اُس کا سر ایک طرف ڈھلکا ہُوا تھا۔ اُس کے قریب تام چینی کی دو پلیٹیں فرش پر پڑی تھیں۔ ایک میں آدھی روٹی اور دوسری میں چنے کی کچھ دال تھی۔ ہاشمی دال روٹی کھا چکا تھا اور آدھی روٹی جو بچ گئی تھی، اُس پر دو کاکروچ پھر رہے تھے۔

دروازہ کھُلا تو ہاشمی بیدار ہو گیا۔ اُس نے ڈھلکے ہُوئے سَر کو اُوپر کیا اور مزید ایذا رسانی کے لئے تیار ہو گیا۔ اُس کے جسم کا حال اتنا بُرا ہو چکا تھا کہ اُسے دَرد سے ہائے ہائے کرتے رہنا چاہیئے تھا لیکن وہ خاموش تھا جیسے اُس کا جسم اُس کا اپنا نہیں تھا۔ اُس نے تو جیسے روح اور جسم کو الگ کر لیا تھا، یا جیسے وہ اپنے جسم سے دستبردار ہو گیا اور خود روح بن گیا تھا۔ اُس کی زبان پر ہر وقت اللہ کا نام ہوتا تھا۔ کبھی کوئی سورۃ پڑھ رہا ہوتا کبھی کسی وظیفے کا وِرد کر رہا ہوتا۔

"ہاشمی!" — انڈین انٹیلی جنس کے کرنل اوجھا نے اُسے ایک ہی روز پہلے سَیل کے دروازے میں کھڑے ہو کر کہا تھا — "بول پڑو۔ یہ نہ سمجھنا کہ مر جاؤ گے اور آزاد ہو جاؤ گے۔ ہم تمہیں مرنے نہیں دیں گے، زندہ رکھیں گے۔ کیا تمہیں یہ زندگی اچھی لگتی ہے؟ کیا تم خارش کے مارے ہُوئے مریل کُتّے کی طرح زندہ رہنا چاہتے ہو؟"

"وہ جانتا ہے"— ہاشمی نے بازو اُوپر کیا اور اُنگلی آسمان کی طرف کر کے نحیف آواز میں کہا تھا —"وہ اُوپر والا جانتا ہے کُتا کون اور کتوں جیسا انسان کون ہے۔ میں اُس کے آگے جوابدہ ہوں تم کون ہو؟"

"وہ اُوپر والا تمہیں بھول چکا ہے"— کرنل اوجھا نے کہا تھا — "ایک دو دنوں میں تم بھی اُسے بھول جاؤ گے اور ہم سے رحم کی بھیک مانگو گے۔ وعدہ معاف گواہ بن جاؤ۔ عزیز کے قتل کا راز دے دو۔ میں تمہارے خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ وہ صلہ دلواؤں گا کہ باقی عمر عیش کرو گے۔"

ہاشمی کے اُن ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ آگئی تھی جو تفتیشی افسر کا گھونسہ لگنے سے سُوج گئے تھے۔

اگلی رات اُس کی کال کوٹھڑی کا دروازہ کھلا تو وہ بیدار ہو گیا۔ سر سیدھا کر کے اُس نے ٹانگیں سمیٹ لیں۔

"اٹھو"— یہ میجر بھاٹیہ کی آواز تھی۔

ہاشمی دونوں ہاتھ فرش پر رکھ کر اس طرح اُٹھا جس طرح نوّے سالہ بوڑھا اُٹھنے کی کوشش کرتا ہے۔ میجر بھاٹیہ نے آگے بڑھ کر اُس کا بازو پکڑا اور اُسے اپنے ساتھ کمرے سے باہر لے گیا۔

وہ ایک کمرے کے سامنے جا رُکا۔ یہ تفتیشی کمرہ تھا۔ اُس نے کمرے کا دروازہ کھولا اور ہاشمی کو اندر لے گیا۔ کمرے میں تیز روشنی والے دو بلب روشن تھے۔ فرش پر ایک عورت اس حالت میں پیٹھ کے بل پڑی تھی کہ اُس کا صرف ستر ڈھانپا ہُوا تھا۔ ناف کے اُوپر سے سارا جسم بالکل برہنہ تھا۔ کمرے میں بدبو پھیلی ہوتی تھی۔ یہ عورت زندہ نہیں لگتی تھی۔ اُس کے برہنہ جسم پر تشدّد کے نشان صاف نظر آ رہے تھے اور سر کے بال اس طرح بکھرے ہُوئے تھے جیسے انہیں نوچنے کی کوشش کی گئی ہو۔

"اسے پہچانتے ہو ہاشمی؟"— میجر بھاٹیہ نے دروازے کے قریب رک کر ہاشمی سے پوچھا۔

ہاشمی نے نیم وا آنکھوں کو پوری طرح کھول کر عورت کو دیکھا۔

"ہاں"— اُس نے کہا —"میں اسے پہچانتا ہوں۔"

"کون ہے یہ؟"

"میری بیوی"— ہاشمی نے جواب دیا۔

"کیا اس کی حالت اس سے بھی بُری کرانا چاہتے ہو؟"— میجر بھاٹیہ نے پوچھا۔

"کیا تمہیں میرے مشورے کی ضرورت ہے؟"— ہاشمی نے کہا —"تم جو چاہو کر سکتے ہو .... مجھے یہاں کیوں لاتے ہو؟"

"اس لئے کہ اپنی معزز اور پردہ نشین بیوی کو دیکھ لو"— میجر بھاٹیہ نے طنزیہ لہجے میں کہا —"اور اس لئے بھی کہ تم جان سکو کہ تم بھی اسی انجام کو پہنچو گے .... اور اس لئے بھی تمہیں بلایا ہے کہ اسے کہو کہ باقی باتیں بھی بتا دے اور تم بھی اقبال جُرم کر لو ورنہ تمہارے سامنے تمہاری بیوی کے ساتھ ایسا بُرا سلوک کیا جائے گا جو تم برداشت نہیں کر سکو گے۔ اس نے ہمیں آدھی باتیں بتائی ہیں۔"

اپنی بیوی کو برہنہ حالت میں دیکھ کر ہاشمی کا ردِّ عمل سرد سا تھا۔ اُس کے چہرے کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ اُس کے لئے اُس کی بیوی کا جسم ایسا تھا جیسے یہ اُس کا اپنا جسم ہو۔ اُس نے مُنہ بھی نہ پھیرا کہ اُس جسم سے نظریں ہٹا لے۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اُس کی بیوی نے اقبالِ جُرم کیا ہے یا نہیں۔

"کیا میں اس کے قریب بیٹھ کر بات کر سکتا ہوں؟"— ہاشمی نے میجر بھاٹیہ سے پوچھا۔

"ہاں ہاں"— میجر بھاٹیہ نے جواب دیا —"اس کے پاس چلے جاؤ۔"

ہاشمی اپنی بیوی کے قریب اور اُس کے پاس بیٹھ گیا۔ اُس وقت تک اُس کی بیوی کی آنکھیں بند تھیں۔ ہاشمی نے اُسے بلایا تو اُس نے

آنکھیں کھول دیں۔ ہاشمی کو دیکھ کر اُس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔

"میں نے انہیں کچھ نہیں بتایا"— بیوی نے ہاشمی سے ایسی آواز میں کہا جو بڑی مشکل سے ہاشمی کے کانوں تک پہنچی — "میں خدا کے حضور شرمسار نہیں"۔

ہاشمی کی بیوی نے بڑی مشکل سے اپنا دایاں ہاتھ فرش سے اوپر اُٹھایا۔ ہاشمی نے اُس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اُس معزز خاتون کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔ ہاشمی نے فوراً اس کی نبض پر اُنگلیاں رکھیں۔ نبض خاموش تھی۔ اُس کا سینہ جو آہستہ آہستہ اُٹھ اور بیٹھ رہا تھا، ساکت ہو گیا تھا۔ میجر بھاٹیہ دیکھ رہا تھا۔ اُس نے جھک کر اُس کی دوسری کلائی پر اُنگلیاں رکھیں۔ اُس نے ہاشمی کو اور ہاشمی نے اُس کو دیکھا۔

"اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں"— ہاشمی نے ایسی آواز میں کہا جس میں نقاہت نہیں تھی۔ اُس نے پوچھا — "اس کی میّت کا کیا بنے گا؟"

"یہ ہمارا کام ہے"— میجر بھاٹیہ نے بغیر کسی افسوس اور تأسف کے کہا — "تم یہ سوچ لو کہ یہی انجام تمہارا ہو گا اور کوئی پوچھنے والا بھی نہ ہو گا کہ ان دونوں لاشوں کا کیا بنے گا"۔

"اب مجھے اپنے انجام کا کوئی غم نہیں"— ہاشمی نے کہا اور اپنی بیوی کی لاش کی طرف اشارہ کر کے بولا — "یہ ایک زنجیر تھی جس نے مجھے پابجولاں کر رکھا تھا۔ اللہ نے یہ زنجیر اُتار دی ہے .... تم مجھے اس انجام سے ڈراتے ہو! ہم مسلمان اس انجام کے لئے دعائیں مانگا کرتے ہیں۔ یہ سرخرو ہو گئی ہے۔ یہ تو جسم ہے، اسے جہاں چاہو پھینک دو۔ میں ایسی ہی موت کا خواہشمند ہوں۔ میری بیوی کو اللہ نے اپنے حضور بلا کر مجھے دلیر اور آزاد کر دیا ہے"۔

"واپس چلو"— میجر بھاٹیہ نے ہاشمی کو زور سے دھکا دیتے ہوئے کہا۔ اس دھکے سے ہاشمی دروازے تک پہنچ گیا۔ اُس نے مُڑ کے دیکھا اور دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھا دیئے۔ خلافِ توقع میجر بھاٹیہ نے اُسے فوراً باہر نکلنے کو نہ کہا اور وہ کبھی ہاشمی کو اور کبھی اُس کی بیوی کی میّت کو دیکھنے لگا۔ ہاشمی نے کچھ دیر دعا پڑھی اور مُنہ پر ہاتھ پھیرے۔

"میری رفیقہ!"— ہاشمی نے بلند آواز سے کہا — "میں انشاء اللہ جلدی تمہارے پاس آجاؤں گا"۔

میجر بھاٹیہ ابھی کمرے میں ہی کھڑا تھا کہ ہاشمی دروازے سے ہٹ کر اپنے سیل کی طرف چل پڑا۔

❄

اگلے روز میجر بھاٹیہ، کرنل اُوجھا اور ایک بریگیڈیئر اپنے چیف کے دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ بریگیڈیئر نے چیف کو جو میجر جنرل تھا، رپورٹ دی تھی کہ ہاشمی کی بیوی مر گئی ہے۔

"اُس سے کچھ حاصل ہوا؟"— اس ہندو میجر جنرل نے میجر بھاٹیہ سے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں سر!"— میجر بھاٹیہ نے جواب دیا۔

"اس ناکامی کی کوئی وجہ؟"— چیف نے پوچھا — "میرا خیال ہے کہ تم نے اُسے عورت سمجھ کر رویّہ نرم رکھا ہو گا"۔

"نہیں سر!"— میجر بھاٹیہ بولا — "آپ کو شاید یقین نہ آئے۔ میں نے اس عورت کو اتنا ہی ٹارچر کیا ہے جتنا اس کے خاوند کا ہو رہا ہے یا ہم کسی بھی مرد کا کیا کرتے ہیں۔ اگر میرا رویّہ نرم ہوتا تو یہ مر نہ جاتی"۔

"حیرت ہوتی ہے سر!"— بریگیڈیئر نے کہا — "اتنی سخت جان عورت میں نے کم ہی کبھی دیکھی ہے۔ اسے کیا کہنا چاہیئے؟"

"میں تو اسے وِل پاور کہوں گا"— چیف نے کہا — "لیکن یہ بیوقوف قوم اسے ایمان کی قوت کہا کرتی ہے"۔

"ایمان اور اسلام کا نعرہ لگا کر آپ ان مسلمانوں سے جو چاہیں کرا سکتے ہیں" — کرنل اوجھا نے کہا۔

"بڑی اُلٹی قوم سے پالا پڑا ہے" — چیف نے کہا — "بہتر تھا کہ ۱۹۴۷ء میں ہی تمام مسلمانوں کو پاکستان کی طرف دھکیل دیا گیا ہوتا۔ دوسری بیوقوف اور اکھڑ قوم سکھوں کی ہے۔ سالوں نے مصیبت کھڑی کر رکھی ہے ....۔ دوسرے دو کیا کہتے ہیں؟ کیا نام ہیں اُن کے؟ ..... عبدالقدیر اور ہاشمی"۔

"بدبخت پتھر بنے ہوئے ہیں" — بریگیڈیئر نے جواب دیا۔

"میرا خیال ہے" — چیف نے کہا — "کہ ان دونوں کے خلاف جاسوسی، تخریب کاری اور اپنی حکومت کے خلاف منافرت پھیلانے کے الزام میں مقدمہ عدالت میں پیش کر دیا جائے اور عزیزہ کے قتل کی تفتیش جاری رکھی جائے۔ عبدالقدیر اور ہاشمی جس علاقے میں رہتے ہیں اس میں اپنے مخبر مقرر کر دیئے جائیں .... اور ہاں، جمیل کو ہم نے چھوڑ تو دیا ہے، لیکن اسے زیرِ نگرانی رکھنا بہت ضروری ہے"۔

"سر!" — بریگیڈیئر نے چیف سے پوچھا — "اس عورت کی لاش کا کیا کریں؟"

"کسی نے مجھے بتایا تھا کہ ہاشمی اور اس کی بیوی کا کوئی رشتہ دار نہیں؟" — چیف نے کہا۔

"یس سر!" — بریگیڈیئر نے کہا — "یہ معلوم کر لیا گیا تھا۔ پیچھے ان کا کوئی نہیں"۔

"پھر کیا مشکل ہے؟" — چیف نے کہا — "تم جانتے ہو کہ ہم نے یہ ظاہر کرنا ہی نہیں کہ ہم نے اس عورت کو شاملِ تفتیش کر کے یہاں بند کر رکھا تھا"۔

"لاوارث قرار دے کر آج رات کہیں دفن کر دیں؟" — بریگیڈیئر نے پوچھا۔

"نہیں بھائی!" — چیف نے ہنستے ہوئے کہا — "یہ عورت زندہ تو ہمارے کام نہ آئی، مر کر تو کام آسکتی ہے۔ اس کی لاش کسی میڈیکل کالج کو دے دو۔ سٹوڈنٹس کے کام آئے گی"۔

اُسی روز ہاشمی کی بیوی کی لاش ایک پھٹی پرانی چٹائی میں لپیٹ کر دلی کے ایک میڈیکل کالج میں بھیج دی گئی۔

❄

اُدھر سرحد پار ایک مسلمان عورت اسلام کی بقا اور پاکستان کی سلامتی کی خاطر اسلام اور پاکستان کے دشمن کی درندگی کا شکار ہو گئی۔ اُس نے اپنی وسیع و عریض حویلی میں پردہ نشین ہو کر باوقار زندگی گزاری تھی۔ وہ ایسی موت مری جسے انڈین انٹیلی جنس والوں نے بے وقار موت سمجھا ہو گا لیکن ایک مسلمان کی نگاہ میں یہ موت نہیں شہادت تھی جو اللہ تعالیٰ کو بہت عزیز ہے۔

رشی کو جب اغوا کر کے ہاشمی کی حویلی میں رکھا گیا تھا تو ایک روز ہاشمی کی بیوی رشی کے پاس جا بیٹھی تھی۔

"یہ ہمارے اُن آباؤ اجداد کی حویلی ہے جو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں انگریزوں کے خلاف لڑے تھے" — ہاشمی کی بیوی نے رشی سے کہا تھا — "وہ تم جیسے یا تمہارے والدین جیسے غداروں کی وجہ سے شکست کھا گئے تھے۔ میرے اور میرے خاوند کے آباؤ اجداد میں سے کچھ تو لڑتے ہوئے شہید ہو گئے تھے اور ایک دو کو سرِعام پھانسی دی گئی تھی۔ ان سب کی روحیں اس حویلی میں موجود ہیں۔ میں ان کی موجودگی محسوس کرتی رہتی ہوں۔ پھر یہ حویلی انگریزوں، سکھوں اور ہندوؤں کے ہاتھوں لُوٹی بھی گئی تھی"۔

ہاشمی کی بیوی نے رشی سے یہ بھی کہا تھا — "۱۸۵۷ء میں پورے کا پورا دلی شہر لُوٹا گیا تھا اور سینکڑوں نہیں ہزاروں مسلمان لڑتے ہوئے یا بعد میں درختوں سے لٹکا کر یا توپوں کے آگے باندھ کر

شہید کئے گئے تھے۔ وہ شہید مرے نہیں۔ ہم نے انہیں زندہ رکھا ہُوا ہے۔ انہی شہیدوں کے صدقے ہم نے پاکستان بنایا۔ آج تم اپنے خاوند کے ساتھ اُس پاکستان سے غداری کرنے آتی ہو جس کی بنیادوں میں دِلی کی اس حویلی کے رہنے والوں کا خون شامل ہے ..... ہم اب بھی لڑ رہے ہیں۔ اب ہمارا دشمن انگریز نہیں ہندو ہے۔"

اُدھر انڈین انٹیلی جنس رابی کی برین واشنگ کر رہی تھی، اِدھر ہاشمی کی بیوی نے تھوڑی سی دیر میں رِشی کی برین واشنگ کر دی تھی۔ اس رِشی نے راشدہ بن کر اپنے ملک کے دشمن کے ایک درجن سے زیادہ ایجنٹ پکڑوا دیئے۔

اس عظیم خاتون کی لاش دِلی کے ایک میڈیکل کالج کے ایک کمرے میں میز پر پڑی تھی۔ اس کا سینہ چیر کر کھول دیا گیا تھا۔ اُس کا پیٹ چاک کر دیا گیا تھا۔ اس کی کھوپڑی کھول کر دماغ الگ رکھا ہُوا تھا اور ایک انڈین کرسچین پروفیسر لاش کے اردگرد کھڑے لڑکوں اور لڑکیوں کو لیکچر دے رہا تھا۔

ہاشمی کی بیوی کی لاش خاموش تھی۔

اُس کی رُوح اُس حویلی میں چلی گئی تھی جو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے شہیدوں کی روحوں کا مسکن تھا۔

اُس خاتون نے اپنی جان دے کر ایک روایت کو زندہ کر دیا تھا۔

اُس وقت جب دِلی کی ایک خاتون کو انڈین انٹیلی جنس کے ٹارچر سیل میں غیر انسانی ایذارسانی کا نشانہ بنایا جا رہا تھا اور اُس وقت بھی جب اسلام اور پاکستان کی خاطر جان قربان کرنے والی اس خاتون کی لاش کو ایک انڈین میڈیکل کالج میں چیرا پھاڑا گیا تھا، پاکستان کی فضا میں انڈین فلموں کے گانے اور مکالمے تیر رہے تھے اور بند کمروں میں پاکستان کے نونہال وی سی آر پر بلیو فلمیں دیکھ رہے تھے۔ ڈسکو

میوزک پر پاکستانی نوجوان پاگلوں کی طرح ناچ رہے تھے۔

اُس وقت بھی انڈیا کی سیکرٹ سروس "را" پاکستان میں سرگرم تھی۔

اُس وقت جب رابی کا باپ اکلوتے اور جوان بیٹے کو جاسوسی کے جُرم میں آئی ایس آئی کے حوالے کر کے دل کے عارضے میں مبتلا ہو گیا تھا، پاکستان کے کئی جوان بیٹے ہیروئن اور انگلش میوزک کے نشے میں بدمست ہو رہے تھے اور اپنے دشمن کے کام کا خام مال بن رہے تھے۔

اُس وقت بھی جب عبدالقدیر اور ہاشمی اسلام اور پاکستان کے نام پر زندہ لاشیں بن گئے تھے، پاکستان میں سیاسی لیڈر اقتدار کے نام پر ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریباں ہو رہے تھے۔

اُس وقت بھی جب ہاشمی کی بیوی کو ایذارسانی سے ادھ موا کر کے کہا جاتا تھا کہ کہو کہ تم پاکستان کے لئے کام کر رہی ہو اور وہ انکار کرتی تھی، پاکستان کے سپوت کلاشنکوفیں اُٹھائے بنکوں میں، پٹرول پمپوں اور لوگوں کے گھروں میں ڈاکے ڈال رہے تھے۔

انڈین انٹیلی جنس کے انٹروگیشن سنٹر میں مجاہدین کے لہو کے چراغ جل رہے تھے، ادھر پاکستان کی سڑکوں پر ٹائر جلائے جا رہے تھے جن سے سیاسی لیڈروں کے دلوں جیسا سیاہ کالا دھواں اُٹھ رہا تھا۔

❄

پاکستان میں آئی ایس آئی نے کئی جگہوں پر چھاپے مار کر خان صاحب کے رِنگ کے بیشتر افراد کو گرفتار کر لیا تھا۔ ان میں سے دو نے تین چار مزید آدمیوں کی نشاندہی کر دی تھی۔ یہ تمام افراد پاکستانی تھے۔

رات کے نو بج چکے تھے۔ رِشی اور اُس کی ماں ٹی وی سے

خبریں سُن رہی تھیں۔ دروازے کی گھنٹی بجی۔ نوکرانی باہر گئی اور اندر آکر اُس نے بتایا کہ ایک آدمی رِشی سے ملنے آیا ہے۔ رِشی کی بجائے اس کی ماں باہر گئی۔ تیس بتیس سال عمر کا ایک خوش لباس اور خوش شکل آدمی گیٹ کے باہر کھڑا تھا۔ قریب ہی اُس کی کار کھڑی تھی۔

"کرنل مرزا نے بھیجا ہے"۔۔۔ اس آدمی نے کہا۔۔۔ "مَیں آئی ایس آئی کا فوجی افسر ہوں۔ میجر عظمت میرا نام ہے"۔

"اندر آئیے نا!"۔۔۔ رِشی کی ماں نے کہا۔

وہ میجر عظمت کو ٹی وی لاؤنج میں لے گئی جہاں رِشی بیٹھی ٹی وی کی بجائے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میجر عظمت کو دیکھ کر وہ اُٹھی۔

"آپ ہیں مس رِشی!"۔۔۔ میجر عظمت نے والہانہ انداز میں کہا ۔۔۔ "مَیں میجر عظمت ہوں"۔۔۔ اُس نے بیٹھتے ہوئے کہا۔۔۔ "آپ نے پاکستان کی سلامتی کے لئے ایسا کام کیا ہے کہ آپ کو پاکستان کا سب سے بڑا اعزاز ملنا چاہیئے۔ آپ نے اپنی ازدواجی زندگی پاکستان پر قربان کر دی ہے"۔

"وہاں ہو کیا رہا ہے؟"۔۔۔ رِشی نے پوچھا۔۔۔ "کیا میرے خاوند نے تسلیم کر لیا ہے کہ وہ انڈیا کا جاسوس ہے؟"

"تسلیم کیوں نہ کرتا؟"۔۔۔ میجر عظمت نے کہا۔۔۔ "ثبوت اور شہادت آپ نے مہیّا کی ہے، باقی کام ہم نے کر لیا ہے۔ صرف رابی نے ہی نہیں، زینی نے بھی اقبالِ جرم کر لیا ہے۔ آج تک پندرہ آدمی گرفتار کئے جا چکے ہیں۔ گلبرگ والے خان صاحب کے اقبالی بیان پر اِن سب کو گرفتار کیا گیا ہے۔ اب تو ان کے خلاف مقدمہ تیار ہو رہا ہے"۔

"رابی کو کتنی سزا ملے گی؟"۔۔۔ رِشی کی ماں نے پوچھا۔

"عمر قید"۔۔۔ میجر عظمت نے جواب دیا۔۔۔ "وہ بوڑھا ہو کر جیل

سے نکلے گا"۔

"کیسے میجر عظمت!"۔۔۔ رِشی نے پوچھا۔۔۔ "کیسے آنا ہُوا؟"

"کرنل مرزا صاحب اسلام آباد سے آئے ہیں"۔۔۔ میجر عظمت نے جواب دیا۔۔۔ "وہ اسی کیس کے سلسلے میں آئے ہیں۔ علی الصبح واپس چلے جائیں گے۔ آپ سے انہوں نے کچھ پوچھنا ہے۔ وہ خود یہیں آجاتے لیکن اُن کے پاس وقت تھوڑا اور کام زیادہ ہے۔ آپ صرف آدھے گھنٹے کے لئے میرے ساتھ چلیں پھر میں آپ کو واپس چھوڑ جاؤں گا"۔

"مَیں ساتھ چلتی ہوں"۔۔۔ رِشی کی ماں نے کہا۔

"نہیں آنٹی!"۔۔۔ میجر عظمت نے کہا۔۔۔ "کرنل مرزا نے خاص طور پر کہا تھا کہ رِشی اکیلی آئیں۔ انٹیلی جنس کا معاملہ ہے۔ مجھ پر بھروسہ کریں۔ رِشی میری بہن ہیں"۔

"ہاں ممّی!"۔۔۔ رِشی نے ماں سے کہا۔۔۔ "آپ گھر رہیں، مَیں ان کے ساتھ چلی جاتی ہوں"۔

رِشی پردہ نشین یا گھریلو لڑکی تو نہیں تھی۔ وہ لڑکوں کے ساتھ گھومتے پھرتے اور شامیں باہر گزارتے جوان ہوئی تھی۔ کسی غیر مرد کے ساتھ باہر جانے میں وہ جھجک محسوس نہیں کرتی تھی۔ اس کے علاوہ آئی ایس آئی کے ساتھ رابطہ قائم ہونے کی وجہ سے اُس میں خود اعتمادی پیدا ہو گئی تھی۔ یہ بڑی اچھی اور صحت مند خود اعتمادی تھی جس نے اُسے نڈر بنا دیا تھا۔ وہ میجر عظمت کے ساتھ چلی گئی۔ اُس کے ساتھ اُس کی کار میں اگلی سیٹ پر بیٹھی اور کار رِشی کی ماں کو کوٹھی کے گیٹ پر کھڑا چھوڑ کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

❄

کار دو تین موڑ مڑ کر گلبرگ کی ایک تنگ سی سڑک پر چلی گئی جہاں ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ رفتار سُست ہونے لگی۔ سڑک کے کنارے دو آدمی کھڑے تھے۔ کار ان کے قریب جا کر رُک گئی۔

"آ گئے میجر عظمت!" — ان دونوں میں سے ایک نے سٹیرنگ کی طرف والے دروازے کے قریب آ کر کہا — "ہیلو مس رشی!"

"آؤ بھائی آؤ" — میجر عظمت نے کہا — "کم آن۔ جمپ اِن۔ کرنل مرزا انتظار کرتے ہوں گے۔"

دونوں کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ رشی نے دونوں کو ہیلو ہیلو کہا۔

"دونوں آئی ایس آئی میں ہیں" — میجر عظمت نے کہا — "کیپٹن افتخار اور کیپٹن مجید۔"

میجر عظمت اِن کا مزید تعارف کرا رہا تھا اور پیچھے بیٹھے ہوئے دو آدمیوں میں سے ایک جیب میں سے رومال نکال کر ایک شیشی میں سے دوائی سی رومال پر چھڑک رہا تھا۔

"یہ بُو کیسی ہے؟" — رشی نے پوچھا۔

پیچھے سے تہہ کیا ہُوا رومال اُس کی ناک پر آ پڑا اور ایک ہاتھ نے رومال کو اُس کی ناک پر دبا لیا۔ پیشتر اِس کے کہ رشی سمجھ پاتی کہ یہ کیا ہُوا ہے، وہ بیہوش ہو چکی تھی۔ اُس کی ناک پر رومال رکھنے والے آدمی نے اُسے ایک طرف لڑھکا دیا۔

"نہیں یار!" — دوسرے نے کہا — "اِسے پچھلی سیٹ پر کھینچ لو.... رومال باہر پھینک دو۔ گاڑی کلوروفارم کی بُو سے بھر گئی ہے۔ گاڑی کے شیشے نیچے کر دو۔"

پیچھے والے دونوں آدمیوں نے چلتی گاڑی میں رشی کو اُٹھا کر پچھلی سیٹ پر کر لیا۔ رشی کی ٹانگیں ایک آدمی کی گود میں اور سر دوسرے آدمی کی گود میں تھا۔ کار اب راوی کی طرف جا رہی تھی۔

کار چلانے والا آدمی میجر نہیں تھا اور اُس کا نام عظمت نہیں تھا۔ پیچھے بیٹھے ہوئے دونوں آدمی کیپٹن نہیں تھے اور ان کے نام افتخار

اور مجید نہیں تھے۔ وہ انڈین سیکرٹ سروس کے پاکستانی ایجنٹ تھے۔ انہیں نئی دِلّی سے حکم ملا تھا کہ رشی کو اغوا کر کے ایسا لاپتہ کیا جائے کہ اِس کا سراغ نہ ملے۔

اس کا ایک طریقہ قتل ہو سکتا تھا لیکن لاش غائب کرنا ایک مسئلہ تھا۔ قتل کا طریقہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ رشی کے گھر جا کر اُسے گولی مار دی جاتی لیکن پکڑے جانے کا خطرہ تھا۔ پاکستان میں قتل کی وارداتیں تو ہوتی ہی رہتی ہیں اور بہت کم قاتلوں کا سراغ ملتا ہے لیکن اِن تین آدمیوں میں سے ایک رشی کو قتل یا زندہ لاپتہ کرنے کی بجائے اُسے کیش کرنا چاہتا تھا۔

"علاقہ غیر سے میں اتنا واقف ہوں جتنا میں اپنے علاقے سے بھی واقف نہیں" — اُس نے اپنے ساتھیوں سے کہا تھا — "یہ بڑی قیمتی لڑکی ہے۔ کم از کم ایک لاکھ میں نکل جائے گی، خدا کی قسم، اسے سعودی عرب یا مڈل ایسٹ کے کسی بھی ملک میں لے جا سکیں تو عربی شہزادے اور شیخ پانچ لاکھ کی بولی دیں مگر مجبوری ہے۔ میں اسے پٹھانوں کے علاقہ غیر تک لے جا سکتا ہوں۔"

"بات تو تمہاری ٹھیک ہے" — اُس کے ایک ساتھی نے کہا — "لیکن ڈر ہے کہیں پھنسا دو گے۔"

"کیا بات کرتے ہو یار!" — اُس نے کہا — "طورخم سے دِلّی تک ہیروئن پہنچاتا رہا ہوں۔ وہاں سے وہاں تک چیکنگ کرنے والے میری صورت دیکھ کر مُنہ دوسری طرف کر لیتے ہیں۔ انہیں اِن کا حق باقاعدہ ملتا رہا ہے.... ارے بھائی! جس ملک کے وزیر اور حاکم یہ کاروبار کرتے ہوں وہاں ڈر کس کا؟ انہی کے لئے تو میں یہ کام کرتا رہا ہوں۔"

"لے جاؤ گے کہاں؟"

"یہ مجھ پر چھوڑ دو" — اُس نے جواب دیا — "ہم براہِ راست کسی گاہک کے پاس نہیں جا سکتے۔ ہم تیسری پارٹی کے پاس جائیں گے۔ علاقہ غیر

ہیں ایسے آدمی موجود ہیں جو لڑکیاں خرید کر آگے چلا دیتے ہیں۔ اِس لڑکی جیسی تعلیم یافتہ اور تہذیب یافتہ اور دلکش لڑکیاں مڈل ایسٹ لے جا کر بیچی جاتی ہیں۔۔۔ تم دونوں میرے ساتھ چلو گے۔ اِن راستوں اور منزلوں سے بھی تم واقف ہو جاؤ گے اور پچاس ہزار نہیں تو چالیس چالیس ہزار روپیہ ہم تینوں کی جیبوں میں ہو گا۔"

تینوں نے یہ پروگرام طے کر کے رِشی کو اغوا کیا تھا۔

کار لاہور سے نکل گئی۔ اُس کی رفتار نوّے میل فی گھنٹہ تھی۔ یہ تینوں صبح طلوع ہونے سے پہلے پشاور تک پہنچ جانے کی کوشش میں تھے۔

❋

"میجر عظمت" رِشی کی ماں کو یہ کہہ کر رِشی کو لے گیا تھا کہ آدھ گھنٹے تک اُسے واپس لے آئے گا، ماں انتظار کرتی رہی۔ ایک گھنٹہ گزر گیا، پھر دو گھنٹے گزر گئے۔ تب ماں کچھ پریشان ہونے لگی۔ اُس کے پاس کرنل مرزا کا لاہور کا فون نمبر تھا۔ اُس نے یہ نمبر ڈائیل کیا۔

کسی نے ریسیور اُٹھایا اور ہیلو کہا۔

"کرنل مرزا صاحب سے بات کرنی ہے" — رِشی کی ماں لے کہا۔

"وہ تو راولپنڈی میں ہیں جی!" — اُدھر سے آواز آئی۔

"کیا وہ آج شام لاہور نہیں آتے تھے؟"

"نہ جی!" — اُسے جواب ملا — "میں ڈیوٹی این سی او بول رہا ہوں۔ وہ آتے تو مجھے ضرور علم ہوتا۔"

"کیا اُن کا پنڈی کا فون نمبر آپ کو معلوم ہے؟"

"آپ دو نمبر نوٹ کر لیں" — رِشی کی ماں کو جواب ملا — "ایک آفس کا ہے اور دوسرا اُن کے گھر کا۔"

رِشی کی ماں نے دونوں نمبر لکھ لئے اور کرنل مرزا کے گھر کا نمبر ملایا۔ کرنل مرزا سو گیا تھا۔ فون اُس کے پلنگ کے پاس سائیڈ ٹیبل پر رکھا تھا۔

اُس کی آنکھ کھلی اور اُس نے ریسیور اُٹھایا۔ رِشی کی ماں اُسے لاہور میں مل چکی تھی اور کرنل مرزا اُس کی اور رِشی کی اہمیت سے پوری طرح واقف تھا۔ اُس نے غنودگی کے عالم میں کہا — "ہیلو۔۔۔ کرنل مرزا۔"

"سلیمہ بول رہی ہوں کرنل صاحب!" — رِشی کی ماں نے کہا — "رِشی کی ممی۔۔۔ کیا آپ آج لاہور نہیں آتے تھے؟"

"نہیں تو!" — کرنل مرزا نے کہا — "کیوں؟ کیا بات ہے؟"

"آج رات نو بجے آئی ایس آئی کا ایک میجر آیا تھا" — رِشی کی ماں نے کہا — "میجر عظمت۔۔۔ اُس نے کہا کہ کرنل مرزا لاہور آئے ہوئے ہیں اور اُنہوں نے رِشی کو صرف آدھے گھنٹے کے لئے بلایا ہے۔ رِشی اُس کے ساتھ چلی گئی تھی۔"

"اُس کے ساتھ چلی گئی تھی؟" — کرنل مرزا کی غنودگی ختم ہو گئی۔ اُس نے اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا — "او مائی گاڈ۔۔۔ آپ نے اُسے اکیلے جانے ہی کیوں دیا تھا۔۔۔ نہیں مسز سلیمہ! لاہور آئی ایس آئی میں کوئی میجر عظمت نہیں ہے۔۔۔ گھبرائیں نہیں۔ میں اب سوؤں گا نہیں۔ آپ فون بند کر دیں۔ اپنا بُرا حال نہ بنائیں۔ میں آپ کو رِنگ کرتا ہوں۔"

کرنل مرزا نے رِشی کی ماں کو فون کیا اور اُس سے کار کا ماڈل، رنگ اور نمبر وغیرہ اور "میجر عظمت" کا حُلیہ، عمر، لباس وغیرہ پوچھنے لگا۔ رِشی کی ماں کار کا نمبر تو دیکھ نہیں سکی تھی، اُس نے جو کچھ دیکھا وہ بتا دیا۔

اِس کے بعد آئی ایس آئی کے ٹیلیفونوں کی لائنیں گرم ہو گئیں۔ راولپنڈی اور لاہور میں ہلچل بپا ہو گئی۔ آئی ایس آئی کے چیف کو بھی جگا کر اطلاع دے دی گئی۔ رِشی کوئی عام لڑکی نہیں تھی کہ اُس کی ماں کو کہہ دیا جاتا کہ اپنے علاقے کے تھانے میں چلی جاتے۔ رِشی آئی ایس آئی کی لڑکی تھی اور جاسوسی کے اِس محکمے نے جو رِنگ پکڑا تھا، اس کے کیس میں رِشی کی پوزیشن کو بڑی ہی اہمیت حاصل تھی۔ اِس اہمیت کے علاوہ رِشی نے جو کارنامہ سرانجام دیا تھا، اِس نے آئی ایس آئی کے اور ڈیفنس کے اعلیٰ

حکام کے دلوں میں بڑا اونچا مقام حاصل کر لیا تھا۔ اُس کے لاپتہ ہو جانے کو وہ یوں سمجھ رہے تھے جیسے اُن کی بیٹی لاپتہ ہو گئی ہو۔

رات ہی رات لاہور پولیس سے شہر کی ناکہ بندی کرا دی گئی۔ سرحد کی ناکہ بندی کے لئے رینجرز کو چوکس کر دیا گیا۔ آئی ایس آئی نے یہ سوچا ہی نہیں کہ رِشی کو کسی اور نے اغوا کیا ہو گا۔ یہی ایک شُبہ یقین کی صورت میں سامنے رکھ لیا گیا کہ رِشی کو انڈیا کی سیکرٹ سروس نے اغوا کرایا ہے۔

کراچی، حیدر آباد اور سندھ کے دوسرے شہروں کی پولیس اور چھاؤنیوں کی ملٹری پولیس کو بھی احکام دے دیتے گئے کہ کراچی کی طرف جانے والی ہر کار کو چیک کریں اور چیکنگ بڑی سخت ہو۔ صوبہ سرحد کے قبائلی علاقے کی طرف جانے والی سڑکوں پر بھی چیکنگ کے احکام دے دیتے گئے۔

یہ انتظامات ایسے نہ تھے جو فوراً ہو جاتے۔ خاصا وقت تو آئی ایس آئی کے بڑے افسروں کی آپس کی بات چیت میں صرف ہو گیا پھر دُور کے شہروں کے ساتھ ٹیلیفون سے رابطہ قائم کرتے کرتے رات گزر گئی۔ اُس وقت رِشی کو لے جانے والی کار پشاور شہر کے باہر سے کوہاٹ کی طرف جانے والی سڑک پر دوڑی جا رہی تھی۔

یہ کار جب نوشہرہ کے قریب پہنچی تھی تو رشی ہوش میں آ گئی تھی کلوروفام کا اثر اُتر گیا تھا۔ اُسے اُٹھا کر بٹھا دیا گیا تھا۔ اُس نے پہلے تو کار میں دیکھا۔ اُسے رات والے تین آدمی نظر آتے۔ پھر اُس نے باہر دیکھا تو اُسے پہاڑ دکھائی دیتے۔

یہ رِشی کا دوسرا اغوا تھا۔ اِسی طرح وہ دِلی میں اغوا ہوئی تھی۔ فرق یہ تھا کہ وہاں اُسے بیہوش نہیں کیا گیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ رونے، چیخنے اور منت سماجت کرنے سے کچھ حاصل نہ ہو گا سوائے اس کے کہ اذیت میں اضافہ ہو گا۔

"پوری طرح ہوش میں آ گئی ہو؟" ــــ رِشی کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہُوئے ایک آدمی نے اُس سے پوچھا ــــ "سر میں گرانی یا کوئی تکلیف تو نہیں؟"

"تم نے مجھے کچھ سونگھایا تھا" ــــ رِشی نے کہا ــــ "اِس دوائی کے اثرات ابھی سر میں باقی ہیں .... پوچھنا بیکار ہے۔ کیا بتا سکتے ہو ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"ہم نوشہرہ سے گزر رہے ہیں" ــــ اُسے جواب ملا ــــ "خاموشی سے بیٹھی رہو گی تو ٹھیک رہو گی۔ ہمیں پکڑوانے کے لئے شور مچاؤ گی تو باقی عمر پچھتاتی رہو گی۔ ہم ناشتے کے لئے گاڑی روک رہے ہیں۔"

انہوں نے نوشہرہ شہر سے نکل کر کار روکی تھی اور ایک آدمی نہایت معمولی سے ایک ہوٹل سے چائے اور مکھن بند لے آیا تھا۔ رِشی نے اطمینان سے ناشتہ کیا تھا۔ پھر کار چلی اور پشاور سے کوہاٹ کی طرف روانہ ہو گئی۔

❄

رِشی ناشتے کے بعد خاموش رہی۔ اُسے سر میں گرانی محسوس ہو رہی تھی جس میں آہستہ آہستہ کمی آ رہی تھی۔ کار پشاور اور کوہاٹ کے درمیان پہاڑی علاقے میں سے گزر رہی تھی۔

"کیا تم لوگ انڈین انٹیلی جنس کے آدمی ہو؟" ــــ رِشی نے پوچھا۔

"یہ خیال تمہیں کیوں آیا ہے؟"

"اگر انڈیا کے ایجنٹ نہیں ہو تو پھر بردہ فروش ہو گے" ــــ رِشی نے کہا۔

"بتا دو اسے!" ــــ کار چلانے والے نے کہا اور خود ہی بتانے لگا ــــ "ہم پاکستان کی حکومت کو اور تمہاری آئی ایس آئی کو بتانا چاہتے ہیں کہ انڈیا کی انٹیلی جنس پاکستان کی جڑوں میں اُتری ہوتی ہے۔ تم نے ہمارے آدمی پکڑوا کر زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی ہے۔"

"اِس کا مجھے افسوس تو نہیں"— رشی نے اطمینان سے کہا —"نہ اُس وقت افسوس تھا جب مَیں نے انڈیا کے جاسوسوں کو پکڑوایا تھا نہ اب افسوس ہے جب مَیں خود پکڑی گئی ہوں۔"

"تمہیں اِس کا کتنا انعام ملا ہے؟"

"خدا جانتا ہے"— رشی نے جواب دیا —"نہ مجھے انعام ملا ہے نہ مَیں نے یہ کام انعام کی خاطر کیا ہے۔ انعام خدا سے ملے گا۔"

"او بیوقوف لڑکی!"— کار چلانے والے نے کہا —"دیکھ لے خدا نے تجھے کیا انعام دیا ہے۔"

"مَیں ایسا خیال ذہن میں نہیں لا سکتی"— رشی نے کہا —"مَیں اپنے انجام سے بے خبر نہیں۔ تمہارے متعلق میں اپنے آپ کو کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں کر سکتی۔ تم تین جوان آدمی اور مَیں خوبصورت اور جوان لڑکی ....مَیں تم سے اچھے سلوک کی توقع نہیں رکھ سکتی۔"

"کیا ہمیں اتنا بدکردار سمجھتی ہو؟"— ایک نے پوچھا۔

"اپنے ملک کے غداروں کا بھی کردار ہوتا ہے؟"— رشی نے کہا— "تم تینوں پاکستانی ہو نا!"

تینوں نے قہقہہ لگایا جیسے رشی نے کوئی لطیفہ سنایا ہو۔ ساتھ بیٹھے ہوئے ایک آدمی نے اپنا بازو رشی کے گلے میں ڈال کر اُسے اپنی طرف کیا اور اپنا گال اُس کے گال کے ساتھ لگا دیا۔

"بالکل تازہ لڑکی ہو رشی!"— اِس آدمی نے کہا۔

رشی نے مزاحمت نہ کی۔ مزاحمت بیکار تھی۔ وہ تین آدمیوں کے قبضے میں تھی۔ ایک ہوتا تو شاید مقابلہ کرتی۔

شہروں اور علاقہ غیر کی طرف جانے والے راستوں کی ناکہ بندی کے احکام اتنی تیز رفتار سے نہیں آ رہے تھے جس رفتار سے کار جا رہی تھی۔

احکام پیچھے رہ گئے اور کار آگے نکل گئی۔ ان تینوں میں جو آدمی رشی

کا سودا کرنے اپنے ساتھیوں کو لایا تھا، سٹیئرنگ پر بیٹھ گیا تھا کیونکہ آگے کا راستہ اُسی کو معلوم تھا۔

کار کوہاٹ سے نکل گئی تھی اور بہادر خیل کی سُرنگ میں سے بھی نکل گئی۔ وہاں تک آئی ایس آئی کے احکام نہیں پہنچ سکتے تھے۔

❄

راولپنڈی میں آئی ایس آئی کے انٹیروگیشن سنٹر میں خان صاحب کے رِنگ کے جو آدمی بند تھے، وہ بڑے آرام میں تھے کیونکہ ان میں سے بیشتر نے اقبالی بیان دے دیئے تھے اور بعض نے مزید نشاندہیاں بھی کی تھیں لیکن اُن پر ایک بار پھر انٹیروگیشن کی مصیبت ٹوٹ پڑی۔ ان سے اب یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی کہ اغوا کرنے والے کون لوگ ہیں اور ان کے ٹھکانے کہاں ہیں۔

سب سے زیادہ بُرا حال خان صاحب کا کیا جا رہا تھا۔ اُس میں اب ذرا سی بھی اور اذیّت برداشت کرنے کی طاقت نہیں رہی تھی۔

"یہ تو بتائیں بات کیا ہے؟"— آخر خان صاحب نے پوچھا۔

"وہ لڑکی اغوا ہو گئی ہے جس نے تم سب کو پکڑوایا ہے۔"

"پھر وہ آپ کو زندہ نہیں مل سکے گی"— خان صاحب نے کہا۔

"مَیں پوچھ رہا ہوں اغوا کرنے والے کون ہیں۔"

"مَیں تو یہاں بند پڑا ہوں"— خان صاحب نے کہا —"اگر دِلّی سے اس لڑکی کو اغوا کرنے کا حکم میرے پاس آتا تو میں بتا سکتا کہ اُسے کس سے اغوا کرایا گیا ہے۔ اغوا کرنے والے زیادہ تر آدمی سندھ میں ہیں اُن کے ٹھکانے کراچی اور حیدرآباد میں ہیں جو میں نہیں جانتا۔"

"تم جنہیں جانتے ہو وہ بتا دو"— تفتیشی افسر نے کہا۔

"مَیں دو آدمیوں کے نام بتا سکتا ہوں"— خان صاحب نے کہا— "ان کے ٹھکانے مجھے معلوم نہیں۔"

"تمہیں سب کچھ معلوم ہے"— اُس پر مزید دباؤ ڈالا گیا —"اور تم سب کچھ اُگلو گے۔"

"مَیں سب کچھ اُگل چکا ہوں جناب!" — خان صاحب نے کہا — "چھپانے کے لئے میرے پاس کچھ بھی نہیں رہا۔ وہ تو ایسے ہی ہے کہ ایک آدمی کو قتل کرو خواہ ایک درجن آدمی مار ڈالو، پھانسی ایک ہی بار ملے گی۔ مجھے اسی اعتراف پر عمر قید مل جائے گی کہ مَیں انڈیا کا ایجنٹ ہوں اور ایک رِنگ کا لیڈر ہوں۔ اگر مَیں کچھ اعتراف چھپا لوں گا تو میری سزا میں کچھ کمی تو نہیں ہو جائے گی۔"

"ہو سکتا ہے کمی ہو جائے" — تفتیشی افسر نے کہا — "تم ان لوگوں کے ٹھکانے جانتے ہو۔"

"سر جی! مَیں نہیں جانتا۔" خان صاحب نے کراہتی ہوئی آواز میں کہا — "میری بات تحمل سے اور غور سے سُنیں۔ آپ خود انٹیلی جنس کے افسر ہیں۔ آپ کے ایجنٹ انڈیا میں موجود ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ایجنٹ ایک دوسرے پر اپنی اصلیت ظاہر نہیں کیا کرتے۔ میں ایسے رِنگ کا لیڈر ہوں جس کا اُن افراد کے ساتھ کوئی تعلق نہیں جو دھماکے کرتے ہیں یا دوسرے طریقوں سے تخریب کاری کرتے ہیں۔"

اُدھر خان صاحب کے دوسرے ساتھی بھی یہی جواب دے رہے تھے۔ انہوں نے اپنا اپنا رول بیان کر دیا تھا۔

"عالی جاہ!" — اِدھر خان صاحب کہہ رہا تھا — "آپ اس طرح تخریب کاروں کو نہیں پکڑ سکتے۔ مَیں آپ کو بتا چکا ہوں کہ اغوا والے بالکل الگ اور ہم سے بھی پوشیدہ ہیں۔ مَیں آپ کو یہ بتا دیتا ہوں کہ ایک تو آپ کی اپنی حکومت ہے جس کا دارالحکومت اسلام آباد ہے لیکن پاکستان میں ایک حکومت اور ہے جو انڈین انٹیلی جنس کی ہے۔ یہاں کا ہر بڑا شہر اس کا دارالحکومت ہے۔ یہ زمین دوز حکومت اتنی مضبوط ہے کہ کچھ سیاسی لیڈر اور کچھ امیر اور وزیر بھی دانستہ یا نادانستہ طور پر اس کے اشاروں پر چل رہے ہیں۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ سمگلروں کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے؟"

"مجھے معلوم ہے۔"

"کبھی اُن پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت کی ہے؟" — خان صاحب نے کہا — "مَیں معافی چاہتا ہوں، مَیں آپ سے باز پُرس نہیں کر رہا نہ مَیں طنزیہ یہ بات کہہ رہا ہوں۔ مَیں آپ کو کچھ بتا رہا ہوں۔ پاکستان جرائم کے لئے بڑی زرخیز زمین ہے۔ یہ انڈیا اور اسرائیل کے جاسوسوں کی جنت ہے۔ پاکستان کی سیاست نے ایسے حالات پیدا کر رکھے ہیں جو انڈیا کی سیکرٹ سروس کے لئے موزوں ہیں اور اس کے کام کو آسان بناتے ہیں۔ اقتدار میں آنے والی پارٹیوں کے بڑے لیڈر سمگلروں کی پشت پناہی کرتے ہیں اور بعض سمگلنگ کے لئے اپنے گروہ بنا لیتے ہیں۔ ان گروہوں میں انڈیا کے جاسوس بھی ہوتے ہیں جو پاکستان کے اپنے لیڈروں کی چھتری کے نیچے کُھلے بندوں آتے اور جاتے ہیں۔ کسی کو اغوا کرانا ہو تو انہی کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔ سرحد، رینجرز، بارڈر سیکورٹی فورس، چیک پوسٹیں وغیرہ ان کے راستے میں حائل نہیں ہو سکتیں۔ البتہ یہ سمگلر سرحدوں کے ان محافظوں کے فرائض میں حائل ہو جاتے ہیں۔ اگر اب یہ لڑکی اغوا ہو گئی ہے تو دُعا کریں کہ آپ کو واپس مل جائے۔ وہ پاکستان سے نکل گئی ہو گی۔"

رِشی بھی تو پاکستان میں ہی لیکن پاکستان کے جس خطے میں تھی، وہاں پاکستان کا قانون مجبور اور بے بس تھا۔ یہ تھا صوبہ سرحد کا قبائلی علاقہ۔ پاکستان کے قاتل اور ڈاکو اِس علاقے میں پہنچ جاتے تھے تو معلوم ہوتے ہوتے کہ وہ وہاں ہیں، پکڑے نہیں جاتے تھے۔ وہاں جا کر انہیں پکڑنے کی کوئی جرأت نہیں کرتا تھا۔ اسے آزاد علاقہ کہتے تھے اور اس کا ایک نام اور بھی تھا جو اس علاقے کے لئے اور پاکستان کے لئے بھی توہین آمیز تھا۔ یہ نام تھا "علاقہ غیر" یعنی غیروں کا علاقہ۔ ہمارے حکمران قائداعظمؒ کی رحلت کے بعد بھول گئے کہ اس علاقے کے لوگ بھی تحریکِ پاکستان میں شامل تھے اور پاکستان کی بنیادوں میں ان کا بھی خون پسینہ شامل ہے۔

یہ وہ خطہ تھا جس میں اس کے غیور قبائلیوں نے انگریزی راج قائم نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ ایک سو سال لڑتے رہے تھے۔ اِس خطے کی تاریخ

حریتِ اسلام کی قابلِ فخر اور قبائلی پٹھانوں کے خون سے لکھی ہوئی تاریخ ہے مگر یہ خطہ ہیروئن کی پیداوار اور سمگلنگ کے لئے مشہور ہُوا اور یہ خطرناک مجرموں کی پناہ گاہ بن گیا۔ چوری کی کاریں، اغوا کی ہوئی لڑکیاں، چوری کا مال وغیرہ اس خطے میں پہنچنے لگے — یہ ہمارے اقتدار پرست سیاسی لیڈروں کے اعمال کا نتیجہ تھا۔ ایک تو یہ خطہ ضائع ہُوا جو معدنیات سے بھرا پڑا تھا اور اس خطے کے لوگ جو پاکستان کی عسکری قوت تھے، وہ ضائع ہُوتے اور ان کا جو کردار ہُوا کرتا تھا وہ مجروح ہُوا۔

رِشی اس علاقے کے ایک کچے سے مکان میں تھی۔ یہ تین چار مکانوں سے الگ تھلگ ایک مکان تھا جس کے دو کمرے تھے۔ اس کے اُوپر مٹی کے بُرج سے بنے ہوتے تھے۔ یہ کوہاٹ سے بنوں کی طرف جانے والی سڑک سے تین ساڑھے تین میل دُور پہاڑیوں کے اندر تھا۔ کمروں کے آگے چھوٹا سا صحن اور صحن کی دیواریں تھیں۔ اس کے باہر دو بکریاں بندھی ہوتی تھیں۔

رِشی اس مکان کے ایک کمرے میں فرش پر بچھے ہوئے بستر پر بیٹھی تھی۔ صرف دو افراد اس مکان میں تھے۔ ایک بوڑھا آدمی تھا اور ایک بُڑھیا۔ بوڑھے کی عمر پچھتر برس سے کچھ زیادہ تھی اور بُڑھیا اس سے چار پانچ سال چھوٹی تھی۔ رِشی کو ایک ہی روز پہلے یہاں لایا گیا تھا۔ اس سے ایک روز پہلے اُسے ایک اور مکان میں لے گئے تھے جو اس مکان سے ذرا دُور تین چار مکانوں کے ساتھ تھا۔

انڈیا کے جس پاکستانی ایجنٹ نے رِشی کو یہاں لا کر بیچنے کا مشورہ دیا وہ ان جگہوں سے واقف تھا۔ یہاں کے لوگوں کے اصولوں سے بھی آگاہ تھا۔ متعلقہ آدمیوں کو بھی جانتا تھا اور وہ اُسے جانتے تھے۔ اُس کے پاس کوئی شناختی نشان بھی نہیں تھا ورنہ ایک کار اور ایک خوبصورت لڑکی کو ایسی جگہ ساتھ لئے پھرنا خطرے سے خالی نہ تھا جہاں کوئی قانون نہیں تھا۔ ان کا اپنا ایک زبانی قانون تھا اور کچھ اصول تھے۔ کار اور رِشی کو

کچھ قبائلیوں نے دیکھا تھا اور انہوں نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ کار میں بیٹھے ہُوئے تین آدمی پٹھان نہیں۔ اس علاقے میں ایسی وارداتیں ہوتی ہی رہتی تھیں کہ کسی سرکاری محکمے کے ایک دو آدمیوں کو پکڑ کر یرغمال بنا لیا اور پولیٹیکل ایجنٹ کو پیغام بھیج دیا کہ اتنے لاکھ روپیہ دو اور اپنے آدمی رہا کرا لو لیکن رِشی کے ساتھ بیٹھے ہوتے آدمیوں کو یرغمال بنانے کی کسی نے نہ سوچی۔

رِشی کو اُس آدمی کے گھر لے گئے جو لڑکیوں کی خرید و فروخت کا دلال تھا۔ اس دلال نے اُس آدمی کے ساتھ بات کرنی تھی جس نے رِشی کو خرید کر آگے چلانا تھا۔ یہ شخص اس علاقے کا مشہور سمگلر اور سوداگر تھا۔ وہ افغانستان سے لائی ہوئی لڑکیوں کو پاکستان اور انڈیا تک پہنچا چکا تھا۔

رِشی کو دلال تک پہنچایا گیا تو دلال نے بتایا کہ سوداگر بنوں میں ہے اور اُسے لڑکی دکھانے کے لئے یہاں لانا پڑے گا۔ رِشی کو بنوں تک ساتھ لے جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ کسی مغویہ کو گاڑی میں بٹھا کر کسی بھی شہر سے گزر جانا کوئی مشکل کام نہیں تھا لیکن مغویہ کو ساتھ لے کر کسی شہر میں کچھ دیر کے لئے قیام کرنے میں پکڑے جانے کا خطرہ تھا۔ اس مسئلے کو یوں حل کیا گیا کہ رِشی کو ایک بوڑھے پٹھان کے پاس چھوڑ دیا گیا جو اپنی بیوی کے ساتھ الگ تھلگ ایک مکان میں رہتا تھا۔ یہ بوڑھا اس دلال کا باپ تھا۔

قبائلی پٹھانوں میں یہ روایت چلی آ رہی تھی کہ وہ کسی نوجوان لڑکی یا کسی عورت کو اغوا کر کے لے جاتے تھے تو اُسے امانت سمجھتے اور خیانت کا اُن کے ذہن میں خیال بھی نہیں آتا تھا۔ انگریزوں کے دَورِ حکومت میں وہ کسی شہر سے کسی ہندو یا سکھ کی ایک دو جوان لڑکیاں اُٹھا لے جاتے اور ان کے عوض مُنہ مانگے پیسے لے کر انہیں اُن کے وارثوں کے حوالے کر دیتے تھے۔ اب بعض قبائلی بردہ فروشی کرنے لگے تھے لیکن انہوں نے

اپنی اِس روایت کو زندہ رکھا ہُوا تھا کہ مغویہ کو امانت سمجھتے تھے۔ مغویہ کو وہ پہلے بھی اپنی عورتوں کے حوالے کر دیتے تھے اور اب بھی وہ مغویہ کو مردوں سے دُور رکھتے تھے۔

بنوں جانے سے پہلے رِشی کو اسی روایت کے مطابق ولال نے اپنے ضعیف العمر باپ اور بوڑھی ماں کے حوالے کر دیا تھا۔ بوڑھے کے پاس دو رائفلیں اور قدیم زمانے کی ایک تلوار تھی۔

❄

رِشی کو اغوا کرنے والے بنوں گئے تو پتہ چلا کہ مطلوبہ آدمی رزمک کی طرف نکل گیا ہے اور کسی بھی دن اُس کی واپسی متوقع ہے۔ ان چاروں نے بنوں میں اس آدمی کے گھر میں انتظار کرنا بہتر سمجھا۔

پہلے روز اس بوڑھے پٹھان نے رِشی سے کہا کہ وہ یہاں سے بھاگنے کی کوشش نہ کرے ورنہ وہ پیدل چل چل کر مر جائے گی یا اُسے کوئی اور پکڑ کر لے جائے گا۔ بوڑھے نے اُسے بتایا کہ ان پہاڑوں کے اندر باہر کا کوئی آدمی آ جاتے تو وہ نکل نہیں سکتا۔ وہ بھٹک بھٹک کر مر جاتا ہے۔ بوڑھے نے اُسے یہ بھی کہا تھا کہ یہاں اُس کے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں ہو گی۔

رِشی مجبور تھی۔ اُس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی جاتی تو وہ کیا کر سکتی تھی۔ بوڑھے کی اس تسلی سے اُسے کچھ سکون محسوس ہُوا مگر اُسے یہ نہیں بتایا جا رہا تھا کہ اُس کی قسمت میں کیا لکھا ہے۔ رات کو بوڑھا اور بڑھیا سو گئے تو رِشی اُن کے خراٹے سُنتی رہی۔ اُسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ فرش پر اور ایسے فضول سے بستر پر وہ کبھی نہیں لیٹی تھی۔ وہ فائیو سٹار ہوٹلوں اور کوٹھیوں میں رہنے والی لڑکی تھی۔ وہ اپنی دنیا کی شہزادی تھی۔

کمرے میں لالٹین جل رہی تھی۔ اس کی بتی مدھم تھی۔ رِشی کو سوتے ہُوئے بوڑھے کے قریب پڑی ہوئی رائفل نظر آئی۔ اُسے خیال آیا کہ اس رائفل کی میگزین میں گولیاں ہیں۔ وہ آسانی سے اس بوڑھے اور بڑھیا کو

ایک ایک گولی مار کر یہاں سے بھاگ سکتی ہے لیکن اُس نے کوہاٹ سے آگے یہ علاقہ دیکھا تھا۔ اُسے احساس ہُوا کہ وہ اِس مکان سے نکل سکتی ہے، اِس علاقے سے نہیں نکل سکے گی۔

رِشی کو خدا یاد آیا۔ تب اُس کے آنسو نکل آتے۔ وہ تو سمجھتی تھی کہ رابی کو پکڑوا کر اُس نے اپنے ملک کے ساتھ بہت بڑی نیکی کی ہے اور پاکستان کو اللہ اور قرآن کی سرزمین کہا جاتا ہے، تو کیا خدا نے اُس کی یہ نیکی قبول نہیں کی؟..... نہیں کی ہو گی۔ اُسے اپنے گناہ یاد آنے لگے۔ اُسے یہ بھی یاد آیا کہ شادی سے پہلے وہ کنواری نہیں تھی۔ اُس کا دامن پاک نہیں تھا۔ اُس نے شراب بھی دو چار مرتبہ پی تھی۔ اُس کا باپ بھی گناہگار اور اُس کی ماں بھی گناہگار تھی۔

"خدا گناہوں کی سزا دیتا ہے"— اُسے خیال آیا —"تو وہ نیکی کا صلہ نہیں دیتا؟ کیا وہ توبہ قبول نہیں کرتا؟ ان جاسوسوں اور بردہ فروشوں کو خدا سزا کیوں نہیں دیتا؟"

یہ سزا اور جزا کا، نیکی اور بدی کا فلسفہ تھا جسے وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ اِس معاملے میں اُس کا ذہن کورا تھا۔ وہ انگریزی سکولوں میں پڑھی تھی۔ اپنے مذہب سے وہ ناواقف تھی۔ اُس کے آنسو نکل آتے اور وہ خدا کے تصوّر میں کھو گئی۔ نجات اور فرار کا کوئی راستہ نہ پا کر اُس نے اپنے آپ کو حالات کے سپرد کر دیا اور وہ سو گئی۔

❄

اُسے کسی نے نہ جگایا۔ اُس کی آنکھ کھُلی تو کمرے میں دھُوپ آ رہی تھی۔ وہ اُٹھی اور کمرے سے نکل گئی۔ بوڑھا اور بڑھیا صحن میں بیٹھے تھے۔ بوڑھے نے اُسے کہا کہ باہر چلی جاؤ۔ وہ سمجھ گئی۔ اس مکان میں کوئی اٹیچ باتھ روم نہیں تھا۔ وہ باہر نکل گئی۔ واپس آئی تو بڑھیا نے اُسے صحن میں چٹائی پر بٹھا لیا اور ایک چنگیر اُس کے آگے رکھ دی۔ اس میں مکئی کی روٹی تھی جس پر گھی لگا ہُوا تھا۔ بڑھیا نے مٹی کا ایک پیالہ اُس کے آگے رکھا۔

اس میں دُودھ تھا۔ یہ اُن بکریوں کا دُودھ تھا جو صحن میں بندھی ہوتی تھیں۔

"وہ کہاں چلے گئے ہیں؟" ــــ رشی نے ناشتے سے فارغ ہو کر پوچھا ــــ "واپس آئیں گے؟"

"ہاں!" ــــ بوڑھے پٹھان نے حُقّے کا کش لگا کر جواب دیا ــــ "وہ آجائیں گے۔ معلوم نہیں کب آئیں گے۔"

رشی خاموش ہو گئی۔ بوڑھا اُسے دیکھتا رہا۔ وہ اپنے لہجے میں صاف اُردو بولتا تھا۔

"تم مسلمان کی بچی ہو؟" ــــ بوڑھے نے رشی سے پوچھا ــــ "یا تمہارے ماں باپ کافر ہیں؟"

"مَیں مسلمان ماں باپ کی بیٹی ہوں" ــــ رشی نے جواب دیا۔

"تم کافر کی بچی لگتی ہو" ــــ بوڑھے نے کہا ــــ "تمہارے بال فرنگی عورتوں کی طرح کٹے ہوئے ہیں۔ تم سر ننگا رکھتی ہو۔ تم کافر نہیں تو مسلمان بھی نہیں۔"

"کیا تم اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے ہو؟" ــــ رشی نے کہا ــــ "کیا یہ طریقہ مسلمانوں کا ہے کہ دوسروں کی بیٹیوں کو اغوا کرتے ہو۔ اپنی عمر دیکھو پھر اپنے اعمال دیکھو کیا مجھے تم اس کا جواب دے سکتے ہو؟"

"مَیں نے تمہیں اغوا نہیں کیا" ــــ بوڑھے نے کہا ــــ "تم مسلمان نہیں۔ تمہیں اغوا کرنا کوئی گناہ نہیں۔"

"مَیں تم سے زیادہ مسلمان ہوں" ــــ رشی نے کہا ــــ "مَیں نے اپنے خاوند کو اپنے ملک پر قربان کر دیا ہے۔ میں نے اپنے ملک کے دشمن کے جاسوسوں کو پکڑوایا ہے۔ ہندو ہمارے دشمن ہیں۔ اُن کے جاسوس پاکستان میں موجود ہیں۔ مَیں نے پاکستان کو بڑے خطرناک جاسوسوں سے بچایا ہے .... لیکن بوڑھے بابا! تم میری اس بات کو نہیں سمجھ سکتے۔ تم نہیں جانتے کہ پاکستان اسلامی ملک ہے اور پاکستان شہیدوں کی سرزمین ہے .... نہیں، تم نہیں سمجھ سکتے۔ تم عورتوں کے سوداگر

ہو" ــــ رشی اچانک غصّے میں آگئی۔ اُس نے اُنگلی بوڑھے پٹھان کی طرف کر کے اور دانت پیس کر کہا ــــ "تم بوڑھے ڈاکو کیا جانو کہ ملک کیا ہوتا ہے۔ تم بے غیرت ہو۔ تم مجھے فرنگی کہتے ہو لیکن خود بہت بڑے قاتل ہو اور تم ...."

"بکواس بند کرو لڑکی!" ــــ بوڑھا اُچھل کر گرجا ــــ "مَیں تیس سال فرنگیوں کے خلاف لڑا ہوں۔ میرا ملک پاکستان ہے۔ تمہارے باپ دادا ہندوستان میں فرنگی کے غلام ہو گئے تھے لیکن ہم نے غلامی قبول نہیں کی اور ایک سو سال تک لڑتے رہے ہے۔"

یہ کہہ کر بوڑھے نے اپنی دونوں ٹانگیں لمبی کیں اور شلوار کے پائنچے اُوپر کو کھینچے۔ اُس کی ٹانگیں رانوں تک ننگی ہو گئیں۔

"یہ دیکھو" ــــ اُس نے اپنی دونوں ٹانگوں پر پانچ چھ جگہوں پر باری باری اُنگلی رکھ کر کہا ــــ "یہ فرنگی کی فوج کی گولیوں کے نشان ہیں" ــــ اُس نے اپنا بایاں بازو ننگا کیا اور رشی کو دکھا کر کہا ــــ "یہ سنگین کے زخم کا نشان ہے" ــــ اُس نے اپنی پیٹھ سے کُرتا اُوپر کھینچ کر پیٹھ رشی کی طرف کی۔ پیٹھ پر تقریباً آٹھ انچ لمبی لکیر سی تھی۔ یہ بھی زخم تھا۔ بوڑھے نے کہا ــــ "یہ بھی گولی کا زخم ہے۔ گولی پیٹھ کی کھال کو کاٹتی ہوئی آگے نکل گئی تھی۔ ذرا سی بھی نیچے ہوتی یا میری پیٹھ ذرا سی اور اُوپر ہوتی تو میں آج تمہیں یہ زخم دکھانے کے لئے زندہ نہ ہوتا۔"

یہ سب زخموں کے نشان تھے جن میں بعض بڑے ہی بھدّے تھے۔ بوڑھے کے مُرجھاتے ہوئے چہرے پر حرّیت کی رونق آگئی تھی۔

"تم نے مجھے بے غیرت کہا ہے" ــــ بوڑھے نے کہا ــــ "اور تم کہتی ہو کہ میرا کوئی ملک نہیں۔ تم نے مجھے ڈاکو کہا ہے۔ اب میری بات سنو۔ میرا باپ فرنگیوں کے خلاف لڑتا ہوا شہید ہوا تھا۔ مَیں ابھی تیرہ چودہ سال کا تھا جب میرا باپ مجھے لڑائی میں لے گیا تھا .... کیا تم نے کبھی سُنا نہیں کہ قبائلی علاقے کے پٹھان کس طرح انگریزوں کے خلاف

لڑتے رہے ہیں؟"

"ہاں!" — رشی نے کہا — "مَیں نے سُنا ہے لیکن زیادہ نہیں سُنا۔"

"میں تمہیں سناتا ہوں" — بوڑھے نے کہا — "انگریزوں نے ہندوستان کو فتح کر لیا تو وہ ہمارے اس علاقے کو بھی فتح کرنے کے لئے اپنی فوجیں لے آئے۔ یہ پچھلی صدی کی بات ہے۔ ہمارے باپ دادا نے ان فرنگیوں کو کہا کہ تم واپس چلے جاؤ۔ ہم تمہیں اپنے ملک کا بادشاہ نہیں بننے دیں گے۔ فرنگیوں کا خیال تھا کہ اُن کے پاس بہت زیادہ فوج ہے اور اُن کے پاس توپیں بھی ہیں۔ اُن کے پاس گھوڑوں کے رسالے بھی تھے۔ اِدھر ہمارے پاس پہلے پہل تلواریں تھیں۔ اس کے بعد رائفلیں آگئیں۔ بس تم یہ سمجھ لو کہ ہم نے پورے ایک سَو سال انگریزوں کی اتنی زیادہ فوج اور توپوں کا مقابلہ صرف رائفلوں سے کیا....

"فرنگی ہمارے گاؤں تباہ کر دیتا تھا۔ ہمارے بچے بھی مارے جاتے تھے، پھر بھی ہم فرنگی کے آگے ہتھیار نہیں ڈالتے تھے۔ ہم لوگ اُن چھاؤنیوں پر بھی شبخون مارتے تھے جو فرنگی نے صوبہ سرحد کے علاقے میں بنائی تھیں۔ اگر میں تمہیں پٹھانوں کی بہادری کا کوئی ایک بھی واقعہ سُنا دوں تو تم شاید یقین نہیں کرو گی کہ ہم اتنے زیادہ بہادر اور اس طرح اپنی غیرت پر جانیں دینے والے لوگ تھے۔ انگریز ہمیں بہت لالچ بھی دیتا تھا لیکن ہم اپنے ملک کا سودا کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔"

اس بوڑھے قبائلی پٹھان نے رشی کو صوبہ سرحد کے پٹھانوں خصوصاً قبائلی پٹھانوں کی داستانِ حریت کی صد سالہ تاریخ سنانی شروع کر دی۔ یہ پاکستان کی تاریخ کا ایک قابلِ قدر باب ہے۔ انگریزوں نے صوبہ سرحد کے قبائلی علاقے پر قبضہ کرنے کے لئے کم و بیش ایک سو سال تک فوج کشی جاری رکھی۔ ہندوستانی فوج کی زیادہ سے زیادہ نفری اس جنگ میں جھونکی۔

توپیں اور طیارے بھی استعمال کئے لیکن قبائلی پٹھانوں نے اپنی زمین کے ایک اِنچ پر بھی انگریزوں کا قبضہ نہ ہونے دیا۔

پٹھانوں کے جہاد کی یہ داستان بڑی لمبی اور ولولہ انگیز ہے۔ پاکستان میں چونکہ تاریخ نویسی کا رجحان ناپید ہے اس لئے قبائلی پٹھانوں کی داستانِ حریت وقت کے ساتھ ساتھ ذہنوں سے اُترتی جا رہی ہے۔ اس جہاد کے جو مجاہدین ابھی زندہ ہیں وہ تاریخ کے اس ولولہ انگیز باب کو اپنے ساتھ قبروں میں لے جائیں گے پھر وہی ہوگا — تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں!

"ہم پاکستان بننے تک لڑتے رہے" — بوڑھے پٹھان نے رشی کو یہ داستان سُنا کر کہا — "جناح بابا جب پشاور آتے تھے تو میں اُنہیں دیکھنے کے لئے وہاں گیا تھا۔ مَیں جناح بابا کو ملنا چاہتا تھا لیکن کسی نے ملنے نہ دیا۔ مَیں اُنہیں کہنا چاہتا تھا کہ یہ لو، ہم نے اتنا بڑا خطہ لڑ لڑ کر جانیں قربان کر کر کے فرنگی سے بچا کر رکھا ہُوا ہے، یہ ہم پاکستان کو دیتے ہیں.... تم بھی عورت ہو۔ ہماری بیٹیاں بھی تمہاری طرح عورتیں ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ تم اپنے آپ کو خوبصورت بنانے کی کوشش کرتی ہو کہ مرد تمہیں پسند کریں اور تمہارے حُسن کی تعریفیں کریں۔ اِدھر ہماری عورتیں مردوں کی طرح انگریزوں کے خلاف لڑتی رہی ہیں۔ اُن کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ مرد اُنہیں پسند کریں یا نہ کریں، اُنہیں جہاد میں شریک ہونے کا موقع دے دیں۔"

❄

"تم نے پاکستان کے لئے جو جہاد کیا ہے وہ تم نے سُنا دیا ہے" — رشی نے کہا — "لیکن اب تم اپنے جہاد پر مٹی ڈال رہے ہو۔ اگر اب بھی تمہارے دل میں پاکستان کی محبت ہے تو مجھ سے سُنو کہ میں نے پاکستان کے لئے کیسا جہاد کیا ہے۔ میں تمہیں اپنی زندگی کی ساری کہانی سُناتی ہوں پھر میں دیکھوں گی کہ تم میں کتنی غیرت ہے اور تم کتنے کچے مجاہد ہو۔"

رِشی نے اپنی کہانی وہاں سے شروع کی جہاں وہ لڑکوں کے ساتھ ڈِسکو ناچ ناچتی، انگریزی بولتی اور امریکہ کے آوارہ اور بے حیا طور طریقوں کو اپنا کلچر سمجھتی تھی۔ اُس نے رابی کے ساتھ شادی کا ذکر کیا پھر وہ اپنی اس روداد کو نئی دِلّی لے گئی۔ اُس نے عزیز کا ذکر بھی کیا۔ نئی دِلّی کے اشوکا ہوٹل سے کس طرح اُسے اغوا کیا گیا تھا، وہ تفصیل سے سُنایا۔ اُس نے ہاشمی کے گھر جو دن گزارے تھے، ہاشمی اور اُس کی بیوی نے اُس کے ساتھ جو باتیں کی تھیں، وہ سنائیں۔

"مجھے ایسے لگا جیسے مَیں مر گئی ہوں" — رِشی نے کہا — "پھر ایسے جیسے میں پھر زندہ ہو گئی ہوں مگر اب میں رِشی نہیں بلکہ راشدہ تھی، اور مجھے پہلی بار یہ احساس ہُوا کہ میں کسی کافر کی نہیں بلکہ ایک مسلمان کی بیٹی ہوں اور میں پاکستانی ہوں اور یہ ہندو میرے دشمن ہیں۔"

"آفرین!" — بوڑھے پٹھان نے پُرجوش انداز میں کہا — "میں ان لوگوں کی اُس حویلی کو سلام کرتا ہوں جس میں فرنگی کے خلاف لڑنے والے مجاہدین کی رُوحیں رہتی ہیں۔ تم ٹھیک کہتی ہو۔ ہندو مسلمان کا اور پاکستان کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ اگر تم مجھے کوئی ہندو دکھا کر یہ کہو کہ یہ پاکستان کے خلاف جاسوسی کرتا ہے تو میں اُسے اسی وقت گولی مار دوں گا۔"

"ایک نہیں" — رِشی نے کہا — "میں تمہیں تین جاسوس دکھا سکتی ہوں لیکن تم انہیں گولی نہیں مارو گے۔"

"کون ہیں وہ؟" — بوڑھے نے تڑپ کر پوچھا — "کہاں ہیں وہ؟"

"یہیں ہیں" — رِشی نے کہا — "یہ تین آدمی جو مجھے یہاں لاتے ہیں اور تمہارے حوالے کر گئے ہیں۔"

"تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ یہ جاسوس ہیں؟" — بوڑھے پٹھان نے پوچھا اور کہنے لگا — "انہوں نے مجھے بتایا ہے کہ تم مسلمان نہیں ہو۔"

"اگر تم میری پوری بات سُن لو تو خود ہی فیصلہ کر سکو گے کہ یہ جاسوس ہیں یا نہیں" — رِشی نے کہا — "اور تمہیں یہ بھی پتہ چل جائے گا کہ مَیں

مسلمان ہوں یا نہیں۔"

رِشی نے اُسے وہ تمام واقعات سُنائے جو اُسے دِلّی میں پیش آتے تھے۔ پھر لاہور آ کر اُس کے ساتھ رابی نے جو سلوک کیا اور گھر سے نکالا، وہ سنایا اور رابی کے باپ نے جس طرح رابی کو اور دوسرے جاسوسوں کو گرفتار کرایا، وہ تفصیل سے سُنایا۔

"کیا پاکستان میں ایسے باپ موجود ہیں؟" — بوڑھے پٹھان نے کہا — "اگر ہیں تو پھر ہندو پاکستان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

"ہاں، موجود ہیں" — رِشی نے کہا — "مجھے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ اِس باپ کو جو میرا سُسر ہے، اس صدمے سے دل کی تکلیف ہو گئی ہے .... کیا تم میری قربانی کا اندازہ نہیں کرتے؟ مجھے پتہ چلا تھا کہ میرا خاوند جاسوس ہے تو میں اُسے کہتی کہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے لو۔ مجھ جیسی لڑکیاں جاسوسی میں پوری طرح کامیاب ہوتی ہیں۔ ہم دونوں اتنی زیادہ دولت کما سکتے تھے کہ شہزادے شہزادی جیسی زندگی گزارتے لیکن مَیں مسلمان کی بچی بن گئی اور اپنا خاوند بھی قربان کر دیا اور اتنی زیادہ دولت بھی ٹھکرا دی بوڑھا قبائلی تھا تو اَن پڑھ لیکن وہ جانتا تھا کہ جاسوس کیا کیا کرتے ہیں۔ انگریزوں کے دورِ حکومت میں جب قبائلی پٹھان اپنے وطن کے دفاع میں گوریلا قسم کی جنگ لڑ رہے تھے تو انگریزوں نے انہی قبائلیوں میں سے اپنے جاسوس اور مُخبر پیدا کر لئے تھے۔ ان میں بعض مُخبر دوغلی جاسوسی کرتے تھے۔ پٹھانوں کو کسی کے متعلق پتہ چل جاتا کہ وہ فرنگیوں کا جاسوس ہے تو اُسے زندہ نہیں چھوڑتے تھے۔

"معلوم نہیں تم اعتبار کرو گے یا نہیں کہ میں نے تمہیں اتنی لمبی بات جو سنائی ہے یہ سچّی ہے یا مَیں جھوٹ بول رہی ہوں" — رِشی نے کہا — "مجھے یقین ہے کہ اِن تین آدمیوں نے مجھے انتقام کے طور پر اغوا کیا ہے۔ مجھے جاسوسوں کو پکڑنے والے محکمے کے افسروں نے کہا تھا کہ میں اکیلی باہر نہ نکلا کروں۔ اِن جاسوسوں کے خلاف مقدمہ چلے گا اور مَیں اس میں گواہ

پیش ہوں گی۔ مجھے اسی لیے اغوا کیا گیا ہوگا کہ میں عدالت میں پیش نہ ہو سکوں یہ انتقامی کارروائی بھی ہو سکتی ہے۔"

بوڑھے پٹھان کی رگِ حمیت پھڑک اُٹھی۔ اُس کے غصّے کا اظہار اس طرح ہُوا کہ وہ اپنے جسم کو جھٹکا دے کر اُٹھ کھڑا ہُوا اور سر جھکا کر لمبے ڈگ بھرتا ٹہلنے لگا۔ کچھ دیر ٹہل کر وہ رُک گیا اور اُس نے رشی کی طرف دیکھا۔ ایک لمبا قدم رشی کی طرف لے کر اُس نے رشی کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

"اگر تمہاری بات سچ نکلی تو یہ بھی سچ ہے کہ تم میری بیٹی ہو" ——— بوڑھے نے کہا ——— "اور یہ جھوٹ نکلا تو تمہیں بہت بُری سزا ملے گی۔"

"کیا تم میری مدد کرو گے؟" ——— رشی نے پوچھا۔

"مدد اللہ کرے گا" ——— بوڑھے نے کہا ——— "اور اللہ سچے انسانوں کی مدد کیا کرتا ہے۔"

"یہ بتا سکتے ہو کہ مجھے یہاں کیوں لاتے ہیں؟"

"بیچنے کے لیے" ——— بوڑھے قبائلی نے جواب دیا ——— "میرے پاس تمہیں امانت کے طور پر رکھا گیا ہے۔"

"میرا خریدار کون ہوگا؟"

"وہ بنوں گیا ہُوا ہے" ——— بوڑھے نے جواب دیا ——— "وہ یہاں آئے گا۔ تمہیں دیکھے گا پھر تمہارا سودا ہوگا اور وہ تمہیں لے جائے گا۔ پھر وہ تمہیں کسی امیر آدمی کے ہاتھ بیچے گا۔"

رشی گہری سوچ میں کھو گئی۔

❄

دن گزرا۔ رات بھی گزر گئی۔ رشی کو کچھ ایسا سکونِ قلب محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ یہاں اپنی مرضی اور خوشی سے دو چار دنوں کے لیے آئی ہے۔ بوڑھا قبائلی اُسے انگریزوں کے ساتھ لڑائیوں کے قصّے سناتا رہا تھا اُس نے اپنے زخمی ہونے کے واقعات بھی سُناتے تھے۔

دوسرے دن دس گیارہ بجے کے درمیان بوڑھے کا بیٹا اُن تینوں

کے ساتھ آگیا جو رشی کو یہاں لاتے تھے۔ بوڑھے کا بیٹا انہیں اپنے گھر لے جانے کی بجائے بوڑھے کے گھر لے آیا تھا۔ وہ رشی کو دیکھنا چاہتے تھے کہ اس نے بوڑھے اور بڑھیا کو پریشان تو نہیں کیا۔ وہ بنوں جس آدمی کے پاس گئے تھے، وہ رزمک گیا ہُوا تھا۔ پہلے تو وہ اُس کا انتظار کرتے رہے پھر ایک آدمی یہ اطلاع لایا کہ وہ چھ سات دنوں بعد آئے گا۔ یہ چاروں واپس آگئے۔

بوڑھا اپنے بیٹے کو باہر لے گیا۔

"طوطی خاناں!" ——— بوڑھے نے اپنے بیٹے سے پوچھا ——— "ان تینوں کو تم جانتے ہو؟"

"صرف ایک کو جانتا ہوں" ——— طوطی خان نے جواب دیا ——— "اس کا نام عادل ہے۔ خان گُلمست خان کا آدمی ہے۔ پکّا آدمی ہے۔ تین بار مال لے جا چکا ہے۔ دوسرے دو کو مَیں نے پہلی بار دیکھا ہے۔ انہیں عادل اس کام میں لگا رہا ہے۔"

"اس لڑکی کا مذہب کیا ہے؟" ——— بوڑھے نے پوچھا۔

"عادل کہتا ہے یہ عیسائی ہے" ——— طوطی خان نے جواب دیا۔

"یہ مسلمان ہے" ——— بوڑھے نے غصّے سے کہا ——— "اور یہ تینوں ہندوستان کے ہندوؤں کے جاسوس ہیں۔ طوطی خان میری پوری بات سُن لو۔ مَیں تمہیں یہ پہلے ہی کہہ دیتا ہوں کہ لڑکی واپس جائے گی۔"

بوڑھے نے اپنے بیٹے کو وہ باتیں مختصراً سنانی شروع کر دیں۔

"اگر لڑکی سچ بول رہی ہے تو مَیں اس لڑکی کو اپنے گھر سے باہر نہیں جانے دوں گا" ——— بوڑھے نے کہا ——— "دیکھو طوطی خان! مَیں نے تمہیں ہر کام کرنے کی اجازت دے رکھی ہے لیکن مَیں تمہیں یہ اجازت نہیں دوں گا کہ اس لڑکی کو تم بیچو۔"

"مَیں ان سے پوچھتا ہوں" ——— طوطی خان نے کہا۔

"ایسے طریقے سے پوچھنا کہ انہیں کوئی شک نہ ہو" ——— بوڑھے نے کہا ———

"انہیں اپنے گھر لے جاؤ پھر مجھے بتانا۔ میں پاکستان کے کسی دُشمن کو نہیں بخشوں گا۔ تمہاری رگوں میں اگر میرا خون ہے تو تم مجھے دھوکہ نہیں دو گے۔"

طُوطی خان اِن تینوں کو اپنے گھر لے گیا اور ایک ہی گھنٹے بعد واپس آ گیا۔ اُس نے اپنے باپ کو بتایا کہ اِن میں ایک ہندو ہے اور دو مسلمان ہیں اور تینوں انڈیا کے جاسوس ہیں۔ طُوطی خان نے اپنے آپ کو پاکستان کا دُشمن ظاہر کر کے اُن سے پوچھا تھا۔ عادل نے یہ سوچ کر طُوطی خان نے اِس دُور افتادہ علاقے میں رہتا ہے اس لئے اس سے کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا، اُسے اپنی اصلیت بتا دی تھی۔

"انہیں یہاں لے آؤ" — بوڑھے نے طُوطی خان سے کہا۔

❄

وہ آ گئے۔ بوڑھے نے انہیں بٹھایا۔ وہ بیٹھ ہی رہے تھے کہ بوڑھے نے رائفل اُٹھائی اور بولٹ پیچھے کر کے آگے کیا۔ ایک راؤنڈ رائفل کے چیمبر میں چلا گیا۔

"تمہارے پاس کوئی ہتھیار ہے تو وہ میرے آگے رکھ دو" — بوڑھے نے کہا۔

"تمہارا بابا کیا کر رہا ہے طُوطی خان؟" — عادل نے پوچھا — "کیا یہ مذاق کر رہا ہے؟"

"میں اپنے باپ کو نہیں روک سکتا" — طُوطی خان نے کہا — "یہ جو کہتا ہے وہ کرو۔ اپنے پستول اسے دے دو۔"

"بڑا افسوس ہے طُوطی خان!" — عادل نے کہا — "لڑکی کا سودا ہونے دو، تم پیسے زیادہ لے لینا۔ لڑکی پر اس طرح قبضہ نہ کرو۔ پٹھان اِس طرح تو نہیں کیا کرتے۔"

"اور پٹھان ایک اسلامی ملک کے دُشمن کو نہیں چھوڑا کرتے" — بوڑھے نے کہا — "ہم لڑکی پر قبضہ نہیں کر رہے۔ لڑکی تمہارے ساتھ واپس جا رہی ہے۔ پستول مجھے دے دو۔"

رِشی حیرت سے کبھی بوڑھے قبائلی کو دیکھتی کبھی اِن تینوں کو دیکھتی۔ اُسے یوں بھی محسوس ہُوا جیسے وہ خواب دیکھ رہی ہو۔

تینوں نے میگزین والے پستول نکال کر بوڑھے کے آگے پھینک دیے۔

تھوڑی دیر بعد وہ کار جس پر رِشی کو یہاں لایا گیا تھا، بنّوں کی طرف جا رہی تھی۔ کار کا ڈرائیور وہی تھا جو کار یہاں تک لایا تھا۔ اُس کے دونوں ساتھی اُس کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ طُوطی خان اور اُس کا باپ پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ دونوں کے پاس رائفلیں تھیں۔ رِشی ان کے درمیان بیٹھی تھی۔

پولیٹیکل ایجنٹ بنّوں میں تھا۔ بوڑھا قبائلی اِن سب کو پولیٹیکل ایجنٹ کے حوالے کرنے کے لئے لے جا رہا تھا۔

رِشی کو جب لاہور سے اغوا کر کے قبائلی علاقے کی طرف لے جایا جا رہا تھا، اُس وقت اُس کی ذہنی حالت ایسی تھی، جیسے وہ بے حس ہو گئی ہو۔ اُس کا من مُردہ ہو گیا تھا۔ اُس نے ذہنی طور پر قبول کر لیا تھا کہ وہ اِن تین آدمیوں کے قبضے میں ہے۔ وہ اِن کا مقابلہ نہیں کر سکتی اور رو لے چیخنے یا ان کی منت سماجت سے بھی کچھ حاصل نہ ہو گا۔ اُس نے اپنے آپ کو خدا کے اور اِن آدمیوں کے حوالے کر دیا تھا۔

اُس کے ذہن میں اپنا دِلّی والا اغوا بھی آ گیا تھا۔ وہ بہت ڈری تھی۔ روتی اور چلاتی بھی تھی اور اُس نے اغوا کرنے والوں کی منّتیں بھی کی تھیں مگر اُس کی کسی نے نہیں سُنی تھی۔ آخر اُس کا انجام ایسا غیر متوقع ہُوا کہ اُس کی فطرت میں انقلاب آ گیا تھا۔ اُس نے ایسا روحانی سکون محسوس کیا تھا کہ اُس نے ہاشمی، اُس کی بیوی اور عبدالقدیر سے کہا تھا کہ وہ واپس نہیں جانا چاہتی۔ اُس نے دِلّی کی اُسی حویلی میں ہی باقی زندگی گزار دینے کا فیصلہ کر لیا تھا جو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے مجاہدین اور شہیدوں کی رُوحوں کا مسکن تھی۔

اُسے جب لاہور سے اغوا کر کے لے جایا جا رہا تھا تو بے حس ہو جانے کے باوجود اُسے کچھ ایسا سکون محسوس ہو رہا تھا جیسے اب بھی وہ بڑے اچھے انجام کی طرف لے جائی جا رہی ہو۔ اُسے قرآن کی کوئی سورۃ، کوئی آیت یاد نہیں تھی۔ بسم اللہ اور کلمہ طیبّہ کے سوا وہ کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔ وہ اُس سوسائٹی میں جنی پلی تھی جس میں نماز، روزہ اور قرآن دقیانوسیت کی پسماندگی کی علامات سمجھی جاتی تھیں۔ اُسے صرف یہ یقین تھا کہ خدا ہے اور یہ کائنات خدا نے بنائی تھی اور خدا کے حکم کے بغیر

ایک پتّا بھی نہیں ہِل سکتا۔ یہ الگ بات ہے کہ رِشی کے ذہن میں خدا کا نام کبھی آیا نہیں تھا۔ اُس کے دل میں خدا کا خوف بھی نہیں اور خدا کی محبّت بھی نہیں تھی۔ خدا کے ساتھ اُس کا رِشتہ ہاشمی کی حویلی میں قائم ہُوا تھا۔

وہاں وہ ہاشمی کی بیوی کو نماز پڑھتے دیکھتی تھی تو وہ اپنی ذات میں ایک خلا محسوس کرتی تھی۔

"خالہ جان!" ——— ایک روز اُس نے ہاشمی کی بیوی سے پوچھا —— "خدا مجھ سے گناہگاروں کی طرف تو دیکھتا بھی نہیں ہو گا؟"

"اگر خدا کی نظر تم پر نہ ہوتی تو آج تم یہاں نہ ہوتیں" ——— ہاشمی کی بیوی نے کہا تھا ——— "تمہاری عصمت محفوظ نہ ہوتی اور تمہیں صراطِ مستقیم بھی دکھائی نہ دیتی۔ کیا تم محسوس نہیں کر رہیں کہ خدا نے تم پر کتنا بڑا کرم کیا ہے؟"

وہ قائل ہو گئی تھی کہ خدا کسی سے نظریں پھیرتا نہیں۔ اب تو وہ خدا کے بہت ہی قریب ہو گئی۔ اُس نے قرآن کی سرزمین کے دشمن پر وہ کاری ضرب لگائی تھی کہ نئی دِلّی کے محکمۂ جاسوسی میں بھونچال آ گیا تھا۔ اُس نے کار میں نامعلوم منزل کی طرف جاتے ہوتے خدا سے کوئی دُعا نہیں مانگی تھی۔ صرف اتنا کیا تھا کہ خدا کے نام کو دل میں رکھا تھا اور اِس سے اُسے ایسا اطمینان محسوس ہُوا تھا جسے وہ نہیں سمجھ سکتی تھی۔

اور جب وہ طوطی خان اور اُس کے باپ کے درمیان کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی بنوں کی طرف جا رہی تھی تو اُس کی جذباتی دنیا میں طوفان اُٹھ رہے تھے۔ وہ حیران اور پریشان ہوتی جا رہی تھی کہ اُس کے ساتھ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اُسے آوازیں سنائی دینے لگیں۔

"ہم نے ۱۸۵۷ء کے شہیدوں کو زندہ رکھا ہُوا ہے" —— یہ ہاشمی کی بیوی کی آواز تھی۔

"ہم نے پورے ایک سو سال انگریزوں کی اتنی زیادہ فوجوں اور توپوں کا مقابلہ صرف رائفلوں سے کیا تھا" ——— یہ بوڑھے پٹھان

کی آواز تھی۔

"انہی شہیدوں کے صدقے ہم نے پاکستان بنایا تھا" —— ہاشمی کی بیوی کی آواز بوڑھے پٹھان کی آواز میں شامل ہوگئی۔

"میرا باپ فرنگیوں کے خلاف لڑتا ہوا شہید ہوا تھا" —— بوڑھے پٹھان کی آواز ہاشمی کی بیوی کی آواز میں گڈمڈ ہوگئی۔

کار بہت تیز جا رہی تھی۔ دلّی اور قبائلی علاقے کی آوازیں اُسی طرح ایک ہوگئی تھیں جس طرح تحریکِ مجاہدین کے قائد سیّد احمد شہید کے جھنڈے تلے ہندوستان کے مسلمان سرحد کے پٹھانوں کے دوش بدوش سکھوں اور انگریزوں کے خلاف لڑے تھے۔

"فرنگی ہمارے دشمن تھے"۔

"انگریز تو چلے گئے اب ہندو ہمارے دشمن ہیں"۔

رِشی کو کبھی تو یوں لگتا جیسے اُس کے اِرد گرد دھماکے ہو رہے ہوں اور کبھی اُسے اپنے اِرد گرد شہد کی سینکڑوں مکھیوں کی بھنبھناہٹ سنائی دینے لگتی۔ پھر اُس نے اپنے آپ کو بادلوں میں اُڑتا ہوا پایا۔ اس نے بوڑھے پٹھان کی طرف دیکھا تو اُسے یقین کی حد تک محسوس ہوا کہ یہ بوڑھا اس زمین کی نہیں بلکہ ساتویں آسمان کی مخلوق ہے۔

"او کافرا!" —— بوڑھے نے اپنی رائفل کی نالی کار کے ڈرائیور کی گردن پر رکھ کر ذرا دبائی اور بولا —— "موٹر کو آہستہ کیوں کرتا ہے! تیز کرو اس کو!"

ڈرائیور نے بدک کر ایکسیلیٹر پر پاؤں دبایا۔ کار دھچکہ لے کر تیز ہو گئی۔ اس دھچکے نے رِشی کو بیدار کر دیا۔ آوازیں جو اُسے سُنائی دے رہی تھیں خاموش ہوگئیں۔

کار بنوں شہر میں داخل ہوئی۔ اس پارٹی کا انچارج طوطی خان کا باپ تھا لیکن اُسے معلوم نہیں تھا کہ پولیٹیکل ایجنٹ کہاں ملے گا۔ رِشی کو اغوا

کرنے والوں میں اُس شخص کا نام عادل تھا جو رِشی کو بیچنے کے لئے اپنے ساتھیوں کے ساتھ یہاں لایا تھا۔ وہ سرحد کے ایک بہت بڑے سمگلر گُلمست خان کا آدمی تھا۔

"او گُلمست کے بچے!" —— بوڑھے پٹھان نے عادل کی گردن پر آہستہ سے مُکّا مار کر کہا —— "تمہیں ایجنٹ صاحب کا دفتر ضرور معلوم ہوگا۔ اُدھر چلو"۔

عادل کے اشارے پر ڈرائیور نے کار روک لی۔

"خان بابا!" —— عادل نے پیچھے مُڑ کر بوڑھے پٹھان سے التجا کے لہجے میں کہا —— "مانگو کتنی رقم مانگتے ہو۔ ساتھ نئی رائفل دوں گا۔ واپس چلو.... طوطی خان! تم بولو"۔

"مَیں اپنے باپ کا حکم مانوں گا" —— طوطی خان نے کہا —— "تم خود اسے راضی کر لو"۔

"تم میرا ایمان خریدنا چاہتے ہو" —— بوڑھے پٹھان نے رائفل عادل کی طرف سیدھی کرتے ہوئے کہا —— "تم خوش قسمت ہو کہ میرے علاقے سے زندہ جا رہے ہو لیکن مَیں اس بچی کی خاطر تمہیں ایجنٹ صاحب کے حوالے کر رہا ہوں۔ موٹر چلاؤ"۔

کار چل پڑی۔

پوچھتے پوچھتے کار جس دفتر کے سامنے جا رُکی وہ ڈپٹی کمشنر کا دفتر تھا۔ بوڑھا پٹھان کار سے نکلا اور ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں داخل ہونے لگا تو چپڑاسی نے اُسے روک لیا۔ پٹھان نے چپڑاسی کو بتایا کہ وہ کیوں آیا ہے پھر بھی چپڑاسی اُسے روک رہا تھا۔ بوڑھے پٹھان نے غصّے میں آکر چپڑاسی کو دھکیل کر ایک طرف کیا اور اندر چلا گیا۔ ڈپٹی کمشنر دو آدمیوں کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ غریب سے ایک پٹھان کو جو رائفل سے مسلح تھا، اپنے دفتر میں دیکھ کر ڈپٹی کمشنر لال پیلا ہونے لگا۔ چپڑاسی بھی اندر آچکا تھا۔ ڈپٹی کمشنر کی ڈانٹ پھٹکار سُن کر چپڑاسی نے ڈپٹی کمشنر کو بتایا کہ یہ بوڑھا اُسے دھکا دے

کر اندر آ گیا ہے۔

"دیکھو بوڑھے!" — ڈپٹی کمشنر نے طوطی خان کے باپ سے پشتو میں کہا — "تم رائفل لے کر میرے دفتر میں آ گئے ہو۔ میں تمہیں گرفتار کر لوں گا اور تمہاری رائفل ضبط ہو جائے گی۔"

"گرفتار انہیں کرو جو پاکستان کے دشمن ہیں اور ہندو کے جاسوس ہیں" — بوڑھے پٹھان نے کہا — "میں انہیں ساتھ لایا ہوں۔ میرا بیٹا میرے ساتھ ہے۔ وہ سب موٹر میں بیٹھے ہوئے ہیں .... میرے پاس صرف رائفل نہیں تین پستول بھی ہیں۔" اس نے چوغے کی جیب میں سے تین پستول نکال کر ڈپٹی کمشنر کی میز پر رکھ دیئے — "یہ ان کے ہیں۔"

بوڑھے نے ڈپٹی کمشنر کو وہ باتیں سنائیں جو اسے رشی نے سنائی تھیں۔

"کیا اس لڑکی کا نام رشی یا راشدہ ہے؟" — ڈپٹی کمشنر نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں!" — بوڑھے پٹھان نے جواب دیا — "وہ اپنا یہی نام بتاتی ہے۔"

ڈپٹی کمشنر اچھل کر اٹھا اور دفتر سے باہر نکلا۔ اس نے اپنے سٹاف کے دو تین آدمیوں کو بلا کر کچھ حکم دیئے پھر رشی کو کار میں سے نکال کر اپنے دفتر میں لے گیا۔ اس نے رشی کو بٹھا کر پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ رشی نے اپنا بیان دینا شروع کر دیا۔ اس دوران ڈپٹی کمشنر نے پولیٹیکل ایجنٹ کے ساتھ ٹیلیفون پر بات کی۔

کچھ دیر بعد رشی کو اغوا کرنے والے تینوں آدمیوں کو ہتھکڑیاں لگ گئیں۔ پولیٹیکل ایجنٹ بھی آ گیا۔

پولیٹیکل ایجنٹ بہت خوش تھا۔ دو تین روز پہلے اسے اسلام آباد سے حکم نامہ ملا تھا کہ راشدہ عرف رشی نام کی ایک لڑکی لاہور سے اغوا ہو گئی ہے جس کے متعلق یہ شک ہے کہ اسے علاقہ غیر میں لے جایا گیا ہے۔ اس حکم نامے

میں مختصر لکھا گیا تھا کہ اس لڑکی کی اہمیت کیا ہے۔ یہ بھی لکھا گیا تھا کہ یہ شک ہے کہ اس لڑکی کو انڈیا کے ایجنٹوں نے اغوا کیا ہے۔

اغوا کئے ہوئے افراد، چوری کی کاریں اور موٹر سائیکلیں اور مفرور مجرم قبائلی علاقے میں پہنچتے ہی رہتے تھے۔ پولیٹیکل ایجنٹ کے دفتر میں ایسے حکم ناموں کا انبار لگا ہوا تھا لیکن رشی کے معاملے میں وہ بہت پریشان تھا۔ اس نے رشی کی تلاش کے لئے کارروائی شروع کر دی تھی۔ یہ کارروائی ایسی نہیں تھی کہ جہاں شک ہوتا وہاں چھاپہ مارا جاتا یا شک میں کچھ مشتبہوں کو پکڑ لیا جاتا۔ قبائلی علاقے میں ایسی کارروائی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ وہاں مختلف قبیلوں کے ملکوں سے مل کر ڈپلومیسی کے ذریعے سراغ لینا پڑتا تھا۔ سراغ مل جانے کی صورت میں کچھ سودا بازی ہوتی تھی۔

پولیٹیکل ایجنٹ کو جب ڈپٹی کمشنر نے اطلاع دی کہ رشی نام کی ایک لڑکی کو اس کے دفتر میں لایا گیا ہے تو اسے یقین نہیں آیا تھا کہ یہ وہی لڑکی ہو سکتی ہے جس نے اسے پریشان کر رکھا ہے۔ ڈپٹی کمشنر کے دفتر آ کر اس نے خود رشی کا بیان لیا تو اسے یقین آیا کہ یہ وہی لڑکی ہے۔

❄

اگلے روز شام کے وقت وہ کار جس میں رشی کو قبائلی علاقے میں لے جایا گیا تھا، راولپنڈی میں آئی ایس آئی کے انٹروگیشن سنٹر میں کھڑی تھی۔ اغوا کے تینوں ملزم الگ الگ کوٹھڑیوں میں بند تھے اور رشی آئی ایس آئی کے چیف کے سامنے اس کے دفتر میں بیٹھی ہوئی تھی۔ کرنل مرزا نے رشی کی ماں کو لاہور اطلاع دے دی تھی کہ رشی بخیریت واپس آ گئی ہے۔ کرنل مرزا نے اسے کہا تھا کہ وہ راولپنڈی آنا چاہے تو آ جائے۔

طوطی خان اور اس کے باپ کو معزز مہمانوں کی طرح رکھا گیا تھا۔

"دیکھا رشی!" — آئی ایس آئی کا چیف رشی سے کہہ رہا تھا — "اللہ کسی کے نیک کام کو ضائع نہیں ہونے دیتا۔ ہم تو تم سے ہاتھ دھو

بیٹھے تھے۔"

"سوچ سوچ کر میرا تو سر چکرانے لگا ہے" — رشی نے کہا — "کیا مجھ جیسے گناہگاروں کی زندگی میں بھی اس قسم کے معجزے ہُوا کرتے ہیں؟"

"مَیں عالمِ دین نہیں" — آئی ایس آئی کے اس میجر جنرل نے کہا — "میں سیدھا سادا فوجی ہوں۔ مَیں اتنا جانتا ہوں کہ مجاہد کی ایک ضربِ کاری کے مقابلے میں سینکڑوں سجدوں کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ تم نے اسلام اور پاکستان کے دشمن پر جو کاری ضرب لگائی ہے اس نے تمہارے سارے گناہ بخشوا دیئے ہیں۔ ثبوت اس کا یہ ہے کہ تمہیں جہنم میں پہنچا دیا گیا تھا اور اللہ کے نظر نہ آنے والے ہاتھ نے وہاں سے نکال کر ہمارے پاس بلکہ اپنی ماں کے پاس پہنچا دیا ہے۔ اسے تم معجزہ کہہ لو، اللہ کا خاص کرم کہہ لو، مَیں اسے ایک انعام سمجھتا ہوں جو تمہیں اللہ نے دیا ہے۔"

"اس انعام کے باوجود میں پریشان ہوں" — رشی نے کہا — "کیا مَیں اسی طرح اغوا ہوتی رہوں گی؟ کیا مَیں گھومنے پھرنے کے قابل نہیں رہی؟"

"نہیں رشی!" — چیف نے کہا — "کچھ عرصے کے لئے تمہاری حفاظت کا انتظام کر دیا جائے گا پھر اس کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔ مَیں حیران ہوں کہ تمہیں اغوا کیوں کیا گیا تھا۔ انٹیلی جنس میں ایسا نہیں ہوتا۔ انڈین انٹیلی جنس میں ایسے اناڑی دماغ نہیں کہ وہ اس قسم کی اوچھی حرکت کریں۔ اغوا کی صرف یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ اس کیس میں تم سب سے زیادہ اہم گواہ ہو بلکہ تم واحد گواہ ہو جس کے بیان پر یہ کیس تیار کیا گیا ہے۔ اگر تم جیسا گواہ عدالت میں پیش ہی نہ ہو تو ان لوگوں کا جرم ثابت نہیں ہو سکتا ..... اگر تمہیں اس مقصد کے لئے غائب کرنا تھا تو تمہیں قتل کرا دیتے۔ اغوا انتقاماً کیا جاتا ہے۔ بہرحال اغوا کے ملزم ہمارے پاس ہیں۔ سب کچھ سامنے آجائے گا۔"

"وہ مجھے بیچنے کے لئے لے گئے تھے" — رشی نے کہا — "اس بزرگ پٹھان نے مجھے بتایا تھا۔"

❋

اغوا کے ان تین ملزموں میں ایک ہندو راجن راؤ تھا اور دو مسلمان۔ ایک کا نام عادل اور دوسرے کا نام اعجاز تھا۔ انہیں راولپنڈی میں لا کر آرام نہیں کرنے دیا گیا تھا۔ ہر ایک کو الگ الگ کمرے میں لے جا کر تھرڈ ڈگری کے پہلے مرحلے میں ڈال دیا گیا۔ تینوں سے کہا گیا تھا کہ جب سچ بولنے کے موڈ میں آ جاؤ گے تو بتا دینا۔

وہ مشتبہ نہیں تھے۔ وہ جرم کے ارتکاب کے دوران پکڑے گئے تھے جسے رنگے ہاتھوں پکڑے جانا کہتے ہیں۔ طوطی خان اور اُس کا باپ گواہ تھے۔ اُن سے یہ معلوم کرنا تھا کہ اُن کے دیگر ساتھی کون ہیں اور وہ کہاں کہاں ہیں۔

رات بھر انہیں ایذا رسانی کے عمل میں رکھا گیا۔ راجن راؤ سے آئی ایس آئی کا میجر شبیر تفتیش کر رہا تھا۔ وہ اپنی ڈیوٹی پوری نہیں کر رہا تھا بلکہ اس ہندو کے لئے قصائی بنا ہُوا تھا۔ اُس نے راجن راؤ کو چھت سے اُلٹا لٹکا رکھا تھا۔ اُس کا سر فرش سے تین فٹ اُونچا تھا۔ کمرے میں ایک انگیٹھی رکھی تھی جس میں تھوڑے سے کوئلے دہک رہے تھے۔ میجر شبیر دو تین منٹوں کے لئے انگیٹھی راجن راؤ کے نیچے رکھ دیتا تھا۔ راجن اپنے بازو اُوپر کر لیتا اور سر بھی اُوپر کرنے کی کوشش کرتا تھا، چیختا اور چلاتا بھی تھا۔

صبح تک وہ اتنا نڈھال ہو چکا تھا کہ اس میں بازو اُوپر کرنے کی بھی طاقت نہیں رہی تھی۔ اُس کے ٹخنوں سے بندھی ہوئی رسّی کھول کر اُسے اُتار لیا گیا۔ وہ فرش پر لاش کی طرح لیٹ گیا۔ اُس کے مُنہ پر پانی کے چھینٹے مارے گئے۔ کچھ پانی اُس کے مُنہ میں ٹپکایا گیا۔ اُس نے آنکھیں کھولیں۔ آنکھیں گہری لال ہو گئی تھیں۔

"پانی" — اُس کے مُنہ سے سِسکی نکلی۔

"تیرے باپ دادا نے سن سنتالیس میں ہمارے بچّوں کو بھُوکا اور پیاسا مارا تھا" — میجر شبّیر نے غصّے کو دباتے ہُوئے کہا — "تیری قوم آج تک وہاں مسلمانوں کو قتل کر رہی ہے۔ مرجا ہنومان کی اولاد!... لیکن میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔ تیرا خون بہاؤں گا لیکن قطرہ قطرہ۔ تیری شہ رگ پر کُند چھُری چلاؤں گا۔ آہستہ آہستہ۔ تُو مرنے لگے گا تو تیری رگوں میں بھنگیوں کا خون ڈال کر تجھے زندہ رکھوں گا۔"

"دو گھونٹ پانی!" — راجن نے بلبلا کر کہا۔

"اس کے مُنہ میں پانی ڈالو" — میجر شبّیر نے اُس حوالدار سے کہا جو کمرے میں اُس کے ساتھ موجود تھا۔

حوالدار پانی کا گلاس لے آیا۔ راجن اُٹھنے کے لئے پیٹ کے بل ہُوا پھر دونوں ہاتھ فرش پر رکھ کر اُس نے پیٹ اور سینہ فرش سے اُٹھایا گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل ہُوا اور اسی طرح چلتا ہُوا دیوار تک گیا، گھوم کر پیٹھ دیوار کے ساتھ لگائی اور ٹانگیں لمبی کر کے بیٹھ گیا۔

"مُنہ کھولو" — میجر شبّیر نے حوالدار کے ہاتھ سے گلاس لے کر راجن راؤ سے کہا — "مُنہ اُوپر کر کے کھولو۔ مَیں گلاس کو ناپاک نہیں کروں گا۔"

اس ہندو نے مُنہ اُوپر کر کے کھولا۔ میجر شبّیر نے اُوپر سے گلاس ٹیڑھا کیا۔ پانی کی دھار راجن کے مُنہ میں گئی۔ اُس نے بے تابی سے پانی حلق سے اُتارا اور پھر مُنہ کھولا۔ میجر شبّیر نے گلاس حوالدار کو دے کر اشارہ کیا کہ وہ کمرے سے نکل جائے۔

راجن راؤ کمرے کے دروازے کی طرف جاتے ہُوئے حوالدار کی طرف بازو پھیلا کر لپکنے لگا۔ میجر شبّیر نے اُس کے پھیلے ہُوئے ایک بازو کی کلائی پر چھڑی ماری۔ راجن کلائی کو بغل میں دبا کر

فرش پر لڑھک گیا۔

دوسرے دو کمروں میں عادل اور اعجاز کے ساتھ جو سلوک ہو رہا تھا وہ اس سے بہتر نہیں تھا۔

❋

"مجھے وعدہ معاف گواہ بنا لیں" — اگلی رات راجن راؤ نے میجر شبّیر سے کہا — "ایسا بیان دوں گا جو آپ کو حیران کر دے گا۔"

"تمہارے دونوں ساتھی بیان دے چکے ہیں" — میجر شبّیر نے کہا — "تم بھی بیان دے دو۔ تینوں کے بیان دیکھ کر فیصلہ کیا جائے گا کہ وعدہ معاف گواہ کس کو بنایا جاتا ہے۔ سو فیصد سچ بولو گے تو وعدہ معاف گواہ بن جاؤ گے۔"

عادل اور اعجاز نے کوئی بیان نہیں دیا تھا۔ وہ ایذا رسانی برداشت کر رہے تھے۔ راجن راؤ کی قوّتِ برداشت جواب دے گئی۔ اُس نے بیان دینے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ اُسے کچھ آرام اور اچھا کھانا دیا گیا۔

"میرا علاقہ سندھ ہے اور مَیں پاکستانی ہوں" — اُس نے کہا — "میرا شناختی کارڈ جو آپ کے پاس ہے، جعلی نہیں۔ میرے ماں باپ سنتالیس میں اِدھر ہی رہ گئے تھے۔ انڈیا نہیں گئے تھے۔ میں دادو میں پیدا ہُوا تھا۔"

اُس نے تفصیل سے سنایا کہ اُس نے کہاں کہاں تعلیم حاصل کی اور اُسے کہاں نوکری ملی تھی۔

"میری عمر بارہ تیرہ سال تھی جب میرے ماں باپ اور بڑے بھائی نے مجھے پاکستان بننے کے بعد کی باتیں سُنانی شروع کی تھیں" — راجن راؤ نے کہا — "انہیں شروع شروع میں ڈر تھا کہ سندھ کے مسلمان انہیں مسلمان بنانے کی کوشش کریں گے لیکن سندھ میں اتنی غربت اور اس قدر پسماندگی تھی کہ جس کے پاس روپیہ ہوتا تھا وہ اُسی کو اَن داتا اور قابلِ پرستش سمجھ لیتے تھے۔ روپیہ پیسہ ہمارے پاس تھا۔ زیادہ ہندو ساہوکارہ کرتے تھے۔ میری

اُس عمر تک سندھ میں ہندوؤں کی آبادی زیادہ ہوتی تھی کیونکہ جو ہندو سن سنتالیس میں انڈیا چلے گئے تھے وہ واپس آنا شروع ہو گئے تھے۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ خود واپس نہیں آتے تھے"۔۔۔ میجر شبیّر نے کہا ۔۔۔ "انہیں انڈین گورنمنٹ کے پلان کے تحت بھیجا گیا تھا۔"

"آپ کا خیال ٹھیک ہے سر!" ۔۔۔ راجن راؤ نے کہا ۔۔۔ "یہ ایک پلان تھا جو اب کامیاب جا رہا ہے۔ ہم ابھی لڑکپن میں تھے جب مندروں میں ہمارے پنڈتوں نے ہمیں یہ سبق دینے شروع کر دیئے تھے کہ سندھ ہندوؤں کا ملک تھا، اسے بھارت ماتا میں شامل کرنا ہے۔ ہمیں بتایا جاتا تھا کہ محمد بن قاسم اور سلطان محمود غزنوی نے ہندوؤں کے ساتھ جو زیادتیاں کی تھیں، ان کا انتقام پاکستان کے مسلمانوں سے لینا ہے۔"

"کیا مجھے انتقام لینے کے طریقے بتاؤ گے؟" ۔۔۔ میجر شبیّر نے پوچھا۔

"سب کچھ بتاؤں گا سر!" ۔۔۔ راجن راؤ نے کہا ۔۔۔ "بتانے کی ضرورت تو نہیں۔ سندھ میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ اس کے پیچھے ہمارا ہی تو ہاتھ ہے۔ عمل سندھی مسلمان کر رہے ہیں، دماغ ہندو کا کام کر رہا ہے۔ محمد بن قاسم کو ڈاکو اور لٹیرا تو ہم ہندو سمجھتے ہیں لیکن سندھی ہندوؤں نے محمد بن قاسم کو سندھ کے ایک مسلمان لیڈر کی زبان سے ڈاکو اور لٹیرا اور راجہ داہر کو اپنا ہیرو کہلوایا اور اس لیڈر کے ہیرو کاروں نے جگہ جگہ جلسوں میں یہی الفاظ کہے۔"

"ہندو کی عیاّری اور فریب کاری کو تو ساری دنیا جانتی ہے" ۔۔۔ میجر شبیّر نے طنزاً کہا۔

"ایک بات کہوں گا سر!" ۔۔۔ راجن راؤ نے کہا ۔۔۔ "بُری لگے تو معاف کر دینا۔ کسی دوسری قوم کی عیاری اور فریب کاری اُسی قوم پر اور اُسی ملک میں کامیاب ہو سکتی ہے جس میں غداّر اور ایمان فروش موجود ہوتے ہیں۔"

"یہ غداّر ہندوؤں کے پیدا کئے ہوتے ہیں" ۔۔۔ میجر شبیّر نے کہا۔

"میں آپ کے ساتھ بحث میں اُلجھنے کی جرأت نہیں کر سکتا سر!" ۔۔۔ راجن راؤ نے کہا ۔۔۔ "ایک بات کہنے کی اجازت دیں۔ یہ صحیح ہے کہ آپ کی قوم میں غداّر ہم نے پیدا کئے ہیں لیکن آپ کی حکومت نے کیا رول ادا کیا؟ اب حکومت کیا رول ادا کر رہی ہے؟ اپنے لیڈروں کی کھلم کھلا غداّری پر آپ کی حکومت نے کیا کارروائی کی؟ کسی ایک پر بھی مقدمہ چلایا؟"

میجر شبیّر کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ یہ ہندو جو کچھ کہہ رہا تھا سو فیصد ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ راجن راؤ سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ اپنے جُرم کا اقبالی بیان دے اور پاکستان کی سیاست کو الگ رہنے دے لیکن راجن راؤ بولتا چلا جا رہا تھا۔

"ہماری حکومت کی یہی پلاننگ آپ کے مشرقی پاکستان میں چل رہی تھی" ۔۔۔ وہ کہہ رہا تھا ۔۔۔ "۱۹۷۱ء میں وہ کامیاب ہو گئی۔ اسی تجربے کی کامیابی نے انڈیا کے لیڈروں کا حوصلہ بڑھا دیا اور انہوں نے توجہ سندھ پر مرکوز کر لی۔ مشرقی پاکستان میں انڈیا کو کامیاب ہونے میں چوبیس برس لگے تھے لیکن سندھ میں وہ جلدی کامیاب ہو گئے۔ سندھ میں ڈاکہ زن کون ہیں؟ بڑے بڑے لوگوں کو اغوا کرنے والے کون ہیں؟ اندھا دُھند فائرنگ کرنے والے نامعلوم افراد کون ہیں؟ ہم ہی تو ہیں۔ پاکستان میں لوگ کہتے ہیں سندھ اور کراچی میں جو خونریزی ہو رہی ہے اس سے انڈیا فائدہ اُٹھا رہا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ حالات انڈیا نے پیدا کئے ہیں اور ان سے پاکستانی لیڈر فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ آپ کی سیاسی پارٹیاں فائدہ اُٹھا رہی ہیں۔"

❊

میجر شبیّر بے چین ہو گیا۔ یہ احساس اُسے پہلے ہی پریشان کر رہا تھا کہ یہ ہندو جو کچھ کہہ رہا ہے ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اپنے سیاسی لیڈروں کو

وہ جانتا تھا۔ یہ سب اقتدار کے بھوکے تھے۔ حکمرانی کے نشئی تھے۔ ا
ہیں سے جنہیں اقتدار مل جاتا وہ قومی خزانے کے لئے سفید ہاتھی بن
جاتے۔ نئے نئے ٹیکسوں کے ذریعے عوام کی کھال اتارتے اور عیش وع
کرتے تھے اور جو اقتدار سے محروم رہتے وہ برسرِ اقتدار طبقے کے
نیچے سے زمین نکالنے کے ہتھکنڈے آزماتے رہتے۔ برسرِ اقتد
طبقہ ان مخالفین کی سرکوبی کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیتا۔

میجر شبیر اسی ملک کی فوج کا افسر تھا۔ اس سے حلف لیا گیا تھ
کہ ملک کی سلامتی کے لئے اپنی جان بھی قربان کر دے گا لیکن وہ اپ
ملک کے حکمرانوں کو دیکھتا تھا تو انڈیا کی بجائے انہیں اپنے ملک کا
دشمن نمبر ایک سمجھتا تھا۔ راجن راؤ ٹھیک کہہ رہا تھا کہ پاکستان میں کو
تباہ کن صورتِ حال اگر انڈیا پیدا کرے تو پاکستانی لیڈر اسے اقتدار
معرکہ آرائی میں استعمال کرتے ہیں۔ انہیں ضرورت پڑتی تو دشمن کی لگا
ہوئی آگ پر اپنی خواہشات اور اپنے مفادات کا تیل چھڑکتے تھے۔

میجر شبیر انٹیلی جنس کا افسر تھا۔ ملک کے سنٹرل انٹیلی جنس بیو
سی آئی ڈی اور سی آئی اے کے افسروں کے ساتھ بھی اس کا را
رہتا تھا۔ وہ اپنے ملک کے حکمران طبقے کے ہر ایک لیڈر کی درپر
سرگرمیوں سے واقف تھا۔ ان کی پرائیویٹ زندگیوں کے شب ور
جس طرح گزرتے تھے، یہ بھی جانتا تھا مگر مجبور تھا۔ ان کے خلاف و
کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا بلکہ وہ میجر شبیر کے خلاف بہت کچھ کر سکتے تھے۔

میجر شبیر ہی نہیں، آئی ایس آئی کے ادنیٰ سے اعلیٰ افسر تک
کو معلوم تھا کہ اقتدار کے ہوس کار ملک کی سلامتی کو خطرے میں ڈال
ہیں اور اس طرح وہ دشمن کا کام آسان کر رہے ہیں۔ آئی ایس آئی کو یہ
معلوم تھا کہ بعض لیڈر اپنے مخالفین کو دبانے کے لئے انڈیا سے ا
حاصل کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ مشرقی پاکستان کے المیہ کا تمام
پس منظر ان کے سامنے تھا اور اب وہ سندھ کی خونچکاں صورتِ حا

دیکھ رہے تھے۔

انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ سیاسی میدان کے کون کون سے کھلاڑی
بین الاقوامی سمگلنگ کے سرپرست بنے ہوتے ہیں۔ عادل کو جس
وقت آئی ایس آئی کے ہاں لایا گیا تھا تو ایک انفارمر نے اسے دیکھتے
ہی بتا دیا تھا کہ یہ فلاں سابق وزیر کا آدمی ہے اور تجربہ کار سمگلر ہے۔
انفارمر نے اس کی پوری ہسٹری سنا دی تھی۔ یہ ہسٹری عادل کو بریگیڈیئر
مرزا نے سنائی اور اسے کہا تھا کہ وہ اقبالِ جرم کر لے اور اپنے آپ کو
تھرڈ ڈگری سے بچا لے لیکن عادل نے معصومیت کے لہجے میں کہا تھا کہ
اس کے متعلق یہ باتیں کسی دشمن نے گھڑی ہیں۔ اس نے مطالبہ کیا تھا کہ
اس کی گرفتاری کی اطلاع اس وزیر کو دی جائے۔ بریگیڈیئر مرزا نے
اسے اپنے ایک کیپٹن کے حوالے کر دیا تھا۔ عادل ابھی تک اس
امید پر جرم کے اقبال سے انکار کئے جا رہا تھا کہ اس کا آقا سابق وزیر
اسے چھڑا لے گا۔ وہ ایذا رسانی برداشت کر رہا تھا۔

سمگلنگ اور جاسوسی کے جرائم کو ختم کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ ان جرائم
کے مجرموں کی پشت پناہی کرنے والوں کو پکڑا جاتا مگر پاکستان میں یہ
ممکن نہ تھا۔ حکمرانوں کو نہیں پکڑا جا سکتا تھا۔ اگر کبھی کسی سابق گورنر یا کسی
صوبے کے سابق وزیرِ اعلیٰ یا کسی سابق وزیر کو گرفتار کر لیا جاتا تو مخالف
سیاسی پارٹیاں حکمران پارٹی کے خلاف طوفان کھڑا کر دیتی تھیں۔ حکمران
پارٹی خود بھی ایک سیاسی پارٹی ہوتی تھی اس لئے وہ کسی بڑی شخصیت
کی گرفتاری میں دیانتدار نہیں ہوتی تھی۔ گرفتاری محض ایک سیاسی
چال ہوتی تھی۔ حکمران پارٹی کو معلوم تھا کہ جب وہ اپوزیشن بنچوں پر بیٹھے
گی تو نئی حکمران پارٹی اس کے سمگلروں کو گرفتار کر لے گی۔

اس صورتِ حال میں آئی ایس آئی اپنا رول صحیح طریقے سے ادا
کر ہی نہیں سکتی تھی۔ بڑے بڑے سمگلر سیاسی پارٹیوں کے ساتھ
وابستہ ہو گئے تھے۔ الیکشن میں وہ اپنی اپنی پارٹی کے امیدواروں پر

بے دریغ پیسہ خرچ کرتے تھے۔ کوئی سمگلر کسی کمزور پارٹی میں شامل نہیں
ہوتا تھا۔ سمگلروں میں جاسوس بھی ہوتے تھے۔ سمگلروں کی پشت پناہی
کا مطلب جاسوسوں کی پشت پناہی تھا۔ البتہ یہ ہوتا تھا اور ہوتا چلا آرہا
ہے کہ وہ کسی گروہ کے ایک دو ورکر قسم کے سمگلروں کو پکڑ کر دو چار سال
سزا دے دی جاتی تھی۔ اس طرح یہ صورت پیدا ہوتی کہ افراد پکڑے جاتے
رہے اور گروہ زندہ رہے۔ انہیں پکڑنے والے ادارے سرخرو رہے
کہ وہ اپنا فرض پورا کر رہے ہیں۔

❋

راجن راؤ میجر شبیر کو اقبالی بیان دے رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ بیشمار
ہندو انڈیا سے سندھ میں غیر قانونی طور پر آ گئے اور وہ ابھی تک آرہے
ہیں۔ انہوں نے آتے ہی سندھی مسلمانوں میں روپیہ پیسہ بانٹنا شروع کر دیا
اور سندھ کی زمین پر ہی نہیں بلکہ سندھ کے لوگوں کے دلوں میں جگہ حاصل
کر لی۔

"ایک بات بتاؤ راجن" — میجر شبیر نے پوچھا — "کیا ہر ایک
سندھی مسلمان کو ہندوؤں نے خرید کر پاکستان کے خلاف کر دیا ہے؟"

"میں سمجھ گیا ہوں آپ کیا پوچھ رہے ہیں" — راجن نے جواب
دیا — "دیہات کے بیشتر سندھی پاکستان کے خلاف نہیں۔ وہ بیچارے
تو کچھ سمجھنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتے۔ ہم ان کے وڈیروں کو پکڑتے ہیں۔
ہم انہیں اپنے زیرِ اثر لیتے ہیں جن کے زیرِ اثر عوام ہوتے ہیں۔ ان غریب
اور پسماندہ لوگوں کو تو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ آپ کے
مشرقی پاکستان میں بھی ایسے ہی ہوا تھا۔ وہاں کے دیہاتی علاقوں میں
چلے جائیں۔ آپ کو آج بھی ایسے بنگالی ملیں گے جو بنگلہ دیش کو پاکستان
کہتے ہیں یا یہ کہتے ہیں کہ بنگلہ دیش پاکستان کا دوسرا نام ہے .... اگر آپ
سندھ کے ان وڈیروں اور پیروں کو جو پاکستان کے خلاف ہیں اور
ان سیاسی لیڈروں کو جو جئے سندھ کی تحریک میں کھلم کھلا یا درپردہ شامل

ہیں، پکڑ لیں تو سندھ کے عوام پاکستان کے وفادار ہوں گے۔"

راجن راؤ نے تفصیل سے بتایا کہ وہ کس طرح اندرونِ سندھ
میں تخریب کاری کرتا رہا ہے اور کس طرح انڈیا سے تجربہ کار تخریب کار
آتے اور کیا کیا کرتے تھے۔

"ایک بار مجھے حیدرآباد سے ایک پنجابی تاجر کو اغوا کرنے کا موقع
دیا گیا" — راجن راؤ نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا — "میں نے
یہ کام نہایت اچھے طریقے سے کیا۔ اس تاجر کی رہائی کے لئے چار لاکھ روپیہ
وصول کیا گیا تھا۔ اس کے بعد میں نے چار دوسرے درجے کے لیڈر
اغوا کئے اور انہیں کچھ دنوں بعد چھوڑ دیا تھا۔ وہ اب بھی اپنی ہڈیاں سینکتے
ہوں گے۔

❋

میجر شبیر اس کے بیان سے کوئی بات پوچھتا تھا اور راجن راؤ
جواب دیتا چلا جا رہا تھا۔

"دو مہینوں سے میں پنجاب میں تھا" — راجن راؤ نے کہا —
"دہشت گردی کی کچھ وارداتیں کرنی تھیں۔ لاہور میں مجھے جو ساتھی دیئے گئے
تھے، انہوں نے ایک روز مجھے اس لڑکی کے متعلق بتایا کہ اسے غائب
کرنا ہے۔ غائب کرنے کی وجہ بھی مجھے بتائی گئی۔ مجھے اغوا کا ماہر سمجھا
جاتا تھا۔ مجھے اس لڑکی کا گھر دکھایا گیا۔"

میجر شبیر کے سوال کے جواب میں راجن نے دو آدمیوں کے نام
بتائے جنہوں نے رشی کے اغوا کا کام اس کے سپرد کیا تھا۔ اسے دو آدمی
دیئے گئے۔ ایک تو عادل تھا اور دوسرا اعجاز تھا جو آئی ایس آئی کا میجر
عظمت بن کر رشی کے گھر گیا تھا۔ انہوں نے رشی کو آسانی سے
اغوا کر لیا۔

"اس لڑکی کو قتل کر کے لاش غائب کر دینی تھی" — راجن راؤ نے

کہا — "مَیں نے گوجرانوالہ کے قریب سے گزرنے والی بڑی نہر دیکھ لی تھی۔ لاش دوہری کر کے ایک پرانے صندوق میں بند کرنی اور صندوق اس نہر میں پھینک دینا تھا۔ صندوق میں پتھر بھی بھرنے تھے لیکن عادل نے کچھ اور سوچ لیا۔ کہنے لگا کہ اتنی خوبصورت اور ایسی جوان لڑکی ضائع نہیں ہونی چاہیئے۔ اس سے ہم خاصا پیسہ کما سکتے ہیں۔ اُس نے جب اپنی سکیم بتائی اور ہمیں بتایا کہ وہ فرنٹیئر کے قبائلی علاقے سے اچھی طرح واقف ہے تو اُس کی سکیم مجھے اچھی لگی۔ مَیں نے پوچھا کہ اس لڑکی کو وہاں لے جا کر دو تین دن عیش موج کریں گے پھر اسے بیچ کر پیسہ کمائیں گے۔ مَیں اس لئے بھی خوش ہُوا کہ فرنٹیئر کا قبائلی علاقہ دیکھ لوں گا۔ اِس علاقے کی مَیں نے بہت باتیں سُنی تھیں مگر اِس بوڑھے پٹھان نے رنگ میں ایسی بھنگ ڈالی کہ لینے کے دینے پڑ گئے۔"

راجن راؤ نے لاہور کے دو تین آدمیوں کی نشاندہی کی تھی۔ عادل اور اعجاز نے بھی اقبالی بیان دے دیئے۔ اُن کی جسمانی حالت ایسی ہو چکی تھی کہ اُن سے اچھی طرح بولا بھی نہیں جاتا تھا۔ ان تینوں کو لاہور لے گئے۔ وہاں ان کے اُن ساتھیوں کو گرفتار کر کے اِن سے شناخت کرائی تھی جن کی اُنہوں نے نشاندہیاں کی تھیں۔

رشی کو لاہور بھیج دیا گیا اور کچھ عرصے کے لئے اُس کی کوٹھی پر پولیس کے پہرے کا انتظام کر دیا گیا۔

اس کے بعد آئی ایس آئی نے گرفتاریوں، تفتیش اور شہادت کی فراہمی کا طویل اور صبر آزما سلسلہ شروع کر دیا۔

دِلی میں عزیز کے قتل کا معمہ ابھی تک حل نہیں ہُوا تھا۔ ہاشمی اور عبدالقدیر نے سوائے انکار کے کوئی بیان نہیں دیا تھا۔ اُنہوں نے جو ایذا رسانی برداشت کی تھی وہ کوئی جانور بھی شاید برداشت نہ کر سکتا۔ یہ ایمان کی قوت کا کرشمہ تھا۔ اُنہوں نے اپنے جسم اللہ کے حوالے کر دیئے تھے۔ ایذا رسانی کے دوران وہ قرآن کی کسی آیت کا وِرد شروع کر دیتے اور توجہ اللہ پر

مرکوز کر لیتے تھے، حتیٰ کہ وہ بیہوش ہو جاتے۔

ایک شام ہاشمی اپنے سیل میں بے حال پڑا تھا۔ یہ تیسرا دن تھا کہ اُسے سیل سے نہیں نکالا گیا تھا۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ انڈین انٹیلی جنس کے چیف نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تفتیش ختم کر دی جائے اور اِن دونوں کے خلاف مقدمہ تیار کیا جائے۔ ہاشمی کی جسمانی حالت ٹھیک نہیں تھی، البتہ پہلے سے کچھ بہتر تھی۔ ذہنی طور پر وہ نارمل تھا۔ یہ اُس کا اپنا کمال تھا کہ اُس نے ذہن کو ماؤف نہیں ہونے دیا تھا۔ جس ذہن میں اللہ اور رسولؐ کا نام اور پاک کلام ہو، وہ دنیاوی صعوبتوں سے متاثر نہیں ہو سکتا۔ ہاشمی اور عبدالقدیر اللہ کی راہ پر چلنے والے آدمی تھے۔ اللہ اُن کی نگہبانی کر رہا تھا۔

"کوئی سیل خالی نہیں" — ہاشمی کو سیل کے دروازے پر آواز سنائی دی — "اسی سیل میں ڈال دو۔"

ہاشمی نے دروازے کی طرف دیکھا۔ اُسے تین آدمی سلاخوں کے ساتھ کھڑے دکھائی دیئے۔ دو کو وہ جانتا تھا۔ وہ انڈین انٹیلی جنس کے آدمی تھے۔ وہ تین چار بار اُسے سیل سے تفتیشی کمرے تک لے گئے اور اُسے سہارا دے کر اور دوبارہ بیہوشی کی حالت میں گھسیٹ کر سیل میں پھینک گئے تھے۔ اُس شام وہ دونوں اُس کے سیل کے دروازے پر کھڑے تھے۔ وہ دروازہ تو نام کا تھا۔ لکڑی کے مضبوط فریم میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔

ان دو آدمیوں نے ایک آدمی کو اس طرح تھام رکھا تھا کہ دونوں نے اپنے بازو اُس کی بغلوں میں ڈال رکھے تھے۔ اس آدمی کا سر آگے کو گرا ہُوا تھا جیسے وہ ہوش میں نہ ہو۔ اُس میں اپنے بازوؤں پر کھڑا ہونے کی سکت نہیں تھی۔

"دروازہ کھول اوئے!" — ایک آدمی نے کہا — "اسے آج رات یہیں پھینک دو۔ کل نکال لیں گے۔"

"کل یہاں سے اس کی لاش ہی نکلے گی" ـــــ دوسرے آدمی نے ہنستے ہوئے کہا۔

دروازہ کھلا۔ دونوں اس آدمی کو اندر لاتے اور ہاشمی کے قریب فرش پر لٹا دیا۔

"لے بھائی!" ـــــ ایک آدمی نے ہاشمی سے کہا ـــــ "یہ آج رات تیرا مہمان ہوگا۔ اس کے منہ میں پانی ٹپکاتا رہ۔ ہوش میں آ جائے گا۔"

وہ دونوں چلے گئے اور دروازہ پھر بند ہوگیا۔

❋

کمرے میں مدھم سی روشنی کا بلب روشن تھا۔ ہاشمی نے اس آدمی کا چہرہ دیکھا تو وہ چونک اٹھا۔ اسے ہاشمی جانتا تھا۔ وہ اس کے محلے کا ایک جواں سال آدمی تھا۔ ہاشمی کی حویلی سے تقریباً پچاس قدم دور سے یہ گلی بائیں کو مڑتی تھی۔ اس موڑ سے چند قدم آگے اس آدمی کا مکان تھا۔ اس آدمی کا نام رشید تھا۔ مڈل کلاس کا آدمی تھا۔ ایک سرکاری محکمے میں اپر ڈویژن کلرک تھا۔ وہ محلے کا گمنام سا آدمی تھا۔ مسلمانوں میں اسے اتنی سی اہمیت حاصل تھی کہ وہ مسلمان تھا۔ اسے جمعہ کے روز اور عید کی صبح بھی کبھی مسجد میں نہیں دیکھا گیا تھا اور وہ کسی پڑوسی کے جنازے میں بھی کبھی شامل نہیں ہوا تھا۔ رسمی طور پر محلے کے کسی بھی بڑی عمر کے مسلمان کے قریب سے گزرتا تو اسے السلام علیکم کہنا نہیں بھولتا تھا۔

ہاشمی اسے انٹیلی جنس کے انٹیروگیشن سنٹر میں اس حالت میں دیکھ کر حیران ہوا۔ یہ پولیس سٹیشن نہیں تھا کہ اسے زخمی حالت میں یا بیہوشی کی حالت میں کوئی سڑک سے اٹھا کر یہاں چھوڑ گیا ہو۔ یہ ہسپتال بھی نہیں تھا۔ یہاں اسی کو لایا جاتا تھا جس پر جاسوسی کا شبہ ہوتا تھا۔ ہاشمی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ رشید کسی ملک کا جاسوس ہو سکتا ہے۔

سیل میں ایک گھڑا رکھا تھا جس میں پانی تھا۔ ہاشمی اٹھا اور گھڑے

سے گلاس بھر لایا۔ پہلے اس نے چلو بھر کر پانی کے دو چھینٹے رشید کے منہ پر مارے۔ رشید کی آنکھیں بند تھیں۔ چھینٹوں سے اس کا سر دائیں بائیں ہلا۔ ہاشمی نے ایک ہاتھ سے اس کا منہ کھولا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے منہ میں ایک گھونٹ پانی انڈیلا۔ رشید نے یہ گھونٹ حلق سے اتار لیا پھر اس کا منہ اپنے آپ ہی تھوڑا سا اور کھل گیا۔ ہاشمی نے اس کے منہ میں تھوڑا سا اور پانی انڈیل دیا۔ اس طرح ہاشمی نے رشید کو آدھا گلاس پانی پلا دیا۔

رشید نے آنکھیں کھولیں اور دائیں بائیں دیکھا۔

"رشید!" ـــ ہاشمی نے اس کے ماتھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بلایا۔

رشید نے ماتھا سکیڑ کر ہاشمی کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔

"میں کہاں ہوں؟" ـــــ رشید نے مری مری آواز میں پوچھا ـــــ "آپ؟ .... میں آپ کو شاید جانتا ہوں۔ آپ فرید الدین ہاشمی تو نہیں؟"

"ہاں رشید!" ـــ ہاشمی نے جواب دیا ـــــ "تم نے ٹھیک پہچانا ہے .... تم یہاں کیسے؟"

"مجھے اٹھائیں" ـــ رشید نے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

ہاشمی نے اسے سہارا دے کر اٹھایا۔ وہ سرک کر دیوار کے ساتھ ہو گیا اور پیٹھ دیوار کے ساتھ لگا لی۔ وہ کراہ رہا تھا۔ بار بار آنکھیں بند کر کے دانت پیستا تھا جس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ جسم میں کہیں ناقابل برداشت درد محسوس کر رہا ہے۔

"کہاں تکلیف ہو رہی ہے؟" ـــ ہاشمی نے پوچھا۔

"کوئی ایک جگہ ہو تو بتاؤں" ـــ رشید نے کراہتے ہوئے جواب دیا ـــ "ہر ہڈی دکھ رہی ہے۔ ہر جوڑ کھل گیا ہے" ـــ وہ ہانپنے لگا۔ ذرا دم لے کر بولا ـــ "ظالموں نے ہڈیاں توڑ دی ہیں۔"

"نہیں بولا جاتا تو نہ بولو" ـــ ہاشمی نے کہا ـــ "صرف یہ بتا دو کس جرم یا کس شبہے میں پکڑے گئے ہو؟"

"جاسوسی!" ـــ اس نے آنکھیں بھینچ کر دانت کٹکٹاتے ہوئے بڑی

مشکل سے کہا —— "اپنی حکومت کے خلاف نفرت پیدا کرنا اور مسلمانوں کو بغاوت پہ اُکسانا .... مجھے بولنے دیں ہاشمی صاحب! اتفاق سے مجھے آپ کے سیل میں پھوڑ گئے ہیں۔ مَیں آپ کی زمین دوز سرگرمیوں سے واقف ہوں۔ مَیں آپ کے ساتھ بہت ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"تم پر جاسوسی کا شُبہ صحیح نہیں ہو سکتا" —— ہاشمی نے کہا —— "تم نہ کسی کے بُرے میں نہ بھلے میں۔ تم کس کے جاسوس ہو سکتے ہو؟"

"پاکستان کا!" —— رشید نے کہا —— "یہی میری اُستادی تھی کہ میں نے ایسا رویہ اختیار کئے رکھا جیسے مَیں نہ کسی کے بھلے میں ہوں نہ بُرے میں۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ مَیں مسلمانوں کی بجائے ہندوؤں کے ساتھ گھُل مِل کر رہتا تھا مگر کسی نے مخبری کر دی اور مَیں پکڑا گیا۔"

"کب پکڑے گئے تھے؟"

"پرسوں" —— رشید نے جواب دیا —— "اِسی وقت .... یہاں لا کر انہوں نے میرے کپڑے اتروا دیئے اور پیٹ کے بَل برف پر لٹا دیا اور ایک آدمی کو میری پیٹھ پر بٹھا دیا۔ پندرہ بیس منٹ بعد ان کا ایک افسر آیا۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ اقبالِ جُرم کرتے ہو؟ اپنے تمام ساتھیوں کے نام پتے بتاتے ہو؟ میں نے کہا نہیں۔ مَیں نے کوئی جُرم نہیں کیا جس کا اقبال کروں۔ ایک گھنٹے بعد انہوں نے مجھے برف کے بلاک سے اٹھایا۔ میں کھڑا ہُوا اور چکرا کر گِر پڑا۔ انہوں نے مجھے اُٹھایا اور میری کلائیوں پر رسیاں باندھنے لگے ...."

"یہ تفصیل نہ سناؤ" —— ہاشمی نے اُس کی بات کاٹ کر کہا —— "مَیں اس ٹارچر سے گزر چکا ہوں .... کیا تم نے اقبالِ جرم کیا ہے؟"

"نہیں ہاشمی صاحب!" —— رشید نے ہانپتے ہُوئے کہا —— "میرے ہاتھ کاٹ دیں۔ میرے پاؤں کاٹ دیں۔ مَیں اقبالِ جُرم نہیں کروں گا۔ اپنے کسی ایک بھی ساتھی کا نام نہیں بتاؤں گا۔ ان کافروں کی نگاہ میں جو جُرم ہے اسے میں نیکی بلکہ جہاد سمجھتا ہوں۔ پاکستان کے لئے جاسوسی کو میں جہاد

سمجھتا ہوں۔"

رشید اب بولتے پہلے جیسی تکلیف محسوس نہیں کر رہا تھا۔

"اس کا مطلب یہ ہُوا کہ تم واقعی پاکستان کے جاسوس ہو" —— ہاشمی نے کہا۔

"آپ کو حیرت کیوں ہو رہی ہے ہاشمی صاحب؟" —— رشید نے کہا —— "کیا آپ مجھے کمزور ایمان والا مسلمان سمجھتے ہیں؟ کیا میرا ایمان آپ جیسا مضبوط نہیں؟ آپ نے جاسوسی کے جرم کا اقبال کر لیا ہے؟"

"ہم تو شبہے میں پکڑے ہُوتے ہیں رشید بھائی!" —— ہاشمی نے کہا "ہم نے کس کی جاسوسی کرنی ہے!"

"آپ کی یہ بات سُن کر مجھے خوشی ہوئی ہے" —— رشید نے کہا —— "خوشی اس بات کی کہ آپ اناڑی نہیں۔ اقبالِ جرم نہ کرنا۔"

"کیا کہہ رہے ہو رشید!" —— ہاشمی نے ذرا جھنجھلا کر کہا —— "یہ تم نے کیا اقبالِ جرم اقبالِ جرم کی رٹ لگا رکھی ہے؟"

رشید نے لمبا سانس لیا اور دروازے کی طرف دیکھا پھر ہاشمی کی طرف مُڑا۔

"مَیں نہیں چاہتا کہ آپ میرے آگے تسلیم کریں کہ آپ پاکستان کے لئے کام کر رہے ہیں" —— رشید نے کہا —— "آپ اور عبدالقدیر صاحب میرے بزرگ ہیں۔ مَیں آپ کو اپنے متعلق بتا دیتا ہوں۔ یہ تو بتا چکا ہوں کہ میں پاکستان کا جاسوس ہوں۔ ابھی مَیں آپ کو اپنے گروپ کے کسی ساتھی کا نام نہیں بتاؤں گا۔ میرے ساتھیوں میں سے تین کو آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ بعد میں بتاؤں گا وہ کون ہیں۔ میں کچھ عرصے سے جانتا تھا کہ آپ بھی یہی جہاد کر رہے ہیں۔ مَیں آپ سے ملنا چاہتا تھا لیکن اس لئے نہ ملا کہ ایک دوسرے سے الگ الگ ہی رہیں تو بہتر ہے۔ میں نے پاکستان میں جا کر ٹریننگ لی تھی۔ ٹریننگ میں یہ خاص طور پر بتایا جاتا ہے کہ رنگ کس طرح بے نقاب ہوتے ہیں۔ اگر مَیں اپنا رنگ آپ پر

اور آپ اپنا رنگ مجھ پر بے نقاب کر دیتے تو پکڑے جانے کی صورت
میں ہمارے دونوں رنگ پکڑے جاتے۔"

ہاشمی خاموشی سے سُن رہا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ رشید کی آواز جاندار
ہوگئی ہے۔

"کیا تم پاکستان سے باقاعدہ تنخواہ لے رہے ہو؟" ـــ ہاشمی نے
رشید سے پوچھا۔

"نہیں ہاشمی صاحب!" ـــ رشید نے جواب دیا ـــ "میں تو جہادِ
فی سبیل اللہ کا قائل ہوں۔ مَیں پاکستان کا تنخواہ دار ایجنٹ نہیں ہوں۔ اگر
آپ پکڑے نہ جاتے تو میں اب تک آپ سے مل چکا ہوتا.... آپ اپنے
متعلق کوئی بات نہیں کر رہے۔ یہ احتیاط اچھی ہے۔ آپ مجھے جانتے
ہیں۔ مَیں آپ کے لئے اجنبی نہیں لیکن اس معاملے میں مَیں آپ کے
لئے اجنبی ہوں.... آپ پاکستان گئے ہوں گے؟"

"کبھی نہیں گیا" ـــ ہاشمی نے کہا ـــ "رشتہ دار تو دُور کی بات ہے،
وہاں کوئی جان پہچان والا بھی نہیں۔"

"مَیں آٹھ بار جا چکا ہوں" ـــ رشید نے کہا ـــ "وہاں کاغذی رشتہ دار
بناتے ہوتے ہیں۔ میرے رشتہ دار تو پاکستان کی انٹیلی جنس کے افسر ہیں"
ـــ اُس نے ایک بار پھر دروازے کی طرف دیکھا اور سرگوشی میں ہاشمی
سے کہنے لگا ـــ "ہم نے عزیز کو ٹھکانے لگانے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر موقع
نہیں مل رہا تھا۔ خدا نے آپ کو موقع دے دیا اور عزیز کے قتل کی
سعادت آپ کو مل گئی۔"

"مجھے؟" ـــ ہاشمی نے حیرت سے پوچھا ـــ "تمہیں یہ خیال کس
طرح آیا ہے کہ عزیز کو مَیں نے قتل کیا ہے؟"

"آپ نے نہیں ہاشمی صاحب!" ـــ رشید نے کہا ـــ "آپ کے
آدمیوں نے.... مَیں آپ کو راز کی ایک بات بتاتا ہوں۔ آپ کا ایک
آدمی میرا دوست ہے۔ اُس نے مجھے بتایا تھا۔"

"کون ہے وہ؟"

"یہ نہیں بتاؤں گا" ـــ رشید نے کہا ـــ "آپ اپنے آپ پر پردہ
ڈال رہے ہیں۔ میں آپ کو اپنا بزرگ اور اپنا ہم خیال سمجھ کر اپنے راز
آپ کو دے رہا ہوں۔ معلوم نہیں یہ لوگ مجھے بے گناہ قرار دیں گے یا
ابھی اور ہڈیاں توڑیں گے۔ میں پاکستان پر جان قربان کر دوں گا۔
معلوم نہیں کہ پاکستان کی حکومت جس کسی کے بھی ہاتھ آتی ہے وہ انڈیا
کے معاملے میں بُزدل کیوں ہو جاتا ہے.... لیکن ہاشمی صاحب اصل چیز
پاکستان ہے۔ ہم پاکستان کی سلامتی کے لئے کام کر رہے ہیں، پاکستان
کی کسی حکومت کے لئے نہیں۔"

"پاکستان کی سلامتی سے تمہیں کیا ملے گا؟" ـــ ہاشمی نے پوچھا ـــ
"ہمیں کیا ملے گا؛ انڈیا کے مسلمانوں کو کیا حاصل ہوگا؟"

"آپ شاید میرا امتحان لے رہے ہیں" ـــ رشید نے کہا ـــ
"بہرحال میں آپ کے سوال کا جواب دے دیتا ہوں.... طاقتور پاکستان
انڈیا کے مسلمانوں کی سلامتی کا ضامن ہوگا۔ پاکستان اسلامی ملک ہے۔
ایک اسلامی ملک کی حفاظت ہم سب کا فرض ہے.... اس موضوع پر
میں آپ کے سامنے اظہارِ خیال نہیں کروں گا۔ یہ تو سورج کو چراغ دکھانے
والی بات ہوگی۔ مَیں عزیز کے قتل کی بات کر رہا تھا۔ آپ یا آپ کے آدمی
اُسے قتل نہ کرتے تو ہم کر دیتے۔"

"تم کس طرح پکڑے گئے ہو؟" ـــ ہاشمی نے پوچھا ـــ "کیا تمہیں
معلوم ہے مُخبری کس نے کی ہے؟"

"کوئی گھر کا بھیدی ہوگا" ـــ رشید نے جواب دیا ـــ "کوئی اپنا
مسلمان بھائی ہوگا۔"

"تمہارے ساتھ اور کتنے آدمی پکڑے گئے ہیں؟"

"دو" ـــ رشید نے جواب دیا ـــ "دونوں پاکستانی ہیں۔ انہیں ہم
نے انڈیا کا شہری بنا کر اپنی حفاظت میں رکھا ہوا تھا۔ مجھے پاکستان

کی انٹیلی جنس سے شرم آ رہی ہے کہ یہ دو پاکستانی پکڑے گئے ہیں۔"

❋

رات گزرتی جا رہی تھی۔ رشید ہاشمی کو سُنا رہا تھا کہ اُس نے پاکستان کو اب تک کتنی اہم انفارمیشن دی ہے اور کیسے خطرے مُول لئے ہیں۔ اُس نے عزیز کے قتل پر کئی بار ہاشمی کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ ہاشمی نے ایک بار بھی اعتراف نہ کیا کہ اُس نے پاکستان کے لئے کچھ کیا ہے۔ عزیز کے قتل سے وہ لاتعلقی کا اظہار کرتا رہا۔

"تم مسلمان گھرانے میں پیدا ہوتے تھے رشید!" — آخر ہاشمی نے کہا — "لیکن تم مسلمان کہلانے کے قابل نہیں۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ ہاشمی صاحب!" — رشید نے کہا۔

"تم مجھ سے نہیں اسلام سے غداری کر رہے ہو" — ہاشمی نے کہا — "تمہاری اس ایکٹنگ سے میں حیران نہیں ہُوا۔ تم ہندو کا نمک حلال کر رہے ہو۔ تمہارا باپ تو ایسا نہ تھا۔ اُس نے تحریکِ پاکستان میں جو کام کیا تھا وہ پاکستان کی تاریخ میں سنہرے حروف میں لکھنے کے قابل ہے۔ تم اپنے مرحوم باپ کی رُوح سے غداری کر رہے ہو.... اس ایکٹنگ کا تمہیں کتنا معاوضہ ملا ہے؟"

"کون سی ایکٹنگ ہاشمی صاحب؟" — رشید نے حیران سا ہو کے پوچھا۔

"تمہیں جب یہاں لا کر پھینکا گیا تو تم لاش کی طرح ساکت و جامد تھے" — ہاشمی نے کہا — "تم ہوش میں آتے تو تمہارے مُنہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔ دَرد کی شدت سے تم آنکھیں بھینچتے اور دانت پیستے تھے مگر تھوڑی ہی دیر بعد تم ترو تازہ ہو گئے۔ تمہاری آواز میں جان آگئی اور تم بھُول گئے کہ تمہیں دَرد سے کراہتے رہنا ہے۔ انہوں نے مجھ سے بیان لینے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ تم کو ایسی حالت میں یہاں چھوڑا گیا

جیسے تمہیں ناقابلِ برداشت اذیتیں دی گئی ہوں.... یاد رکھو رشید! ہندو تمہیں اتنا معاوضہ دیں گے جو تمہاری سال بھر کی تنخواہ جتنا ہو گا۔"

"مَیں دَرد کو برداشت کر رہا ہوں ہاشمی صاحب!" — رشید نے کہا — "آپ کو مجھ پر کیا شک ہو رہا ہے؟"

"صبح وہ تمہیں اس طرح یہاں سے لے جائیں گے جیسے تم ملزم ہو" — ہاشمی نے کہا — "اور تم ایکٹنگ کرو گے۔ اب سو جاؤ۔ مَیں اور زیادہ بیٹھ نہیں سکتا۔ مَیں تکلیف میں ہوں۔"

ہاشمی فرش پر بچھی ہوتی چٹائی پر لیٹ گیا اور اُس کی آنکھ لگ گئی۔

سَیل کا دروازہ کھُلا اور وہی دو آدمی اندر آتے جو گزشتہ رات رشید کو یہاں چھوڑ گئے تھے۔

"چل اوتے اُٹھ!" — اُن میں سے ایک نے رشید سے کہا۔

ہاشمی کی آنکھ کھُل گئی۔ اُس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ سورج طلوع ہو چکا تھا۔ رشید کو اُٹھا کر رات والے دونوں آدمی سَیل سے نکل گئے۔

ہاشمی کو رشید پر ایک تو اس لئے شک ہُوا تھا کہ دو ملزموں یا مشتبہوں کو تفتیش کے دوران اکٹھا نہیں رکھا جاتا تھا۔ ہاشمی کو یہ بھی معلوم تھا کہ ساتھ والا سَیل خالی تھا۔ اس سے اُس کا شک مزید پختہ ہو گیا۔ رشید کو ہاشمی کے سَیل میں لانے والوں نے کہا تھا کہ اور کوئی سَیل خالی نہیں۔ ہاشمی جان گیا کہ رشید کو اُس کے پاس بھید لینے کے لئے اس حالت میں چھوڑا گیا ہے جیسے وہ زیرِ تفتیش ملزم ہو۔

ہاشمی کو عبدالقدیر کی باتیں بھی یاد آگئیں۔ عبدالقدیر اُس کا گہرا دوست تھا۔ دونوں کی ملاقات ہر روز ہوتی اور عبدالقدیر اکثر ہاشمی کو تفتیش کے طریقے سناتا رہتا تھا۔ ان میں ایک طریقہ یہ تھا کہ کوئی مشتبہ یا ملزم بیان

دینے پر رضامند نہیں ہوتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بے گناہ کہتا چلا جاتا تھا۔
یہ معلوم کرنے کے لئے کہ یہ شخص زیرِ تفتیش جرم میں ملوث ہے یا نہیں، کسی آدمی کو رشید کی طرح اُس کے سیل میں پھینک دیا جاتا تھا۔ اُس کی حالت ایسی ہی ہوتی تھی جیسی رشید کی تھی۔ وہ ملزم یا مشتبہ سے کوئی نہ کوئی بات اُگلوا لیتا تھا۔

یہ طریقہ اس طرح بھی استعمال کیا جاتا تھا کہ کسی نئے ملزم یا مشتبہ کو لایا جاتا تو اُس پر تھرڈ ڈگری آزمانے سے پہلے کسی آدمی کو اسی طرح بے ہوشی کی حالت میں اُس کے سیل میں پھینک دیا جاتا تھا جو کچھ دیر بے ہوشی میں بُری طرح کراہتا پھر ہوش میں آکر تڑپنے، چیخنے اور درد کی شدت کا اظہار کرنے کی ایکٹنگ کرتا تھا۔ پھر وہ نئے مشتبہ کو ڈرانے کے لئے کہتا تھا کہ وہ اقبالِ جرم کر لے ورنہ اُس کی یہ حالت کر دی جائے گی۔

ہاشمی رشید کو جانتا تھا۔ وہ رشید سے اس جرأت مندانہ جہاد کی توقع نہیں رکھ سکتا تھا جو وہ بتاتا تھا۔ ہاشمی نے یہ بھی دیکھا تھا کہ رشید کے لئے تو سانس لینا بھی محال نظر آتا تھا لیکن چند منٹوں میں اُس نے صحت مند آدمی کی طرح باتیں شروع کر دیں۔ ایک بار بھی اُسے درد کی ٹیس نہ اُٹھی۔ اس کے علاوہ اُس نے جتنی باتیں کیں وہ مشکوک تھیں۔
یہ عبدالقدیر کی ٹریننگ کا اثر تھا کہ ہاشمی رشید کی باتوں میں نہ آیا۔ رشید نے اسلام اور پاکستان کے نام پر ایسی جذباتی اور جوشیلی اور ایمان افروز باتیں کی تھیں کہ کوئی بھی مسلمان متاثر ہو کر جوش میں آسکتا تھا۔ ہاشمی کی شخصیت پختہ تھی اس لئے وہ چُپ چاپ رشید کی باتیں سُنتا رہا اور اُسے کچھ بھی نہ بتایا۔

"یہ تو بڑا پکا آدمی معلوم ہوتا ہے"—— رشید کرنل اوجھا کے دفتر میں بیٹھا اُسے بتا رہا تھا —— "یہ پکا اور منجھا ہُوا مجرم ہے یا بے گناہ۔"
میجر بھاٹیہ بھی وہاں موجود تھا۔ رشید نے اُنہیں تفصیلاً سُنایا کہ اُس

نے کیسی ایکٹنگ کی تھی اور کیا کچھ کہا تھا۔
"عبدالقدیر پر یہ طریقہ نہیں آزمایا جا سکتا"—— کرنل اُوجھا نے کہا —— "وہ ہمارے ہی محکمے کا ریٹائرڈ آدمی ہے۔ ویسے بھی پکّا اُستاد ہے۔"
"ایسے طریقے تو وہ خود آزماتا رہا ہے"—— میجر بھاٹیہ نے کہا۔
"آپ نے مجھے بہت دیر سے بتایا"—— رشید نے کہا —— "اگر کچھ عرصہ پہلے مجھے اُس ہاشمی وغیرہ کے پیچھے لگایا گیا ہوتا تو مَیں آپ کو صحیح رپورٹ دیتا۔"
"تم عزیزہ کے بہنوئی جمیل کے پیچھے لگے رہو"—— کرنل اوجھا نے کہا —— "ذرا انتظار کرو۔ میں بریگیڈیئر سے بات کر لوں۔"
کچھ دیر بعد کرنل اُوجھا انٹیلی جنس کے بریگیڈیئر کے ساتھ اپنے میجر جنرل کے پاس بیٹھا تھا اور رپورٹ دے رہا تھا کہ اپنے ایک آدمی (رشید) کو ہاشمی کا سینہ کھولنے کے لئے استعمال کیا گیا تھا لیکن یہ طریقہ بھی ناکام رہا۔
"ان دونوں کے خلاف مقدمہ تیار کر لو اور متعلقہ منسٹری کو بھیج دو" —— چیف نے کہا —— "شہادت بنا لو۔"
"شہادت تیار کرنا کوئی مشکل کام نہیں سر!"—— بریگیڈیئر نے کہا۔

❋

پاکستان میں آئی ایس آئی مزید گرفتاریوں میں مصروف تھی۔
رابی کا باپ ابھی مری میں تھا۔ اُس کے دل کا مرض بڑھا تو نہیں تھا لیکن کم بھی نہیں ہُوا تھا۔ وہ بدستور دوائیاں لے رہا تھا۔ جُونہی اُسے رابی کا خیال آتا اُس پر گھبراہٹ طاری ہو جاتی اور سینے میں بائیں طرف ہلکا ہلکا درد ہونے لگتا تھا۔ اُس پر ہر وقت افسردگی طاری رہتی تھی۔ اُس کا گھرانہ بکھر گیا تھا۔ ایک ہی بیٹا تھا جو آئی ایس آئی کے ایک سیل میں جاسوسی کے الزام میں بند پڑا تھا۔ یہ بیٹا تو اُس کے لئے جیتے جی مر گیا تھا۔ تفتیش کے بعد مقدمہ اور مقدمے کے بعد اُسے بڑی لمبی قید

بھگتنے کے لئے جیل میں چلے جانا تھا۔ رابی کے باپ کو یہ پریشانی بھی لگی ہوتی تھی کہ جب اُس کے بیٹے کا مقدمہ شروع ہوگا تو اخباروں میں خبر آئے گی اور ان خبروں میں اُس کا نام بھی آئے گا کہ فلاں کا بیٹا جاسوسی کے جُرم میں پکڑا گیا ہے۔

رابی کے باپ کو اب عبادت اور وِرد وظیفوں میں سکون ملتا تھا۔ یہ عمر تو اُس کے آرام کی تھی لیکن اُس کے لئے صورت یہ پیدا ہوگئی تھی کہ بیٹا ساری عمر کے لئے جیل جا رہا تھا، اُس کی بیوی لاہور میں تھی، دونوں بیٹیاں اپنے اپنے سُسرال میں تھیں اور وہ خود ایک نوکر کے رحم و کرم پر مری میں تھا۔ ڈاکٹروں نے اُسے چلنے پھرنے کی اجازت دے رکھی تھی لیکن چڑھائی چڑھنے سے منع کر دیا تھا۔ صرف اللہ ہی تھا جو اُس کا مونس و غمخوار تھا۔ وہ اللہ کی عبادت میں مصروف رہتا اور اللہ سے ہی ہمکلام ہوتا تھا۔

پاکستان کے معاشرتی حالات پہلے جیسے ہی تھے۔ جُوں جُوں پاکستانی بچوں کا شعور بیدار ہوتا جا رہا تھا ڈسکو میوزک اور اس کے نام پر ہلڑبازی اور انڈین فلموں کے ویڈیو کیسٹوں کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ قرآن اور اذان کی مقدس آوازوں میں اور تیغوں کے سائے میں پرورش پانے والے بچے انگلش میوزک اور انڈین فلموں کے گانوں کے شور و غل میں پرورش پا رہے تھے۔

نئی دِلی میں پاکستان کے نام پر قربان ہونے والے دو مجاہدوں کے خلاف بغیر شہادت کے مقدمہ تیار ہو رہا تھا۔ ایک مجاہدہ کی لاش دِلی کے ایک میڈیکل کالج میں چیری پھاڑی جا چکی تھی اور طلباء کو اس پہ لیکچر دیا جا چکا تھا پھر یہ لاش کہیں دفن کر دینے کے لئے کالج کے متعلقہ آدمیوں کے حوالے کر دی گئی تھی۔ ان آدمیوں نے لاش کی کھوپڑی اور ہڈیوں سے گوشت الگ کر لیا تھا۔ اُنھوں نے یہ ہڈیاں چوری چھپے طلباء

کے ہاتھ بیچی تھیں۔

آئی ایس آئی کے کیپٹن، میجر اور ایک لیفٹیننٹ کرنل گرفتاریوں میں مصروف تھے اور اس محکمے کے سب سے بڑے افسر کو پاکستان کے سربراہ نے اپنے پاس بٹھا رکھا تھا اور اُس کے سامنے ایک فہرست رکھ کر بتا رہا تھا کہ یہ چند ایک آدمی اُس کے ذاتی مخالفین نہیں بلکہ ملک کے دُشمن ہیں اور تخریب کاروں کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔

ملک کا سربراہ آئی ایس آئی کی مدد سے اپنے اقتدار کو مستحکم اور طویل کرنے کے جتن کر رہا تھا۔ اس طرح آئی ایس آئی دو رول ادا کر رہی تھی۔ ایک اُس کا اصل رول تھا اور دوسرا رول حکمرانوں نے اسے دے رکھا تھا۔ یہ تھا حکمرانوں کے مخالفین کی سرکوبی۔

❄

کم و بیش ایک مہینے بعد ہاشمی اور عبدالقدیر کا مقدمہ تیار ہوگیا اور وزارتِ داخلہ کے سُپرد کر دیا گیا۔ وزارتِ داخلہ نے جونہی دیکھا کہ مقدمہ جاسوسی کا ہے اور اس میں دو مسلمان ملوث ہیں تو اس وزارت نے مقدمہ عدالت میں بھیجنے کا حکم دے دیا۔ اس کے ساتھ اس وزارت کی طرف سے ایک خبر تیار کر کے اخباروں، ٹی وی اور ریڈیو کو بھیج دی گئی۔ خبر کی سُرخی تھی کہ دِلی میں پاکستان کے دو خطرناک جاسوس پکڑے گئے ہیں۔ سنسنی خیز انکشافات کی توقع ہے۔

ہاشمی اور عبدالقدیر کو جیل کی حوالات میں بھیج دیا گیا۔ انہیں اُس وارڈ میں رکھا گیا جس میں جاسوسی، دہشت گردی اور تخریب کاری کے ملزموں کو مقدموں کا فیصلہ ہونے تک رکھا جاتا تھا۔ سزا ہو جانے کی صورت میں انہیں سزا یافتہ قیدیوں کی بارکوں میں بھیج دیا جاتا تھا۔ ہاشمی اور عبدالقدیر کے اس وارڈ میں دس کوٹھڑیاں تھیں۔ تین میں تین سکھ تھے۔ دو میں دو نیم پاگل سے آدمی تھے جو اپنے آپ کو سیاسی قیدی کہتے تھے۔ دو کوٹھڑیاں خالی تھیں۔ وارڈ کے اِرد گرد اُونچی دیوار تھی جس میں سلاخوں والا ایک

دروازہ تھا۔ یہ دن رات بند رہتا تھا۔ کوٹھڑیاں علی الصبح کھل جاتی تھیں۔ قیدی آپس میں مل سکتے تھے۔ سورج غروب ہوتے ہی قیدی اپنی اپنی کوٹھڑی میں چلے جاتے اور انہیں مقفل کر دیا جاتا تھا۔

اس وارڈ میں جب یہ دو نئے قیدی آتے تو تینوں سکھ قیدیوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ان دونوں قیدیوں کے حلیے بگڑے ہوتے تھے۔ انٹیلی جنس کے انٹروگیشن سنٹر میں مسلسل ایذارسانی، ناقص خوراک اور غلیظ کوٹھڑیوں میں اتنے دن رہنے کی وجہ سے اُن کے چہرے ایسے ہو گئے تھے کہ وہ ایک دوسرے کو پہچاننے میں دشواری محسوس کر رہے تھے۔ اُن کی داڑھیاں بڑھ آئی تھیں۔ آنکھیں قریب المرگ مریضوں کی طرح نیم وا اور غلیظ ہو گئی تھیں۔ سر کے بال بکھرے ہوتے تھے۔ ایذارسانی نے اُن کے جسموں کی حالت ایسی کر دی تھی کہ وہ اچھی طرح چل بھی نہیں سکتے تھے۔

سکھوں نے اُن پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ یہ چند ایک قدرتی سوال تھے جو ہر نئے قیدی سے پرانے قیدی پوچھا کرتے تھے — کیسے گرفتار ہوئے؟ الزام کیا ہے؟ ہندو یا مسلمان؟ چالان عدالت میں چلا گیا ہے یا نہیں؟ کوئی شہادت ہے؟ کوئی وعدہ معاف گواہ تو نہیں؟ اور ایسے ہی دو چار اور سوال تھے جو پرانے قیدی نئے قیدیوں سے پوچھتے تھے۔

"سیاسی چکر ہے سردار جی!" — عبدالقدیر نے سکھوں سے کہا — "ہم مسلمان ہیں۔ دِلی کے ہی رہنے والے ہیں۔"

دونوں کو ان کی کوٹھڑیاں دکھا دی گئیں اور جیل کا سنتری چلا گیا۔

دونوں نیم پاگل سیاسی قیدی بھی آ گئے۔ انہیں بھی عبدالقدیر نے بتایا کہ وہ اور ہاشمی سیاسی قیدی ہیں۔ اُن دونوں نے بیک وقت اپنی حکومت کے خلاف بولنا شروع کر دیا۔ دونوں ہندو تھے۔ انہوں نے مہاتما گاندھی سے لے کر اندرا گاندھی اور اُس کے بیٹوں تک تمام لیڈروں کو بُرا بھلا کہا۔ وہ سکھوں کی علیحدگی پسند تحریک کی حمایت کر رہے تھے۔ کشمیر اور

ملک کے دوسرے علاقوں میں ہندوؤں کے ہاتھوں مسلمانوں کے قتلِ عام کے خلاف بول رہے تھے۔ اچھوتوں کو برہمنوں کے مقابلے میں قابلِ قدر انسان کہتے تھے۔ باتیں بالکل صحیح اور پتے کی کرتے تھے لیکن اُن کے بولنے کا انداز ایسا تھا کہ ذہنی طور پر نارمل نہیں لگتے تھے۔

❊

دو تین دنوں میں تینوں سکھ ہاشمی اور عبدالقدیر کے ساتھ بے تکلف ہو گئے۔ پتہ چلا کہ ان میں دو گریجوئیٹ ہیں اور ایک میٹرک پاس ہے۔ وہ عمر میں ان دونوں سے بڑا تھا۔ یہ تینوں دِلی میں سرکاری ملازم تھے اور خالصتان کے لئے تینوں زمین دوز سرگرمیوں میں ملوث پائے گئے۔ انہوں نے دہشت گردی کی بھی ایک واردات کی تھی لیکن پولیس کو ان کے خلاف شہادت نہیں مل رہی تھی۔ ان کے خلاف حکومت کے خلاف باغیانہ سرگرمیوں کے الزام میں مقدمہ زیرِ سماعت تھا۔

صبح جب کوٹھڑیاں کھلتی تھیں تو تینوں سکھ ہاشمی اور عبدالقدیر کے پاس آ جاتے یا یہ دونوں کسی سکھ کی کوٹھڑی میں جا بیٹھتے اور گھنٹوں باتیں کرتے رہتے۔

"اگر پاکستان اور ہندوستان کے مسلمان سکھوں کا ساتھ دیں تو ہم مل کر ہندوستان کو کئی ٹکڑوں میں تقسیم کر دیں" — ایک روز ایک سکھ جگجیت سنگھ سندھو نے ہاشمی اور عبدالقدیر سے کہا — "لیکن پاکستان کی حکومت معلوم نہیں کیا سوچ رہی ہے۔ ہندوستان کی حکومت نے ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان میں خود گڑبڑ پیدا کر کے اعلان کر دیا تھا کہ مشرقی پاکستان ہندوستان کا مسئلہ ہے۔ اب پاکستان کہہ سکتا ہے کہ مشرقی پنجاب میں سکھوں کا مسئلہ پاکستان کا مسئلہ ہے۔"

"اگر پاکستان سکھوں کی مدد کرے تو ہندوستان پاکستان پر حملہ کر دے گا" — دوسرے سکھ درشن سنگھ نے کہا — "لیکن ہندوستان کی فوج لڑے گی کہاں؟ .... مشرقی پنجاب کی سرحد پر۔ یہ سارا علاقہ سکھوں

کا ہے۔ سکھ پیچھے سے انڈین آرمی پر حملے کریں گے اور اس کی سپلائی
آگے جانے ہی نہیں دیں گے۔ اس کے علاوہ تمام سکھ رجمنٹیں باغی ہو
کر پاکستان کی فوج کے پاس چلی جائیں گی۔ یہ میں نہیں کہہ رہا۔ یہ ہمارے
لیڈروں کا پلان ہے۔"

"اندازہ کریں ہندوستان میں کتنے کروڑ مسلمان ہیں"— تیسرے
سکھ منگل سنگھ نے کہا — "بارہ کروڑ کے لگ بھگ تو ہوں گے۔ جس طرح
پاکستان کا نعرہ لے کر مسلمان سن چھیالیس سنتالیس میں متحد ہوئے تھے اسی
طرح اب پھر ایک محاذ بنالیں تو ہندوستان میں ایک اور پاکستان بنا سکتے
ہیں۔ پھر دیکھنا اس ملک کے کتنے ٹکڑے ہوتے ہیں۔"

اس موضوع پر ان کی باتیں شروع ہوئیں پھر ہر روز وہ اسی موضوع
پر تبادلہ خیالات کرنے لگے۔ تینوں سکھ حقیقت پسند تھے اور اُن کی باتیں
پُر مغز تھیں۔ انہوں نے عملاً بھی بہت کچھ کیا تھا۔ انہیں پکڑے جانے
کا ذرا سا بھی غم نہیں تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ انہیں بڑی لمبی سزائے قید
ملے گی لیکن وہ مایوس نہیں تھے۔

"ہم نے ایک نہ ایک روز جیل سے فرار ہونا ہے"— جگجیت سنگھ
نے کہا — "مقدمے کا فیصلہ ہو لے تو دیکھیں گے۔"

ہاشمی اور عبدالقدیر ان سکھوں سے بہت متاثر ہوئے۔ ایک
روز عبدالقدیر نے انہیں بتا ہی دیا کہ وہ دونوں جاسوسی کے الزام
میں پکڑے گئے ہیں۔

"کیا تم پاکستان کے ایجنٹ تھے؟"— درشن سنگھ نے پوچھا —
"پاکستان سے پیسے ملتے تھے؟"

"نہیں بھائی!"— عبدالقدیر نے کہا — "یہ کام ہم اپنے طور
پر کرتے تھے۔ ہم پاکستان کو مضبوط کرنا چاہتے ہیں۔ پاکستان میں جو
کمزوریاں ہیں وہ پاکستان کے وجود کی وجہ سے نہیں، یہ پاکستان کے

حکمرانوں کی کمزوریاں ہیں۔"

ان سکھ قیدیوں پر اپنا یہ راز فاش کر دینا اب خطرناک نہیں
تھا۔ تفتیش مکمل ہو چکی تھی اور مقدمہ عدالت میں چلا گیا یا جانے والا تھا۔
عبدالقدیر نے ان سکھوں کو پوری تفصیل سے سنایا کہ انہوں نے کیسا
محاذ بنا رکھا ہے اور کیا کیا کارروائیاں کی تھیں۔ سکھوں نے یہ تفصیل
سُن کر خوشی کا اظہار کیا۔

"آپ کو اپنی گرفتاری اور سزا کا افسوس نہیں ہونا چاہیئے"—
منگل سنگھ نے کہا — "یہ قربانیاں تو دینی ہی پڑتی ہیں۔ ہم تین دوست
گرفتار ہو گئے ہیں۔ ہم جیل میں بیٹھ کر اپنی آزاد ریاست خالصتان نہیں
بنا سکتے لیکن ہماری یہ قربانی رائیگاں نہیں جائے گی۔ ہم نے ایک
مثال قائم کی ہے۔ ہم تین قید ہو گئے ہیں تو تین اور سکھ ہماری جگہ
میدان میں آجائیں گے۔ آپ نے جو محاذ بنایا ہے، اگر آپ کے پیچھے
کوئی آدمی ہیں تو وہ آپ کے محاذ کو زندہ رکھیں گے۔ تحریکیں اسی طرح
زندہ رہتی اور کامیاب ہوتی ہیں۔ ایک رات میں کامیابی حاصل نہیں
ہُوا کرتی۔"

عبدالقدیر اور ہاشمی کو توقع نہیں تھی کہ سکھ ایسی دانشمندانہ باتیں
کر سکتے ہیں۔ ان سکھوں کی دانشمندی کا باعث ایک تو یہ تھا کہ ان میں
دو گریجویٹ تھے اور ایک میٹریکولیٹ تھا اور اصل وجہ یہ تھی کہ اُن
کے سامنے ایک واضح نصب العین تھا جو اُن کا جائز حق تھا۔

"کیا آپ کے پیچھے کام کرنے والے آدمی موجود ہیں؟"—
درشن سنگھ نے پوچھا۔

"ہیں تو سہی!"— عبدالقدیر نے جواب دیا — "لیکن لیڈر ہم
دونوں تھے۔ ہم اندر ہو گئے ہیں۔ پیچھے جو ہیں وہ جذبے والے تو ہیں لیکن
اُن کی راہنمائی کرنے والا کوئی نہیں۔"

"پرواہ نہیں"— درشن سنگھ نے کہا — "جذبہ زندہ رہے تو

سارے کام ٹھیک ہو جاتے ہیں۔"

"انکل جی!" — منگل سنگھ نے عبدالقدیر کے کندھے پر زور سے ہاتھ مار کر کہا — "دُعا کرو تم دونوں کے مقدمے کا فیصلہ ہمارے فیصلے کے ساتھ ہو اور ہمیں کسی ایک جیل میں رکھیں، پھر دیکھنا ہم تمہیں کس طرح فرار کراتے ہیں۔"

"لیکن ہم جائیں گے کہاں؟" — عبدالقدیر نے پوچھا اور کہنے لگا — "انڈیا میں تو ہم رہ نہیں سکیں گے۔"

"اگر رہے بھی تو کیڑوں مکوڑوں کی طرح چھُپ چھُپ کر رہنا پڑے گا" — ہاشمی نے کہا۔

"ہم تمہیں پاکستان کا بارڈر کراس کرا دیں گے" — جگجیت سنگھ نے کہا اور پوچھا — "کیا پاکستان میں تم دونوں کا اپنا کوئی عزیز ہے؟"

"نہیں!" — عبدالقدیر نے جواب دیا — "مجھے یہ امید ہے کہ پاکستان کی انٹیلی جنس ہم دونوں کے ناموں سے واقف ہے .... سردار صاحب! آپ اس طرح باتیں کر رہے ہیں جیسے آپ واقعی ہمیں فرار کرا لیں گے۔"

"اگر موقع ملا تو پھر بات کریں گے" — جگجیت سنگھ نے کہا — "تم جس کو خدا مانتے ہو، ہمارا بھی وہی خدا ہے۔ خدا کی راہ میں نیک کام کرنے والوں کی خدا مدد کرتا ہے۔ دُعا کرو کہ موقع مل جائے۔"

جیل سے فرار ایک خواب تھا جو یہ دو مسلمان اور تین سکھ قیدی دیکھتے رہتے تھے۔

❄

پہلے سکھوں کے مقدمے کی سماعت شروع ہوئی۔ کچھ دنوں بعد ہاشمی اور عبدالقدیر کا مقدمہ بھی شروع ہو گیا۔

ہاشمی اور عبدالقدیر کو پہلی پیشی پر ہتھکڑیوں میں عدالت میں لے جایا گیا۔ یہ عدالت سپیشل کورٹ تھی جس میں جاسوسی، تخریب کاری اور دہشت گردی کے مقدمات کی سماعت ہوتی تھی۔ پبلک پراسیکیوٹر نے

وہ الزامات پڑھ کر جج کو سنائے جو ہاشمی اور عبدالقدیر پر عائد کیے گئے تھے۔ استغاثہ کی یہ تحریر بڑی ہی پُر زور تھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ دونوں ملزم انڈیا کے خلاف پاکستان کے لیے بڑے ہی خطرناک کام کرتے پکڑے گئے ہیں اور یہ کیس انڈین انٹیلی جنس کا ہے اس لیے ان دفعات کی انتہائی سزا ملنی چاہیے۔

"کیا تم دونوں نے یہ الزامات اچھی طرح سُن اور سمجھ لیے ہیں؟" — جج نے ہاشمی اور عبدالقدیر سے پوچھا۔

"بڑی اچھی طرح سمجھ لیے ہیں جناب والا!" — عبدالقدیر نے جواب دیا۔

"اور مَیں نے بھی!" — ہاشمی نے کہا۔

"کیا آپ ان الزامات کو قبول کرتے ہیں؟" — جج نے پوچھا۔

"نہیں!" — دونوں ملزموں نے پُر جوش آواز میں جواب دیا۔

"آپ کا وکیل نہیں ہے؟" — جج نے پوچھا۔

"ہے!" — عبدالقدیر نے جواب دیا — "لیکن وہ جناب کو نظر نہیں آئے گا۔ ہمارا وکیل اللہ ہے۔"

"تم اس وقت مسجد میں نہیں عدالت میں کھڑے ہو" — جج نے قدرے غصے سے کہا — "اس عدالت میں تمہیں وکیل لانا پڑے گا۔"

"ہمارے پاس کچھ نہیں ہے" — عبدالقدیر نے کہا — "ہم قید میں ہیں۔ وکیل نہیں لا سکتے۔"

"تمہیں گورنمنٹ کے خرچ پر وکیل دیا جائے گا" — جج نے کہا — "یہ وکیل تمہارے پاس جیل میں آئے گا اور تم اُس کے ساتھ اپنی صفائی کے متعلق بات کر لینا۔"

"جناب والا!" — ہاشمی نے کہا — "جو وکیل ہمیں وہ گورنمنٹ دے گی جس نے ہم پر الزام عائد کیے ہیں، وہ ہماری صفائی میں اس حکومت کو

جھوٹا ثابت نہیں کرے گا۔ ہم وکیل کے بغیر مقدمہ لڑیں گے۔"

"ایسے نہیں ہو سکتا" — جج نے کہا — "قانون کا تقاضا ہے کہ ملزموں کا وکیل ہونا چاہیے۔ اگر تمہیں گورنمنٹ کے دیے ہوئے وکیل پر اعتماد نہیں تو اپنا وکیل لے آؤ .... اگر چاہو تو تمہیں مسلمان وکیل دے دیا جائے گا۔"

"نہیں جنابِ والا!" — عبدالقدیر نے کہا — "ہم کسی مسلمان وکیل کو گرفتار نہیں کروانا چاہتے۔ ہمارا اصل جرم یہ ہے کہ ہم مسلمان ہیں۔ کوئی مسلمان وکیل حکومت کے خلاف بولنے کی جرأت نہیں کرے گا۔"

"میں تمہیں یہ یقین دلا سکتا ہوں کہ اس عدالت سے تمہیں انصاف ملے گا" — جج نے کہا۔

"کیا میری بیوی کے قاتلوں کو آپ سزا دیں گے؟" — ہاشمی نے پوچھا۔

"یہ سوال اُس عدالت میں کرنا جس میں تمہاری بیوی کے قاتلوں کو پیش کیا جائے گا" — جج نے کہا۔

"جنابِ والا!" — ہاشمی نے کہا — "قاتل تو مدعی اور گواہ بن کر آپ کی عدالت میں پیش ہوں گے" — اس کی آواز بلند ہو گئی — "انہوں نے تفتیش کے دوران میری پردہ نشین بیوی کو اتنی اذیتیں دی ہیں کہ وہ مر گئی ہے۔"

"اپنے وکیل کے ساتھ بات کرنا" — جج نے کہا اور پیشی کی اگلی تاریخ دے دی۔

❄

تینوں سکھوں کا مقدمہ بھی اسی عدالت میں چل رہا تھا۔ جج اس کیس کی اور ہاشمی اور عبدالقدیر کے کیس کی بھی لمبی تاریخیں نہیں دیتا تھا۔ بعض اوقات وہ صرف دو دنوں بعد کی تاریخ دے دیتا تھا جس سے پتہ چلتا تھا کہ اُسے دونوں کیس جلدی ختم کرنے کا حکم ملا ہے۔

ہاشمی اور عبدالقدیر کو ایک عیسائی وکیل دیا گیا تھا۔

"میں پوری دیانتداری سے کیس لڑوں گا" — اس وکیل نے کیس کی فائل دیکھ کر انہیں کہا تھا — "لیکن اس عدالت سے انصاف کی امید نہ رکھنا۔ کیس انٹیلی جنس کا ہے اور الزام کے مطابق آپ دونوں کا تعلق پاکستان کے ساتھ بنتا ہے۔ پاکستان کے متعلق ہماری حکومت بہت حساس ہے۔"

جیل میں ان کے سکھ ساتھیوں نے انہیں بتایا تھا کہ اُن کے مقدمے میں جج اُن کے وکیل کی سنتا ہی نہیں۔

"سرکاری وکیل جو کہے جج مان لیتا ہے" — ایک روز درشن سنگھ نے انہیں بتایا تھا — "ہمارا وکیل گواہوں پر جرح کرتا ہے تو سرکاری وکیل اُس کے کئی سوالوں پر اعتراض کر کے سوال نامنظور کرا دیتا ہے۔ ہمارا وکیل کوئی معمولی وکیل نہیں لیکن جج اور سرکاری وکیل اُسے چلنے ہی نہیں دیتے۔"

ہاشمی اور عبدالقدیر کے خلاف گواہیاں شروع ہوئیں تو دونوں حیران رہ گئے۔ ہر گواہ جھوٹا تھا۔ حد یہ کہ ایک وعدہ معاف گواہ بھی عدالت میں پیش کیا گیا جس نے بیان دیا کہ وہ ہاشمی اور عبدالقدیر کا ساتھی ہے اور وہ پاکستان کے لیے جاسوسی کرتے تھے۔ اس جھوٹے وعدہ معاف گواہ نے یہ بھی کہا کہ انہوں نے انڈیا کی انٹیلی جنس کے ایک پاکستانی ایجنٹ کی بیوی کو اغوا کیا اور کچھ دنوں بعد اسے واپس چھوڑ گئے تھے۔ اس گواہ نے اپنے بیان میں یہ ظاہر کیا کہ وہ ہاشمی اور عبدالقدیر کے ساتھ ان جرائم میں شریک رہا ہے۔

صرف دو مہینوں میں تمام گواہ بھگت گئے۔ صفائی کا وکیل چیختا چلاتا رہ گیا۔ اُس کے کئی سوال مسترد کر دیے گئے۔ آخر اسے کہا گیا کہ وہ صفائی کے گواہ پیش کرے۔ ہاشمی اور عبدالقدیر کے پاس صفائی کا ایک بھی گواہ نہ تھا۔ اُن کے وکیل نے انہیں ضمانت پر رہا کرنے کی درخواست دی تھی لیکن یہ اس وجہ سے مسترد کر دی گئی کہ یہ جاسوسی اور تخریب کاری

کا کیس ہے جس میں ضمانت پر رہائی کی گنجائش نہیں۔ ہائی کورٹ نے بھی ضمانت منظور نہیں کی تھی۔

"کیا ملزم بیان دینا چاہتے ہیں؟" — جج نے پوچھا۔

"جنابِ والا!" — عبدالقدیر نے کہا — "آپ نے کہا تھا کہ اس عدالت میں ہمیں انصاف ملے گا۔ کیا دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت میں انصاف اسے کہتے ہیں کہ جھوٹے گواہ پیش کر کے ملزموں کو صفائی کے گواہ پیش کرنے کی بھی سہولت نہ دی جائے؟"

"گواہوں کے ایڈریس دے دو" — جج نے کہا — "انہیں کورٹ میں بلا لیا جائے گا۔"

"انڈین انٹیلی جنس کے ایک پاکستانی ایجنٹ رب نواز عرف رابی کا نام اِس کیس میں آیا ہے" — عبدالقدیر نے کہا — "کہا گیا ہے کہ ہم نے اس کی بیوی کو دِلی میں اغوا کیا تھا۔ ہم دونوں ملزم درخواست کرتے ہیں کہ رابی اور اس کی بیوی کو عدالت میں پیش کیا جائے۔"

"کیا انہیں پیش کیا جا سکتا ہے؟" — جج نے پبلک پراسیکیوٹر سے پوچھا۔

"نہیں جنابِ والا!" — پبلک پراسیکیوٹر نے جواب دیا — "یہ انٹیلی جنس کا معاملہ ہے۔ کسی ایجنٹ کی چہرہ نمائی نہیں کی جا سکتی۔ اس کے علاوہ یہ دونوں، رابی اور رِشی پاکستان میں ہیں۔ وہاں سے انہیں بلانا ناممکن ہے.... جنابِ والا! ملزم اگر بیان دینا چاہتا ہے تو بیان دے۔ ملزم کو مطالبات پیش کرنے کی اجازت نہیں دی جانی چاہیئے۔ یہ نکات اِن کے وکیل کو پیش کرنے چاہئیں۔"

"اگر تم دونوں بیان دینا چاہتے ہو تو صرف بیان دو" — جج نے ہاشمی اور عبدالقدیر سے کہا — "تم پر جرح نہیں کی جائے گی۔"

"جنابِ والا!" — عبدالقدیر نے کہا — "اس اندھیر نگری میں ہم کوئی بیان نہیں دینا چاہتے۔ ہمارے خلاف یہ الزامات بے بنیاد ہیں۔

ہمارا جُرم صرف یہ ہے کہ ہم مسلمان ہیں۔"

جج نے اگلی پیشی کی تاریخ دے دی۔

اس پیشی پر سرکاری وکیل اور صفائی کے وکیل نے دلائل پیش کئے۔ اس سے اگلی پیشی پر جج نے فیصلہ سُنا دیا۔ ہاشمی اور عبدالقدیر کو تین تین دفعات میں مجموعی طور پر بیس بیس سال سزائے قید سُنا دی۔

انہیں جیل میں لا کر قیدیوں والے کپڑے پہنا دیئے گئے اور سی کلاس قیدیوں کی بارک میں بھیج دیا گیا جہاں وہ مختلف جرائم کے قیدیوں کے ہجوم میں گم ہو گئے۔

چند دنوں بعد تینوں سکھوں کو بھی چھ چھ سال سزائے قید سُنا دی گئی اور اُنہیں بھی قیدیوں والے کپڑے پہنا کر اخلاقی قیدیوں کے ہجوم میں گم کر دیا گیا۔ یہاں پھر ہاشمی اور عبدالقدیر اور یہ تینوں سکھ اکٹھے ہو گئے۔ اب وہ سزا یافتہ قیدی تھے۔ مشقت بھی اکٹھے کرتے اور رات کو ایک ہی بیرک میں بند ہوتے تھے۔

ہاشمی کی حویلی جس میں ہاشمی کی بیوی کے الفاظ میں، ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے غازیوں اور شہیدوں کی روحیں رہتی تھیں، بحقِ سرکار ضبط ہو گئی۔ اس کے متعلق حکومت نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ نیلام کر دی جائے گی۔ انڈیا کی حکومت نے یہ دھاندلی اس لئے کی تھی کہ ہاشمی کا پیچھے کوئی عزیز رشتہ دار نہیں تھا جو اس حویلی کا وارث کہلانے کا حق رکھتا۔

کوئی ایک مہینے بعد ایک مسافر ریل گاڑی دِلی سے پنجاب کی طرف جا رہی تھی۔ اس کی ایک بوگی کا ایک کمپارٹمنٹ قیدیوں کو اِدھر اُدھر لیجانے کے لئے رکھا گیا تھا۔ یہ تھرڈ کلاس کا چھوٹا سا کمپارٹمنٹ تھا جس کی کھڑکیوں اور دروازوں پر موٹی سلاخیں لگی ہوتی تھیں۔ دروازے اندر اور باہر سے مقفل ہو جاتے تھے۔

قیدیوں کے اس مضبوط اور مقفل کمپارٹمنٹ میں پانچ قیدی
ہتھکڑیوں میں بندھے ہُوئے دِلی سے لے جائے جا رہے تھے۔ ان کی
منزل نابھہ تھی۔ جاسُوسوں، تخریب کاروں اور نامی گرامی ڈاکوؤں اور خطرناک
جرائم پیشہ قیدیوں کو نابھہ جیل میں رکھا جاتا تھا۔ اب جن قیدیوں کو دِلّی کے
جیل خانے سے نابھہ جیل کو منتقل کیا جا رہا تھا، ان میں دو جاسوسی کے الزام
کے سزا یافتہ تھے۔ ایک فریدالدین ہاشمی اور دوسرا عبدالقدیر تھا۔ ان کے
ساتھ تین قیدی سکھ تھے ــــ جگجیت سنگھ سندھو، درشن سنگھ اور منگل سنگھ
ــــ پانچوں دوست اس سفر میں بھی اکٹھے تھے۔

اس کمپارٹمنٹ کے اندر ان قیدیوں کے ساتھ جو پولیس گارد جا رہی
تھی اس میں ایک ہندو کانسٹیبل تھا۔ تین ہندو اور ایک مسلمان کانسٹیبل
تھے۔ کانسٹیبلوں کے پاس رائفلیں تھیں اور ہیڈ کانسٹیبل کے پاس ریوالور
تھا۔ پانچوں قیدیوں کو ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھیں۔

یہ ریل گاڑی دن کے پچھلے پہر دِلّی سے روانہ ہوئی تھی۔ عبدالقدیر
اور ہاشمی کھڑکیوں کے ساتھ بیٹھے دِلی کو پیچھے ہٹتا دیکھ رہے تھے۔ اُن کے
چہروں پر حسرت و یاس کے تاثرات تھے۔ وہ دِلی کو ہمیشہ کے لئے چھوڑے
جا رہے تھے۔ اُنہیں ایسی توقع نہیں تھی کہ وہ بیس سال تک جیل میں زندہ
رہیں گے اور واپس دِلی آ جائیں گے۔ دونوں اِسی شہر میں پیدا ہُوئے تھے۔
یہ شہر جو مسلمانوں کی تاریخ کا ایک سنگِ میل تھا اُن کے خون میں رچ بس
گیا تھا۔ وہ اسی شہر کی عظمت پر اپنے آپ کو قربان کر چلے تھے۔

"اللہ تجھے آباد رکھے۔"

یہ آواز عبدالقدیر کی تھی جس نے ہاشمی کو چونکا دیا۔ اُس نے عبدالقدیر
کی طرف دیکھا۔ عبدالقدیر گم سُم بیٹھا اپنے پُرعظمت شہر کو ریل گاڑی کی رفتار
سے پیچھے ہٹتا دیکھ رہا تھا۔

"آپ نے کچھ کہا تھا؟" ــــ ہاشمی نے پوچھا۔

"مَیں نے؟" ــــ عبدالقدیر نے چونک کر کہا ــــ "ہاں ....

مَیں دِلی کو دعا دے رہا تھا۔ اللہ اس شہر کو آباد رکھے۔"

"اللہ اس شہر کو تا قیامت آباد رکھے گا" ــــ ہاشمی نے پُرعزم لہجے
میں کہا ــــ "ہماری قربانی رائیگاں نہیں جائے گی۔ سیّد احمد شہید لڑتے
ہُوئے شہید ہو گئے تھے۔ وہ سکھوں اور انگریزوں کو شکست نہیں دے
سکے تھے۔ اس لحاظ سے وہ ناکام اس دنیا سے اُٹھ گئے لیکن اُن کی بہت
بڑی کامیابی یہ تھی کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک جذبہ پیدا کر گئے۔
اُنہوں نے مسلمانوں کے سینوں میں آزادی کی تڑپ پیدا کر دی تھی۔ ۱۸۵۷ء
میں ہمیں شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا لیکن شہیدوں کا لہو بے رنگ نہ رہا۔
ایسا رنگ لایا کہ ۱۹۴۷ء میں مسلمانوں نے ہندوستان میں ایک اسلامی مملکت
بنا لی۔ ہم اپنے پیچھے جو جذبہ چھوڑ آئے ہیں، اسے ہندوؤں کی حکومت
ہتھکڑیاں نہیں لگا سکتی نہ اسے قید کر سکتی ہے .... عبدالقدیر بھائی!
دوتے پوتے تو یاد نہیں آ رہے؟"

"انسانی فطرت کے تقاضوں سے آزاد تو نہیں ہُوا جا سکتا" ــــ
عبدالقدیر نے کہا اور اُس کی ہنسی نکل گئی۔ کہنے لگا ــــ "یاد تو بہت
کچھ آتا ہے لیکن اطمینان اور سکون یہ سوچ کر ملتا ہے کہ ہم چوری اور ڈکیتی
کے مجرم نہیں۔ اللہ کی نگاہ میں ہم سُرخرو ہیں۔"

"پاکستان والوں کو تو معلوم نہیں ہو گا کہ ہندوستان کے دو مسلمان
اسلام اور پاکستان کی ناموس پر عمر بھر کے لئے قید خانے میں ڈال دیئے گئے
ہیں" ــــ ہاشمی نے کہا۔

"اللہ کو تو معلوم ہے" ــــ عبدالقدیر نے کہا ــــ "پاکستان والوں
کو معلوم ہو بھی گیا تو وہ ہمیں رہا تو نہیں کرا لیں گے .... وہاں تو اب بھی
کئی راہی پاکستان کی بنیادیں کھوکھلی کرنے کے لئے تیار ہو رہے ہوں گے۔
انڈین فلموں اور انگلش میوزک کے شور و غل میں اسلامی قدریں خس و خاشاک
کی طرح اُڑ رہی ہوں گی۔ اس شور و غل میں مسجدوں کے لاؤڈ سپیکروں کا
شور و غوغا مل کر اسلام کا مذاق اُڑا رہا ہو گا۔ ہمارا جہاد پاکستان والوں

کے لئے نہیں بلکہ پاکستان کے لئے ہے اور پاکستان سیاسی لیڈروں کی جاگیر نہیں، اللہ اور قرآن کی سرزمین ہے۔ ایک نہ ایک دن ہندوستان ہندوؤں سے اور پاکستان جاگیرداروں اور اقتدار پرست جرنیلوں سے آزاد ہو کر رہے گا۔"

"او تے مسلمینو!" — جگجیت سنگھ نے سکھوں کی روایتی زندہ دلی اور بے تکلفی سے ہاشمی اور عبدالقدیر کو پکارا۔ دونوں نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے کہا — "وہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو۔ ادھر آؤ۔"

"تم شاید دِلی کو دیکھ دیکھ کر اُداس ہو رہے ہو" — درشن سنگھ نے ہنستے ہوئے کہا — "مت دیکھو اُدھر۔ ایک نہ ایک دن ہم دِلی آئیں گے۔"

"نہیں خالصہ جی!" — ہاشمی نے کہا — "ہم اتنے اُداس نہیں، کچھ نہ کچھ اُداسی تو ہوتی ہی ہے۔ تم اپنے وطن کی طرف جا رہے ہو اور ہم اپنے وطن سے دُور لے جائے جا رہے ہیں۔"

"جانے دو یار!" — درشن سنگھ نے کہا — "سارا ہندوستان اپنا وطن ہے" — اُس نے پولیس گارد کے ہندو ہیڈ کانسٹیبل کی طرف دیکھا اور طنزیہ لہجے میں بولا — "کیوں لالہ جی مہاراج! تم نے تو ہندوستان کو اپنے باوا کی جاگیر بنا رکھا ہے۔"

"نہیں سردار جی!" — ہیڈ کانسٹیبل نے کہا — "ہم تو سرکار کے نوکر ہیں، تمہاری بادشاہی آ گئی تو تمہاری نوکری کریں گے۔"

اس ہندو کانسٹیبل کو اور گارد کے ہر کانسٹیبل کو معلوم تھا کہ یہ پانچوں قیدی جرائم پیشہ نہیں بلکہ حکومت کے باغی ہیں اور تعلیم یافتہ بھی ہیں اس لئے ہیڈ کانسٹیبل اُن کے ساتھ دوستانہ رویہ رکھے ہوئے تھا۔

"حوالدارا!" — جگجیت سنگھ نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا — "دروازے اندر سے پکے بند ہیں، چابیاں تمہارے قبضے میں ہیں، کھڑکیوں میں سلاخیں لگی ہوتی ہیں۔ تمہارے پاس ریوالور ہے۔ سارے سپاہیوں کے پاس رائفلیں ہیں۔ رائفلوں کی میگزینوں میں راؤنڈ ہیں۔ ہم نہتے ہیں۔ ہم سے

اتنا لمبا سفر ہتھکڑیوں میں کیوں کراتے ہو۔ ہتھکڑیاں کھول دو۔ ہم تم پر حملہ تو نہیں کر دیں گے۔"

"تم حملہ تو نہیں کرو گے خالصہ جی!" — ہیڈ کانسٹیبل نے کہا — "لیکن راستے میں کسی افسر نے دیکھ لیا تو مجھ پر ایسا حملہ ہو گا کہ میری حوالداری اُڑ جائے گی۔ ہتھکڑیاں میرے حکم سے تو نہیں لگائی گئیں۔ اُوپر کے حکم سے لگائی گئی ہیں۔"

پانچوں قیدیوں نے ہیڈ کانسٹیبل کی منت سماجت شروع کر دی کہ وہ ہتھکڑیاں کھول دے لیکن وہ اپنے عہدے اور نوکری کو خطرے میں ڈالنے کی جرأت نہیں کر رہا تھا۔

یہ تینوں اکٹھے گرفتار ہوئے تھے۔ ان کی جامہ تلاشی میں کچھ رقم برآمد ہوئی تھی جو ان کے ریکارڈ میں لکھ دی گئی تھی۔ انہیں سزا سُنا دی گئی تو یہ رقم جیل کے دفتر میں جمع کرا دی گئی تھی۔ جب انہیں نابھہ جیل کے لئے روانہ کیا گیا تو یہ رقم گارد کے اس کمانڈر ہیڈ کانسٹیبل کے حوالے کر کے رسید لے لی گئی تھی۔ سکھوں نے دِلی جیل کے سپرنٹنڈنٹ سے درخواست کی تھی کہ انہیں اجازت دی جائے کہ راستے میں وہ کھانے پینے کے لئے کچھ پیسے خرچ کرنا چاہیں تو کر لیں۔ یہ اُن کی اپنی رقم تھی۔ سپرنٹنڈنٹ نے اس شرط کے ساتھ اجازت دے دی کہ رقم ہیڈ کانسٹیبل کے پاس رہے گی اور وہ قیدیوں کو ضرورت کے مطابق دے گا۔ ویسے پانچوں قیدیوں کے کھانے کے اخراجات ہیڈ کانسٹیبل کے ذمے تھے۔

"حوالدارا!" — جگجیت سنگھ نے ہیڈ کانسٹیبل سے پوچھا — "ہماری کتنی رقم تمہارے پاس ہے؟"

"گیارہ سو بیس روپے" — ہیڈ کانسٹیبل نے جواب دیا۔

"ہم نے دِلی جیل سے اجازت لے لی تھی کہ ہم یہ پیسے راستے میں خرچ کر سکتے ہیں" — جگجیت سنگھ نے کہا — "ایک ہزار روپیہ تم رکھ لو۔ تم پانچ ہو۔ آپس میں تقسیم کر لینا۔ ہم نابھہ جیل میں کہہ دیں گے کہ راستے

میں ہم ایک ہزار روپیہ خرچ کر آتے ہیں۔ ہماری ہتھکڑیاں کھول دو۔"

"تمہارا دماغ پھر گیا ہے خالصہ جی!" —— ہیڈ کانسٹیبل نے کہا —— "کیا مجھ سے نابھہ جیل میں یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ قیدیوں نے دِلّی سے نابھہ تک ایک ہزار روپیہ کہاں خرچ کیا ہے؟"

"تم کچھ رکھ لو لالہ جی!" —— منگل سنگھ نے کہا۔

ایک پرانے کانسٹیبل نے ہیڈ کانسٹیبل کو سَر سے اشارہ کیا کہ وہ کچھ نہ کچھ لے لے۔

"خالصہ جی!" —— ہیڈ کانسٹیبل نے کہا —— "مَیں پانچ سَو رکھ لوں گا لیکن ہتھکڑیاں دونوں ہاتھوں سے نہیں کھولوں گا۔ دونوں کڑے تم تینوں کے ایک ایک ہاتھ میں ڈال دوں گا اور ہتھکڑیاں کانسٹیبل نہیں پکڑیں گے۔ ڈبے میں کُھلے پھرو۔"

"تینوں نہیں" —— جگجیت سنگھ نے کہا —— "پانچوں ..... یہ دو ہمارے یار ہیں بلکہ ہمارے بزرگ ہیں۔ ان کی بھی ہتھکڑیاں کھولنی ہیں۔"

معاملہ طے ہوگیا۔ پانچوں کے دائیں ہاتھوں سے ہتھکڑیوں کے کڑے اُتار کر بائیں ہاتھوں میں ڈال دیئے گئے اور سب کے دائیں ہاتھ آزاد ہو گئے۔ پانچوں نے ہیڈ کانسٹیبل کا شکریہ ادا کیا اور اُس کے ساتھ گپ شپ لگانے لگے۔

❄

سورج کبھی کا غروب ہوگیا تھا۔ دِلّی کا شہر بہت دُور پیچھے رہ گیا تھا۔ ریل گاڑی پنجاب میں داخل ہوگئی تھی۔ ایک سٹیشن پر رُکی تو دو کانسٹیبل قیدیوں کے لئے کھانا لے آئے۔ وہ اپنے لئے بھی کھانا لے آئے تھے۔ قیدی الگ اور پولیس کے آدمی الگ کھانا کھانے لگے۔ دونوں پارٹیاں ایک دوسری سے دُور بیٹھی تھیں۔ کمپارٹمنٹ چھوٹا سا تھا پھر بھی گاڑی کے شور کی وجہ سے قیدیوں کی باتیں گارڈ تک نہیں پہنچ سکتی تھیں۔

مسلمان اور سکھ قیدیوں نے اکٹھے کھانا کھایا۔ پانچوں آگے کو جُھکے

ہوتے تھے۔ زیادہ تر باتیں سکھ کر رہے تھے اور یہ باتیں سرگوشیوں میں ہو رہی تھیں۔ عبدالقدیر اور ہاشمی سُن رہے تھے۔

"ڈر گئے تو نہیں" —— منگل سنگھ نے مسلمان قیدیوں سے پوچھا —— "حوصلہ قائم رکھو گے؟"

"دیکھ لینا بھائی!" —— عبدالقدیر نے جواب دیا۔

"ہمارے حوصلے سے تم پریشان ہو جاؤ گے" —— ہاشمی نے کہا۔

کھانا کھا کر قیدی گارڈ کے پاس جا بیٹھے اور ان سے گپ شپ لگانے لگے جیسے وہ قیدی نہ ہوں اور پولیس کے یہ پانچ آدمی ان کے یار دوست ہوں۔ انہوں نے اپنے جرائم کی اور سزاؤں کی کوئی بات نہ کی۔ وقت گزرتا چلا گیا۔ رات آگے بڑھتی گئی۔ گاڑی چھوٹے بڑے سٹیشنوں پر رُکتی اور چلتی رہی —— اور سکھ قیدیوں نے جماہیاں لینی شروع کر دیں۔

"سو جاؤ یارو!" —— منگل سنگھ نے کہا —— "نابھہ جیل میں داخل ہوتے ہی مشقت شروع ہو جائے گی۔"

"سُنا ہے بڑی سخت جیل ہے" —— ہیڈ کانسٹیبل نے کہا۔

"اسی لئے تو خطرناک قیدیوں کو اس جیل میں بھیجا جاتا ہے" —— ایک کانسٹیبل نے کہا۔

"ہم کہاں کے خطرناک قیدی ہیں بھائی!" —— درشن سنگھ نے کہا۔

پانچوں قیدی سیٹوں پر لیٹ گئے۔

رات کو قیدیوں پر ایک سنتری کو بیدار رکھنا لازمی تھا۔ یہ قیدیوں کو ایک سے دوسری جیل میں منتقل کرنے کے طریقۂ کار کا لازمی جزو تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے تین تین گھنٹوں کے لئے سنتری مقرر کر دیئے۔ پہلا سنتری رائفل لے کر ایک دروازے کے قریب بیٹھ گیا اور اس کمپارٹمنٹ کے باقی سب مسافر لیٹ گئے۔

❄

ڈیڑھ پونے دو گھنٹے بعد سب گہری نیند سوتے ہُوتے تھے۔ بعض کے خراٹے بھی سنائی دے رہے تھے۔ سنتری بیٹھے بیٹھے اونگھ رہا تھا۔ اُس نے اپنی ٹوپی اُتار کر سیٹ پر رکھ دی تھی۔ خراٹے تو قیدیوں کے بھی سنائی دے رہے تھے لیکن پانچوں بیدار تھے۔

درشن سنگھ جس سیٹ پر لیٹا ہُوا تھا، اُس کے پاؤں کی طرف سنتری دروازے کی طرف مُنہ کر کے بیٹھا ہُوا اونگھ رہا تھا۔ درشن سنگھ کی طرف اُس کی پیٹھ تھی۔ درشن سنگھ نے اپنی ٹانگیں سمیٹیں اور نہایت آہستہ آہستہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ ایک ہاتھ کو لگی ہوتی ہتھکڑی کی زنجیر اُس کے ہاتھ میں تھی۔ اسے اُس نے اتنی آہستہ سے اکٹھا کیا کہ آواز پیدا نہ ہونے دی۔ پھر اُس نے زنجیر کو آہستہ آہستہ دوہرا کیا۔ پھر دوہری زنجیر کو دوہرا کیا۔

وہ اُٹھا اور پوری طاقت سے زنجیر سنتری کے ننگے سر پر ماری۔ یہ زنجیر تو ایک ہی تھی لیکن چار زنجیریں بنی ہوتی تھی۔ ایک اس کا وزن دوسرے ایک جوان سکھ کا طاقتور وار۔ سنتری کے مُنہ سے آواز بھی نہ نکلی۔ گاڑی کے شور میں زنجیر کی ضرب کی آواز بھی نہ سنائی دی۔ گارد گہری نیند سوتی ہوتی تھی۔

سنتری بغیر آواز نکالے آگے کو گرا۔ درشن سنگھ نے لپک کر اُس کی رائفل اُٹھالی۔ سنتری بے ہوش ہو چکا تھا۔

دوسرے قیدی اِسی ضرب کے منتظر تھے۔ وہ تیزی سے اُٹھے۔ انہوں نے کھانے کے دوران کام بانٹ لئے تھے۔ عبدالقدیر ہیڈ کانسٹیبل کی طرف لپکا۔ ہیڈ کانسٹیبل ابھی سویا ہُوا تھا۔ عبدالقدیر نے اس کا سر اُٹھا کر اپنی ہتھکڑی کی زنجیر اُس کے گلے میں ڈالی اور پھندہ بنا کر زنجیر زور سے کھینچی۔ ہیڈ کانسٹیبل کو اُٹھنے کا موقع نہ مل سکا۔ عبدالقدیر نے ایک ہاتھ سے زنجیر کا پھندہ مضبوط رکھا اور دوسرے ہاتھ سے ہیڈ کانسٹیبل کا ریوالور نکال لیا۔ پھر اُس نے زنجیر ہیڈ کانسٹیبل کے گلے سے اُتار لی۔ ہیڈ کانسٹیبل خوف اور حیرت کا مارا ہُوا تھا۔ عبدالقدیر نے اُس کے سَر پر زنجیر کے دو وار کئے۔ لوہے کی زنجیر نے اس

ہندو کو اوندھا اور بے سُدھ کر دیا۔

تین کانسٹیبل رہ گئے تھے۔ باقی قیدیوں نے ان کانسٹیبلوں پر آسانی سے قابو پا لیا۔ وہ تو خود ہتھیار قیدیوں کے حوالے کر رہے تھے۔

ہیڈ کانسٹیبل اور سنتری بے ہوش پڑے تھے۔ باقی تین کانسٹیبلوں کو ایک جگہ فرش پر اکٹھے بیٹھنے کو کہا گیا۔ تینوں نے ہاتھ جوڑ کر قیدیوں کی منت سماجت شروع کر دی کہ وہ انہیں گولی نہ ماریں۔

"تمہیں ہم کیوں گولی ماریں گے!" — ہاشمی نے کہا — "مت ڈرو۔ اگر تم نے ہمارا پیچھا کیا تو...."

"ہم سب کو گولی ماریں گے" — منگل سنگھ نے کہا — "صرف اِس مسلمان کو چھوڑ دیں گے۔ کیا تم نہیں جانتے یہ ہندو بچھو ہیں۔ یہ سکھوں اور مسلمانوں کے دشمن ہیں۔"

ہندو کانسٹیبلوں نے واویلا بپا کر دیا۔

"نہیں منگل!" — عبدالقدیر نے کہا — "یہ حکم کے بندے ہیں۔ انہیں زندہ رہنے دو تاکہ اپنے ساتھیوں کو جا کر بتائیں کہ مسلمانوں اور سکھوں سے ٹکر لوگے تو کتنی مہنگی پڑے گی" — اُس نے کانسٹیبلوں سے کہا — "چلو اوئے! ایمونیشن اکٹھا کر کے ہمارے حوالے کرو۔"

عبدالقدیر نے ہیڈ کانسٹیبل کی بیلٹ سے ریوالور کی گولیاں نکال لیں اور کانسٹیبلوں نے رائفلوں کا ایمونیشن اُن کے حوالے کر دیا۔ ہیڈ کانسٹیبل کی جیب سے ہتھکڑیوں اور دروازوں کی چابیاں بھی نکال لی گئیں۔ سکھوں کی جو رقم ہیڈ کانسٹیبل کے پاس تھی وہ بھی قیدیوں نے نکال لی۔ اس میں ہیڈ کانسٹیبل کی اپنی بھی کچھ رقم تھی، وہ بھی لے لی گئی۔

عبدالقدیر نے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی ہتھکڑیاں کھول دیں۔ ایک ایک ہتھکڑی دو دو کانسٹیبلوں کو لگا دی گئی۔ سنتری ہوش میں آگیا تھا۔ اُسے ہیڈ کانسٹیبل کے پاس لے آئے جو بے ہوش پڑا تھا۔ ایک ہتھکڑی ان دونوں

کے ایک ہاتھ کو لگا دی گئی۔ ایک ہتھکڑی میں گارڈ کو لگی ہوئی ہتھکڑیوں کے دوسرے سروں والے کڑے ڈالے گئے اور ہتھکڑی کی زنجیر ایک سیٹ کے پائے کے گرد لپیٹ کر اس کا دوسرے سرے والا کڑا بھی اس ہتھکڑی میں ڈال کر مقفل کر دیا گیا۔ گارڈ نے ذرا سی بھی مزاحمت نہ کی۔ رائفلیں

قیدیوں کے پاس تھیں۔ کانسٹیبل جان کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔

ریل گاڑی رات کے سکوت کو چیرتی جا رہی تھی۔ عبدالقدیر نے چابی لگا کر کمپارٹمنٹ کا ایک طرف کا دروازہ کھول دیا اور باہر لٹک کر آگے دیکھا۔

"معلوم ہوتا ہے اگلا سٹیشن بہت دُور ہے" — عبدالقدیر نے دروازہ بند کر کے اپنے ساتھیوں کو بتایا — "دُور دُور تک اندھیرا ہے"۔

"کسی سٹیشن کے قریب نہیں اُترنا چاہیئے" — جگجیت سنگھ نے کہا — "تم یہ چاہتے ہو کہ اگلے سٹیشن کے قریب گاڑی ذرا آہستہ ہو گی تو ہم اُتر جائیں گے.... گاڑی کی رفتار پھر بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اُترتے ہوتے ہم میں سے کوئی ایک بھی زخمی ہو گیا تو بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ ہم اپنے زخمی ساتھی کو پیچھے چھوڑ کر نہیں بھاگیں گے"۔

"ویسے بھی کسی سٹیشن کے قریب نہیں اُترنا چاہیئے" — درشن سنگھ نے کہا — "زنجیر کھینچو اور گاڑی رُکنے سے پہلے اُتر جاؤ"۔

"کیا تم لوگوں کو معلوم ہے ہم کہاں ہیں؟" — عبدالقدیر نے پوچھا — "اس علاقے سے واقفیت ہے؟"

"پوری واقفیت ہے" — جگجیت سنگھ نے کہا — "یہ ہمارا علاقہ ہے.... یہ خالصتان ہے.... سب تیار ہو جاؤ۔ میں زنجیر کھینچتا ہوں"۔

جگجیت سنگھ نے اُس ہینڈل کو پکڑا جو گاڑی روکنے والی زنجیر کا تھا۔ ہینڈل کو زور سے کھینچا۔ گاڑی نے دھچکہ لیا اور ویکوم بریکیں لگنے سے گاڑی کے پہیئے چرچرائے۔ رفتار سست ہو گئی۔

"جلدی کُود و" — عبدالقدیر نے کہا اور وہ پائیدان پر جا کر کُود گیا۔ اُس کے پیچھے اُس کے چاروں ساتھی کُود گئے۔ سکھوں میں سے کسی نے کہا کہ سیدھے چلے چلو، رائفلیں سنبھال کر رکھنا۔ چار کے پاس ایک ایک رائفل تھی اور ریوالور عبدالقدیر کے پاس تھا۔ ان کے پاس گٹھڑی بھی تھی۔ اس میں ان کے اپنے کپڑے تھے جو سزا سنانے کے بعد اُتروا کر جیل کے سٹور میں رکھ لئے گئے اور انہیں قیدی کپڑے پہنا دیئے گئے تھے۔ یہ پرائیویٹ کپڑے ان کے ساتھ نابھہ جیل جا رہے تھے۔

❋

گاڑی رُک گئی۔ گارڈ اُترا اور گاڑی کے ساتھ ساتھ آگے کو دوڑا۔ کچھ دیر بعد وہ اُس کمپارٹمنٹ تک پہنچا جس میں سے زنجیر کھینچی گئی تھی۔ یہ دیکھ کر وہ حیران ہُوا کہ یہ تو قیدیوں کا ڈبہ ہے۔ وہ پائیدانوں پر چڑھ گیا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ اُس نے کھڑکی کے شیشے میں سے اندر دیکھا۔ اُسے پولیس گارد نظر آئی۔ قیدی ایک بھی نہیں تھا۔ کانسٹیبل ایک جگہ کھڑے تھے۔ اُس کی طرف کوئی نہیں آ رہا تھا۔ ایک کانسٹیبل نے اُسے دوسرے دروازے سے آنے کا اشارہ کیا۔

گارڈ گاڑی کے نیچے سے گزر کر دوسری طرف گیا اور پائیدان پر چڑھا۔ دروازہ کُھلا تھا۔ وہ اندر گیا۔ پوری گارد ہتھکڑیوں میں بندھی ہوئی تھی۔ ہیڈ کانسٹیبل ہوش میں آ گیا تھا۔ ہندو گارڈ کو جب پتہ چلا کہ قیدی بھاگ گئے ہیں تو اُس پر خوف طاری ہو گیا۔ وہ یُوں خوف کا مارا کُھلے ہوئے دروازے کی طرف دیکھنے لگا جیسے ابھی قیدی آئیں گے اور اُسے بھی ہتھکڑی لگا کر ان کانسٹیبلوں کے ساتھ باندھ جائیں گے۔ مشرقی پنجاب میں سکھوں کی دہشت گرد سرگرمیوں کی وجہ سے ہندوؤں پر ان کی دہشت بھی بیٹھی ہوئی تھی۔

سکھوں کی خالصتان کے لئے علیحدگی کی تحریک عروج پر پہنچ رہی تھی۔ انہوں نے مسافر بسوں پر بھی حملے شروع کر دیئے تھے اور اس سلسلے میں قتل کی وارداتیں بڑھ گئی تھیں اس لئے ریل گاڑیوں میں پولیس گارد سفر کیا

کرتی تھی۔ اس گاڑی کے ساتھ بھی پولیس کی گارد تھی جو ایک الگ کمپارٹمنٹ میں تھی۔ گاڑی رُکی تو اس گارد کا کمانڈر جو ہندو کانسٹیبل تھا، آہستہ آہستہ قیدیوں کے کمپارٹمنٹ کی طرف آیا۔ گارڈ وہاں سے اُتر آیا تھا۔ اُس کا آمنا سامنا ہیڈ کانسٹیبل سے ہُوا۔

"کیا ہو گیا گارڈ صاحب!" — ہیڈ کانسٹیبل نے پوچھا۔

"بھاگ گئے" — گارڈ نے گھبرائے ہُوئے لہجے میں کہا — "بھاگ گئے۔ اندر جا کر دیکھو۔"

"کون بھاگ گئے بابو صاحب؟"

"قیدی!" — گارڈ نے کہا — "قیدی .... سب نکل گئے۔ حوالدار اور سپاہیوں کو ہتھکڑیوں میں باندھ گئے ہیں .... دیکھو .... جا کر دیکھو۔"

"ہیڈ کانسٹیبل قیدیوں کے ڈبے میں گیا تو اپنے جیسے ایک ہیڈ کانسٹیبل کو اور چار کانسٹیبلوں کو ہتھکڑیوں میں بندھا ہُوا دیکھ کر پہلے تو ہنسا پھر سنجیدہ ہو گیا۔

"شرم کرو" — اُس نے کہا — "میں مان نہیں سکتا کہ تمہاری کوئی غلطی نہیں تھی اور قیدی بھاگ گئے۔ ہتھکڑیاں جو اُنہیں لگی ہوتی تھیں وہ جادو کے زور سے تو تمہیں نہیں لگ سکتی تھیں۔ تم نے قیدیوں کے ہاتھ کھول دیئے ہوں گے اور وہ ہتھکڑیاں تمہیں لگا کر بھاگ گئے۔"

"میری مدد کرو بھائی!" — قیدیوں کی گارد کے ہیڈ کانسٹیبل نے کہا — "وہ دُور نہیں گئے ہوں گے۔ تمہارے پاس گارد ہے۔"

"میری ڈیوٹی گاڑی میں ہے بھائی صاحب!" — گاڑی والے ہیڈ کانسٹیبل نے کہا — "تمہاری رائفلیں کہاں ہیں؟"

"وہ لے گئے ہیں" — ہیڈ کانسٹیبل نے جواب دیا — "میرا ریوالور بھی لے گئے ہیں۔ ہتھکڑیوں کی چابیاں بھی ساتھ لے گئے ہیں۔"

"میں تمہاری یہی مدد کر سکتا ہوں کہ ہتھکڑیاں توڑنے کا انتظام کر

دوں گا" — گاڑی والے ہیڈ کانسٹیبل نے کہا — "وہ بھی اگلے سٹیشن پہ .... تمہارے اور اس کانسٹیبل کے سر سے خون بہہ رہا ہے۔ فسٹ ایڈ کا سامان موجود ہے۔ دونوں کی مرہم پٹی کر دوں گا .... گارڈ صاحب! میری طرف سے آپ کو اجازت ہے۔ گاڑی چلا دیں۔"

❋

اُس وقت تک پانچوں قیدی ڈیڑھ میل دُور نکل گئے تھے۔ پہلے تو وہ دوڑتے رہے تھے پھر وہ تیز چلنے لگے تھے۔

"آدھی رات گزر گئی ہے" — منگل سنگھ کہتا جا رہا تھا — "اب وقت کے ساتھ ہماری دوڑ ہے۔ صبح تک ہمیں کہیں پناہ مل جانی چاہیئے یا ہمیں پولیس مقابلے کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے۔"

"اگر ہم اسی طرح چلتے رہے تو صبح تک سری رام تک پہنچ سکتے ہیں" — جگجیت سنگھ نے کہا — "وہاں پہنچ گئے تو ایسی پناہ ملے گی کہ انڈیا کی ساری پولیس فورس آ گئی تو بھی ہمیں نہیں پکڑ سکے گی۔"

"سری رام کوئی گاؤں ہے؟" — ہاشمی نے پوچھا۔

"ہاں!" — جگجیت سنگھ نے جواب دیا — "یہ ایک گاؤں ہے۔ اس میں زیادہ تر آبادی سکھوں کی ہے۔ میرے اندازے کے مطابق یہاں سے فاصلہ بیس میل کے لگ بھگ ہو گا۔ وہاں ہمارے آدمی موجود ہیں۔"

"بیس میل!" — عبدالقدیر نے کہا — "صبح طلوع ہونے تک ہم یہ فاصلہ طے نہیں کر سکیں گے۔ ہم زیادہ سے زیادہ تین میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل سکتے ہیں .... یہ بھی سوچ لو کہ صبح تک اس علاقے کے تمام تھانوں میں اطلاع پہنچ چکی ہو گی کہ پانچ خطرناک قیدی فرار ہو گئے ہیں۔ فوری طور پر اس علاقے کی ناکہ بندی کر دی جائے گی۔ مجھے تو یہ نظر آتا ہے کہ پولیس کے ساتھ ہماری ٹکر ضرور ہو گی۔"

"کیا تم پولیس مقابلے سے ڈرتے ہو؟" — جگجیت سنگھ نے پوچھا۔

"نہیں جگجیت!" — عبدالقدیر نے کہا — "میرے دل میں کوئی

ایسا ڈر نہیں۔ مَیں تو چاہتا ہوں کہ مقابلہ ہو اور مَیں اور میرا بھائی ہاشمی مارے جائیں، مرنے سے پہلے ہم پانچ سات ہندوؤں کو تو مار ہی لیں گے۔ مَیں جیل خانے میں نہیں مرنا چاہتا۔ مجھے یقین ہے کہ تم تینوں بھی یہی چاہتے ہو۔"

"بالکل یہی چاہتے ہیں" — درشن سنگھ نے پُرجوش آواز میں کہا — "جانیں بچ گئیں تو ٹھیک نہ بچیں تو اور زیادہ ٹھیک ہوگا۔ ہم ہندوؤں کے قید خانے سے آزاد ہو جائیں گے ۔۔۔۔"

"ایک مشکل ہے" — منگل سنگھ نے کہا — "ہم تینوں تو جوان ہیں، تیز چل سکتے ہیں، دوڑ بھی سکتے ہیں مگر تم دونوں بوڑھے ہو، ہم جتنی تیزی نہیں دکھا سکو گے۔"

"ہمارے ساتھ چل کے تو دیکھو سردار جی!" — ہاشمی نے ہنستے ہُوئے کہا — "تم سے دو چار قدم آگے ہی رہیں گے۔"

"میں تمہیں یہ بھی بتا دوں" — درشن سنگھ نے کہا — "اگر تم دونوں ہمارا ساتھ نہ دے سکے اور تھک ہار کر پیچھے رہ گئے تو ہم تمہارا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ پہلے تمہاری جانوں کی حفاظت کریں گے پھر اپنی جانوں کا فکر کریں گے۔"

"تم ہمارے پاس امانت ہو" — جگجیت سنگھ نے کہا — "ہم نے تمہیں پاکستان کے حوالے کرنا ہے۔ تم اُسی دشمن کے خلاف لڑ رہے ہو جو ہمارا دشمن ہے۔"

وہ تیز رفتار سے چلتے گئے۔

ریل گاڑی اگلے سٹیشن پر رُکی تو ریلوے پولیس کا ہیڈ کانسٹیبل جو گاڑی کے ساتھ جانے والی گارڈ کا کمانڈر تھا، سٹیشن ماسٹر کے پاس گیا۔ یہ ایک بڑے قصبے کا سٹیشن تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے سٹیشن ماسٹر کو بتایا کہ گاڑی میں کیا واردات ہو گئی ہے۔

"مَیں مستری کو بلا کر ان کی ہتھکڑیاں تڑوا دیتا ہوں" — سٹیشن ماسٹر نے کہا۔

"نہیں بابو صاحب!" — ہیڈ کانسٹیبل نے کہا — "مسئلہ صرف ہتھکڑیاں تڑوانے کا نہیں۔ یہ بڑا خطرناک معاملہ ہے۔ قیدیوں میں تین سکھ اور دو مسلمان ہیں۔ یہ کوئی معمولی قیدی نہیں تھے۔ سکھوں کو دہشت گردی میں اور مسلمانوں کو جاسوسی کے جرم میں سزا ملی ہے۔ گاڑی یہاں سے آگے نہیں جائے گی۔ مَیں پولیس سٹیشن جا رہا ہوں۔ تھانیدار کو ساتھ لاؤں گا تاکہ وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ قیدیوں کی پوری گارد ہتھکڑیوں میں بندھی ہوتی ہے پھر یہ اس تھانے کی ڈیوٹی ہوگی کہ وہ جہاں جہاں اطلاع دینی ہے دیتا ہے یا اُوپر سے اُسے جو حکم ملے گا اس کے مطابق کارروائی کرے۔"

ہیڈ کانسٹیبل تھانے چلا گیا اور تھانیدار کو گھر سے جگا کر لے آیا۔ تھانیدار نے قیدیوں کے ڈبے میں جا کر صورتِ حال دیکھی۔ قیدیوں کی گارد والے ہیڈ کانسٹیبل نے اُس کی بھی منت سماجت کی کہ وہ انہیں ہتھکڑیوں سے آزاد کرا دے اور ریکارڈ میں یہ نہ آئے کہ قیدی اپنی ہتھکڑیاں گارد کو لگا کر بھاگ گئے ہیں۔

"میرے بھائی!" — تھانیدار نے کہا — "مَیں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ یہ دیکھو کہ قیدی کس قسم کے تھے۔"

تھانیدار تھانے گیا اور وہاں سے اپنے ڈی ایس پی کو فون پر اس واردات کی اطلاع دی۔ ڈی ایس پی نے کہا کہ جس بوگی میں قیدیوں کا کمپارٹمنٹ ہے وہ گاڑی سے الگ کر لی جائے اور بوگی کے دوسرے مسافروں کو دوسری بوگیوں میں منتقل کر دیا جائے۔

ٹیلی فون کی لائنیں گرم ہو گئیں۔ یوں لگتا تھا جیسے پولیس کا پورا محکمہ بیدار ہو گیا ہو۔ جس علاقے میں قیدی فرار ہُوئے تھے وہاں کے تمام پولیس سٹیشنوں اور سنٹرل ریزرو پولیس فورس کے ٹیلی فون بج اُٹھے۔

صبح تک قیدیوں کے فرار کی اطلاع دِلّی پولیس کے آئی جی تک پہنچ گئی۔ آئی جی نے اُس تھانے کے علاقہ ڈی ایس پی اور ایس پی کو طلب کیا جس نے سکھوں کا چالان پیش کیا تھا۔ انہیں ان سکھوں کے کیس ریکارڈ

لانے کو کہا گیا تھا۔

عبدالقدیر اور ہاشمی کا کیس انڈین انٹیلی جنس نے تیار کیا اور سی آئی اے نے کورٹ میں پیش کیا تھا۔ آئی جی نے سی آئی اے کے ایس پی کو مجرموں کا ریکارڈ لانے کو کہا۔

انٹیلی جنس کا چیف جب دفتر میں آیا تو اُسے پہلی خبر یہ سنائی گئی کہ جن دو جاسوسوں کو اُس کے محکمے نے بیس بیس سال سزائے قید دلوائی تھی وہ ریل گاڑی سے فرار ہو گئے ہیں اور ان کے ساتھ تین سکھ دہشت گرد بھی فرار ہوتے ہیں۔

چیف کا ردِ عمل یہ تھا کہ وہ خبر سنانے والے بریگیڈیئر کو یوں دیکھتا رہ گیا جیسے بریگیڈیئر جھوٹ بول رہا ہو یا چیف اس خبر کو صحیح ماننے کو تیار نہ ہو۔ اُس نے کچھ دیر بعد بریگیڈیئر کے چہرے سے نظریں ہٹائیں۔

"یہ بہت بڑا اور طاقتور رِنگ ہے"۔۔۔ چیف نے کہا ۔۔۔ "ہتھکڑیوں میں بندھے ہوئے قیدی ریلوے کے مقفل کمپارٹمنٹ سے فرار نہیں ہو سکتے۔ انہیں فرار کرایا گیا ہے۔"

"سر! میرا شک کچھ اور ہے"۔۔۔ بریگیڈیئر نے کہا ۔۔۔ "ان کے ساتھ تین سکھ فرار ہوتے ہیں۔ ہمارے دونوں مجرموں کو بھی یہ سکھ فرار کرا کے اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔"

"یہ تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس طرح فرار ہوتے ہیں"۔۔۔ چیف نے کہا ۔۔۔ "لیکن انہیں پکڑنا ہمارا کام نہیں۔ ہم نے اپنا کام کر دیا ہے البتہ ہمارے لئے یہ ایک وارننگ ہے کہ یہ کوئی اچھا خاصا رِنگ ہے۔ اسے توڑنا ہمارا کام ہے۔ آپ اس سلسلے میں کارروائی کریں۔ جیل کو ہم نے چھوڑ تو دیا تھا، لیکن اُسے نظر میں رکھنا ضروری ہے اور ان دونوں مفرور مجرموں کے علاقے میں انفارمر مقرر کر لے بھی ضروری ہیں۔"

پولیس کی بالائی سطح سے قیدیوں کی گرفتاری کے احکام جاری کر دیئے گئے۔ بارڈر سیکورٹی فورس کو بھی چوکنا کر دیا گیا کیونکہ عبدالقدیر اور

ہاشمی کے متعلق یہ شک تھا کہ وہ پاکستان کے جاسوس تھے اس لئے پاکستان میں ہی جائیں گے۔

جب صبح کا اُجالا ذرا نکھرنے لگا اُس وقت یہ پانچ مفرور سری رام گاؤں سے پانچ چھ میل دُور رہ گئے تھے۔ عبدالقدیر چونکہ انٹیلی جنس میں رہ چکا تھا اس لئے وہ ہر بات کو ذہن میں رکھے ہوئے تھا۔ اُس نے رات کو ہی جب وہ ابھی بہت دُور تھے، اپنے ساتھیوں سے کہہ دیا تھا کہ ہم اپنے پیچھے کھرے چھوڑتے جا رہے ہیں اور یہ کھرے ہمیں آسانی سے پکڑوا دیں گے۔

کھرے گم کرنے کا عبدالقدیر نے یہ طریقہ سوچا کہ راستے میں دیہاتی علاقے کی کچی سڑک آ گئی جسے چھوڑ کر سیدھا آگے نکل جانا تھا لیکن عبدالقدیر سب کو سڑک پر چلاتے ہوئے تین فرلانگ لے گیا اور وہاں سے اس نے اپنی پارٹی کا رُخ اصل سمت کی طرف کیا۔ کچھ اور آگے جا کر پانی کی کھال نظر آ گئی جو اُسی سمت سے آ رہی تھی جدھر یہ پانچوں جا رہے تھے۔ عبدالقدیر نے سب کو کھال میں اُتار دیا۔ اس میں پانی گھٹنوں سے نیچے تک تھا کم و بیش تین فرلانگ سب کھال میں چلتے گئے۔ کچھ اور آگے جا کر کھال ایک طرف کو مُڑ گئی اور یہ پانچوں پانی سے نکل کر کھیتوں کی پینڈھوں پر چلتے گئے۔

"اب کھروں کے متعلق بے فکر ہو جائیں"۔۔۔ عبدالقدیر نے کہا ۔۔۔ "ہماری شلواروں سے پانی ٹپک رہا ہے۔ یہ پانی کھروں کو مٹاتا جائے گا۔ کئی کئی فرلانگ تک تو ہمارے کھرے نظر ہی نہیں آئیں گے۔ ہم نے تعاقب کرنے والوں کو گمراہ کر دیا ہے۔"

تقریباً آدھا فاصلہ طے کر کے یہ پارٹی ایک جگہ رُک گئی تھی۔ سب اپنے پرائیویٹ کپڑے جو گارد کے ہیڈ کانسٹیبل کے قبضے میں تھے، ساتھ لے آئے تھے۔ انہوں نے قیدیوں والے کپڑے اُتارے اور اپنے کپڑے پہن لئے۔ جیل کے کپڑوں کی اُنہوں نے گٹھڑی سی بنا لی۔ اس گٹھڑی میں دو وزنی پتھر بھی رکھے۔ ہتھکڑیوں اور کمپارٹمنٹ کی چابیاں بھی اس گٹھڑی میں رکھیں

اور گٹھڑی باندھ کر ایک سکھ نے اُٹھالی۔ عبد القدیر نے پوچھا تھا کہ کوئی بڑی نہر راستے میں آتی ہے یا نہیں۔ اُسے بتایا گیا تھا کہ کچھ دُور آگے ایک نہر آتی ہے گی۔ یہ نہر آئی تو انہوں نے گٹھڑی اس نہر میں پھینک دی۔ گٹھڑی میں بندھے ہوئے پتھر گٹھڑی کو نہر کی تہہ میں لے گئے۔

❋

گاؤں ابھی پانچ چھ میل دُور تھا اور صبح طلوع ہو رہی تھی۔ اب آگے جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ سکھ اس علاقے سے واقف تھے۔ قریب ہی خاصا وسیع علاقہ چٹانی اور جنگلاتی تھا۔ زمین کٹی پھٹی تھی۔ یہ ایسا ویرانہ تھا جس کے اندر سے کوئی راستہ نہیں گزرتا تھا۔ سکھ اپنی مفرور پارٹی کو اُس طرف لے گئے اور وہ ایسی جگہ جا پہنچے جہاں اُنہیں کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"ایک خیال رکھنا سردار جی!" — عبد القدیر نے کہا — "ہماری تلاش میں ہمارے پیچھے آنے والے ایسی جگہوں کو ضرور دیکھا کرتے ہیں جہاں بیٹھ کر ہم اپنے آپ کو محفوظ سمجھ رہے ہیں۔ ہمیں یہاں زیادہ دیر نہیں بیٹھنا چاہیئے۔"

"ہم تینوں میں سے کسی ایک کو اپنے آپ کو خطرے میں ڈالنا پڑے گا" — جگجیت سنگھ نے کہا — "پہل میں کروں گا۔"

جگجیت سنگھ اپنے دونوں ساتھیوں سے عمر میں دس بارہ سال بڑا تھا۔ باتیں عقل کی اور جرأت کی کرتا تھا اور تجربہ کار بھی تھا۔ ان سکھوں کے کپڑوں میں دو چادریں بھی تھیں۔ جگجیت سنگھ ایک چادر اپنے سر پر ڈال کر اس جگہ سے نکل گیا۔ اُس نے جو سوچا تھا وہ عبد القدیر کو اُستاد سمجھ کر سُنایا تھا۔ عبد القدیر نے اُس کے پلان میں دو تین ترمیمیں کی تھیں۔ اُس کے مطابق جگجیت سنگھ چلا گیا۔

جگجیت سنگھ اُس راستے پر جا کر آہستہ آہستہ چلنے لگا جو کم و بیش ایک میل دُور سے گزرتا تھا۔ یہ علاقہ زیادہ تر بنجر تھا اس لئے وہاں کسانوں کی آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ جگجیت سنگھ کو اپنی سکیم کی کامیابی ممکن

نظر نہیں آتی تھی، لیکن وہ ثابت قدم رہا اور انتظار کرتا رہا۔ آخر اُسے معمولی سی ایک گھوڑی پر سوار ایک سکھ اپنی طرف آتا نظر آیا۔ جگجیت سنگھ رُک گیا۔ اتنے میں سوار اُس کے قریب آپہنچا۔ وہ جگجیت سنگھ کی عمر کا ہی آدمی تھا اور سکھ تھا۔ وہ تھا تو دیہاتی، لیکن کچھ پڑھا لکھا معلوم ہوتا تھا۔

"ست سری اکال خالصہ جی!" — جگجیت سنگھ نے سوار سے کہا۔

"واہگورو کی فتح خالصہ جی!" — سوار نے جواب دیا اور گھوڑی روک کر پوچھا — "کدھر جا رہے ہو؟"

"جہاں پناہ مل جاتے" — جگجیت سنگھ نے جواب دیا — "ویسے ہی چلا جا رہا ہوں۔ واہگورو خالصوں کو فتح دے۔ خالصوں نے ٹکر بڑی طاقتور حکومت سے لی ہے" — اُس نے فقیروں اور درویشوں کی طرح ہاتھ اُوپر کر کے مجنونانہ انداز میں کہا — "راج کرے گا خالصہ ... ہم تو اپنی جانیں دینے کو بھی تیار ہیں، لیکن کوئی بتاتا نہیں کہ ہم کیا کریں۔"

یہ ایسی بات تھی جو اس علاقے کے ہر سکھ کے دل کی بات تھی۔ سوار گھوڑی سے اُتر آیا۔ جگجیت سنگھ نے اُسے گھوڑی سے نہیں اُتارا تھا بلکہ شیشے میں اُتار لیا تھا۔

"میں نے دربار صاحب کی بے حُرمتی کا انتقام لینا ہے" — جگجیت سنگھ نے ایسے لہجے میں کہا جیسے وہ نشے میں ہو — "اندرا گاندھی کے قتل سے میری تسلی نہیں ہوتی تھی۔ اتنے سال گزر گئے ہیں۔ میں اس ڈاتن کے بیٹے راجیو کو قتل کروں گا۔ اس کی بیوی بچوں کو بھی قتل کر دوں گا ... خالصتان بن کے رہے گا۔"

"باتوں سے تو نہیں بنے گا خالصتان خالصہ جی!" — گھوڑی سوار نے کہا۔

"میں باتیں کرنے والا آدمی نہیں ہوں سردار جی!" — جگجیت سنگھ نے کہا — "اس وقت تک تیرہ ہندوؤں کو قتل کر چکا ہوں۔

اس کے علاوہ میں نے جو کچھ کیا ہے وہ میں تمہیں بتا نہیں سکتا۔ تم مخبری کر کے گرفتار ہی نہ کرا دو۔"

"تم نے مجھے اتنا بے غیرت سمجھ لیا ہے؟" — گھوڑی والے نے ایسے لہجے میں کہا جس میں غصے کی جھلک بھی تھی — "اگر میں تمہیں بتاؤں کہ میں کیا کچھ کر چکا ہوں اور کیا کچھ کروں گا تو تم حیران رہ جاؤ.... تم کچھ کرنا چاہتے ہو تو کسی کے ساتھ مل جاؤ۔ اکیلے کچھ نہیں کر سکو گے.... مجھ پر شک نہ کرو۔ میں جانتا ہوں کچھ سکھ غدار ہو گئے ہیں لیکن اتنے غدار تو ہر قوم میں ہوتے ہیں۔ اس وقت خالصہ قوم ایک ہے۔"

جگجیت نے اپنا مجنونانہ انداز چھوڑ دیا اور حقیقی روپ میں آ گیا۔ گھوڑی والا سکھ جس نے اپنا نام دربارا سنگھ بتایا تھا، اتنا متاثر ہوا کہ وہ بھی بے خوف ہو کر باتیں کرنے لگا۔ جگجیت سنگھ نے باتوں میں اُسے پرکھا۔ دربارا سنگھ نے اُسے یہاں تک بتا دیا کہ وہ سری رام اسی سلسلے میں جا رہا ہے۔

"کیا تم سری رام کے کرتار سنگھ کو جانتے ہو؟" — جگجیت سنگھ نے پوچھا۔

"آٹے کی مشین والا؟"

"ہاں دربارے!" — جگجیت سنگھ نے کہا — "وہی.... ہندو اُس کا نام سن کر ڈر جاتے ہیں۔"

"وہ میرا اُستاد ہے" — دربارا سنگھ نے کہا — "میں اُسی کے ساتھ ہوں۔"

"سچ کہتے ہو دربارے؟"

"تم مجھ پر اعتبار کیوں نہیں کرتے؟" — دربارا سنگھ نے کہا — "پانچ پیاروں کی سوں، میں ایک سکھ کے آگے جھوٹ نہیں بول سکتا۔"

"تم نے بہت بڑی قسم کھائی ہے دربار سیاں!" — جگجیت سنگھ رُک گیا اور بولا — "اب میری بات سنو.... تین مہینے پہلے تم نے اخباروں میں ایک خبر پڑھی ہو گی کہ دلی میں تین سکھ پکڑے گئے ہیں۔"

"پڑھی تھی" — دربارا سنگھ نے جواب دیا — "انہوں نے ایک سرکاری گودام کو آگ لگائی تھی لیکن موقعہ پر ہی پکڑے گئے۔ کرتار سنگھ ان تینوں کو جانتا تھا، پھر کرتار سنگھ نے مجھے بتایا تھا کہ تینوں کو چھ چھ سال قید ہو گئی ہے۔ وہ کہتا تھا کہ تینوں بہت دلیر ہیں۔"

"وہ تینوں کہاں ہیں؟" — جگجیت سنگھ نے پوچھا۔

"دلی کے جیل خانے میں ہوں گے" — دربارا سنگھ نے جواب دیا۔

"اگر میں کہوں کہ وہ تینوں یہاں ہیں تو مان جاؤ گے؟"

"یہاں کہاں؟" — دربارا سنگھ نے پوچھا۔

"ایک تمہارے ساتھ باتیں کر رہا ہے" — جگجیت سنگھ نے کہا — "میرا نام جگجیت سنگھ ہے۔ دوسرا درشن سنگھ اور تیسرا منگل سنگھ ہے۔ ہمیں دلی سے نابھہ جیل بھیجا جا رہا تھا۔ ہم ریل گاڑی سے فرار ہو آئے ہیں۔"

"باقی کہاں ہیں؟"

"یہیں ہیں" — جگجیت سنگھ نے جواب دیا — "ہمارے ساتھ دو مسلمان ہیں۔ وہ پاکستان کے جاسوس ہیں۔ وہ بھی ہمارے ساتھ فرار ہوئے ہیں۔ مجھے کرتار سنگھ سے اس طرح ملوا دو کہ مجھے کوئی نہ دیکھ سکے۔"

"میں نے تمہیں کرتار سنگھ کے ساتھ کبھی نہیں دیکھا تھا" — دربارا سنگھ نے کہا۔

"میں سری رام میں صرف ایک بار آیا تھا" — جگجیت سنگھ نے کہا — "کرتار سنگھ ہمارے پاس جنڈیالہ گورو آتا رہتا تھا.... ان باتوں کو چھوڑو۔ کرتار سنگھ تمہیں ہمارے متعلق بتا دے گا۔ میں اور آگے نہیں جاؤں گا۔ تم کرتار سنگھ کو یہاں تک لے آؤ" — اُس نے پیچھے مڑ کر اشارہ کیا اور کہا — "میں وہاں چھپا ہوا ہوں گا۔ ایک خیال تو یہ رکھنا کہ تم نے ہمیں دھوکہ دیا تو بہت بُرا نقصان اُٹھاؤ گے۔ تمہارے خاندان کا کوئی بوڑھا اور کوئی بچہ بھی زندہ نہیں بچے گا۔ اگر دربار صاحب کے سچے سکھ ہو تو یہ خیال

رکھنا کہ ہمارے فرار کی اطلاع اس علاقے کے تھانے میں پہنچ چکی ہو گی یا تھوڑی دیر تک پہنچ جائے گی۔ ہم جہاں سے فرار ہوئے تھے وہ جگہ بیس میل دُور ہے۔"

"پھر وقت کا خیال کرو" — دربارا سنگھ نے کہا — "تم واپس جاؤ اور انتظار کرو۔"

جگجیت سنگھ واپس چل پڑا اور دربارا سنگھ گھوڑی پر سوار ہو کر کرتار سنگھ کے گاؤں سری رام کی طرف چل پڑا۔

❋

جس ریلوے سٹیشن پر قیدیوں کے کمپارٹمنٹ والی بوگی الگ کر کے سائیڈ ٹریک میں کھڑی کر دی گئی تھی، وہاں ضلعے کی پولیس کے اعلیٰ افسروں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا۔ ڈپٹی کمشنر بھی آ گیا تھا۔ سب نے قیدیوں کی گارد کو ہتھکڑیوں میں بندھا دیکھا اور سب نے ان پر لعن طعن کی۔ ان کی ہتھکڑیاں توڑی گئیں۔ ہیڈ کانسٹیبل اور ایک کانسٹیبل کے سر زنجیروں کی ضربوں سے زخمی تھے۔ ان کی مرہم پٹی پہلے ہی کر دی گئی تھی۔ ایس پی کے حکم سے ان سب کو اسی قصبے کے تھانے میں لے جا کر حوالات میں بند کر دیا گیا۔

جس وقت اس علاقے کے تمام تھانوں کو پانچ سزا یافتہ قیدیوں کے فرار کی اطلاع دی جا رہی تھی، اُس وقت جگجیت سنگھ دربارا سنگھ کے ساتھ بات کر کے اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچا۔ تھانوں کو اطلاع دینا وقت طلب کام تھا۔ ہر تھانے کا نمبر مشکل سے ملتا تھا۔ ہر تھانے کو قیدیوں کے نام، ولدیت، عمر اور حُلیہ بتانا پڑتا تھا۔ یہ تو دِلّی والوں کو معلوم تھا کہ مفرور قیدی کہاں کہاں کے رہنے والے تھے۔

جگجیت سنگھ نے اپنے ساتھیوں کو دربارا سنگھ کی ملاقات کی تفصیل سنائی اور اپنی رائے یہ دی کہ وہ دربارا سنگھ کو قابلِ اعتماد سمجھتا ہے۔

"وہ قابلِ اعتماد نہیں بھی ہو سکتا" — عبدالقدیر نے کہا — "ہمیں اپنی حفاظت کا انتظام کر لینا چاہیئے۔ رائفلیں لو۔ میرے پاس ریوالور ہے

اُٹھو۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کیا کرنا ہے۔ ہو سکتا ہے ہم بہت بڑے خطرے میں گھر جائیں اور ہو سکتا ہے کہ یہی دربارا سنگھ ہمارے لئے فرشتہ ثابت ہو۔"

اُس جگہ ٹیکریاں اور چٹانیں تھیں۔ درخت خاصے زیادہ اور گھنے تھے۔ عبدالقدیر نے اپنے ساتھیوں کو ایسی ٹیکریوں پر پوزیشن میں بٹھا دیا جہاں سے سامنے دُور دُور تک دیکھا جا سکتا تھا۔ عبدالقدیر نے سب کو بتا دیا تھا کہ دربارا سنگھ اگر اپنے ساتھ کوئی خطرہ، مثلاً پولیس لے کر آیا تو پہلی گولی عبدالقدیر چلائے گا۔ اُس نے کہا تھا کہ جب تک اُس کا ریوالور فائر نہ ہو کوئی آدمی گولی نہ چلائے، اور کوئی گولی ضائع نہ ہو۔

وہ خود ایک اونچی جگہ چلا گیا اور جگجیت سنگھ کو آگے بھیج دیا جہاں اُس نے دربارا سنگھ کا انتظار کرنا تھا۔

❋

جگجیت سنگھ رائفل اپنے ساتھ لے گیا تھا لیکن اپنے پاس نہیں رکھی تھی۔ وہ جس درخت کے نیچے کھڑا تھا، رائفل اس درخت کے تنے کے ساتھ کھڑی کر دی تھی۔

سب پر ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ کچھ پتہ نہیں تھا کہ تھوڑی ہی دیر بعد کیا ہونے والا ہے۔ انہیں یہ بھی احساس تھا کہ اتنے تھوڑے ایمونیشن سے وہ زیادہ دیر تک پولیس کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ سکھوں نے آپس میں فیصلہ کر لیا تھا کہ گرفتار ہونے کی بجائے وہ مر جائیں گے۔ انہوں نے آخری گولی اپنے لئے رکھ لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ان کے لئے وقت ایک مقام پر رُک گیا تھا۔ انتظار کی بے تابی ہیجانی کیفیت میں اضافہ کر رہی تھی۔ سورج اُفق سے اُوپر آ گیا تھا اور اُوپر ہی اُوپر اُٹھتا آ رہا تھا۔ سب کی نظریں اُس طرف لگی ہوئی تھیں جدھر سے دربارا سنگھ نے آنا تھا۔

عبدالقدیر ایک گھنے درخت پر یہ سوچ کر چڑھ گیا کہ پولیس کا اُسی
طرف سے آنا ضروری نہیں جس طرف وہ دیکھ رہے ہیں۔ پولیس کسی اور طرف
سے اور پیچھے سے بھی آسکتی تھی۔ پولیس کو یہ بتا دیا گیا تھا کہ مفرور قیدیوں
کے پاس رائفلیں، ایک ریوالور اور ایمونیشن بھی ہے۔

دُور دُور تک کوئی اِدھر آتا نظر نہیں آرہا تھا۔ بہت دُور کچھ کسان
کھیتوں میں دکھائی دے رہے تھے۔

آخر عبدالقدیر کو دو گھوڑے نظر آئے جو اِسی طرف آرہے تھے۔
فاصلہ تقریباً ایک میل تھا۔ گھوڑے دوڑ تو نہیں رہے تھے لیکن ان کی رفتار
تیز تھی۔ عبدالقدیر نے جگجیت سنگھ کو آواز دے کر بتایا اور کہا کہ وہ بھی
درخت پر چڑھ کر دیکھے۔

جگجیت سنگھ رائفل کا سلنگ کندھے میں ڈال کر اُسی درخت پر چڑھ
گیا جس کے نیچے وہ کھڑا تھا۔ اُسے بھی دو گھوڑے نظر آنے لگے۔ وہ دیکھتا
رہا اور گھوڑے تیزی سے قریب آتے گئے۔

"وہی لگتے ہیں" — جگجیت سنگھ نے بلند آواز سے کہا۔ کچھ دیر بعد
اُس نے کہا — "وہی ہیں.... دربارا اور کرتار سنگھ"

عبدالقدیر نے ہر طرف اور غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔ گھوڑے
قریب آگئے۔ جگجیت سنگھ درخت سے اُتر آیا۔ دربارا سنگھ اور کرتار سنگھ
کمزور اور دُبلی پتلی سی گھوڑیوں پر سوار تھے۔ جگجیت سنگھ اُن کی طرف بڑھا۔
وہ دونوں گھوڑیوں سے اُتر آئے۔ کرتار سنگھ ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ وہ ہنسا اور
جگجیت سنگھ کو گلے لگا لیا پھر دربارا سنگھ نے اُس کے ساتھ ہاتھ ملایا۔

"تم شاید ایک روز میرے پاس آئے تھے" — کرتار سنگھ نے جگجیت سنگھ
سے کہا — "تمہارے ساتھ دو اور لڑکے تھے۔ ایک کا نام یاد رہ گیا ہے
.... منگل سنگھ اور ...."

"دوسرا درشن سنگھ ہے" — جگجیت سنگھ نے کہا — "ہم تینوں سردار

پرتاب سنگھ کے ساتھ تمہارے پاس آئے تھے۔ تم نے ہمیں امرتسر کے دو
کام بتائے تھے۔ لالہ اجیت رائے کو غائب کرنا تھا"

"تم نے کر دیا تھا" — کرتار سنگھ نے کہا — "تم نے دِلّی میں وہ جو
ایک کام کیا تھا، وہ تم تینوں کا کمال تھا"

"پرتاب نے ہمیں دِلّی بھیجا تھا" — جگجیت نے کہا۔

"مَیں نے ہی اُسے کہا تھا کہ دِلّی تم تینوں کو بھیجے" — کرتار سنگھ
نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے" — جگجیت سنگھ نے کہا — "اُس نے ہمیں بتایا تھا۔
اسی لئے تمہارے پاس آتے ہیں۔ گاڑی سے ہم فرار ہوتے تو یاد آیا کہ تمہارا
ہی گاؤں قریب ہے۔ جنڈیالہ گورو تو بہت دُور ہے۔ یہ تو واہگورو کی
خاص کرپا ہے کہ دربارا سنگھ مل گیا۔ میرا گاؤں میں جانا خطرناک تھا"

"یہاں کھڑے نہ رہو" — کرتار سنگھ نے کہا — "فرار کی پوری
بات پھر سنوں گا۔ باقی کہاں ہیں؟"

"ٹیکریوں پر مورچے باندھ کر بیٹھے ہوتے ہیں" — جگجیت سنگھ نے ہنستے
ہوتے کہا — "آؤ.... ہمارے ساتھ دو مسلمان ہیں۔ جاسوسی میں انہیں
بیس بیس سال قید ملی تھی۔ ایک تو پکا اُستاد ہے .... عبدالقدیر .... بڑا
تجربے والا اور عقل والا آدمی ہے۔ انہیں بارڈر کراس کرانا ہے"

"کرا دیں گے" — کرتار سنگھ نے کہا — "پہلے کچھ کھا پی لو"

کرتار سنگھ اور دربارا سنگھ اپنی گھوڑیوں کو ساتھ لے کر ٹیلوں ٹیکریوں
اور چٹانوں کے اندر چلے گئے۔ باقی چار مفرور قیدیوں کو بھی اکٹھا کر لیا
گیا۔ کرتار سنگھ ان کے لئے روٹیاں لایا تھا۔ ساتھ آلو کی بھجیا تھی۔ ایک
چھاگل پانی کی بھی تھی۔ کھانے کے دوران باتیں ہوتی رہیں۔ کرتار سنگھ نے
دربارا سنگھ کو ایک اونچی ٹیکری پر چڑھا دیا تھا کہ وہ ارد گرد دیکھتا رہے۔

".... اور تم دونوں پاکستان جانا چاہتے ہو؟" — کرتار سنگھ نے
عبدالقدیر اور ہاشمی سے پوچھا۔

"پاکستان ہی تو ہمارا ٹھکانہ ہوگا" ___ عبدالقدیر نے جواب دیا۔

"تمہاری جاسوسی کس طرح چلتی تھی؟" ___ کرتار سنگھ نے پوچھا ___ "اور تم پکڑے کس طرح گئے تھے؟"

عبدالقدیر اور ہاشمی نے اپنی داستانِ جہاد سُنا دی اور یہ بھی سنایا کہ ہاشمی کی بیوی ایذا رسانی سے مر گئی ہے۔

"خدا تمہیں اور حوصلہ دے" ___ کرتار سنگھ نے کہا ___ "پاکستان میں تمہیں داخل کر دینا ہمارا کام ہے اور ہندو کے نیچے سے پانی گزار دینا تمہارا کام ہے.... میرا اور میرے گاؤں کا نام یاد کر لو۔ جب کبھی ادھر آنا ہوا یا جاسوسی کے معاملے میں پناہ کی ضرورت ہوتی تو اِس گاؤں میں پہنچ جانا۔ کسی کو تمہاری مُشک بھی نہیں ملے گی۔"

"فتح آپ کی ہوگی سردار کرتار سنگھ جی!" ___ عبدالقدیر نے کہا ___ "ہم نے بھی پاکستان کے لئے تمہاری قوم کی طرح قربانیاں دی تھیں۔ پاکستان کے ساتھ ہماری محبت دیکھو۔ ابھی تک پاکستان دیکھا بھی نہیں اور پاکستان کی خاطر بیس سال قید لے لی ہے۔"

"ہم تمہیں پاکستان دکھا دیں گے" ___ کرتار سنگھ نے کہا ___ "میں تمہیں ایک بات بتا دوں قدیر اور ہاشمی بھائی! تم نے مجھے سردار کرتار سنگھ جی کہا ہے۔ میں کوئی بڑا سردار نہیں ہوں۔ سمگلر ہوں اور یارانہ سمگلروں کے ساتھ ہے لیکن میں واہگورو کا سچا سکھ ہوں اور اکال تخت کی عزت پر اپنی جان قربان کرنے کا عہد کر رکھا ہے۔"

"ہمیں پاکستان کی سرحد کب پار کرا سکو گے؟" ___ عبدالقدیر نے پوچھا۔

"کل رات!" ___ کرتار سنگھ نے جواب دیا ___ "سب سُن لو بھائیو! آج کا دن تمہیں یہیں گزارا کرنا پڑے گا۔ دوپہر کو تمہیں کھانا اور پانی پہنچ جائے گا۔ دن کو میں تمہیں اس لئے نہیں لے جا رہا کہ تمہارے پاس رائفلیں ہیں۔ پکڑے جانے کا خطرہ ہے۔ میں سارا دن دیکھتا رہوں گا کہ

گاؤں میں باہر کا کوئی مُخبر آیا ہے یا نہیں۔ گاؤں کے مُخبر اور تھانے کا عملہ میری مٹھی میں ہے پھر بھی احتیاط ضروری ہے.... مَیں اب چلتا ہوں۔ اپنا پہرہ اب خود ہی دینا۔ ایک آدمی ہر وقت کہیں اُونچی جگہ بیٹھا ہر طرف دیکھتا رہے۔"

"یہ احتیاط اور انتظام میرا کام ہے" ___ عبدالقدیر نے کہا ___ "تم جاؤ.... روٹی نہ بھولنا کرتار سنگھ!"

عبدالقدیر کی مادری زبان اُردو تھی لیکن سکھوں کے ساتھ وہ ٹھیٹھ پنجابی بول رہا تھا۔

"قدیر بھائی!" ___ کرتار سنگھ نے کہا ___ "تم جنمے پلے دِلی میں ہو لیکن پنجابی بڑی سُتھری بولتے ہو؟"

"مَیں نے انٹیلی جنس میں سروس کی ہے" ___ عبدالقدیر نے کہا ___ "میں مختلف علاقوں کی اُردو بول سکتا ہوں۔ رہتک حصار کی زبان بولوں تو تم مجھے اُسی علاقے کا آدمی سمجھو۔ اسی طرح مختلف علاقوں کی پنجابی بھی روانی سے بول سکتا ہوں۔ میرے بھائی ہاشمی صاحب سوائے اُردو اور انگریزی کے کوئی اور زبان نہیں بول سکتے۔"

"کوئی مشکل نہ پیدا ہو جائے" ___ کرتار سنگھ نے کہا ___ "اِس علاقے میں کبھی کبھی فوجی آجاتے ہیں اور لوگوں کو چیک کرتے ہیں۔"

"کوئی مشکل نہیں" ___ عبدالقدیر نے کہا ___ "میں نے پہلے ہی سوچ رکھا ہے۔ انہیں گونگا اور بہرہ بنا دوں گا۔ یہ بولیں گے ہی نہیں۔ میں انہیں پریکٹس کرا دوں گا۔"

❋

کرتار سنگھ اور دربارا سنگھ چلے گئے۔

مفرور پارٹی کے لئے وہ دن ایک مہینے جتنا لمبا ہو گیا۔ انہوں نے ایک کی بجائے دو آدمی دو اُونچی ٹیکریوں پر بٹھا دیئے۔ کوئی بھی جو قریب یا دُور سے گزرتا تھا، وہ انہیں پولیس کا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ یہ

جگہ عام راستوں سے دُور ہٹ کر تھی لیکن عبدالقدیر نے اِس خطرے کی نشاندہی کر دی تھی کہ مفرور کے تعاقب میں ایسی ہی ویران اور راستوں سے ہٹی ہوئی جگہوں کو دیکھا جاتا ہے۔

دن گزرتا چلا گیا۔ چند ایک آدمی اِس جگہ کے قریب سے گزرے۔ دوپہر کو کرتار سنگھ کے دو آدمی کھانا لے کر آئے اور پارٹی کو کھانا کھلا کر چلے گئے۔

دن انتہائی ہیجانی کیفیت میں گزر گیا۔ سورج اپنی رفتار سے اُفق میں اُتر گیا اور شام کا اندھیرا گہرا ہونے لگا۔ وہ دیہاتی علاقہ تھا۔ لوگ دن بھر کے تھکے ماندے شام کے کچھ ہی دیر بعد سو جاتے تھے، پھر بھی کرتار سنگھ نے احتیاط کی اور رات خاصی گزُر جانے کے بعد ایک آدمی کو ساتھ لے کر پارٹی کے پاس گیا اور اپنے گاؤں میں لے آیا۔

"اِس علاقے کے تھانے میں تمہارے فرار کی اطلاع پہنچ چکی ہے" ——کرتار سنگھ نے بتایا ——"اور گاؤں کے دو مخبروں کو تھانے سے اطلاع مل چکی ہے لیکن کوئی خطرہ نہیں۔ یہ دونوں اپنے آدمی ہیں اور انہیں اپنی جانیں بھی پیاری ہیں۔ مخبری کر کے جائیں گے کہاں!" ——اُس نے ہاشمی اور عبدالقدیر سے کہا ——"تمہارا بندوبست ہو گیا ہے۔ تم دونوں کل رات یہاں سے روانہ ہو جاؤ گے۔ ایک بڑا پکا آدمی تمہارے ساتھ بارڈر تک جائے گا.... قدیر بھائی! یہ ریوالور تو تم اپنے پاس ہی رکھو گے اور ہاشمی بھائی رائفل لیتا جائے۔"

"نہیں!" ——عبدالقدیر نے کہا ——"یہ تمہارا مال ہے" ——اُس نے ریوالور اور ہاشمی کے ہاتھ سے رائفل اور ایمونیشن لے کر کرتار سنگھ کے حوالے کرتے ہوئے کہا ——"تم لوگ باقاعدہ جنگ لڑ رہے ہو۔ ہتھیاروں اور ایمونیشن کی تمہیں زیادہ ضرورت ہے۔ ہم تمہاری فتح کے لئے دُعا کرتے رہیں گے۔"

"تم دُعا ہی کر سکتے ہو بھائی" ——کرتار سنگھ نے کہا ——"چاہیئے تو یہ تھا کہ پاکستان ہماری ویسی ہی مدد کرتا جیسی اندرا گاندھی نے ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کے بنگالیوں کی کی تھی لیکن پاکستان پر حکومت کرنے والے لیڈروں پر حکومت کرنے کا ایسا نشہ سوار ہے کہ ان کی غیرت رہی ہی نہیں۔"

کرتار سنگھ اپنے گاؤں کا حاکم لگتا تھا۔ اُسے گاؤں کا کوئی آدمی اور اُسے جاننے والا کوئی آدمی جو کہیں بھی رہنے والا کیوں نہ تھا، دھوکہ دینے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ سکھوں کے بعد دوسری قوم ہندوؤں کی تھی۔ خالصتان کی تحریک کے سلسلے میں سکھوں نے ہندوؤں کی قتل و غارت کا جو سلسلہ شروع کر رکھا تھا، اس سے ہندو سکھوں سے خائف رہتے تھے۔ گاؤں کے ہندو سکھوں کے بچوں کو بھی جھک کر یا ہاتھ جوڑ کر سلام کرتے تھے۔

❋

اگلی رات جب گاؤں کے لوگ گہری نیند سو گئے تھے، ہاشمی اور عبدالقدیر کرتار سنگھ، منگل سنگھ، جگجیت سنگھ اور درشن سنگھ سے بغلگیر ہو کر ملے اور اُس آدمی کے ساتھ کرتار سنگھ کے گھر سے رُخصت ہوئے جو شام کو آگیا تھا۔ اس آدمی نے دونوں کو ساتھ لیا اور گاؤں کے باہر کھڑے ایک تانگے میں بٹھایا۔ تانگہ بان ان کا اپنا ہی آدمی تھا۔

کچھ کچی اور کچھ پکی سڑک پر دو اڑھائی گھنٹوں کا سفر طے کر کے وہ ایک قصبے میں پہنچے۔ ایک بس تیار کھڑی تھی۔ تینوں بس میں سوار ہونے لگے تو پولیس کے دو کانسٹیبلوں نے انہیں روک لیا اور رٹے رٹائے سوال پوچھے ——"کہاں سے آئے ہو؟" ——اور ساتھ ہی ہاتھ اُوپر کرا کے جامہ تلاشی لی۔ ایک ہیڈ کانسٹیبل بھی آگیا تھا۔

"اچھی طرح چیک کرنا ادّے!" ——ہیڈ کانسٹیبل نے کہا ——"اچھی طرح دیکھنا۔"

"حوالدارا!" ——عبدالقدیر نے ٹھیٹ پنجابی میں کہا ——"ہم تو اپنے ہی وطن میں مشتبہ ہو گئے ہیں۔ کر لو چیکنگ۔"

باقی سوالوں کے جواب عبدالقدیر اور سکھ نے دیئے جو ان کے

ساتھ جا رہا تھا۔ ہاشمی خاموش تھا۔

"تم بھی کچھ بولو بھائی!" ــــ ہیڈ کانسٹیبل نے ہاشمی سے کہا۔

"یہ بے چارہ گونگا ہے" ــــ عبدالقدیر نے ہاشمی کی طرف دیکھ کر ہنستے ہوئے کہا ــــ "میرے چاچے کا بیٹا ہے"۔

عبدالقدیر کو ہنستا دیکھ کر ہاشمی بھی ہنس پڑا اور ہاتھ کے اشارے سے پوچھا کہ کیا بات ہے۔ عبدالقدیر نے ہاتھوں سے کچھ اشارے کئے۔ ہاشمی سر ہلاتا رہا جیسے وہ سمجھ رہا ہو۔ پولیس کی تسلّی کے لئے یہی کافی تھا۔ انہیں تو تین سکھ اور دو مسلمان مطلوب تھے۔ سکھ جنڈیالہ گورو اور اِرد گرد کے علاقے کے رہنے والے اور مسلمان دِلّی کے رہنے والے تھے اور دونوں اُردو بولتے تھے۔ ان میں گونگا کوئی نہیں تھا۔

تینوں بس میں سوار ہو گئے۔

راستے میں تین جگہوں پر بس کو پولیس نے روکا اور تمام مسافروں کو بڑی اچھی طرح جانچا پرکھا۔ ہاشمی گونگا بنا رہا۔

❄

صُبح طلوع ہوئی تو بس ایک جگہ رُکی۔ سکھ نے عبدالقدیر اور ہاشمی کو اُتارا۔ وہاں بھی پولیس چیکنگ کے لئے کھڑی تھی۔ اس چیکنگ میں سے بھی تینوں نکل گئے اور ان کا رہنما سکھ انہیں ایک گاؤں میں لے گیا۔ یہ گاؤں پاکستان کی سرحد سے پندرہ سولہ میل دُور تھا۔ سکھ نے اُنہیں بتایا کہ اِس گاؤں کی تقریباً آدھی آبادی سمگلروں کی ہے یا سمگلروں کے ساتھیوں کی۔

سارا دن ایک سکھ کے گھر گزرا جس نے ان کی خوب خاطر تواضع کی اور انہیں کہا کہ وہ بے شک آرام کی نیند سو جائیں کیونکہ رات یہاں سے پاکستان کے بارڈر تک پیدل چلنا ہو گا۔ عبدالقدیر، ہاشمی اور سکھ کھا پی کر ایسے سوئے کہ آنکھ کھُلی تو سورج غروب ہو چکا تھا۔ اُنہوں نے کھانا کھایا اور چلنے کی تیاری کرنے لگے۔

کھانا کھاتے ہی چل پڑے۔ کرتار سنگھ کے گاؤں سے جو سکھ ان کے ساتھ آیا تھا وہ ان کے ساتھ گیا۔ اُسے معلوم تھا کہ بارڈر کہاں سے کراس کیا جا سکتا ہے۔ جس سمگلر کے وہ دن کے وقت مہمان رہے تھے اُس نے اُنہیں کچھ ہدایات دی تھیں۔ عبدالقدیر اور ہاشمی بہت خوش تھے کہ وہ عمر بھر کی قید سے آزاد ہو کر اپنے خوابوں کی سرزمین، پاکستان کو جا رہے ہیں۔ ہاشمی تو بہت ہی خوش تھا۔ دِلّی میں سوائے حویلی کے اُس کا کچھ بھی نہ تھا۔ عبدالقدیر کی بیوی مر چکی تھی۔ اُس کی اولاد شادی شدہ تھی۔ وہ اولاد کے فرائض سے فارغ ہو چکا تھا۔ اُسے پیچھے کا کوئی غم نہ تھا۔

وہ باتیں کرتے جا رہے تھے۔ راستے میں ذرا رُک کر کچھ دیر آرام کیا۔ آخر رات ڈیڑھ بجے کے لگ بھگ سکھ رُک گیا اور انہیں بتایا کہ سرحد صرف دو سو گز دُور رہ گئی ہے۔

"اگر دو سو گز فاصلہ طے کر جاؤ اور سامنے سے تمہیں کوئی للکارے تو دوڑ کر آگے چلے جانا" ــــ سکھ نے کہا ــــ "اور بلند آواز سے کہنا، ہم پاکستانی ہیں، تمہارے پاس آ رہے ہیں۔ یہ کہہ کر بیٹھ جانا ورنہ اِدھر (انڈیا) کی بارڈر سکیورٹی فورس نے دیکھ لیا اور پاکستانی کا لفظ سُن لیا تو معلوم نہیں کتنی گولیاں تمہارے جسموں سے پار ہو جائیں گی۔ تم پاکستان کے رینجرز کی للکار کا جواب دے کر بیٹھ جاؤ گے تو وہ تمہاری طرف آئیں گے۔ قریب آئیں تو اُن کے پاس چلے جانا۔ آگے تم جانتے ہو کیا کہنا ہے.... رینجرز کی ایک پوسٹ بالکل قریب ہے۔ اگر تمہیں کوئی نہ للکارے تو اس پوسٹ میں چلے جانا۔"

دونوں سکھ سے گلے ملے۔ سکھ واپس چلا گیا۔ ہاشمی اور عبدالقدیر پاکستان کی سرحد کی طرف چل پڑے۔ رات تاریک تھی پھر بھی عبدالقدیر اپنے آپ کو اور ہاشمی کو جھاڑیوں اور سرکنڈوں کی اوٹ میں چھپا چھپا کر آگے بڑھ رہا تھا لیکن یہ اوٹ سرحد سے کچھ دُور ختم ہو گئی تھی۔ یہ انڈیا کی

بارڈر سیکیورٹی فورس نے صاف کر دی تھی تاکہ غیر قانونی طور پر بارڈر کراس کرنے والوں کو اوٹ نہ مل سکے اور گشتی سنتریوں کو وہ دُور سے نظر آسکیں۔

عبدالقدیر اور ہاشمی اوٹ ختم ہو لے پر ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل چلنے لگے۔ سرحد چند قدم دُور رہ گئی۔

"رُک جاؤ اوتے!" —— ایک للکار سنائی دی —— "گولی آتی ہے"۔

"یہ پاکستانی نہیں ہو سکتے" —— عبدالقدیر نے ہاشمی کو سرگوشی میں کہا —— "یہ آواز انڈیا کی طرف سے آتی ہے۔ پیٹ کے بل ہو جاؤ"۔

سنتری آگے آرہے تھے۔ عبدالقدیر نے اچانک ایک فیصلہ کیا اور ہاشمی سے کہا کہ اسی طرح ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل دوڑو۔ دونوں دوڑ پڑے۔

عبدالقدیر نے مُنہ سے کُتّے کے بھونکنے اور غرّانے کی آوازیں نکالنی شروع کر دیں۔

گُپ اندھیری رات میں ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل چلتے ہُوئے آدمی کو کُتّا سمجھا جا سکتا تھا لیکن ہُوبہو کُتّے کی طرح انسان تو نہیں بھونک سکتا۔ گشتی سنتریوں نے دوبارہ للکارا جس سے عبدالقدیر کو غلط فہمی ہوئی کہ ان دونوں کو کُتّے سمجھ کر سنتری مطمئن ہو گئے ہیں۔ سرحد پر کوئی لکیر یا نشانی تو نہیں تھی جس سے پتہ چلتا کہ یہاں ہندوستان ختم ہو گیا اور پاکستان شروع ہو گیا ہے۔ یہ عبدالقدیر اور ہاشمی کا اندازہ تھا کہ وہ سرحد پر آگئے ہیں۔ عبدالقدیر اُٹھا۔ ہاشمی بھی اُٹھ کھڑا ہُوا اور دونوں دوڑ پڑے۔

سِکھوں نے مشرقی پنجاب میں خالصتان کی آزاد ریاست کے قیام کے لئے جو مسلح تحریک چلا رکھی تھی، اس کی تباہ کاری کے پیشِ نظر انڈیا کی بی ایس ایف کو حکم دیا گیا تھا کہ سرحد پر کوئی آدمی للکارنے پر بھاگنے کی کوشش کرے تو اُسے گولی مار دی جائے۔ انڈین گورنمنٹ کو یہ شک بھی تھا کہ سکھوں کو پاکستان سے مدد ملتی ہے۔ اس وجہ سے بھی حکم دے دیا گیا تھا کہ سرحد پر ذرا سی بھی حرکت نظر آئے تو گولی چلا دی جائے۔

ہاشمی اور عبدالقدیر اُٹھ کر دوڑے تو انڈیا کے دو گشتی سنتریوں کی آٹومیٹک رائفلوں نے ایک دوسرے کے پیچھے کئی راؤنڈ فائر کر ڈالے۔ کچھ گولیاں تو ان کے قریب سے گزر گئیں لیکن ایک گولی عبدالقدیر کے گھٹنے کی ہڈیوں کو توڑتی ہوئی گزر گئی۔ عبدالقدیر پھر بھی دوڑتا رہا لیکن گر پڑا۔

ہاشمی کی چال بدل گئی تھی۔ وہ اب دوڑ نہیں رہا تھا، چل رہا تھا اور اُس کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ کچھ اور آگے جا کر وہ گر پڑا۔ عبدالقدیر اُٹھا اور زخمی ٹانگ کو گھسیٹتا ہُوا ہاشمی تک پہنچا۔ اُسے بلایا۔ وہ نہ بولا۔ نبض دیکھی۔ وہ زندہ تھا۔

❄

وہ پاکستان کی سرحد میں داخل ہو چکے تھے۔ فائرنگ کی آواز پر پاکستان کی رینجرز پوسٹ والے بیدار ہو گئے۔ گشتی سنتریوں نے پوزیشنیں لے لی تھیں۔

"تمہارے پاس آگئے ہیں پاکستانیو!" —— انڈیا کے ایک سنتری نے بلند آواز سے کہا —— "دیکھو کون ہیں"۔

فائرنگ بند ہو چکی تھی۔ پاکستانی سنتری آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔ پوسٹ کا کمانڈر اور دو تین عہدیدار بھی آگئے۔

"کون ہو؟" —— ایک سنتری نے کہا —— "تمہارے پاس ہتھیار ہیں تو ہماری طرف پھینک دو"۔

"ہم پاکستانی ہیں بھائیو!" —— عبدالقدیر نے کہا —— "دونوں زخمی ہیں۔ ہمارے پاس کوئی ہتھیار نہیں"۔

پوسٹ کمانڈر نے قریب آکر ٹارچ روشن کی اور دونوں کو دیکھا۔ ان کے کپڑے خون سے لال تھے۔

"ہم پاکستان کی انٹیلی جنس کے آدمی ہیں" —— عبدالقدیر نے کہا —— "لاہور میں انٹیلی جنس کا جو بڑا افسر ہے اُسے اطلاع دو اور ہمیں ہسپتال پہنچاؤ"۔

"شناخت کیا ہے تمہاری؟"—پوسٹ کمانڈر نے پوچھا۔

"بیوقوف!"—عبدالقدیر نے جواب دیا—"کیا انٹیلی جنس کے آدمی دشمن ملک میں اپنی شناخت ساتھ لے کر جایا کرتے ہیں؟ ہم بہت ضروری انفارمیشن لاتے ہیں۔ پیشتر اس کے کہ ہم دونوں مر جائیں ہمیں انٹیلی جنس کے کسی افسر سے ملوا دو۔"

عبدالقدیر کو رشی اور رابی کے حوالے سے اور عزیز کے قتل کے حوالے سے آئی ایس آئی کی ہی پناہ مل سکتی تھی۔ یہ تو اُسے معلوم ہی نہیں تھا کہ رشی کی کوششوں سے پاکستان میں انڈیا کے کتنے ایجنٹ پکڑے گئے ہیں۔

رینجرز کی اس پوسٹ پر فرسٹ ایڈ کا انتظام موجود تھا عبدالقدیر کا خون روکنے کے لئے اُس کے گھٹنے پر پٹیاں باندھ دی گئیں۔ ہاشمی بے ہوش تھا۔ اُس کے پیٹ میں تین گولیاں لگی تھیں۔ اُس کے پیٹ کو پٹیوں میں جکڑ دیا گیا اور دونوں کو ایک جیپ پر لاہور کے سی ایم ایچ میں پہنچا دیا گیا۔

❄

صبح طلوع ہو رہی تھی جب آئی ایس آئی لاہور کا ایک لفٹیننٹ کرنل سی ایم ایچ میں آیا۔ اس سے چند منٹ پہلے ہاشمی اور عبدالقدیر کو آپریشن روم سے نکال کر دو الگ الگ کمروں میں لاتے تھے۔ عبدالقدیر کی گھٹنے کی ہڈی ایسی بُری طرح ٹوٹی تھی کہ اسے جوڑا نہیں جاسکتا تھا۔ گھٹنے کی کیپ تو بالکل ہی بیکار ہو گئی تھی۔ سرجن نے مجبوراً گھٹنے سے ذرا اُوپر سے ٹانگ کاٹ دی۔

ہاشمی بے ہوش تھا۔ اُس کے بچنے کی اُمید نہ ہونے کے برابر تھی۔

عبدالقدیر کو آپریشن کے لئے بیہوش کیا گیا تھا۔ کمرے میں آکر وہ کم وبیش دو گھنٹوں بعد ہوش میں آیا۔ آئی ایس آئی کا لفٹیننٹ کرنل

سی ایم ایچ میں ہی کہیں موجود تھا۔ اُسے عبدالقدیر کے ہوش میں آنے کی اطلاع ملی تو وہ اُس کے کمرے میں آیا اور عبدالقدیر سے اپنا تعارف کرایا۔

"سنا ہے تم آئی ایس آئی کے ایجنٹ ہو"—لفٹیننٹ کرنل نے کہا—"لیکن میں آج تمہیں پہلی بار دیکھ رہا ہوں"۔

"میں آپ کا ایجنٹ نہیں ہوں جناب!"—عبدالقدیر نے کہا—"میں انڈین انٹیلی جنس سے ریٹائر ہوا ہوں۔ پاکستان کے لئے کام کرنے کے جرم میں بیس سال سزائے قید ملی تھی۔ میں اور میرا ساتھی فرید الدین ہاشمی نابھہ جیل کے راستے میں فرار ہو کر آتے ہیں۔ میں آپ کو اپنی اور اپنے ساتھی کی کارگزاری سناتا ہوں۔"

اُس نے دلّی میں اپنے زمین دوز محاذ کی تفصیل سنائی۔ عزیز کا ذکر کیا۔ رشی کے اغوا کا پورا واقعہ سنایا۔ رابی کا نام لیا۔ عزیز کے قتل کی واردات سنائی۔ ہاشمی کی بیوی کی موت بیان کی۔ غرضیکہ اُس نے ہر تفصیل سنا ڈالی۔

لفٹیننٹ کرنل رشی اور رابی کے کیس سے پوری طرح واقف تھا۔ رشی کے گھر کی حفاظت کا انتظام اُسی نے کیا تھا۔ عبدالقدیر اور ہاشمی کی شناخت صرف رشی کر سکتی تھی۔ رشی نے دلّی سے واپس آکر یہی بیان دیا جو عبدالقدیر نے دیا تھا۔ رشی کے بیان سے وہ واقف تھا عبدالقدیر کا بیان سن کر وہ خود رشی کے گھر گیا اور اُسے بتایا کہ دلّی سے دو آدمی آتے ہیں۔ ایک کا نام عبدالقدیر اور دوسرے کا نام فرید الدین ہاشمی ہے۔

"کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں کرنل صاحب!"—رشی نے مسرت اور اشتیاق سے اُچھلتے ہوئے کہا—"کہاں ہیں وہ؟ مجھے اُن کے پاس لے چلیں"۔

لفٹیننٹ کرنل رشی کو اُس کی ماں کے ساتھ سی ایم ایچ لے گیا۔

پہلے ہاشمی کا کمرہ آتا تھا۔ لفٹیننٹ کرنل رشی کو اِس کمرے میں لے گیا۔ ہاشمی بے ہوش پڑا تھا۔ رِشی نے اُسے دیکھا، پھر لفٹیننٹ کرنل کی طرف دیکھا۔

"ہاشمی صاحب!" — رِشی نے ہاشمی کے ماتھے پر ہاتھ پھیرتے ہُوئے کہا — "انکل ہاشمی!"

ہاشمی نے آنکھیں کھول دیں اور رِشی کو دیکھا۔

"راشدہ؟" — ہاشمی نے غنودگی کے لہجے میں پوچھا — "تم؟.... کیا میں پاکستان میں ہوں؟"

"ہاں انکل!" — رِشی نے کہا — "آپ پاکستان میں ہیں۔ میں آپ کو اپنے گھر لے جاؤں گی" — اُس نے ہاشمی کی بیوی کے متعلق پوچھا — "خالہ کیسی ہیں؟ کہاں ہیں؟"

"اللہ کے پاس!" — ہاشمی نے جواب دیا — "رشی بیٹی! اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ مَیں پاکستان کے پاک نام پر پاکستان میں جان دے رہا ہوں"

"نہیں انکل ہاشمی!" — رِشی نے ہاشمی کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر کہا — "مَیں آپ کو اپنے گھر رکھوں گی"

"تمہارا شکریہ رِشی بیٹی!" — ہاشمی نے کہا — "تمہاری خالہ میرا انتظار کر رہی ہو گی۔ میں نے اُس کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ میں جلد ہی اُس کے پاس پہنچ رہا ہوں"

ہاشمی کو ہچکی سی آئی۔ اُس نے سرگوشی میں کلمہ شریف پڑھا اور وہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ رِشی نے روتے ہوتے اُسے بلایا، ہلایا لیکن وہ اپنی بیوی کے پاس پہنچ گیا تھا۔ لفٹیننٹ کرنل کو ڈاکٹر نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ یہ شخص زندہ نہیں رہے گا۔ اُس کے پیٹ میں تین گولیاں لگی تھیں۔

رِشی کو عبدالقدیر کے کمرے میں لے گئے تو وہ اور زیادہ جذباتی ہو گئی۔

"عبدالقدیر انکل!" — رِشی نے ایسے والہانہ انداز سے عبدالقدیر کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے جیسے وہ اُس کا سگا باپ ہو۔ روتے ہوتے بولی — "انکل ہاشمی فوت ہو گئے ہیں۔ آپ تو ٹھیک ہیں نا!"

"ہاشمی خوش نصیب ہے بیٹی" — عبدالقدیر نے کہا — "تم کرنل صاحب کو بتاؤ کہ مجھے جانتی ہو یا نہیں"

"ہاں کرنل صاحب!" — رِشی نے لفٹیننٹ کرنل سے کہا — "مَیں انہیں جانتی ہوں۔ یہی ہیں وہ جنہوں نے مجھے نئی زندگی دی ہے" — وہ عبدالقدیر سے مخاطب ہوئی — "مَیں نے اپنے خاوند کو پکڑوا دیا ہے۔ پاکستان کے بہت سے دشمنوں کو پکڑوا دیا ہے"

❄

تین چار مہینے بعد جب انڈیا کے ان تمام ایجنٹوں کے مقدمے کی سماعت پاکستان کی ایک خاص عدالت میں شروع ہوئی تو استغاثہ کے گواہوں میں ایک گواہ پیش ہُوا جس کی ایک ٹانگ مصنوعی تھی۔ اُسے پاکستان کی شہریت دے دی گئی تھی۔ اُس کا بیان سب سے زیادہ لمبا تھا اور صفائی کے وکیلوں نے اُس پر جو جرح کی اس میں دو دن صَرف ہوتے۔ اِن وکیلوں نے ایک اعتراض یہ کیا کہ یہ گواہ غیر قانونی طور پر پاکستان میں داخل ہُوا تھا اس لئے اسے پاکستان کی شہریت کا حقدار نہیں قرار دیا جا سکتا۔ یہ بحث سرکاری اور صفائی کے وکیلوں کے درمیان تھی لیکن عبدالقدیر بول پڑا۔

"جناب والا!" — اُس نے ملزموں کی طرف اشارہ کر کے کہا — "اگر یہ پاکستان کی شہریت کے حقدار ہو سکتے ہیں جو دشمن سے معاوضہ وصول کر کے پاکستان کی جڑیں کاٹ رہے ہیں تو کیا میں پاکستان کا شہری نہیں ہو سکتا جس نے پاکستان کی خاطر اپنی ٹانگ کٹوا دی ہے؟.... اور وہ بھی دِلّی کا رہنے والا تھا جس نے پاکستان کے نام پر اپنی بیوی مروا دی اور

خود پاکستان کی سرحد پر آکر جان دے دی۔"

"آپ خاموش رہیں" —— جج نے عبدالقدیر سے کہا —— "یہ وکیلوں کی بحث ہے۔ آپ سے جب پوچھا جائے گا تو آپ بولیں گے۔"

جج نے صفائی کے وکیلوں کا یہ احتجاج مسترد کر دیا کہ عبدالقدیر پاکستان کی شہریت کا حقدار نہیں تھا۔ عبدالقدیر نے عدالت میں جو بیان دیا اور دو دن جرح کے جواب دیتا رہا، اِن سے رشی کے بیان کی تصدیق ہو گئی اور آئی ایس آئی کا استغاثہ اتنا مضبوط ہو گیا کہ صفائی کے وکیل ہار گئے۔

آٹھ نو مہینوں بعد مقدمے کا فیصلہ سُنا دیا گیا۔ کسی ایک کو بھی چودہ سال سے کم سزائے قید نہ ملی۔ رشی کو اغوا کر کے قبائلی علاقے میں پہنچانے والوں کو چھ چھ سال مزید سزائے قید دی گئی۔

کسی کو بھی وعدہ معاف گواہ نہیں بنایا گیا تھا۔ رابی کا باپ معمولی سی کوشش سے اُسے وعدہ معاف گواہ بنوا کر سزا سے بچا سکتا تھا لیکن اُس پر خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ اپنی بیوی اور بیٹیوں کی باتیں سُن کر بھی چُپ رہتا تھا۔ وہ دل کا مریض بن چکا تھا۔ اُس نے درخواست دی کہ اُسے ریٹائر کر دیا جائے اور اُس کی ایک سال کی جو سروس رہتی ہے وہ ریٹائرمنٹ سے قبل کی چھٹی میں شمار کی جائے۔ اُس کی درخواست منظور کر لی گئی تھی۔

اُس نے اپنے بیٹے پر یہ کرم کیا تھا کہ ایک تجربہ کار ایڈووکیٹ کر لیا تھا۔ وہ خود عدالت میں مقدمہ سننے کے لئے کبھی نہیں گیا تھا۔

فیصلے کے روز ایڈووکیٹ نے اُسے ٹیلیفون پر بتایا کہ رابی کو چودہ سال سزائے قید سُنا دی گئی ہے۔ ذرا ہی دیر بعد رابی کے دونوں بہنوئی جو فیصلہ سُننے عدالت میں گئے ہوتے تھے، آگئے اور رابی کی ماں اور بہنوں کو عدالت کا فیصلہ سنایا۔ رابی کا باپ بیٹھے بیٹھے لڑھک گیا —— اُس کی حرکتِ قلب بند ہو چکی تھی۔

اُس روز بھی پاکستان کے دو تین نوجوان ایک انڈین ایجنٹ کے

ذریعے سیر و سیاحت کے لئے نئی دِلّی جا رہے تھے۔ پاکستان میں انڈین فلموں اور انگلش میوزک کا شور و غل پہلے سے زیادہ ہو گیا تھا۔ ہلڑبازی جیسا رقص جاری تھا۔ اخلاق اور قومی کردار کا مذاق اُڑایا جا رہا تھا۔

پاکستان میں اقتدار کی معرکہ آرائی اور زیادہ بڑھ گئی تھی۔ زندہ باد اور مُردہ باد کے نعرے لگ رہے تھے۔

علما کی تفرقہ بازی جاری تھی۔

کراچی اور حیدر آباد خون میں ڈوب رہے تھے۔ بھائی اپنے بھائیوں کا خون بہا رہے تھے۔ پاکستان میں حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف کے لیڈر اپنی اپنی ڈفلی بجا رہے تھے اور اپنے اپنے راگ اُلاپ رہے تھے —— اور سندھ میں انڈیا کے تخریب کار اطمینان سے اپنا کام کر رہے تھے۔

پاکستان میں انڈیا کے جتنے ایجنٹوں کو لمبی قید کی سزائیں دی گئی تھیں ان کی جگہ اتنے ہی نئے ایجنٹ آگئے تھے۔

پاکستان کے حکمرانوں کی ہوسِ اقتدار اور بے نیازی نئے رابی اور نئے خان صاحب پیدا کر رہی تھی —— اور ایک کہانی اپنے آپ کو دوہراتے چلی جا رہی تھی۔